دیوتا
تیرھواں حصہ

چک نمبر ۲۱۲ کے قریب پہنچ کر اُس نے ٹیکسی والے کو اتنی رقم دی جس کی وہ توقع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پھر کھیت ہی کھیت چلتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں آج سے بارہ برس پہلے اس نے لہو اور مٹی میں لتھڑی ہوئی باپ کی لاش دیکھی تھی۔

وہاں عیدا پہلوان اس کا انتظار کر رہا تھا، اسے دیکھتے ہی بولا "ریحانہ کہاں ہے؟"

"وہ زندہ ہے سلامت ہے تمھیں مل جائے گی، دو لاکھ روپے نکالو۔"

اس نے بریف کیس کھول کر اسے نوٹوں کی گڈیاں دکھائیں پھر اسے بند کرتے ہوئے کہا "ایک ہاتھ سے بیٹی لوں گا دوسرے ہاتھ سے رقم دوں گا۔"

اس نے دُور اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پہلوان! اس آم کے درخت کو دیکھ رہے ہو۔ آج سے بارہ برس پہلے وہ ہرا بھرا تھا۔ ابھی آموں کا موسم نہیں ہے پھر بھی ہم وہاں چلتے ہیں۔"

عیدے پہلوان نے دور اس درخت کو دیکھا تو ایک دم سے جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اس نے پوچھا "تم نے مجھے یہاں کیوں بُلایا ہے؟ سودا شہر میں ہوسکتا تھا کیا تم اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتے ہو؟"

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ دیر ہوگئی تو تیری بیٹی زندہ نہیں رہے گی۔ جہاں میں نے اسے رکھا ہے وہاں یہ تاکید کردی ہے کہ مجھے پہنچنے میں دیر ہو تو اسے ختم کر دیا جائے۔"

پہلوان نے کہا "تم یہ نہ سمجھنا کہ میں بوڑھا ہوں تو کمزور بھی ہوچکا ہوں۔ چلو دیکھتا ہوں تم اس درخت کے پاس کیا کرنا چاہتے ہو۔"

وہ دونوں چلتے چلتے وہاں پہنچ گئے۔ کرم داد نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ابھی تم نے کہا تھا، بوڑھے ہو مگر کمزور نہیں ہو۔ ذرا میرے ہاتھوں کو دیکھو، یہ ایک لوہار کے ہاتھ ہیں کیا تم پنجہ لڑا سکتے ہو؟"

عیدے پہلوان نے کن انکھیوں سے اس کے موٹے سخت کھُردرے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ ہاتھ اور اس کی انگلیاں فولاد کی طرح سخت تھیں اس نے کہا "آؤ ایک بار پنجہ لڑاؤ۔"

پہلوان پیچھے ہٹ کر بولا "کیا بکواس ہے۔ کیا تم نے پنجہ لڑانے کے لیے مجھے بُلایا ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"میں چلا جاؤں گا۔ پھر تمھیں دو لاکھ نہیں ملیں گے۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اپنی بیٹی کو لے کر جاؤ۔ دیکھو اس درخت کے پاس دیکھو جہاں سے ہم ابھی آئے ہیں اور جہاں بارہ برس پہلے میں کھڑا ہوا تھا۔ تم نے میرے باپ کے ساتھ یہاں سے دوڑ لگائی تھی۔ شرط یہ تھی کہ جو پہلے مجھ تک پہنچے گا میں اسی کی ملکیت بن جاؤں گا اب ذرا غور سے اس درخت کی طرف دیکھو

وہاں تمھاری بیٹی کھڑی ہوئی نظر آئے گی۔"

عیدے پہلوان نے بے اختیار اس درخت کی طرف دیکھا۔ پھر پلٹ کر بولا "کیا بکواس ہے وہاں کوئی نہیں ہے۔ تم یہ کیا تماشا کر رہے ہو ؟"

"پہلوان! تمھاری بیٹی وہاں موجود ہے ذرا غور سے دیکھو۔"

وہ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کرم داد نے کہا ۔۔۔ "اپنے دماغ میں یہ بات دہراتے رہو کہ اس کے بائیں بازو میں بارہ لاکھ روپے کے ہیرے ہیں تب وہ نظر آجائے گی اور جب نظر آجائے تو یہاں سے دوڑ لگانا۔ اپنی بیٹی تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔ اگر میں پہلے پہنچ جاؤں تو وہ تمھیں نہیں ملے گی۔ اگر تم پہلے پہنچ گئے تو بیٹی بھی تمھاری اور ہیرے بھی تمھارے۔"

وہ بے بسی سے بولا "کہاں ہے میری بیٹی؟ کہاں ہیں وہ ہیرے مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔"

"تمھاری دور کی نظر کمزور ہے۔ قریب جاؤ گے تو نظر آجائے گی۔ لہٰذا دوڑ لگاؤ اور اس درخت تک پہنچو۔"

"نہیں، میں دوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

"تمھارا تو باپ بھی جائے گا۔" یہ کہتے ہی اس نے ایک الٹا ہاتھ پہلوان کے منہ پر رسید کیا۔ وہ ذرا لڑکھڑایا۔ پھر اس سے لپٹ پڑنے کے لیے آگے بڑھا مگر منہ پر گھونسہ پڑا۔ پھر کرم داد نے اس کے ایک ہاتھ کے پنجے میں اپنا پنجہ ڈال کر موڑنا شروع کر دیا اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ وہ نہ صرف بوڑھا ہی نہیں کمزور بھی ہو گیا ہے اور اگر کمزور نہیں ہوا ہے تو ایک قد آور لوہار کے سامنے اس کا بڑھاپا بے بس ہے۔ اس نے پوچھا "بولو وہاں تک دوڑ کر جاؤ گے یا نہیں ؟"

"چھوڑ دو۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔ میں جاؤں گا، دوڑ کر جاؤں گا۔"

اس نے چھوڑتے ہوئے کہا "یہ بریف کیس چاہو تو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ روپے میرے ہیں اور آخر میں مجھے ہی ملیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی پہلوان نے یک بیک دوڑ لگائی۔ وہ تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ چاہتا تھا کرم داد اس کے پیچھے نہ آئے۔ اگر آئے تو اس سے آگے نہ نکل سکے۔ تھوڑی دور جاتے ہی وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ تب پتا چلا، کرم داد نے اپنے کاندھے کی چادر اس کے قدموں سے الجھا دی تھی۔

اس نے اوندھے منہ زمین پر گرنے کے بعد فوراً ہی اٹھ کر دیکھا۔ وہ پوچھ رہا تھا "کچھ یاد آیا۔ اگر نہیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ مجھے یاد ہے، چلو دوڑ لگاؤ۔"

"نن نہیں۔ میں نہیں دوڑوں گا۔ میں سمجھ گیا تم کیا چاہتے ہو۔ میرا باپ بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا تم اسے پہنچنے نہیں دو گے اس کے باوجود ایک ذرا سی آس تھی ۔۔ شاید دوڑ میں وہ تم سے بہت آگے نکل جائے۔ اور تم اسے نہ روک سکو۔ تم بھی یہی آس رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم اس درخت کے پاس پہنچ جاؤ گے تو یہ دو لاکھ روپے تمھارے ہوں گے اور تمھاری بیٹی تمھیں واپس مل جائے گی۔ چلو شروع ہو جاؤ۔"

اس نے کچھ درخت تک پہلے پہنچنے کی آس میں دوبارہ دوڑنا شروع کیا۔ دوڑنے کے دوران وہ پلٹ کر دیکھتا تھا، اور مطمئن ہو جاتا تھا۔ کرم داد اس سے پیچھے رہ گیا تھا۔ یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ قریب نہیں آئے گا۔ اس کی ٹانگ میں ٹانگ نہیں پھنسا سکے گا۔ وہ اور زور سے دوڑنے لگا۔ درخت اس سے بیس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ قدم تیزی سے اٹھتے رہیں آگے بڑھتے رہیں تو منزل قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ پھر پندرہ گز کا فاصلہ رہ گیا۔ اس کے بعد دس گز۔ پھر چھ گز۔ اس کے ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ دونوں بازو پھیل گئے منہ آسمان کی طرف اٹھ گیا پھر وہ دھپ سے اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اس کی پشت میں ایک خنجر پیوست تھا ۔۔ کرم داد نے زمین پر پڑے ہوئے بریف کیس کو اٹھایا، پھر اس سے چند فٹ کے فاصلے پر رکھتے ہوئے بولا "یہ دو لاکھ روپے تمھارے سامنے ہیں، بڑھو، آگے بڑھو، لے لو یہ تمھارے ہیں۔"

جان جا رہی تھی۔ اس کے باوجود عیدے پہلوان نے اپنا ایک ہاتھ بریف کیس کی طرف بڑھایا۔ وہ بیٹی کو نہیں، بارہ لاکھ روپے کے ہیروں کو بھی نہیں پا سکا تھا۔ وہ نہیں مل رہے تھے، یہ تو اس کے اپنے دو لاکھ تھے۔ اس رقم تک تو پہنچ سکتا تھا۔

وہ گھسٹتا ہوا آگے بڑھا۔ اپنے ایک ہاتھ کو اور آگے بڑھایا بریف کیس کے قریب پہنچنے لگا لیکن وہ لرزتا ہوا ہاتھ یک بار گی بے دم ہو کر زمین بوس ہو گیا۔

ایک دیرینہ انتقام کی آگ ذرا ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس نے بریف کیس کو اٹھایا۔ لہو اور مٹی میں لتھڑی لاش کو بڑی آسودہ نظروں سے دیکھا پھر وہاں سے چل پڑا۔ شام کے چھ بجے تک اپنے کلینک میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھ کر پوچھا "کہاں گئے تھے؟ کیا کرتے پھر رہے ہو ؟"

"آپ فکر نہ کریں آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"اور آگیا تو ؟"

اس نے بستر کے نیچے سے بریف کیس نکال کر اسے ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس میں دو لاکھ روپے ہیں آپ جتنی رقم چاہیں نکال لیں میں اعتراض نہیں کروں گا۔ باقی رقم میری ہے۔ فی الحال یہ بریف کیس آپ کے پاس رہے گا۔"

ڈاکٹر نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر دروازے کو بند کرنے کے بعد بریف کیس کو کھول کر دیکھا۔ واقعی اس میں نوٹوں کی گڈیاں ہی گڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے حیرانی سے پوچھا "کیا میں پورا بریف کیس اپنے ساتھ لے جاؤں ؟"

"ہاں ضرور۔"

"کیا تمھیں مجھ پر اعتماد ہے ؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "میں جن ہواؤں میں اڑ رہا ہوں وہاں دو لاکھ روپے کی اہمیت نہیں ہے اسے آپ لے جائیں۔ کم از کم ایک لاکھ روپے آپ کے پاس میری امانت رہیں گے۔ میں ملک سے باہر جانے والا ہوں جب بھی واپس آؤں گا، یہ رقم آپ سے لے لوں گا۔"

وہ بریف کیس اٹھا کر لے گیا کرم داد آرام سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ بہت خوش تھا تصور میں دیکھ رہا تھا۔ کبھی اسے نظر آتا تھا، اس کا باپ لہو اور مٹی میں لتھڑا ہوا ہے دوسرے ہی لمحے ٹھیک اسی جگہ اس کا دشمن مٹی اور لہو میں لتھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ خوش ہو کر بے اختیار مسکرانے لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی اور بتیسی دکھائی دینے لگتی تھی اس رات وہ بڑے سکون سے گہری نیند سوتا رہا۔ دوسری صبح پولیس والے آدھمکے۔ انسپکٹر نے کہا "ہم تمھارے گھر گئے تھے، تمھارے پڑوسی نے بتایا" اس اسپتال میں ہو۔ تمھارے تو بڑے ٹھاٹھ ہیں، اتنے مہنگے اسپتال میں علاج کرا رہے ہو۔"

"انسپکٹر صاحب! کیا آپ مجھے اس لیے پکڑنے آئے ہیں کہ ایک غریب آدمی اتنے مہنگے اسپتال میں اپنا علاج کرا رہا ہے ؟"

وہ غرا کر بولا "ہم پوچھنے آئے ہیں کل تم کہاں تھے ؟"

"یہاں کے ڈاکٹروں اور نرسوں سے پوچھ لیجیے۔ میں اسی اسپتال میں پچھلے دو دنوں سے ہوں۔"

ڈاکٹر کے کمرے میں ریحانہ کا بڑا بھائی میز پر گھونسہ مارتے ہوئے ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا "یہ ناممکن ہے۔ وہ یہاں نہیں تھا۔ اس نے چک نمبر ۲۱۲ میں پہنچ کر واردات کی ہے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔"

ڈاکٹر نے سخت لہجے میں کہا "مسٹر! ہوش میں رہ کر بات کرو۔ تم میرے اسپتال کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے مریض اسپتال سے اٹھ کر میلوں دور جاتے ہیں اور قتل کی واردات کے بعد واپس اسپتال آجاتے ہیں۔ کیا ابھی پولیس انسپکٹر نے یہ نہیں بتایا کہ میں کتنی عزت اور شہرت کا مالک ہوں۔ اگر تم میرے اسپتال کے خلاف کوئی بات کرو گے تو میں تمھارے خلاف قانونی کارروائی کروں گا۔"

ریحانہ کو پورا یقین تھا کہ اس کے باپ کے قتل میں کرم داد کا ہاتھ نہیں ہے۔ وہ خود دن کے ساڑھے بارہ بجے تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا کرم داد اتنی جلدی اسپتال سے اٹھ کر جائے گا اور میلوں دور جا کر واردات کرنے کے بعد واپس آجائے گا۔ کبھی اس کے دل میں شبہ پیدا ہوتا تو وہ اس شبہے کو دل و دماغ سے جھٹک دیتی تھی۔

اس کے دونوں بھائی تلملا کر رہ گئے۔ دشمن کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل رہا تھا۔ کوئی گواہ نہیں تھا۔ اسی رات فون کی گھنٹی بجنے پر ریحانہ کے بڑے بھائی نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو۔"

کرم داد کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی "آج سے بارہ برس پہلے چک نمبر ۲۱۲ میں ایک کسان کا قتل ہوا تھا۔ وہاں کے تھانیدار اور سپاہیوں نے گواہی دی کہ تمھارا باپ بے گناہ ہے۔ قاتل نہیں ہے۔ وہ تھانیدار کی نظروں کے سامنے صبح بس میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا تھا۔ کتنی زبردست گواہی تھی ۔۔ اس کی بے گناہی کا ثبوت خود قانون کے محافظوں نے پیش کیا تھا اب تم سر پٹختے رہو۔ تمھارے شیطان باپ نے جو سبق مجھے پڑھایا تھا، میں نے اسے دہرا دیا۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ وہ ہیلو ہیلو کہتا چیختا ہی رہا۔ یہ تو ازل سے ہوتا آیا ہے، جب بھی ظلم ہوتا ہے تو صرف مظلوم نہیں چیختے ۔ ظلم اگر ظالم پر ہو تو وہ بھی چیختا ہے۔ وہ بھی چیخ رہا تھا۔ قسمیں کھا رہا تھا کہ کرم داد کو بری طرح اذیتیں دے دے کر مارے گا۔

اس نے سوچ لیا تھا، ستائیس تاریخ کو ریحانہ اسمگلنگ کا مال لے کر جائے گی۔ اس کے بعد اسے اطمینان ہو جائے گا۔ پھر وہ کرم داد کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا لیکن ستائیس تاریخ کے بعد پتا چلا کہ وہ چھبیس تاریخ کو ہی ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ اس کے فرشتے بھی سمجھ نہیں سکتے تھے کہ خود اس کی بہن ان کے دشمن سے مل کر کس طرح فراڈ کر رہی ہے۔

ریحانہ اور کرم داد نے اپنے منصوبے پر بڑی کامیابی سے عمل کیا اور بڑی کامیابی سے وہ خشکی کا سفر کرتے ہوئے پیرس پہنچ گئے۔ ریحانہ کے بڑے بھائی کا نام رب نواز اور چھوٹے کا شاہنواز تھا۔ انھوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ ریحانہ اپنی آنٹی وغیرہ کے ساتھ کار میں سفر کرتے ہوئے پیرس پہنچے گی وہاں چھوٹا بھائی شاہنواز ان کے استقبال کے لیے موجود رہے گا۔

دونوں بھائی جانتے تھے کہ مغربی ممالک میں کس طرح منشیات کو اچھے داموں فروخت کرنا چاہیے اور ان ہیروں کو کس شخص کے پاس پہنچانا چاہیے۔ انھوں نے جتنا لگا ریحانہ کو ایسے

لوگوں کے پتے نوٹ کرا دیے تھے کبھی غیر متوقع حالات پیش آتے ہیں ایسے میں شاہنواز اور ریحانہ کی ملاقات پیرس میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اب دونوں بھائی رب نواز اور شاہنواز کی اطلاع کے مطابق یہی ہو رہا تھا۔ اطلاع ملی تھی کہ ریحانہ کو کار سمیت اغوا کیا گیا ہے۔ اگر اغوا میں مخالف اسمگلروں کا ہاتھ ہوگا تو وہ یقیناً ریحانہ پر تشدد کریں گے اور معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ اسمگلنگ کا مال کس طرح لے جا رہی ہے و مال کہاں چھپایا گیا ہے؟ بہر حال انھیں امید نہیں تھی کہ ریحانہ کار سمیت انھیں مل سکے گی۔

تاہم شاہنواز پیرس پہنچا ہوا تھا اور رب نواز پاکستان میں کوئی اچھی خبر سننے کا منتظر تھا۔

ریحانہ اور کرم داد نے پیرس پہنچ کر سب سے پہلے ایک گیراج کرائے پر حاصل کیا تھا۔ کار کو وہاں لاک کر دیا تھا۔ پھر ہوٹل لاروش میں اپنے لیے ایک کمرہ لیا۔ وہیں سے انھوں نے فون کے ذریعے متعلقہ لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان معاملات میں ریحانہ کے مقابلے میں کرم داد اناڑی تھا کس طرح سودا کیا جاتا ہے۔ کس طرح لوگوں سے گفتگو کی جاتی ہے اسے ذرا بھی علم نہ تھا۔ وہ تمام راستے تہران سے پیرس تک اسے انگریزی کے خاص خاص جملے سکھاتی آئی تھی اور اسے کار ڈرائیور کرنے کی ٹریننگ بھی دیتی رہی تھی۔

اس نے ٹیلیفون کے ذریعے ایک مخصوص نمبر پر رابطہ قائم کیا۔ دوسری طرف سے جواب ملتے ہی اس نے کہا "میں مسٹر گوڈز یلا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم کون ہو اور کیا بات کرنا چاہتی ہو؟"

"گوڈز یلا سے صرف اتنا کہہ دو۔ اے گرل ود گولڈ ڈسٹ فرام ایسٹ (ایک لڑکی مشرق سے چرس کے ساتھ آئی ہے)"

ہولڈ آن کے لیے کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی "کون ہو تم؟"

ریحانہ نے کہا "میں اپنے ساتھ گولڈ ڈسٹ لائی ہوں۔"

"تمھیں میرا نام اور پتا کیسے معلوم ہوا؟"

"ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، ایک دوسرے کو پہچاننے میں ڈھونڈ نکالنے میں دیر نہیں لگتی میرے پاس اچھا خاصا مال ہے دیکھو گے تو آنکھ کھل جائے گی۔ مجھ سے ملاقات کرنا پسند کرو گے، یا مجھے اپنے پاس بلاؤ گے؟"

"تم کہاں ہو؟"

"ہوٹل لاروش، کمرہ نمبر سات۔"

"جواب کا انتظار کرو کسی وقت بھی فون پر ابتدائی معاملے پر بات ہو سکتی ہے۔"

"ویٹ اے منٹ۔ میں جانتی ہوں پہلے تم ہمارے متعلق تفتیش کرو گے اس کے بعد ہم سے گفتگو کرو گے لیکن میری ایک گزارش ہے۔"

"بولو، کیا بات ہے؟"

"تمھارا پاکستانی ڈیلر شاہنواز یہاں آیا ہوا ہے۔ اسے ہمارے معاملات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔"

"او، آئی سی۔ کیا یہ وہی مال ہے جو تہران میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے؟"

"جی ہاں، آپ اپنے ڈیلر کو اہمیت دیں گے یا اس مال کو جو ہمارے ذریعے ملے گا؟"

"ہم مال چاہتے ہیں آدمی کی صورت نہیں دیکھتے۔ اگر وہ مال شاہنواز کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ کیا تم لاروش میں تنہا ہو؟"

"میرا بوائے فرینڈ بھی ہے۔"

"کیا تم اس میدان میں نئی ہو؟"

آج سے پانچ برس پہلے ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ آئی تھی۔ ہماری ملاقات دریائے سین کے کنارے گاڈ زیلا بوٹ میں ہوئی تھی۔"

"او، آئی سی۔ کیا تم بے بی ریحانہ ہو؟"

ریحانہ نے حیرانی سے کہا "آپ کی یادداشت قابلِ رشک ہے۔"

"بے بی! اتنی لمبی باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی پہلے ہی اپنا نام بتا دیا ہوتا۔ آدھے گھنٹے کے اندر میرا ایک آدمی وہاں پہنچے گا۔ اس کے ساتھ چلی آنا۔"

آدھے گھنٹے کے بعد وہ کرم داد کے ساتھ گوڈز یلا کے پاس پہنچی۔ سارے معاملات طے ہو گئے۔ شام تک انھیں فرانسیسی فرانک مل گئے جن کی مالیت تقریباً پونے دو لاکھ روپے تھی۔ پیرس کے خوبصورت شہر کی خوبصورت رات ان کے لیے تھی۔ خوب تفریح کرتے رہے ہنستے بولتے رہے کھاتے پیتے رہے۔ نائٹ کلب میں جی بھر کر رت جگا مناتے رہے۔ دوسری صبح ریحانہ نے فون کے ذریعے دوسرے ڈیلر سے رابطہ قائم کیا۔

رابطہ قائم ہونے پر اس نے کہا "میں مسٹر جیکی وائز سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا "تم کون ہو کیا بات کرنا چاہتی ہو ان سے؟"

"مسٹر جیکی وائز سے صرف اتنا کہہ دو ڈائمنڈ گرل فرام پاکستان۔"

ہولڈ آن کرنے کے لیے کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیکی وائز کی آواز سنائی دی "ہیلو، تم کون ہو اور کوڈ ورڈز کیسے جانتی ہو؟"

"میں وہی ہوں جس کے ذریعے تمھیں مال ملنے والا تھا۔ فرق اتنا ہے

کہ وہ مال تہران میں چوری ہو گیا۔ ڈیلر بدل گئے ہیں میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم پرانے ڈیلر کو اہمیت دو گے یا مال لینے کے لیے نئے ڈیلر کو؟"

"ہم مال کا لین دین کرتے ہیں ڈیلروں سے رشتے داری نہیں کرتے۔"

"میں ہوٹل لاروش کے کمرہ نمبر سات میں ہوں۔"

"انتظار کرو — ہمارا آدمی آ رہا ہے۔"

"ویٹ اے منٹ۔ کیا میں بھروسہ کر سکتی ہوں کہ یہ معاملہ راز میں رہے گا۔ حتیٰ کہ مسٹر شاہنواز کو بھی اس کا علم نہیں ہوگا۔"

"شاہنواز تو بہت دور کی بات ہے میرے دستِ راست کو بھی معاملے کا علم نہیں ہوگا۔"

ایک گھنٹے کے اندر وہ ایک بہت ہی خوبصورت کار میں بیٹھ کر ایک اتنی بڑی کوٹھی میں پہنچے جو قلعہ نما تھی۔ مسلح گارڈز مخصوص وردی میں تھے۔ جب یہ دونوں کار سے اتر کر اس کوٹھی میں داخل ہوئے تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی عالیشان محل میں پہنچ گئے ہوں۔ فرش چکنا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے جیسے کیلے کے چھلکوں پر سے گزر رہے ہوں۔ دیواریں آرائشی سامان سے سجی ہوئی تھیں کہیں کہیں دیواروں پر ایسے آلات نظر آتے تھے جو انھوں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ ایک شخص کی راہنمائی میں طویل راہداری سے گزرتے ہوئے ایک بڑے سے ہال میں پہنچے لیکن دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گئے۔

ہال کے وسط میں دائرہ نما اسٹیج تھا۔ اسٹیج سے پرے وسیع و عریض دیوار پر فش ایکوریم بنے ہوئے تھے۔ ایکوریم میں مچھلیاں تیرتی ہیں لیکن وہاں جل پریاں تیر رہی تھیں۔ یوں کہنا چاہیے دس بارہ فٹ کے چوکور شیشے کے مختلف مرتبان تھے، صاف اور شفاف شیشوں کے اندر پانی بھرا ہوا تھا اور اس شفاف پانی میں تیرتی ہوئی جل پریاں ایسی دل کش لگ رہی تھیں کہ نظر ہٹانا محال ہو رہا تھا۔

ہال کی دوسری دیوار پر ایک بڑا سا ٹی وی اسکرین تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا کمپیوٹر اسکرین بھی تھا اور طرح طرح کے آلات وہاں نصب کیے گئے تھے۔ ہال کے تیسری طرف ایک بہت بڑا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ ایسا اسٹیج جہاں ڈرامے کیے جاتے ہیں، اس وقت وہاں سنہری ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ ہال کے وسط میں جہاں دائرہ نما اسٹیج تھا۔ اس اسٹیج کے بالکل وسط میں ایک بڑی سی ریوالونگ چیئر رکھی ہوئی تھی۔ اس گھومنے والی کرسی کا رخ فش ایکوریم کی طرف تھا اور اس کی پشت اس دروازے کی طرف تھی جہاں سے ریحانہ اور کرم داد داخل ہو رہے تھے۔ اس کرسی کے ایک طرف ایک بہت ہی خوش پوش جوان ہاتھ باندھے کھڑا ہوا تھا جیسے کرسی پر اُس کا کوئی آقا بیٹھا ہوا ہو اور وہ اس کے سامنے باادب کھڑا ہو۔

اس جوان نے ادب سے کہا "سر! مس ریحانہ اپنے دوست کے ساتھ آ چکی ہیں۔"

وہ ریوالونگ چیئر آہستہ آہستہ گھومنے لگی۔ گھومتے گھومتے اس رخ پر ٹھہر گئی جدھر ریحانہ اور کرم داد آ کر ٹھہر گئے تھے۔ وہ دونوں دائرہ نما اسٹیج سے ذرا دور تھے لیکن کرسی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس پر کوئی نہیں تھا، وہ خالی تھی لیکن اچانک ہی وہ خالی کرسی بولنے لگی "مس ریحانہ! راز آخر راز ہوتا ہے۔ پھر ہمارے معاملے میں تمھارے اس ساتھی کا کیا کام؟"

ریحانہ اور کرم داد حیرانی سے خالی کرسی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ واضح الفاظ میں بول رہی تھی، مردانہ آواز میں بول رہی تھی۔ ریحانہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا "جناب! یہ میرے لائف پارٹنر بھی ہیں اور بزنس پارٹنر بھی اس لیے اپنے ساتھ لائی ہوں۔ ساتھ لانے کی ایک اہم وجہ ہے۔ میں آپ کے لیے جو مال لائی ہوں اس کے بدلے آپ سے کچھ سہولتیں چاہتی ہوں۔"

"کیسی سہولتیں؟ واضح بات کرو۔"

"میں اپنے لائف پارٹنر کے ساتھ پیرس کی شہریت حاصل کرنا چاہتی ہوں اور اپنے ساتھی کو کسی ایسے ادارے میں پہنچانا چاہتی ہوں جہاں یہ انگریزی، فرنسیسی زبان سیکھنے کے علاوہ کار ڈرائیونگ اور ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت حاصل کر سکے۔"

"یہ تمام سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ مال کہاں ہے؟"

ریحانہ نے کن انکھیوں سے اس نوجوان کو دیکھا پھر کہا۔ "جناب! یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ ہمارے سامنے ایک شخص موجود ہے یا دو ہیں؟"

ریوالونگ چیئر نے کہا "اس کا نام جیکی وائز ہے۔ اس سے تم فون پر باتیں کر چکی ہو۔ یہ میرا دستِ راست ہے۔ اس کے سامنے تم اپنا کوئی بھی راز بیان کر سکتی ہو۔"

"جناب! مال اس وقت میرے پاس موجود ہے میں ابھی بتاتی ہوں لیکن یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں رقم کتنی ملے گی؟"

"جو رب نواز اور شاہنواز سے طے ہو چکا ہے وہی تمھیں ملے گا لیکن تم نادان ہو۔ یہاں پہنچ کر سودا کر رہی ہو۔ کیا ہم جبراً وہ مال چھین کر نہیں رکھ سکتے؟"

"آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں بے یار و مددگار ہوں صرف آپ کو اپنا ہمدرد جان کر آئی ہوں۔"

"تم جو چاہتی ہو ملے گا۔ مال پیش کرو۔"

وہ اپنے بائیں بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "وہ

میرے یہاں چھپے ہوتے ہیں۔ آپریشن کے بعد نکالے جا سکتے ہیں۔"

"ویری گڈ۔۔۔ بزنس از ڈن۔"

اسی وقت میز کی سطح سے ٹک ٹک کی آواز سنائی دی۔ اس کے دستِ راست جیکی وائز نے آگے بڑھ کر ریموٹ بٹن کو آن کیا۔ پھر کہا۔ "ہاں بولو۔"

کہیں دوسری طرف سے آواز آئی۔ "سر! ہمیں ملنے والی اطلاعات درست ہیں۔ للی نے ہم سے فراڈ کیا ہے۔ اس کا ثبوت مل چکا ہے۔"

جیکی وائز نے سوالیہ نظروں سے کرسی کی جانب دیکھا۔ کرسی نے کہا۔ "اس سے کہو ثبوت بیان کرے۔ للی سے کہو، اپنے کانوں میں ائرفون لگالے۔"

جیکی وائز نے ایک بٹن کو آن کیا۔ سامنے ہی ایک فش ایکوریم کے اندر کا بلب جلنے بجھنے لگا۔ اس کے اندر تیرنے والی ایک جل پری نے سامنے جیکی وائز کی طرف دیکھا۔ جیکی نے سگنل کے ذریعے ..... اسے بتایا کہ فش ایکوریم کی چھت سے لٹکے ہوئے ائرفون کو استعمال کیا جائے۔

لڑکی نے ہدایت کے مطابق اسے چھت پر سے کھینچ کر کانوں سے لگا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میز پر سے آواز آنے لگی۔ "سر! رپورٹ یہ ہے کہ للی پچھلی رات شاہنواز کے ساتھ تھی۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے ہاں نے کوئی فراڈ کیا اور وہ مال تہران سے نکل کر براہِ راست ہاس تک پہنچ گیا تو وہ شاہنواز کو اطلاع دے گی یعنی وہ ایک ٹٹ پونجیے کی خاطر ہمارے خلاف کام کر رہی ہے۔"

آواز ابھر رہی تھی اور دوسری طرف فش ایکوریم کے اندر للی سن رہی تھی۔ وہ دہشت سے زرد پڑ گئی تھی۔ ریوالونگ چیئر اس ایکوریم کی طرف گھوم کر کہہ رہی تھی۔ "للی! ایکوریم کی چھت کو لاک کر دیا گیا ہے تم باہر نہیں نکل سکو گی۔"

وہ تڑپ کر تیرتی ہوئی چھت کی طرف گئی اور اس پر ہاتھ مارنے لگی۔ اسے اوپر کی طرف دھکا دینے لگی تاکہ وہ اٹھ جائے۔ لیکن چھت کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ دوسری جل پریاں تیرنے کے دوران سانس لینا چاہتیں تو اوپر چھت کی طرف پہنچ جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر تک سانس لیتی تھیں پھر واپس آ کر تیرنے لگتی تھیں۔ یعنی اس پُراسرار سنڈیکیٹ کا سربراہ جو بظاہر خالی کرسی نظر آتا تھا وہ ایکوریم میں یہ تماشے دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا۔۔۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے وہ جنونی تھا۔ دوسروں کو شدید ترین اذیتیں پہنچا کر تسکین حاصل کرتا تھا۔

ریحانہ کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ کرم داد کی باچھیں کھل رہی تھیں جیسے من پسند تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب للی شیشے کے پاس آ کر کرسی کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتی تھی۔ پانی میں ہاتھ پاؤں مار کر زندگی کی بھیک مانگتی تھی تو کرم داد کو ایسے لگتا تھا جیسے عیدا پہلوان زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو جیسے وہ ابھی ابھی اپنی سوتیلی ماں کو خنجر کی نوک میں پرو کر اس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ رہا ہو۔

وہ بے چاری پانی کے اندر کتنی دیر تک سانس روک سکتی تھی۔ آخر اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ اس کی ناک سے اور منہ سے پانی کے بلبلے نکلنے لگے۔ ریحانہ یہ منظر نہ دیکھ سکی۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ کرم داد دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کرسی بھی دیکھ رہی تھی۔ اگر اس کی آنکھیں ہوں گی تو وہ بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو گی۔ اس کرسی والے کا اور کرم داد کا مزاج ایک تھا۔ وہ دونوں ہی جنونی تھے۔ کرم داد کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب وہ مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ دانت پیس رہا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ "مر گئی۔ ہاہا مر گئی۔ جو اپنے محبوب سے بے وفائی کرے اور اپنے آقا سے غداری کرے اس کو مارنے کے بعد اور مارنا چاہیے۔ اگر یہ بیکر ہتھے چڑھتی تو میں اس کی لاش کو۔"

وہ قہقہے لگا رہا تھا اور بول رہا تھا۔ ریوالونگ چیئر اس کی طرف گھوم گئی جیسے اسے دیکھ رہی ہو سمجھ رہی ہو پھر اس نے پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "کرم داد۔"

"کرم داد! تمھاری خواہش پوری ہو گی اسے مارنے کے بعد بھی مارا جائے گا۔ دیکھو۔ خوب دل چسپی سے دیکھو۔"

یہ کہہ کر ریوالونگ چیئر اپنے دستِ راست جیکی کی طرف گھوم گئی پھر اس سے کہا۔ "ایسڈ (تیزاب)۔"

اس کے ساتھ ہی جیکی نے میز کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک بٹن کو دبایا۔ ایکوریم کے اندر للی کا بے جان جسم پانی میں تیر رہا تھا۔ وہ پانی کم ہونے لگا۔ شاید ایکوریم کے نیچے سے نکاسی کا انتظام تھا۔ جب وہ کافی حد تک کم ہو گیا تو جیکی نے اس بٹن کو آف کر کے دوسرا بٹن دبایا جس کے پاس ایسڈ لکھا ہوا تھا۔

اب پانی آہستہ آہستہ ابل رہا تھا۔ اس میں تیزاب کی آمیزش ہو رہی تھی پھر وہ زیادہ ہی ابلنے لگا۔ ریحانہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ للی کے جسم کو تیزاب میں گلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کرم داد وحشیانہ انداز میں آنکھیں پھاڑے منہ کھولے دیکھ رہا تھا اور ریوالونگ چیئر اس کی طرف گھوم کر اسے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ریحانہ نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر ایکوریم کی طرف دیکھا۔ اب وہاں للی نہیں تھی۔ کہاں گیا اس کا حسن؟ کہاں گیا

اس کا شباب؟ وہاں تو ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تیزاب ملے ہوئے گدلے پانی میں تیر رہا تھا۔ پھر وہاں کا بلب بجھ گیا۔ ایکوریم میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ڈھانچہ اندھیرے میں گم ہو گیا۔

کرم داد تاریک ایکوریم کو ابھی تک یوں دیکھ رہا تھا جیسے موت کی تاریکی میں گہری دل چسپی سے جھانک رہا ہو۔ ریوالونگ چیئر اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس چیئر نے کہا۔ "جیکی!"

جیکی نے فوراً اٹینشن ہو کر کہا۔ "یس سر!"

"یہ شخص ہمارے کام کا ہے۔ اسے ٹیررٹریننگ سینٹر (دہشت گردی کے تربیتی مرکز) میں رکھا جا سکتا ہے۔"

جیکی اسی طرح اٹینشن تھا۔ اس نے ریوالونگ چیئر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے حکم کے مطابق اسے ٹی ٹی سی ہی رکھا میں رکھا جائے گا، ماسٹر کی!"

❦

میں نے بلیک شیڈ وسے حاصل کیے ہوئے کیسٹ کے ذریعے کرم داد کی آواز سنی تھی پھر اس کے دماغ میں پہنچ کر اس کی ہسٹری معلوم کی تھی جو آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔

اب جب کہ میں کرم داد کے دماغ کو پڑھ رہا تھا تو دو برس گزر چکے تھے۔ ان دو برسوں میں اسے تجربات کی بھٹی سے گزار کر کندن بنا دیا گیا تھا۔ اس پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ دہشت گردی کی تربیت دینے والے پہلے ہی بھانپ لیتے ہیں کہ کون شخص کتنی جلدی ان کے مقاصد کے مطابق ڈھل سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دہشت گردی کے تربیتی مراکز میں پہنچانے سے پہلے انھیں جانچنے پرکھنے کی مخصوص کسوٹیاں ہوتی ہیں۔

مثلاً کرم داد جیسے لوہاروں کے لیے یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ فولادی مزاج رکھتے ہیں زیادہ محنت کرتے ہیں۔ زیادہ شراب پیتے ہیں۔ گرم مزاج ہوتے ہیں۔ فوراً ہی لڑ پڑتے ہیں وہ مخالفت کرنے والے کو دلائل سے کم اور ہتھیاروں سے زیادہ قائل کرتے ہیں۔ ان کا جسم سخت دھات کا لگتا ہے۔ لوہا پگھلانے والی جہنم کی آگ میں تپتے رہتے ہیں۔ جھلستی آنچ میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ ان کی جسمانی کھال گینڈے کی طرح سخت ہو جاتی ہے۔

کرم داد بالکل ایسا ہی تھا۔ ایک تو حالات نے اسے تند خو بنا دیا تھا۔ دوسرے لوہار کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد وہ اور سخت ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بچپن کی بے بسی اور باپ کی موت پر کڑھتا رہتا تھا۔ ایسے ہی ناراض لوگ بڑی آسانی سے دہشت گردوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

دو برسوں میں وہ فر فر انگریزی بولنے لگا۔ فرانسیسی بڑی حد تک سمجھتا بھی تھا اور بولتا بھی تھا۔ موٹر سائیکل سے لے کر ہیوی گاڑیاں طوفانی رفتار سے چلاتا تھا۔ اسے زندگی کی پروا ہی نہیں تھی۔ موت سے نہیں ڈرتا تھا اور اسے تربیت دینے والے یہی چاہتے تھے۔ اگر کوئی ٹریننگ کے دوران مر بھی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کوئی دوسرا آلۂ کار بننے کے لیے پہنچ جاتا تھا۔ کرم داد بڑی جی داری سے یہ سب کچھ سیکھ رہا تھا۔ ننھے پستول سے لے کر بڑی بڑی اسٹین گنوں کو استعمال کرنے کا ہنر بھی آ رہا تھا۔

مختصر یہ کہ جس طرح کسی کارخانے سے کوئی چیز پوری طرح تیار ہو کر بازار میں فروخت کرنے کے لیے پہنچائی جاتی ہے، اسی طرح کرم داد پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اب کسی دن کوئی بھی حکومت اسے اپنے مقاصد کے لیے کرائے پر حاصل کر سکتی تھی۔ ماسٹر کی سنڈیکیٹ کا یہی خفیہ کاروبار تھا۔ ماسٹر کی اپنے تربیتی مراکز میں مختلف قسم کے دہشت گرد تیار کرتا تھا اور کسی بھی ملک سے اچھا خاصا معاوضہ لے کر اپنے مراکز کے چنیدہ چنیدہ کرم دادوں کو ان کے حوالے کر دیتا تھا۔ یہ اپنا کام پورا کرنے کے بعد پھر اس تربیتی مراکز میں واپس آ جاتے تھے یا وہ اپنے ہی ملک میں رہنا پسند کرتے تو اس کی بھی اجازت تھی۔ شرط یہ تھی کہ وہ تاحیات ماسٹر کی سنڈیکیٹ سے رابطہ رکھیں اور ان کے کام آتے رہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کچھ میرے ہم وطن جوان دہشت گردی کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ اور آئندہ شاید اپنے ہی وطنِ عزیز کے خلاف دوسرے ممالک کے آلۂ کار بننے والے تھے۔ ایک کرم داد کا ذکر کر چکا ہوں باقی تین اور جوان ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ یہ چاروں اپنے اپنے تربیتی مرکز سے نکل کر میرے وطن میں تخریبی کارروائی کے لیے جانے ہی والے ہیں۔ جب تک وہ وہاں پہنچیں تب تک آپ ان کے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لیں۔۔۔ یہ حقیقت سامنے ہونا چاہیے کہ ہمارے جوان اگر گمراہ ہوتے ہیں تو انھیں گمراہ کرنے میں کن لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ حالات کیسے ہوتے ہیں جب اپنے وطن سے محبت کرنے والے اپنے ہی وطن کے خلاف اقدامات کرنے پر دوسروں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

میں نے ریکارڈر کو آن کیا پھر کیسٹ سے ایک آواز ابھرنے لگی۔ میں دوسرے ہی لمحے اپنے ایک بھائی دلاور خان کے دماغ میں تھا۔

دلاور خان کا باپ زور آور خان معمولی سا زمیندار تھا۔ اسے سیاست سے دل چسپی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن تھی۔ پہلے وہ کوشش کر کے بی ڈی ممبر بنا پھر چیئرمین بن گیا۔ اس نے اپنے علاقے میں ایک جماعت بنائی جس کا نام پیپلز کمیٹی فار ایوب تھا۔ اس نے ایوب خان کو انتخابات میں کامیاب بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کامیاب ہوا۔ اس کی خدمات سے خوش ہو کر اسے ٹرانسپورٹر کی حیثیت سے لائسنس جاری کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے ہیوی ٹرک پشاور سے کراچی تک چلنے لگے۔

دلاور خان ایک ذہین طالب علم تھا۔ اس کے دل میں وطن کی محبت تھی لیکن محض دل میں محبت ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دماغ میں پختگی لازمی ہے۔ ہمارے ہاں تعلیمی نصاب ایسا نہیں ہے کہ بچپن ہی سے بچوں کے دل و دماغ میں وطن کی محبت اور اس کی اہمیت کو نقش کیا جائے۔ ہمارے طلباء و طالبات کی قوتِ فیصلہ کو کمزور بنانے میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے پھر ہمارے وہ بزرگ جو راتوں رات امیر بننے کے راستے پر چل نکلتے ہیں، اس کا اثر بھی نوجوان نسل قبول کرتی ہے۔

ایک دن پشاور کے ایک ٹرانسپورٹر گل باز خان نے کہا۔ "دلاور! تم کراچی ٹرین کے ذریعے جاتے ہو۔ طیارے سے بھی جا چکے ہو، کبھی ہائی وے سے سفر کیا ہے؟ تمہارے باپ کی تو پچیس گاڑیاں چلتی ہیں۔"

دلاور نے کہا "میرے بابا کہتے ہیں، وقت بچایا کرو۔ جب بھی میں لاہور یا کراچی جاتا ہوں تو میرے لیے کسی فلائیٹ کی سیٹ ریزرو کرا دیتے ہو۔ میں نے کئی بار کہا تفریح کے لیے اپنے کسی ٹرک میں بیٹھ کر کراچی جاؤں گا مگر۔۔۔۔"

گل باز نے ہنستے ہوئے کہا "تمہارا باپ تمہیں کبھی ٹرک میں جانے نہیں دے گا۔"

"کیوں نہیں جانے دے گا؟"

"آزما کر دیکھ لو۔ تم تو اس کے لاڈلے بیٹے ہو، ضد کر سکتے ہو۔"

اس نے اپنے باپ سے ضد کی، باپ نے کہا "ایک دن میرا تمام کاروبار تم سنبھالو گے لیکن ابھی وہ دن نہیں آیا ہے خوب تعلیم حاصل کرو۔ کالج کی سیاست میں حصہ لو۔ میں بعد میں فیصلہ کروں گا کہ تمہیں سیاست میں رہنا چاہیے یا کاروبار میں۔"

"بابا! میں کاروبار اور سیاست کی بات نہیں کر رہا ہوں میں تو صرف کراچی جانا چاہتا ہوں میں اپنے کسی ٹرک میں بیٹھ جاؤں گا۔"

"ہماری سڑکیں محفوظ نہیں ہیں، آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں پھر یہاں سے کراچی تک کتنے ہی بدنام ڈاکو ہیں جو بھرے ٹرک کو لوٹ کر چلے جاتے ہیں تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی اس لیے میں نہیں چاہتا کہ تفریح کی خاطر کوئی خطرہ مول لو۔"

"کوئی پٹھان اپنی اولاد کو خطرے سے نہیں ڈراتا۔ بزدلی کا سبق نہیں دیتا۔ آپ جانتے ہیں میرا ریوالور کا اور رائفل کا نشانہ کتنا پکا ہے۔ میں مرد ہوں، جوان ہوں۔ اپنی حفاظت آپ کرنا جانتا ہوں۔"

"خواہ مخواہ ضد نہ کرو۔ تمہیں کراچی جانا ہے تمہارے لیے کسی طیارے میں سیٹ ریزرو کرا دی جائے گی۔"

دلاور نے کچھ سوچ کر کہا "میں ٹرین کے ذریعے جاؤں گا۔"

"چلو ٹرین میں سیٹ ریزرو کرا دیتے ہیں۔"

لیکن وہ ٹرین میں بیٹھ کر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن گیا، پھر وہاں سے ٹرک کے اس اڈے پر پہنچ گیا جو پشاور کے بعد دوسرا اڈہ تھا۔ اس کے ڈرائیور اور کلینر نے اسے دیکھ کر حیرانی ظاہر کی۔ اس نے کہا "بابا سے کچھ نہ کہنا میں تمہارے ساتھ کراچی تک جاؤں گا۔ اگر کسی نے چغلی کھائی تو اس کی نوکری بھی جائے گی اور میری دشمنی بھی مہنگی پڑے گی۔"

وہ ٹرک کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر اس سفر پر روانہ ہوا۔ لیکن دریائے اٹک سے کچھ پہلے اچانک چاروں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ ڈرائیور نے ایک کنارے گاڑی روک لی۔ اپنی سیٹ کے نیچے سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا "یہ گل باز کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہائی وے کا بے تاج بادشاہ بننے کے خواب دیکھتا رہتا ہے لیکن تمہارا باپ اسے ہمیشہ شکست دیتا آیا ہے۔"

باہر سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں سیٹ کے پاس دبک گئے تھے۔ دلاور نے بھی اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ کبھی کبھی کھڑکی کی طرف اٹھ کر جوابی فائر کرتا تھا۔ یہ مقابلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ اچانک ہی پولیس کی ایک بھاری جماعت فائر کرتے ہوئے ایک گاڑی میں پہنچ گئی۔ ٹرک پر فائر کرنے والے وہاں سے فرار ہو گئے۔ جب پولیس کی گاڑی ٹرک کے پاس پہنچی تو سناٹا چھا چکا تھا۔ کوئی فائر کرنے والا نہیں تھا۔ دلاور نے گاڑی سے نکل کر پولیس انسپکٹر سے کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ اگر آپ نہ آتے تو یہ لوگ یقیناً ہمیں نقصان پہنچاتے۔"

انسپکٹر نے خشک لہجے میں کہا "میں تمہارے ٹرک کا مال چیک کرنا چاہتا ہوں۔"

دلاور نے حیرانی سے پوچھا "وہ کیوں؟"

"ہمیں پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی کہ تمہارا ٹرک یہاں سے گزرنے والا ہے اور ڈاکو اسے گھیرنے والے ہیں۔"

دلاور نے حیرانی سے کہا "جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ہم پشاور سے باقاعدہ بک ہونے والا مال لے جا رہے ہیں۔ اس میں اسمگلنگ کا کوئی سامان نہیں ہے۔"

"تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا ہم اپنی تسلی کریں گے۔"

انھوں نے اپنی تسلی کے لیے جب چیکنگ شروع کی تو دلاور گم صم کھڑا حیرانی سے تکتا رہا۔ ٹرک کے اوپری حصے اور سامنے والے حصے میں وہ مال تھا جو پشاور سے باقاعدہ بک کیا گیا تھا۔ اسے ہٹا کر دیکھنے کے بعد وہاں کارتوس کی پیٹیاں اور مختلف قسم کی رائفلیں برآمد ہوئیں۔

ایک ذہین طالب علم جو ہر سال اول آتا تھا، اسمگلر

کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر حوالات پہنچا دیا گیا۔ اس کے ڈرائیور نے رشوت دے کر اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ نوٹوں کی گڈیاں انسپکٹر کے سامنے رکھ دیں لیکن وہ سب ٹھکرا دی گئیں بعد میں پتا چلا یہ سب گل باز خان کی چال تھی۔

قصہ یوں تھا کہ کچھ عرصہ پہلے دلاور خان کے باپ زور آور خان نے گل باز خان کے ایک ٹرک کو پکڑوا دیا تھا۔ گلباز کی بھاری سے بھاری دی ہوئی رشوت بھی کام نہیں آئی تھی۔ زور آور خان واقعی اس شاہراہ کا بے تاج بادشاہ تھا۔ پولیس والے اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ اس سے مستقل بھتہ وصول کیا کرتے تھے اس لیے گل باز خان کی نہ چلی۔ چونکہ وہ پاکستان کا مال پاکستان کے دوسرے شہر میں اسمگل کر رہا تھا یعنی ایک جگہ سے چینی کا کافی ذخیرہ کراچی پہنچا رہا تھا۔ ان دنوں چینی کی قلت تھی۔ اگرچہ یہ جرم تھا وہ گرفتار بھی کیا گیا تھا لیکن مقدمہ چلنے کے دوران اس کے آدمیوں کی ہیرا پھیری کام آ گئی، اسے صرف جرمانہ ادا کرنا پڑا، اس کے بعد رہا کر دیا گیا۔

ادھر کچھ روز پہلے گل باز کا ایک رشتہ دار پولیس کی ایک خصوصی گشتی ٹیم کا انچارج بن کر چوکی پر آیا تھا۔ وہیں اس کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ گل باز خان نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اپنے رشتے دار کے گھر نوٹوں کی گڈیاں پہنچائیں اسے رشتہ داری کا حوالہ دے کر قسم دلائی کہ زور آور خان خواہ کتنی ہی رشوت دے اس کے پکڑے ہوئے مال کو اور مجرم کو نہ چھوڑا جائے۔ اور یہی ہوا۔ زور آور خان نے گل باز خان کے صرف ایک ٹرک کے مال کو پکڑوایا تھا۔ گل باز خان نے مال کے ساتھ اس کے بیٹے کو بھی پکڑوا دیا۔ دشمنی دو اسمگلروں کے درمیان ہوئی تھی لیکن سزا ایک نوجوان طالب علم کو ملی۔ وہ پشاور یونیورسٹی سے نکل کر جیل کی تربیت گاہ میں پہنچ گیا۔ مجرموں کی نفسیات کو سمجھنے والے ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ انسان بھوک افلاس اور دوسری مجبوریوں سے تنگ آ کر اتنی جلدی مجرم نہیں بنتا جتنی جلدی کہ جیل کی تربیت گاہ میں پہنچ کر بن جاتا ہے۔

ملک کے اندر کہیں سے ہتھیار لانے اور ایک شہر سے دوسرے شہر اسمگل کرنے والی بات اتنی دھماکہ خیز تھی کہ تمام اخبارات نے اسے خوب اچھالا۔ ہتھیاروں کی اسمگلنگ کے پیچھے حکومت کے خلاف ہونے والی تخریبی کارروائیوں کا سراغ ملتا تھا۔ دلاور کو صرف گرفتار ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس سے یہ اگلوانے کی کوشش کی گئی کہ کس ملک سے ہتھیار آ رہے ہیں اور کن لوگوں میں یہ تقسیم ہونے والے تھے۔ اور وہ ان ہتھیاروں کو کہاں پہنچانا چاہتا تھا۔

دلاور خان اسمگلنگ کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہ بے چارہ کیا بتاتا۔ اس کا باپ زور آور روپوش ہو گیا تھا۔ اپنی تمام دولت کو داؤ پر لگا کر دوسرے ذرائع سے بیٹے کو رہا کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر بیٹے کو تین سال کی سزا ہو گئی۔

سزا کا پہلا سال ختم ہوا تو اطلاع ملی، اس کا باپ زور آور خان پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس کا ایک عزیز جیل میں ملنے آتا تھا۔ اس نے کہا "یہ جھوٹ ہے زور آور کو گل باز خان نے قتل کیا ہے لیکن پولیس والوں سے گٹھ جوڑ کرنے کے بعد ایسا کیا گیا ہے۔ اس علاقے کے تھانیدار کو دوہرا فائدہ پہنچا ہے۔ ایک تو گلباز خان نے اسے بھاری رقم دی، دوسرے یہ کریڈٹ حاصل ہوا ہے کہ اس نے ایک مفرور مجرم کو مقابلہ کے دوران مارا ہے۔ تھانیدار کو سرکاری طور پر انعام بھی ملے گا اور اس کی ترقی بھی ہو گی۔"

باہر سے ملنے والی اطلاعات دلاور خان کو غیظ و غضب میں مبتلا کر رہی تھیں اور جیل کے اندر چھپے ہوئے بدمعاش اسے اپنے رنگ میں رنگ رہے تھے۔ سزا کے تیسرے سال پتا چلا کہ زور آور کی ہلاکت کے بعد اس کے ایک چچا نے ٹرانسپورٹ کے کاروبار کو سنبھالا تھا لیکن چچا رفتہ رفتہ گل باز خان سے مل گیا تھا۔ دو برس کے اندر اس نے ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں اتنا نقصان دکھایا تھا کہ تقریباً بائیس ٹرک فروخت کرنے پڑے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے چچا نے وہ بائیس ٹرک گل باز خان کو فروخت کیے تھے اور وہ اس کا حصے دار بن گیا تھا۔

دلاور کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ چچا ایسا کر سکتا ہے۔ حالانکہ وہ کوئی سگا نہیں تھا چونکہ اس کی بیٹی گل جانہ دلاور سے منسوب تھی۔ اس سے شادی ہونے والی تھی اس لیے وہ سوچ رہا تھا کہ ہونے والا سسر اس سے بے ایمانی نہیں کرے گا۔ اس کے کاروبار اور بچی کھچی دولت کی حفاظت کرے گا۔

وہ سزا پوری کر کے جیل سے باہر آیا۔ اس انداز میں آیا، جیسے کوئی فاتح کسی نئی زمین پر قدم رکھتا ہے۔ جیل جاتے وقت وہ محض ایک طالب علم تھا۔ شرمندہ شرمندہ سا تھا۔ اس پر جو الزام لگایا گیا تھا اس سے انکاری تھا۔ خود کو مجرم سمجھتے ہوئے اپنی توہین محسوس کرتا تھا۔ اب جیل سے یوں نکلا جیسے مجرم ثابت ہونا بہت بڑا اعزاز ہو۔ ساری دنیا اس کے قدموں تلے ہو۔ اس کا وہ عزیز جو اکثر جیل میں اس سے ملنے آتا تھا، وہ پچھلے چھ ماہ سے نہیں آیا تھا۔ اس لیے اسے اپنے گھر کے اور شہر کے حالات کا علم نہیں تھا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو رات ہو چکی

تھی۔ وہ مکان دو منزلہ ہو چکا تھا۔ اس کا ڈھانچہ ہی بدل گیا تھا۔ دروازے پر پہلے کسی کا نام لکھا ہوا نہیں تھا اب وہاں اس کے چچا کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

اُسے بڑا غصہ آیا۔ باپ مر چکا تھا تو کیا ہوا نام تو نہیں مرا تھا۔ آدمی اپنے بعد بھی اس دُنیا میں اپنا نام چاہتا ہے۔ اگر باپ کے نام کی تختی لگائی جاتی تو چچا کا کیا بگڑ جاتا ؟"

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا ایک دھڑاکے سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اس کا چچا کسی شخص کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا اُسے دیکھتے ہی گھبرا کر کھڑا ہو گیا "تم ! دلاور خان ! تم کب جیل سے چھوٹے ؟"

اس کا چچا اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے پوچھ رہا تھا ورنہ وہ تو دیکھ ہی چکا تھا کہ جیل سے چھوٹ چکا ہے۔ اور اب اس کے لیے خطرہ ہے۔ پیچھے دیوار پر دو رائفلیں لٹکی ہوئی تھیں وہ پلٹ کر ادھر جانا چاہتا تھا۔ یکبارگی دلاور نے اس پر چھلانگ لگائی۔ اُسے لیے ہوئے فرش پر گر پڑا۔ اس کے چچا کا ساتھی رائفل کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن دلاور فرش پر پڑے رہنے کے لیے نہیں گرا تھا۔ اس نے ایک دم سے اچھل کر دیوار کے پاس پہنچتے ہی ایک رائفل پر قبضہ جما لیا۔ پھر اُسے نال کی طرف سے تھام کر اپنے چچا کے ساتھی پر حملہ کر دیا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے گیا۔ اس کا چچا فرش پر سے اٹھ گیا تھا لیکن اب وہ دُوسرے رائفل کی طرف بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

دلاور خان نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے پوچھا "میرے باپ کی زندگی میں پچیس ٹرک تھے، اب کتنے رہ گئے ؟"

وہ ہکلاتے ہوئے بولا "مم ۔۔۔ میں کیا بتاؤں کہ میں نے پے درپے کتنے نقصانات برداشت کیے، کتنی محنت کی اس کے باوجود نقصان سے سنبھل نہ سکا۔"

"بکواس بند کرو۔ یہ مکان دو منزلہ کیسے ہو گیا ؟ تمھارے بینک بیلنس کو بھی چیک کروں گا۔ اس کے بعد سچ اور جھوٹ سامنے آ جائے گا۔"

اس کے چچا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ دُوسرے شخص نے کہا۔ "دلاور! یہ رائفل واپس کر دو۔ تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔ میں گل باز خان کا آدمی ہوں۔ اگر مجھے ذرا بھی نقصان پہنچا، تو تمھاری ہڈیوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔"

دلاور نے کہا "اچھا تو یہ سازشیں ہو رہی ہیں جب گل باز خان کا آدمی میرے مکان میں آ سکتا ہے اور میرا چچا اس سے دوستی کر سکتا ہے تو پھر میرے کاروبار کو تباہ ہونا ہی تھا۔ چچا! تم کیسے نمک حرام ہو میرے باپ کا کھاتے رہے اور ہم سے نمک حرامی کرتے رہے کیا تمھیں یہ خیال نہیں آیا کہ تمھاری بیٹی مجھ سے منسوب ہے اور میری شریکِ حیات بننے والی ہے۔"

"اب گل جانہ کا نام نہ لو وہ پرائی ہو چکی ہے۔"

دلاور خان نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا "کیا ؟"

گل باز خان کے آدمی نے اکڑ کر بڑی شان سے کہا۔

"اب وہ ہمارے گل باز خان کی شریکِ حیات ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کٹھا ہیں سے گولی چلی اور وہ شان سے اکڑنے والا فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا چچا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے کہا "میں تمھیں اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا۔ تم نے بکواس کی میرے باپ کی ہلاکت میں یقیناً تمھارا ہاتھ ہو گا۔ اسی لیے تم نے گل باز خان کو اپنا داماد بنایا ہے۔"

اس نے رائفل کے کُندے سے اس کے مُنہ پر ضرب لگائی وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ اس کی ناک سے باچھوں سے خون بہہ رہا تھا ایک آنکھ پر بھی چوٹ لگی تھی۔ دلاور انتقام کی آگ میں تپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ نہیں رک رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک ضربیں لگاتا جا رہا تھا۔ اس کا چچا کبھی گرتا تھا، کبھی سنبھلتا تھا۔ کبھی اٹھتا تھا کبھی مدد کے لیے پکارتا تھا۔

اندرون خانہ عورتیں بھی چیخ پکار میں مصروف تھیں۔ دلاور نے آخری ضرب اتنی بھرپور لگائی کہ اس کا چچا اُٹھ نہ سکا چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ وہ بے جان ہو چکا تھا۔

وہ رائفل لیے دندناتا ہوا زنان خانے میں داخل ہو گیا۔ عورتیں چیختے ہوئے ادھر سے اُدھر بھاگنے لگیں۔ پناہ کے لیے سب بھاگ رہی تھیں۔ ایک رک گئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر سامنے ہی کھڑی ہوئی تھی۔ دلاور کا جنون ایک ذرا سرد پڑ گیا۔ وہ ایک ٹک اُسے دیکھنے لگا۔

یہ ہی گل جانہ تھی جسے وہ چھپ چھپ کر دیکھا کرتا تھا اور وہ بھی اسے دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اس مکان کی چار دیواری سے پشاور یونیورسٹی تک اس نے جتنی شاعری کی تھی وہ سب گل جانہ کے لیے تھی۔ آہ! اب وہ پرائی ہو گئی تھی اور دشمن کی شریکِ حیات بن گئی تھی۔ وہ دشمن کو مار سکتا تھا اسے کس طرح مارے ؟ کس طرح اسے بے وفائی کا الزام دے ؟ جب کہ وہ اس کی حفاظت کے لیے، اسے اپنانے کے لیے آزاد نہیں تھا۔۔۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

گل جانہ نے کہا "دلاور! جو میرے نصیب میں لکھا ہے میں بھگت رہی ہوں۔ میں تجھے اس کی قسم دیتی ہوں جسے تو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہے چلا جا، جلدی چلا جا۔

گل باز خان کے آدمی آتے ہی ہوں گے۔"

آہ۔ اس کے لہجے میں اب بھی وہی اپنائیت تھی۔ اس کی آواز میں وہی رس تھا۔ اب تک وہ صرف اس کی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے گل جانہ کو دیکھا تو یکبارگی غصے سے بھڑک گیا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔

اس نے تلملا کر رائفل سیدھی کی۔ گل جانہ نے کہا "نہیں، نہیں۔ تم مجھے نہیں مار سکتے۔"

"تم میری خاطر مر جاؤ۔ میں تو اس خبیث کی اولاد کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مارنا چاہتا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولی "دلاور! یہ تو سوچو۔ یہ صرف اس کا نہیں میرا بھی ہے۔ جو اولاد ہو گی، وہ گل جانہ کی ہو گی۔ کیا تم گل جانہ کو اس کی اولاد دے، اس کی ممتا کے جذبوں سے محروم کر دو گے ؟"

وہ ذرا سرد پڑ گیا۔ رائفل کی نال جھک گئی۔ پھر وہ سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔ دشمن اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ جب وہ مکان سے ذرا دُور نکل آیا تب فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ایک گولی اس کے قریب ہی سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ وہ فوراً ہی لیٹ گیا۔ رینگتا ہوا تھوڑی دُور تک گیا پھر وہاں سے دوڑنے لگا۔ رات کا وقت تھا۔ اندھیرے میں دشمن اس کا صحیح نشانہ نہیں لے سکتے تھے اس لیے جان بچ گئی۔ وہ دوڑتا رہا، بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ حالات اُسے دوڑا رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار پیدل چل رہا تھا، چلتا ہی جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ رات سے صبح ہو گئی۔ دوسرے دن گیارہ بجے پہاڑیوں سے اور ٹیلوں کے پیچھے سے ہوائی فائر ہونے لگے۔ اس سے کہا گیا کہ ریوالور پھینک دے۔ تب سمجھ میں آیا کہ وہ علاقہ غیر میں آ پہنچا ہے۔

علاقہ غیر ایک ایسی جگہ ہے جہاں مجرموں کو قانون سے بھی پناہ ملتی ہے اور اپنے جانی دشمنوں سے بھی لیکن پناہ حاصل کرنے کے لیے مال و زر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن کے پاس مال نہیں ہوتا، علاقے کے لوگ اُسے کسی کے ہاتھ بھی فروخت کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی ملک اس مجرم کا مطالبہ کرے یا اُس کے جانی دشمن اسے حاصل کرنا چاہیں تو اسے زرِ کثیر ادا کرنا پڑتا ہے۔ علاقہ غیر کے لوگ مہمان نواز بھی ہوتے ہیں۔ کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو یا مجرم کو اس طرح پناہ دیتے ہیں کہ قانون یا کوئی جانی دشمن مہمان کو اُن سے لے جا نہیں سکتا۔ دلاور خان کو وہاں پناہ مل گئی۔

وہ دو ہفتوں تک اپنے میزبان کے یہاں رہا۔ اسے کسی بات کی تکلیف نہیں تھی۔ کھاتا پیتا تھا اور آرام کرتا تھا لیکن اُس کا دل اور دماغ اپنے دشمن کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ گل باز خان سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کے میزبان نے اسے سمجھایا۔ "اکیلے جاؤ گے تو مارے جاؤ گے۔ ایک تو گل باز علاقے کا بہت طاقتور شخص ہے۔ تم نے جیل سے چھوٹتے ہی اپنے چچا اور ایک شخص کو قتل کیا۔ وہاں کا قانون بھی تمھیں طلب کرے گا لہٰذا سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ ابھی یہاں آرام کرو۔"

تیسرے ہفتے وہاں ایک بوڑھا شخص آیا۔ بظاہر انگریز لگتا تھا لیکن وہ روسی تھا۔ بخارا سے آیا تھا۔ روسی زبان بولتا تھا۔ اس نے میزبان سے بڑی دیر تک گفتگو کی۔ دلاور خان دُور بیٹھا انھیں دیکھتا رہا۔ وہ دونوں بحث کر رہے تھے اور بحث کے دوران کبھی ایک دوسرے کی بات سے انکار کرتے تھے پھر ایک دوسرے کی باتوں کے قائل ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد اس کے میزبان نے آکر کہا "دلاور خان! تم اس آدمی کے ساتھ جاؤ۔ یہ بہت اثر والا اور جہاندیدہ آدمی ہے۔ اس کا نام عرض مند بخاری ہے۔ یہ بخارا کا رہنے والا ہے لیکن تمھیں ہرام علی کے علاقے میں لے جائے گا۔"

"میں اس کے ساتھ جا کر کیا کروں گا ؟"

"تم اپنے دشمنوں سے انتقام لینا سیکھو گے۔"

عرض مند نے قریب آ کر انگریزی زبان میں پوچھا "تم انگریزی زبان بول سکتے ہو ؟"

اس نے کہا "ہاں، بول سکتا ہوں۔"

عرض مند نے کہا "کسی سے انتقام لینے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمھیں ملے گی۔ ہتھیاروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمھیں ملیں گے مگر میرے بچے! صرف دولت اور ہتھیاروں سے تم کچھ نہیں کر سکتے۔ دشمن اتنے چالاک ہوتے ہیں کہ ہتھیار زنگ آلود ہو جاتے ہیں اور دولت کے متعلق تم جانتے ہی ہو۔ جیسا کہ تمھارے میزبان نے بتایا تمھارا باپ امیر تھا لیکن آج وہ دولت کیا ہوئی ؟ کچھ نہیں۔ تمھارے پاس کچھ نہیں رہا لہٰذا دولت کو اور ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے لیے منصوبے بنانے اور ان منصوبوں پر عمل کرنے کے طریقۂ کار کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم تمھیں سب کچھ سکھائیں گے۔ تم ایسے ایسے ہنر سیکھو گے کہ دشمن تمھارے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے، خاک کے کیڑے بن جائیں گے۔"

دلاور نے خوش ہو کر کہا "ایسا ہے تو میں ضرور تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

معاملہ طے ہو گیا۔ جب وہ عرض مند بخاری کے ساتھ جانے لگا تو اس نے ایک چھوٹی سی تھیلی میزبان کو دی جس میں سونے کے بسکٹ بھرے ہوئے تھے تب دلاور کی سمجھ میں آیا کہ اس کا سودا ہوا ہے بہرحال اسے سہارے کی ضرورت تھی اس لیے وہ عرض مند کے ساتھ ایک نئے سفر پر روانہ ہوا۔ وہ افغانستان گئے۔ پھر

وہاں سے سفر کے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہوئے افغانستان کے شمالی حصے میں پہنچے۔ بخارا سے دُور افغان روسی سرحد کے قریب بہرام علی نامی علاقہ تھا۔ وہ علاقہ اگرچہ جغرافیائی لحاظ سے افغانستان میں تھا لیکن ایک عرصے سے وہاں روسی مداخلت ہو رہی تھی۔ افغان حکومت اعتراض نہیں کرتی تھی گویا بہرام علی کے علاقے کو روسیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

دانش مندوں کا قول ہے' باہر کے آدمیوں کو گھر میں نہ آنے دو۔ وہ ایک قدم دہلیز پر رکھے گا تو دوسرا قدم اٹھاتے اٹھاتے مکان میں گھس آئے گا۔ افغان حکومت نے بہت عرصہ پہلے اپنے ایک چھوٹے سے سرحدی علاقہ کو نظر انداز کیا تھا اور روسی مداخلت کو اہمیت نہیں دی تھی۔ آج روسی بڑے طمطراق سے افغانستان میں اپنے قدم جمانے جا رہے ہیں۔

دلاور خان نے غرض مند کے ساتھ سفر کرنے کے دوران کتنے ہی شہروں اور علاقوں کو دیکھا تھا اور اندازہ لگایا تھا کہ افغانستان بہت ہی پسماندہ ملک ہے لیکن بہرام علی کے علاقے میں پہنچتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اتنا جدید شہر لگتا تھا جیسے افغانستان سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ ایک بہت ہی وسیع و عریض عمارت میں داخل ہوا اُسے بعد میں پتا چلا کہ وہ دہشت گردی کا تربیتی مرکز ہے اور روسی حکومت کی سرپرستی میں وہاں کرائے کے فوجی تیار کیے جاتے ہیں۔

❦

میری خیال خوانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اچانک ثباتہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ میں تمہارے پروگرام کے مطابق تیار بیٹھی ہوں۔"

مجھے یاد آیا، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا، ایک گھنٹے بعد پیرس کی سیر کرنے نکلیں گے۔ میں نے اُسے وادیٔ قاف میں جانے کے لیے بڑی حد تک راضی کر لیا تھا۔ اس لیے اس کا دل بہلانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا "میں میک اپ کے ذریعے اپنا چہرہ تبدیل کر سکتی ہوں لیکن تم سے میک اپ کرانا چاہتی ہوں۔ سُنا ہے اس فن میں بڑی مہارت رکھتے ہو۔ تم سے بھی کچھ سیکھ لوں گی۔"

میں اسے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی "اس طرح منہ کیا تک رہے ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا "اگر میں اپنے اصلی چہرے کے ساتھ تمہارے سامنے آ جاؤں تو؟"

"تو میری عید ہو جائے گی۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا میں تمہیں اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھوں اس سے بڑی خوشی میرے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ کہیں تم مجھے بہلا تو نہیں رہے ہو؟"

"ابھی میں نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے، ذرا ٹھہرو۔ میں ڈاکٹر شیفرڈ کو یہاں بُلاتا ہوں۔"

میں ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے کلینک سے اُٹھ کر گھر جانا چاہتا تھا میرے مخاطب کرنے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر! میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ اچانک پاکستان کا قصد کیوں؟"

"ضرورت پیش آ گئی ہے میں موجودہ چہرے کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

اس نے تعجب سے پوچھا "کیا اصلی روپ میں جاؤ گے؟"

"اصلی روپ میں جا ہی نہیں سکتا لیکن چہرہ ایسا ہو کہ کسی حد تک پاکستانی لگوں۔"

"کیا ابھی تبدیلی کی ضرورت ہے؟"

"ابھی صرف میک اپ اتار دیں۔ کل کسی وقت دوسرا میک اپ کر دیں۔"

"میں آ رہا ہوں۔"

میں نے ثباتہ سے کہا "ڈاکٹر شیفرڈ آ رہے ہیں۔ میں اصلی روپ میں آ تو جاؤں گا لیکن باہر تفریح کے لیے نہیں جا سکیں گے۔"

وہ کہنے لگی "جب گھر میں جنت اُتر آئے تو باہر کی دنیا دوزخ لگتی ہے میں تو کبھی چار دیواری سے باہر نہیں جاؤں گی۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ وادی میں واپس جانے کا وعدہ بھول رہی ہو؟"

"میں زبان کی دھنی ہوں جب وعدہ کیا ہے تو ضرور واپس جاؤں گی لیکن ابھی نہیں۔ پہلے مجھے زندگی کے چند لمحات کو یادگار بنا لینے دو۔"

میں نے یہاں کے افسران سے وعدہ کیا ہے۔ کل تم ان کے ہیلی کاپٹر میں چلی جاؤ گی۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولی "ہاں چلی ہی جاؤں گی۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی، میں نے ریسیور اٹھایا۔ چپ چاپ کان لگا کر کھڑا رہا۔ دوسری طرف سے آواز آئی "ہیلو، میں ڈاکٹر شیفرڈ بول رہا ہوں۔"

میں نے فوراً ہی دماغ کی طرف چھلانگ لگا کر پوچھا "آپ نے فون کیوں کیا؟"

اس نے بھی سوچ کے ذریعے کہا "اب مجھے ٹیلی پیتھی تو آتی نہیں ہے کہ فون کے بغیر تمہیں مخاطب کروں۔ بات یہ ہے کہ ایک ایمرجنسی کیس آیا ہے۔ ایک عورت کا چہرہ جل گیا ہے۔ اسے فوری طور پر اٹینڈ کرنا ہو گا۔ اگر میں کچھ دیر سے آؤں تو؟"

"کوئی بات نہیں، آپ جب بھی آئیں گے میں یہیں انتظار کرتا رہوں گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ثباتہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس نے پوچھا "یہ کیا بات ہوئی۔ ریسیور اٹھا کر چپ چاپ کھڑے رہے پھر ریسیور رکھ دیا۔ کسی سے بات نہیں کی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ڈاکٹر شیفرڈ تھا۔ خیال خوانی کے ذریعے بات ہو گئی۔ وہ دیر سے آئے گا۔"

ثباتہ مایوس ہو گئی، کہنے لگی "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا چہرہ دیکھنے میں کافی دیر ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "دیر آید درست آید۔"

"کیا درست آید۔ کیا دیر ہونے سے فرہاد علی تیمور کے چہرے پر چار چاند لگ جائیں گے۔ مجھے تو وہی چہرہ دیکھنا ہے جس کی تصویر اب تک دیکھتی آئی ہوں۔"

"بھئی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے' ویسے بھی مجھے ضروری خیال خوانی کرنی ہے' مجھے وقت مل گیا ہے تو چلو یہی سہی۔"

جہاں تک خیال خوانی کا تعلق ہے میری مصروفیات بہت بڑھنے والی تھیں۔ ایک طرف کرم داد کے ذریعے ماسٹر کی تک پہنچنے کی کوشش کرنا تھا۔ اس کے آس پاس رہنے والوں کے دماغوں میں بھی پہنچنا تھا۔ یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ماسٹر کی یوگا کا ماہر ہے۔ میں اس کے دماغ میں پہنچ سکتا۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا تھا کہ اس کے دستِ راست اور خاص آدمی بھی یوگا کے ماہر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے دوسرے پینترے بدلتے ہوئے دوسرے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ماسٹر کی تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نکالنا ہی تھا۔

دوسرا دلاور خان تھا اس کے ذریعے میں بہ آسانی بہرام علی ٹیررسٹ ٹریننگ سینٹر کے لوگوں تک پہنچ سکتا تھا کیونکہ اُن میں سے اکثریت روسی زبان بولتی تھی۔ جو روسی زبان سیکھتے تھے اور مشق کے طور پر وہی زبان بولتے تھے یعنی وہاں کے سرکردہ لوگوں تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

ابھی تو میرے ذہن میں یہی ایک تدبیر تھی کہ میں باری باری اُن پاکستانیوں کے ساتھ رہوں گا۔ اُن کے ساتھ پاکستان جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ دہشت گردی کی تربیت دینے والے اُن سے کیا کام لینا چاہتے ہیں اور میں اپنے طور پر کیسی چالیں چل سکتا ہوں۔

میں نے بلیک شیلڈ کے ذریعے حاصل کیے ہوئے کیسٹ کو ریکارڈر میں رکھ کر آن کیا۔ اس بار مجھے تیسرے پاکستانی جوان کی آواز سُنائی دی۔ میں نے اُسے سُنا۔ اُس کے لب و لہجے کو اپنی گرفت میں لیا پھر ریکارڈ کو آف کر کے اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔

اس کا نام جمال احمد جسکانی تھا۔ وہ گوٹھ سارنگ کا رہنے والا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کراچی میں سائٹ کا علاقہ پوری طرح صنعتی نہیں ہوا تھا۔ کچھ ملیں اور کارخانے تھے۔ باقی علاقہ ویران پڑا رہتا تھا۔ وہیں جمال احمد جسکانی کے باپ کا ایک بہت بڑا پلاٹ تھا جو دس ہزار مربع گز پر پھیلا ہوا تھا۔ جب سائٹ کے علاقے میں صنعتیں پھلنے پھولنے لگیں تو ایک صنعت کار چوہدری صدیق حیات نے وہ زمین خریدنے کی خواہش کی۔ اُس نے دس ہزار مربع گز زمین کی قیمت دو لاکھ روپے لگائی۔ جمال جسکانی کے والد کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوڑیوں کے مول خریدی ہوئی زمین کے دو لاکھ روپے مل سکتے ہیں۔ وہ سودے پر راضی ہو گیا لیکن گوٹھ سارنگ کے وڈیرے رجب علی نے اعتراض کرتے ہوئے کہا "بیچ دو' ساری زمینیں بیچ دو۔ سرمایہ دار یہاں آ کر ہمیں خرید رہے ہیں اور ہم بک رہے ہیں تمہیں شرم نہیں آتی؟" رجب علی نے کہا "جب تمہیں زمین بیچنا ہی ہے تو ہمارے ہاتھ بیچ دو۔ وہ دو لاکھ دیتا ہے مگر باہر سے آیا ہے ہم تو تمہارے اپنے آدمی ہیں ہم کو ایک لاکھ میں دے دو۔ چلو ڈیڑھ لاکھ میں دے دو مگر اپنے ہی آدمی کو دو۔ گوٹھ کے تمام لوگوں نے وڈیرے کی ہاں میں ہاں ملائی۔ جمال جسکانی کے باپ نے قائل ہو کر کہا "ٹھیک ہے دو لاکھ نہ سہی ڈیڑھ لاکھ سہی۔ اپنے ہی آدمی کے پاس زمین ہونی چاہیے۔ مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔"

زمین کے کاغذات لکھے گئے۔ قانون کی مُہر لگائی گئی۔ اور جمال جسکانی کے والد کو ڈیڑھ لاکھ مل گئے۔ جمال ان دنوں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنے باپ سے زیادہ سمجھ دار تھا۔ دُنیا کو کھلی آنکھوں دیکھتا تھا اور وڈیروں کی چالاکیاں خوب سمجھتا تھا۔ چند ماہ بعد ہی پتا چلا کہ وڈیرے رجب علی نے ان کی زمین پانچ لاکھ روپے میں فروخت کر دی ہے۔

جمال جسکانی نے اپنے باپ سے کہا "کاروبار میں کوئی کسی کا بھائی ہوتا ہے نہ باپ ہوتا ہے نہ ہم وطن ہوتا ہے، نہ ہم زبان ہوتا ہے۔ منافع حاصل کرنے کے لیے کسی کو بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ رجب علی کہہ رہا تھا غیروں کو زمین نہ دو۔ تم نے اسے اپنا سمجھ کر دیا تو اس نے ڈیڑھ لاکھ روپے دیے اور خود پانچ لاکھ روپے کمائے بتاؤ اِس وقت وہ ہمارا اپنا نہیں تھا؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا "میں آپ کا بیٹا ہوں لیکن آپ کو سمجھاتا ہوں۔ گلا اپنا بھی کاٹ سکتا ہے' گلا غیر بھی کاٹ سکتا ہے لیکن محبت سے گلے لگانے والوں کے لیے محبت کے ایک مرکز کی ضرورت ہے اور وہ مرکز ہے پاکستان میری یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو کچھ اور ٹھوکریں کھانے کے بعد سمجھ میں آ جائے گی۔"

پاکستان کے ہر صوبے میں نوجوان ذہنی انتشار میں مبتلا رہتے ہیں۔ کبھی وہ محبِ وطن بن کر سوچتے ہیں کہ پاکستان میں تعصب کی فضا پیدا نہ ہو۔ پاکستان کا ہر شخص صرف پاکستانی ہو لیکن قائدِ اعظم کے بعد اس قوم کو کوئی ایسا رہنما نصیب نہ ہوا جو یہاں کی سیاسی فضا کو مکدر ہونے سے بچا لے۔

یہ محض سیاست دانوں کی بات بھی نہیں ہے۔ ہمارے مختلف شعبوں کے لوگ اور ہمارے صنعتکار ایک دوسرے صوبے میں پہنچ کر جو لوٹ کھسوٹ مچاتے ہیں اس کے نتیجے میں نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ بات یہ نہیں ہوتی کہ ایک شخص نے لوٹ مچائی ہے۔ بات یہ ہوتی ہے کہ فلاں صوبے والے نے ایسا کیا ہے۔ جمال جسکانی بھی اسی لپیٹ میں آگیا۔ ایک بار اس کے ہاں ڈاکا پڑا۔ وہ ڈیڑھ لاکھ روپے جو بڑے جتن سے چھپا کر رکھے ہوئے تھے وہ ڈاکو لے گئے۔ بعد میں پولیس کی بھاگ دوڑ کے بعد جب ڈاکو گرفتار ہوا تو پتا چلا کہ وہ اس صوبے کا نہیں ہے کسی دوسرے صوبے سے تعلق رکھتا ہے۔ بھلا کسی چور ڈاکو کا صوبہ کیا ہوگا جب کہ اس کا کوئی ایمان ہی نہیں ہوتا۔

لیکن یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ بڑے افسران بھی دوسرے ہی صوبے سے آکر لوٹ مچاتے ہیں گویا سبھی نے ایک چھوٹے سے صوبے کو لوٹنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ جمال جسکانی اپنے اندر کے تعصب کو ظاہر تو نہیں کرتا تھا لیکن وہ بھی اس لپیٹ میں آچکا تھا۔ انسان جب کمزور ہوتا ہے، ہر طرف سے ٹھوکریں کھاتا ہے تو وہ غصے میں صحیح سمت کا تعین نہیں کر سکتا۔ اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ جمال جسکانی کے ایک تو ڈیڑھ لاکھ روپے چلے گئے تھے۔ دوسرے تعلیم چھوٹ گئی۔ گھر کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ جوان بہن کی شادی کے لیے معقول رقم نہ رہی۔

مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ اس کی بہن اگرچہ بے حد خوبصورت تھی، کوئی بھی اسے اپنے گھر کی عزت بنا سکتا تھا لیکن بچپن ہی سے آنکھوں میں کچھ خرابی تھی۔ جوان ہوتے ہوتے وہ اندھی ہوگئی۔ ایسے میں کہیں سے رشتہ آنے کی توقع نہیں تھی۔ پھر بھی بہن کی شادی کے لیے کچھ رقم جوڑنے کی خاطر وہ ملازمت کرنے لگا۔ ایک ٹیکسٹائل مل میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی۔ وہ ملازمت کسی بھی وقت چھوٹ سکتی تھی کیونکہ مزدوروں نے اسے اپنی یونین کا صدر چن لیا تھا اور یہ مل مالکان کو پسند نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے، مالکان کے مفاد میں رہنما بن جاؤ، تو ملازمت پکی، لیکن وہ محنت کا استحصال کرنے والوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے خود غریبی، مفلسی اور بے چارگی کے دن گزارے تھے۔ وہ مزدوروں کے جلسے میں دھواں دھار تقریریں کرتا تھا۔ سب اسے کاندھوں پر اٹھا کر زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ صرف دو برس کے عرصے میں وہ مزدور رہنما کی حیثیت سے تمام ملوں اور کارخانوں میں مشہور ہو گیا۔ اخبارات میں اس کی تصویریں چھپنے لگیں۔ اس کا نام معروف ہوتا گیا۔

انہی دنوں اس کے گاؤں سے خبر آئی کہ اس کی بہن اغوا کر لی گئی ہے۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ ایک تو وہ بہن کو بہت چاہتا تھا دوسرے اپنی عزت اور غیرت کی بات تھی۔ کوئی اسے اٹھا کر لے جائے تو وہ کیسے اپنوں کو منہ دکھا سکتا ہے؟ کس منہ سے وہ گوٹھ میں جائے گا؟

ایک بات سمجھ میں آرہی تھی۔ گوٹھ سارنگ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ کراچی جیسی بھرپور آبادی نہیں کہ کوئی گم ہوجائے یا کسی کو اٹھا کر لے جائے تو پتا نہ چلے۔ چھوٹی سی جگہ میں چوری ہوتی ہے یا کسی کو اغوا کیا جاتا ہے تو وہاں کے تھانے والوں اور وڈیروں کو ضرور اس کا علم ہوتا ہے۔

اس نے گوٹھ سارنگ کے قریبی تھانے میں کہا۔ "انسپکٹر! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہاں مٹھی بھر لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی غائب ہوجائے تو کیسے پتا نہ چلے۔ آپ لوگ تو مجرموں کی بو سونگھ لیتے ہیں کیا میری بہن کو اغوا کرنے والوں تک نہیں پہنچ سکتے؟"

انسپکٹر نے غصے سے پوچھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم مجرموں کی بو سونگھ چکے ہیں اور ان تک نہیں پہنچ رہے ہیں۔ دیکھو مسٹر! تم مزدور رہنما ہوگے اپنے شہر میں۔ اگر یہاں لیڈر بننے کی کوشش کروگے تو۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک سپاہی نے آکر کہا۔ "سر! یہ جھوٹ موٹ دوسروں پر الزام لگا رہا ہے، اس کی بہن کہیں نہیں گئی، اس کے گھر ہی میں ہے۔"

جمال اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ بے یقینی سے سپاہی کی طرف دیکھنے لگا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع کرتے ہو۔ بچہ بغل میں ہوتا ہے اور ڈھنڈورا شہر میں پیٹتے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ دوڑتا ہوا گھر پہنچا۔ اس کے بوڑھے باپ نے کہا۔ "وہ آگئی ہے مگر کمرے میں بند ہے دروازہ نہیں کھولتی ہے۔ کہتی ہے میں اسے زہر لا کر دے دوں یا چاقو دے دوں۔ وہ اپنے آپ کو ختم کر لے گی۔ آہ! میں کیا کروں۔ اچھا ہوا کہ وہ اندھی ہے۔ نہ زہر حاصل کر سکتی ہے نہ کہیں سے چاقو لا سکتی ہے ورنہ وہ اب تک اپنی جان پر کھیل چکی ہوتی۔"

جمال نے اس کمرے کے دروازے پر آتے ہوئے کہا۔ "بہن! دروازہ کھولو۔ میں تمھارا بھائی ہوں۔"

اندر سے چیخ سنائی دی۔ "نہیں۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ میں اپنا منہ نہیں دکھاؤں گی۔ خدا کے لیے مجھے مار ڈالو۔ نہیں مار سکتے تو زہر لا کر دو۔ مٹی کا تیل اور ماچس لا دو۔ تم دنیا کے سامنے تو کہہ سکوگے کہ بہن غیرت مند تھی، اپنی جان پر کھیل گئی۔"

"نہیں بہن! میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم مجھے ان لوگوں کا نام اور پتا بتاؤ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کو چن چن کر مار دوں گا۔ ان کے گھروں میں آگ لگا دوں گا۔ بتاؤ وہ کون تھے؟"

اندر خاموشی رہی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے کبھی رونے اور کبھی سسکنے کی آواز آتی تھی۔ جمال نے پھر پوچھا۔ "مجھے بتاؤ، میری بہن! وہ کون ہیں؟ تم دیکھوگی کہ تمھارا بھائی کتنا غیرت مند ہے کس طرح تمھارا انتقام لیتا ہے۔ مجھے بتاؤ کون تھے وہ؟"

سوال کرتے کرتے وہ ٹھٹک گیا۔ اچانک اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ بہن تو اندھی ہے وہ دشمنوں کو نہ تو دیکھ سکتی تھی نہ پہچنوں میں انھیں پہچان سکتی تھی۔ "اف خدایا! میں کیا کروں؟ کس طرح ان دشمنوں کو ڈھونڈ نکالوں؟"

اس نے کہا۔ "تم دیکھ نہیں سکتیں، تم کسی کو پہچان نہیں سکتیں لیکن تم نے اسکی آواز تو سنی ہوگی؟"

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ جب میں زندہ ہی رہنا نہیں چاہتی تو دشمنوں کو آواز سے پہچان کر کیا کروں گی۔"

"بہت کچھ کروگی۔ میں انھیں ایسا سبق دوں گا کہ آئندہ وہ کسی کی بہن اور بیٹی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمھارے بعد دوسری معصوم بہنیں بھی ان کی ہوس کا نشانہ بنتی رہیں؟ اگر نہیں چاہتیں تو میری بہن! مجھ پر رحم کرو ورنہ میں کھانا پینا چھوڑ دوں گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکوں گا۔ میں اسی طرح مر جاؤں گا۔ صرف اتنا بتا دو تم اس دشمن کو آواز سے پہچان سکتی ہو؟"

"ہاں۔"

وہ وہاں سے پلٹ کر تیزی سے بھاگتا ہوا تھانے میں پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی انسپکٹر نے پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟ کیا وہ پھر غائب ہوگئی ہے؟"

"نہیں وہ موجود ہے مگر ایک کمرے میں بند ہوگئی ہے۔ وہ بڑی شرم والی ہے۔ کہتی ہے اپنا منہ نہیں دکھائے گی۔ میں نے بڑی مشکل سے معلوم کیا ہے۔ وہ مجرم کو اس کی آواز سے پہچان لے گی پلیز! انسپکٹر صاحب! آپ میرے ساتھ چل کر اس کا بیان لیجیے۔ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کیجیے کہ وہ کون ہے؟"

جمال کہہ رہا تھا اور انسپکٹر گھبرایا ہوا سا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی سنبھل کر کہا۔ "تم جاؤ۔ میں بعد میں آجاؤں گا۔"

"یہاں ہماری کوئی عزت نہیں رہی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ آپ کے ذریعے ان بدمعاشوں کا سراغ لگ سکتا ہے۔ اور آپ۔۔۔"

"زیادہ باتیں نہ کرو۔ میں نے کہا نا، مجھے ضروری کام ہے تم بیان لکھوانا چاہتے ہو تو اپنے محرر کو بھیج دیتا ہوں اسے لے جاؤ۔"

"میں کہہ چکا ہوں، وہ بڑی شرم والی ہے میرے سامنے نہیں بولتی۔ آپ تجربہ کار آدمی ہیں آپ باتیں اگلوانا جانتے ہیں۔ آپ اس کے ذریعے مجرموں تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"میں کہہ چکا ہوں مجھے ابھی فرصت نہیں ہے بعد میں آؤں گا تم جاؤ اور میرا دماغ خراب نہ کرو۔"

اس نے مجبور ہو کر پوچھا۔ "یہ تو بتا دیجیے آپ کب تک آئیں گے۔"

"شام کو آؤں گا۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ چلا آیا۔ اس نے رجب علی کے پاس آکر کہا۔ "سائیں! میری بہن مجرموں کو آواز کے ذریعے پہچان سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو ہم مجرموں کو پکڑ سکتے ہیں۔"

رجب علی نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"آپ گوٹھ کے تمام لوگوں سے کہیں وہ میرے گھر کے پاس جمع ہو جائیں پھر ایک ایک آدمی میری بہن کے کمرے کے پاس سے گزرے اور دروازے کے پاس اپنی آواز سناتا جائے۔ اس طرح ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ گاؤں کا کوئی آدمی اس جرم میں شریک ہے یا نہیں؟"

رجب علی نے کہا۔ "بابا! یہ پولیس کا معاملہ ہے تم ہمیں کیوں بیچ میں الجھاتے ہو؟"

"یہ پولیس کا معاملہ بھی ہے اور ہماری پنچایت کا بھی۔ آپ ہمارے بڑے ہیں آپ چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔"

"چلو تم کہتے ہو تو کوئی بات نہیں۔ میں ابھی اعلان کرا دیتا ہوں سارے گاؤں والے تمھارے گھر کے پاس جمع ہو جائیں گے۔"

ایک گھنٹے بعد ہی گوٹھ کے تمام لوگ اس کے مکان کے سامنے ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ دور تک ایک لمبی قطار نظر آنے لگی۔ ایک ایک آدمی گھر کے اندر جاتا تھا اور دروازے کے پاس پہنچ کر اپنی آواز سناتا تھا پھر وہاں سے چلا جاتا تھا۔ اس طرح گوٹھ کے سارے ہی لوگ آوازیں سنا کر چلے گئے۔ بہن نے کہا۔ "ان میں سے کوئی نہیں ہے۔"

شام ہوگئی انسپکٹر نہیں آیا۔ [illegible] وہ تھانے پہنچا تو پتا چلا انسپکٹر شہر گیا ہوا ہے آج نہیں آسکے گا۔

وہ مایوس ہو کر واپس جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ آخر کون ہو سکتا ہے؟ گوٹھ کے لوگ نہیں تھے۔ آس پاس کی بستی والے بھی ہو سکتے ہیں یا پھر ڈاکہ ڈالنے والے عادی مجرموں نے ایسا کیا ہے۔ ایسے خطرناک ڈاکوؤں تک تھانے والے پہنچ سکتے تھے مگر تھانے والا ہی نہیں تھا۔

دوسری صبح وہ تھانے پہنچا تو وہاں دوسرا پولیس انسپکٹر تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"سر! کل والے انسپکٹر صاحب نے ہمارے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میری اندھی بہن کو بدمعاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ ان کی آواز کے ذریعے انھیں پہچان سکتی ہے۔"

انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔"چلو میں تمھاری بہن سے پوچھتا ہوں۔"

وہ اس کے گھر آیا۔ اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔"لڑکی دروازہ کھولو میں تھانیدار ہوں۔ میں تم پر ظلم کرنے والوں تک پہنچ سکتا ہوں تم مجھ سے تعاون کرو۔"

اندر خاموشی رہی، جمال نے کہا۔"جناب یہ کچھ بولتی ہی نہیں ہے کل سے چپ ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے اس طرح تو یہ مر جائے گی اور اگر یہ مر جائے گی تو میں کبھی اس درندے تک نہیں پہنچ سکوں گا۔"

"تم اطمینان رکھو۔ ہم پولیس والے چوہے کے بل سے بھی مجرموں کو کھینچ کر لے آتے ہیں۔"

انسپکٹر آس پاس کی بستیوں میں جا کر مجرموں کو تلاش کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن جمال تھانے پہنچا تو وہ انسپکٹر جا چکا تھا اور پہلا انسپکٹر جو اس تھانے کا صحیح معنوں میں انچارج تھا وہ پھر اپنی کرسی پر نظر آ رہا تھا۔ اس نے جمال سے پوچھا۔"اب کیا ہے؟"

"سر! کل دوسرے انسپکٹر صاحب تھے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ آس پاس کی بستیوں میں جا کر مجرموں کو تلاش کریں گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں دوپہر کو کھانے کے بعد پاس والی بستی میں جاؤں گا۔ تم جاؤ۔"

وہ قانون کے محافظ سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ ناچار واپس آ گیا۔ شام کو بہن کی حالت یقیناً خراب ہو گئی ہو گی کیونکہ اندر سے بالکل آواز نہیں آ رہی تھی۔ دونوں باپ بیٹے دروازہ پیٹ پیٹ کر اسے بلاتے رہے تب کہیں شام کو جا کر اس نے نقاہت سے جواب دیا۔ اور کہا۔"اب بھی وقت ہے مجھے زہر لا دو۔ یوں بھوک پیاس سے دم نکلے گا تو کیا وہ درندہ مل جائے گا؟"

جمال نے کہا۔"لبنیٰ میں تمھاری خودکشی کی خواہش پوری کر دوں گا مگر ایک وعدہ کرو۔"

"تم جو کہو گے وہ کروں گی۔"

"دیکھو رات کا وقت ہے تم دروازہ کھول کر باہر آؤ گی تو ہم تمھیں نہیں دیکھ سکیں گے کوئی تمھیں نہیں دیکھ سکے گا۔ تم کچھ کھا لو، پانی پی لو۔ ذرا طاقت آئے گی تو میرے ساتھ... پاس والی بستی میں چلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں وہ درندہ مل جائے گا تو میں تمھیں جینے یا مرنے کے لیے آزاد چھوڑ دوں گا۔"

"میں جانتی ہوں میرا بھائی زبان کا دھنی ہے۔ اس اعتماد پر دروازہ کھول رہی ہوں۔"

دروازہ کھل گیا۔ باپ اور بھائی نے اسے سمجھا بجھا کر کھانا کھلایا۔ وہ اندھیرے میں تھی اور اپنے دوپٹے کو گھونگھٹ کی طرح اوڑھے ہوئے تھی۔ اپنا چہرہ نہیں دکھا رہی تھی۔ کھانا کھلانے کے بعد جمال نے ایک بڑی سی چادر دیتے ہوئے کہا۔"اسے اچھی طرح اوڑھ لو۔ تم منہ نہیں دکھانا چاہتیں۔ شریف زادیاں اپنی تباہی کے باوجود باحیا ہوتی ہیں۔ مرد عورت کی حیات چھین سکتا ہے حیا نہیں چھین سکتا۔"

وہ بہن کو لے کر رات کی تاریکی میں نکلا۔ پھر ایک طرف جانے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک چھوٹا سا مکان نظر آ رہا تھا۔ اندر لالٹین کی روشنی تھی۔ اس نے مکان کے قریب پہنچ کر کہا۔"لبنیٰ! یہ پولیس انسپکٹر کا مکان ہے۔ میں ایک بار پھر التجا کرتا ہوں شاید وہ ہمارے ساتھ پاس والی بستی میں چلنے کے لیے تیار ہو جائے۔"

وہ بہن کو لے کر دروازے پر آیا جہاں ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔"کیا بات ہے؟"

"ہم انسپکٹر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ابھی وہ کسی سے نہیں مل سکتے تھکے ہوئے ہیں آرام کر رہے ہیں۔"

"مجھے بات تو کر لینے دو۔ ہو سکتا ہے وہ میری بات سن لیں۔"

اندر سے انسپکٹر کی آواز سنائی دی، وہ سپاہی سے پوچھ رہا تھا۔"کون ہے جان محمد! کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

آواز سنتے ہی لبنیٰ نے اپنے بھائی کے بازوؤں کو سختی سے پکڑ لیا۔ اتنی مضبوطی سے کہ اس کے ناخن بازو میں گڑنے لگے۔ پھر وہ ایک لمبی سانس چھوڑتی ہوئی بولی۔"یہی ہے...!"

سپاہی کہہ رہا تھا۔"جناب! وہی سرپھرا مزدور ہے۔ اس بار اپنی بہن کو لے کر آیا ہے۔"

بند دروازے کے پیچھے سے آواز نہیں آئی۔ لبنیٰ نے ایک بھائی سے دور ہٹتے ہوئے کہا۔"میں نے وعدہ پورا کیا۔ بھیا اب اپنا وعدہ پورا کرو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

وہ دور جانے لگی۔ جمال کے دماغ میں جو آندھی چل رہی تھی اس کے پیش نظر نہ بہن نظر آ رہی تھی نہ دنیا۔ صرف تھانیدار کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ سپاہی نے راستہ روکنے کی کوشش کی تو اس کے منہ پر ایک گھونسہ پڑا۔ وہ اسے دھکا دے کر دروازے کو پیٹنے لگا۔"انسپکٹر کے بچے! دروازہ کھول، ہم نے تجھے پہچان لیا ہے۔ دیکھ میری بہن جا رہی ہے میں اسے روک رہا ہوں۔ تو باہر نکل آ۔ مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈال۔ بھائی کا رشتہ کہتا ہے بہن کی حفاظت کے لیے جاؤں، غیرت کہتی ہے پہلے تجھے ٹھکانے لگاؤں۔"

وہ دروازے پر ٹکریں مارنے لگا۔ اچانک ہی دروازہ کھل گیا۔ وہ ٹکریں مارتے مارتے اپنی ہی جھونک میں اندر دور تک گیا۔ پھر

فرش پر گر گیا۔ جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ غراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔"کہاں ہے تیری بہن جھوٹ بولے گی تو اسے گولی مار دوں گا۔"

"تم گولی مارنے کی دھمکی دے کر اس کا بیان بدلوانا چاہتے ہو؟"

جمال جہاں گرا تھا وہیں ایک تپائی پر لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بات کرتے کرتے اچانک ہی لالٹین کو اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی فرش پر لڑھکتا چلا گیا۔ ٹھائیں ٹھائیں دو بار گولی چلنے کی آواز سنائی دی پھر تاریکی چھا گئی لالٹین نیچے گر کر ٹوٹ گئی تھی اور بھڑک کر بجھ گئی تھی۔ وہ تیسری بار فائر نہ کر سکا۔ اندھیرے میں وہی تپائی اسے آ کر لگی تھی۔ ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ وہ تپائی سے لگنے والی چوٹ کو بھول کر اندھیرے میں ریوالور ڈھونڈنے لگا۔ فرش پر جھک کر ادھر سے ادھر جھاڑو پھیرنے کے انداز میں ہاتھ کو پھیلانے لگا لیکن ریوالور کہاں گیا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر یہی سمجھ میں آیا کہ جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگ نکلنا چاہیے۔ بعد میں سپاہیوں کو بلا کر اسے قابو میں کیا جائے گا۔

وہ فرش پر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر نہ نکل سکا۔ اچانک ہی جمال نے پیچھے سے آ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر دبوچتا ہی چلا گیا۔ سپاہی اندر آنے والا تھا لیکن گولیاں چلنے کے بعد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ باہر سے پوچھ رہا تھا۔"جناب کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟"

اس بار انسپکٹر نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔"اُلّو کے پٹھے! دور سے پوچھ رہا ہے، اندر آ کر میری گردن نہیں چھڑا سکتا۔"

جمال نے للکار کر کہا۔"خبردار! میرے ہاتھ میں ریوالور ہے اندر آؤ گے تو گولی مار دوں گا۔"

بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ سپاہی دُم دبا کر بھاگ رہا تھا۔ شاید تھانے والوں کو خبر دینے جا رہا تھا۔ جمال نے اس کی گردن میں بازو کی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔"یہ اکیلے کا کام نہیں ہو سکتا۔ تمھارے ساتھ کون تھا بتاؤ؟"

وہ جواب دینے کے بجائے اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زور آزمائی میں لگا ہوا تھا۔ جمال نے اس کے کنپٹی سے ریوالور لگاتے ہوئے کہا۔"یہ میرے پاس ہے۔ جواب نہیں دو گے تو کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔"

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔"بتاتا ہوں مجھے چھوڑ دو۔ وعدہ کرو مجھے جان سے نہیں مارو گے۔"

"جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو۔ تمھارے ساتھ کون تھا؟"

"رجب علی اور اس کے گھر کی نوکرانی۔"

"لیکن میری بہن نے تو رجب علی کی آواز نہیں پہچانی۔"

"وہ صرف تمھاری بہن کو یہاں تک پہنچانے کا ذمہ دار تھا۔ اس نے اپنی آواز نہیں سنائی تھی۔"

"کیا لبنیٰ کو اس وقت اغوا کیا جب وہ وڈیرے کی بیٹی کی منگنی میں شریک ہونے کے لیے گئی تھی؟"

"ہاں، رات کو سب لڑکیاں ڈھولک بجا کر گانے گا رہی تھیں جب تمھاری بہن وہاں سے جانے لگی تو اس کی ملازمہ نے کہا۔ آؤ میں تمھیں گھر تک پہنچا دوں۔ وہ گھر کی طرف لے جانے کے بجائے ادھر لے آئی۔ آدھے راستے ہی میں میرے دو آدمیوں نے اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا، اسے زبردستی اٹھا کر لے آئے۔"

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے جمال اپنے باپ کی زبان سے سن چکا تھا۔ وڈیرے کے ہاں سے رات کو واپس آتے وقت اس کی ملازمہ اسے گھر کی طرف لا رہی تھی کہ اسے کچھ لوگوں نے اغوا کیا۔ بے چاری ملازمہ چیختی چلاتی رہ گئی تھی یعنی اس ملازمہ نے دوہرا رول ادا کیا تھا۔ ایک طرف تھانیدار کے کام آ رہی تھی دوسری طرف چیختے چلاتے معصوم بن گئی تھی۔

اس نے کہا۔"تم میرے ساتھ گوٹھ میں چلو گے، وڈیرے کے سامنے اور لوگوں کے سامنے بیان دو گے۔"

"نن... نہیں مجھے معاف کر دو۔ دیکھو میں وعدہ کرتا ہوں، تمھاری بہن کا بہت اچھا رشتہ لاؤں گا۔ اسے عزت آبرو سے بیاہ دیا جائے گا۔ بات کو یہیں دفن کر دو۔ جمال! تم تعلیم یافتہ ہو، سمجھ دار ہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر بہن کو زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو اسے عزت آبرو سے بیاہ دو، ورنہ وہ سچ مچ اپنی جان پر کھیل جائے گی۔"

اس کی بات سنتے ہی یاد آیا کہ بہن تو جان پر کھیلنے کے لیے کہیں چلی گئی ہے۔ اس نے کہا۔"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اپنی بہن کی حفاظت پہلے کرنا چاہیے۔ تم کبھی لوگوں کے سامنے اپنا پول نہیں کھولو گے۔ قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے ہر ممکن ہتھکنڈے استعمال کرو گے اور میں تمھیں اس کا موقع ہی نہیں دوں گا۔"

یہ کہتے ہی اس نے گولی مار دی۔ پھر وہاں سے دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اپنی بہن کو آواز دینے لگا۔"لبنیٰ... لبنیٰ...!"

رات کے سناٹے میں دور تک اس کی آواز گونجتی جا رہی تھی۔ مگر بہن کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک بھٹکتا رہا۔ پھر اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر سوچا خودکشی کرنے والے کدھر جا سکتے ہیں۔ کوئی ایسی جگہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی پھر یاد آیا۔ تھانے کے قریب ہی ایک ڈھلان ہے جو دور نیچے تک گئی ہے۔ وہاں ایک تالاب ہے جو برسات کے موسم میں بھرا رہتا ہے اور عام دنوں میں خشک پڑا رہتا ہے۔

وہ اُدھر دوڑتا چلا گیا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ تھانے والے اس کی آواز سنیں گے۔ سارا گاؤں اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ وہ اپنی بہن کو دیوانہ وار آوازیں دے رہا تھا۔ آگے جا کر کچھ لالٹین کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی کئی ٹارچ روشن ہوگئیں۔ اسے چاروں طرف سے گھیرا جا رہا تھا۔ چیخ چیخ کر کہا جا رہا تھا۔ "جمال! اپنا ریوالور پھینک کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کردو۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے ورنہ تمھارے باپ کو تمھارے جرم کی سزا دی جائے گی۔"

وہ اُن کی پروا کیے بغیر بہن کو آواز دینے لگا۔ "لبنیٰ! تم کہاں ہو؟ میری بہن آواز دو۔"

اسی وقت کھائی میں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔

اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ نیچے گرا۔ پھر ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ اُس نے بار بار کوشش کی۔ لڑھکنے کا عمل کسی طرح رک جائے۔ وہ کسی نہ کسی چیز کو ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر تاریکی میں کوئی سہارا نظر نہیں آرہا تھا۔ آخر وہ لڑھکتا ہوا کسی چیز سے ٹکرا کر رک گیا۔ وہ کسی کا جسم تھا۔ اس نے چھو کر دیکھا تو بہن کو پہچان لینے میں دیر نہیں لگی۔ "لبنیٰ!... لبنیٰ!... تم یہاں ہو۔"

وہ اس کے بازو کو ہلا رہا تھا۔ ہولے ہولے جھنجھوڑ کر مخاطب کر رہا تھا۔ پھر اس نے چہرے کو ٹٹول کر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ محبت سے پکارنے لگا۔ تب پتا چلا کہ ہاتھ بھیگ رہا ہے۔ پانی سے نہیں لہو سے۔ وہ بہن کا خون تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا پتھر تھا۔ تاریکی میں اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ اس کی سختی کا اندازہ کیا۔ پھر یہ بات سمجھ میں آئی کہ بہن لڑھکتی ہوئی آئی تھی اور اس پتھر سے ٹکرا گئی تھی۔ سر ٹکرایا تھا اس لیے وہ جاں بر نہ ہوسکی۔ وہ پہلے ہی حیا سے مر چکی تھی۔ باقی جو جان بچی تھی وہ یہاں پتھر کے پاس آکر دے چکی تھی۔

چاروں طرف سے ٹارچ کی روشنی اُس پر پڑنے لگی۔ لالٹین کی روشنی میں دُور دُور تک سپاہی اور بستی والے نظر آرہے تھے۔ وہ سب لاٹھیاں اور چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لیے ہوئے تھے۔ رجب علی ہاتھ میں ریوالور پکڑے کہہ رہا تھا "جمال! خود کو قانون کے حوالے کردو۔ گولی چلاؤ گے تو اس سے پہلے میں تمھیں گولی مار دوں گا۔"

جمال نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا، وہ ریوالور سے خالی تھے۔ پتا نہیں نشیب میں لڑھکنے کے دوران کب اور کہاں ریوالور چھوٹ گیا تھا۔ اس نے غصے سے چیخ کر کہا "کتے میری بہن تیری بیٹی کے برابر تھی تو نے اس معصوم کو اس بدمعاش کے حوالے کردیا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیرے گھر کو آگ لگا دوں گا۔ تو میری بہن کو غریب اور بے آسرا سمجھ کر یہ بھول گیا تھا کہ تیری بھی دو بیٹیاں ہیں۔ میں اُن کے ساتھ جو سلوک کروں گا۔ وہ دُنیا دیکھے گی اور اپنے کان پکڑے گی۔"

ایک طرف سے ایک سپاہی نے کہا۔ "دیکھ جمال! تیرا باپ ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم اس کی ایسی پٹائی کریں گے کہ تو پہچان نہیں سکے گا۔ اس کی خیریت چاہتا ہے تو خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے سے پہلے ریوالور ہماری طرف پھینک دے۔"

جمال نے چیخ کر کہا "میں اپنے ریوالور سے ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ جو بھی قریب آئے گا زندہ نہیں بچے گا۔ پہلے میں اپنی بہن کی آخری رسمیں ادا کروں گا۔ اسے قبر میں اتاروں گا۔ اس کے بعد تم لوگوں سے نمٹ لوں گا۔"

رجب علی نے کہا "قانون سے ٹکرانے کی حماقت نہ کر۔ میں تیری بہن کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا تھا۔ وہ مر گئی تو کیا ہوا۔ اب بھی میں اُسے بیٹی کہوں گا۔"

"خبردار! اپنی ناپاک زبان سے اُسے بیٹی نہ کہنا ورنہ ایک گولی تیری طرف آئے گی۔"

وہ چپ رہا۔ اس کے بوڑھے باپ نے کہا "بیٹے جمال! ہم تو وہ لوگ ہیں جو ہر ظلم کو تقدیر کا لکھا سمجھتے ہیں۔ پہلے زمین گئی پھر ڈیڑھ لاکھ روپے گئے۔ اس کے بعد بیٹی کی عزت گئی۔ اب جان گئی۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا نظر آرہا ہے اور تیری گردن دکھائی دے رہی ہے بیٹے! اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ تجھے بھی جان سے جاتا دیکھوں۔ آپ یہاں سے بھاگ جا میرے بچے! میری پروا نہ کر۔ میں تیری بہن کو قبر میں اتار دوں گا۔ میں اسے سہاگ کا جوڑا نہ پہنا سکا کفن پہنا دوں گا۔"

"نہیں! میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس کے دشمنوں کو اس کی آنکھوں کے سامنے قتل نہیں کیا۔ اس کی روح بے چین ہوگی۔ اس کی آخری رسومات خود ادا کروں گا۔ اگر کوئی میرے قریب آیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔ آپ سب دُور چلے جاؤ میں آخری بار کہتا ہوں جتنی جلدی ہوسکے دُور ہو جاؤ ورنہ جو زیادہ قریب نظر آئے گا، گولی اُسے لگے گی۔"

کون بھلا گولی کھانا چاہتا تھا۔ وہ سب دُور ہٹنے لگے۔ لالٹین کی روشنی دُور ہونے لگی۔ جاتے جاتے ایک سپاہی نے فائر کیا۔ جمال نے چیخ کر "مجھے نادان نہ سمجھو۔ میں اندھیرے میں فائر کرکے گولیاں ضائع نہیں کروں گا۔"

پھر دوسری طرف سے فائرنگ نہیں ہوئی۔ وہ ذرا دیر انتظار کرتا رہا۔ لالٹین کی روشنیاں دُور ہوگئیں۔ وہ سب اس چڑھائی پر نظر آرہے تھے جہاں سے اس کی بہن اور پھر وہ لڑھکتا

ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

اُس نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا۔ پھر جھک کر بہن کی لاش کو اٹھانے لگا۔ اسی وقت دُور کہیں سے آواز سنائی دی۔ "اِسے ریوالور تو یہاں پڑا ہوا ہے۔"

اس نے ایک دم سے پلٹ کر بلندی کی طرف دیکھا۔ ایک لالٹین والا زمین پر سے ریوالور اٹھا کر رجب علی کو دکھا رہا تھا۔ تب پتا چلا، جمال جھوٹ بول رہا تھا، دھوکا دے رہا تھا اس کے پاس ریوالور نہیں تھا۔ پھر تو سب کے سب اس کی طرف دوڑتے چلے آئے۔ بستی کے لوگ اس کے دشمن نہیں تھے۔ لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو وڈیرے کے حکم سے مجبور تھے۔ وہ جو کہتا تھا اس پر بے چون و چرا عمل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تھانے کے سپاہی بھی تھے۔ وہ اس کے پاس آتے ہی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ لاٹھیوں اور رائفل کے کندوں سے اس کی پٹائی کرنے لگے۔ پولیس والے اور وڈیرے کے خاص آدمی جمال سے خوفزدہ تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اُس پر خون سوار ہے۔ اگر اُسے پوری طرح قابو میں نہ کیا گیا تو پھر یہ بے قابو ہو جائے گا، اور ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اور انتقام لینے دوبارہ آئے گا پھر کسی کی خیریت نہیں ہوگی۔

رجب علی نے کہا "بس کرو۔ کیا اسے جان سے مار ڈالو گے؟"

تب لوگوں کے ہاتھ رکے۔ انھوں نے دیکھا تو جمال بیہوش ہوچکا تھا۔ اس کا بوڑھا باپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کبھی بے ہوش بیٹے کو، کبھی مُردہ بیٹی کو۔ اس کی سمجھ میں... نہیں آرہا تھا کہ مُردہ بیٹی کا ماتم کرے یا بے ہوش جوان اولاد کے لیے فریاد کرے، انصاف مانگے۔

انصاف آسانی سے نہیں ملتا۔ اُسے جب ہوش آیا تو اس نے خود کو حوالات میں پایا۔ دوسری صبح پھر اس کی پٹائی کی گئی۔ تھانے والوں کو اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ ملزم کے جسم پر اذیت رسانی کے آثار پائے جائیں گے۔ انھوں نے پہلے ہی رپورٹ تیار کرلی تھی کہ ملزم کو زبردست مقابلے کے بعد گرفتار کیا گیا ہے۔ بستی والے اور رجب علی گواہ تھا کہ اچھی طرح اس کی پٹائی کرنے کے بعد ہی اسے قابو میں لایا گیا تھا۔ بہرحال وہ عدالت تک پہنچایا گیا۔ سینٹرل جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہا۔ مگر اس کی حمایت میں کوئی بولنے والا نہیں تھا۔ اس کے باپ کو دھمکی دی گئی تھی کہ وہ کوئی وکیل نہ کرے۔ اور وہ کرتا بھی کیسے، ہر جگہ سے لُٹ چکا تھا۔ ایک ایک پیسے کا محتاج تھا۔ تمام ثبوت جمال کے خلاف تھے۔ پوری بستی اس کے خلاف گواہی دے رہی تھی۔ ایسے میں وہ سزا سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اُسے پھانسی نہ ہوتی کیونکہ اسے مشتعل کیا گیا تھا قتل پر مجبور کیا گیا تھا۔ تاہم اسے عمر قید کی سزا ہوسکتی تھی

ابھی اس کے مقدر میں آزادی لکھی ہوئی تھی۔ اسے کھلی فضا میں سانس لینا تھا۔ جیل کی چار دیواری میں اس کی ملاقات ایک ایسے انگریز سے ہوئی جو ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا۔ وہ اس جرم میں گرفتار ہوا تھا کہ لوگوں کو بلوچستان کے راستے ملک سے باہر لے جاتا تھا اور اُن سے اچھی خاصی رقمیں وصول کرتا تھا۔ اس نے پوچھا "تمھارا نام کیا ہے؟"

"جمال احمد جسکانی۔ اور تمھارا نام؟"

"مجھ کو آرتھر کہتے ہیں۔ تم نے ایک قتل کیا ہے؟"

"ہاں، دوسرا کرنے کی حسرت ہے۔"

"اگر یہاں سے نکل سکو تو کتنے قتل کرسکتے ہو؟"

"جتنے دشمن ہوں گے۔"

"تم نے کیوں قتل کیا تھا؟"

اس نے مختصر سی رُوداد سنائی۔ آرتھر نے سننے کے بعد ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا "جو لوگ کمزور یا بزدل ہوتے ہیں اپنی بہن کی بے عزتی کا، اپنے خاندان کی تباہی کا انتقام نہیں لے سکتے، اُن کے دلی جذبات سمجھ سکتے ہو؟"

"ہاں وہ اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہوں گے میری طرح زندگی گزارتے ہوئے بے بسی سے مر جاتے ہوں گے۔"

"اگر کبھی دوسری بہنوں کی عزت خطرے میں پڑ جائے تو کیا تمھیں اپنی بہن یاد آئے گی؟"

"ہاں۔ اب کسی بھی لڑکی کے سر سے آنچل کھینچا جائے گا تو میں کھینچنے والے کا ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں گا۔ کوئی بوڑھا اپنی بیٹی کی لاش کے پاس کھڑا ہوگا اور اپنے جوان بیٹے کی بے بسی کا ماتم کر رہا ہوگا تو میں ماتم کرانے والوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تم کام کے آدمی ہو۔ کیا تعلیم یافتہ ہو؟"

"ہاں میں نے دس جماعتیں پاس کیں۔ کالج میں پڑھنا چاہتا تھا۔ پھر ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے مجبور ہوکر ایک مل میں ملازمت کرنی پڑی۔ وہاں سے میری نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ میں رفتہ رفتہ مزدور لیڈر بن گیا۔ لیڈر کی حیثیت سے مجھے اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اخبارات میں تصویریں شائع ہونے لگیں۔ مل اور کارخانے کے مالکان مجھ سے خوفزدہ تھے۔"

آرتھر اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا پھر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا "تم تو بہت ہی کام کے آدمی ہو۔ مجھے کسی ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے جو مزدوروں کو اپنی مٹھی میں رکھنا جانتا ہو۔ اگر تمھارا ذکر اخبارات میں ہوتا رہا ہے۔ تمھاری تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں تو ہمارے پاس

کی کانفیڈنشیل لسٹ میں تمھارا نام ضرور ہوگا۔ فی الحال تم مجھے لیڈر کی حیثیت سے ایک ایسی تقریر سناؤ جس میں مل مالکان، کارخانہ داروں، حکومت اور نوکر شاہی پر خوب کیچڑ اچھالی گئی ہو۔"

"میں کیوں ایسی تقریر کروں؟"

"مجھے تمھاری باتیں تمھارا انداز پسند آیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ تم جدھر جاؤ گے ادھر مزدوروں کا سیلاب جائے گا تو میں تمھیں جیل کی چار دیواری سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

جمال جیسکانی نے بے یقینی سے پوچھا "تم مجھے کس طرح یہاں سے نکالو گے؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اگر تم رہائی چاہتے ہو، اپنے دشمنوں سے انتقام لینا چاہتے ہو، ایک شاندار مستقبل بنانا چاہتے ہو تو مجھے اپنی شعلہ بیانی کا ثبوت دو۔"

وہ سوچنے لگا۔ آرتھر نے کہا "ہو سکتا ہے آئندہ پیشی میں سزا سنا دی جائے۔ اگر سزائے موت کا حکم ہو گیا تو تمھیں یہاں سے نکال کر پھانسی پانے والے مجرموں کی کال کوٹھری میں پہنچا دیا جائے گا۔ پھر نہ مجھ سے ملاقات ہو سکے گی اور نہ ہی تمھارے لیے کچھ کر سکوں گا۔ یقین کرو، یہ جو آہنی دروازے پر بڑا سا تالا پڑا ہوا ہے میں اسے تمھارے سامنے کھولوں گا، تمھیں اپنی جگہ رکھوں گا اور خود باہر نکل جاؤں گا۔"

"اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو اب تک یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا "میں یہاں سزا پانے کے لیے نہیں قیمتی ہیرے تلاش کرنے آتا ہوں۔ ایک ہیرا شاید اس وقت میرے سامنے ہے۔ اگر اپنے جوہر دکھاؤ گے تو عیش کرو گے۔"

جمال نے اچانک ہی تقریر شروع کر دی پہلے دھیمے انداز میں ابتدا ہوئی پھر اس میں شدت آتی گئی۔ وہ تقریر کرتے کرتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ٹہلتے ہوئے مٹھی باندھ کر غصے کے انداز میں یوں بولنے لگا جیسے اپنے دشمن وزیرے کو مٹھی باندھ کر گھونسا مار رہا ہو۔ مزدوروں کو سہانے شاندار مستقبل کا یقین دلا رہا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا "ہر رات کی صبح ہوتی ہے آج اندھیری رات ہے کل صبح سویرا طلوع ہوگا۔"

ایک سپاہی نے آ کر سلاخوں کو ڈنڈے سے بجاتے ہوئے کہا "اے! کیوں چلا رہے ہو چپ چاپ سو جاؤ ورنہ ڈنڈے برسائے جائیں گے۔"

آرتھر اپنی جگہ سے اٹھ کر سپاہی کے پاس گیا پھر سرگوشی میں کچھ کہنے لگا۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔ آرتھر نے پلٹ کر جمال کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہو گیا ہے تمھارے مقدر میں آزادی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہی سپاہی آیا، اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چھوٹی سی چیز نکالی اور اسے سلاخوں کے درمیان بڑھا دیا۔ آرتھر نے اسے ہاتھ میں لے کر آہستگی سے کہا "ٹھیک ہے تھوڑی دیر بعد واپس لے جانا۔"

سپاہی چلا گیا۔ آرتھر سلاخوں کے قریب ہی بیٹھ گیا پھر اس چھوٹی سی چیز کو منہ کے پاس لے جا کر کچھ کرنے لگا۔ جمال نے قریب آ کر دیکھا۔ وہ پاکٹ ریڈیو کی طرح تھا اس کا ایریل اوپر کی طرف نکلا ہوا تھا۔ جب آرتھر نے کچھ کہنا شروع کیا تو پتا چلا وہ ٹرانسمیٹر ہے۔ وہ دستور کے مطابق کوڈ ورڈز ادا کرنے کے بعد کہہ رہا تھا "لیبر یونین کی فہرست دیکھی جائے کیا اس میں جمال احمد جیسکانی مزدور رہنما کا نام ہے؟ اگر ہے تو وہ کس حد تک ہمارے لیے کارآمد ہے۔ یہ جمال میرے ساتھ قید خانے میں ہے ہو سکتا ہے آئندہ پیشی میں اسے پھانسی کی سزا سنائی جائے۔ اب آپ ہی اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔ یہ ٹرانسمیٹر صرف آدھے گھنٹے کے لیے ملا ہے۔ جواب فوراً چاہیے۔"

اس نے بات ختم کر دی۔ ٹرانسمیٹر کو آف کر دیا۔ جمال نے حیرانی سے پوچھا "تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "ایک عدالت نیچے ہے زمین پر، ایک عدالت اوپر ہے آسمان پر، لیکن آسمانی عدالت کے فیصلے تو مرنے کے بعد سنے جائیں گے۔ زمینی عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی ہم تمھیں نکال کر لے جائیں گے۔"

دس منٹ کے بعد ہی ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ اس نے آن کر کے کہا "یس آرتھر اٹینڈنگ۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "آرتھر! تمھاری جیل یاترا ہمیشہ کامیاب رہتی ہے تم بہترین ہیرے تلاش کر کے لاتے ہو۔ اگرچہ جمال احمد جیسکانی ہیرا ہے مگر تراشیدہ نہیں ہے۔ ہم اسے تراش لیں گے۔ تم وہاں سے دو بجے نکلو گے۔ تین بجے ہیلی کاپٹر اسی جگہ کھڑا رہے گا۔ متعلقہ لوگوں تک ان کی رقم پہنچا دی گئی ہے اوور اینڈ آل۔"

جمال احمد جیسکانی اس وقت حیرت کے سمندر میں...

ڈوبا ہوا کھلی فضا میں سانس لے رہا تھا اور ہیلی کاپٹر میں بیٹھ آزادی سے سفر کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، پلک جھپکتے ہی کیا ہو گیا۔ شام تک اس بات کی ایک ذرا امید نہیں تھی کہ کوئی اسے سزا سے بچا سکے گا۔ قیدیوں کو سخت پہرے میں رکھا جاتا ہے انھیں ہتھکڑیاں پہنائی جاتی ہیں۔ ملزم زیادہ خطرناک ہوں تو زنجیریں پہنائی جاتی ہیں۔ آہنی سلاخوں کے پیچھے رکھا جاتا ہے، سنگینوں اور بندوقوں سے یقین دلایا جاتا ہے وہ دیواروں سے اپنا سر پھوڑ سکتے ہیں لیکن آزادی حاصل

نہیں کر سکتے۔ اور ایک غیر ملکی کتنی آسانی سے اس جیل خانے میں بیٹھے بیٹھے اسے آزادی دلا کر ساتھ لے جا رہا تھا۔

وہ صبح ہونے سے پہلے کابل پہنچ گئے۔ آرتھر نے اسے ہوٹل کے کمرے میں ٹھہرایا۔ اس کا نام، ولدیت اور پاکستانی پتا نوٹ کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ جب شام کو آیا تو اس کے ہاتھوں میں اس کا اپنا اور جمال کا پاسپورٹ ویزا اور دوسرے اہم کاغذات تھے۔ جمال نے اپنا پاسپورٹ لے کر حیرانی سے دیکھا۔ پھر بولا "اچھا! یہ کیسے تیار ہو گیا؟"

"تمھارے ملک کا پاسپورٹ ہے ہم دوسرے ملک میں بھی تیار کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اب تم باقاعدہ ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے سفر کرو گے۔ ہمارا ایک آدمی تمھیں امریکا لے جائے گا۔"

دوسری صبح آرتھر نے اسے ایک پاکستانی اخبار لا کر دیتے ہوئے کہا "اس کے پہلے صفحے پر اپنے متعلق پڑھو۔"

اس نے پڑھا۔ لکھا تھا "دو قیدی فرار ہو گئے ان میں سے ایک غیر ملکی تھا جو لوگوں کو غیر قانونی طور پر سرحد پار لے جاتا تھا۔ دوسرا ایک مقامی نوجوان جمال احمد تھا۔ اس پر قتل کا الزام ثابت ہو چکا تھا اور آئندہ پیشی میں شاید سزا سنائی جانے والی تھی۔ ہماری فرض شناس پولیس ان کی تلاش میں ہے۔ ان کی مستعدی سے پتا چلتا ہے کہ مفرور مجرم جلد ہی گرفتار ہو جائیں گے۔" جمال نے اخبار کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ میں رہائی پانے کے بعد اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکوں گا مگر تم مجھے یہاں لے آئے ہو۔"

"انتقام لینے کے لیے اپنے بازو بھی مضبوط رکھنے پڑتے ہیں اور اپنی پشت بھی۔ جب تک پشت پناہی نہیں ہو گی، اس وقت تک کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

"مجھے امریکہ کیوں جانا چاہیے؟"

"ایک کامیاب ترین لیڈر بنانے کے لیے تمھیں وہاں ایسی ٹریننگ دی جائے گی ایسی تعلیم دی جائے گی کہ اپنے ملک واپس آنے کے بعد تم ایک کنگلے مزدور لیڈر ہی نہیں رہو گے بلکہ بہت دولت مند بھی بن جاؤ گے۔ کسی بھی حکومت کو مزدوروں کی آڑ میں بلیک میل کر سکو گے۔"

"کوئی حکومت معقول ہو، مزدوروں کے مطالبات پورے کرتی ہو تو میں اسے بلیک میل کیوں کروں گا؟"

"بھائی تھوڑا تھوڑا سب کو کھانا چاہیے۔ تم صرف مزدوروں کو کھلاؤ گے، ہمیں نہیں کھلاؤ گے، خود نہیں کھاؤ گے؟ تمھیں رفتہ رفتہ علم ہوگا کہ لیڈری ایک کاروبار ہے جو مختلف پارٹنروں کے درمیان سمجھوتے کے ذریعے ہوتا ہے مثلاً ایک پارٹنر تم ہو۔ اب تک صرف لیڈری کرتے رہے۔ اپنے لیے کچھ نہیں کیا۔ اگر کچھ کرتے تو آج تمھارا مقدمہ لڑنے والا کوئی وکیل ہوتا۔ تمھارے پاس دولت ہوتی تو بہن کی شادی دھوم دھام سے کرتے۔ تمھارے پاس دولت ہوتی تو صرف تھانیدار سے نہیں بلکہ اپنے وڈیرے سے بھی انتقام لے سکتے۔ اب جو انتقام لو گے تو وہ ہمارے سہارے لو گے۔ اس لیے دوسرے پارٹنر ہم ہیں۔ ہم تمھیں انتقام لینے کے طریقے بتائیں گے۔ تم صرف ایک رجب علی سے نہیں ایسے ہزاروں ظالموں سے انتقام لے سکو گے۔"

"میں پہلے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"کیا تم تعلیم حاصل کیے بغیر کسی کاغذ پر دستخط کر سکتے ہو؟ پہلے تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے پھر کسی دستاویز پر دستخط کرنے کے قابل ہو گے۔ لہٰذا پہلے سیکھو، ہم سکھائیں گے۔ ہم تمھارے اخراجات برداشت کریں گے تمھارا مستقبل بنائیں گے۔ ہمیشہ تمھارا تحفظ کریں گے۔ صرف تمھارے ملکی قانون سے نہیں، بلکہ بین الاقوامی قوانین سے بچاتے رہیں گے۔ اس کا معاوضہ ہمیں ملنا چاہیے لہٰذا اس لیڈری کے کاروبار میں ہم تمھارے دوسرے اہم پارٹنر ہیں۔"

"تیسرا پارٹنر کون ہے؟"

"پولیس والے۔ ان کے ساتھ کس طرح گٹھ جوڑ ہوتا ہے اس کا پورا کورس تمھیں پڑھایا اور عملی طور پر سکھایا جائے گا۔"

"لیکن سارے ہی پولیس والے بددیانت اور رشوت خور نہیں ہوتے۔"

"جو رشوت خور نہیں ہوتے ہم ان کا ٹرانسفر کرا دیتے ہیں تم فکر نہ کرو۔"

"میں لیڈر ہوں، آج تک یہ معلوم نہ تھا کہ اس لیڈری کے کاروبار میں ایسے ایسے پارٹنر ہوتے ہیں۔ یہ بتاؤ چوتھا پارٹنر کون ہے؟"

"حکومت۔ جو بھی سیاسی پارٹی حکومت کر رہی ہو، مزدور لیڈر کی ساتھی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے دورِ حکومت میں مزدور تحریک، توڑ پھوڑ اور صنعتی تباہی نہیں چاہتی تو اسے لیڈر کی بات ماننی پڑتی ہے۔ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ہر حکومت ہمیں خوش رکھتی ہے۔ ہم خوش رہتے ہیں تو تمھارے جیسے لیڈروں کو بھی خوش رکھتے ہیں اور ان کا ہر طرح سے تحفظ کرتے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ لیڈری کے کاروبار میں چار پارٹنر ہوتے ہیں ان چاروں کے نام گنوا دیے۔ مزدور کہاں گئے؟"

"مزدور کہاں ہوتے ہیں؟ انھیں تو بھگی نصیب نہیں ہوتی، بھلا کاروبار میں انھیں پارٹنر کون بناتا ہے۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے مزدوروں کی اسٹڈی کرو گے تو پتہ چلے گا کہ یہ مزدور صدیوں سے تقریریں سنتے آتے ہیں۔ اور

تقریروں سے پیٹ بھرتے آئے ہیں۔ انھیں صرف لفظوں کی بازی گری سے مطمئن کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ان کا ایک چھوٹا مطالبہ تسلیم کر کے انھیں خوش کر دیا جاتا ہے۔ ابھی اس سلسلے میں مجھ سے بحث نہ کرو۔ جب تم ہمارے تربیتی اسکول میں پہنچو گے تو سب کچھ سیکھ کر وہاں سے نکلو گے۔"

دوسرے دن وہ ایک امریکی ریاست الباما میں کرائے کے سپاہیوں کی تربیت کے اسکول میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسکول سے پاس ہونے والے دوسرے ضرورت مند ممالک کے حکام سے یا اُن حکام کے مخالفوں سے اچھی خاصی رقم لے کر وہاں چھاپہ مار جنگ کرتے ہیں۔

یہ کوئی قصے کہانیوں والی بات نہیں ہے۔ امریکی ریاست الباما میں یہ اسکول آج بھی موجود ہے اور بڑے تعجب کی بات یہ کہ یہ اسکول غیر قانونی نہیں ہے۔ امریکی حکومت کرائے کے فوجیوں کو قانونی سمجھتی ہے اور اپنے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتی ہے۔ پھر وہی بات کہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے تو یہ ایک قانونی عمل ہے۔ یہی لوگ امریکہ کے خلاف کسی دوسرے ملک کے آلۂ کار بن جائیں یا اپنا جائز مطالبہ منوانے کے لیے کوئی قدم اٹھائیں تو دہشت گرد کہلاتے ہیں۔

❀❀

میں دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ تین پاکستانی جوانوں کے متعلق مکمل معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق اپنی پسند کے مقامات تک پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے دہشت گردی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ابھی ایک اور پاکستانی کا ذکر لازمی ہے اور وہ پاکستانی کوئی مرد نہیں، ایک عورت ہے۔ اور اس کا نام آمنہ بابر ہے۔

فرانس کے ایک مغربی ساحلی علاقے کا نام لی ہاوری ہے۔ وہاں ایک دہشت گرد تنظیمی ادارے میں سب آمنہ سے واقف ہیں۔ کوئی اگر پوچھتا ہے "آمنہ کی پہچان کیا ہے؟" جواب ملتا ہے "آمنہ کا آمنا سامنا کرو۔ موت نظر آئے گی۔"

میں آمنہ کے دماغ میں پہنچنے والا تھا کہ شبانہ نے آ کر کہا۔

"ڈاکٹر شیفرڈ آ گئے ہیں۔"

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ پھر ڈاکٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے، میں آپ کو آرام کرنے کا موقع نہیں دیتا ہوں۔ بار بار اپنے لیے دوڑاتا رہتا ہوں۔"

"تم بعض اوقات غیروں کی طرح باتیں کرتے ہو جب کہ جانتے ہو تمھارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ زیادہ باتیں نہ کرو کام بتاؤ۔"

"میں اصلی روپ میں آنا چاہتا ہوں۔ اوہ! میں تو آپ سے تعارف کرانا ہی بھول گیا۔ یہ ہے قاف کی شہزادی شبانہ۔"

ڈاکٹر اور شبانہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ میں نے تعجب سے پوچھا "کیا ہوا؟"

ڈاکٹر نے کہا "جب تم خیال خوانی کے لیے مراقبے میں جاتے ہو تو دنیا والوں کے لیے گویا سو جاتے ہو۔ ہمارے لیے بھی تم سو رہے تھے جب ہم اور شبانہ ایک دوسرے سے خود ہی تعارف حاصل کر رہے تھے۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے ایک شہزادی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی پی ہے۔ آدھے گھنٹے تک گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد تمھیں بلایا گیا ہے۔"

شبانہ مجھے دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ میں نے کہا "ڈاکٹر! اس کی خواہش ہے کہ ..."

ڈاکٹر نے میری بات کاٹ کر کہا "کہ شہزادی تمھارا اصلی چہرہ دیکھے۔ بھئی اس کے لیے میں تمام ضروری سامان لے آیا ہوں۔ آئینے کے سامنے چلو۔"

میں اُٹھنے لگا، ڈاکٹر نے کہا "ذرا ٹھہرو۔ پہلے وہ تصویریں دیکھ لو جس کا چہرہ اپنانے والے ہو۔"

اُس نے اپنے بیگ میں سے ایک فائل نکالتے ہوئے کہا "تمھاری خاطر میں کلینک سے اپنے گھر گیا۔ پھر گھر سے یہ فائل لی۔ تم جانتے ہو میرے پاس چہرہ تبدیل کرانے کے لیے اپنے عیب چھپانے کے لیے ایسے ایسے لوگ آتے ہیں جو حالات سے مجبور ہو کر اپنا سارا ریکارڈ، اپنی ساری ہسٹری میرے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی روپوش ہو جاتا ہے، کوئی نہ جانے کیوں پلٹ کر نہیں آتا۔ اور کوئی اس دنیا سے ہی اُٹھ جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا "جس کی تصویریں لائے ہیں وہ اس دنیا میں موجود ہے یا نہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔ وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں اس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرنے کے لیے تیار تھا لیکن دوسری صبح کلینک میں پہنچا تو نرس نے بتایا، وہ جا چکا ہے۔ رات کو کسی وقت اُٹھ کر چلا گیا۔ کوئی نہیں جانتا لیکن تم یہ سوال کیوں کرتے ہو؟ تصویر دیکھو، اس کی آنکھوں میں جھانکو اور معلوم کر لو۔"

میں نے تصویر دیکھی۔ اچھا خوبرو جوان تھا لیکن بیمار نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "جب یہ میرے پاس پہنچا تو بُری طرح زخمی تھا۔ اپنے زخموں کو لباس کے اندر چھپانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ تمھارے مقابلے میں بہت ہی دُبلا پتلا تھا۔ اگر وہ صحت مند ہوتا تو یقیناً اس کی جسامت تمھاری طرح ہوتی۔"

اس دوران میں نے تصویر کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کیا۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "بے چارا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا "ایک عورت فون پر مجھے دھمکی دیتی ہے۔ اس نے پہلی بار فون کیا تو میں نے اُسے نظر انداز کر دیا۔ دوسری بار، ایک ہفتہ پہلے پھر فون کیا تھا۔ اس بار اُس نے مجھے سختی سے وارننگ دی تھی، اور کہا تھا اگر میں اس کے شوہر کا پتا نہیں بتاؤں گا تو وہ یہی سمجھے گی کہ اُسے غائب کرنے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ لہٰذا وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

"کیسے بتاتا؟ میں تمھارے چہرے پر کرسٹوفر میکی کا میک اپ کرنے کے لیے لبنان سے آیا۔ تب مجھے اس کا فون موصول ہوا۔ اس کے بعد تم نے مجھ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ ایک بار سرسری سی گفتگو کی پھر چوبیس گھنٹے پہلے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے سوچا، تم اپنی مصروفیات سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں اس عورت کے متعلق بتاؤں گا۔ اور بتانا کیا ہے، تم اُس کے شوہر کے میک اپ میں رہو گے۔ تو میں تمھیں اُس کے حوالے کر کے اپنا پیچھا چھڑا لوں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟ کیوں مجھے کسی نئی مصیبت میں پھنسانا چاہتے ہو؟ آخر کون ہے وہ عورت؟"

"میں نے اس کی آواز سُنی ہے، اسے دیکھا نہیں ہے۔"

"اُس نے نام تو بتایا ہو گا؟"

میں نے نام پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگی آمنہ کے آمنے سامنے ہمیشہ موت ہوتی ہے۔ نام نہ پوچھو، میرے آدمی کا پتا بتاؤ۔"

میں چونک کر ڈاکٹر کا منہ دیکھ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے آمنہ بابر کے دماغ میں پہنچ کر ایک ذرا خیال خوانی کی تھی۔ اسکے دماغ کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بہرحال میں نے فوراً ہی اس فائل کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اُس میں تصویر والے کا نام لکھا ہوا تھا۔ "بابر جلال" اس نسبت سے آمنہ کا نام آمنہ بابر تھا۔

ڈاکٹر شیفرڈ نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"میں سوچ رہا ہوں۔ اس عورت نے تمھیں اپنا پتا ٹھکانہ نہیں بتایا ہو گا تو اتنا ضرور کہا ہو گا کہ آئندہ وہ پھر کب رابطہ قائم کرے گی؟"

"شاید اس عورت کی کچھ مجبوریاں ہیں ورنہ وہ وارننگ دینے کے بجائے خود میرے سر پر پہنچ جاتی۔ اس نے کہا تھا، وہ جلد ہی میرے پاس آئے گی۔"

میں ڈاکٹر کی باتیں سُننے کے دوران فائل کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔ پھر میری مطلوبہ چیز مل گئی۔ ایک لفافے میں بابر جلال اور آمنہ بابر کی بہت سی تصویریں تھیں۔ میں آمنہ کے دماغ میں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اب اُسے صورت شکل سے پہچان رہا تھا۔ صورت کے اعتبار سے ظاہر ہے بے حد حسین ہونا چاہیے کیونکہ جرائم کے بین الاقوامی بازاروں میں عورت کا بے حد حسین ہونا لازمی ہے۔ تصویر میں وہ اس قدر حسین نظر آ رہی تھی جس قدر حسن کی قدر ہوتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مسکرا رہی تھی، لیکن مسکراتی ہوئی ان سنجیدہ آنکھوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ غیظ و غضب کی حالت میں کس طرح ناگن بن جاتی ہو گی۔

شبانہ نے کہا "تم ان تصویروں کو یوں غور سے دیکھ رہے ہو جیسے آج ہی اس شخص کے میک اپ میں آ جانا ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "بھئی آج میک اپ نہیں کروں گا۔ صرف اصلی چہرے کے ساتھ تمھارے سامنے رہوں گا۔"

ہم آئینے کے سامنے آ گئے۔ میں نے ایک کرسی پر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر! کیا پلاسٹک سرجری کا میک اپ ختم کرنے کے دوران بھی خاموش رہنا پڑتا ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں تم اس لیے پوچھ رہے ہو کہ خاموش رہنے کی ہدایت ملتے ہی خیال خوانی شروع کر دو۔"

شبانہ نے کہا "اپنے سامنے والوں سے کترانے کا یہ بڑا اچھا طریقہ ہے۔ جب بیزار ہوتے تب کہہ دیا خیال خوانی کر رہے ہیں۔ پھر سامنے بیٹھے ہی بیٹھے دُور چلے گئے۔ یہ ٹیلی پیتھی بھی کمال کی چیز ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "میں خیال خوانی نہیں کروں گا۔ تم بابر جلال کا فائل اُٹھاؤ اور اُسے کھول کر شروع سے پڑھتی جاؤ۔ تاکہ اس کی تمام ہسٹری شیٹ سے واقف ہوتا رہوں۔"

اُس نے ایک ڈائری کو کھولتے ہوئے کہا "جب ہسٹری شیٹ معلوم کرنی ہے تو ڈائری کو پڑھنا مناسب رہے گا۔"

ڈائری مکمل طور پر لکھی ہوئی نہیں تھی۔ کچھ صفحات خالی تھے۔ خاص خاص واقعات لکھے ہوئے تھے۔ اتنا ہی میرے لیے کافی تھا۔

اِس ڈائری کے مطابق بابر جلال بہار کے شہر پٹنہ کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں وہ مشرقی پاکستان گیا۔ ۱۹۶۵ء میں سید پور سے میٹرک پاس کر کے ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ وہیں آمنہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات آہستہ آہستہ گہرے ربط و ضبط اور عشق و محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔

وہ مزاج کے اعتبار سے شعلہ بھی تھی اور شبنم بھی۔ جب اچھے موڈ میں ہوتی تو نہایت سنجیدگی سے گفتگو کرتی۔ ہر مسئلے کو بڑی ذہانت سے حل کرتی مگر غصے کے وقت کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔ زیادہ طیش میں آتی تو جو چیز سامنے آتی وہ پھینک کر مارنا شروع کر دیتی۔ اُس نے غصے کو برداشت کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ جب برداشت کر لیتی تو سب پریشان ہو جاتے تھے۔ اور سمجھتے تھے ضرور کوئی چال چل رہی ہے اپنے مخالف

کی نیندیں حرام کر دے گی اور یہی ہوتا تھا۔ دو چار روز میں لوگ دیکھتے تھے کہ جس نے اس کی مخالفت کی ہوتی وہ کسی نہ کسی طرح زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ جاتا تھا یا پھر اپنی کسی قیمتی چیز کے چوری ہونے کا ماتم کرتا رہتا تھا۔

چھاترو لیگ کے تمام طلبہ اُسے چاہتے تھے ۔ وہ ان کی ہر تحریک میں حصہ لیتی تھی ۔ زبان کے مسئلہ پر شہید ہونے والے طلباء کے مزاروں پر پھول چڑھاتی تھی اور جوشیلی تقریریں کرتی تھی۔ ایک بار بہت سے طلباء کے ساتھ پولیس والوں نے اُسے بھی گرفتار کر لیا ۔ وہ ایک ماہ تک جیل میں رہی جیل ایسی جگہ ہے جہاں پہنچ کر عورتوں میں بھی مردانہ صفات پیدا ہو جاتی ہیں ۔ وہ پہلے بھی کسی سے کم نہیں تھی جیل سے نکلی تو کچھ اور ہی بے باک ہو گئی ۔ دو دن بعد ہی وہ پولیس آفیسر جس نے اُسے اور اس کے ساتھی طلباء کو گرفتار کیا تھا، اچانک مر گیا۔ پتا چلا اس کے کھانے میں کسی نے زہر ملا دیا تھا۔ پولیس والے قاتل کو تلاش کرنے لگے لیکن اس کا کوئی نام نشان تک نہیں تھا۔ طلباء کی اکثریت سمجھ رہی تھی ۔ وہ سب آمنہ کو جس قدر چاہتے تھے اسی قدر اس سے ڈرتے بھی تھے ۔

پھر بنگلہ دیش کی تحریک شروع ہوئی آمنہ نے اعلان کر دیا کہ وہ اس تحریک کا ساتھ نہیں دے گی۔ وہ پاکستانی ہے اور پاکستانی رہے گی ۔ اور اگر پاکستان کی بقا کے لیے چھاترو لیگ کی مخالفت کرنی پڑی تو بھی اس سے باز نہیں آئے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس جماعت سے الگ ہو گئی ۔ حالات اور مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی ۔ وہ لڑکے جو اس پر جان دیتے تھے، اس کی جان کے دشمن ہو گئے ۔

پھر ایک دن ایک بڑا سا ٹرک عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا میمن سنگھ سے آیا۔ وہاں تمام بہاریوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ صرف اُن کی عورتوں اور بچوں کو میمن سنگھ سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ پناہ لینے ڈھاکہ آئے تھے اس لٹے ہوئے قافلے میں آمنہ کی بیوہ بھابی بھی تھی یعنی آمنہ کے بھائی کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر وہ بھلا کیسے برداشت کرتی ۔ وہ تو اسی رات میمن سنگھ جانا چاہتی تھی اپنے بھائی کے قاتلوں کو چُن چُن کر قتل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن بابر نے اُسے جانے نہیں دیا۔ اگرچہ وہ رُکنے والی نہیں تھی ۔ بابر نے کہا "پاگل ہو گئی ہو، اب میمن سنگھ میں کوئی بھی اُردو بولنے والا نہیں رہا۔ تم وہاں جاؤ گی تو وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے ۔"

"میں بنگالی زبان روانی سے بولتی ہوں۔ کوئی مجھے نہیں پہچانے گا ۔"

"یہ تمھاری بھول ہے ۔ چھاترو لیگ کے کتنے ہی اسٹوڈنٹس میمن سنگھ میں رہتے ہیں وہ تمھیں پہچان لیں گے خواہ مخواہ جان دینے کی حماقت نہ کرو ۔ زندہ رہنا سیکھو ۔ زندہ رہو گی تو بعد میں بھی دشمنوں سے انتقام لے سکو گی ۔ فی الحال تم میرے ساتھ چلو ۔ میں سید پور جا رہا ہوں تم دیناج پور میں اپنے والدین کے پاس رہو گی ۔"

وہ دیناج پور کے لیے روانہ ہوئے ۔ ٹرین رات کے دو بجے میمن سنگھ اسٹیشن سے گزرتی تھی ۔ بابر جاگ رہا تھا ۔ وہ آمنہ کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ گاڑی جیسے ہی میمن سنگھ کے اسٹیشن پر رکی ۔ آمنہ کی بے چینی بڑھ گئی ۔ وہ کمپارٹمنٹ میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی ۔ کبھی دروازے کے پاس جاتی تھی کبھی باہر دیکھتی پھر پلٹ کر بابر کو دیکھنے لگتی ۔ بابر نے اشارے سے منع کیا۔ پھر پاس آ کر کہا "کیوں حماقت کر رہی ہو ۔ کمپارٹمنٹ میں بنگالی مسافر بھرے ہوئے ہیں ۔ انھیں تمھارے ارادوں کا علم ہو گیا تو ہم دونوں کی ہڈیاں بھی نظر نہیں آئیں گی ۔"

وہ اسے سمجھا بجھا کر پاربتی پور لے آیا۔ وہاں سے دو ٹرینیں جاتی تھیں ۔ ایک سید پور کی طرف دوسری دیناج پور کی طرف۔ دونوں کو وہاں سے بچھڑنا تھا۔ بابر نے کہا "کل دیناج پور آؤں گا تمھارے والدین سے ملوں گا اور اُن سے تمھیں مانگ لوں گا ۔"

وہ بچھڑ گئے ۔ دوسرے دن بابر اپنے وعدے کے مطابق دیناج پور نہ جا سکا۔ اس کے چچا اور چچی اسے اپنا داماد بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے جب انھیں پتا چلا کہ وہ کسی آمنہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے کھل کر کہا "مگر ہم نے تو اپنی خالدہ کے لیے سوچ رکھا ہے تم گھر کی لڑکی چھوڑ کر باہر کیوں جانا چاہتے ہو ۔"

اس نے کہا "میں نے خالدہ کو ہمیشہ بھائی کی نظر سے دیکھا ہے، اسے بہن سمجھتا ہوں اُس سے شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔"

"فضول باتیں نہ کرو ۔ ہم نے تمھاری پرورش کی ۔ تمھیں تعلیم دلائی تمھیں اس قابل بنایا ۔ اب تم گھر آباد کرنے کے قابل ہو گئے ہو تو ہم سے نظریں پھیر رہے ہو ۔"

"چچی جان ! آپ مجھے پرورش کرنے کا طعنہ نہ دیں ۔ آپ میرا سہارا نہ بنتیں تو میری خالہ اور پھوپھی وغیرہ بن جاتیں۔ ابا جان نے مرتے وقت ایک بہت چلتا ہوا کاروبار چھوڑا تھا وہ سب میرا تھا۔ چچا جان نے اُسے سنبھال لیا ۔"

چچا نے کہا "کاروبار اُسی کا ہوتا ہے جو اُسے چلاتا ہے میں نے دن رات ایک کر کے خون پسینہ بہا کے اس کاروبار کو ترقی دی ہے ۔ یہ تمھارا خام خیال ہے کہ بھائی جان نے مرتے وقت اچھا چلتا ہوا کاروبار چھوڑا تھا۔ اس دکان میں کچھ نہیں تھا۔ بس نمائش کے لیے خالی ڈبے اور بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔

انھوں نے جو رقم چھوڑی تھی وہ تمھاری تعلیم میں خرچ ہو گئی ۔ بلکہ اس سے زیادہ ہم نے خرچ کیا ہے ۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کاروبار میں میرا کوئی حصہ نہیں رہا ۔"

"بیٹے! تم حصے کی بات کرتے ہو۔ میں سارا کاروبار تمھارے حوالے کر دوں گا ۔ تم میرے بھائی کی اکلوتی اولاد ہو ۔ خالدہ میری اکلوتی بیٹی ہے، دونوں کی شادی ہو جائے گی ۔ کاروبار گھر کا گھر میں ہی رہے گا ۔"

بات بگڑ چکی تھی ۔ وہ دیناج پور جا کر آمنہ سے رشتے کی بات نہیں بنا سکتا تھا ۔ یہ بات مضحکہ خیز ہوتی کہ وہ اپنے بزرگوں کو ساتھ لیے بغیر لڑکی والوں کے ہاں جاتا ۔ اور وہاں جا کر اس کا رشتہ مانگتا ۔ ایسے بھلا کون رشتہ دیتا ہے ؟

دو ہفتے کے بعد ہی دیناج پور سے عورتوں اور بچوں کے قافلے آنے لگے ۔ پتا چلا ، وہاں بھی غیر بنگالیوں کو قتل کیا گیا ہے ایک مرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا ۔ وہ آنے والے قافلے میں آمنہ کو تلاش کرنے لگا ۔ عورتوں اور بچوں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا گیا تھا اس کی لفظوں میں تصویر کشی نہیں کی جا سکتی ـــــ بچوں کو اپاہج بنا دیا گیا تھا ۔ آمنہ اس قافلے میں نہیں تھی ۔

وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ۔ دل تیزی سے دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا ۔ "وہ نہیں مر سکتی ۔ وہ زندہ ہے ۔" اور حالات کہہ رہے تھے کہ وہ مر چکی ہے ۔ "چلو قسمت کو جو منظور تھا وہ ہو گیا ۔ اب تم خالدہ سے شادی کر لو گے ۔" چچا چچی خوش ہو کر بولے ۔

اس نے غصے سے کہا "آپ لوگ کس زبان سے ایسا کہہ رہے ہیں ۔ بہاریوں نے بنگالیوں پر ظلم کیے ۔ بنگالیوں نے بہاریوں پر ظلم کیے ہیں لیکن ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ظالم نے کسی کی لاش پر بیٹھ کر کسی کے ساتھ نکاح پڑھایا ہو۔ آپ آمنہ کی لاش پر اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے پڑھانا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی سنگدلی سے تو دشمن بھی شرما جائیں گے ۔"

چار دن کے بعد آمنہ آ گئی ۔ اُس نے بتایا کہ اس قافلے میں جو چار دن پہلے آیا ہے اس کی ماں بھی ہے ۔ اس نے آمنہ کی ماں سے ملاقات ... پھر دونوں ماں بیٹی کو اپنے گھر لے آیا ۔ چچا چچی کو یہ پسند نہیں تھا ... دن سے جھگڑے شروع ہو گئے ۔

آمنہ نے طنزیہ انداز میں کہا "یہ ملکیت کا جھگڑا ہے تمھارے چچا اور چچی نے تمھیں پال پوس کر جوان کیا ۔ تمھیں تعلیم دلائی ... تم پر اپنے حقوق جتانے کا یہ حق رکھتے ہیں ۔ ٹھیک اسی طرح بنگالی بھی کہتے ہیں ۔ بنگال زرعی ملک ہے یہاں کے کسان دن رات محنت کر کے اناج اگاتے ہیں ۔ محنت کرتے ہیں لیکن انھیں اُن کے بنگال سے اُن کے حقوق نہیں ملتے ۔ سب اپنا حق طلب کرتے ہیں ۔ اگر بنگالیوں نے دیناج پور میں میرے باپ کو قتل کیا تو یہاں سید پور میں یہ بہاری تمھیں مجھ سے چھین رہے ہیں ۔ چھیننے تو سبھی ہیں پھر ہم چھیننے والوں کو یہ کیوں کہیں کہ فلاں بہاری ہے، فلاں بنگالی ہے ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہم انسان ہیں اپنی فطرت سے مجبور ہیں ۔ جب ہمیں اپنا حق نہیں ملتا تو ہم اسے چھینتے ہیں ۔ اس کے لیے قتل و غارت گری سے باز نہیں آتے ۔ بابر ! میں تم پر اپنا حق سمجھتی ہوں ۔ اس لیے اپنے حق کو چھیننے کے لیے قتل و غارت گری سے باز نہیں آؤں گی ـــ اپنے چچا اور چچی کی زندگی چاہتے ہو تو یہ گھر چھوڑ دو ـــ ہم یہاں سے چلے جائیں گے ۔"

وہ دو ٹوک باتیں کرنے والی تیز طرار محبوبہ تھی ۔ جو کہتی تھی کر گزرتی تھی ۔ دیناج پور میں اپنے باپ کے قتل ہونے کے بعد اس نے قافلے کے ساتھ آنا منظور نہیں کیا تھا ۔ وہ وہیں رہ گئی تھی ، چھپتی پھرتی تھی ۔ بنگالی بن کر کہیں پناہ لیتی تھی اور اس کی نظروں میں جو اس کے باپ کے قاتل تھے ان سے انتقام لیتی رہی تھی ۔ جب اس کے انتقام کی آگ سرد پڑ گئی، تب سید پور واپس آئی تھی اور اب اپنے محبوب کے چچا اور چچی کو وارننگ دے رہی تھی

بابر کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ اسے یہ تیز و تند مزاج رکھنے والی عورت دل و جان سے پسند تھی ۔ وہ اسے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر خشکی کے راستے نیپال پہنچ گیا ۔ وہاں سے وہ پاکستان جانا چاہتے تھے لیکن رکاوٹیں پیدا ہو گئیں ۔ اُن سے پوچھا جا رہا تھا پاکستانی ہونے کا ثبوت پیش کیا جائے اور وہ حیران تھے کہ ثبوت کس طرح پیش کریں ؟ کیا پاکستانیوں کے ماتھے پر چاند تارا بنا ہوتا ہے ؟ یا اس سے پہلے حکومتِ پاکستان نے اُن کے لیے شناختی کارڈ کا اجراء کیا تھا ؟ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا پھر وہ پاکستان کیسے پہنچ سکتے تھے ؟

نیپال پہنچ کر آمنہ کی ماں بیمار پڑ گئی ۔ اُن کے پاس معقول رقم تھی لیکن معقول علاج نہیں ہو رہا تھا ۔ نہ رہنے کے لیے مناسب ٹھکانہ تھا اور نہ ہی اپنی پسند کا کھانا نصیب ہوتا تھا ۔ آخر اس کی ماں بیمار رہ کر وہیں مر گئی ۔ تب وہ غصے سے کھولنے لگی ۔ اس نے بابر سے پوچھا "ہم لوگوں کا کیا قصور ہے ؟ کون سی بڑی غلطی کی ہے جس کی سزا اب تک بھگت رہے ہیں ۔ جب میرے ابا جان بہار سے مشرقی پاکستان گئے تو اپنے پیچھے اپنے بزرگوں کی لاشیں چھوڑ گئے ۔ اُن کا ماتم کرتے ہوئے پاکستان پہنچے ۔ پال پوس کر جوان کیا تو ہم اپنے ماں باپ کا ماتم کر رہے ہیں ۔ کیا اپنے باپ دادا کے خون سے پاکستان بننے کے بعد بھی ہم پاکستانی نہیں ہیں ؟"

وہ غصے سے بھری ہوئی تھی۔ گہری گہری سانس لے کر بولی۔
"اب میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔"

بابر نے چونک کر پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں کہہ چکی ہوں میں پاکستان نہیں جاؤں گی۔ یہ ہم سے شناخت پوچھتے ہیں۔ میں اوّل پاکستانی ہوں تا آخر پاکستانی ہوں۔ خواہ ملک سے باہر رہوں یا ملک کے اندر۔ اس لیے ہم ملک سے باہر رہیں گے۔ ہم میں صلاحیت ہوگی تو ہم خود کو ایک دن پاکستانی منوالیں گے۔"

"سچ پوچھو تو میرا بھی دل بھر گیا ہے ہم ایسے پاکستان جاکر کیا کریں گے جہاں ہمیں پاکستانی تسلیم نہ کیا جائے۔ ہم جبراً اپنی شناخت پیش کرکے وہاں جبراً اپنا حق نہیں منوائیں گے ہم کسی دوسرے ملک جائیں گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "میرے عزائم بلند ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا، ہم اپنے ہی ملک میں نہیں جاسکتے، تو کسی دوسرے ملک میں کیسے جائیں گے؟"

آج کل پاکستان میں ہیروئن کا زور ہے اسی طرح نیپال کو ان دِنوں چرس کی سب سے بڑی منڈی سمجھا جاتا تھا۔ دنیا بھر کے اسمگلر اور اسی قسم کے لوگ وہاں آتے تھے اور قانون کی نظروں میں دھول جھونک کر بقدرِ زر کوئی چٹکی بھر لے جاتا تھا اور کوئی منوں کے حساب سے چرس اسمگل کرتا تھا۔

ایسی جگہ اسمگلروں کو اکثر اناڑی آلۂ کاروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کبھی اسمگلنگ کا دھندا نہ تو کیا ہو اور نہ ہی اسے سمجھتے ہوں۔ وہ ایسے لوگوں کے سامان میں مال رکھ دیتے ہیں، اگر وہ مال پار ہوگیا تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں، ورنہ ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ معصوم آلۂ کار پکڑے جاتے ہیں۔ مال کا جو نقصان ہوتا ہے اُسے دوسرے چکر میں پورا کرلیا جاتا ہے۔ اسمگلروں کے ایسے ہی ایک گروہ نے بابر اور آمنہ کو اس شرط پر لندن پہنچانے کا ذمّہ لیا، کہ وہ دونوں اپنے سامان کے ساتھ ان کا تھوڑا سا سامان بھی لے جائیں گے۔

بابر نے کہا۔ "مسٹر! ہم اگرچہ دانشمند نہیں ہیں تاہم احمق بھی نہیں ہیں۔ اگر ہمارے مال کے ساتھ کچھ اسمگل کرنا چاہتے ہو تو صاف صاف بتادو۔"

آمنہ نے کہا۔ "ہم ضرورت مند ہیں تمھارا کام ضرور کریں گے تاکہ یہاں سے لندن پہنچ سکیں۔"

اسمگلر نے خوش ہوکر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں کی صاف گوئی مجھے پسند آئی مجھے سائمن دی گریٹ کہتے ہیں لندن بخیریت پہنچ جاؤ گے تو وہاں تمھاری رہائش کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ اگر آئندہ بھی کام آنا چاہو گے تو میں خوش آمدید کہوں گا۔"

اُن کے درمیان معاملات طے ہوگئے۔ وہ دونوں اُن کا مال لے کر لندن بخیریت پہنچ گئے۔ انھیں کوڈ ورڈز سمجھا دیے گئے تھے۔ اُن سے کہا گیا تھا، جو شخص بھی وہ کوڈ ورڈز ادا کرے گا وہ اس کے ساتھ مال لے کر چلے جائیں پھر وہ شخص اُن کی رہائش کا بندوبست کرے گا۔

لیکن لندن ائرپورٹ کے باہر ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ جو کوڈ ورڈز کا تبادلہ کرتا۔ ایسے اجنبی شخص کو متوجہ کرنے کے لیے طے شدہ پروگرام کے مطابق آمنہ نے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہنا تھا اور بابر گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص اُن کے سامنے آیا۔ اُس نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لباس سے پاکستانی لگتے ہیں۔ میں بھی پاکستان کا رہنے والا ہوں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔"

بابر نے کہا۔ "ہمیں ایک صاحب کی تلاش ہے مگر وہ نظر نہیں آرہے ہیں۔"

"آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے وہی صاحب ہمارے رہنے کا انتظام کرنے والے تھے۔"

"تو بھائی! فکر کیوں کرتے ہیں، آپ بھی پاکستانی ہیں، میں بھی پاکستانی ہوں۔ آپ لوگوں کے لیے میرے دل میں جگہ ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "افسوس پاکستان میں جگہ نہیں ہے۔"

وہ اس کے ساتھ ایک ہاسٹل کے کمرے میں آئے۔ آمنہ اور بابر کے لیے وہاں کی ہر جگہ اجنبی تھی۔ اُن کے اجنبی میزبان کا نام صادق تھا۔ چونکہ صادق تھا اس لیے اس نے راستے میں سچ سچ بتا دیا کہ بالکل قلاش ہے — لندن کی بندرگاہ اور ائیرپورٹ میں مارا مارا پھرتا ہے ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کو اپنا مہمان بناتا ہے اس طرح اس کی گزر بسر بھی ہو جاتی ہے۔ جہاں وہ رہتا ہے وہاں کا کرایہ بھی نکل آتا ہے پھر مہمان رخصت ہوتے وقت اسے اچھی خاصی رقم دے کر جاتے ہیں۔

بابر نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم باہر سے آنے والوں کی خیرات پر پلتے ہو۔"

آمنہ نے صادق کے سینے پر ایک ہاتھ مارا اور پھر اس کے گریبان کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "میں پاکستان سے ناراض ہوں بالکل اسی طرح جس طرح ایک بیٹی اپنے ماں باپ سے ناراض ہوتی ہے لیکن وطن کی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔ آئندہ تم نے کسی بھی باہر سے آنے والے کے سامنے خود کو پاکستانی کہا تو میں تمھیں

زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ یا تو بھیک مانگنا چھوڑ دو یا اپنی پہچان کرانا چھوڑ دو۔ یہ مت بھولو کہ وطن سے باہر آکر ایک ایک بچہ پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔"

اس نے غصے سے اسے دھکا دیا۔ پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابر وہاں پہنچا تو وہ دیوار پر گھونسے مار رہی تھی اس نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟"

وہ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔ "اور کیا کروں، سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے صادق کا گریبان پکڑ کر اُسے سمجھا دیا کہ پاکستان کی توہین نہ کرو۔ ہم نے کیا کیا؟ ہم بھی اسمگلنگ کا مال لے کر آئے ہیں!"

"او خدایا! تم مثبت انداز میں بھی سوچتی ہو منفی انداز میں بھی۔ انسان کو یا تو انسان رہنا چاہیے یا شیطان بن جانا چاہیے ورنہ وہ دو طرفہ کھنچاؤ کے باعث پاگل ہو جاتا ہے۔ ہم تعلیم یافتہ ہیں ہم شیطان نہیں بن سکتے۔ ہمیں مثبت انداز میں سوچنے کی عادت ہے بے شک پاکستانی حکومت نے ہمیں قبول نہیں کیا۔ ہم مجبور ہوکر ایک اسمگلر کے آلۂ کار بن گئے لیکن ہم دوسری غلطی نہیں کریں گے۔"

"کیا ہم اپنی غلطی کی تلافی نہیں کرسکتے؟"

بابر نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ "ہاں، کرسکتے ہیں جو مال لے کر آئے ہیں اسے ہم قانون کے محافظوں کے پاس جاکر دے دیں گے، انھیں صاف صاف بتادیں گے کہ ہم کن حالات میں یہاں پہنچے ہیں۔"

انھوں نے یہی کیا۔ ایک پولیس اسٹیشن میں پہنچ کر تمام سامان ایک آفیسر کے سامنے رکھ دیا اور سادگی سے کہا۔ "اس میں چرس ہے۔"

آفیسر نے حیرانی سے انھیں دیکھا اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ چرس کو گولڈن ڈسٹ یعنی سنہرا برادہ کہتے ہیں۔ کوئی اپنے پاس رکھا ہوا سونا یوں پولیس والوں کے حوالے کرنے نہیں آتا۔ اس نے سوٹ کیس کو کھول کر دیکھا، اس کی تہہ میں چرس بھری ہوئی تھی۔ پاکستانی کرنسی کے مطابق وہ دو ڈیڑھ لاکھ روپے کا مال ضرور ہوگا۔

آفیسر نے اُن کا بیان لیا۔ بیان بھی عجیب و غریب تھا، انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ انھیں پاکستان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ وہ واپس بنگلہ دیش نہیں جا سکتے تھے۔ بیچ منجدھار میں تھے نہ یہ کنارا اُن کے لیے تھا، نہ وہ کنارا اُن کے لیے تھا۔ لہٰذا انھیں مجبور ہوکر اسمگلروں کا آلۂ کار بن کر یہاں تک آنا پڑا۔

آفیسر نے پوچھا۔ "تم نے یہ مال ہمارے حوالے کیوں کیا؟ یہاں تم اجنبی ہو۔ قدم قدم پر تمھیں رقم کی ضرورت ہے۔ اس سے تم بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے۔ یہاں عیش کرسکتے تھے۔"

بابر نے کہا۔ "ہم وطن کے نام کو داؤ پر لگا کر عیش کرنا نہیں چاہتے۔ اگر آپ ہم پر مہربانی کرنا چاہتے ہیں تو اخبارات میں ہمارا یہ بیان من و عن شائع کرادیں۔"

انھیں حوالات میں رکھا گیا لیکن اُن کا بیان اسی طرح اخبارات میں شائع ہوگیا۔ ان پر مختصر سا مقدمہ چلا۔ پھر یہ کہہ کر بری کر دیا گیا کہ انھوں نے قانون کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ انھیں اس شرط پر رہا کیا جائے کہ وہ فوراً ہی یہ ملک چھوڑ [illegible]

ان کا پاسپورٹ وغیرہ ضبط کر لیا گیا [illegible] کے بنائے ہوئے جعلی کاغذات تھے۔ وہ دونوں پاکستانی سفارت خانے [illegible] گئے۔ پاکستانی سفیر نے انھیں اپنے پاس بلایا، ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے پاکستان کا وقار بلند کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہم غیر قانونی دھندوں میں ملوث نہیں ہونا چاہتے۔ میں تم دونوں کے لیے اسلام آباد سے رابطہ قائم کروں گا۔ تمھاری پُرزور سفارش کروں گا کہ تمھیں ہر حال میں پاکستانی تسلیم کیا جانا چاہیے۔"

وہ انتظار کرنے لگے۔ اسلام آباد سے اُن کے لیے اجازت نامہ آنے والا تھا لیکن دو دن کے بعد ہی وہ ٹیوب میں سفر کر رہے تھے۔ اچانک ہی ایک شخص ان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ جھکی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "مال کہاں ہے؟"

وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ "معصوم بننے کی کوشش نہ کرنا۔ تم نے خود کو پاکستانی فرشتے ظاہر کرنے کے لیے ہمارے مال کا کباڑا کر دیا۔ اپنی زندگی چاہتے ہو تو بیس ہزار پونڈ میرے سامنے رکھ دو یا پھر میرے ساتھ چلو۔"

بابر نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیا تم ہمیں ائرپورٹ میں لینے کے لیے آنے والے تھے؟"

"میں نہیں، ہمارا ایک آدمی تمھارے استقبال کے لیے پہنچنے والا تھا لیکن پتا چلا، پولیس والوں کو ہمارے مال کی سن گن لگ گئی ہے وہ ہم میں سے ہر ایک کو شبہ کی نظروں سے دیکھ سکتے تھے۔ چونکہ تم لوگ ہندوستان سے آرہے تھے تمھارے چہروں پر اسمگلروں جیسی پختگی نہیں تھی۔ تم پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے ہم نے وقتی طور پر تمھارے حال پر تمھیں چھوڑ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مال قانون کے حوالے کر دیا جائے۔"

"ہم مجبور تھے، ہم نے کبھی یہ دھندا نہیں کیا۔ ہم کسی کا سہارا لے سکتے تھے تو وہ قانون کا سہارا ہی ہوسکتا تھا اور ہم نے یہ سہارا لیا۔"

اوورکوٹ والے نے کہا۔ "اس وقت جیب کے اندر میرا ہاتھ ہے اور میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول ہے

اس کی ایک ایک گولی تم دونوں کے لیے کافی ہوگی۔ اگر زیادہ چالاکی دکھاؤ گے یا مجھ سے الجھنے کی کوشش کروگے تو میں بے دریغ فائر کردوں گا۔"

آمنہ اور بابر نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ذرا سی بھی حرکت کرتے تو گولی چل جاتی۔ لہٰذا انھوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

وہ ٹیوب میں سفر کرتے ہوئے زمین دوز لائن کے آخری اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ اوورکوٹ والا انھیں اشاروں سے آگے چلنے کا اشارہ کرتا جا رہا تھا۔ وہ اس کے حکم کے مطابق زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر آئے، وہاں ان کے لیے ایک ویگن تیار تھی، انھیں بیٹھنا پڑا۔ اب ان کے آگے پیچھے دو ریوالور والے تھے اور وہ ویگن ایک طرف بھاگتی جا رہی تھی۔ ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد پتا چلا کہ وہ انگلینڈ کے مشرقی ساحل پر پہنچ گئے ہیں ان سے بار بار کہا جا رہا تھا کہ مال واپس کریں یا اس کا جرمانہ ادا کریں۔ اور جرمانہ بیس ہزار پاؤنڈ لگایا گیا تھا۔ نہ ان کے پاس اتنی رقم تھی اور نہ ہی مال تھا۔

انھیں ایک چھوٹی سی لانچ میں بٹھایا گیا۔ وہ اسمگلروں کی مخصوص لانچ تھی۔ اس کے ایک بہت ہی خوبصورت کیبن میں سائمن دی گریٹ بیٹھا ہوا تھا، انھیں دیکھتے ہی قہقہہ لگا کر بولا۔" اپنے ہی گھر کا کتا کاٹنے لگے تو اسے گولی مار دیتے ہیں۔ اپنا آدمی نقصان پہنچائے تو اس سے کیا سلوک کرنا چاہیے؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے آمنہ اور بابر کو دیکھا۔ پھر خود ہی کہا۔" میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ نہ تم مال دے سکتے ہو اور نہ اس کی رقم ادا کر سکتے ہو۔ اب ایک ہی صورت ہے ہمارا دوسرا کام کر دو یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمھاری لاشیں برٹش چینل کی لہروں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو جائیں گی۔"

وہ دونوں مرنا نہیں چاہتے تھے اور اپنے مزاج کے خلاف کوئی غلط کام کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ سائمن دی گریٹ نے کہا۔" آرام سے بیٹھ جاؤ اور میری باتیں غور سے سنو۔ اگر تم میرا وہ مال فروخت کر دیتے اور وہ ساری رقم ہتھیا لیتے تو تم لوگوں کو پہلی فرصت میں گولی مار دیتا کیونکہ وہ سراسر بے ایمانی ہوتی۔ میں اپنی رقم پر قبضہ جمانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ تم دونوں واقعی معصوم ہو۔ تم نے میرا مال فروخت نہیں کیا۔ تم لالچی بھی نہیں ہو اور یہ بات مجھے پسند آئی ہے۔"

وہ انھیں سمجھانے لگا۔" دیکھو، تم ابھی نادان ہو، تم لوگوں نے ابھی دنیا نہیں دیکھی لیکن تمھارے تیور بتا رہے ہیں کہ دنیا دیکھ لوگے تو وہی کروگے جو میں کرتا ہوں۔ یہ کتنے عیش اور آرام کی زندگی ہے۔ اسمگلروں کی دنیا میں مجھے سائمن دی گریٹ کہتے ہیں۔ شریفوں کی دنیا میں میرا کوئی اور نام ہے میرا کوئی اور ہی روپ ہے۔ میں بہت ہی عزت اور وقار سے زندگی گزارتا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو تمھارے ملک میں سبھی شریف لوگ بستے ہیں۔ سب ہی فرشتے رہتے ہیں، ہرگز نہیں میں وہاں کے ایک ایک شیطان کا چہرہ دکھا سکتا ہوں اور وہ شیطان معاشرے میں نہایت ہی اُجلا لباس پہنتے ہیں، اُجلی باتیں کرتے ہیں۔ دین دھرم کے معاملے میں لاکھوں روپے چندہ کے طور پر دیتے ہیں، غریبوں کی مدد دونوں ہاتھوں سے کرتے ہیں، لیکن ان کا کالا دھندا کیا ہے یہ ہم جیسے لوگ سمجھتے ہیں۔ کیا وہ لوگ شریف آدمی بن کر اُجلا لباس پہن کر اپنے وطن کا نام روشن نہیں کر رہے ہیں؟ ایک طرف صفائی ہے، دوسری طرف غلاظت ہے ایک طرف اُجلا پن ہے دوسری طرف کالک ہے۔ تار پازیٹو بھی ہوتا ہے اور نیگیٹو بھی۔ جب تک دونوں نہیں ملتے روشنی نہیں ہوتی۔ اوپر لانچ کے عرشے پر جاؤ تازہ تازہ ہوا کھاؤ اور میری باتوں پر غور کرو۔ میری آخری بات یہی ہے کہ اچھا کرنے کا وقت آئے تو بے شک کرو، کبھی اس سے نہ کتراؤ۔ اپنی جان پر کھیل کر بھی کسی کے لیے نیکی کرو لیکن خالی ہاتھ سے کبھی نیکی نہیں ہوتی۔ کچھ کمانے کے لیے کچھ کالے پیلے دھندے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ جاؤ میں نے کہا نا اچھی طرح غور کرو۔ اگر دوسرے ساحل تک پہنچنے سے پہلے تم نے میری بات مان لی تو ساری زندگی عیش کروگے ورنہ کنارے پر پہنچتے ہی گولی مار دی جائے گی۔"

وہ عرشے پر آ گئے۔ سائمن دی گریٹ نے کچھ ایسی تقریر سنائی تھی کہ وہ غیر شعوری طور پر بڑی حد تک متاثر ہو گئے تھے۔ اب ان کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ اتنی بڑی دنیا میں ہمارے پاؤں تلے کوئی زمین نہیں ہے۔ پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ بنگلہ دیش واپس نہیں جا سکتے اور یہاں دوسرے کنارے پہنچتے پہنچتے گولی مار دی جائے گی۔ پھر وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ جب پاکستان میں انھیں رہنے کے لیے جگہ نہیں ملی تو پھر پاکستان کے لیے جان کیوں دیں؟

ہاں، اگر ہمیں پاؤں تلے زمین مل گئی، ٹھکانہ مل گیا اور ہم نے اپنی ایک طاقت بنالی تو پھر اپنی زبان پر وطن کا نام لائیں گے ورنہ خود کو پاکستانی نہیں کہیں گے۔ وطن کی آغوش میں

ہمیں جگہ نہ ملی، کوئی بات نہیں مگر ہم وطن کو بدنام نہیں کریں گے لہٰذا آج سے ہم پاکستانی نہیں ہیں۔ اجنبی ہیں۔ ہمارا تعلق کسی شہر، کسی صوبے، کسی ملک سے نہیں ہے کیونکہ کوئی شہر کوئی صوبہ، کوئی ملک ہمیں تسلیم نہیں کر رہا ہے۔

انھوں نے سائمن دی گریٹ کی بات مان لی۔ دوسرے ساحل پر پہنچ کر انھیں دوسری زندگی مل گئی۔ فرانس کے شمال مغرب میں لی ہاروی کے علاقے کے ٹی ٹی سینٹر میں انھیں رہنے، کھانے پینے اور عیش و آرام سے زندگی گزارنے کی سہولتیں فراہم کر دی گئیں۔ وہاں وہ دہشت گردی کی تربیت حاصل کرنے لگے۔

ایک دن بابر نے کہا۔" تم یہاں ہوسٹل کے ایک کمرے میں رہتی ہو، میں دوسرے کمرے میں رہتا ہوں کیوں نہ ہم اب شادی کرلیں۔"

انھوں نے پروگرام بنایا اور شادی کرنے کے لیے پیرس پہنچ گئے۔ وہاں ایک بہت بڑے ہوٹل میں اپنے لیے ایک کمرہ ریزرو کرایا۔ ان کی شادی میں شریک ہونے کے لیے ٹی ٹی سینٹر سے چار ساتھی بھی آئے تھے۔ ایک مسجد میں نکاح پڑھانے کے بعد جب وہ ہوٹل کی طرف واپس آ رہے تھے تو اچانک ان کی کار پر فائرنگ ہونے لگی۔ انھوں نے گاڑی جہاں روکی وہیں ایک زبردست قسم کا دھماکا ہوا۔ سبھی گاڑی سے نکل کر چھپتے ہوئے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے بھاگنے لگے۔ اتنی دیر میں گاڑی کے اگلے حصے کو آگ لگ چکی تھی اور وہاں بابر بیٹھا ہوا تھا۔

وہ بے جان مجسمہ کی طرح بیٹھا نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے بھی دوسروں کی طرح جد و جہد کی لیکن ذرا دیر ہو گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آگ میں جھلس گیا۔ جب وہ بچتا ہوا اپنے ساتھیوں کی طرف جانے لگا تو دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بابر کی ٹانگ پر گولی لگی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا پھر اس کے بازوؤں کو اپنے کاندھے پر رکھ کر اسے گھسیٹتے ہوئے ایک گلی میں لے گئے۔ آمنہ اس گلی کے سرے پر فائرنگ کرنے کے لیے رک گئی تھی تاکہ دشمن ادھر نہ آسکیں۔ بابر کو کسی طرح اس طویل گلی سے گزار کر دوسرے سرے پر پہنچایا گیا۔ اس وقت تک آمنہ بھی آ گئی۔ ایک نے کہا۔" وہ دیکھو سامنے ڈاکٹر شیفرڈ کا کلینک ہے، بابر کو وہاں پہنچا دیا جائے یہ بُری طرح جھلس گیا ہے۔ چہرہ بھی جل گیا ہے اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے بعد میں پلاسٹک سرجری کی ضرورت پیش آئے۔ ہم صحیح جگہ پہنچے ہیں۔"

آمنہ نے بابر کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔" تم لوگ دشمنوں کو روکو میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ اسے سہارا دے کر ڈاکٹر شیفرڈ کے کلینک میں لے آئی۔ وہاں اس نے بیان دیا کہ وہ پُرامن شہری ہے پتا نہیں کن بدمعاشوں نے ان پر فائرنگ کی ہے۔ اگر اس زخمی کو پناہ نہ دی گئی اور چھپا کر نہ رکھا گیا تو دشمن اس کی جان لے لیں گے۔"

ڈاکٹر شیفرڈ نے کہا۔" ہم اس کی حفاظت کریں گے اور اس کے کمرے کے سامنے خاص طور پر مسلح سپاہیوں کو رکھا جائے گا تاکہ بغیر اجازت کوئی اندر نہ جا سکے۔"

آمنہ مطمئن ہو کر چلی گئی۔

ثباتہ ڈائری پڑھ رہی تھی اور میں سن رہا تھا لیکن جس تسلسل سے میں بیان کر رہا ہوں، ڈائری میں وہ تسلسل نہیں تھا کہیں ورق سادہ تھے اور کہیں خاص خاص واقعات لکھے ہوئے تھے۔ آخر میں بابر نے لکھا تھا میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ اگر ایک رات سے زیادہ گزاروں گا تو دوسری صبح زندہ نہ رہ سکوں گا۔ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم پر فائرنگ کرنے والے ماسٹر کی کے آدمی تھے۔ ہماری ان سے ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے۔

ماسٹر کی سے دشمنی کیوں ہے۔ یہ اس میں نہیں لکھا تھا بس اتنا ہی لکھا ہوا تھا کہ زندہ سلامت رہا تو اپنے کاغذات لینے کے لیے ڈاکٹر شیفرڈ کے پاس ضرور آؤں گا۔

اس کے بعد ڈائری ختم ہو گئی تھی اور وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ٹیلی پیتھی کے علم کے مطابق وہ ایسی جگہ جا چکا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

ثباتہ ڈائری پڑھنے کے دوران بار بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھتی تھی۔ اب میں اپنے اصلی روپ میں آچکا تھا اور بڑی لگن سے وہ مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ میں اسے بار بار ٹوکنے لگتا تھا۔" بھئی چپ کیوں ہو، آگے پڑھو۔"

آخر میں اس نے کہا۔" آگے پڑھنے کے لیے کچھ نہیں ہے صرف دیکھنے کے لیے تم ہو اور میں تمھیں ہی دیکھتی رہوں گی۔"

ڈاکٹر نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا۔" میرا کام ختم ہو چکا ہے میں جا رہا ہوں۔"

" ڈاکٹر! یہ تو بتاؤ میرے چہرے پر بابر کا میک اپ کرنے کب آسکو گے؟"

" ابھی رات گزرنے دو۔ صبح تم ہی بتا دینا میں چلا آؤں گا۔"

اس کے جاتے ہی وہ میرے پاس آ گئی۔ بڑے پیار سے بولی۔" میں یہی چہرہ دیکھنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ تمھاری تصویر دیکھتی تھی اور سوچتی تھی جانے وہ دن کب آئے گا جب تم

میرے رُوبرو ہو گئے اور میں تمھیں دیکھتی رہوں گی، دیکھتی ہی چلی جاؤں گی!"

مجھے بابر اور آمنہ کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنا تھا لیکن خیال خوانی کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ وہ اپنے شوق کی خاطر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی دیکھ رہا تھا اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے رات گزر گئی۔

دن نکل آیا۔ دن کی روشنی بند دریچوں اور دروازوں سے گزر کر اندر آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا قاف کی شہزادی محوِ خواب تھی۔ خوابیدہ حسن اور زیادہ پُرکشش ہو گیا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی نے چونکا دیا۔ میں بستر سے اتر کر فون کے پاس آیا پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔"میں ڈاکٹر شیفرڈ بول رہا ہوں۔"

میں نے بے چین ہو کر شہزادی کی جانب دیکھا۔ پھر آہستگی سے کہا۔"ڈاکٹر! میں ابھی میک اپ نہیں کرنا چاہتا۔"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔"شہزادے! اسی لیے میں نے رات کو کہا تھا۔ صبح فیصلہ کرنا اور مجھے تمھارے فیصلے کا علم پہلے سے تھا۔ میرا مشورہ ہے کچھ روز کے لیے خیال خوانی چھوڑ دو کسی کا دماغ نہ پڑھو۔ بس شہزادی ہی کافی ہے۔"

دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا۔ اُدھر شہزادی ثبانہ نے نیند میں انگڑائی لی۔ میں ریسیور رکھ کر اس کی طرف یوں لپکا جیسے وہ انگڑائی کے لیے دونوں بازو اٹھاتے ہی پرواز کرنے لگے گی۔ اگر میں نے اسے تھام نہ لیا تو ہوا میں اڑے گی اور ہوا ہو جائے گی۔

اسے کہتے ہیں اسیرِ بے زنجیر یا ایسا اسیر جو کچے دھاگے سے بندھا ہے اور خود کو چھڑا نہ سکے۔ میں کہاں تو ثبانہ کو اسی دن وادی میں بھیجنے والا تھا اور کہاں دو دن گزر گئے [illegible] کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ آمنہ کے متعلق معلوم کرنا تھا تو جب بھی مجھے فرصت ملتی میں خیال خوانی کے ذریعہ معلومات حاصل کر لیتا ــ جن پاکستانیوں کے متعلق مکمل معلومات حاصل ہو چکی تھی، ان کے ساتھ آئندہ جو طریقۂ کار اختیار کرنا تھا اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا ابھی وقت نہیں تھا جب راوی چین لکھ رہا تھا، تو میں بھی لکھ رہا ہوں۔

انسان کی زندگی میں محبت اور خوشیاں موسم کی طرح نہیں آتیں۔ موسم تو کچھ روز رہتے ہیں تب جاتے ہیں محبت اور خوشیاں تو عید کی طرح ایک دن کے لیے آتی ہیں۔ دوسرے دن چلی جاتی ہیں۔ ثبانہ پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی جب میں نے کہا، میں کل پیرس سے چلا جاؤں گا تو وہ ایک دم سے مرجھا گئی۔

میں نے اس کے احساسات پڑھے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نہیں جاؤں گا اس کی جان چلی جائے گی۔ میں مجبور تھا۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے معلوم کر چکا تھا کہ آمنہ بابر ڈاکٹر شیفرڈ کے پاس پہنچنے والی ہے اور اس سے بابر کا مطالبہ کرنے والی ہے۔ اس نے اپنے طور پر یہ رائے قائم کی تھی کہ ماسٹر کی کے آدمیوں نے ڈاکٹر شیفرڈ کو کسی طرح مجبور کر دیا ہے اور وہ اپنی زبان نہیں کھول رہا ہے اس کے کلینک سے بابر کو اغوا کیا گیا ہے لہٰذا ڈاکٹر کو کچھ تو اس کے متعلق معلوم ہو گا۔

ویسے آمنہ خاموش بیٹھنے والی نہیں تھی پہاڑوں سے ٹکرا جانے کی [illegible] تھی۔ اس نے ماسٹر کی کے ایک آدمی کو نقصان پہنچایا تھا۔ بُری طرح زخمی کرنے کے بعد اس کے گلے سے ایک پرچی لٹکا دی تھی۔ اس میں لکھا تھا۔"اگر دو دن کے اندر مجھے میرا بابر نہ ملا تو تیسرا دن ماسٹر کی کی زندگی کا آخری دن ہو گا کیونکہ آمنہ سے اس کا آمنا سامنا ہو گا۔"

دوسری صبح ثبانہ مجھ سے رخصت ہونے کے وقت کہنے لگی۔"ہم قاف کی لڑکیاں بچپن ہی سے پہاڑوں اور چٹانوں میں پرورش پاتی ہیں۔ کانٹوں کے بستروں پر سوتی ہیں جاگتی ہیں تو ہاتھوں میں ہتھیار یا تیر کمان ہوتے ہیں۔ سوتی ہیں تو دماغ جاگتا رہتا ہے ہم جیسی سخت تربیت حاصل کرتی ہیں اس کے پیشِ نظر ہمیں کبھی رونا نہیں آتا ورنہ آج رخصت ہوتے وقت میں ضرور رو دیتی۔"

آخر وہ رخصت ہو گئی۔ ڈاکٹر شیفرڈ نے اس روز اپنی مصروفیات ختم کر دی تھیں۔ شہزادی ثبانہ کو خود ائیرپورٹ تک چھوڑنے گیا تھا۔ میں نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ تھا۔ یہ ثبانہ کی فرمائش تھی کہ وہ آخری لمحے تک مجھے اپنے اصلی چہرے کے ساتھ دیکھتی رہے۔

جاتے ہوئے وہ اپنی حسین ترین یادوں کا وہ سرمایہ چھوڑ گئی جو نہ تو گم ہو سکتا تھا نہ چوری ہو سکتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ اس نے مجھے دماغی طور پر نہایت ہی تازہ دم کر دیا ہے کیونکہ پچھلے دو دنوں میں میں نے خیال خوانی نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی وقت ملنے پر میں رسونتی، سونیا، مرجانہ وغیرہ کی خیریت معلوم کر لیتا تھا پھر اس کے پاس واپس آ جاتا تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے دو دن اور دو راتوں تک جی بھر کے آرام کیا تھا۔ اپنے جسم کو بھی آرام پہنچایا تھا اور دماغ کو بھی۔

ڈاکٹر شیفرڈ ثبانہ کو ائیرپورٹ پر سی آف کرنے کے

بعد میرے پاس آیا۔ پھر میرے چہرے پر پلاسٹک سرجری کا عارضی میک اپ کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔"کیا پاکستان جانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں، میرے نئے دشمن مجھے مجبور کر رہے ہیں۔"

جب ثبانہ ڈاکٹر کے ساتھ ائیرپورٹ کی طرف گئی تھی تب ہی سے میں نے خیال خوانی شروع کر دی تھی۔ اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کرم داد، دلاور خان، جمال احمد جسکانی اور آمنہ بابر کن حالات میں پاکستان کی طرف واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں۔

میں ترتیب کے لحاظ سے پہلے کرم داد کے پاس پہنچا۔ وہ ریحانہ کے سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا جسمانی کرتب دکھا رہا تھا۔ کبھی وہ بلندی کی طرف اچھلتا تھا، پھر فضا میں قلابازی کھا کر فرش پر دونوں پاؤں جما کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ ریحانہ خوشی سے تالی بجانے لگتی۔ پھر وہ قلابازی کھا کر اچانک ہی ایک ہاتھ کے بل پر سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کر کے کھڑا ہو جاتا تھا۔ دوسرا دایاں ہاتھ خالی رہتا تھا اور وہ بائیں ہاتھ کے ذریعے گول گھومتا ہوا یوں دائیں ہاتھ سے فائرنگ کرتا تھا جیسے ہاتھ میں ریوالور پکڑا ہوا ہو۔ وہ کہتا جاتا تھا۔"اگر کھلی فضا میں تم یہ تماشا دیکھو تو میں سچ مچ ریوالور کے ذریعے اسی طرح ہاتھ کے بل پر الٹا کھڑا ہو کر فائرنگ کر سکتا ہوں۔ چاروں طرف گھوم گھوم کر گولی چلا سکتا ہوں اور میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہو گا۔"

ریحانہ نے پھر تالیاں بجا کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "واقعی تم نے دو برس کے عرصے میں بڑا کمال حاصل کیا ہے۔"

کرم داد سیدھا کھڑا ہو گیا پھر افسوس کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"میں نے تو کمال حاصل کیا ہے لیکن اس کم بخت ماسٹر کی نے میرے نام کا کباڑا کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیرم کہتا ہے۔ کیا میں کوئی کیرم بورڈ ہوں؟"

ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔"اس نے نہ تو تمھیں بگاڑا ہے نہ تمھارا نام بگاڑا ہے۔ اس کی وجہ سے تم کیا سے کیا ہو گئے ریوالور سے لے کر بھاری مشین گن تک چلاتے ہو اور تمھارے نشانے کی سبھی تعریف کرتے ہیں۔ انگریزی فرفر بولتے ہو، فرانسیسی بھی بڑی حد تک سمجھ لیتے ہو اور اٹک اٹک کر بول لیتے ہو۔ پہلے تمھارا جسم بھاری بھرکم تھا اور لوہاروں جیسی سختی تھی۔ اب دیکھو کیسا متناسب ہے۔ اس میں کتنی لچک پیدا ہو گئی ہے تم الٹی سیدھی قلابازیاں کھاتے ہو، فضا میں چھلانگیں لگاتے ہو اور ایک ذرا توازن نہیں بگڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم نے جو کچھ حاصل کیا ہے، جو ترقی کی ہے اس کے پیشِ نظر کرم داد جیسا نام بیک ورڈ لگتا ہے۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ کال بیل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کرم داد نے کہا۔"ہمارا شکار آ گیا ہے جاؤ دروازہ کھولو۔"

وہ اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آئی، پھر اس نے بیرونی دروازے کو کھولا۔ دروازے کے باہر اس کا دوسرا بھائی شاہنواز کھڑا ہوا تھا۔ وہ غصے سے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ریحانہ نے کہا۔"اندر آ جاؤ۔"

اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔"اور کون ہے؟"

"دوسرے کمرے میں چلو کوئی بھی ہو گا، دوست بناؤ گے تو دوست ہو گا، دشمن بناؤ گے تو دشمن۔"

"پہلے یہ بتاؤ تم دو برس تک کہاں رہیں۔ کہاں گم ہو گئی تھیں۔ وہ ہیرے کہاں ہیں؟"

"کیا یہیں کھڑے کھڑے سب باتیں پوچھ لو گے؟"

اس نے غرّا کر دیکھا پھر اچانک نرم پڑتے ہوئے پوچھا۔"مجھے یقین ہے تم نے ہیروں کو محفوظ رکھا ہو گا۔ تبھی مجھے فون کر کے بلایا ہے۔"

"پلیز دوسرے کمرے میں چلو۔"

"میں بھی پلیز کہہ رہا ہوں۔ میری بے چینی کو سمجھو میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ صرف ہاں یا ناں میں جواب دو۔ وہ ہیرے تمھارے پاس موجود ہیں؟"

"دوسرے کمرے میں ہیں۔"

وہ تیر کی طرح دوسرے کمرے میں پہنچا مگر وہاں پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔ سامنے ایک خوبصورت سے صوفے پر کرم داد آرام سے لیٹا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شاہنواز نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کی بہن کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ یکبارگی غصّے سے بپھر کر بہن کو گالیاں دینے لگا۔ کرم داد نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔"اپنی زبان بند کر لو۔ اس کے بعد کوئی گالی نکلی تو میں تمھارا مُنہ توڑ دوں گا۔"

شاہنواز مقابلے کے لیے پینترا بدلنے لگا۔ کرم داد نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف یوں بڑھایا جیسے پنجہ لڑانا چاہتا ہو۔ چک نمبر ۲۱۲ کے کھیتوں میں شاہنواز کا باپ بھی اس سے پنجہ نہیں لڑا سکا تھا، پھر وہ کیا لڑاتا۔ وہ جانتا تھا لوہار کے ہاتھ کتنے مضبوط ہوتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان دو برسوں میں کرم داد حیرت انگیز طور پر ایک اسمارٹ فائٹر بن چکا ہے۔

شاہنواز پیچھے ہٹ گیا۔ جھنجلا کر کہنے لگا۔"میں ساری باتیں سمجھ گیا ہوں۔ جب میری ماں کو قتل کیا گیا تو تم کرم داد

کے ساتھ اس قتل میں شریک تھیں۔ اسی لیے تم نے شناختی پریڈ میں اسے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر میرا باپ کھیت میں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل میں بھی تمھاری جیسی ذلیل بیٹی کا ہاتھ ضرور ہو گا تب ہی تم ہمارے ہیرے لے کر ہمارے اس دشمن کے ساتھ چلی آئیں۔"

کرم داد نے کراٹے فائٹر کی طرح گھوم کر ایک لات اس کے منہ پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں تمھیں وارننگ دے چکا ہوں۔ ریحانہ سے اچھے الفاظ میں گفتگو کرو۔ یہ میری بیوی ہے۔"

ریحانہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "کرم داد! تم نے وعدہ کیا تھا، میرے بھائی کی عزت کرو گے۔"

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اس سے کہو کہ یہ عزت کے قابل بنے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمھارے باپ اور بھائی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں نے اپنے وعدے کے مطابق انھیں قتل نہیں کیا۔ تمھارا یہ بھائی ابھی زندہ نظر آ رہا ہے صرف اس لیے کہ تم میری شریکِ حیات ہو، میری محبت ہو۔ میں نے وعدہ کیا ہے اس وعدے کو نبھا رہا ہوں۔"

وہ جھوٹ کہہ رہا تھا۔ وہ ریحانہ کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی لاعلمی میں اس نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا اور اب شاہنواز کی باری تھی۔ اس نے کہا "آج دو برس بعد تم نے فون پر بہن کی آواز سن کر سب سے پہلے ہیروں کے متعلق سوچا۔ بہن کی خیریت نہیں پوچھی، ہیروں کے متعلق سوال کیا تھا۔ تمھیں بہن سے محبت نہیں ہے؟ تم یہاں ہیروں کی خاطر آئے ہو۔ تو سنو، وہ کہاں ہیں۔"

شاہنواز اسے توجہ سے دیکھنے لگا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہ تمام ہیرے ماسٹر کی کے پاس پہنچ چکے ہیں اور اُن کی معقول رقم ہمیں مل چکی ہے۔"

وہ ایک دم سے تلملا کر بولا۔ "یہ جھوٹ ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ماسٹر کی سے میری ڈیلنگ ہے، وہ تم لوگوں سے ہیرے کبھی نہیں خریدے گا۔"

"وہ خرید چکا ہے۔ یہ بات پرانی ہو چکی ہے تم اس سے جا کر پوچھ لو۔"

وہ غصے سے جانے لگا تو ریحانہ نے راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "شاہنواز! رُک جاؤ۔ کیا تمھیں بہن سے محبت نہیں ہے۔ کیا میرے پاس تھوڑی دیر نہیں ٹھہر سکتے۔"

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ تم بہن نہیں، ہمارے گھر کی، ہمارے خاندان کی دشمن ہو۔ تمھاری وجہ سے ہمارے والدین کا قتل ہوا۔ تمھاری وجہ سے شاید ہم بھی مارے جائیں گے۔ تم خود کو بہن کہتی ہو، تمھیں شرم نہیں آتی۔"

وہ اسے دھکا دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ کرم داد لپک کر اسے پکڑنا چاہتا تھا لیکن ریحانہ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ "نہیں کرم داد تم میرے بھائی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔"

"دروازہ کھول دو۔ اس نے تمھیں دھکا دیا ہے۔"

"وہ میرا بھائی ہے، میں اس کی بہن ہوں اور بہنیں ایسی باتوں کا بُرا نہیں مانتیں۔"

وہ چپ ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ اس کا قصہ تو تمام کرنا ہی ہے، فی الحال ریحانہ کی بات مان لینا چاہیے۔

اور اس نے بات مان لی۔ میں شاہنواز کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ وہاں سے سیدھا ماسٹر پیلس پہنچا۔ یہ وہی محل نما کوٹھی تھی جہاں دو برس پہلے ریحانہ اور کرم داد پہنچے تھے اور ماسٹر کی سے ہیروں کا سودا کیا تھا۔ جب وہ اس بڑے سے ہال میں پہنچا تو جکی نے کہا۔ "آئیے مسٹر شاہنواز! ہمیں آپ ہی کا انتظار تھا۔"

"میں ماسٹر کی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"اُن ہیروں کے سلسلے میں جو میری ملکیت تھے۔ سودا مجھ سے ہونا چاہیے تھا۔ سودا دوسری پارٹی سے کیوں ہوا؟"

"اس کا جواب للی دے سکتی ہے۔"

"للی؟" شاہنواز نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں، تم چونک کیوں گئے۔ دو برس ہو گئے تم نے للی کی کوئی خبر نہیں لی ہے۔ وہ زندہ ہے یا مُردہ؟ وہ تمھاری محبوبہ تھی، تمھاری رازدار تھی۔"

"میں ہیروں کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔"

"میں نے کہا نا، اس کا جواب للی دے سکتی ہے۔ تم اس دروازے سے جاؤ، وہ تمھیں ایک کمرے میں ملے گی۔"

وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا دروازے کے سامنے پہنچا۔ دروازہ خود بخود کھلتا گیا۔ وہاں سے وہ ایک راہداری میں پہنچا۔ راہداری سے گزرتے ہوئے وہ دونوں طرف دیکھ رہا تھا۔ مختلف کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک کمرے کے بند دروازے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو شاہنواز! میں تمھاری للی بول رہی ہوں۔"

وہ دروازے کے سامنے رُک گیا۔ پھر اس نے تصدیق کے لیے پوچھا۔ "کیا تم للی ہو؟"

"کیا دو برس کے عرصے میں اس آواز کو بھول گئے جو بقول تمھارے رس بھری تھی۔"

اس نے جھجکتے ہوئے دروازے کو کھولا۔ پہلے تھوڑا سا کھول کر دیکھا، پھر پورا کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی لیکن اسے دیکھتے ہی شاہنواز کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر ہڈیوں کا ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا اور وہ ڈھانچہ نسوانی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "یقین کرو میں تمھاری للی ہوں۔ وہی للی جس کے حسن کی تعریف کرتے تھے۔ کیا حُسن صرف زندگی تک محدود رہتا ہے، کیا مرنے کے بعد تم میرے ڈھانچے میں کہیں سے شباب کو تلاش نہیں کر سکتے؟"

وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ "یہ کیا بکواس ہے۔"

کمرے کے ایک دُور افتادہ گوشے میں رکھی ہوئی کرسی آہستہ آہستہ گھومنے لگی۔ پھر ماسٹر کی نے کہا۔ "شاہنواز! تم للی کو نہیں پہچان رہے ہو، مجھے تو پہچان رہے ہو۔"

وہ کرسی کی طرف پلٹ کر بولا۔ "ماسٹر کی! یہ آپ نے اصول کے خلاف کیا ہے۔ میرے وہ ہیرے...."

ماسٹر کی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو، تمھیں معلوم ہے میں غیر ضروری باتیں سننا پسند نہیں کرتا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ یہ سچ مچ تمھاری للی ہے۔ جس دن ہمیں پتا چلا کہ یہ ہمارا کھاتی ہے اور تمھارا اگاتی ہے، ہماری باتیں تم تک پہنچاتی ہے اسی دن ہم نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا۔ تم چاہو تو جاتے وقت اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

"ماسٹر کی! یہ جھوٹ ہے میں نے کبھی تمھارے خلاف سازش نہیں کی۔ للی نے کبھی تمھارے خلاف مخبری نہیں کی۔"

"میری معلومات آج تک غلط نہیں ہوئیں۔ تم نے مجھ سے فراڈ کرنا چاہا۔ میں نے وقتی طور پر برداشت کر لیا۔ سوچا تمھیں اس خوش فہمی میں رکھا جائے کہ ماسٹر کی تمھارے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ دراصل میں اپنے ڈیلروں سے خواہ مخواہ دشمنی اس لیے نہیں کرتا کہ ان کے ایک فراڈ کے باوجود ان سے طرح طرح کے منافع حاصل کرتا ہوں مگر ان دو برسوں کے دوران تم نے ہمارے لیے کوئی مال نہیں پہنچایا۔ تمھاری وہ اسمگلنگ کی صلاحیتیں کیا ہوئیں؟ دو برس سے تم مزید ہیرے ہمارے پاس پہنچانے کا وعدہ کر رہے ہو، کہاں ہے وہ مال؟"

"میں ان دنوں بہت مجبور ہوں میرا بھائی رب نواز پوری کوشش میں ہے اس بار ہم بہت اچھا مال پہنچائیں گے۔"

"اسی لیے تو میں نے تمھیں زندہ رکھا ہے۔ اب یہ بتاؤ، کب تک بھروسا کیا جائے، تم زندگی چاہتے ہو یا موت؟"

شاہنواز نے تھوک نگل کر کہا۔ "میں سراسر نقصان میں ہوں۔ میرا مال اس کم بخت کرم داد نے ہتھیا لیا۔ میری بہن اس کا ساتھ دے رہی ہے۔ میں ہر طرح سے نقصان اٹھا رہا ہوں پھر بھی وعدہ کرتا ہوں...."

"اب میں تمھارا وعدہ نہیں سنوں گا۔ ایک بات یاد رکھو۔ اگر تم میرے کام آنا چاہتے ہو تو تمھیں اب وہی کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔"

"میں تیار ہوں۔ میرا بھائی رب نواز بھی کہہ رہا تھا، اگر تمھاری طرف سے کوئی آفر ہو، ہم تمھارے کسی بڑے منصوبے میں شریک ہو سکیں۔ تو ہمارا تجربہ بڑھے گا اور ہمارے پچھلے نقصانات کی تلافی ہو سکے گی۔"

"اچھی بات ہے۔ اس کے لیے تمھیں پاکستان جانا ہو گا۔ سفر کے دوران تمھارا جو سامان ہو گا وہ ہمارے ہاں سے ایئرپورٹ پہنچے گا۔ پاکستان پہنچ کر تم وہ سامان ہمارے ایک ایجنٹ کو دے دو گے۔ اس کا پتا تمھیں بتا دیا جائے گا۔"

"مجھے معلوم تو ہونا چاہیے۔ سامان کس قسم کا ہے میں کیا لے جا رہا ہوں تاکہ محتاط رہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ کسٹم والے تمھیں نہیں روکیں گے کوئی تم پر شبہ نہیں کرے گا۔ پاکستان پہنچتے ہی تمھیں وہاں کی کرنسی کے مطابق ایک لاکھ روپے ادا کر دیے جائیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "مجھے کب جانا ہو گا؟"

"جانے سے پہلے ہمارا ایک کام کرنا ہے، ہم ایک تحریر تم سے لکھوانا چاہتے ہیں۔"

"کیسی تحریر؟"

"سوال نہ کرو۔ میز کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ وہاں تمھاری ڈائری رکھی ہوئی ہے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "میری ڈائری؟"

"ہاں، یہ وہی ڈائری ہے جسے تم دو برس پہلے للی کی خواب گاہ میں چھوڑ آئے تھے۔"

اس نے میز کے پاس جا کر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی ڈائری میں کیا لکھوں۔ آخر یہ کیا چال ہے مجھے کچھ پتا تو چلے۔"

"کوئی چال نہیں ہے۔ آج سے تم پاکستان کے لیے ہمارے ایجنٹ ہو۔ ہم ایجنٹ مقرر کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ کی تحریر اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اتفاق سے تمھاری ڈائری ہمارے پاس موجود ہے۔ تمھاری تحریر تمھاری ہی ڈائری میں ضروری ہے۔ لہٰذا لکھو۔"

وہ قلم اٹھا کر اپنی ڈائری کو کھولتے ہوئے ایک سادے صفحے پر جھک گیا۔ وہ ریوالونگ چیئر ماسٹر کی کے لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "میں ڈائری کے اس ورق پر اپنی دلی اور

دماغی کیفیت کو لکھتے وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں اگرچہ یہ ڈائری دو برس پرانی ہے لیکن فی الوقت یہی میرے سامنے ہے اور میں اسی میں لکھ رہا ہوں۔"

شاہنواز نے لکھتے لکھتے پلٹ کر ریوالونگ چیئر کی طرف دیکھا۔ چیئر نے کہا: "میں تلی کی طرح حسین نہیں ہوں۔ لکھنے کی طرف توجہ دو۔"

وہ پھر گھوم کر ڈائری پر جھک گیا۔ ریوالونگ چیئر نے کہا۔

"پچھلی رات مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے آپ میں نہیں ہوں یا دماغی طور پر غیر حاضر ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر مجھے ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کھلی آنکھوں سے اپنے ماحول کو دیکھ رہا ہوں۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگا کہ چند لمحوں پہلے دماغی طور پر کس طرح غائب رہا تھا۔"

شاہنواز اپنی ڈائری میں لکھ رہا تھا اور پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ آخر اس تحریر کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو میرے خلاف بالکل نہیں ہے بس اوٹ پٹانگ سی باتیں ہیں۔

ریوالونگ چیئر کے کہنے کے مطابق وہ پھر لکھنے لگا۔

"آج صبح بیدار ہوتے ہی میرے دماغ نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے پاکستان جانا چاہیے۔

میں نے اپنے طور پر سوچا۔ میں نہیں جاؤں گا۔ بھلا پیرس جیسے خوبصورت شہر کو چھوڑ کر کون پاکستان جانا پسند کرے گا لیکن میرے دماغ میں بار بار یہی تکرار ہوتی رہی۔ آج دوپہر کو میرے دماغ میں پھر وہی بات آئی میں انکار کرنے لگا تو میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ میں پاکستان نہیں جاؤں گا تو یہیں خودکشی کر لوں گا۔

میں اس بات سے چونک گیا۔ بھلا میں خودکشی کیوں کروں گا۔ میں نے کہا۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔ میں نارمل آدمی ہوں اور نارمل آدمی کبھی اپنی جان کا دشمن نہیں ہوتا۔

تب مجھے پھر اپنے دماغ میں آواز سنائی دینے لگی۔ میں نارمل سے ابنارمل بن جاؤں گا۔ چشم زدن میں دماغی طور پر غیر حاضر ہو جاؤں گا جس طرح پچھلی رات ہوا تھا۔ پھر مجھے ہوش آئے گا تو میں خودکشی کے لیے بالکل آمادہ ہوں گا اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے خودکشی کرنے سے نہیں روک سکے گی۔

میرے دماغ میں کوئی آواز مجھے دھمکیاں دے رہی تھی اور میں قائل ہو رہا تھا کہ مجھے پاکستان جانا چاہیے۔ میں حرام موت مرنا نہیں چاہتا پھر وہ آواز گم ہو گئی۔ تب میں یہ لکھنے کے دوران سوچ رہا تھا، آخر مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں کیوں خودکشی کروں گا میں پاگل نہیں ہوں۔ میں جنونی نہیں ہوں۔ میں آزماؤں گا کہ آئندہ بھی یہ باتیں میرے دماغ میں آتی ہیں یا نہیں۔ میں مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہوں۔ اب اگر یہ آواز میرے دماغ میں آئے گی تو میں اس آواز کو اپنے دماغ سے جھٹک کر دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

ریوالونگ چیئر لکھوا رہی تھی۔ وہ لکھ رہا تھا اور میں اپنا سر کھجاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اچھا تو دشمن اب ایسے ہتھکنڈے استعمال کریں گے۔ شاہنواز نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس تحریر کا مطلب کیا ہے۔ ایک بار اس کے دماغ میں بات آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا: "دماغ میں اگر کوئی پرانی بات سنائی دیتی ہے یا دوسرا خیال آتا ہے تو ٹیلی پیتھی کا شبہ ہوتا ہے لیکن میرے دماغ میں تو کبھی ٹیلی پیتھی کی لہر نہیں آئی ہے۔ یہ مجھ سے ایسی تحریر کیوں لکھوا رہا ہے اور یہ مجھے مارنا بھی نہیں چاہتا۔ بھلا میں خودکشی کیوں کروں گا اور جبکہ میں اس کے لیے ایک مستقل منافعے کا ذریعہ ہوں۔ یہاں سے پاکستان تک پتا نہیں اس کا کتنا قیمتی مال لے جاؤں گا۔"

شاہنواز اپنے طور پر سوچ رہا تھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ماسٹر کی کیسی چالیں چل رہا ہے، اسے تو پاکستان جانا نصیب ہی نہیں ہوگا۔ یہ سراسر خودکشی کا کیس بننے والا تھا اور اس خودکشی کا الزام مجھ پر یار سونتی پر ہی آتا۔

میں شاہنواز کو یہ سب کچھ لکھنے سے روک سکتا تھا اور جب لکھ چکا تھا تو لکھے ہوئے کو ضائع کرا سکتا تھا لیکن میں اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں خودکشی والا معاملہ ختم کرنے کے لیے شاہنواز کو کسی حادثے کا شکار بنا سکتا تھا لیکن ماسٹر کی وغیرہ سمجھ لیتے کہ جسے ٹارگٹ بنایا جا رہا تھا وہ اچانک کیسے حادثے کا شکار ہو گیا کسی نہ کسی طرح مجھ پر شبہ ہوتا اور اب میں اپنے کسی دشمن کو شبہ کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

اور یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ خودکشی کا الزام مجھ پر عائد کرتے اور میں اسے جھٹلا نہ سکتا۔ اسے جھٹلانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن ماسٹر کی نادان نہیں ہو سکتا تھا۔ اس خودکشی کے کیس کے پیچھے کوئی بڑا کھیل کھیلنا چاہتا تھا لہٰذا اس کی سازشوں کو سمجھنے کے لیے تحمل کی ضرورت تھی۔ میں اس کے تماشے دیکھ رہا تھا اور آگے نہ جانے ان باقی پاکستانی جوانوں کے ذریعے کیا کیا تماشے دیکھنے والا تھا۔

اس نے لکھنے کے بعد پوچھا: "اور کیا لکھوں؟"

"ڈائری وہیں چھوڑ دو اور کل یہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تمھیں فون کے ذریعے اطلاع دی جائے گی۔ اس اطلاع کے مطابق اپنے ٹکٹ اور ضروری کاغذات

حاصل کر لینا۔ اب جاؤ۔"

وہ وہاں سے چلا آیا۔ میرا خیال درست تھا۔ یہ خودکشی کا کیس بنایا جا رہا تھا۔ اسی شام اسے فون کے ذریعے جیکی نے اطلاع دی: "صبح سات بجے کی فلائیٹ میں تمھارے لیے ایک سیٹ ریزرو ہو چکی ہے، اپنا ٹکٹ اور ضروری کاغذات لینے کے لیے بڈ اینڈ اسپنسر بلڈنگ کے بارھویں فلور پر پہنچو۔ کمرہ نمبر ایل-۱۲ میں تمھاری چیزیں مل جائیں گی۔ فوراً وہاں جاؤ، ایک گھنٹے بعد وہ دفتر بند ہو جائے گا۔"

وہ اپنی رہائش گاہ سے روانہ ہوا اور اس بلند و بالا عمارت کے بارھویں فلور پر پہنچ گیا۔ ایل بارہ نمبر کے دروازے کی گھنٹی بجائی، دروازہ فوراً ہی کھل گیا، جتنی جلدی کھلا، اتنی ہی تیزی سے اسے شاک پہنچا کیونکہ سامنے کرم داد کھڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چونکنے کے بعد سنبھلتا، کرم داد نے اچانک اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر کمرے کے اندر کھینچ لیا دروازے کو بند کر دیا۔ وہ کمرہ کوئی دفتر نہیں تھا بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر اتنی زور سے دھکا دیا تھا کہ وہ اندر آ کر خالی فرش پر گر پڑا تھا۔

وہ کرم داد کی طرح قد آور تھا۔ جسامت میں بھی کم نہیں تھا لیکن لڑنے کے لیے طاقت اور لڑائی کی تکنیک ہوتی ہے جو یہ نہ جانتا ہو وہ جسامت اور قد رکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کرم داد نے اسے بُری طرح پیٹتے ہوئے کہا: "پہلے کچھ مار کھا لو پھر باتیں ہوں گی۔"

وہ مار کھانا نہیں چاہتا تھا۔ مصلحت سے کام لینا چاہتا تھا فوراً ہی عاجزی سے بولا: "میں لڑنا نہیں چاہتا تمھاری برتری تسلیم کرتا ہوں، صرف اتنا ہی نہیں، تمھیں اپنا بہنوئی بھی تسلیم کرتا ہوں۔"

"تسلیم کرو یا نہ کرو، میں تمھارا بہنوئی ہوں اور تمھارے مرنے کے بعد بھی رہوں گا۔"

اس نے سہم کر پوچھا: "کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"کیا تمھارے ماں باپ کے انجام نے تمھیں کچھ نہیں سمجھایا ہے؟"

جان کا خطرہ محسوس کرتے ہی وہ چیخنا چاہتا تھا کہ منہ پر زبردست گھونسہ پڑا۔ پھر تو گھونسے پڑتے ہی گئے اس کے بعد اس نے شاہنواز کی گردن دبوچ لی۔ کہنے لگا: "اگر ذرا بھی آواز نکلی تو...."

وہ اپنے ہاتھوں کو نہیں نہیں کے انداز میں ہلانے لگا جیسے کہہ رہا ہو: "میں شور نہیں مچاؤں گا۔" کرم داد نے اس کی گردن چھوڑ کر کہا: "تم مدد کے لیے بلانا چاہتے ہو تو دروازہ کھول کر نہیں، یہ کھڑکی کھول کر بلاؤ۔"

شاہنواز نے اسے بے یقینی سے دیکھا، جو قاتل تھا وہ بھلا اس بات کا موقع کیوں دیتا کہ اس کے خلاف مدد کے لیے دوسروں کو بلایا جائے۔ کرم داد نے کہا: "وقت ضائع نہ کرو میرا ارادہ بدل جائے گا پھر مدد کے لیے کسی کو پکارنے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔"

وہ پلٹ کر کھڑکی کے پاس گیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا، دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اتنی بلندی پر تھا کہ نیچے جھانکنے پر گاڑیاں کھلونوں کی طرح اور انسان بونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ شاہنواز نے بس اتنا ہی دیکھا۔ اس کے بعد دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کرم داد نے پیچھے سے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر دوسری طرف الٹ دیا تھا۔ اس کے بعد صرف اس کی آخری چیخ سنائی دی۔

وہ بلندی سے پستی کی طرف کیسے جا رہا ہے یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر وہاں سے بھاگتا ہوا لفٹ میں آیا۔ لفٹ کے ذریعے آٹھویں منزل پر پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے لفٹ کا بٹن نیچے جانے کے لیے دبا دیا۔ نیچے خالی لفٹ جا رہی تھی اور وہ آٹھویں منزل پر تیزی سے چلتا ہوا زینے کی طرف آ رہا تھا وہاں ایک خوبصورت مقامی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ زینے سے نیچے اترتے ہوئے بولی: "حواس کو قابو میں رکھو۔ تم ایسے خوش نظر آ رہے ہو جیسے ابھی کوئی درندہ اپنے شکار کو ہضم کر کے ٹہلنے نکلا ہو۔"

وہ سرگوشی میں بولا: "تو کیا میں اس کم بخت کا ماتم کروں، آج میں نے تیسرے دشمن کو ٹھکانے لگایا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی: "چلو خوش رہو۔ خوب ہنستے بولتے رہو۔"

وہ زینے سے اترتے ہوئے ساتویں منزل پر آئے۔ پھر وہاں کی لفٹ کے پاس پہنچ کر قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اس وقت تک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ عمارت کی بلندی سے کوئی گر پڑا ہے۔ یہ بحث بعد میں ہوتی کہ گرنے والا خود گرا ہے، خودکشی کی ہے یا کسی نے گرا دیا ہے۔

کرم داد اب جلد سے جلد ماسٹر پیلس پہنچ کر ریحانہ کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ بہت پہلے ہی سے ماسٹر پیلس میں موجود تھا۔ ماسٹر کی نے تفریح کی غرض سے اسے اسٹیج کا ایک کردار بنایا ہوا تھا۔

اس کی سوچ سے وضاحت نہیں ہو رہی تھی۔ میں

ریحانہ کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت ماسٹر پیلس کے اسی بڑے ہال میں تھی جس کے وسط میں ایک دائرہ نما اسٹیج بنا ہوا تھا اور اس اسٹیج پر وہ ریوالونگ چیئر موجود تھی یعنی وہ ریوالونگ چیئر صرف ایک جگہ رکھی نہیں رہتی تھی۔ اس چیئر کے نیچے چار ننھے پہیے تھے۔ وہ حرکت کرتی تھی اور خود ہی راستے کا تعین کرتے ہوئے جہاں جانا ہوتا تھا وہاں پہنچ جاتی تھی۔ وہ اسی طرح اس کمرے میں بھی پہنچی تھی جہاں اس نے شاہنواز سے اس کی ڈائری میں بہت کچھ لکھوایا تھا۔

بہرحال ریحانہ اور جیکی دو کرسیوں پر ریوالونگ چیئر سے ذرا دور بیٹھے اس بڑے سے اسٹیج کو دیکھ رہے تھے جس کے سامنے ریشمی پردہ پڑا رہتا تھا جیسا کہ عام طور پر سینما اور تھیٹر وغیرہ کے اسٹیج کے سامنے پڑا رہتا ہے۔

آج وہ پردہ ہٹ گیا تھا۔ اس اسٹیج پر ایک نہایت ہی وہشت ناک خونی ڈراما پیش کیا جا رہا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ماسٹر کی نفسیاتی طور پر جنونی رہا ہوگا۔ وہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر بہت خوش ہوتا تھا اور ایسے ہی تماشے دیکھتا تھا جس میں کوئی شدید تکلیف میں مبتلا ہو اور اذیتیں برداشت کرتے کرتے دم توڑ دے۔ اس سے پہلے فش ایکوریم میں للّی نے اپنی جان دی تھی۔ آج وہ فش ایکوریم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے صرف اسٹیج روشن تھا۔ پس منظر میں ایسا اسٹیڈیم دکھائی دے رہا تھا جیسے کہ رومن حکمرانوں کے دور میں ہوا کرتا تھا۔ اس اسٹیڈیم میں کوئی نہیں تھا لیکن ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے تماشائی بھرے پڑے ہوں۔ اسٹیڈیم یعنی اسٹیج پر تقریباً بیس افراد ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ کوئی نیزہ اٹھائے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں شمشیر تھی، کوئی تیر کمان لیے ہوئے تھا، کوئی آہنی زنجیریں اور جال پکڑے ہوئے تھا۔ وہ جال اپنے مقابل پر پھینک کر اسے پھانسنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر کوئی پھنس جاتا تھا تو اسے خنجر سے ہلاک کر دیتا تھا۔

بظاہر یہ اسٹیج ڈراما تھا۔ اسٹیج ڈرامے میں سچ مچ قتل نہیں کیے جاتے۔ لڑائی کا منظر دکھانے کے لیے نقلی ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں اور نقلی لہو بہایا جاتا ہے لیکن وہاں اصلی لہو بہہ رہا تھا اور اصلی ہتھیار استعمال ہو رہے تھے۔

ریحانہ کو ایسے مناظر سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی لیکن مجبوراً بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسٹیج پر ہونے والے اس خونی ڈرامے میں اس کا کرم داد بھی ایک کردار بنا ہوا ہے لیکن وہ کہاں ہے؟ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ ایک دوسرے سے لڑتے والے جتنے بھی کردار تھے۔ چہرے پر نقاب پہنے ہوئے تھے۔ ان کے لباس بھی عجیب طرح کے تھے اس لیے وہ کرم داد کو پہچاننے میں ناکام ہو رہی تھی۔ آخر وہ خونی ڈراما اس مرحلے پر پہنچ گیا جب اسٹیج پر صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ باقی سولہ افراد اپنے لہو میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکے تھے۔ باقی بچنے والے چاروں جنگجو افراد نے اسٹیج کے سامنے رُخ کر کے ریوالونگ چیئر کو دیکھتے ہوئے اپنے ہتھیار ڈال دیے۔ پہلے تعظیماً اپنا سر جھکایا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔ پھر اپنے نقاب اتار دیے۔ ریحانہ نے خوش ہو کر ایک گہری سانس لی۔ اسے درمیان میں کھڑا ہوا کرم داد نظر آ رہا تھا۔ وہ اب تک دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ اس کردار میں واقعی کرم داد موجود ہے تو اسے کوئی نہ مارے۔ وہ زندہ بچ جائے۔ اب اسے زندہ دیکھ کر وہ خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا: "ماسٹر کی! ہم آپ کو اپنا آقا تسلیم کرتے ہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ایسے خونی ڈرامے سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ میرے شوہر کو استعمال کریں؟"

ریوالونگ چیئر نے اس طرف گھوم کر قہقہہ لگایا۔ پھر کہا، "مجھے تو بڑا لطف آتا ہے۔ اگر کوئی اس وقت تمھاری بوٹی بوٹی کاٹنے لگے تو میں اسے بھاری انعام دوں گا لیکن کرم داد میرا بہت ہی دلیر ماتحت ہے اس نے ٹریننگ کے دوران مجھے خوش کر دیا ہے۔ اس اسٹیج پر جتنے مُردے نظر آ رہے ہیں ان میں سے صرف دو میرے ایسے ماتحت تھے جو مجھ سے غداری کر رہے تھے۔ باقی میرے دشمن سائمن ڈی گریٹ کے تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ ہمارے آدمیوں نے انھیں گرفتار کر لیا تھا۔ میں انھیں اس شرط پر رہا کر سکتا تھا کہ یہ اسٹیج پر آ کر ہمارے آدمیوں سے مقابلہ کریں اور انھیں قتل کرنے کے بعد یہاں سے چلے جائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کرم داد، جیکب، ہیری اور ولسن نے میرے ٹریننگ سینٹر کا وقار قائم کر رکھا ہے۔ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے ٹی ٹی سینٹر کے تربیت یافتہ دوسرے تمام ٹی ٹی سینٹر کے تربیت یافتہ افراد پر بھاری ہیں۔

کرم داد اپنے باقی تین جنگجو ساتھیوں کے ساتھ اسٹیج سے اتر کر ہال میں آ گیا تھا اور اس دائرہ نما اسٹیج کے سامنے ادب سے کھڑا ہوا تھا۔ ریوالونگ چیئر کہہ رہی تھی: "کرم داد! تمھارے لیے خوشخبری ہے۔ تم اپنی وائف کے ساتھ پاکستان جانے کی تیاری کرو۔"

وہ خوش ہو گیا۔ اس کا چوتھا شکار پاکستان میں تھا۔ ریحانہ بھی خوش تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی رب نواز سے مل سکے گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہی اس کے شوہر کا چوتھا شکار ہے۔

ماسٹر کی کیا سوچ رہا تھا یہ میں نہیں جانتا تھا۔ کرم داد کے پاکستان پہنچنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ اسے کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کسی ایسی سازش کی ابتدا ہو چکی تھی جس کے نتیجے میں میرے ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

میرے سوچنے کے دوران فون کی گھنٹی سنائی دی۔ جیکی نے میز کی طرف بڑھ کر ریسیور اٹھایا، پھر سننے لگا۔ میں فوراً ہی جیکی کے دماغ میں پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ "میں بریگیڈیئر جناتھن تمھارے ماسٹر کی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہولڈ آن کیجیے۔"

جیکی نے ریحانہ، کرم داد، ہیری، جیکب اور ولسن کو حکم دیا کہ وہ چلے جائیں۔ بعد میں ان سے رابطہ قائم کیا جائے گا۔ وہ سب ہال سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد جیکی نے کہا: "سر! بریگیڈیئر جناتھن آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

میں اتنی دیر میں معلوم کر چکا تھا۔ بریگیڈیئر جناتھن ایک امریکی فوجی تھا جو ویت نام کی جنگ سے ریٹائر ہونے کے بعد الباما کے ٹریننگ سینٹر کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔

ریوالونگ چیئر نے کہا: "میں بریگیڈیئر سے باتیں کر رہا ہوں تم ریسیور رکھ دو۔"

جیکی نے ریسیور رکھ دیا یعنی ماسٹر کی اور بریگیڈیئر جناتھن کے درمیان جو گفتگو ہونے والی تھی اسے اس کا دست راست جیکی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ میں نے بریگیڈیئر کے دماغ میں جگہ بنا لی تھی۔ اس کے ذریعے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

ماسٹر کی نے کہا: "ہیلو بریگیڈیئر! تمھارے آرڈر کے مطابق تمام آدمی تیار ہیں۔ ایک کھیپ پہلے روانہ کر چکا ہوں۔ دوسری کل رات کو یہاں سے روانہ ہوگی۔"

بریگیڈیئر نے کہا: "ماسٹر! تم جتنے آدمی بھیج رہے ہو اُن میں فائر لائیک زیادہ ہیں اور فلاور لائیک کم ہیں۔"

فائر لائیک کا مطلب تھا، گرم مزاج، جنگجو قسم کے لوگ اور فلاور لائیک کا مطلب تھا ٹھنڈا مزاج رکھنے والے سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ وقت اور حالات کو دیکھ کر عمل کرنے والے۔

وہ کہہ رہا تھا: "دراصل پاکستان سے جو چیدہ چیدہ لوگ ہمارے ہاتھ لگے ان میں فلاور لائیک صرف دو ہی تھے انھیں ہم برسوں سے ٹریننگ دیتے آ رہے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ فلاور لائیک ہمارے لیے کافی ہیں۔ یہ دونوں میرے فائر لائیک پیوپل کو کنٹرول کریں گے۔"

"میں اپنے سینٹر سے سات پاکستانیوں کو بھیج رہا ہوں۔ شاید تمھیں یہ سن کر حیرت ہو کہ ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ پانچ عورتیں ہیں اور دو مرد۔"

ماسٹر کی نے ہنستے ہوئے کہا: "مجھے بالکل حیرانی نہیں ہوئی۔ عورتیں آجکل جس تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں وہ مردوں کو بہت پیچھے چھوڑ جائیں گی۔ ماہرین جرمیات اور سماجی سائنسداں جرائم کے اسباب کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی روک تھام کے سلسلے میں تجاویز پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، یوں تو عورتیں بھی ازل سے مردوں کی طرح جرم و گناہ کی مرتکب ہوتی رہی ہیں لیکن اب اور تب میں بڑا فرق ہے۔ پہلے زمانے میں جرائم کو زنانہ اور مردانہ اقسام کے اعتبار سے جُدا جُدا سمجھا جاتا تھا۔ فی زمانہ عورتوں کی مجرمانہ سرگرمیاں عالمی پیمانے پر ہیں۔ اب عورتیں مردانہ وار جرم کر کے گزر جاتی ہیں اور قانون کے محافظ سوچتے سمجھتے رہ جاتے ہیں۔"

اس بات پر دونوں طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ میں قہقہہ لگانے والے بریگیڈیئر جناتھن کے دماغ کو ٹٹول رہا تھا۔ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے پاکستان پہنچنے والی پانچ عورتوں اور دو مردوں میں ایک جمال احمد جسکانی تھا۔ باقی پاکستانیوں کے نام پتے اور ان کی ہسٹری شیٹ وقت آنے پر بریگیڈیئر کے دماغ کے ذریعے معلوم کر سکتا تھا۔ یہ افسوس کا مقام تھا کہ پاکستان کے ذہین اور ہُنرمند افراد غیر ملکی ایجنٹوں کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔ ویسے ساری دنیا کی سیاست پر نظر ڈالی جائے تو ایسا صرف پاکستان میں نہیں ہوتا، دنیا کے ہر ملک میں جہاں صنعتی اور زرعی ترقی کو روکنا ہو، سیاسی حالات کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنا ہو، اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا ہو تو بڑے ممالک اسی طرح کسی بھی ملک کے باشندوں کو خرید لیتے ہیں۔ خرید نہ سکیں تو ان کے پسماندہ حالات اور انکی زندگی کے المیوں کے مطابق ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا سہارا بنتے ہیں یا پھر آخری چال یہی ہوتی ہے کہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں بلیک میل کرتے ہیں اور انھیں ان کی ہی حکومت کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سیاست کی دنیا میں یہ گُر نہایت کامیاب ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک میں کسی بھی گھر میں گھر کے چراغ سے ہی آگ لگائی

جاتی ہے۔"

میں نے جمال احمد جسکانی کے دماغ کو پڑھنا شروع کیا۔ اس عرصے میں وہ بہت بدل چکا تھا۔ کرم داد کی طرح اس نے بھی ہر قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ بغیر ہتھیار کے خالی ہاتھ لڑنے کی نت نئی تکنیک بھی اچھی طرح سیکھ لی تھی۔ اس کے دماغ میں ہمیشہ یہی بات رہتی تھی کہ کسی طرح ٹریننگ مکمل کرے اور پاکستان جا کر اپنی بہن کا انتقام لے۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کا باپ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔

جب بریگیڈیئر جناتھن نے اسے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ وہ جلد ہی پاکستان بھیجا جائے گا تو اس نے خوش ہو کر پوچھا "کیا میں وہاں آزادی سے رہ سکوں گا؟ کیا وہاں کا قانون مجھے بھول چکا ہو گا؟"

"ہاں، سمجھ لو کہ وہاں کا قانون تمھیں ہمیشہ کے لیے نظر انداز کر چکا ہے۔ اگر تمھیں گرفتار کیا جائے گا تو تمھارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ علاقائی تھانے سے لے کر عدالت تک تمھارے خلاف جتنے ثبوت تھے، جتنے ریکارڈ تھے وہ سب غائب کر دیے گئے ہیں۔ فی الحال تم اپنے علاقے میں نہیں جاؤ گے۔ ہمارے منصوبے کے مطابق کم از کم چھ سات ماہ تک یا ایک برس تک ڈاکو کا کردار ادا کرتے رہو گے۔ اپنے صوبے کے اندرونی علاقوں میں ڈاکے ڈالو گے اور اپنے نام کو ایک دہشت کے طور پر پیش کرو گے اس کے بعد تم اپنے علاقے میں جاؤ گے تو تمھارے مخالف گواہ جو وہاں موجود ہوں گے وہ تمھاری دہشت سے عدالت میں حاضری نہیں دیں گے۔"

جمال احمد جسکانی کو اور بہت کچھ سمجھایا جا رہا تھا۔ اسے وہ کوڈ ورڈز بتائے گئے تھے جن کے ذریعے وہ اپنے اجنبی ساتھیوں کو پہچان سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سات افراد کی ایک ٹیم وہاں سے روانہ ہونے والی ہے جس کی سربراہ ایک عورت ہے۔ یہ بات اسے بُری لگی تھی۔ چونکہ وہ عورت اس سے زیادہ تجربہ کار تھی اور وہ فلاور لائیک تھی لہٰذا فلاور لائیک کردار کو کسی بھی ٹیم کا سربراہ بنایا جاتا تھا اس لیے اس نے ایک عورت کی سربراہی منظور کر لی تھی۔

میں نے خیال خوانی کی پرواز کا رخ بدل دیا۔ دلاور خان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بہرام علی ٹیرر ٹریننگ سینٹر کے ایک کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ تقریباً پچاس میرے ہم وطن ہوں گے۔ ان سب نے مختلف شعبوں میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کی تھی۔ کوئی چالبازی میں ماہر تھا۔ بلیک میلنگ کے ذریعے کسی بھی بڑے آفیسر کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتا تھا، کوئی پلان میکر تھا، کوئی انڈر گراؤنڈر تھا، کوئی ہتھیاروں کو یوں استعمال کرتا تھا جیسے کھلونا سمجھ کر کھیل رہا ہو۔ کوئی خالی ہاتھ لڑنے اور برتری حاصل کرنے میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ ان میں دھیرے دھیرے کیچوے کی چال چل کر بازی جیتنے والے فلاور لائیک زیادہ تھے۔

دلاور خان ان تمام لوگوں کے ساتھ کلاس رُوم میں بیٹھا ہوا اپنے انسٹرکٹر کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ انکے انسٹرکٹر آفیسر کا نام واسکولائی تھا۔ وہ رُوسی زبان بولتا تھا انگریزی کم جانتا تھا اس لیے اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

میں اٹک اٹک کر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں سائمن دی گریٹ کا ایک خط پکڑے ہوئے تھا۔ اس خط کا متن یہ تھا کہ بکرے تیار ہیں، پاکستان میں عید نزدیک ہے، انھیں منڈی میں پہنچانے کی تاریخ جلد مقرر کرو ورنہ ہم دوسری پارٹی سے سودا کر لیں گے۔

اچانک میری خیال خوانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مجھے یکبارگی تاریکی کا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا۔ میں بہت دیر سے خیال خوانی کر رہا ہوں۔ اتنی دیر سے کہ رات ہو چکی ہے اور ڈاکٹر شیفرڈ جو لائٹ آن کر گیا تھا وہ اچانک بجھ گئی ہے۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میں نے ہولے سے آواز دی۔ "ڈاکٹر! کیا تم ہو؟"

میری بات ختم ہوتے ہی جیسے کمرے میں کوئی بلا نازل ہو گئی۔ ٹھیک میرے سینے پر ایک لات پڑی تھی۔ اس نے فلائنگ کک ماری تھی۔ میں لڑکھڑا کر صوفے پر گر پڑا۔ بڑا غصہ آیا جب تک مزید آہٹ نہ ملتی یا اس بلا کی آواز سنائی نہ دیتی میں اندھیرے میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر اچانک ہی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ ریوالور کی گولی اور میرے خالی ہاتھ روشنی کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ اندھیرے میں بھی چلتے ہیں۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تم آمنہ کا سامنا کر رہے ہو۔"

اسے کیا معلوم تھا کہ وہ تاریکی میں آواز سُنا کر کتنی بڑی غلطی کر رہی ہے۔ میں نے اطمینان سے نشانہ لیا۔ پھر گھوم کر ایک لات اس کے مُنہ پر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے دیوار سے جا کر لگ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تم میری لات کا آمنا سامنا کر رہی ہو۔"

میوہ کھانے والے آمنہ کی آنکھوں کو بادامی کہتے۔ شراب پینے والے مے خانہ کہتے۔ دودھ پینے والے بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں سمجھتے۔ شکار کرنے والے خوب صورت ہرنی کی آنکھوں سے تشبیہ دیتے۔ آنکھیں خواہ کتنی ہی خوب صورت ہوں، خواہ کتنی ہی بڑی بڑی اور دل میں اُتر جانے والی ہوں، سب کی سب تاریکی میں پہنچ کر اندھی ہو جاتی ہیں۔

وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے سیاہی میں گھور رہی تھی۔ مجھے دیکھنا چاہتی تھی، دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن میری آواز سے اندازہ کر لیا تھا کہ کہاں ہوں، کتنے فاصلے پر ہو سکتا ہوں۔ وہ طیش میں تھی۔ آج تک کسی نے اُسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کی تھی، کجا یہ کہ میں نے اس کے مُنہ پر لات ماری تھی۔ وہ سنبھل کر آگے بڑھی، اندازہ کیا پھر اس نے ایک کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کی سماعی قوت حیرت انگیز تھی۔ اندھیرے اور سناٹے میں ہلکی سی آواز بھی سُن لیتی تھی۔ ایک طرف ہٹنے پر اس نے اُسی طرف آنکھیں گھما کر دیکھا۔ پھر حملہ کیا۔ پہلے تو میں نے جھک کر حملے کو ناکام بنایا۔ پھر سیدھا کھڑا ہو کر اُسے دبوچ لیا۔

وہ جدوجہد کرنے لگی۔ اُس کے دونوں ہاتھ میرے شانے سے اوپر تھے۔ وہ پیچھے سے ہاتھ لا کر میرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ سکتی تھی۔ کھڑی ہتھیلیوں سے میرے سر پر ضربیں لگا سکتی تھی اور وہ ایسا ہی کرنا چاہتی تھی لیکن میں اسے موقع نہیں دے رہا تھا، اُسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ فضا میں اس طرح چلا رہی تھی جیسے پَر مار رہی ہو۔ پرواز کی مشق کر رہی ہو۔

یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہ بچپن ہی سے اپنے مخالفوں پر برتری حاصل کرنے کی عادی تھی۔ کسی سے شکست کھانے سے پہلے مر جانا پسند کرتی تھی۔ سونے پر سُہاگہ یہ کہ مسلسل تربیت حاصل کرنے کے بعد دہشت کی علامت بن گئی تھی۔ اس کے ساتھی دُرست کہتے تھے "آمنہ کا آمنا سامنا کرنا گویا موت کا سامنا کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "عورت کی پہچان گھر کی چار دیواری میں ہوتی ہے۔ تم دوسروں کے گھروں میں گُھس کر خواہ مخواہ دُشمنی کرتی ہو۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟"

"مجھے چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"چھوڑ کر بھی تو اچھا نہیں ہو گا۔ چھوڑنے کی حماقت کیوں کروں۔"

بہکنے کے دوران میں اُس کے دماغ میں نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنا داؤ کھیل گئی۔ اتنی زور سے پاؤں پر پاؤں مارا کہ میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے منہ پر ایک زبردست کراٹے کا ہاتھ پڑا۔ واقعی اس کی قوتِ سماعت حیرت انگیز تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے سانس لینے کی آواز بھی سن رہی ہو۔ تاریکی میں نظر نہ آنے کے باوجود وہ کامیاب حملے کر رہی تھی۔ اس کے بعد پھر اس نے حملہ کیا۔ میں نے موقع نہیں دیا، اسی طرح پھر گرفتار کر لیا۔

"تم شاید پاگل خانے سے آئی ہو یا پھر گھروں میں گُھس کر چوری کرنے کی عادی ہو۔ میں تمھاری یہ عادت چھڑا کر رہوں گا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے ریڑھ کی ہڈی پر اس طرح دباؤ ڈالا کہ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اُٹھی۔ وہ میری دشمن نہیں تھی، لہٰذا ایک داؤ دُشمن کی طرح اور دوسرا دوست کی طرح آزمایا۔ اُسے دوستانہ داؤ پسند نہیں آیا۔ وہ میرے خلاف کچھ کہنا چاہتی تھی، میں نے اُس کا منہ بند کر دیا۔

غصے کی انتہا تک پہنچ کر انسان پاگل بن جاتا ہے۔ اب اس کے پاگل بننے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ بس ذرا آزاد ہونے کی دیر تھی۔ وہ میری بوٹیاں نوچ لیتی۔ مجھے کبھی زندہ نہ چھوڑتی۔

اسی وقت اچانک ہی کمرہ روشن ہو گیا۔ میں نے اُسے پرے دھکیل دیا۔ اس نے چشم زدن میں لباس کے اندر سے پستول نکال لیا۔ مجھ پر فائر کرنا ہی چاہتی تھی کہ میری صورت دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ شدید حیرانی کے باعث اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر اُس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ ایک دم سے بابر کہہ کر چیختے ہوئے میرے قریب آ گئی۔ میں نے اُسے پرے دھکیل دیا اور وہاں سے اُچھل کر صوفے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر حیرانی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ "ارے تم تو وہی عورت ہو جس کی تصویر میرے پاس ہے۔ ایک ڈائری میں تمھارا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ کیا تمھارا نام آمنہ ہے؟"

وہ میرے پاس آتے ہوئے بولی "بابر! تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم اپنی آمنہ سے نام پوچھ رہے ہو۔ کیا مجھے نہیں پہچان رہے ہو؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ پھر تعجب سے پوچھا "کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟ کیا تم بھی یہی کہتی ہو کہ میرا نام بابر ہے؟ وہ ڈاکٹر شیفرڈ بھی مجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔"

"وہ دُرست کہہ رہا تھا۔ تمھارا نام بابر ہی ہے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس روز زخمی ہونے

کے بعد تم یادداشت کھو بیٹھے ہو ؟"

"میں نہیں جانتا، میں کب زخمی ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی کچھ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

"وہ درست کہتا ہے۔ میں بھی کہتی ہوں، تم سر سے پاؤں تک بابر ہو۔ تم میرے بابر ہو۔ بابر جلال ہو۔"

"تم اُلٹا نام کیوں لے رہی ہو۔ جلال اُلدین بابر کیوں نہیں کہتیں ؟"

"کیا تمھارا نام جلال الدین بابر ہے ؟"

"یہ ایک مغل شہنشاہ کا نام تھا۔ تم اُسے بگاڑ کر بابر جلال کہہ رہی ہو۔"

"اوہ بابر ! یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے ؟"

وہ آگے بڑھی، میں ایک صوفے سے اُچھل کر دوسرے صوفے پر گیا، وہاں بھی اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر بولا "اے خبردار ! میرے قریب نہ آنا۔ میں خوب سمجھتا ہوں تم گلے لگنے آؤ گی اور گلا کاٹو گی۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں، تم آزما چکی ہو۔ ایسے ایسے داؤ آزماتا ہوں کہ دُشمن گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اگر تم میرے پاس آؤ گی تو . . . !"

وہ دور ہی سے بولی "میں پاس نہیں آؤں گی مگر میری پریشانی دور کر دو۔ میں سمجھنا چاہتی ہوں، تمھارے ساتھ کیا ہو نا رہا ہے۔ تم میرے ہو اور مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔ یقیناً دُشمنوں نے تمھیں گرفتار کرنے کے بعد ایسی اذیتیں پہنچائی ہیں کہ تمھارا ذہن ناکارہ ہوگیا ہے۔"

"ناکارہ ہوگی تم، تمھارا خاندان۔"

"اوہ گاڈ ! یہ کیا ہو رہا ہے۔ اچھا تم مجھے اپنی ڈائری اور وہ تصویریں دکھاؤ۔"

"پہلے تم بتاؤ، تم نے یہاں آتے ہی اندھیرا کیوں کر دیا۔ مجھ پر حملہ کیوں کیا اور یہ اچانک روشنی کیسے ہوگئی ؟"

"میرے ایک ساتھی نے اطلاع دی تھی کہ ڈاکٹر شیفرڈ اس مکان میں دیکھا گیا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ میری وارننگ سے پریشان ہو کر یہاں چھپنے آیا ہے۔ اس لیے میں نے یہاں داخل ہونے سے پہلے مین سوئچ کو آف کر دیا اور تم پر حملہ کر بیٹھی۔ شاید ہمارے لڑنے کی آواز باہر تک گئی ہے، اسی لیے میرے کسی ساتھی نے مین سوئچ کو آن کر دیا ہے۔"

میں نے بابر جلال کا تمام سامان نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ اُسے دیکھتے ہوئے بولی "کیا ان چیزوں کو دیکھ کر بھی تمھیں یقین نہیں آتا کہ تم بابر جلال ہو۔ یہ تمھارا سامان ہے، اسی لیے تمھارے پاس ہے۔"

"اگر تمھارا سامان میرے پاس آجائے تو کیا میں آمنہ خاتون بن جاؤں گا ؟"

"اچھا یہ بتاؤ تم کون ہو ؟"

"اگر یہ مجھے معلوم ہوتا تو پریشان کیوں ہوتا ؟"

"تم یہاں کیسے پہنچے ؟"

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں بے ہوش تھا۔ جب ہوش میں آیا تو ڈاکٹر کے کلینک کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ کلینک کے لوگوں نے مجھے اٹھا کر اندر پہنچایا۔ وہاں ڈاکٹر شیفرڈ نے مجھے دیکھتے ہی بابر کہا۔ تم بھی مجھے دیکھتے ہی بابر کہہ رہی ہو اور وہ لوگ بھی مجھے بابر کہتے تھے۔ طرح طرح کی باتیں پوچھتے تھے اور مجھ پر ظلم کرتے تھے۔"

"وہ کون لوگ تھے ؟"

"میں کیا بتاؤں، کون تھے ؟ جب میں اپنے آپ کو نہیں پہچان رہا ہوں تو دُشمنوں کو کیسے پہچان سکتا ہوں ؟"

وہ غصّے سے مٹھیاں بھینچ کر بولی "میں سمجھ گئی، وہ ماسٹر بِی کی سنڈیکیٹ کے آدمی ہوں گے۔ میں ایک ایک کو چُن چُن کر قتل کروں گی۔ اس کے پورے سنڈیکیٹ کو تباہ کر دوں گی۔"

میں نے اُس کی سوچ میں کہا "لیکن میں تو پاکستان جانے والی ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی، کیا کرے ؟ اسے اتنا غصّہ آرہا تھا کہ اپنے محبوب کے دُشمنوں سے انتقام لیے بغیر سکون حاصل نہیں کر سکتی تھی لیکن سائمن دی گریٹ نے آج رات ایک طیارے میں اُس کے لیے سیٹ ریزرو کرا دی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی جا رہے تھے۔ اس نے سوچا "سائمن دی گریٹ ٹھیک کہتا ہے، مجھے غصّہ نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے دماغ کو بعض حالات میں ٹھنڈا رکھ کر دُشمنوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے پھر کسی دوسرے وقت ان سے نمٹنا چاہیے لہٰذا میں بابر کو اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گی تاکہ یہ دُشمنوں سے محفوظ رہے۔ ویسے بھی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

پھر اُس نے سوچا "لیکن یہ میرے بغیر بھی تو مطمئن نظر آرہا ہے۔ کہیں میں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے، یہ بابر سے مشابہت رکھتا ہو۔ مجھے توجہ سے دیکھنا چاہیے۔"

وہ توجہ سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ چونک کر سوچنے لگی "آں، اس پر تو میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس کی آواز بابر جیسی نہیں ہے۔"

اُس کے تیور بدل گئے۔ وہ گھور کر بولی "تم کون ہو ؟"

میں نے ایک دم سے خوش ہو کر پوچھا "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بابر نہیں ہوں، تم تسلیم کرتی ہو ؟"

"تمھاری آواز اُس کی طرح نہیں ہے۔"

"میں یہ تو نہیں جانتا کہ تمھارے بابر کی آواز کیسی تھی۔ ویسے میرے گلے کا آپریشن کیا گیا تھا۔ یہ دیکھو!" میں نے ٹھوڑی کے نیچے اپنے نرخرے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر کہا "اوہ، تم کیا دیکھ سکو گی۔ یہاں تو آپریشن کے بعد پلاسٹک سرجری کی گئی تھی۔"

اس نے چونک کر پوچھا "تمھارے گلے کا آپریشن کیوں کیا گیا تھا ؟"

"اُنھوں نے مجھے اتنی اذیتیں پہنچائی تھیں کہ چیختے چیختے آواز بند ہوگئی۔ میں بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر ایک ڈاکٹر نے میرا آپریشن کیا تھا، ہوش میں آنے کے بعد میں پھر بولنے لگا مگر میری پہلی آواز کیسی تھی اور یہ آواز میری اپنی ہے یا نہیں، میں کچھ نہیں جانتا۔"

یہ کہہ کر میں نے اُسے اُلجھا دیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی، "یقیناً یہ بابر ہے۔ گلے کا آپریشن ہونے کے باعث آواز بدل گئی ہے۔"

اس نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔ ایک نوجوان کمرے کے اندر آیا۔ وہ میرا پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات اُسے دیتے ہوئے بولی "باس کو بتا دو، بابر جلال مل گیا ہے۔ یہ بھی میرے ساتھ پاکستان جائے گا۔ لہٰذا ہم دونوں کے لیے . . . . ایک ہی طیارے میں سیٹ ریزرو کرائی جائے۔ کوئی دشواری ہوگی تو میں آج نہیں جاؤں گی۔ کل کسی طیارے سے چلی جاؤں گی، لیکن بابر کے ساتھ جاؤں گی۔"

وہ کہہ رہی تھی اور میں پریشانی سے کبھی اُسے اور کبھی اُس کے ساتھی کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے غصّہ دکھاتے ہوئے کہا "تم مجھے پاکستان لے جانے والی کون ہوتی ہو ؟ میں نہیں جاؤں گا۔"

"تمھیں جانا چاہیے۔ میرے ساتھ رہو گے تو آہستہ آہستہ یادداشت واپس آجائے گی۔"

وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں فوراً ہی اُٹھ گیا۔ اس سے ذرا دور ہو کر بولا "اچھا تو اس طرح یادداشت واپس لاؤ گی۔ میں تمھیں سمجھا دیتا ہوں، میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔"

"اوہ بابر ! یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ پاس بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"کچھ نہیں ہوتا ؟"

"ہاں، آؤ یہاں بیٹھو۔ میں ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ بیٹھ تو جاؤں گا لیکن اُنگلی پکڑتے پکڑتے ہاتھ پکڑنا چاہو گی تو جوڈو کراٹے استعمال کروں گا۔"

"استعمال کرنا اور مجھے مار ڈالنا مگر میرے پاس بیٹھو تو سہی۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سوچ کر بولی "کیا تم بن رہے ہو۔ تھوڑی دیر پہلے لڑتے وقت اتنے شرمیلے اور پارسا نہیں تھے۔"

"لڑائی تم نے شروع کی تھی۔ میں پرائی عورتوں کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھتا ہوں لیکن ہاتھا پائی کا مطلب یہی ہے کہ ہاتھ سے ہاتھ لگے، پاؤں سے پاؤں۔ اگر تمھاری آنکھوں میں ذرا بھی حیا ہے تو تمھارے ہونے والے شوہر کی قسم، تمھارے ہونے والے بچوں کی قسم، آئندہ مجھ سے ہاتھا پائی نہ کرنا۔ یہ شریف لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا۔"

وہ پریشانی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی "میرے بھی کیا نصیب ہیں۔ بہار سے بنگال تک، بنگال سے پیرس تک آگ اور خون کا دریا پار کرتے کرتے تمام رشتے دار کٹ مر گئے۔ ایک محبوب ہے، جو آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اپنا نہیں ہے۔ یہ جب تک خود کو نہیں پہچانے گا، مجھے بھی نہیں پہچانے گا۔ پہچان کے بغیر محبت نہیں ہوتی، اجنبیت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے درمیان آدھی پہچان ہے۔ میں پہچان رہی ہوں، یہ نہیں پہچان رہا ہے۔ میں کیا کروں کیا کسی بہت ہی تجربہ کار ڈاکٹر سے اس کا علاج کراؤں ؟"

یہ سوچتے ہی وہ ٹیلی فون کے پاس گئی۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد سائمن دی گریٹ کے دستِ راست کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا "میں آمنہ ہوں، لارڈ باس سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد سائمن دی گریٹ کی آواز سُنائی دی۔ اس نے کہا "جناب ! میرا بابر مجھے مل گیا ہے۔ میں نے اس کے کاغذات آپ کے پاس بھیجے ہیں۔ یقیناً آپ تک پہنچ گئے ہوں گے۔"

"ہاں، یہ سب کچھ میرے سامنے رکھا ہوا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اسی فلائیٹ میں اس کے لیے بھی سیٹ ریزرو ہو جائے۔"

"ہم ایک ساتھ سفر کریں گے۔"

"کوشش کروں گا۔ اور کچھ ؟"

"یہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔ مجھے نہیں پہچان رہا ہے

اگر پاکستان کا سفر ملتوی کر کے کچھ روز کسی تجربہ کار ڈاکٹر سے اس کا علاج کرایا جائے تو اُس کی یادداشت واپس آ سکتی ہے۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر سائمن دی گریٹ نے کہا۔ "سفر ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں بھی میڈیکل کے ہر شعبے کے اسپیشلسٹ موجود ہیں۔ پھر یہ دماغی معاملہ ہے۔ اسے دماغی امراض کے ماہرین یا ماہرین نفسیات اچھی طرح ٹریٹ کر سکتے ہیں۔ تم اُسے پاکستان لے جاؤ۔ وہاں باقاعدہ علاج کرایا جائے گا۔ اگر ناکامی ہوئی تو پیرس لے آنا۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کچھ روز کے لیے بابر کو پیرس میں علاج کی خاطر چھوڑ دوں۔ آپ کی نگرانی میں علاج ہوتا رہے گا۔"

"میں نے کہا نا، اسے پاکستان لے جاؤ۔ اس کی لوسٹ میموری والا کیس ہمارے لیے فائدہ مند رہے گا۔ یہ جس جگہ علاج کے لیے بھیجا جائے گا، وہاں بھی ہم اپنا اُلّو سیدھا کریں گے۔"

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"تم اُسے لے کر جاؤ۔ پھر جو منصوبہ بندی ہوگی، اس کا تمہیں علم ہو جائے گا۔"

وہ ریسیور رکھ کر مجھ سے بولی۔ "چلو۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کہاں چلوں؟"

"تم میرے ساتھ پاکستان جاؤ گے۔ زیادہ سوالات نہ کرو۔ میں تمہاری کھوئی ہوئی یادداشت واپس لاؤں گی۔"

وہاں سے سائمن دی گریٹ کے ٹی ٹی سینٹر میں جانے کا بڑا فائدہ ہوتا۔ میں وہاں قریب سے اُن کے سرغنہ کو دیکھ سکتا تھا اور اُن کے طریقۂ کار کو سمجھ سکتا تھا لیکن ایسا تو میں خیال خوانی کے ذریعے بھی کر سکتا تھا۔ مجھے ایک بات کا اندیشہ تھا، وہ یہ کہ میں پہچانا جا سکتا ہوں۔ ایک تو آواز کے سلسلے میں آمنہ نے شبہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے لیے میں نے بات بنالی تھی، لیکن میری آنکھیں بابر کی آنکھوں سے مختلف تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اب تک آمنہ کو اپنے قریب آنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ پاس بیٹھی ہوتی تو اُسے آنکھوں میں جھانکنے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ اگر رومانس کا معاملہ ہوتا تو وہ میری آنکھوں میں جھانک کر مصیبت بن چکی ہوتی۔ میں نے کہا۔ "تم کہتی ہو، میں پاکستان جاؤں گا لیکن جانے کا وقت ہوگا تو جاؤں گا۔ ابھی تو اسی گھر میں رہوں گا۔"

"میں تمہیں ایک محفوظ جگہ لے جاؤں گی۔"

"میں یہاں بھی محفوظ ہوں۔ کوئی دشمن آئے گا تو اس کا وہی حشر کروں گا جو تمہارا کرنے والا تھا۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے ڈرائنگ روم کو چاروں طرف سے گھوم کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم تنہا رہتے ہو؟ یہاں ڈاکٹر بھی آتا ہے؟"

"وہ آیا تھا چلا گیا، اب نہیں آئے گا۔ میں تنہا رہتا ہوں۔"

اس نے ریسیور اُٹھا کر سائمن دی گریٹ سے رابطہ قائم کیا۔ پھر کہا۔ "بابر چاہتا ہے، ہم اسی جگہ رہیں۔ ابھی میں آپ کے پاس نہیں آ سکتی۔ سیٹ ریزرو ہو جائے تو مجھے اس نمبر پر اطلاع دیجیے گا۔"

اس نے فون کا نمبر معلوم کیا۔ پھر سائمن دی گریٹ کو بتا دیا۔ ریسیور رکھ کر بولی۔ "دیکھو بابر! میں تمہاری بات مانتی ہوں۔ تم نے کہا، یہاں سے نہیں جاؤ گے، اس لیے میں نے بھی جانے سے انکار کر دیا۔"

"تمہارا ارادہ کیا ہے۔ کیا یہاں رات کو بھی رہو گی۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔"

وہ میرے لیے فکرمند تھی۔ تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے پتا نہیں کیا دوا دی ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

وہ گھور کر بولی۔ "کیا تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو۔ ابھی تو بالکل چاق و چوبند تھے۔ مجھ سے دو دو ہاتھ بھی کیے تھے اور اب اچانک ہی جمائی لینے لگے۔"

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہو۔ میں ابھی تمہیں سو کر دکھاتا ہوں۔"

میں وہاں سے چلتا ہوا بیڈ روم میں آیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پہنچ گئی۔ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ چھوٹا سا کاٹیج ہے۔ یہاں دوسرا بیڈ روم نہیں ہے — تم فلائیٹ کے وقت تک ڈرائنگ روم میں گزارا کر سکتی ہو۔"

میں لیٹ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پائنتی آئی پھر فرش پر گھٹنے ٹیک دیے۔ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں کو تھام کر بولی۔ "تمہیں کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"تم مجھے کیا یاد دلانا چاہتی ہو؟"

"ذرا دماغ پر زور ڈالو۔ سوچو ہم کن حالات میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔"

"کن حالات میں؟"

"جب یہاں شادی کرنے آئے تھے تو ہمارے ساتھ ٹی ٹی سینٹر کے چار ساتھی تھے۔ ہم نے ایک ہوٹل میں اپنے

لیے کمرہ ریزرو کرایا تھا۔ پھر ایک مسجد میں جا کر نکاح پڑھوایا تھا۔ ہمارے دلوں میں کتنے ارمان تھے۔ ہماری آنکھوں میں کتنے سپنے بھرے ہوئے تھے۔ ہر خواب کی تعبیر ہمارے سامنے تھی، لیکن ہمارے سامنے دشمن آ گئے اور ہم بچھڑ گئے۔"

"بچھڑ گئے تو کیا ہوا۔ نکاح تو ہو گیا تھا نا۔"

"یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ ہمارا نکاح ہو چکا ہے، میں تمہاری شریکِ حیات ہوں۔"

میں نے بستر پر اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی رومانی کہانی سنا رہی ہو۔ کہانی کو ایسے موڑ پر پہنچا رہی ہو جہاں سے میرا مرکزی کردار شروع ہونا چاہیے لیکن میں تمہارا شوہر نہیں ہوں۔ میں بابر نہیں ہوں۔"

اُس نے میرے پاؤں کو سختی سے اپنی گرفت میں لے کر کہا۔ "تم خود کو نہ پہچان سکو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے بھی تمہیں نہیں پہچان سکتے۔"

میں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں، لیکن تم بھی مان لو، اگر بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ میں تمہارا شوہر نہیں ہوں تو؟ تقدیر کبھی کبھی بڑا عجیب سا مذاق کرتی ہے۔ بعد میں پتا چلے کہ میں بابر سے مشابہت رکھتا ہوں، پھر کیا ہوگا؟"

میں نے اُس کے سامنے ایسا سوال پیش کیا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ "واقعی پہلے مجھے اچھی طرح تصدیق کر لینا چاہیے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ اُس کی یادداشت گم ہو چکی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بابر سے مشابہت رکھتا ہو۔ مجھے جذبات کی رو میں بہنا نہیں چاہیے۔ اپنے بابر کے ظاہر اور باطن کو پہچاننے کے سلسلے میں مجھے جتنی بھی باتیں یاد آتی رہیں گی، اُن کے پیشِ نظر اسے پرکھتی رہوں گی۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اسے اپنا شوہر تسلیم کروں گی۔ اس وقت تک اس سے دور ہی رہوں گی۔"

میں بستر پر لیٹ گیا۔ وہ اُٹھ کر بولی۔ "میں ڈرائنگ روم میں جا رہی ہوں، تم آرام سے سوتے رہو۔ روانگی کا وقت ہوگا تو جگا دوں گی۔"

وہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ویسے اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد پھر آ کر دیکھے گی کہ میں سو رہا ہوں یا بہانہ کر رہا ہوں؟ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ خیال خوانی کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب کہ میں دہشت گردوں کے ساتھ یہاں سے سفر کرنے والا تھا اور ان کے ساتھ ہی پاکستان میں سامنا ہونے والا تھا۔

اس کہاوت میں کوئی شبہ نہیں کہ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا — میں خیال خوانی سے مجبور تھا۔ ایک ذرا پرواز کی اور سائمن دی گریٹ کے دماغ سے معلوم کر لیا کہ رات دو بجے کی فلائیٹ سے میرے لیے سیٹ ریزرو ہو چکی ہے۔ اس وقت آٹھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے اپنے دماغ کو ہدایات دیں کہ چار گھنٹے تک آرام سے گہری نیند سوتا رہوں گا۔ اگر کوئی کمرے میں آئے یا کوئی غیر معمولی بات ہو تو آنکھ کھل جائے گی۔

چونکہ آمنہ کمرے میں نہیں آئی تھی، دروازے سے ہی مجھے دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی، اس لیے میں چار گھنٹے تک اطمینان سے نیند پوری کرتا رہا۔

رات کے ڈھائی بجے ہم طیارے میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے حتی الامکان سائمن دی گریٹ وغیرہ سے کترانے کی کوشش کی تھی۔ ائیرپورٹ پر اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ آمنہ میری طرف دیکھ کر بات کرتی تو میں محسوس کرتا کہ جیسے وہ میری آنکھوں سے آنکھیں ملا رہی ہو۔ ایسے وقت خیال خوانی کے ذریعے اس کی نظریں نیچی کر دیتا تھا، یا اُس کے دماغ کو اپنی آنکھوں کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔

وہ میری آنکھوں میں جھانک کر میرے اور بابر کے درمیان فرق کو سمجھ سکتی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھے ایک اجنبی سمجھ لیتی تو کبھی اپنی مہم میں ساتھ نہ لے جاتی۔ جانے کو تو میں تنہا بھی جا سکتا تھا لیکن بابر کے روپ میں رہ کر آمنہ کے ساتھ ہی جانا زیادہ مناسب تھا۔

ایسے دہشت گردوں کی ایک طویل فہرست ہے جو پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور پاکستان میں تخریبی کارروائیاں کرنے کے لیے تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ جو دہشت گرد میرے ساتھ سفر کر رہے تھے اور دوسری رات بھی الباما ٹی ٹی سینٹر اور مافیا کی سنڈیکیٹ سے روانہ ہونے والے تھے، ان سب کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اگر میں یک وقت ان کا ذکر کروں تو یہ قارئین کے ذہن میں محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ البتہ جیسے جیسے یہ کردار میری داستان میں آئیں گے، میں ان کا ذکر کرتا جاؤں گا۔

فی الحال اس طیارے میں میرے ساتھ جو سفر کر رہے تھے، ان میں آمنہ کے علاوہ ایک جافر تھا۔ یہ پاکستان پہنچتے ہی سرحد کی طرف جانے والا تھا۔ دوسرا منصور دادا تھا۔ یہ پنجاب کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہاب لاکھن تھا۔ اُسے حکم دیا گیا تھا کہ کراچی پہنچ کر دو دن وہاں آرام کرے

کیونکہ افغانستان اور روس کے درمیانی سرحدی علاقے بہرام علی کی دہشت گرد تنظیم سے تین نئے ساتھی کراچی پہنچنے والے تھے۔ ان میں سے ایک حیات محمد، دوسرا سراج آدم اور تیسری روزینہ جمال تھی۔ وہاب لاکھن سے کہا گیا تھا کہ وہ ان تینوں کے ساتھ سندھ کے اندرونی علاقے میں چلا جائے۔ وہاں سے وہ کہاں جائیں گے، یہ انھیں بعد میں رہنمائی حاصل ہونے والی تھی۔

ہمارے ساتھ اس سفر میں ایک نہایت ہی ذہین اور قابل عورت گلزاری بیگم تھی۔ اس نے انگلش لٹریچر میں ایم اے آنرز کیا تھا پھر سیاسیات پڑھنے لگی۔ اس کے بعد سائمن دی گریٹ کے ساتھ ہو گئی۔ سائمن اس کی ذہانت اور علمیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے انگلینڈ میں اس کی رہائش کا بندوبست کیا اس کی سرپرستی کی۔ وہاں رہ کر گلزاری بیگم نے وکالت پاس کی۔ اب پاکستان میں پریکٹس کے بہانے سائمن دی گریٹ کی آلۂ کار بن کر جا رہی تھی۔

دہشت گردوں کی تنظیم میں آوارہ اور سستا ذوق رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو بحالتِ مجبوری صرف لڑنے مرنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ورنہ اس قسم کی تنظیم میں زیادہ تر نہایت ہی تعلیم یافتہ ذہین اور مختلف شعبوں کے ماہرین ہوتے ہیں۔

موجودہ ٹیم میں مجھ کو یعنی بابر کو اور آمنہ کو ریزرو آلۂ کار کے طور پر رکھا گیا تھا۔ ہمیں ضرورت کے وقت کسی بھی علاقے میں بھیجا جا سکتا تھا۔

ہم کراچی پہنچ گئے۔ میں نے ایک طویل عرصے کے بعد پاک وطن کی زمین پر قدم رکھا تھا اور خوشی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے گہری گہری سانس لینے لگا۔ گویا ہواؤں کو مٹی کی خوشبو کو اور پاک فضاؤں کو اپنی سانسوں میں جذب کرنا چاہتا ہوں۔ اپنا وطن پھر اپنا وطن ہوتا ہے۔ یہاں کے ایک نظارے کو دنیا جہان کے خوب صورت نظاروں پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔

ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ وزیٹرز لابی میں ایک شخص نیلے سوٹ میں ملبوس ملے گا۔ اس نے نیلے سوٹ کے ساتھ سیاہ نکٹائی پہن رکھی ہو گی۔ وہ ہمیں دیکھ کر جیب سے رومال نکالے گا اور اپنے چہرے پر یوں پھیرے گا جیسے پسینہ پونچھ رہا ہو۔

دوسری طرف اس شخص کو بتا دیا گیا تھا کہ ہماری چھ افراد پر مشتمل جو ٹیم کراچی پہنچ رہی ہے، اس کا ہر فرد کس قسم کے لباس میں ہو گا۔ لہٰذا وہ ہمیں دیکھ کر اپنی جیب سے رومال نکالنے کے بعد چہرے پر پھیرنے لگا۔ گلزاری بیگم ہم سب کے مقابلے میں زیادہ ذہین، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ موقع شناس تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سرگوشی کے انداز میں کوڈ ورڈز دہرائے جواب میں اس شخص نے بھی کوڈ ورڈز ادا کیے۔ ہم نے اس سے مصافحہ کیا۔ اس نے کہا ”مسٹر بابر اور مسز آمنہ بابر! میں آپ لوگوں کو کار کا نمبر اور رنگ بتا رہا ہوں۔ آپ اس کار میں جا کر بیٹھ جائیں۔ مسٹر بابر! آپ اپنی جیب پر یہ بیج لگا لیں۔ اس بیج کے ذریعے وہ میزبان جو کار کے پاس کھڑا ہوا ہے آپ کو پہچان لے گا۔“

میں نے اس بیج کو لے کر سینے پر جیب کی جگہ لگا لیا ہماری ٹیم کا ایک جوان جالو اور دوسرا منصور دادا سرحد اور پنجاب جانے کے لیے ہم سے الگ ہو گئے۔ ہمارے استقبال کرنے والے میزبان نے وہاب لاکھن سے کہا۔ ”تمہارے لیے کراچی ہوٹل کا کمرہ نمبر سولہ ریزرو کرا دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کے تین کمرے کل سے خالی ہو جائیں گے وہاں تمہارے باقی تین ساتھی حیات محمد، سراج آدم اور روزینہ جمال جو کل تک پہنچنے والے ہیں ٹھہریں گے۔“

پھر اس نے گلزاری بیگم کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ادب سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! آپ میری مہمان ہیں۔ میرے ساتھ چلیں۔“

ہم اس کے بتائے ہوئے کار نمبر کے مطابق نیلے رنگ کی کار کے پاس پہنچ گئے۔ میرے سینے پر اس بیج کو دیکھتے ہی ہمارے نئے میزبان نے پچھلی سیٹ کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔ پھر اگلی سیٹ پر آ کر اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کار کو اسٹارٹ کیا اور ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ آمنہ نے کہا۔ ”تمہارا تعارف ہو جانا چاہیے۔“

اس نے کہا۔ ”آپ لوگوں کا پورا ریکارڈ ہمارے ہاں پہنچ گیا ہے۔ رہ گئی میری بات تو میں آپ لوگوں کے برابر نہیں ہوں۔ میں حکم کا غلام ہوں۔ حکم کا اِکّا تو وہاں بیٹھا ہے جہاں آپ پہنچنے والے ہیں۔“

ہم محمد علی سوسائٹی کی ایک شاندار کوٹھی میں پہنچ گئے ایک ملازم نے ہمارے لیے دروازہ کھولا۔ اندر ایک بوڑھا ہمارے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ وہ نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ چشمے کا فریم سنہرا تھا یا واقعی سونے کا تھا۔ منہ میں پائپ دبا ہوا تھا اور دھواں نکل رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا۔ پہلے اس نے آمنہ سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم مسز آمنہ بابر ہو۔“

آمنہ نے اُس سے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس

کے بعد میں نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا، جبکہ وہ پہلے ہی بابر جلال کے نام سے اور اُس کی ہسٹری سے واقف تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم سفر کے تھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ خوب کھاؤ پیو، موج کرو۔ ہم رات کو اطمینان سے باتیں کریں گے۔“

آمنہ نے کہا۔ ”میں اپنے شوہر کے لیے فکرمند ہوں پہلی فرصت میں کسی ماہرِ نفسیات سے یا دماغی امراض کے تجربہ کار ڈاکٹر سے معائنہ کرانا چاہتی ہوں۔“

”کل صبح مسٹر بابر کو یہاں کے مہنگے اسپتال سیونتھ ڈے میں لے جایا جائے گا۔“

دوپہر کو ہم نے آرام کیا۔ میں خلافِ عادت گہری نیند سو گیا۔ کسی طرح کی خیال خوانی کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ ایک تو میں نے رسونتی سے کہہ دیا تھا کہ اسے میری ضرورت ہو تو وہ کسی وقت بھی رابطہ قائم کر لیا کرے۔ دوسرے یہ کہ میں میدانِ عمل میں تھا، اور جو لوگ میدانِ عمل میں ہوتے ہیں، وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آتے ہیں۔

رات کو ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لیے گلزاری بیگم پہنچ گئیں۔ پروگرام کے مطابق کھانے کے بعد ہم ایک بڑے سے کمرے میں آئے۔ وہ کمرہ ریکارڈ روم تھا۔ دیواروں سے لگے ہوئے ریکوں میں مختلف فائل اور ایسے بڑے بڑے لفافے نظر آ رہے تھے جیسے تصویریں رکھی ہوں۔ فلم کے ڈبے بھی تھے۔ ٹرانسمیٹر اور پروجیکٹر وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ دیوار پر ایک چھوٹا سا اسکرین تھا اس سے ذرا فاصلے پر چند کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے بوڑھے میزبان کا نام مائخل شوف تھا۔ وہ پروجیکٹر کے پاس جاتے ہوئے بولا۔ ”اسکرین پر جو کچھ نظر آئے گا، اس کا تعلق تمہارے موجودہ مشن سے ہے۔ لہٰذا توجہ سے دیکھنا۔“

کمرے کی بتی بجھ گئی، تاریکی چھا گئی۔ اسکرین روشن ہو گیا۔ ایک سلائیڈ کے ذریعے ایسا منظر نظر آ رہا تھا جیسے کسی عمارت کی تعمیر ہو رہی ہو۔ مائخل شوف نے کہا۔ ”یہ عمارت اسلام آباد سے چند میل کے فاصلے پر تعمیر ہو رہی ہے۔ پاکستان ایٹمی توانائی کے میدان میں پہلا قدم رکھ رہا ہے۔ یہ ایٹمی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی عمارت ہے ــــ اس انسٹی ٹیوٹ کے لیے جن پاکستانی سائنس دانوں کی تقرری ہوئی ہے، ان کے نام ہیں ڈاکٹر عبدالباقی ....“

اس کے ساتھ ہی منظر بدل گیا اور ڈاکٹر عبدالباقی کی بڑی سی تصویر نظر آنے لگی۔ مائخل شوف اس تصویر کو دکھاتے ہوئے ڈاکٹر عبدالباقی کی تعلیمی قابلیت کا ذکر کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بیرونی ممالک میں رہ کر جن عالمی شہرت یافتہ سائنسدانوں کے ساتھ .... کام کیا تھا اور ان کے درمیان اپنی صلاحیت کو منوایا تھا، ان سب باتوں کو تفصیل سے بیان کیا جا رہا تھا۔

یکے بعد دیگرے منظر بدلتے رہے اور اس طرح سات چہرے دکھائے گئے۔ سات اہم پاکستانی شخصیتوں کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا۔ اس کے بعد مائخل شوف نے کہا۔ ”پاکستان اس حقیقت سے انکار کر رہا ہے کہ وہ ایٹم بم بنانے والا ہے۔“

گلزاری بیگم نے پوچھا۔ ”مسٹر مائخل شوف! کیا یہ حقیقت ہے؟“

”ابھی ہم بھی سمجھ نہیں پائے ہیں۔ اگر یہ حقیقت نہ ہو تب بھی اس بات کو اُچھالنا چاہیے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی کرنا چاہیے۔“

”ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“

”ہم چاہتے ہیں، پاکستان کی ایٹمی توانائی حاصل کرنے والا معاملہ ایک ہوّا بن جائے اور بھارتی لیڈروں اور بڑے سیاست دانوں کے حواس پر چھا جائے۔ وہ خوفزدہ رہیں کہ جانے کب پاکستان ایٹمی توانائی حاصل کر لے گا اور ایٹم بم بنا لے گا۔ اگر بھارت خوف زدہ رہے گا تو وہ ہمیشہ ہمارے بلاک میں رہے گا اور ہماری مرضی کے مطابق اپنی خارجہ پالیسی بنائے گا۔“

اس نے پروجیکٹر کے ذریعے ڈاکٹر عبدالباقی کی سلائیڈ دوبارہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”مس گلزاری! اور مسٹر بابر! تم دونوں اسے غور سے دیکھو اور اچھی طرح پہچان لو۔ ڈاکٹر عبدالباقی ان دنوں بیمار ہے اور یہاں کے اسپتال سیونتھ ڈے کے اسپیشل کمرہ نمبر چھ میں ہے۔ ہم نے بابر کے لیے اسپیشل کمرہ نمبر سات مخصوص کرا لیا ہے۔ کل بابر کو وہاں پہنچا دیا جائے گا اور مس گلزاری تم بابر کی وائف کی حیثیت سے وہاں رہو گی۔“

آمنہ نے چونک کر پوچھا۔ ”لیکن بابر کی وائف تو میں ہوں۔“

مائخل شوف نے کہا۔ ”ڈراما اسٹیج کرنے کے دوران کوئی کردار ادا کرتے وقت ایک ہیرو، اگر کسی ہیروئن کا محبوب بنتا ہے تو کسی دوسرے ڈرامے میں وہ اسی ہیروئن کا باپ بن جاتا ہے۔ کردار بدلتے رہتے ہیں۔ کرداروں

کی خاصیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مس گلزاری سچ مچ تمھارے شوہر کی بیوی نہیں بنے گی بلکہ بیوی کا رول ادا کرے گی۔"

گلزاری بیگم نے کہا "بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"کیسی گڑبڑ؟"

"میں نے کراچی بار ایسوسی ایشن کی ممبرشپ حاصل کرنے کے لیے فارم پر خود کو غیر شادی شدہ لکھا ہے۔"

"تم نے وہ فارم آج سے تین ہفتے پہلے پیرس سے بھیجا تھا تاکہ یہاں پہنچنے سے پہلے بار ایسوسی ایشن کی ممبر بن سکو؟"

"جی ہاں، تین ہفتے پہلے بھیجا تھا۔"

"پھر کیا مشکل ہے؟ تمھارا ایک جعلی نکاح نامہ تیار ہو جائے گا جس کی رُو سے تم نے پچھلے ہی ہفتے شادی کی ہے۔ تمھارے شوہر کا نام بابر جلال ہے۔ یہ نکاح نامہ احتیاطاً اپنے پاس رکھو گی۔ بات بگڑے گی تو اسے ظاہر کیا جائے گا ورنہ تم ایک بیوی کا رول ادا کرنے کے بعد اسپتال سے چلی جانا۔"

"میں سمجھ گئی۔ مجھے بابر کے ساتھ کمرہ نمبر سات میں رہ کر اپنے پڑوسی ڈاکٹر عبدالباقی سے دوستی کرنا ہوگی۔ اس سے معلومات حاصل کرنا ہیں کہ ایٹمی توانائی حاصل کرنے کے سلسلے میں پاکستان کن ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے؟"

"ویری گڈ، ہم نے تمھاری ذہانت کی تعریف سنی تھی اور تم یہ ثابت کر رہی ہو۔ ہمارے کچھ بتانے سے پہلے ہی اپنے کام کو بخوبی سمجھ رہی ہو۔"

میں نے بھی اُسے دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔ وہ بےحد ذہین تھی۔ ویسے عورت خواہ کتنی ہی ذہین ہو، دنیا کے کتنے ہی علوم حاصل کرتی رہے، لیکن اپنی عمر بتاتے وقت جھوٹ ضرور بولتی ہے۔ پتا نہیں میں اس سے عمر پوچھتا تو وہ کیا کہتی۔ میں نے اُس کے دماغ سے پڑھ لیا۔ وہ پورے بتیس برس کی تھی اور اب تک غیر شادی شدہ تھی۔ اُس نے علم حاصل کرنے کی لگن میں دُلھن بننے کی آرزو کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔

مائخل شوف نے پھر ایک سلائیڈ دکھائی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

مائخل شوف نے کہا "یہ ایک بااختیار افسر ہے اور مسز آمنہ بابر کا شکار ہے۔"

پھر اُس نے آمنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اس شخص کا نام سلطان عابدی ہے۔ اسکی رہائش برج سوسائٹی میں ہے۔ تم اسے کارواں کلب میں ٹریپ کر سکتی ہو۔ یہ ہر شام وہاں بلاناغہ جاتا ہے۔ کل تمھیں کارواں کلب کی ممبرشپ کا کارڈ مل جائے گا۔"

آمنہ نے گلزاری کو ناگواری سے دیکھا۔ پھر کہا "میں گلزاری بیگم کی طرح ذہین نہیں ہوں۔ مجھے بتا دیا کرنا ہے۔"

مائخل شوف نے کہا "تمھیں اس پر زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے جلد ہی شیشے میں اتار سکتی ہو۔ یہ لالچی نہیں ہے۔ دولت کے پیچھے نہیں بھاگتا مگر حُسن پرست ہے۔ تمھارے پیچھے ضرور بھاگے گا۔ اگر یہ تمھارا دیوانہ بن جائے اور ہماری مرضی کے مطابق خبروں کو توڑ مروڑ کر اخبارات کے حوالے کرے اور جو چند اخبارات ہماری مالی امداد سے چل رہے ہیں، اُنھیں سنسر کی زد میں آنے سے بچاتا رہے تو اچھی بات ہے ورنہ دو دن کے بعد تم اسے ختم کر دو گی پھر ہم اس کی جگہ اپنا آدمی لانے کی بھرپور کوشش کریں گے۔"

دوسرے دن مجھے سبو تھڈرے اسپتال کے کمرہ نمبر سات میں پہنچا دیا گیا۔ یعنی میرا کام یہی رہ گیا تھا کہ میں یادداشت گم ہونے والے ایک شخص کی طرح اپنا معائنہ کراتا رہوں، نفسیاتی علاج کے مراحل سے گزرتا رہوں اور کمرہ نمبر سات میں اپنی عارضی دُلھن سے لگاوٹ کی باتیں کرتا رہوں۔ وہ اپنے شکار کو پھانسنے کمرہ نمبر چھ میں جائے تو میں چپ چاپ لیٹا رہوں یا سوتا رہوں۔

لیکن میں آرام فرمانے کے لیے اور وقت بےوقت سوتے رہنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔ حضرت علامہ اقبال کے ارشاد کے مطابق؛

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

میری عادت ہے۔

تو آئیے میرے جسم کو اسپتال کے کمرے میں چھوڑ دیجیے۔ ابھی اس داستان میں بہت سے ایسے کردار ہیں، جن کے ساتھ رہ کر ہم اور آپ اپنا لہو گرم رکھ سکتے ہیں۔ جب خیال خوانی کی پرواز کے بعد واپس آئیں گے تو شاید اُس وقت تک ڈاکٹر عبدالباقی، گلزاری بیگم کے اور سلطان عابدی آمنہ کے آنچل سے بندھے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی نہ ہو، کوئی ایسا تماشا ہو جائے جس کی ہم توقع بھی نہ کرتے ہوں۔ میری داستان میں اکثر یہی ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی خلافِ توقع واقعہ پیش آ جاتا ہے۔

❋

فون کی گھنٹی چیخ رہی تھی۔ گل باز خاں نے کن انکھیوں سے فون کی طرف دیکھا۔ سوچنے لگا، کس طرح ریسیور اٹھائے اس کے ایک ہاتھ میں شراب کا جام تھا، دوسرے ہاتھ سے نوٹ گن رہا تھا۔ آخر اُس نے نوٹوں پر شراب کے جام کو رکھا تاکہ نوٹ اُڑ نہ جائیں اور جام نگاہوں کے سامنے رہے۔ یوں دیکھتے دیکھتے بھی نشہ ہونے لگتا ہے۔ اُس نے ریسیور کو اٹھا کر ناگواری سے کہا "ہیلو کون ہے؟"

دوسری طرف سے قہقہہ سُنائی دیا۔ اس نے غرّا کر پوچھا "کون بدتمیز ہے؟"

"تم شاید مجھے آواز سے پہچان سکو۔ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا، جب تم نے سرحدی علاقے کا لیڈر ٹرانسپورٹر بننے کے لیے ایک بےچارے ٹرانسپورٹر کو ہلاک کر دیا، اس کا مال پکڑوا دیا، اس کے بیٹے کو جیل بھجوا دیا۔"

گل باز خاں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا "کون ہو؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں کون ہوں، تم پہچان رہے ہو۔ ہاں، کہاں سے بول رہا ہوں، یہ بتا دوں۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو تو پتا چلے گا۔ میں تمھارے ضمیر کے مُردہ خانے سے بول رہا ہوں۔"

گل باز خاں کے ہاتھ میں ریسیور کانپ رہا تھا۔ وہ بُزدل نہیں تھا لیکن دُشمن بہت زیادہ شہ زور ہو، نڈر اور ضدی ہو تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، وہ کب کہاں سے آ جائے اور ناگہانی بلا کی طرح اس کی زندگی کو چاٹ جائے۔

اس نے ذرا حوصلہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "سیدھی طرح اپنا نام بتاؤ ورنہ ریسیور رکھ دوں گا۔"

"ریسیور رکھنے سے پہلے ایک بات اور سُن لو۔ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا، جب میں نے انتقام کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ تمھاری ہونے والی اولاد میری رائفل کی زد میں تھی۔ میں چشم زدن میں اُسے گولی مار دیتا۔ وہ اولاد پیدا ہونے سے پہلے مر جاتی، لیکن میں نے چھوڑ دیا۔ جانتے ہو کیوں؟"

گل باز خاں ریسیور رکھنا بھول گیا تھا۔ اس نے جوانی میں تین شادیاں کی تھیں۔ تینوں بیویوں سے لڑکیاں پیدا ہوتی رہی تھیں۔ بڑھاپے میں اُس نے گل جانہ سے شادی کی، جس سے ایک بیٹا ہوا تھا۔ وہ بیٹا اب ڈھائی برس کا ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے ایک تو بڑھاپے کی اولاد تھی، دوسرے بیٹا تھا۔ اس سے محبت کیوں نہ ہوتی۔ وہ تو اُسے اس قدر چاہتا تھا کہ اُس پر کوئی آنچ آنے والی بات سُن کر لرز جاتا تھا۔ کوئی اُسے ٹیڑھی نظر سے دیکھتا تو اس کی آنکھیں نکال لیتا تھا۔ فون پر جانی پہچانی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "کیوں گل باز خاں! خاموش کیوں ہو گئے، کیا یہ سوال نہیں کرو گے کہ میں نے تمھاری ہونے والی اولاد کو پیدا ہونے کے لیے کیوں چھوڑ دیا تھا؟"

گل باز خاں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "تم... میں، تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"شہ زور گل باز خاں! چوہے کی طرح کیوں بول رہے ہو۔ تم مجھ جیسے ایک کمزور جوان سے ملنا چاہتے ہو جسے تم چٹکی میں مَسل سکتے تھے۔ آج بھی تمھارے پاس پہلے سے زیادہ طاقت ہے۔ تم پہلے سے زیادہ دولت مند ہو۔ تم پہلے سے زیادہ ذرائع کے مالک ہو۔ تم پہلے سے زیادہ غنڈوں کے سردار ہو۔ پھر مجھ سے کیوں ڈر رہے ہو؟"

وہ جواب نہ دے سکا۔ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا، کس طرح اپنے بیٹے کی حفاظت کرے۔ دوسری طرف سے آواز آئی "میں بتاتا ہوں، تم مجھ سے کیوں ڈر رہے ہو! میں اندھیرے کا تیر ہوں۔ کہاں سے آؤں گا، کب آؤں گا، تم کبھی سوچ بھی نہیں سکو گے۔ اندھیرے کے تیر کے سامنے ساری قوتیں، ساری دولت مندی، سارے ذرائع دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ ہاتھ میں ریسیور پکڑے رہا۔ پھر آواز آئی "گل باز خاں! تم نے ابھی تک ریسیور نہیں رکھا۔ بےوقوف بیٹھے کیا سوچ رہے ہو۔ اُٹھو، بھاگو دوڑو۔ اپنے بچے کو کہیں زمین کی تہہ میں، پاتال میں چھپاؤ۔ یا کہیں خلا میں کسی سیارے پر بھیج دو۔ اپنی دولت کو آزماؤ۔ اپنے حوصلوں کو پکارو۔ اپنی عقل اور تدبّر کا ماتم کرو کہ میں بہت جلد پہنچنے والا ہوں۔"

دوسری طرف ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ آواز نہیں آ رہی تھی۔ گل باز خاں نے فوراً ہی ریسیور رکھ کر ملازموں کو پکارنا شروع کیا پھر وہاں سے اُٹھ کر بھاگتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اُس کی آواز سن کر کتنے ہی ملازم دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ وہ اُنھیں دیکھ کر ٹھٹک گیا، جیسے ہوش میں آ گیا ہو۔ اب تک عجیب حالت میں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے؛ اپنی مردانگی، اپنی شہ زوری، اپنا غرور بھول چکا تھا اور یوں بھاگ رہا تھا جیسے کوئی کمزور اور بُزدل اپنے بچاؤ کے لیے بھاگتا ہے۔ ٹیلی فون پر اُس سے کہا گیا تھا، بھاگو، دوڑو اپنے بچے کی حفاظت کرو۔ شاید اُسی کا اثر تھا کہ وہ بےاختیار

باہر چلا آیا تھا اور یہ بڑی حماقت کی تھی کیوں کہ ٹیلی فون تو اُس کے پاس ہی موجود تھا۔ وہ فون کے ذریعے اپنے بچے کی خیریت معلوم کر سکتا تھا۔

اُس نے ایک خاص ماتحت سے کہا "فیض محمد! اِدھر آؤ۔"

فیض محمد اُس کے پیچھے کمرے میں آ کر سر جھکائے ہوئے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا پھر سوال کیا "خانِ خاناں! آپ کچھ پریشان ہیں؟"

اس نے ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا "ہاں، وہ کمبخت واپس آگیا ہے۔"

"کون؟"

گل باز خاں اُسے جواب نہ دے سکا۔ دوسری طرف فون پر رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا "ہیلو ٹیلیفون ایکسچینج، میں خان گل باز خاں بول رہا ہوں۔ مردان کے پولیس انسپکٹر شہباز سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ فوراً رابطہ قائم کرا دو۔ میں فون کے پاس بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ فیض محمد نے اپنا سوال پھر دہرایا "خانِ خاناں! کون آگیا ہے؟ کیا وہ آنے والا کچھ پریشانی کا سبب بن گیا ہے؟"

"ہاں، تمھیں یاد ہے اب سے ڈھائی برس پہلے وہ چھوکرا دلاور خان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ہم مجبور تھے، اس کے جیل سے رہا ہوتے ہی گولی نہیں مار سکتے تھے۔ نہ جانے اتنے عرصے تک وہ کہاں چھپا رہا۔ ابھی اچانک اُس نے فون کیا تھا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فوراً ہی لپک کر ریسیور اٹھایا۔ ایکسچینج سے کہا گیا "رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ ہولڈ آن کریں۔"

تھوڑی دیر بعد ہی مردان کے پولیس انسپکٹر شہباز کی آواز سنائی دی "ہیلو خانِ خاناں! میں آپ کا خادم ہوں۔ فرمایئے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"شہباز! ابھی میرے گھر خود ہی جاؤ اور معلوم کرو میرے بیوی بچے خیریت سے ہیں یا نہیں۔ میں اپنے بیٹے نوروز خان کی خیریت جلد سے جلد معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ کسی پولیس والے کو نہ بھیجنا مجھے کسی پر بھروسہ نہیں ہے۔ تم پر خدا کی رحمت، تم خود جاؤ۔"

"خانِ خاناں! بہت پریشان لگتے ہو۔ کیا بات ہے؟"

"تم پہلے خیریت معلوم کر کے آؤ پھر بتاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں پندرہ منٹ کے اندر فون کروں گا۔"

گل باز خاں نے ریسیور رکھ دیا۔ فیض محمد نے پوچھا "کیا دلاور نے ہمارے چھوٹے خان کے سلسلے میں دھمکی دی ہے؟"

"ہاں، میرا جی چاہتا ہے، ابھی اُسے گولی مار دوں لیکن وہ کہاں چھپا ہے، یہ معلوم کرنا ہوگا۔ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟"

"اگر وہ پشاور میں موجود ہے تو میرے آدمی ایک ایک گلی، ایک ایک گھر میں اُسے تلاش کریں گے۔ اتنا بتا دیجیے، آپ اُسے زندہ چاہتے ہیں یا [illegible]"

"اُسے دیکھتے ہی گولی مار دو۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرنا۔"

پھر اُس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پتا نہیں پندرہ منٹ کب گزریں گے؟"

"خان خاناں! ہم سب آپ کے حوصلے اور عزم و ہمت کی مثالیں دیتے ہیں۔ یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے۔ آپ خود کو قابو میں رکھیں۔"

پندرہ منٹ گزر گئے پھر بیس منٹ گزر گئے۔ وہ اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے سامنے دنیا اندھیری ہو رہی تھی آدھا گھنٹہ ہو گیا تو وہ غصے سے دہاڑتا ہوا بولا "کیا یہ شہباز مر گیا ہے؟ یہ کمبخت تھانے والے ہمارا کھاتے ہیں اور کام کے وقت منہ چڑاتے ہیں۔ وہ کہاں جا کر بیٹھ گیا ہے؟"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی، وہ دوڑتا ہوا آیا پھر ریسیور اٹھا کر بولا "ہیلو، میں گل باز خاں ہوں۔ بولو کون ہو تم؟"

شہباز کی آواز سنائی دی "خان خاناں! خدا کا شکر ادا کریں، آپ کا بیٹا قصائیوں کے ہاتھوں میں جا کر واپس آگیا ہے۔"

وہ لرز گیا۔ اس نے پوچھا "کیا کہہ رہے ہو؟ کیسے قصائی؟ کیا نوروز پر کسی دشمن کا سایہ پڑا تھا؟"

"[illegible] ئے کی بات کر رہے ہیں، وہاں چار آدمی [illegible] نے گھر پہنچے تھے۔ اُنھوں نے آپ کے دو مسلح پہرے داروں کو گولی مار دی۔ زنان خانے میں پہنچ کر عورتوں کو رائفلیں دکھا کر خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ایک نے نوروز خان کو اٹھا کر کہا "ہم چاہیں تو اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ہم چاہیں تو اس کا گلا تمھارے سامنے دبا سکتے ہیں لیکن ابھی یہ وقت نہیں آیا ہے۔ گل باز خاں سے اتنا کہہ دینا کہ ہم اسے ایک دم سے

نہیں ماریں گے۔ اس کے بڑھاپے کی لاٹھی کو آہستہ آہستہ توڑیں گے۔ لاٹھی کمزور ہوگی تو اس کا بڑھاپا اوندھے منہ گرے گا۔"

پھر اُس نے آپ کے بیٹے نوروز کو بستر پر ڈالتے ہوئے کہا "ہم یہ ثابت کرنے آئے ہیں کہ جب چاہیں، نوروز خان تک پہنچ سکتے ہیں۔ گل باز خاں سے کہنا وہ اسے جہاں چھپانا چاہے چھپا کر دیکھ لے۔ ہمارا دعویٰ ہے، وہ چھپا نہیں سکے گا۔"

فون کے ریسیور سے انسپکٹر شہباز کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "خان خاناں! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ان کا اتنا حوصلہ ہو گیا کہ میرے علاقے اور آپ کے گھر میں گھس آئیں۔ آپ کچھ نشاندہی کریں ـــــ میں اُن کی شہہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔"

"وہ میرے پرانے دشمن کا بیٹا دلاور خان ہے۔"

"کون دلاور خان؟ کہاں رہتا ہے وہ؟"

"تم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ یہ ڈھائی برس پہلے کی بات ہے۔ اس وقت تم وہاں کے تھانیدار نہیں تھے۔"

"اب تو بتا دیں، وہ کون ہے؟"

"میں نے کہا نا، وہ دلاور خان ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے فون پر وارننگ دی تھی۔ میرے گھر میں گھسنے والے ان چار بدمعاشوں نے جو کہا وہی دلاور نے بھی فون پر کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو کہیں بھی چھپا کر دیکھ لوں، نہیں چھپا سکوں گا۔"

"اکثر مجرم تیس مار خان بنتے ہیں۔ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ میرے سپاہی دن رات آپ کے مکان کو نظروں میں رکھیں گے۔ کوئی بھی اجنبی اُدھر سے گزرے گا تو اُس کا محاسبہ کریں گے کسی کو آپ کے مکان میں گھسنے نہیں دیں گے۔"

گل باز خاں نے شکریہ ادا کر کے ریسیور رکھ دیا۔ پھر کہا "فیض محمد! تم ابھی مردان چلے جاؤ۔ بیس ایسے آدمیوں کا انتخاب کرو جو نشانے کے پکے ہوں۔ اُن کی ڈیوٹی کے مختلف اوقات مقرر کرو۔ وہ باری باری ڈیوٹی دیا کریں گے اور ہمیشہ چاق و چوبند رہیں گے۔ میرے مکان کے چاروں طرف چلتے پھرتے نظر آئیں گے ـــــ اُنھیں بتا دینا، ڈیوٹی کے وقت کوئی بیٹھا ہوا نظر آئے یا اُن کی ڈیوٹی کے وقت کوئی اجنبی مکان میں گھسنے میں کامیاب ہو جائے تو نا اہل محافظوں کو بھی گولی مار دی جائے گی۔"

فیض محمد تمام احکامات سننے کے بعد اُن پر عمل کرنے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو، میں خان گل باز خاں بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "اور میں وہی بول رہا ہوں جس کی آواز تم قبر میں بھی پہچان سکتے ہو۔ میں نے سوچا، ایک گھنٹے بعد فون کروں تاکہ تم اپنے بیٹے کے سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کر لو اور جب معلومات حاصل ہو جائیں تو اُس کی حفاظت کے لیے سخت سے سخت انتظامات کر سکو۔ مجھے یقین ہے تم نے ایسا کیا ہوگا۔"

وہ عاجزی سے بولا "دیکھو، وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے میری کل کائنات ہے۔ دلاور! ہماری دنیا میں بڑے بڑے دشمن ہوتے ہیں اور وہ پرانی دشمنی کو نظر انداز کر کے دوست بن جاتے ہیں۔ خدا کے لیے دوستی کے متعلق سوچو ہم چاہیں تو ..."

دلاور نے بات کاٹ کر کہا "تم پٹھانوں کی روایت کے خلاف بول رہے ہو۔ ہمارے یہاں تو ہمیشہ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔"

"اگر خون کا بدلہ خون ہے تو مجھے مار ڈالو۔ میرا سارا خون بہا دو۔"

”تمھارا ہی خون بہانے والا ہوں۔ کیا نوروز تمھارا خون نہیں ہے ؟“

وہ غصّے سے دہاڑتے ہوئے بولا ”میں تمھیں گولی مار دوں گا۔“

”پہلے اپنے بیٹے کی حفاظت کے انتظامات کر دو۔ میں شام تک دیکھ لوں گا کہ کیسے انتظامات ہوئے ہیں۔ اس کے بعد تمھارا بیٹا . . . .“

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ گل باز نے تڑپ کر پوچھا ”میرا بیٹا؟ ہاں میرا بیٹا، کیا کر لو گے تم میرے بیٹے کا ؟ میں اتنے سخت حفاظتی انتظامات کروں گا کہ تم . . . .“

دوسری طرف سے قہقہہ سنائی دیا۔ پھر اُس نے کہا۔ ”پہرہ لگانے سے کیا ہوتا ہے۔ تمھارا بیٹا اب صرف دودھ نہیں پیتا، کھانا بھی کھاتا ہے۔ سُنا ہے اُسے خشک میوے، تازہ پھل بہت پسند ہیں اور ان میں سے کسی بھی کھانے کے ساتھ تمھارے بیٹے تک زہر پہنچ سکتا ہے۔“

وہ ایک دم سے لرز گیا ”نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں باہر کی کوئی چیز اپنے بچّے تک نہیں پہنچنے دوں گا۔“

”گھر کی چیزوں کو تو پہنچنے دو گے ؟“

”میں نے اپنی تین بیویوں کو دوسرے مکانوں میں رکھا ہے۔ وہ سوتیلی ہیں۔ میرے بیٹے کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ جس گھر میں میرا بیٹا ہے، وہاں صرف اس کی اپنی ماں ہے اور ماں بیٹے کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ میری ماں ہے۔ وہ بچے کی دادی ہے، وہ بھی اس کی حفاظت کرے گی۔ رہ گئیں دو خادمائیں۔ میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ ان دونوں کو نکال دیا جائے۔ بچّے تک صرف اُس کی ماں، اس کی دادی پہنچا کریں گی۔“

اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ پھر دوڑتا ہوا باہر گیا۔ فیض محمد ابھی ان آدمیوں کا انتخاب کر رہا تھا جنھیں وہ ساتھ لے جانے والا تھا۔ اس نے فیض محمد کو بلا کر سمجھا دیا کہ اُس کے مکان میں نوروز کی ماں گل جانہ اور اُس کی دادی کے سوا کوئی تیسری عورت یا کوئی ملازمہ نہ رہے۔ باہر سے کھانے کی کوئی بھی چیز اندر جائے تو پہلے اُسے باہر پہرہ دینے والے چکھ کر آزمائیں۔ اس کے بعد مکان کے اندر بھیجیں اور کوئی چیز بچّے تک کھانے کے لیے جائے تو اُسے پہلے اس کی ماں اور اس کی دادی چکھنے کے بعد اپنا اطمینان کریں گی، پھر اس چیز کو بچّے تک لے جائیں گی۔

وہ اضطراب میں مبتلا تھا۔ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور فیض محمد کو ساری باتیں سمجھا رہا تھا۔ اس پر جھنجھلاہٹ طاری تھی اور وہ اندر ہی اندر بھرا ہوا تھا جیسے ابھی پھٹ پڑے گا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ وہ پھٹ پڑنے کے باوجود دُشمن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

وہ وہاں سے واپس کمرے میں آیا۔ پھر ریسیور اُٹھا کر ہیلو کہتے ہوئے دہاڑ کر بولا ”میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ اب میرا کیا بگاڑ لو گے ؟“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ وہ ریسیور کو ہاتھ میں تھامے منہ کھولے سامنے والی دیوار کو تک رہا تھا۔ اُسے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ تو ریسیور کو کریڈل پر پٹخ کر باہر گیا تھا اور فیض محمد سے باتیں کر کے واپس آیا تھا۔ رابطہ پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ کسے مخاطب کر رہا تھا ؟ کیا وہ پاگل ہو رہا ہے ؟ کیا وہ جنون میں مبتلا ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے گا ؟ کیا دُشمن یہی چاہتا ہے ؟

اُس نے محسوس کیا، وہ سکون سے نہیں رہ سکے گا۔ نہ کھا سکے گا، نہ پی سکے گا ـــ آرام سے لیٹ بھی نہ سکے گا ـــ لیٹنا تو دور کی بات ہے، بیٹھنے سے بھی طبیعت گھبراتی تھی۔ وہ بے اختیار اُٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا، لیکن کب تک ٹہل سکتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنی گاڑی نکالی اور مردان کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب وہ اپنے علاقے میں پہنچا تو رات ہو رہی تھی۔ پہلے تھانہ ہی پڑتا تھا۔ اس نے وہاں گاڑی روک کر شہباز سے ملاقات کرنا چاہی۔ پتا چلا وہ اُسی کے مکان کی طرف گیا ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ سپاہی نے کہا ”ویسے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا نوروز بخیریت ہے۔“

وہ فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ کر اُسے تیزی سے ڈرائیو کرتا اپنے مکان کے پاس پہنچا۔ اس کے مسلح پہرے دار ڈیوٹی پر موجود تھے۔ انسپکٹر شہباز برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے مطابق تفتیش کر رہا تھا اور حرام خوری کے مطابق ایک بھنے ہوئے مُرغ مسلّم کی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔ خان گل باز خاں کی گاڑی کو دیکھتے ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتے ہوئے بولا ”خان خاناں خوش آمدید، اطلاع دیے بغیر اچانک آ گئے ؟“

وہ اس کے خوشامدانہ انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے ”یہاں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میرا بیٹا خیریت سے تو ہے ؟“

”وہ بخیریت ہے۔ پتا نہیں کس نے دودھ میں زہر دیا تھا لیکن بروقت پتا چل گیا۔“

”کیسے پتا چلا ؟“

”فیڈر کے نپل میں ایک چھوٹی سی پرچی پھنسی ہوئی تھی۔ آپ کی وائف نے اُسے نکال کر پڑھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا، ”دودھ زہریلا ہے۔“

گل باز خاں تیزی سے چلتا ہوا اپنے حویلی نما مکان میں داخل ہوا۔ پھر زنان خانے میں پہنچ کر دہاڑتے ہوئے بولا ”وہ زہریلا دودھ میرے بچّے تک کیسے پہنچا تھا ؟“

اس کی بیوی گل جانہ اور اس کی بوڑھی ماں دونوں ہی سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ پہلے ہی پریشان حال تھیں۔ ماں نے کہا ”بیٹا ! ہم بچّے کے دُشمن نہیں ہیں۔ گھر میں کوئی ملازمہ نہیں ہے۔ ایک ملازم بھی اندر نہیں آیا تھا۔ کھانے پینے کی چیز ہم دونوں کے ہاتھ سے جاتی ہے۔ کسی تیسرے کے ہاتھ میں نہیں پہنچتی ـــ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ دودھ زہریلا کیسے ہو گیا۔ ہم نے جب اس پرچی کو پڑھا تو آزمائش کے طور پر دودھ ایک بلی کو پلایا۔ وہ اُسے پینے کے بعد ادھر سے اُدھر دوڑنے لگی۔ اس کے مُنہ سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہو۔ پھر وہ فرش پر لوٹنے لگی۔ ہم سے وہ منظر دیکھا نہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مر گئی۔“

گل باز نے لپک کر اپنے بچّے کو گود میں لے لیا۔ اُسے سینے سے لگا کر چومنے لگا۔ پھر اُس نے گل جانہ کو اور اپنی ماں کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا ”میں شیطانوں اور بدروحوں پر یقین نہیں رکھتا۔ تم دونوں کے سوا تیسرا کوئی نہیں تھا۔ تم میں سے کسی ایک نے میرے بچّے کو زہر دینے کی کوشش کی تھی۔“

گل جانہ نے کہا ”کیا ایک ماں اپنی اولاد کو زہر دے سکتی ہے۔ وہ بھی بیٹے کو ! جس کی وجہ سے ماں کا سر اُونچا ہوتا ہے جس کی وجہ سے تم میری عزت کرتے ہو۔ دوسری بیویوں کے سامنے میرا مان بڑھاتے ہو۔ مجھے کس چیز کی کمی ہے۔ میرے بچّے نے مجھے کون سا نقصان پہنچایا ہے۔ یہ کیسی باتیں کرتے ہو ؟ دُنیا والوں کے سامنے کہو گے کہ ماں نے زہر دیا ہے تو سب تم پر ہنسیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔“ وہ غصّے سے ماں کو دیکھتے ہوئے بولا ”تم بتاؤ، دودھ میں زہر کیسے مل گیا تھا۔ وہ پرچی کس نے لکھ کر نپل میں پھنسائی تھی ؟“

بوڑھی ماں نے کہا ”بیٹے ! مجھے زہر دینا ہوتا تو تجھے دودھ پلاتے وقت دے دیتی۔ تجھے تو پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا۔ اب کیا اپنے پوتے کو زہر دوں گی ؟ غصّہ کرنے سے بہتر ہے، معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر۔ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے ؟ پہلے چار بدمعاش آئے۔ وہ بڑی آسانی سے میرے پوتے کو ہلاک کر سکتے تھے، تجھ سے انتقام لے سکتے تھے لیکن اُنھوں نے زندہ چھوڑ دیا۔ آج بھی اُنھوں نے زہریلا دودھ بچّے تک پہنچایا لیکن اُس کے منہ تک نہیں پہنچنے دیا۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں ؟“

گل باز خان نے غرّا کر کہا ”وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کسی وقت بھی، کسی صورت میں بھی میرے بچّے کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ خواہ میں کتنے ہی پہرے بٹھا دوں، خواہ میں اسے کہیں بھی لے جا کر چھپا دوں۔ اُنھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے۔“

وہ پاؤں پٹختا باہر برآمدے میں آیا۔ انسپکٹر شہباز نے کہا ”اپنے گھر کی عورتوں سے آپ نے باتیں کر لیں اب میں بھی اپنی تفتیش مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا، دُشمن آخر میرے بچّے تک کس طرح پہنچ جاتے ہیں۔ کیا وہ کوئی روحانی عمل جانتے ہیں ؟“

انسپکٹر نے کہا ”کیا آپ کی والدہ یا آپ کی وائف نے کچھ ایسی باتیں نہیں بتائیں جو ناقابلِ یقین ہوں ؟“

اس نے حیرانی سے پوچھا ”کیسی باتیں ؟“

وہ انسپکٹر کا جواب سُنے بغیر اندر آیا۔ اس کے بعد گل جانہ کو دیکھتے ہوئے بولا ”تم لوگوں نے انسپکٹر کو کیا بیان دیا ہے ؟ کیا بکواس کی ہے ؟“

گل جانہ نے کہا ”ہم نے آپ سے ذکر نہیں کیا۔ ہم جانتے ہیں آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”میں یقین کروں یا نہ کروں، جو اس گھر میں ہو رہا ہے وہ مجھے معلوم ہونا چاہیے۔“

”ایسی باتیں ہو رہی ہیں جن کے متعلق ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ میرے دماغ میں کبھی عجیب و غریب قسم کی باتیں آتی ہیں، ایسی باتیں جن کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ اس گھر کو آگ لگا دوں۔ کبھی سوچتی ہوں، اپنے بچے کو لے کر بھاگ جاؤں۔ جب ایسا خیال آتا ہے تو میں توبہ کرتی ہوں، اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی ہوں۔ پھر میرے دماغ میں آواز آتی ہے، چاہے میں ایسا کروں یا نہ کروں، ایک دن ضرور اس گھر کو آگ لگاؤں گی اور اپنے بچّے کو لے کر بھاگ جاؤں گی۔“

گل باز خاں نے کہا ”صاف کیوں نہیں کہتیں، یہ تمھارے دل میں پہلے سے ہے اور تم ایسا ضرور کرو گی۔ تمھارے دماغ میں کوئی بدروح تو نہیں گھس گئی ہے۔ تم ایسی پارسا بھی نہیں ہو کہ محض کسی بدروح کی باتوں میں آ کر یہ سب کچھ کر گزرو گی۔“

گل باز خاں بول رہا تھا اور اِدھر میں فرہاد علی تیمور اپنا

سر کھجاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ میرے دشمن کتنے ذرائع اختیار کر رہے ہیں۔ کتنی دور سے یہ چالیں چلتے ہوئے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے چھوٹی موٹی چھچھوری حرکتیں کرنے لگا ہوں یا پھر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے کوئی بڑی بات سامنے آنے والی ہے جس کا مجھے بھی انتظار ہے۔

گل باز خاں کی ماں نے کہا "میری بہو ٹھیک کہتی ہے۔ اس کے دل میں کوئی مَیل نہیں ہے۔ نہ یہ تیرے خلاف ہے، نہ اپنے گھر کو آگ لگا سکتی ہے نہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اگر سننا چاہتا ہے تو سن، میرے دماغ میں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"کیا؟" گل باز خاں نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔

اس کی ماں نے کہا "ہاں، کل رات کی بات ہے میں سو رہی تھی۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ کمرے میں گھپ تاریکی تھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آہستہ آہستہ بول رہا ہے۔ میرے قریب سرگوشی کر رہا ہے۔ کمرے میں اتنی گہری تاریکی تھی جیسے میں قبر میں اتر گئی ہوں۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، "تم دادی ہو مگر اپنے پوتے کو دودھ میں زہر ملا کر پلاؤ گی، ضرور پلاؤ گی۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا مگر بولنے کی سکت نہیں تھی، اور وہ کہہ رہا تھا "میں جانتا ہوں، تم دانستہ ایسا نہیں کرو گی لیکن میں تمہاری نادانستگی میں تم سے یہ کام کراؤں گا۔ تمہارے پوتے کے دودھ میں زہر ملواؤں گا۔"

گل باز خاں نے جھنجلا کر کہا "یہ سب بکواس ہے۔ تمہارے کمرے میں ضرور کوئی گھس آیا ہو گا۔"

"میں نے چیخ ماری تھی۔ اپنی بہو کو آواز دی تھی۔ آواز دیتے ہی وہ مردانہ آواز گم ہو گئی۔ پھر میری بہو کی آواز سنائی دی۔ اس نے بتی جلائی۔ ہم دونوں نے دیکھا، کمرے میں کوئی نہیں تھا، ایسا ہو نہیں سکتا کہ کوئی ہو اور بھاگ گیا ہو۔ اس ایک دروازے سے میری بہو داخل ہوئی تھی۔ پھر مکان کے باہر رات کو چار پہرے دار ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کون آ سکتا ہے۔ مانا کہ دن کے وقت چار آدمی گھس آئے تھے لیکن انھوں نے دو پہرے داروں کو گولی مار دی تھی تب وہ اندر آ سکے تھے۔"

گل باز خاں پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا پھر وہ باہر برآمدے میں آیا۔ اس نے کہا۔ "انسپکٹر! سمجھ میں نہیں آتا میں اپنی ماں اور اپنی بیوی کی باتیں کیسے جھٹلاؤں۔ بیوی کے خلاف کہہ سکتا ہوں عورت بھروسے کے قابل نہیں ہوتی لیکن میری ماں بھی عورت ہے۔ وہ جھوٹ کیوں بولے گی، مجھے دھوکا کیوں دے گی؟ ویسے میری بیوی بھی فرماں بردار عورت ہے۔"

انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اس طرح تو ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اگر کوئی دماغ میں آ کر بولتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کراتا ہے تو وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا ہے۔"

گل باز خاں نے اُسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دلاور خاں کا باپ بھی ٹیلی پیتھی نہیں جانتا تھا اور یہ تو ایک خیالی علم ہے، انسپکٹر! تم پریکٹیکل آدمی ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

انسپکٹر شہباز نے کہا "آپ اسے خیالی علم کہہ رہے ہیں۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں اس علم پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اس علم کے قواعد اور طریقۂ کار کا تعین کیا جا رہا ہے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ فرہاد علی تیمور بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ وہ بڑے بڑے سنگین معاملات میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ پھر وہ اپنے ہی ملک میں آ کر ہمارے جیسے عام لوگوں کے دماغوں سے کھیلنا کیوں پسند کرے گا۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرے گا؟"

میں نے خیال خوانی ختم کر دی اور سوچنے لگا۔ کیا میں واقعی وقت ضائع کر رہا ہوں جو انسپکٹر شہباز کہہ رہا تھا، "فرہاد علی تیمور بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ وہ پاکستان آ کر عام آدمی کے دماغ سے کیوں کھیلے گا؟" اس انسپکٹر کی بات کا جواب تو یہ ہے کہ پاکستان کا عام آدمی بھی میری نظروں میں عام نہیں ہے۔ یہاں کا ایک ایک کسان، ایک ایک مزدور، ایک ایک ہنر مند میری نظروں میں اہم ہے کہ یہ نہ ہوں تو پاکستان نہ ہو، کیونکہ گھر والوں سے گھر کا نام ہوتا ہے، گھر کی شان ہوتی ہے، گھر کا وقار بڑھتا ہے۔ میں غیر ممالک میں کسی کے دماغ میں پہنچتا ہوں تو وہ میری آمد کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہے اور میں پاکستان کے کسی بھی شخص کے دماغ میں پہنچتا ہوں تو اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔

انسپکٹر شہباز کا خیال تھا کہ میں یہاں آ کر اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بیشک میں وقت ضائع نہیں کر رہا تھا گمراہ ہونے والے ایک ایک پاکستانی کے دماغ کے ذریعے اس بہت بڑے گیم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جو میرے انجانے دشمن چاروں طرف سے بیک وقت کھیلنے میں مصروف تھے۔ ابھی تک اتنی باتیں سمجھ میں آئی ہیں کہ یہ تمام انجانے کھلاڑی کسی بھی معاملے میں مجھے اور میری ٹیلی پیتھی کو ملوث کرنا چاہتے ہیں، وہ جو بھی جرم کرنا چاہتے ہیں یا کسی بین الاقوامی سازش میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں، ان تمام سازشوں کا الزام ٹیلی پیتھی جاننے والوں پر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے یہ ۔۔۔۔ چھوٹا سا گیم شروع کیا ہے اور اسے ایک جگہ لا کر دھماکا کرنا چاہتے ہیں۔

کوئی بات نہیں، جب دھماکا ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو میں قارئین کے سامنے یہ وضاحت کر دوں کہ وہ زہریلا دودھ اس بچے تک کیسے پہنچ رہا تھا۔ بظاہر یقین ہو رہا تھا کہ یہ ٹیلی پیتھی کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔ اگر میں نے اور سونتی نے ٹیلی پیتھی کا علم استعمال نہیں کیا تو شاید کوئی تیسرا اس میدان میں آ گیا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

قصہ یوں ہے کہ اس واقعے سے ایک دن پہلے گل جانہ اپنے میکے میں تھی۔ رات کو اپنے کمرے میں تنہا سو رہی تھی۔ اچانک آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی کسی نے اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہاتھ اتنا سخت اتنا مضبوط تھا کہ نہ اسے ہٹا سکتی تھی نہ چیخ مار سکتی تھی۔ پھر سرگوشی میں پوچھا گیا۔ "کیا تم مجھے آواز سے پہچان سکتی ہو یا اتنے دنوں میں بھول گئی ہو؟"

گل جانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے منہ دبانے والے شخص کو دیکھا۔ وہ اپنے چہرے پر سے کپڑا ہٹا رہا تھا۔ اس کے سامنے دلاور خان کھڑا تھا۔ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ "تمہیں اپنے بچے سے بڑی محبت ہو گی، اس لیے آواز نکالنے کی حماقت نہ کرنا۔"

اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور فوراً ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آہستگی سے بولی "تم زندہ ہو لیکن خانخاناں کہہ رہا تھا، تمہیں گولی ماری گئی ہے۔"

"اس کے ایسا کہنے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل و دماغ سے میری محبت نکل جائے۔"

وہ عاجزی سے بولی "میں پرائی ہو چکی ہوں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے خاوند کی وفادار ہوں۔ اس کے لیے جینا چاہتی ہوں، اس کے لیے مرنا چاہتی ہوں۔"

"میں تم سے دوبارہ محبت کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تمہیں یاد ہے جب تمہارا یہ بیٹا پیدا ہونے والا تھا تو میں نے اسے گولی نہیں ماری تھی۔ جانتی ہو کیوں؟"

"ہاں میں نے کہا تھا، یہ صرف تمہارے دشمن ہی کا نہیں، میرا بھی ہونے والا بچہ ہے۔ اس پر تم نے چھوڑ دیا تھا۔"

دلاور نے انکار میں سر ہلا کر کہا "جب تم اپنے شوہر کی وفادار ہو، میری کوئی نہیں ہو تو پھر تمہاری خاطر میں اس بچے کو کیوں چھوڑ دیتا؟"

گل جانہ نے حیرانی سے پوچھا "پھر؟"

"میں اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ تمہارا شوہر میرے ہاتھوں لمحہ لمحہ مرتا رہے۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"

"ابھی سمجھ لو گی۔ صرف ایک فیصلہ کرو۔ اپنے شوہر کی زندگی چاہتی ہو یا اپنے بیٹے کی؟"

اس نے فوراً ہی پلٹ کر اپنے بیٹے کو اٹھا لیا۔ سینے سے لگا کر بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے دونوں کی زندگی عزیز ہے۔"

"میں ایک کی بات پوچھ رہا ہوں۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی "خدا کے لیے مجھے مار ڈالو لیکن دونوں کو بخش دو۔"

وہ مسکرا کر بولا "میں تمہیں کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مار سکتا۔ ہاں تمہاری خاطر ان دونوں کو بخش سکتا ہوں۔"

"سچ؟" وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں لیکن مجھے یہ بتاؤ، میں اپنے باپ کے خون کا بدلہ کیسے لوں؟ کیا تمہارے شوہر کو اس کی ذرا سی بھی سزا نہیں ملنی چاہیے؟"

"دنیا کے ہر مجرم کو سزا ملنی چاہیے لیکن ایک التجا ہے، میرا سہاگ سلامت رہے، میرا بچہ سلامت رہے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارا بچہ سلامت رہے گا اور تمہارا سہاگ بھی لیکن میں جو کہوں، وہ تمہیں کرنا ہو گا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں تمہارے شوہر سے وہ سب کچھ چھین لینا چاہتا ہوں جس پر میرا حق ہے۔ وہ میرے باپ کی دولت اور جائداد سے اتنا بڑا آدمی بن گیا ہے۔"

"تم ایسا کرو گے تو میں اعتراض نہیں کروں گی۔ تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔"

"میں تمہارے شوہر کے خلاف جو سازش کروں گا تم اس میں میرے ساتھ شریک ہو گی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ نہیں دلاور! تم مجھے اس معاملے سے الگ رکھو۔"

"تمہارے بغیر میرا کام نہیں بنے گا۔ یاد رکھو، تمہارا

بیٹا اس روز میرے رحم و کرم پر تھا۔ دُنیا میں آنے سے پہلے ہی مرنے والا تھا مگر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آج بھی یہ میرے ہاتھوں سے دور نہیں ہے۔ تم اسے سینے سے لگا کر چھپا لو۔ اپنی ممتا کا لاکھ واسطہ دو، مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا میں ابھی گولی مار دوں گا۔"

وہ گڑگڑا کر بولی "نہیں نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے خدا کے لیے ایسا کبھی نہ کرنا۔"

"آہستہ بولو، دوسرے کمرے میں آواز جائے گی کوئی ادھر آئے گا تو میں اپنا مقصد پورا کیے بغیر تمہارے بچے کو ختم کر کے چلا جاؤں گا۔"

وہ شکست خوردہ انداز میں بولی "تم کیا چاہتے ہو؟ کس طرح میرے شوہر کے خلاف سازش کرنا چاہتے ہو؟"

"میں نے یہاں آتے ہی معلوم کیا ہے، گل باز خاں بیٹے کو بہت چاہتا ہے۔ یہ اس کے بڑھاپے کی اولاد ہے اور اکلوتا بیٹا ہے۔ میں اس کے ذریعے اسے دہشت زدہ کردوں گا ــــ یہ تاثر دوں گا کہ اس کے بیٹے کو ہلاک کرنے والا ہوں۔"

وہ آنسو بھرے لہجے میں بولی "تم اسے ہلاک نہیں کروگے نا؟"

"میں تمہارے شوہر کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانا چاہتا ہوں کہ نور روز میرے رحم و کرم پر ہے اور میں کسی وقت بھی اسے ختم کر سکتا ہوں۔"

"میں ہر حال میں اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہوں۔ تم جو کہو گے وہ کروں گی۔"

"تو سُنو، تم کل ہی گل باز خاں کے ہاں چلی جانا۔ میں کچھ چیزیں تمھیں دے رہا ہوں، انھیں سوچ سمجھ کر استعمال کرنا۔"

اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر پہلے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اسے دکھاتے ہوئے کہا "اس میں چند گولیاں ہیں۔ کل رات کے کھانے یا کسی پینے کی چیز میں ایک گولی ملا کر اپنی ساس کو پلا دینا۔"

"کیا تم میرے ہاتھوں انہیں قتل کرانا چاہتے ہو؟"

"میری بات پوری طرح سُنو۔ اسے کھانے سے وہ نہیں مرے گی۔ صرف اس کے اعصاب کمزور ہو جائیں گے۔ یہ بتاؤ جس کمرے میں تمہاری ساس سوتی ہے، اس کے پلنگ کا رُخ کس طرف ہے۔ کیا دروازے کی طرف سرہانہ ہے؟"

"ہاں، سرہانہ دروازے کی طرف ہے۔"

دلاور نے بیگ میں سے ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس میں کیسٹ لگا ہوا ہے۔ تم اس بٹن کو دباؤ گی تو کیسٹ سے میری آواز سنائی دے گی۔ آواز میں جو کچھ بھی ہے وہ تمہاری ساس کے لیے ہے۔ اس میں چند باتیں ریکارڈ کی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد کیسٹ خالی ہے۔ کیا تمہاری ساس کے کمرے میں تاریکی ہوتی ہے؟"

"ہم رات کو اندھیرا کر دیتے ہیں۔ روشنی میں نیند نہیں آتی۔ میرا بچہ بھی روشنی میں نہیں سوتا ہے۔"

"اس کیسٹ ریکارڈر کو اپنی ساس کے کمرے میں رات کے وقت لے جانا۔ پہلے یقین کر لینا، وہ سو رہی ہے۔ اس کے بعد تم اس کے سرہانے چپ چاپ اسے رکھتے ہی بٹن کو آن کر دینا۔ یہ دیکھو آن کرنے کا بٹن یہ ہے۔ میں بار بار سمجھا رہا ہوں، تم کوئی غلطی کرو گی اور میرا کام نہیں بنے گا تو سمجھ لینا میں اپنے وعدے سے پھر جاؤں گا اور تمہارے بیٹے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

وہ اپنے بیٹے کو سینے سے اور زیادہ بھینچتے ہوئے بولی۔ "نہیں، میں کوئی غلطی نہیں کروں گی۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں، تم جو کہہ رہے ہو وہی کروں گی۔"

"اب آگے سنو۔ جس رات تم یہ کیسٹ ریکارڈر اپنی ساس کے سرہانے رکھ دو گی، وہ یہ آواز سُن کر گھبرائے گی اور کسی کو بلانا چاہے گی تو سب سے پہلے تمھیں وہاں پہنچنا ہوگا... تاکہ کیسٹ ریکارڈر کو اپنے قبضے میں لے کر اسے کہیں چھپا سکو۔ اس کے بعد تم روشنی کر کے اپنی ساس کو تسلیاں دے سکتی ہو۔"

"میں یہی کروں گی۔"

"تمھیں اور بہت کچھ کرنا ہے۔ کل رات میری ہدایات پر عمل کرنے کے بعد دوسرے دن میرے چار مسلح آدمی تمہارے گھر میں گھس آئیں گے۔ اگر پہرے دار ہوں گے تو ان کا مقابلہ کریں گے۔ تم انجان بنی رہنا۔ وہ زنان خانے میں آکر تمہارے بچے کو چھین لیں گے۔ دو چار باتیں دھمکی آمیز لہجے میں کہیں گے۔ اس کے بعد بچے کو واپس کر کے چلے جائیں گے۔"

وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ سہمے ہوئے انداز میں بولی "میں کیسے یقین کر لوں؟ وہ مسلح ہوں گے۔ میرے بچے کو چھین لیں گے۔ پھر وہ واپس کیوں کریں گے؟"

"اس لیے کہ وہ میرے آدمی ہوں گے۔ میری مرضی کے بغیر تمہارے بچے کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ میرے حکم کے مطابق اُسے چھینیں گے، پھر واپس کر دیں گے۔ کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

وہ ہاں، ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگی۔

"اب آگے سُنو۔ وہ تمہارے بچے کو واپس کر کے چلے جائیں گے پھر اُسی شام تم اُس کے دودھ میں زہر ملا دینا۔"

گل جانہ کی اُوپر کی سانس اُوپر رہ گئی۔ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی "نہیں، تم کتنے ظالم ہو۔ ایک ماں کو اس کے بچے کے دودھ میں زہر ملانے کے لیے کہہ رہے ہو۔"

"تم بکواس کرو گی یا پوری بات سنو گی؟ بے وقوف عورت، میں تمہارے بچے کو مارنا چاہوں تو یہ میرے لیے کیا مشکل ہے؟"

وہ قائل ہو کر بولی "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں تم پر بھروسہ کرتی ہوں۔ پوری طرح اعتماد کرتی ہوں۔ بولو، میں سن رہی ہوں۔"

دلاور نے اپنی جیب سے کاغذ کی ایک چھوٹی سی پرچی نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "دودھ میں زہر ملانے کے بعد فیڈر میں نپل لگاؤ گی۔ اس نپل میں اس پرچی کو پھنسا دینا۔ اس میں لکھا ہوا ہے: یہ دودھ زہریلا ہے۔ اس طرح تم اپنے شوہر کو اور پولیس کو یہ بیان دے سکو گی کہ زہریلا دودھ بچے تک نہیں پہنچ سکا۔ اس سے پہلے ہی تم نے یہ پرچی پڑھ لی تھی۔"

گل جانہ نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور اُسے عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا "میں تمھیں غلط سمجھ رہی تھی۔ جب وہ لوگ میرے بچے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور مجھ سے چھین کر واپس کر دیں گے۔ جب وہ زہریلا دودھ بچے تک نہیں پہنچ سکے گا تو میں تمہارے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔"

"پولیس والوں کے یا اپنے شوہر کے سامنے بیان دیتے وقت تم یہ تاثر دو گی کہ تمہارے دماغ میں کوئی بولتا ہے اور منفی انداز میں بولتا ہے۔ تمھیں اس گھر کو آگ لگانے اور بچے کو لے کر بھاگنے پر مجبور کرتا ہے اور تم انکار کرتی رہتی ہو۔"

"میں یہ سب کہوں گی لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟"

"جو کہہ رہا ہوں وہ کرتی جاؤ۔ تمہارا شوہر جتنا زیادہ دہشت زدہ ہوگا اتنا ہی تمہارے بچے کی زندگی محفوظ رہے گی۔ مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لو، جب تک میری آلۂ کار بنی رہو گی تمہارا بچہ زندہ سلامت رہے گا۔"

یہ تمام باتیں سمجھا کر وہ وہاں سے چلا گیا اور گل جانہ اسی کے مطابق عمل کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچے کو ہلاک نہ کرنے کی وارداتوں کے باعث تفتیش کرنے والوں کا دھیان ٹیلی پیتھی کی جانب مبذول ہونے لگا۔

دلاور خان اپنے منصوبوں پر عمل کر رہا تھا اور کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک بڑے سے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چار آدمی اور تھے۔ اُن میں سے ایک ذرا عمر رسیدہ تھا۔ اس کا نام فردوس مراد تھا۔ بہرام علی ٹیرر ٹریننگ سینٹر سے جو ٹیم صوبہ سرحد میں پہنچی تھی، فردوس مراد اس ٹیم کا لیڈر تھا۔ وہ تعلیم یافتہ بھی تھا، اور دوسروں کے مقابلے میں ذہین تھا۔ وہاں اس کے اور دلاور خان کے علاوہ جو تین جوان تھے، ان میں سے ایک کا نام بارود خان اور دوسرے کا نام طمنچہ خان تھا۔ تیسرا شمشاد بونا تھا۔ وہ قد میں چھوٹا تھا۔ اس کے ساتھی اکثر اُسے چھیڑتے ہوئے کہتے تھے۔ بلند و بالا پہاڑوں میں رہنے والے پٹھان ایسے ناٹے نہیں ہوتے۔ تم کس پہاڑ کی چوٹی سے گرے تھے کہ گرتے گرتے گھستے گھستے اتنے چھوٹے ہو گئے۔ سب اُسے بونا کہتے تھے۔

فردوس مراد نے کہا "دلاور خان! ہمارا منصوبہ یہاں تک کامیاب رہا ہے۔ گل باز خاں پوری طرح دہشت زدہ ہو چکا ہے ــــ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہم ہر طرح سے اس کے بچے کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ خواہ اُسے کسی پاتال میں بھی چھپا دیا جائے۔ یہ تاثر بھی دے دیا گیا ہے کہ تم ٹیلی پیتھی کے ذریعے وہاں تک پہنچ سکتے ہو۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "وہ کبھی یقین نہیں کریں گے کہ میں ٹیلی پیتھی جانتا ہوں۔ اُن کا دھیان فرہاد علی تیمور کی طرف جائے گا۔"

فردوس مراد نے کہا "ہمارے باس کی پلاننگ یہی ہے۔"

شمشاد بونے نے کہا "اُستاد! کیوں بیچارے فرہاد کو بدنام کرتے ہو؟ اس نے ہمارا کیا بگاڑا ہے کہ ہم اس کا بگاڑے جا رہے ہیں؟"

بارود خان نے کہا "تمہارے قد کی طرح تمہاری عقل بھی چھوٹی ہے۔ بچوں کو بڑوں کے بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔

فردوس مراد نے پوچھا "تمہاری وہ گل جانہ تمہارے تیسرے منصوبے پر عمل کرے گی؟"

"ہاں، اس نے اب تک اپنی ساس کو وہ دو گولیاں کھلا دی ہوں گی۔ اس بڑھیا کے اعصاب زیادہ کمزور ہو جائیں گے۔ وہ بدحواس رہے گی۔ ایسے میں گل جانہ اس کے

قریب بیٹھ کر یہ تاثر دیتی رہے گی کہ ساس کے دماغ میں کوئی پہنچ گیا ہے اور اسے کمزور بنا رہا ہے۔ کوئی اس کے دماغ میں بول رہا ہے۔ شاید اُس کے پوتے کو کسی دوسری طرح مار ڈالنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اپنے پوتے کے مرنے کی بات سُن کر وہ اور زیادہ بدحواس ہو جائے گی۔ جب ان گولیوں کا اثر ختم ہو جائے گا اور وہ اپنا بیان دے گی تو یہ سب ٹیلی پیتھی کی کارستانی سمجھی جائے گی۔"

"کل صبح تک گل باز خاں مردان سے واپس پشاور آئے گا۔ تم پھر اسے فون کرو گے۔"

"مجھے کیا کہنا چاہیے؟"

فردوس مراد نے ڈائری کھولتے ہوئے کہا۔ "باس نے کہا تھا، جب وہ پوری طرح ہماری گرفت میں آجائے گا تو ہم اپنا سامان یہاں سے اس کے ٹرکوں میں اسمگل کرائیں گے۔"

میں فردوس مراد کے دماغ سے معلوم کر چکا تھا، اُن کا باس وہی مائخل شوف تھا جس سے میری ملاقات ہو چکی تھی اور جس کی پلاننگ کے مطابق میں اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ یعنی مائخل شوف کی وہ ٹیم جو ہمارے ساتھ آئی تھی، سندھ میں تھی۔ دوسری ٹیم سرحد میں کام کر رہی تھی۔ اس نے ٹیم کے لیڈر فردوس مراد کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ صرف ایک گلباز خاں ہی نہیں بلکہ وہاں جو ٹرانسپورٹرز بھی اسمگلنگ کے دھندوں میں ملوث ہیں، ان سب کو کسی طرح بلیک میل کیا جائے۔ ان کی کمزوریوں سے کھیلا جائے اور اُنھیں اس طرح مجبور کیا جائے کہ اُن کے ذریعے اپنا سامان ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچایا جا سکے۔

یہ تو اسمگلنگ والی بات تھی لیکن اُنھیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ جو بھی چال چلیں، جو بھی سازش کریں، اس کے پیچھے ایسے نشانات چھوڑ دیں جن کے ذریعے ٹیلی پیتھی جاننے والوں پر شبہ ہونا ہے۔

آیئے، اب ہم لاہور چلتے ہیں۔ میں مائخل شوف کے ذریعے بیگم رعونت جہاں عرف رعونہ کے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ جیسا اس کا نام ہے ویسی ہی وہ رعونت والی ہے۔ اس کے پاسپورٹ اور دوسرے ضروری کاغذات کے مطابق ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پاکستان کے ایک ارب پتی صنعت کار کے بڑے صاحب زادے رانا حیات محمد خاں کی بیوی تھی لیکن اس کے ساتھ بڑا المیہ ہوا تھا۔ شادی کی رات رانا حیات محمد خاں اچانک چل بسا تھا۔ جس کے بعد رعونت جہاں عرف رعونہ کو منحوس قرار دے دیا گیا۔ رانا حیات کے خاندان والوں نے اُسے بہو کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر برطانیہ چلی گئی۔ وہاں انکشاف ہوا کہ اُس کا وہ شوہر جو سہاگ رات کو ہی مر گیا تھا، اُس نے شادی سے پہلے رعونت جہاں کے نام کم از کم ایک کروڑ کے ہیرے جواہرات اور پچاس لاکھ روپے نقد چھوڑے تھے۔ رعونت جہاں نے اس دولت سے ایک بہت بڑی کمپنی میں شیئر خریدا تھا جس کے نتیجے میں اس کی دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ رانا حیات محمد خاں کے خاندان والوں نے اُسے بہو تسلیم نہیں کیا تو وہ دو کوڑی کی نہیں رہی تھی۔ بے حد حسین تھی، بے حد اسمارٹ اور پُرکشش تھی۔ کوئی بھی اُس کے آگے دل ہار سکتا تھا لیکن وہ دولت والے کو ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک ملا تھا جو شادی کی رات مر گیا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ ایک ایجنٹ کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے اُسے بہرام علی ٹیررٹریننگ سینٹر پہنچا دیا۔ تین برس تک مکمل تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ لندن پہنچائی گئی۔ وہاں اس کے حق میں ایسے کاغذات تیار کیے گئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ رانا حیات محمد خاں نے شادی سے پہلے ہی رعونت جہاں کے نام نقد رقم کے علاوہ بیش قیمت ہیرے جواہرات چھوڑے تھے۔ اب اس کے مطابق وہ ایک دولت مند خاتون بن کر پاکستان واپس آئی تھی۔ لاہور اُسے بے حد پسند تھا اُس لیے اسی شہر میں قیام کر رہی تھی۔ ورنہ اس کا ٹارگٹ وہ اہم سرکاری افسر تھے جو حکومت کے اہم شعبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔

جب میں رعونت جہاں کے دماغ میں پہنچا تو اُس وقت وہ نہایت ہی قیمتی ایئر کنڈیشنڈ کار سے اُتر رہی تھی۔ ایک بہت بڑی کوٹھی دُلھن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ بڑے آدمیوں کی بڑی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس پارٹی میں رعونت جہاں جیسی بڑی دولت مند عورت کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کے حُسن اور امیرانہ شان و شوکت کا اتنا چرچا کیا گیا تھا کہ سبھی اُسے ایک نظر دیکھنے کے لیے بیقرار تھے۔

جب وہ اپنی کار سے باہر نکلی تو سب اُسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ان کا خیال تھا، اتنی دولت مند عورت ہیرے جواہرات پہن کر، بہت بن سنور کر آئے گی لیکن وہ بالکل سادہ تھی۔ ایک زیور بھی اس کے بدن پر نہیں تھا۔ اس نے نہایت ہی سادہ سا لباس پہنا ہوا تھا اور اس سادہ سے لباس میں اس کا حُسن جو غضب ڈھا رہا تھا، وہ لوگوں کے ردِ عمل سے ظاہر تھا۔ وہ اسے اس طرح دیکھنے لگے تھے

کہ استقبالیہ انداز میں میزبان بھی آگے بڑھنا بھول گیا تھا۔

وہ میزبان ایک بہت ہی اہم شعبے کا ایک اہم اعلیٰ عہدے دار تھا۔ ہمارے ہاں اکثر چہرہ دیکھ کر یا اس کا نام دیکھ کر اسے اعلیٰ عہدہ دے دیا جاتا ہے، قابلیت نہیں دیکھی جاتی۔ اس کا نام عالی جناب تھا اور اپنے عہدے کے لیے یہ نام بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ پیدا ہوتے ہی اس عہدے کے لیے عالی جناب بن گیا ہو۔

رعونت جہاں کے لیے اس کی لیڈی باڈی گارڈ سرداراں نے کار کا دروازہ کھولا تھا۔ سرداراں یوں تو ایک اچھی خاصی عمر کی عورت تھی۔ یعنی اس کا جسم عورت کا تھا، لیکن گردن سے اُوپر، چہرہ کسی قصائی کا لگتا تھا۔ بارہ برس پہلے وہ اپنے خاوند کو قتل کر کے جیل میں پہنچ گئی۔ ایک برس تک مقدمہ چلتا رہا۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا، نہ ہی کسی نے گواہی دی۔ نتیجتہً وہ رہا کر دی گئی۔ پھر چھ ماہ بعد ایک غیر ملکی اسمگلر کو قتل کرنے کے الزام میں اسے گرفتار کیا گیا۔ اس بار وہ ملتان سینٹرل جیل میں رہی۔ وہاں جیلر کے سامنے تن کر سینے پر ہاتھ مار کر کہتی تھی۔ "میں لاہور جیل میں رہ چکی ہوں۔ ملتان میں زیادہ نہیں رہوں گی۔ یہاں کی آب و ہوا مجھے راس نہیں آتی۔"

ایک ہفتے کے اندر ہی سپاہی جیسے اس کے مرید ہو گئے تھے۔ پتا چلا، اندر نشے کی چیزیں آتی ہیں۔ عورتوں کی جیل میں جن سپاہیوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے، ان کی جیبیں گرم رہتی ہیں اور عورتیں تو اس سے اس طرح سہمی رہتی تھیں جیسے اُن کے درمیان بھُوسے سے ایک مرد چلا آیا ہو۔ وہ مردوں کی طرح بولتی تھی۔ مردانہ وار لڑتی تھی۔ کوئی قیدی عورت، زنانہ وار لڑنے آتی تو اسے اس طرح دبوچتی کہ وہ شکست تسلیم کر لیتی تھی۔

دو برس کے بعد ہی مقدمہ ختم ہو گیا۔ ایک تو مقتول غیر ملکی اسمگلر تھا، غیر قانونی طور پر پاکستان آیا تھا پھر جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی وہاں سرداراں دیکھی گئی تھی لیکن اس کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا جس نے یہ بیان دیا تھا کہ سرداراں جائے واردات پر دیکھی گئی ہے، وہ ان دو برس کے عرصے میں مر چکا تھا۔ لہٰذا وہ پھر بری کر دی گئی پھر سرداراں نے چوری کرنے، قتل کرنے، باہر کی آزاد دنیا میں رہ کر اسمگلنگ کرنے، جیل میں رہ کر باہر کا مال امپورٹ کرنے، جیل کی اہم خبریں، اہم پیغامات ایکسپورٹ کرنے کے جو بڑے بڑے ریکارڈ قائم کیے تھے ان کے پیشِ نظر وہ بین الاقوامی مجرموں کی نظروں میں آ گئی تھی۔ تقدیر یا در حالات نے اُسے بہرام علی ٹیررٹریننگ سینٹر میں پہنچا دیا۔ جہاں وہ رعونت جہاں کو دیکھتے ہی اس پر ہزار جان سے فدا ہو گئی۔

رعونہ پہلے اس سے گھبراتی تھی، کتراتی تھی۔ سرداراں کہتی تھی۔ "میں دُشمنوں کے لیے دشمن ہوں۔ دوست کے لیے دوست جسے پسند کر لیتی ہوں اُسے بڑی محبت سے گرفتار کر لیتی ہوں۔"

یہی ہوا۔ رفتہ رفتہ رعونہ اس سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ پھر اتنی گہری سہیلی بن گئی کہ رات دن دونوں ساتھ رہنے لگیں۔ ساتھ کھانا، ساتھ رہنا، ساتھ ٹریننگ لینا۔ کبھی سرداراں ٹی۔ ٹی سینٹر کے کسی مشن پر سینٹر سے باہر جاتی تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ بار بار دروازے کی طرف آ کر اس کی راہ تکتی تھی۔ اس کے بغیر نہ اسے بھوک لگتی تھی، نہ نیند آتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ بھی سرداراں کے ساتھ کسی مشن پر ضرور جاتی لیکن دونوں میں بڑا فرق تھا۔ سرداراں مردوں کے انداز میں کسی مہم میں شریک ہوتی تھی۔ کسی کو قتل کرنا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اس نے چیونٹی کو انگلیوں میں مسل ڈالا ہو۔ اس کے برعکس رعونت جہاں عرف رعونہ نازک اندام تھی، چونکہ ذہین اور تعلیم یافتہ تھی اس لیے اپنی ذہانت اور علمی قابلیت کے مطابق سازشوں کے جال بچھانے کی تربیت حاصل کر رہی تھی۔ بہرحال ٹریننگ کے اختتام پر رعونہ کی دلی مراد بر آئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ رعونہ ایک دولت مند بیوہ کی حیثیت سے رہے گی اور سرداراں اس کی باڈی گارڈ کے طور پر اس کے ساتھ رہے گی جہاں دماغ کو کام میں لانا ہو گا وہاں رعونہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرے گی اور جہاں ہنگامہ آرائی اور قتل و غارت گری کی بات ہو گی وہاں سرداراں کام آئے گی۔

اسی منصوبے کے مطابق سرداراں نے ایک باڈی گارڈ کی حیثیت سے رعونہ کے لیے دروازہ کھولا تھا اور وہ کار سے نکل کر جس انداز میں جلوہ گر ہوئی تھی، وہ جلوہ گری لوگوں کو محوِ حیرت کر دینے اور دیدار میں گم کر دینے کے لیے کافی تھی۔ سب سے پہلے رعونت جہاں کے سیکریٹری نے عالی جناب سے مصافحہ کرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ "یہی ہماری مالکہ رعونت جہاں ہیں۔"

اس نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے استقبالیہ انداز میں کہا۔ "آپ میری خوشیوں میں شریک ہونے آئی ہیں۔ آپ کی تشریف آوری نے میری خوشیوں کو دوبالا کر دیا ہے۔ آیئے تشریف لایئے۔"

رعونہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی شخصیت

سے متاثر ہو رہی ہو۔ پھر اس نے پوچھا "کیا آپ ہی عالی جناب ہیں؟"

"جی ہاں، اسی خاکسار کو عالی جناب کہتے ہیں۔"

اس تقریب میں بڑے بڑے سرمایہ دار اور مختلف شعبوں کے اعلیٰ افسران شریک ہوئے تھے۔ عالی جناب کو اپنے اعلیٰ رُتبے کا پورا خیال رکھنا تھا۔ اس لیے وہ مجبوراً رعونت جہاں سے زیادہ قریب نہیں رہ سکتا تھا لیکن تقریب کے دوران اس کا سارا دھیان اسی کی طرف تھا۔ وہ کسی سے بات کرتا تو بے اختیار کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ چار چھ معزز مہمانوں سے رسمی گفتگو کرنے کے بعد ایک بار ضرور رعونہ کے پاس پہنچتا تھا اور کہتا تھا، یہاں کسی طرح کا تکلف نہ کرنا، اس گھر کو اپنا سمجھو۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے، ہم بھی تمہارے ہیں۔"

کبھی پھر گھوم پھر کر آتا... اور کہتا "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو اپنا سمجھ کر جب چاہو چلی آؤ۔ میں اپنے سیکرٹری کو تاکید کر دوں گا۔ تم اپنا نام بتاؤ گی، وہ فوراً ہی مجھ سے رابطہ قائم کرا دے گا۔"

جب مہمان رُخصت ہونے لگے تو رعونہ نے بھی اجازت چاہی۔ عالی جناب نے افسردگی سے کہا "یوں لگتا ہے جیسے خواب میں آئی ہو اور خواب میں چلی جاؤ گی۔ آنکھ کھلے گی تو تمہارے بارے میں سوچتا رہ جاؤں گا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ترنّم تھا۔ سُننے والوں کے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا "کل تمہیں فرصت ہو تو..."

وہ بھی آہستگی سے بولی "آپ کا دعوتی کارڈ میرے ایڈریس پر آیا تھا۔ اس کا مطلب ہے، آپ کے سیکرٹری کے پاس میرا پتا اور فون نمبر وغیرہ موجود ہیں۔"

"پھر تو میں پہلی فرصت میں فون کروں گا۔"

وہ جھکی جھکی نظروں سے شرماتے ہوئے بولی "اب تو فون کی ہر گھنٹی پر دل دھڑکنے لگے گا۔"

یہ کہتے ہی وہ رخ پھیر کر تیزی سے یوں کار کی طرف لپکی جیسے شرما گئی ہو۔ اس نے اپنے ناز و انداز سے ظاہر کر دیا کہ محبت کی چوٹ کھا کر جا رہی ہے۔

دوسری طرف عالی جناب گم صُم کھڑا ہوا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ تقریباً پچاس برس کا تھا۔ بیٹے بہو، بیٹی داماد والا تھا۔ نواسے نواسیاں بھی تھیں۔ پوتے اور پوتیاں بھی۔ انسان کا بڑھاپا انہی رشتوں سے ہرا بھرا رہتا ہے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ بڑھاپے میں کوئی نوجوان عورت اس پر یوں پہلی نظر میں فریفتہ ہو جائے گی اور جب وہ ہو ہی گئی تھی تو بڑے عرصے بعد احساس ہوا کہ وہ اب تک خزاں رسیدہ عمر گزار رہا تھا۔ رعونہ جوانی کا صُور پھونک کر چلی گئی تھی اور ساون کے اندھے کو ہری ہری سوجھ رہی تھی۔

وہ اپنی قیمتی کار کی پچھلی سیٹ پر سرداراں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ سرداراں غصّے سے بھری ہوئی ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر آہستگی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

سرداراں نے اس کے ہاتھ کو جھٹک کر غصّے سے کہا "گھر چلو، بتاؤں گی۔"

وہ سہم کر بولی "میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی۔ وہی بار بار میرے پاس آ رہا تھا۔"

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیکرٹری نے کہا "سرداراں! تم جانتی ہو، ہم سب اپنی اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ رعونہ اپنی ڈیوٹی کے مطابق عالی جناب کو لفٹ دے رہی تھی۔ تم بُرا کیوں مان رہی ہو؟"

سرداراں کے منہ سے یوں آواز نکلی جیسے سانپ پھُنکار رہا ہو۔ پھر وہ بولی "اوئے تو چپ کر۔ اپنی ڈیوٹی سے باہر قدم نکالے گا تو اپاہج کر کے چھوڑ دوں گی۔"

وہ ایک دم سے پلٹ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم بہت اودر ہوتی جا رہی ہو۔ میں ابھی جا کر مائخل شوف سے رابطہ قائم کروں گا۔ اس مشن میں رعونہ کے ساتھ یا تو تم رہو گی یا میں۔"

وہ حقارت سے بولی "ارے جا جا، تو مائخل شوف کو اپنا باپ بنا لے گا تب بھی وہ جانتا ہے، یہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

سیکرٹری نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر ہتھیلیاں پھیلائیں۔ اس کے پنجے اتنے بڑے اور مضبوط نظر آ رہے تھے کہ اس کی گرفت میں آنے والا خود کو شاید چھڑا نہ پاتا۔ وہ بولا "دیکھ سرداراں! تو عورت ہے مگر مرد بننے کی کوشش کرتی ہے۔ مرد کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اسے وقت بے وقت غصہ نہیں آتا۔ وہ بڑی سنجیدگی اور متانت سے معاملے کو نمٹانا چاہتا ہے۔ بڑی مجبوری کی حالت میں پنجے لڑاتا ہے۔ اگر تو سمجھدار ہے تو میرا اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔"

سرداراں اسے غرّا کر دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ کار سے اُتر کر وہ غصّے میں بھری ہوئی تیزی سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ جب رعونہ اندر ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے تحکمانہ انداز میں کہا

"ادھر آؤ۔"

یہ حکم دیتے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رعونہ سہمے ہوئے انداز میں اُس کمرے کی طرف جانے لگی۔ سیکرٹری اسے ہمدردی اور تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچی، سرداراں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اندر کھینچ لیا پھر دروازے کو بند کر دیا۔ وہ لرزتی ہوئی بولی "میری اچھی سرداراں! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

وہ بالوں کو زور سے جھٹکا دے کر بولی "قصور کی بچی، وہ اتنی دیر تک بکواس کرتا رہا اور تو سنتی رہی، وہاں سے ہٹ نہیں سکتی تھی؟"

"میں اس مشن کا سب سے اہم رول ادا کر رہی ہوں۔ اسے پھانسنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔"

تڑاخ سے اُس کے منہ پر طمانچہ پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی۔

وہ رونے لگی۔ مار کھانے اور اُس کا ظلم سہنے کے باوجود اُسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولی "میں جانتی ہوں تو اپنی رعونہ پر اعتماد کرتی ہے۔ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں کسی کے فریب میں آؤں گی۔ بس عادت سے مجبور ہے تو مارتی ہے اور میں مار کھا لیتی ہوں۔"

وہ آگے بڑھی۔ یہ محبت سے سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔ اُس نے غرّاتے ہوئے کہا "ہاں، میں تجھ پر اعتماد کرتی ہوں۔ تجھے پہلے بھی سمجھا چکی ہوں۔ پھر سمجھاتی ہوں، اپنے شکار کو صرف محبت کا فریب دینا۔ خود فریب میں آئے گی اور مجھے پتا چلے گا تو پھر جانتی ہے کہ سرداراں کس طرح انسانی ہڈیوں سے گوشت چھڑا دیتی ہے۔"

اس نے اپنے سر کو جھکا لیا۔ سرداراں نے ایک صوفے پر بیٹھ کر اپنا پاؤں اس کی طرف بڑھایا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے کینوس شوز کے فیتے کھولنے لگی۔ دونوں جوتے اتارنے کے بعد اس کے پاؤں کو ہولے ہولے دابنے لگی۔

سرداراں نے کہا "میرے کالے چرمی جوتے لے آؤ۔"

رعونہ نے چونک کر اُسے دیکھا۔ پھر پوچھا "تم کہیں جاؤ گی؟"

"نہیں، جوتے لاؤ۔"

"پھر یہاں کیوں پہننا چاہتی ہو۔ یہاں تمہارا دشمن کون ہے؟"

"جو کہتی ہوں وہ کرو۔"

وہ سیاہ چرمی جوتے لانے کے لیے وہاں سے اُٹھ گئی اس کمرے کے باہر ڈرائنگ روم میں سیکرٹری ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ کبھی کبھی اُس بند دروازے کی طرف دیکھتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رعونہ جیسی حسین عورت سرداراں جیسی بدصورت عورت سے خوف زدہ رہے۔ اس نے سوچا۔ "آخر لیڈی باڈی گارڈ کی کیا ضرورت ہے؟ میں بھی تو اس کا باڈی گارڈ بن کر رہ سکتا ہوں۔ پھر سرداراں کی بدتمیزی اور اس کا حقارت آمیز سلوک میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

وہ اپنے کمرے میں آیا۔ ٹرانسمیٹر نکال کر مائخل شوف سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو، میں بیگم رعونت جہاں کا سیکرٹری بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "میں عالی جناب ہوں کیا تمہاری بیگم صاحبہ سو گئی ہیں؟"

"جی نہیں، ذرا ہولڈ آن کریں۔ ابھی آپ سے رابطہ قائم ہو جائے گا۔"

اس نے انٹرکام کے بٹن کو دبایا۔ دوسرے کمرے سے سرداراں کی غرّاتی ہوئی آواز سُنائی دی "کیا بات ہے؟"

وہ نفرت سے بولا "میں کسی کُتیا کا بھونکنا پسند نہیں کرتا۔ رعونہ کو بتاؤ عالی جناب کا فون ہے۔"

اس نے انٹرکام کے بٹن کو آف کر دیا۔ پھر ریسیور کان سے لگا کر سُننے لگا۔ دوسرے کمرے سے رعونہ جمائی لیتے ہوئے کہہ رہی تھی "اللہ، آپ کون ہیں؟"

"میں ہوں، عالی جناب، شاید تم سونے جا رہی تھیں۔"

دوسرے ہی لمحے رعونہ نے چہک کر کہا "آپ، آپ نے مجھے فون کیا ہے۔ اللہ میری نیند ہی اُڑ گئی۔ آپ یقین کریں جب سے آئی ہوں، رہ رہ کر فون کی طرف دیکھ رہی ہوں۔"

عالی جناب نے کہا "میں کبھی خود ریسیور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل نہیں کرتا۔ پہلے سیکرٹری بات کرتا ہے، اس کے بعد مجھ سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔ پہلی بار میں براہِ راست ریسیور اٹھا کر تم سے گفتگو کر رہا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمارے درمیان تمہارا سیکرٹری بھی نہ رہے۔ میں جب بھی رِنگ کروں، تمہاری ہی آواز سنائی دے۔"

وہ انجان بن کر بولی "آخر میرے سیکرٹری کے ذریعے رابطہ قائم کرنے میں کیا قباحت ہے؟"

"ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں یہاں کی اہم شخصیتوں میں سے ایک ہوں۔ میری ذرا ذرا سی بات کو اخبار والے لے اُڑتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارا اسکینڈل بنے اور میری شخصیت مسخ ہو جائے۔"

"اچھا سمجھ گئی۔ آئندہ یہی ہو سکتا ہے کہ... مجھے پہلے بتا دیں کہ کب فون کریں گے۔ جو وقت مقرر ہو گا، میں سیکرٹری

سے کہہ دوں گی، اس وقت آنے والا کوئی بھی فون وہ ریسیو نہ کرے‘ میں ریسیور اٹھاؤں گی۔“

رعونہ کے سیکرٹری نے آہستگی سے اپنا ریسیور رکھ دیا۔ وہاں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا پھر سوٹ کیس کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالا۔ مائکل شوف سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہی دونوں کے درمیان کوڈ ورڈز کے ذریعے تعارف حاصل ہوا پھر مائکل شوف نے پوچھا ــــ ”آج کی پارٹی کا کیا رہا؟“

”ہم کامیاب رہے۔ عالی جناب ہماری رعونہ کا اسیر ہوگیا ہے۔“

”صرف اسیری سے کچھ نہیں ہوتا اُسے دیوانہ بن جانا چاہیے۔“

”میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ رعونہ اس سے رُخصت ہو کر یہاں آئی ہے۔ مشکل سے چالیس منٹ گزرے ہیں۔ اس کے بعد عالی جناب نے پھر فون کیا ہے۔ میں نے چپکے سے اُن کی بات سُنی ہے۔ وہ رعونہ سے کہہ رہا ہے جب بھی وہ فون کرے تو ان کے درمیان ان کا کوئی سیکرٹری نہ ہو۔ براہِ راست گفتگو ہوا کرے۔ وہ بوڑھا پہلی ہی نظر میں چاروں شانے چت ہو چکا ہے۔ میں اس کامیابی کی خوشخبری سنانے کے علاوہ کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔“

”کیا ضروری بات ہے؟“

”ہاں، یہ سرداراں میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھے چیلنج کیا ہے کہ مجھے اپاہج بنا دے گی۔ میں رعونہ کے سلسلے میں کچھ بولتا ہوں تو وہ کتیا کی طرح غرّانے لگتی ہے۔“

”سرداراں کو ہر حال میں برداشت کرو۔“

”اس میں ایسی کون سی خوبی ہے۔ وہ جاہل ہے۔ بدتمیز ہے، تہذیب سے اُس کا واسطہ نہیں ہے۔ اگر وہ لڑنے میں کچھ زیادہ ہی تیزی دکھاتی ہے تو میں اس سے زیادہ تیزی دکھا سکتا ہوں۔“

”ہم جانتے ہیں، تم کسی سے کم نہیں ہو۔ ہمارے ٹریننگ سینٹر میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، لیکن ہم دو باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر سرداراں کو رعونہ کے ساتھ رکھتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ عورت کا حُسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ رعونہ کی جو خاصیت، دُنیا کو اس کی طرف کھینچتی ہے‘ وہ یہ کہ شادی کی رات ہی وہ بیوہ ہوگئی تھی۔ یہ بات ایسی ہے کہ دل پھینک حضرات اسے دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں۔“

سیکرٹری نے کہا ”میں ان نفسیاتی حربوں کو سمجھتا ہوں۔ میں صرف سرداراں کی بات کر رہا ہوں۔“

”جہاں تک سرداراں کا تعلق ہے تو تمھیں شہر لاہور کے مزاج کو نظر میں رکھنا ہوگا۔ یہاں بڑکیں اور گنڈا سے بھی ہیں۔ ایسے ماحول کے لیے سرداراں جیسی مرد مار عورت نہایت موزوں ہے۔ ہم تمھیں سمجھاتے ہیں، اس سے مخالفت مول نہ لو۔ اسے اپنے طور پر کام کرنے دو۔ تم اپنے طور پر ڈیوٹی انجام دیتے رہو۔“

”اگر مجھے اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے دوران اس کی طرف سے دشواریاں پیش آئیں گی، کوئی مداخلت ہوگی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”تم آپس میں لڑتے مرتے وقت صرف اتنا خیال رکھو کہ ہمارے مشن کو نقصان نہ پہنچے۔ ورنہ ہم نے ٹریننگ سینٹر میں یہ بات اچھی طرح سمجھا دی ہے کہ تم مرو گے تو تمھاری جگہ دوسرے آجایا کریں گے۔ دیٹس آل۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ دوسری طرف سرداراں نے کالے چرمی جوتے پہننے کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا ”میں باہر جا رہی ہوں۔ تم اس کمرے کا پچھلا دروازہ کھلا رکھنا۔ میں ابھی آجاؤں گی۔“

وہ باہر آگئی۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت تک سیکرٹری بھی آگیا تھا۔ اُسے غرّا کر دیکھ رہا تھا۔ سرداراں نے اُسے نظر انداز کیا اور باہر چلی گئی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس کے خیال کے مطابق وہ باہر گئی ہوگی۔ شاید گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دے گی اور جب آواز دور ہوتی جائے گی پھر وہ رعونہ کے پاس جائے گا۔

دیر ہوگئی، گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی نہیں دی۔ اس نے ڈرائنگ روم سے باہر آکر برآمدے میں کھڑے ہو کر دور تک نظریں دوڑائیں۔ گاڑی وہاں موجود تھی۔ سرداراں نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے سوچا، شاید وہ پیدل ہی کہیں گئی ہے۔ اتنی سی مہلت ہی کافی تھی۔ وہ پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ پھر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ رعونہ نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا اس نے کہا ”میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ سیکرٹری نے اندر آتے ہوئے کہا ”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تمھیں بہت چاہتا ہوں۔ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ سرداراں تم سے بدتمیزی کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، وہ تم پر زیادتی کرتی ہے اور تم اُسے برداشت کر لیتی ہو۔ آخر کیوں؟“

”تم جانتے ہو میں ٹریننگ سینٹر کے جس شعبے میں تھی،

وہاں یہی سکھایا جاتا ہے کہ مصلحت کے طور پر بڑے سے بڑا ظلم برداشت کر لو۔ مجھے کسی بھی مشن کے دوران ہنگامی حالت میں اپنے طور پر لائحۂ عمل ترتیب دینے اور پھر اس پر عمل کرنے کی ٹریننگ دی گئی ہے۔ لہٰذا میں سرداراں کو برداشت کر لیتی ہوں۔ تمھیں مشورہ دیتی ہوں‘ اپنے کام سے کام رکھو۔ خواہ مخواہ ہمارے لیے پریشان ہو کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔“

”انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ وہ ہر طرح کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس دوران اس کے اپنے جذبات ہوتے ہیں۔ میرے جذبات یہ ہیں کہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تم بھی مجھے پسند کرو لیکن تمھارے ساتھ کوئی زیادتی ہو یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔“

اچانک سرداراں کی آواز سنائی دی ”تمھارے لیے ناقابلِ برداشت ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

اس نے یکبارگی پلٹ کر دیکھا۔ جس دروازے سے وہ داخل ہوا تھا‘ اسی کے پردے کے پیچھے وہ کھڑی ہوئی تھی اور وہاں سے نکل کر سامنے آرہی تھی۔ سیکرٹری نے کہا۔ ”اچھا تم یہاں چھپی ہوئی تھیں۔ مجھے دھوکا دینے کا مقصد کیا ہے؟“

”مقصد یہ بتانا ہے کہ تم مجھے دھوکا دے کر رعونہ کے پاس آنا چاہتے تھے لیکن میرے سامنے تمھاری کوئی چال نہیں چلے گی۔“

وہ غصّے میں آگے بڑھتے ہوئے بولا ”تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔ ایک ہاتھ جماؤں گا تو چاروں شانے چت نظر آؤ گی۔“

اس نے ایک ہاتھ جمانا چاہا‘ سرداراں نے اُس کے حملے کو روک لیا اور جوابی حملہ کیا۔ سیکرٹری کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ آہنی پنجہ پہنے ہوئے تھی۔ ایک ہی حملے میں سیکرٹری کا چہرہ لہولہان ہوگیا تھا۔ اُس کے باوجود اُس نے مردانہ وار اس کے دوسرے حملے کو روکا پھر اُس کے منہ پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گئی۔ یہ سمجھ میں آگیا تھا کہ آہنی پنجے سے بچنے کے لیے اُسے دور ہی رہنا چاہیے۔ قریب آنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ جیسے ہی وہ پھر قریب آنا چاہتی تھی‘ اس نے فلائنگ کِک ماری۔ وہ پھر لڑکھڑا کر پیچھے گئی اور دیوار سے لگ گئی لیکن بڑی پھرتیلی تھی۔ فوراً وہاں سے اُچھل کر فلائنگ کک مارنے کے لیے اس کی طرف آئی، وہ بیٹھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوسری طرف فرش پر جا کر گر پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اُٹھتی، سیکرٹری نے اُسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ خاص طور پر اس کے دائیں ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا تاکہ وہ آہنی پنجہ استعمال نہ کر سکے۔

دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ سیکرٹری نے دل ہی دل میں تسلیم کیا، وہ دیکھنے میں عورت ہے لیکن مردوں کی طرح مقابلہ کرنا جانتی ہے۔ بڑی زور آور ہے۔ اسے زیادہ دیر تک قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

وہ دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچنے لگا۔ اُسی وقت سرداراں نے اپنے سیاہ چرمی جوتے کی نوک کو زور سے زمین پر مارا۔ ایڑی سے لانبی کیلیں نکل آئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے سیکرٹری کے حلق سے چیخ نکلی۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہوگیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے لنگڑا رہا تھا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کب اسے سنبھلنے کا موقع دے سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا آہنی پنجہ ٹھیک اس کے دل کی جگہ سینے کی طرف آیا اور پانچوں انگلیاں وہاں پیوست ہوگئیں۔

سیکرٹری کے دیدے پھیل گئے۔ خنجر ایک ہوتا ہے، ایک ہی نوک پیوست ہوتی ہے۔ وہاں لگ رہا تھا، پانچ خنجر بیک وقت دل میں پیوست ہوگئے ہوں۔ اس کے حلق سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ وہ کانپ رہا تھا، اپنے آپ کو چھڑانا چاہتا تھا لیکن تکلیف کی شدت سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

سرداراں دانت کچکچا رہی تھی۔ ہی، ہی، ہی کے سُر پر ہنس رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ کو اپنی طرف کھینچا۔ سیکرٹری کے سینے کی جگہ شگاف نظر آنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر پڑا۔ وہ چھت کی طرف منہ اٹھا کر قہقہے لگا رہی تھی، ثابت کر رہی تھی کہ مرد کا دل عورت کے پنجے میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے آہنی پنجے میں اُسے بھینچے ہوئے تھی اور اس میں سے رِستا ہوا لہو اس کے قہقہہ لگاتے ہوئے چہرے پر ٹپک رہا تھا۔

رعونت جہاں عرف رعونہ اطمینان سے چلتے ہوئے کمرے کے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم سے ٹیلی فون اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ پھر اُس دروازے کو بند کر دیا۔ بند کرنے کے بعد اُسے چابی سے لاک کیا۔ وہاں سے پلٹ کر اس نے ایک میز پر کرسی رکھی۔ پھر اُس پر چڑھ کر روشندان تک پہنچی۔ اس کے بعد چابی کو روشن دان کے باہر پھینک دیا۔

وہ وہاں سے اُتر کر ٹیلی فون کے پاس آئی۔ ریسیور

اٹھا کر عالی جناب کے نمبر ڈائل کیے۔ ذرا دیر میں ہی رابطہ قائم ہو گیا۔ اُس کے سیکرٹری کی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی " میں بیگم رعونت جہاں بول رہی ہوں۔ اپنے صاحب سے فوراً رابطہ قائم کراؤ۔"

فوراً رابطہ قائم ہو گیا۔ عالی جناب نے کہا "میں سو رہا تھا، مگر دیکھو تمہاری آواز سنتے ہی بیدار ہو گیا۔ تمہارے لیے ساری رات جاگ سکتا ہوں۔ ساری رات فون پر تمہاری آواز سن سکتا ہوں۔"

"جناب، یہ ایسی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے میں بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ مختصر الفاظ میں فوراً بیان کرو۔ میں ابھی تمہاری مدد کے لیے پہنچ جاؤں گا۔"

"جناب! آپ نے میری لیڈی باڈی گارڈ سرداراں کو دیکھا ہے؟"

"ہاں، دیکھا ہے۔"

"فرہاد علی تیمور اس کے دماغ پر چھا گیا ہے۔"

"کیا؟" دوسری طرف سے چونکنے والا لہجہ سنائی دیا۔ ویسے اب میرے لیے خیال خوانی کے دوران چونکنے کی بات نہیں رہی۔ میں سمجھ چکا تھا، میرے وطن میں جہاں جہاں جن علاقوں میں سازشوں کی ابتدا ہو رہی تھی، وہاں وہاں میرے نام کو، میری شخصیت کو تشویش کا باعث بنایا جا رہا تھا۔

رعونہ کہہ رہی تھی "ہاں فرہاد علی تیمور اس کے دماغ پر چھا گیا ہے۔ میں فون پر تفصیل سے بتا نہیں سکتی۔ آپ پولیس والوں کو لے کر فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ آپ کو زحمت اس لیے دے رہی ہوں کہ کسی کمرے میں تنہا بیٹھ کر آپ کو پوری داستان سناؤں گی۔ یہ ایسے راز کی بات ہے کہ میں کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔"

چونکہ عالی جناب پر بھروسہ کرنے کی بات تھی، وہ خوش ہو گیا۔ ایک نوجوان عورت ایک بوڑھے کو اپنا راز دار بنانے والی تھی۔ اس کی زندگی کا راز کیا ہے، عالی جناب کو اس کی پروا نہیں تھی۔ یہ کچھ کم نہیں تھا کہ وہ تنہا اُس کے ساتھ کمرے میں بیٹھے گا اور اُس کا راز دار بنا رہے گا۔ اس نے کہا "میں ابھی آ رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤں گا۔"

ریسیور رکھ دیا گیا۔ رعونہ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر سیکرٹری کے سوٹ کیس کو کھولا۔ پھر کپڑوں کی تہہ میں سے چھوٹے سے ٹرانسمیٹر کو نکال لیا۔ اُسے ایک اسکرو ڈرائیور کے ذریعے کھولا۔ کھولنے کے بعد اُس میں ایسی تبدیلیاں کیں جس کے بعد وہ بظاہر ریڈیو نظر آنے لگا۔ اس نے اسے میز کے اوپر رکھ دیا۔

اُسی وقت سرداراں کی آواز آئی "رعونہ، تم کہاں ہو؟"

وہ آواز دیتے ہوئے اُس بند کمرے کی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں سے جھانکتے ہوئے بولی "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"سنو سرداراں! عالی جناب سے میری بات ہو چکی ہے۔ ابھی پولیس والے آئیں گے اور تمہیں گرفتار کر کے لے جائیں گے۔"

وہ غرّا کر بولی "کیا بکواس کر رہی ہو۔ ہم لاش کو ٹھکانے لگا سکتے ہیں۔ کسی کو اس واردات کا علم نہیں ہو گا۔"

"لیکن ہمارے منصوبے کے مطابق اس واردات کا علم ہونا چاہیے۔"

"کیا تم مجھ سے بحث کرو گی؟ باہر آؤ۔"

"سرداراں! میری بات توجہ سے سنو۔ تم مانتی ہو کہ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تمہاری ہر زیادتی برداشت کرتی ہوں اور تم یہ بھی مانتی ہو کہ میں ایک پلان میکر ہوں۔ ہنگامی حالات میں اپنے طور پر لائحہ عمل ترتیب دے کر اس پر عمل کر سکتی ہوں اور تم لوگوں سے عمل کرا سکتی ہوں۔ اگر انکار کرو گی تو یہ مشن ناکام رہے گا۔"

"اتو کی پٹھی، کیا تم چاہتی ہو کہ مشن کو کامیاب بنانے کے لیے میں جیل چلی جاؤں۔ پھانسی کے تختے پر چڑھ جاؤں۔"

"میں تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچنے نہیں دوں گی۔ تم جیل جاؤ گی پھر وہاں سے رہا کرالی جاؤ گی۔ عالی جناب میری مٹھی میں ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "لیکن تمہاری پلاننگ کیا ہے؟ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

رعونہ نے کہا "وقت کم ہے، میری بات کو توجہ سے سنو اور اسی کے مطابق پولیس کے سامنے بیان دو۔ تمہارا بیان ہو گا کہ وقتاً فوقتاً تمہارے دماغ میں ایک اجنبی سی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ آواز کہتی ہے۔ میں باڈی گارڈ کی حیثیت سے کسی مرد کو برداشت نہ کروں۔ کسی کو رعونت جہاں کے قریب نہ جانے دوں۔ تم اس اجنبی آواز کو اپنا ہی خیال سمجھتی رہیں لیکن وہ سیکرٹری ہر دم میرے ساتھ رہتا تھا میرے ہر کام میں مداخلت کرتا رہتا تھا۔ تم سیکرٹری کو سمجھانا چاہتی تھیں لیکن دماغ میں یہی بات آ رہی تھی کہ اپنا سوٹ کیس

کھول کر آہنی پنجہ نکالنا چاہیے۔ تم کہہ رہی تھیں کہ تمہارے سوٹ کیس میں آہنی پنجہ نہیں ہے اور وہ آواز بضد تھی، کہہ رہی تھی، تمہارے سوٹ کیس میں ایک آہنی پنجہ رکھ دیا گیا ہے۔ لہٰذا فوراً انگلیوں پر چڑھاؤ۔ ورنہ وہ سیکرٹری، رعونہ کے بہت قریب ہوتا جائے گا۔"

سرداراں نے پوچھا "یہ کیا بکواس ہے!"

"یہ ٹیلی پیتھی ہے۔ پہلے بکواس نظر آتی ہے، پھر بکواس کرنے والوں کے دماغوں میں گھس کر انھیں بکواس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تمہارے دماغ میں بھی ٹیلی پیتھی کی لہریں تھیں۔ وہ تمہیں مجبور کر رہی تھیں اور تم بے بس ہو گئی تھیں بلکہ دماغی طور پر غائب ہو گئی تھیں۔ تم نے کیا کیا، کس طرح وہ آہنی پنجہ پہنا اور کس طرح میرے سیکرٹری پر قاتلانہ حملہ کیا، تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ جب تم ہوش و حواس میں آئیں تو تمہیں سیکرٹری کی لاش نظر آئی۔ تم نے اپنے آہنی پنجے کو اور اپنے چہرے کو خون آلود دیکھا۔ ابھی تم اسی حالت میں رہو گی۔"

اس نے گھور کر پوچھا "کیا یہ تمہاری بہت پہلے کی پلاننگ ہے؟ کیا تم یہی چاہتی تھیں کہ میں اور سیکرٹری آپس میں ٹکرا جائیں اور یہ ٹیلی پیتھی والا شوشہ چھوڑا جائے؟"

"ہرگز نہیں، ایسی کوئی پلاننگ نہیں تھی۔ مجھے ٹریننگ دی گئی ہے کہ جب بھی حالات کوئی نیا رُخ اختیار کریں تو مجھے اُسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔"

سرداراں شش و پنج میں تھی، کچھ سوچ رہی تھی۔ رعونہ نے کہا "دیکھو سرداراں! تم نے اپنے خاوند کو قتل کیا۔ ہم نے ایک غیر ملکی اسمگلر کو قتل کیا لیکن تمہارے خلاف جتنے ثبوت تھے وہ ٹی ٹی سینٹر والوں نے غائب کر دیے۔ کسی گواہ کو پیش ہونے کا موقع نہیں دیا۔ اس بار بھی یہی ہو گا۔ اگر تم میرے طریقۂ کار پر عمل نہیں کرو گی تو پچھلے تمام جرائم کا ثبوت ٹی ٹی سینٹر والے کسی وقت بھی پیش کر سکتے ہیں۔ تم انکار کر کے یہاں سے فرار ہو سکتی ہو لیکن کہیں نہ کہیں دھر لی جاؤ گی اور اپنے پچھلے جرائم اور دو قتل کے سلسلے میں تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔"

سرداراں نے اُسے گھور کر دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر کہا "تم بڑی محبت سے میری زیادتیاں برداشت کرتی تھیں۔ مجھ سے ہر معاملے میں شکست تسلیم کر لیتی تھیں اور مجھے برتری کا احساس دلاتی تھیں۔ لیکن تم تو آستین کا سانپ نکلیں۔"

"میں کیا کروں، ٹریننگ سینٹر میں آستین کا سانپ بننا ہی سکھایا گیا ہے۔ ویسے میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ بہت جلد تمہیں رہا کرا لوں گی۔"

گاڑیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد ایک آفیسر نے کہا "یہ رہی وہ عورت۔"

سرداراں اپنی انگلیوں سے آہنی خول اتار رہی تھی اور پولیس والوں کے سامنے پھینکتے ہوئے آہستگی سے کہہ رہی تھی "میں قسم کھا کر کہتی ہوں، میں نہیں جانتی یہ سب کیسے ہوا اور جو کچھ ہوا اس کے نتیجے میں آپ کے سامنے حاضر ہوں لیجیے، ہتھکڑیاں پہنا دیجیے۔"

اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ عالی جناب کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا "بیگم رعونت جہاں کہاں ہیں؟"

اُس نے کمرے سے آواز دی "میں یہاں ہوں۔"

"دروازہ کھولو۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ قانون کے محافظ تمہاری حفاظت کے لیے موجود ہیں۔"

"میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ میں نے اسے لاک کرنے کے بعد چابی کو اُدھر روشن دان کے باہر پھینک دیا۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ سرداراں جنون میں مبتلا ہوئی ہے۔ اگر وہ ٹیلی پیتھی جاننے والے میرے دماغ میں بھی پہنچ جائیں گے تو مجھے اس چابی سے دروازے کو کھولنے پر مجبور کریں گے۔ پھر سرداراں بھی مجھ پر وحشیانہ طور پر حملہ کرنے آئے گی۔ اس لیے میں نے فوراً ہی اُسے روشن دان کے باہر پھینک دیا۔ نہ میرے پاس چابی رہتی نہ مجھے ٹیلی پیتھی کے ذریعے دروازہ کھولنے پر مجبور کیا جاتا۔"

دو سپاہیوں کو باہر دوڑایا گیا تاکہ وہ روشن دان کے دوسری طرف چابی تلاش کریں۔ تھوڑی دیر بعد چابی مل گئی۔ دروازہ کھل گیا۔ عالی جناب نے اندر آتے ہی رعونہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا "ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ اس قاتلہ کو ہتھکڑی لگ چکی ہے۔ اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور مجھ سے باتیں کرو۔"

پھر اُس نے آفیسر سے کہا "تم قتل کے سلسلے میں اپنی کارروائی مکمل کرو، پھر یہاں آ جانا۔ میں بیگم رعونت جہاں کا بیان دلواؤں گا۔"

آفیسر چلا گیا۔ اس نے کہا "کسی اہم شخصیت کو قتل کر دیا جائے میں تب بھی وہاں نہیں جاتا۔ فون کے ذریعے تعزیت کر لیتا ہوں لیکن تمہارا معاملہ اور ہے۔ زندگی میں پہلی بار

تمھاری خاطر چلا آیا۔ مجھے ڈر ہے، کل اخبارات میں یہ اسکینڈل بن جائے گا۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔" آپ میرے لیے اتنی زحمتیں اٹھا رہے ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ کے قدموں میں جان دے دوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔" ارے یہ کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے تمھاری جان نہیں چاہیے۔" پھر اُس نے سرگوشی میں کہا۔ " صرف دل چاہیے۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔" میں بہت مغرور تھی۔ اپنے سامنے سب کو ہیچ سمجھتی تھی۔ جانے کیوں آپ کے سامنے آ کر خود کو بہت چھوٹی محسوس کرتی ہوں۔"

وہ اسے خوش کر رہی تھی اور وہ خوش ہو رہا تھا۔ غبارے کی طرح پھولتا جا رہا تھا۔ پھر اُس نے پوچھا۔" یہ سب کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟"

" آپ اگر اجازت دیں تو میں دروازے کو بند کر دوں؟ میں نہیں چاہتی کوئی ہماری باتیں سُنے۔"

" تم اطمینان رکھو۔ یہاں میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں رکھے گا۔ دروازہ بند ہو جائے گا تو لوگ باتیں بنائیں گے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔" آپ درُست فرماتے ہیں۔ مجھ پر تو یہ بات صادق آتی ہے کہ اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے، جس نے ڈالی، بُری نظر ڈالی لیکن آپ محبت کی نظر ڈال رہے ہیں۔ اس کا انجام بھی بُرا لگ رہا ہے۔"

عالی جناب نے کہا۔" پتا نہیں، تمھیں دیکھتے ہی مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں آدمی دیوانہ بن کر کہتا ہے۔ بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اوہ گاڈ، یہ کیسی دیوانگی ہے۔ ہم کام کی باتیں کرتے کرتے پھر اپنی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اپنی باتیں کرنے کے لیے ابھی زندگی پڑی ہے۔ تم بتاؤ، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

" جناب! آپ عملی آدمی ہیں۔ شاید میری بات کا یقین نہ کریں۔ ہمارے پیچھے کوئی بلا پڑ گئی ہے۔ میرے دماغ میں اس کی آواز آتی ہے۔ وہ آواز مردانہ ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔" رعونہ! تم ایک سکہ نہیں ہو جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پہنچتا ہے۔ تم ایک قیمتی ہیرا ہو جو کسی ایک ہاتھ میں رہتا ہے۔ میں مجبور ہوں۔ تم سے ہزاروں میل دور رہتا ہوں۔ ورنہ تمھیں ہمیشہ کے لیے اپنا لیتا۔ لیکن اپنی مجبوریوں کے باوجود یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی تمھیں کھلونا سمجھ کر قریب آئے۔ اگر کوئی آئے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

عالی جناب نے کہا۔" یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

" میں جانتی ہوں، آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن ابھی میری باڈی گارڈ سرداراں اس سیکرٹری پر حملہ کرتے ہوئے مردانہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ تم رعونہ کو دل میں بساتے تھے۔ اس سے محبت کا اظہار کر کے اسے اپنا بنانا چاہتے تھے۔ میں تمھیں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ وہ اسی طرح چیخ رہی تھی۔ نہیں میں غلط کہہ رہی ہوں۔ سرداراں کے ذریعے وہ چیخ رہا تھا، جو اکثر میرے دماغ میں بولتا ہے اور اُسی نے سرداراں کو جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا۔ یہ تم نے کیا کر دیا ہے تو وہ لاجواب ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس نے کیا کیا۔ اس نے اتنا ہی کہا کہ میں دماغی طور پر غیر حاضر تھی۔ جب ہوش و حواس میں آئی تو اپنے سامنے سیکرٹری کو مُردہ پایا۔"

عالی جناب نے پوچھا۔" کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمھارے دماغ میں جو بولتا ہے وہ تمھارے قریب کسی کو برداشت نہیں کر سکتا؟"

" ہاں، وہ کہتا ہے کہ تمھارے پاس وہی آئے گا، جو تمھیں اپنی شریکِ حیات بنائے گا۔ ورنہ کوئی بھی تمھارے قریب نہیں آئے گا۔"

عالی جناب نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ " اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ پر قاتلانہ حملہ نہیں کرے گا یا کرائے گا۔"

رعونہ نے اچانک ہی اپنی جگہ سے اُٹھ کر عالی جناب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور بولی۔" میرا دل کہتا ہے، آپ مجھے باعزت نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور کبھی مجھے حاصل کرنا چاہیں گے تو عزت اور شرافت سے اپنائیں گے۔"

اس نے کن اکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔" پلیز، اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو، میرا مطلب ہے کہ میرے دل میں تمھاری عزت ہے۔ میں چاہتا ہوں، سپاہیوں کی نظروں میں بھی عزت رہے۔ میری محبت اور خلوص کا یہ ثبوت ہے کہ جو تمھارے دماغ میں بولتا ہے وہ میری مخالفت نہیں کر رہا ہے۔ میں تمھیں اپناؤں گا تو پوری طرح شرافت اور عزت سے۔"

وہ اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ آفیسر نے دروازے پر پہنچ کر ادب سے کہا۔" جناب! وہ عورت بکواس کر رہی ہے۔ ایسا

بیان دے رہی ہے جس پر کوئی یقین نہیں کر سکتا۔"

عالی جناب نے پوچھا۔" وہ کیا کہہ رہی ہے؟"

آفیسر نے وہی بات دُہرائی جو ابھی رعونہ کہہ چکی تھی اور سرداراں کو سمجھا چکی تھی۔ عالی جناب نے کہا۔" اندر آ جاؤ اور بیگم رعونت جہاں کا بیان لکھ لو لیکن ان کے بیان میں بھی وہی بات ملے گی۔"

آفیسر نے اندر آ کر پوچھا۔" جناب! کیا آپ یہ باتیں تسلیم کر سکتے ہیں؟"

" پہلے بیان لکھ لو، اس کے بعد تم سے بات کروں گا۔"

آفیسر بیٹھ گیا۔ رعونہ بولنے لگی، وہ لکھنے لگا لیکن اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ اس بیان کو بکواس سمجھ رہا ہے۔ یہ کارروائی مکمل ہونے کے بعد عالی جناب نے آفیسر سے پوچھا۔" کیا اب بھی تم اسے بکواس سمجھ رہے ہو؟"

" جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں آپ کے سامنے کیا کہہ سکتا ہوں۔"

" تم تھوڑی دیر کے لیے فرض کرو، دونوں عورتوں کے بیانات درُست ہیں۔ ایسا ہماری دُنیا میں ہو سکتا ہے۔ جب تم فرض کرو گے کہ ایسا ہو سکتا ہے تو تم بے اختیار ٹیلی پیتھی کے متعلق سوچو گے اور یقین کرو گے کہ ہماری دُنیا میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان دوسرے انسان کی سوچ کو پڑھ کر بڑے عجیب و غریب تماشے کرتا ہے۔ اس کی رُوداد ہم سُنتے آئے ہیں۔"

" لیکن جناب! ٹیلی پیتھی جاننے والے ہماری دنیا میں صرف دو ہیں، جن کے متعلق ہم جانتے ہیں اور وہ ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔"

" جب تم نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ایسا ہو سکتا ہے تو پھر تم دو کے عدد کو اپنے ذہن سے نکال دو۔ کوئی تیسرا بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔" جی ہاں، دُنیا کا کوئی بھی علم زیادہ عرصے تک محدود نہیں رہ سکتا۔ پہلے ایک ہی آدمی سیکھتا ہے پھر ہزاروں سیکھنے لگتے ہیں۔ آپ درُست فرماتے ہیں، ٹیلی پیتھی جاننے والا کوئی تیسرا اور چوتھا بھی ہو سکتا ہے۔"

رعونہ نے کہا۔" میری باڈی گارڈ میری حفاظت کے لیے ہے۔ اُس نے میری حفاظت کی تھی لیکن جنونی انداز میں کی تھی۔ ایسا جنون اُس پر کبھی طاری نہیں ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، ہم اسے عدالت میں کیسے ثابت کریں گے۔ یہ بے چاری جنونی ہو گئی تھی۔ یہ تو بے قصور ہے۔ قاتلہ یہ نہیں ہے، قاتل وہ ہے جو اس کے دماغ میں رہ کر اپنا کام کر چکا ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ ایک چیخ مار کر کُرسی سمیت دوسری طرف اُلٹ گئی۔ آفیسر اور عالی جناب نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔" کیا ہو گیا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟"

رعونہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔" نہیں، نہیں میں تمھارے خلاف نہیں بولوں گی لیکن تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تم نے میری باڈی گارڈ کو قاتلہ بنا دیا۔ وہ قانون کی نظروں میں مجرم بن چکی ہے۔"

اچانک اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ وہ مردانہ آواز میں قہقہے لگانے لگی۔ میں خیال خوانی کے ذریعے اس کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ غضب کی اداکارہ تھی۔ ابتدا میں نازک، معصوم اور سیدھی سادی عورت نظر آ رہی تھی۔ اب اپنے اندر سے پَر پُرزے نکال رہی تھی۔ وہ مردانہ آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے بولی۔" رعونہ! فکر نہ کرو۔ تمھاری باڈی گارڈ کو اوّل تو میں عدالت تک پہنچنے نہیں دوں گا اور اگر یہ پہنچ گئی تو ثابت کر دوں گا کہ یہ قتل کرتے وقت دماغی طور پر غیر حاضر تھی۔"

یہ کہتے ہی وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی، جیسے اُس پر بوجھ پڑ رہا ہو، جیسے کوئی اُسے تکلیف پہنچا رہا ہو۔ آفیسر نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔" مسٹر! اگر آپ ٹیلی پیتھی کے ذریعے بول رہے ہیں تو اتنا بتا دیجیے کیا آپ فرہاد صاحب ہیں؟"

رعونہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا تھا۔ پھر وہ حلق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔" پانی، پلیز مجھے تھوڑا سا پانی پلوائیے۔"

فوراً ہی پانی منگوایا گیا۔ اس نے دو گھونٹ پینے کے بعد گلاس واپس کر دیا۔ عالی جناب نے اسے تھام کر فرش پر سے اٹھایا اور کُرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بولی۔" میں تنہائی چاہتی ہوں۔"

آفیسر باہر جانے لگا۔ عالی جناب بھی جانا چاہتا تھا، رعونہ نے ہولے سے اس کو اشارہ کیا۔ وہ خوش ہو کر رُک گیا۔ اس کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔" میں جانتا ہوں، تم پریشان ہو۔ جو کچھ تمھارے ساتھ ہو رہا ہے، میرے لیے اگرچہ عجیب ہے، لیکن نئی بات نہیں ہے۔ میں ایسے قصّے بہت سُن چکا ہوں۔ تم اطمینان رکھو، آئندہ جب بھی وہ آواز تمھارے دماغ میں سنائی دے تو اس سے التجا کرو کہ تمھارا پیچھا چھوڑ دے۔ تمھاری باڈی گارڈ کو بے قصور ثابت کر دے۔ میں تمھیں ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔

ابھی اپنے دل میں رکھنا۔ کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا۔ اگر تمھاری زندگی بچانے کے لیے اور اس پہلی پیتھی والے سے نجات دلانے کے لیے مجھے تم سے [illegible] کرنی پڑیں تو میں انکار نہیں کروں گا لیکن مجھے سوچنے [illegible] کا موقع دو۔

مُرغا پھنس گیا تھا۔ میں اپنی جگہ دماغی طور پر واپس آگیا۔

میں سیونتھ ڈے اسپتال کے ایک خصوصی کمرے کے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ بڑے آرام سے خیال خوانی کر رہا تھا۔ وقت اور ماحول کی بات ہوتی ہے۔ اسی ماحول کے مطابق آدمی کی اگلی پچھلی سوچ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں تو میں بارہا آرام سے لیٹ کر اور بیٹھ کر خیال خوانی کرتا رہا ہوں لیکن اسپتال کے بستر پر خواہ مخواہ ہی خود کو مریض محسوس کرنے لگا تھا۔

بڑے اسپتالوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔ پہلے تو وہاں داخلہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر کسی اسپیشل کمرے میں داخل ہو جائیں تو کسی خاص مرض کے خاص ماہر ڈاکٹر کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ دوسرے دن میرا مینٹل چیک اپ ہوگا۔ یہ بات ماتخل شوف اور گلزاری بیگم وغیرہ کے حق میں تھی۔ انھیں جتنا زیادہ وقت ملتا وہ اتنی ہی آسانی سے ہمارے ملک کے نامور سائنس داں ڈاکٹر عبدالباقی کو اپنے مطلب کے مطابق ٹریپ کرسکتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالباقی نے اچھی خاصی عمر گزار لینے کے بعد بھی شادی نہیں کی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایسے لوگ جس موضوع میں دلچسپی لیتے ہیں اور جس میں کمال حاصل کرتے رہتے ہیں، اسی موضوع سے گویا شادی کرلیتے ہیں یا اسی کو اپنی دُشمن سمجھتے ہیں اور اسی کو فتح کرتے رہتے ہیں۔

لیکن انسانوں کی یہ دُنیا عورت کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہوسکتی۔ جو لوگ خشک مزاج ہوتے ہیں اور خشک موضوعات پر ساری عمر ریسرچ کرتے رہتے ہیں، وہ بھی زندگی کے کسی ایسے موڑ پر ضرور پہنچتے ہیں جہاں انہیں تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس بستر علالت پر زیادہ ہوتا ہے۔ اسپتال میں پہنچ کر ایک نرس کی مسکراہٹ انھیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ہماری دنیا میں خشک موضوعات کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ وہ "کچھ" عورت کا روپ ہے۔ اس کی ایک مسکراہٹ ہے جو درد کی دوا بن جاتی ہے۔ دوست احباب تو خیریت پوچھتے ہی رہتے ہیں لیکن اُن کی ویران زندگی میں اچانک کوئی عورت آجائے اور اپنی مترنم آواز میں اتنا ہی پوچھ لے۔ "اللہ! آپ کیسے ہیں؟"

بس یہی ایک فقرہ اور اس فقرے کی ادائیگی اور حسن کلام، ایک خشک مزاج دانشور کا مزاج بدل دیتا ہے۔ میں گلزاری بیگم کے ساتھ اس اسپتال کے کمرے میں آیا تو اس نے پڑوس کے کمرے میں جانے کا ایک بہانہ ڈھونڈ لیا۔ ڈاکٹر عبدالباقی کے کمرے میں پہنچ کر بولی۔ "معاف کیجیے گا، مجھے یوں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میرے شوہر پاس والے کمرے میں علیل ہیں۔ میں انھیں سیب کھلانا چاہتی ہوں لیکن چاقو نہیں ہے۔ آپ کے پاس ہو تو سیب کاٹنے کے بعد واپس کردوں گی۔"

ڈاکٹر نے سرہانے کی میز پر سے چاقو اٹھا کر اُسے دیا۔ اس نے ادھر [illegible] دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ یہاں تنہا ہیں کوئی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا یا والی . . . ؟"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ ویسے میرے دوست احباب ہیں۔ بے شمار شاگرد ہیں۔ وہ وزیٹنگ آورز میں ملاقات کرتے ہیں۔"

گلزاری بیگم نے کہا۔ "وزیٹنگ آورز سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی تو ضرورت پڑتی ہے۔ ٹھہریے میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ واپس میرے کمرے میں آئی، چاقو رکھا اور پھر چلی گئی۔ میں اپنی خیال خوانی میں مصروف رہا۔ صبح سے شام تک مجھے اتنا وقت نہیں ملا کہ گلزاری بیگم کے متعلق معلوم کرسکتا۔ جب رات کو رعونت جہاں کے پاس سے واپس آیا اور خیال خوانی ختم کی تب گلزاری بیگم کا خیال آیا۔

میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ صبح عبدالباقی کے پاس گئی تھی پھر وزیٹنگ آورز میں میرے پاس چلی آئی تھی کیونکہ وہاں ڈاکٹر کے شاگرد اور دوست احباب آنے لگے تھے۔ بعد میں پھر گئی تھی۔ اس وقت رات کے تقریباً دو بج رہے تھے اور وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی اور ڈاکٹر کا یہ حال تھا کہ نیند اُڑ گئی تھی۔ وہ اُس کی خوبصورت باتوں سے مسحور ہوتا جارہا تھا۔ عورت بھی خوب ہے جس طرح زندگی کے لیے موت لازمی ہے، اسی طرح مرد کے لیے (خواہ وہ کتنا ہی خشک مزاج ہو) عورت لازمی ہے۔ اگر وہ اس سے کتراتا ہے، فرار حاصل کرتا ہے تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے زندگی موت سے فرار حاصل کر رہی ہو۔ آخر میں پتا چلتا ہے، موت نے اُسے جکڑ لیا ہے۔ آہ، بے چارہ ڈاکٹر عبدالباقی۔

عورتیں خشک مزاج ہوں یا نہ ہوں لیکن مغرور اور تنک مزاج ضرور ہوتی ہیں۔ وہ اپنے حواس پر مردوں کو مسلط ہونے کی کب اجازت دیں گی، اپنی ناک پر مکھی تک

بیٹھنے نہیں دیتیں۔ گلزاری بھی ایسی ہی تھی۔ حصولِ علم میں کچھ اس طرح مصروف رہی کہ اس نے کبھی کسی مرد ساتھی کے متعلق سوچا ہی نہیں لیکن ٹریننگ سینٹر میں اسے مرد حضرات کو ٹریپ کرنے کے داؤ پیچ سکھائے گئے تھے۔ ایسی ہی ٹریننگ کے دوران اس کے مزاج میں ایک ذرا لچک پیدا ہوگئی تھی۔ اب بھی اس نے شادی کے متعلق نہ تو سوچا تھا اور نہ ہی کسی مرد سے متاثر ہوئی اور نہ ہونا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا، یہ سراسر ناانصافی ہے۔ وہ ڈاکٹر عبدالباقی کے اندر عشق کی آگ بھڑکانے گئی ہے اور خود کو اس آگ سے بچائے رکھنا چاہتی ہے۔ ایسا کبھی ہوا ہے کہ کوئی آگ جلائے، اُسے بھڑکائے اور اُس کی آنچ اُسے خود نہ لگے! ایسی آنچ لگتی ضرور ہے لیکن آنچ کھانے والا اپنے دامن کو جلنے سے بچائے رہتا ہے۔

اس نے حیرانی سے سوچا۔ "یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟"

میں نے اس کی سوچ میں پوچھا۔ "کیا غلط سوچ رہی ہو؟ آخر ایک نہ ایک دن کسی کے لیے سوچنا ہی ہے۔ کب تک یونہی رہوں گی۔ عورت ایک پھول ہے اور مرد اس کی خوشبو۔ جب تک کوئی خوشبو مجھ میں پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک میں کاغذ کا پھول رہوں گی۔"

وہ انہی خیالات کے زیر اثر پریشان ہوکر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے پھر اُس کی سوچ میں کہا۔ "کیا کشادہ پیشانی ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ جب یہ مجھے دیکھتا ہے تو میں نظریں چراتی ہوں۔ اگر ایک بار نظر بھر کے دیکھوں تو اس کی آنکھیں میرے دل میں اُتر جائیں گی۔"

اسی وقت میں نے ڈاکٹر کو بے اختیار اُس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ گلزاری نظریں جھکانا چاہتی تھی، اس وقت تک میں ڈاکٹر کے دماغ سے نکل کر اُس کے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ پھر وہ کیسے نظریں جھکا سکتی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، کیا یہ ڈاکٹر کی نظروں کی مقناطیسیت ہے جو اس کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے جارہی ہے؟

اُس نے نظریں جھکالیں۔ "نہیں، میں نہیں دیکھوں گی۔"

میں نے اُسے نظریں جھکانے تو دیا لیکن شرمانے پر مجبور کردیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "یہ مجھے کیا ہوتا جارہا ہے۔ کیا میں واقعی ڈاکٹر سے متاثر ہو رہی ہوں؟ کھیل کھیلتے کھیلتے سنجیدہ ہو رہی ہوں۔ مجھے اپنے آپ میں رہنا چاہیے۔"

میں نے اس کی سوچ میں پوچھا۔ "کیا ڈاکٹر ابھی تک مجھے دیکھ رہا ہے؟"

اس سوال کے ساتھ ہی اس کی نظریں بے اختیار اُٹھ گئیں۔ پھر نظریں چار ہوئیں۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "بائی گاڈ گلزاری! تم میری زندگی کی پہلی عورت ہو جس نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں آج تک یہی سمجھتا تھا، دل خوف سے دھڑکتا ہے یا خوشی سے لیکن آج پتا چلا، یہ محبت سے بھی دھڑکتا ہے ——— میرا دل بے اختیار مچل رہا ہے۔ اگرچہ دل کی زبان نہیں ہوتی لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ دھڑک دھڑک کر تمھیں ہی پکار رہا ہے۔"

گلزاری نے محسوس کیا، اس کا اپنا دل بھی کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگا ہے۔

ڈاکٹر عبدالباقی نے کہا۔ "میں وہ ڈاکٹر نہیں ہوں جو اسٹیتھسکوپ سے مریضوں کے دل کی دھڑکنیں سنتا ہے۔ کیا تم نے کبھی دھڑکنیں سنی ہیں؟"

اس نے ہولے سے انکار میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "میری دھڑکنوں کو سُن لو۔"

میں نے اس کے دماغ کو پوری طرح اپنے قبضے میں نہیں رکھا تھا۔ وہ آزاد تھی۔ اس کی سمجھ میں یہی آرہا تھا کہ اس کا دل اور دماغ اپنے قابو میں نہیں ہے۔ وہ پھول ہے اور خوشبو کو اپنانا چاہتی ہے۔ یہ فطری امر ہے اور اس سے انکار کرنے کے باوجود وہ انکار نہیں کرسکتی۔

کوئی اپنے دماغ کے خلاف حرکت نہیں کرسکتا۔ دماغ کی ہر بات کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً ہر شخص سگریٹ نہیں پیتا لیکن کبھی اس کے دماغ میں یہ خواہش پیدا ہو اور وہ خواہش روز بروز بڑھتی جائے تو ایک آدھ کش ضرور لگالے گا۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ سگریٹ نوشی کرنے لگے گا۔ یہی چیز اس کی عادت بن جاتی ہے۔ گویا کہ دماغ پہلی بار جو تحریک پیدا کرتا ہے وہی تحریک رفتہ رفتہ انسان کی عادت بن جاتی ہے۔ گلزاری کو کبھی عشق کا نشہ نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ٹیلی پیتھی نے ایک ہلکی سی تحریک پیدا کی تھی۔ یہ تحریک رفتہ رفتہ اس کی تقدیر بنتی چلی گئی۔

مرد اور عورت دونوں ہی شہ زور ہوتے ہیں۔ پختہ ارادوں کے مالک بھی ہوتے ہیں۔ وہ بڑی مضبوطی سے پاؤں جما کر زمین پر کھڑے ہوتے ہیں لیکن پاؤں تلے سے زمین ہی سرک جائے تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ اگر وہ دریا کنارے بڑے یقین سے اپنا توازن قائم رکھے کھڑے ہوں اور اچانک پاؤں

پھسل جائے تو یہ ان کا قصور نہیں۔ یہ تو حالات نے انھیں پھسلنے پر مجبور کیا اور دریا کی گہرائی میں پہنچا دیا۔

یہ زیادتی ہوتی اگر وہ ڈاکٹر عبدالباقی سے عشق کا کھیل کھیلتی، اسے بیوقوف بناتی۔ اس سے اپنی ضرورت کے مطابق معلومات حاصل کرتی، پھر اسے ٹھینگا دکھا کر چلی جاتی۔

میں چاہتا تھا، دونوں کا بھلا ہو۔ اسے معلومات حاصل ہو جائیں اور ڈاکٹر بھی صرف سائنسداں کی حیثیت سے مستند نہ ہو بلکہ محبت کا سبق بھی پوری طرح پڑھ لے۔

صبح پانچ بجے میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ اندر آئی۔ پھر مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ وہ اس خیال سے گھبرا گئی کہ میں کہیں رات بھر دوسرے کمرے میں رہنے کی وجہ نہ دریافت کروں جبکہ وہ اپنے مشن پر آئی تھی۔ وہ ایک رات تو کیا ساری زندگی بھی میرے کمرے سے باہر رہتی، تب بھی میں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔

میں بستر کے سرہانے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر چھت کی طرف دیکھ کر گنگنا رہا تھا۔

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے

اس کی بدحواسی قابلِ دید تھی۔ اگرچہ میں اسے دیکھ نہیں رہا تھا مگر سوچ کو پڑھ کر دلی کیفیات کو سمجھ سکتا تھا۔ میرے اس طرح گنگنانے پر وہ سخت پریشان ہو گئی۔ اس کے دل میں چور تھا اور وہ چور کہہ رہا تھا، کیا مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ کیا میں نے چھپ کر اسے دیکھا ہے۔ وہ بے چاری پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ گیت کیوں گنگنا رہا ہوں۔ یہ تو ایک پرانا فلمی گیت تھا۔ بہت ہی مقبول گیت۔ اسے کوئی بھی گنگنا سکتا تھا، میں بھی گنگنا رہا تھا۔

وہ کرسی گھما کر میری طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی تاکہ اس کا چہرہ کسی طرح کی چغلی نہ کھائے۔ وہ اپنی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "کام بن گیا؟"

وہ ایک دم سے چونک گئی۔ ہاتھوں سے باندھا جانے والا جوڑا کھل گیا۔ میں نے پوچھا "تم کچھ پریشان ہو گھبرائی ہوئی سی ہو۔ کیا تمھیں ناکامی ہوئی ہے؟"

وہ سنبھل کر، ٹھہر ٹھہر کر بولی "ڈاکٹر کوئی اناڑی آدمی نہیں ہے۔ ذہین ہے، دنیا جہاں کے تجربات رکھتا ہے تبھی اتنا مشہور سائنسداں کہلاتا ہے۔ کیا وہ اتنی آسانی سے ہمارے دام میں آ جائے گا؟"

"ہمارے نہیں، تمھارے۔ یہ کام تمھارا ہے۔ میں نے تو سنا ہے، ایک حسین عورت نے ارسطو جیسے فلسفی کی گردن میں گھوڑے کی لگام ڈال دی تھی اور تم ایک معمولی سائنس داں کو اب تک . . ."

وہ میری بات کاٹ کر بے اختیار بولنے لگی "وہ معمولی نہیں ہیں۔ بہت عظیم سائنسداں ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ اتنے اچھے ہیں کہ دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں۔"

"کس کے دل و دماغ پر؟"

وہ چونک گئی۔ یکبارگی سر گھما کر مجھے دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ بے اختیار بولتی جا رہی ہے۔ اچانک ہی وہ غصہ دکھاتے ہوئے بولی "میں ڈاکٹر سے معلومات حاصل کروں یا نہ کروں، تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟ میں مائخل شوف کے سامنے جواب دہ ہوں۔"

"چلو یہی سہی۔ میں مائخل شوف کو اپنی رپورٹ پیش کروں گا کہ میں صبح پانچ بجے تک تنہا اپنے کمرے میں رہا اور کتنے دن یہاں رہنا ہے مجھے۔ میں خواہ مخواہ مریض بن کر نہیں رہ سکتا۔"

یہ کہتے ہی میں نے اس کی سوچ میں سوال کیا "یہ یہاں سے جلد جانا چاہتا ہے۔ یہ جائے گا تو مجھے بھی ڈاکٹر سے دور جانا ہوگا۔ کیا میرے نصیب میں اتنی مختصر سی ملاقات لکھی ہے؟"

اس کے بعد میں نے خود اسے سوچنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اور وہ تسلسل سے سوچنے لگی "ہائے، ڈاکٹر نے تو مجھے یہ سوچنے ہی نہیں دیا کہ یہ اسپتال نہیں، مسافر خانہ ہے۔ ہم مسافروں کی طرح آئے ہیں۔ پھر اپنی اپنی منزلوں کی طرف چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر کہیں ہوگا، میں کہیں۔ یہ، یہ میں نے کیا کیا مجھے تو پہلے ساری زندگی ساتھ رہنے کا معاہدہ کرنا چاہیے تھا محبّت میں زبانی معاہدے ہوتے ہیں۔ میں یہ بھی نہ کر سکی توبہ ہے، کیسی دیوانی ہو گئی تھی۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "اب تو صرف سوچنا یہ ہے کہ میں بابر کو کس طرح یہاں زیادہ سے زیادہ رہنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔"

وہ اچانک ہی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا "ابھی تو غصہ دکھا رہی تھیں۔"

وہ کرسی کھینچ کر میرے پاس آ گئی۔ پھر اس پر بیٹھتے ہوئے بولی "بات یہ ہے کہ ڈاکٹر بہت گہرا ہے۔ اسے شیشے میں اتارنے میں کچھ دن لگیں گے۔"

"میں کچھ دنوں تک تو رہ نہیں سکتا۔ کل میرا معائنہ ہوگا، اس کے بعد یہاں سے جاؤں گا۔"

"اگر مائخل شوف تمھیں جانے کی اجازت نہ دے تو؟"

"کیا تم نے ڈاکٹر سے پوچھا ہے کہ وہ یہاں کتنے دنوں تک رہے گا؟"

"مجھے خیال ہی نہیں رہا۔"

"فرض کرو، اسے کل صبح اسپتال سے چھٹی مل جائے تو؟"

وہ پریشان ہو کر بولی "نہیں، اتنی جلدی چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں انھیں نہیں جانے دوں گی۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ کبھی نہیں جا سکتے۔"

میں تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر گڑبڑا گئی۔ جلدی سے سنبھل کر بولی "میرا مطلب ہے، میں ان کا پیچھا کروں گی وہ یہاں سے اسلام آباد جائیں گے۔ میں بھی جاؤں گی۔"

میں نے پوچھا "تم کیسے جاؤ گی۔ تم یہاں میری بیوی کی حیثیت سے ہو۔ ڈاکٹر سے کیا کہو گی؟"

"یہی کہ یہاں کے ڈاکٹر نے اسلام آباد جا کر علاج کرانے کے لیے کہا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں آمنہ کو چھوڑ کر تمھارے شوہر کی حیثیت سے اسلام آباد جاؤں؟"

"تمھیں اعتراض ہے تو ہم آمنہ کو بھی لے جائیں گے۔ مجھے تمھاری بیوی بننے کا شوق نہیں ہے۔"

"مجھے بھی تمھارا شوہر بن کر پچھتانے کا شوق نہیں ہے۔ یہ کوئی بات ہے کہ خواہ مخواہ بیوی بن کر میرے کمرے میں صبح پانچ بجے تک رہو۔"

"میں تمھارے نہیں، ڈاکٹر کے کمرے میں تھی۔"

یہ حقیقت اس نے بے اختیار بیان کر دی۔ پھر ایکدم سے چپ ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے کہا "اچھا، تو تم ڈاکٹر کے کمرے میں تھیں۔ تعجب ہے، وہ شخص تم سے اتنا گھل مل گیا ہے۔ پانچ بجے صبح تک تمھارے ساتھ جاگتا رہا لیکن تمھارے مطلب کی بات اس نے نہیں بتائی۔ یہ کوئی تسلیم کرنے کی بات ہے۔"

"تمھارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر تو نہایت شریف آدمی ہے۔ کیا اس نے یہ نہیں پوچھا کہ تم اپنے شوہر کو چھوڑ کر میرے کمرے میں کیوں بیٹھی ہو؟"

"اس کے پوچھنے سے پہلے ہی میں نے تمھاری دماغی کیفیت بیان کر دی تھی۔ تم آمنہ کے ساتھ نکاح پڑھا کر واپس آ رہے تھے۔ تمھارے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، وہ میں نے آمنہ کی جگہ رہ کر اسے بتا دیا۔ اس طرح پتا چل گیا کہ تم اپنی یادداشت کس طرح کھو چکے ہو۔ یعنی میں تمھاری بیوی ہوں لیکن تم مجھے بیوی تسلیم نہیں کر رہے ہو۔ اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہو۔ لہٰذا ہمارے تمھارے درمیان رشتہ ہے بھی اور نہیں بھی۔"

میں پہلے ہی اسلام آباد جانے کے لیے سوچ رہا تھا۔ ایک بات میرے مزاج کے خلاف تھی کہ میں کسی کا آلۂ کار بن کر ان کے منصوبے کے مطابق عمل کروں۔ وہ جہاں مجھے رہنے کے لیے کہیں، وہاں رہوں۔ جہاں جانے کے لیے کہیں، وہاں چل پڑوں۔ میں مصلحت کی خاطر ایسا کر سکتا تھا اور اب تک کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے والا تھا۔

گلزاری تمام رات جاگتی رہی تھی۔ پھر بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دھیان ڈاکٹر باقی کی طرف تھا۔ وہ پھر اس سے ملنا چاہتی تھی۔ مستقبل کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سوچتے سوچتے سو گئی۔ دن کے دس بجے وہ پھر بیدار ہو گئی۔ غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر کے فوراً ہی دوسرے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی کہا "میں کئی بار تمھارے کمرے کے دروازے کے سامنے جا چکا ہوں لیکن دستک دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں تمھارے شوہر سے کیا کہتا کہ کس لیے آیا ہوں۔ کس سے ملنا چاہتا ہوں؟"

وہ اس کے پاس بیٹھ کر آہستگی سے بولی "اسے میرا شوہر نہ کہو۔ میرے لیے یہ توہین ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں تم سے صاف صاف باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے زندگی بھر کے لیے اپنا بناؤ گے؟"

"تم میری زندگی کی پہلی عورت ہو اور آخری بھی۔ میں تمھارے بعد کسی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔"

"یہی میری حالت ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے، تم سے پہلے میری زندگی میں کوئی نہیں آیا۔ نہ شوہر کی حیثیت سے، نہ محبوب کی حیثیت سے۔"

"تو پھر یہ تمھارے ساتھ کون ہے؟"

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔ پہلے وعدہ کرو، قسم کھاؤ، کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔ میری حفاظت کرو گے تو میں ساری باتیں سچ سچ بیان کر دوں گی۔"

"میں قسم کھاتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ کے لیے تمھیں اپنا بنا لوں گا۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ میں دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا کیونکہ جس طرح وہ محبت سے لوٹ کر رہی تھی اور وہ محبت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سن رہا تھا، میرا وہاں رہنا مناسب نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کی سوچ کو پڑھا تو وہ بتا چکی تھی کہ اس کا تعلق کتنے خطرناک گروہ سے ہے اور وہ

گروہ ایک سُپر پاور کے لیے پاکستان میں کام کر رہا ہے۔

ڈاکٹر نے پوچھا "تم اس گروہ میں کیوں شامل ہوگئی تھیں؟"

"کیوں نہ ہوتی؟ پاکستان میں انصاف نہیں ہے۔ چھوٹے صوبوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا ہم انقلاب لائیں گے۔"

ڈاکٹر عبدالباقی نے اسے گہری سنجیدگی سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں انقلاب لانے میں تمھارا ساتھ دوں گا مگر ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم پاکستانی ہیں اور پاکستانی بن کر انقلاب لائیں گے۔ اگر حاکمِ وقت کی پالیسی غلط ہے تو ہم اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے لیکن غیر ملکی ایجنٹ بن کر، ان کی دلاّلی کر کے، ان کے آلۂ کار بن کر پاکستان میں تخریبی کارروائی کرنا حاکمِ وقت کو بلیک میل کرنا، نہ تو سیاست ہے نہ شرافت ہے۔"

"کیا تم کسی سیاسی پارٹی کے حامی ہو؟"

"کسی بھی ملک کے سائنسداں، ڈاکٹر اور انجنیئر وغیرہ کسی پارٹی کے آدمی نہیں ہوتے۔ وہ سارے ملک کے لیے ہوتے ہیں۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ زندگی میں پہلی بار تم سے سیاسی بحث کر رہا ہوں۔ بحث کیا کرنا ہے، ایک سیدھی سادی سی بات ہے بعض اوقات ایک سیدھی سچی حقیقت کو سمجھنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، میری چند منٹ کی گفتگو تمھیں قائل کر دے۔ اس بات کو یوں سمجھو، تم میری زندگی میں آئی ہو اور محبت کی تحریک سے آئی ہو۔ اگر بلیک میلنگ کی تحریک سے آؤگی اور مجھ پر نامناسب دباؤ ڈالوگی تو ہو سکتا ہے کہ میں تمھاری دھونس میں تمھاری شرائط اور بلیک میلنگ کے سامنے جھک جاؤں لیکن دلی محبت نہیں ہوگی، ہمارا رشتہ مستحکم نہیں ہوگا۔ جب دھونس اور بلیک میلنگ سے میاں بیوی کا رشتہ مضبوط نہیں ہو سکتا ہے تو حکومت کیسے مضبوط ہو سکتی ہے۔"

وہ لاجواب ہو کر سوچنے لگی۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "جب تم ایک مرد کی پناہ میں آ رہی ہو تو سارا معاملہ مرد پر چھوڑ دو۔ مرد تو ہوتا ہی عورت کے تحفظ کے لیے ہے۔ تمھیں کس بات کا ڈر ہے؟"

"تم نہیں جانتے، وہ کتنے خطرناک لوگ ہیں۔ میں کسی محفوظ پناہ گاہ میں چھپی رہوں یا عام شاہراہ پر چلتی رہوں، وہ کہیں بھی گولی مار سکتے ہیں۔ کہیں بھی غدّاری کی سزا دے سکتے ہیں۔"

"وہ کیا چاہتے ہیں؟"

وہ تمھارے شعبے کے راز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "اتنی سی بات کے لیے پریشان ہو رہی تھیں۔ تم ان سے کہو، معلومات حاصل کرتے رہنے کے لیے مستقل طور پر میرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ تم مجھ سے شادی کر کے میری شریکِ حیات بن جاؤگی اور ہمارے اندرونی راز وہاں تک پہنچایا کروگی۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کیا، کیا تم وہاں کے راز مجھے بتا دیا کروگے؟"

"تم میری شریکِ حیات ہوگی تو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا اور وہی باتیں تم وہاں جا کر بتا دیا کرنا لیکن اس سے پاکستان کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہمارا ملک نیک نیتی سے ایٹمی توانائی حاصل کر رہا ہے۔ ہمارا مقصد ایٹم بم بنانا ہرگز نہیں ہے ہمارا بنیادی مقصد امن و آشتی ہے۔ ہم ایٹمی توانائی کو پُرامن مقاصد کے لیے استعمال کریں گے تاکہ ہمارے ہاں تیل اور بجلی کی قلّت نہ رہے۔ اب ہم کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ بہرحال جو میں بتاؤں گا تم ان گروہ کے افراد تک وہ باتیں پہنچا سکتی ہو۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے۔"

"پھر تو میں اپنی ٹیم کے لیڈر کو قائل کروں گی کہ مجھے ڈاکٹر کی شریکِ حیات بن کر رہنا ہوگا۔ تاکہ میں ہمیشہ وہاں کے راز اس کے پاس پہنچاتی رہوں۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "مائخل شوف جیسے گھاگ لوگ اتنی آسانی سے فریب میں نہیں آتے ہیں۔ اگر کبھی اس نے میری غدّاری کو بھانپ لیا تو؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر فوراً ہی خوش ہو کر بولی۔ "ایک بہترین آئیڈیا ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا "کیسا آئیڈیا؟"

"میں سوچ رہی ہوں۔ اگر کبھی اس گروہ کے سرغنہ کو میری غدّاری کا علم ہوجائے تو مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا: "کیا کرنا چاہیے؟"

"میرے گروہ کے بڑے بڑے لوگ جو چال چل رہے ہیں، میں وہی چالیں انھیں لوٹاؤں گی۔"

"معلوم تو ہو وہ کیسی چالیں چل رہے ہیں؟"

"وہ اس ملک میں جو بھی سازشیں کر رہے ہیں اور جتنے جرائم ان سے سرزد ہو رہے ہیں، ان کے پیچھے ایسے تاثرات چھوڑتے جا رہے ہیں جیسے یہ سب کچھ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ جب کبھی میری غدّاری کا شبہ ہوگا تو میں فوراً ہی ایکٹنگ شروع کر دوں گی۔ یوں ظاہر کروں گی جیسے میرے دماغ میں کوئی آتا ہے اور مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں مائخل شوف وغیرہ کے سامنے غلط بیانی سے کام لوں۔ میں انکار کرتی ہوں تو دماغی طور پر غیر حاضر ہوجاتی ہوں اور پھر پتا نہیں چلتا کہ میں کیا کچھ کہہ جاتی ہوں۔"

میں نے اپنے سر کو ایک ہاتھ سے تھام کر دل ہی دل میں کہا کمال ہوگیا۔ میں ہاتھ بڑھاتا تو سیرا ایک ہاتھ گلزاری کی گردن پر اور دوسرا مائخل شوف کی گردن پر ہوتا۔ یہ کمبخت میرے قریب رہ کر ہی میرے خلاف سازشیں کر رہے تھے وہ جو کہتے تھے، جو کرتے تھے، اس کی تان ٹیلی پیتھی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔

ہر شخص اپنے دشمنوں سے نفرت کرتا ہے۔ مجھے اپنے دشمنوں پر پیار آ رہا تھا۔ اب ان سے پہلے کی طرح ٹکرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا ہی کافی تھا کہ ان کی چال ان کو ہی چُپ چاپ لوٹا دیا کروں۔ جیسا کہ میں نے گلزاری بیگم کے دل میں محبت کا ایک تیر ترازو کر دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر باقی کے خلاف سازش کرنے گئی تھی، اب رفتہ رفتہ اس سے متاثر ہوتی جائے گی اور مثبت انداز کی زندگی گزارنا سیکھ لے گی۔ میں دوسرے پاکستانی تخریب کاروں کے ساتھ کس طرح پیش آ سکتا ہوں اس کا انحصار آئندہ حالات پر تھا۔

میں بیزار ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ وہاں سے اٹھ کر لباس تبدیل کیا جُوتے پہنے پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ساتھ والے کمرے میں دیکھا، اس کا دروازہ بند تھا۔ گلزاری بیگم اور ڈاکٹر کبھی ہی پکار رہے ہوں گے۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ ایک نرس نے مجھے دیکھا۔ ہمارے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ وہ اپنے کام سے چلی گئی، میں اسپتال سے باہر آگیا۔ شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ ٹریفک کا بے پناہ ہجوم تھا۔ ایسا شور تھا کہ سکون کی تلاش کرنے والے اپنا سر تھام کر رہ جاتے۔ میں اسپتال کے پُرسکون ماحول سے گھبرا کر نکلا تھا کوئی بھی شخص جو جسمانی اور دماغی طور پر صحت مند ہو، وہ اسپتال کے ماحول میں کبھی رہنا پسند نہیں کرے گا۔ خواہ وہاں کتنا ہی سکون ہو۔ میں بھی گھبرا کر باہر آگیا تھا۔

میں پیدل چلنے لگا۔ باہر نکلنے کا موقع بہت کم ملتا تھا۔ خیال خوانی سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ اب میں تفریح کے موڈ میں تھا۔ ٹیکسی وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں سے صدر تک عورتوں اور مردوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ سب مشرقی لباس میں تھے۔ مغربی ممالک میں مجھے شاذ و نادر ہی ایسے لباس میں کوئی نظر آتا تھا۔ یہاں تو جدھر نظریں اٹھتی تھیں...... اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سب چلنے پھرنے والے اور والیاں، بچے اور بوڑھے میرے اپنے ہیں۔ میرا ان سے صدیوں پُرانا زمینی رشتہ ہے۔

میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر چاٹ اور دہی بھلے کھائے۔ اگرچہ لاہور کے دہی بھلے والی بات نہیں تھی مگر مزہ آ رہا تھا۔ کوئی مجھے دیکھ لیتا اور معلوم ہوجاتا کہ فرہاد علی تیمور سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر کھا رہا ہے تو دیکھنے والے کو شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ ہم اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ جب بڑے آدمی بن جاتے ہیں تو یوں کھڑے ہو کر کھانے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ پھر بھی ایسی چٹ پٹی چیزیں کھانے سے باز نہیں آتے۔ اپنی کاروں میں بیٹھ کر آتے ہیں اور بڑے ہی شاہانہ انداز میں آرڈر دے کر کار کے اندر بیٹھے بیٹھے ایسی ہی چیزوں سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

کھاتے کھاتے میری نظر ایک کار کی طرف گئی۔ وہاں ایک شخص بیٹھا مجھے گھُور رہا تھا۔ وہ اسٹیئرنگ سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک دلرُبا نظر آ رہی تھی۔ دونوں ہی چاٹ کھا رہے تھے۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ فوراً کھانے کی طرف توجہ دینے لگا۔ میں نے محسوس کیا، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور مجھے سڑک کے کنارے چاٹ کھاتے دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔

سوچنے کی بات تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس لیے کہ قیمتی سوٹ پہن کر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر نہیں کھانا چاہیے یا وہ میرا کوئی پرانا شناسا ہے اور مجھے بابر کی حیثیت سے پہچانتا ہے اگر ایسا ہے تو مجھے مخاطب کیوں نہیں کر رہا ہے۔ مجھ سے ملنا کیوں نہیں چاہتا؟

اسی وقت کار میں بیٹھی ہوئی حسین عورت کو ٹھسکا لگا۔ اس کے ساتھی نے کار کی کھڑکی سے سر نکال کر چاٹ والے چھوکرے کو آواز دی: "چھوٹے، جلدی پانی لاؤ۔"

چھوٹا اتنی جلدی پانی نہیں لا سکتا تھا، جتنی جلدی میں اس کے دماغ میں پہنچ سکتا تھا۔ فوراً ہی انکشاف ہوا کہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی حسینہ، بابر کی قاتلہ ہے۔ اس نے پہلے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھی نے مجھ سے نظریں ملنے کے بعد سر جھکا کر کھاتے کھاتے اپنی ساتھی عورت سے کہا تھا: "زرینہ! اس شخص کو دیکھو جو سڑک کے کنارے کھا رہا ہے۔ کیا وہ بابر نہیں ہے؟"

یہ سن کر بھی زرینہ نے اپنے کھانے کی پلیٹ سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ بڑے یقین سے کہا "کبیر داس! تم جانتے ہو موت اکثر اپنے شکار کو آدھ مُوا کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ میں کبھی آدھا کام نہیں کرتی۔ جس بابر کی ہڈیاں تک گل چکی ہوں گی، اسے تم یہاں دیکھ رہے ہو اور مجھے دیکھنے کو کہہ رہے ہو۔"

کبیر داس نے کہا، "تم دیکھو تو سہی۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو کہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہوں، وہ میرے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ میں خواہ مخواہ عاشقوں کا میلہ لگانا نہیں چاہتی۔"

"میرا دعوٰی ہے، تم اسے دیکھوگی تو عاشقوں کا میلہ لگانا بھول جاؤگی۔"

وہ بیزار ہو کر بولی "کون ہے آخر۔ کہاں ہے وہ؟"

اس نے نظریں اُٹھا کر میری جانب دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی اسے زور کا ٹھسکا لگا۔ ایسے ہی وقت کبیر داس نے چاٹ والے چھوکرے سے پانی طلب کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں میری

گرفت میں آگئے تھے۔ میں سڑک کے کنارے بھی کھڑا ہوا تھا اور ان کی کار میں بھی موجود تھا۔

یوں تو اسے جھٹکا لگا تھا لیکن دراصل گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ جب تک اس نے دو گھونٹ پانی نہ پیا، اس وقت تک سنبھل نہ سکی۔ پھر وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگی "یہ تو بابر ہی لگتا ہے۔"

"لگتا ہے کیا؟ یقیناً ہے۔"

وہ چڑکر بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے ہماری آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ ہمارے آدمیوں نے اسے تہ خانے میں لے جاکر پھینک دیا تھا۔ پھر وہ تہ خانے سے کیسے نکل سکتا تھا؟ وہ بھی مرنے کے بعد۔"

"ہوسکتا ہے اس کا دم پوری طرح نہ نکلا ہو، تہ خانے میں جانے کے بعد پھر سانس آگئی ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوجاتا ہے۔"

"او گاڈ! میری عقل تسلیم نہیں کر رہی ہے کبیر! ایسا کرو، بابر نے تمھیں نہیں دیکھا تھا۔ اگر یہ وہی ہے تو تمھیں نہیں پہچان سکے گا۔ تم اس سے باتیں کرو۔ معلوم کرو، یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور اگر بابر ہے تو کیسے زندہ رہ گیا؟"

اس دوران زرینہ نے اپنے سر پر آنچل رکھ لیا تھا اور اسے گھونگھٹ کی طرح اوڑھ لیا تھا۔ تاکہ میں سڑک پر سے دیکھنا چاہوں تو اس کا چہرہ واضح طور پر نہ دیکھ سکوں۔

کبیر داس کار سے باہر آگیا۔ اس نے پیسے ادا کیے۔ چھوٹے کو ایک روپیہ ٹپ کے طور پر دیا پھر میری طرف گھوم کر بولا "آپ مجھے کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے ہیں۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"جب آپ مجھے جانتے ہیں تو نام بھی جانتے ہوں گے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "یہ ضروری نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات چہرے شناسا لگتے ہیں لیکن نام یاد نہیں آتا۔ ویسے میرا نام کبیر ہے۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا "صرف کبیر؟"

وہ ہچکچایا۔ پھر بولا "کبیر حسن۔"

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ ذات کا ہندو تھا، نام کبیر داس تھا لیکن پاکستان آکر کبیر حسن بن گیا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میرا نام اے مسٹر ہے۔"

کبیر نے ہنستے ہوئے کہا "بھلا یہ کیا نام ہوا؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ لوگ مجھے اے مسٹر کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ مجھ سے میرا نام پوچھتے ہیں تو میں نام نہیں بتا سکتا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میری یادداشت گم ہوچکی ہے اور میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں۔"

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا "تم کہتے ہو تو یقین کر لیتا ہوں لیکن یقین کرنے والی بات نہیں ہے۔ تم تو نہایت ہی نارمل انسان لگ رہے ہو۔"

"جن کی یادداشت گم ہوجاتی ہے، وہ نارمل ہی ہوتے ہیں، پاگل نہیں ہوتے۔ خیر جانے دو، میں تمھیں یقین دلا کر کیا کروں گا؟"

"کیا اس کا کوئی ثبوت ہے؟"

"ہے، مگر میں تمھیں نہیں بتاؤں گا آخر کیوں بتاؤں؟"

"اگر واقعی تمھاری یادداشت گم ہوچکی ہے اور تمھارا کوئی نہیں ہے اور اگر ہے اور تم اسے پہچانتے نہیں ہو تو ایسی صورت میں ہم تمھارا سہارا بن سکتے ہیں۔ تمھاری مدد کرسکتے ہیں تمھارے بچھڑے ہوئے لوگوں تک تمھیں پہنچا سکتے ہیں۔"

میں نے چند لمحے تک سوچنے کی ایکٹنگ کی پھر جیب سے اسپتال کا کارڈ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "اسپتال قریب ہی ہے۔ کارڈ دیکھ کر اور میرے ساتھ چل کر تصدیق کرسکتے ہو لیکن میں، اسپتال واپس نہیں جانا چاہتا۔"

وہ میری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کارڈ کو پڑھ رہا تھا، جس میں لکھا ہوا تھا کہ لوسٹ آف میموری کا کیس ہے۔ ایک بہت ہی بڑے ماہرِ نفسیات سے وقت لیا گیا ہے۔ وہ میرا معائنہ کرنے والا ہے۔

اس نے پڑھنے کے بعد پوچھا "تم اسپتال کیوں نہیں جانا چاہتے؟"

"مجھے گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ کیا مجھ جیسا صحت مند آدمی اسپتال میں رہنا پسند کرے گا۔ میں کل سے وہاں پڑا ہوا تھا۔"

"تمھیں کس نے وہاں بھیجا تھا۔ کوئی تو جان پہچان والا ہوگا؟"

"یہ ایک لمبی داستان ہے۔ میں یہاں سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر نہیں سنا سکتا۔"

"اچھا ذرا ایک منٹ، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا کار کے پاس گیا۔ پھر کار کی کھڑکی کے پاس جھک کر اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے میرا وہ کارڈ زرینہ کی طرف بڑھا دیا اور بہت ہی مختصر الفاظ میں میرے متعلق جلدی جلدی بتانے لگا۔

زرینہ نے کارڈ کو پڑھنے کے بعد اپنے سر سے آنچل ہٹا لیا پھر کہا "اگر یہ لوسٹ آف میموری کا کیس ہے تو یہ مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ جب اپنے آپ کو بھول گیا ہے تو دوسروں کو کیا یاد رکھے گا۔ اسے یہاں لے آؤ۔ فراڈ ثابت ہوا تو ہمیں ایسے لوگوں سے نمٹنا بھی آتا ہے۔"

کبیر داس پھر میرے پاس آیا۔ اس نے کہا "میری کزن میرے ساتھ ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ چلنا پسند کرو تو ہم ایک نہایت ہی آرام دہ کوٹھی میں بیٹھ کر اطمینان سے تمھاری داستان سنیں گے اور ہر طرح تمھارے کام آئیں گے۔"

میں نے کار کے قریب آکر ذرا جھکتے ہوئے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ گھبرا گئی۔ مجھ سے نگاہیں چار کرنے سے کترانے لگی حالانکہ وہ بڑی بے باک اور سفاک قسم کی عورت تھی لیکن اپنے ہاتھوں سے جسے مارا ہو اور وہی آنکھوں کے سامنے زندہ نظر آئے تو گھبراہٹ طاری ہوجاتی ہے۔ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مجھ میں دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟ جب میں پیرس میں تھا تو وہاں بھی لوگ مجھ پر مہربان ہوگئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں پاکستانی ہوں۔ وہ مجھے پاکستان پہنچا دیں گے اور وہ مجھے یہاں لے آئے۔ اب میں ان سے [illegible] اسپتال سے نکل آیا ہوں تو آپ لوگ بھی [illegible] نظر آتے ہیں۔ کیا آپ دونوں مجھے پہچانتے ہیں؟"

وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری باتوں کو توجہ سے سن رہی تھی۔ یقین کر رہی تھی کہ واقعی میں یادداشت کھوچکا ہوں۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی پھر پچھلی طرف کے دروازے کو کھولتے ہوئے بولی "یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔ اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

کبیر داس نے پچھلی سیٹ کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں دو طرف سے آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کبیر نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ زرینہ نے کہا "میں ایسے لوگوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتی ہوں جو غیر معمولی ہوتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایسے لوگوں پر جان دیتی ہوں۔ اب یہی دیکھو کہ تم یادداشت کھوچکے ہو یعنی ایسے انسان ہو جس کے پیچھے بہت ہی پُراسرار ماضی ہے اور جسے کوئی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ تم خود نہیں جانتے۔ ہے نا یہ دلچسپ بات؟ ایسی دلچسپی میں کون حصہ نہیں لے گا؟"

میں نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا "عجیب بات ہے۔ پیرس میں تمھاری جیسی ایک حسین عورت ملی تھی۔ تم تو محض دلچسپی لے رہی ہو، اس نے تو مجھے اپنا شوہر ہی کہہ دیا تھا۔"

"کون تھی وہ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، وہ کون تھی۔ میں اس کے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتا مگر حال کے متعلق جانتا ہوں۔ اس کا نام آمنہ ہے۔"

زرینہ کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، آمنہ کا تعلق سائمن دی گریٹ کے ڈی ٹی سینٹر سے تھا اور یہ جو زرینہ اور کبیر داس مجھے ملے تھے، ان کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے یعنی یہ ماسٹر کی کی سنڈیکیٹ کی طرف سے پاکستان آئے تھے۔ ایک بار پیرس میں زبردست ٹکر ہوئی تھی جس کے نتیجے میں بابر مارا گیا۔ اب دوسری ٹکر شاید کراچی میں ہونے والی تھی۔

زرینہ نے پوچھا "کیا تم آمنہ کے متعلق اور کچھ بتا سکتے ہو۔ اس کے شوہر کا نام کیا تھا یعنی اس نے جب تمھیں شوہر کہا تو کس نام سے مخاطب کیا؟"

"وہ مجھے بابر جلال کہتی تھی۔"

میرے برابر میں بیٹھی ہوئی بابر کی قاتلہ کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جسے وہ مار چکی ہے، وہ اس کے شانے سے شانہ لگائے اس وقت کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہے اور بڑی معصومیت سے سب کچھ اُگل رہا ہے۔ اس کی معصومیت یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اپنی یادداشت کھوچکا ہے۔ ورنہ اپنی اس قاتلہ کو تو... پہچان لیتا جس سے قتل کرنے میں ضرور کوئی نہ کوئی کمی رہ گئی تھی، جس کے باعث وہ زندہ بچ گیا اور اب اسی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔

ہم جلد ہی ایک بہت بڑی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ مجھے ایک ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہہ کر زرینہ، کبیر کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں ریحانہ اور کرم داد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح ریحانہ اور کرم داد سے سامنا ہوسکتا ہے۔ ان کے علاوہ دو اور باڈی بلڈر قسم کے جوان تھے جو لڑنے مرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ زرینہ اس کمرے میں پہنچتے ہی ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکال کر رابطہ قائم کرنے لگی تھی اور کبیر داس اپنے ساتھیوں کو میرے متعلق بتا رہا تھا۔

ریحانہ اور کرم داد نے بابر جلال کو کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن وہ دو باڈی بلڈر، بابر سے بہت پہلے دو دو ہاتھ کرچکے تھے۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس لیے وہ کمرے کے دوسرے دروازے سے نکل کر اس ڈرائنگ روم کی ایک کھڑکی کے پاس آگئے تھے اور وہاں سے چپ چاپ جھانک کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں انجان بنا ہوا ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔

اُدھر زرینہ نے ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ قائم کرلیا تھا۔ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد اس نے کہا "مسٹر کِم کریزی! اگر میں یہ کہوں کہ بابر جلال زندہ ہے تو کیا آپ میری عقل پر شبہ کریں گے؟"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون بابر جلال؟"

"وہی سائمن دی گریٹ کی ناک چڑھی فائٹر آمنہ کا شوہر

جلال، جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تھا اور تہ خانے میں پھینک دیا تھا لیکن وہ زندہ ہے۔"

"ہاں، اب مجھے تمھاری عقل پر شبہ ہوگا۔"

"میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے آئی ہوں۔ کیا آپ آکر اسے دیکھنا اور اس کی باتیں سننا پسند کریں گے؟ ہمیں اس کے ذریعے سائمن دی گریٹ کے گروہ کے متعلق بہت سی معلومات فراہم ہوسکتی ہیں۔"

"زرینہ! کیا تمھیں یقین ہے کہ تم نے اسے وہاں لاکر غلطی نہیں کی ہے؟ تمھارا تعاقب نہیں کیا گیا ہے۔ کیا تم سائمن دی گریٹ اور مائکل شوف کو نادان بچّہ سمجھتی ہو؟"

"آپ سب اسے تسلیم کرتے ہیں کہ میری چار آنکھیں ہیں۔ میں آگے دیکھتی ہوں مگر پیچھے کی خبر رکھتی ہوں۔ یقین سے کہتی ہوں کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بابر جلال جو ہمارے ساتھ آیا ہے، اس کی یادداشت گُم ہوچکی ہے۔ یہ ایک دلچسپ کیس ہے آپ فوراً آجائیں تاکہ اس سے گفتگو کرنے کے بعد آپ مطمئن ہوسکیں گے۔"

"اچھی بات ہے، آرہا ہوں۔ اوور اینڈ آل۔"

ان کا رابطہ ختم ہوگیا۔ اب مجھے کم کریزی کے دماغ میں پہنچنا چاہیے تھا لیکن میں زرینہ کے ذریعے معلوم کرچکا تھا، وہ یوگا کا ماہر ہے۔ میری سوچ کی لہریں اس کے دماغ سے ٹکرا کر واپس آجاتیں۔ یوں شک وشبہ کی ابتدا ہو جاتی کہ فرہاد ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اب تک وہ مطمئن تھے۔ مختلف ممالک میں مجھے تلاش کیا جارہا تھا۔ میری مصروفیات کے بارے میں معلوم کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں لیکن انھیں صرف رسونتی، سونیا، اعلیٰ بی بی اور مرجانہ وغیرہ کے متعلق معلوم تھا کیونکہ وہ وادی میں تھے اور میں نے آج تک وادی کا رخ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کسی کو بتایا تھا کہ میں کس جگہ ہوں اور کس طرح جگہ تبدیل کرتا رہتا ہوں۔

ایک ملازم میرے لیے چائے اور ناشتے کی ٹرالی لے آیا۔ وہ چاہتے تھے، میں کھانے پینے میں کچھ وقت گزاروں تاکہ اس وقت تک ان کا سرغنہ کم کریزی پہنچ جائے۔ مجھے ان کی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ دونوں باڈی بلڈر کوٹھی کی چھت پر چلے گئے تھے اور چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔ یہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ زرینہ اور کبیر داس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک کوئی اور تو نہیں آیا ہے اور نہ ہی مجھے ان کی مخالف پارٹی نے چارے کے طور پر پیش کیا ہے۔

زرینہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے بن سنور رہی تھی میرے لیے قیامت بننا چاہتی تھی۔ اس کے دماغ میں یہ بات تھی کہ مجھ سے اور بہت کچھ اگلوانے کے لیے اپنے حسن اور اپنی اداؤں سے کام لینا چاہیے۔ کرم داد اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا اور یوں منہ چلا رہا تھا جیسے بے خیالی میں........ جگالی کر رہا ہو۔ ریحانہ مطمئن تھی ——— زرینہ کی مرضی کے خلاف کوئی اس کے قریب نہیں آسکتا تھا۔ وہ صرف اپنے مقصد کے لیے کسی کے قریب آتی تھی۔ قریب آکر بھی اتنا فاصلہ رکھتی تھی کہ شکار تڑپتا۔ .... رہ جاتا تھا اور اس کے ہر اشارے پر ناچتا رہتا تھا۔ جو سوال کیا جاتا اس کا جواب دیتا تھا۔ جو حکم دیا جاتا اس کی تعمیل کرتا تھا۔ زرینہ کو اپنے شکار سے کھیلنے کا ایسا تجربہ تھا جسے کوئی چیلنج نہیں کرسکتا تھا۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی دونوں باڈی گارڈ باہر گئے انھوں نے کِم کریزی کا استقبال کیا، اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ میں انھیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور اجنبی نظروں سے دیکھنے لگا۔ کبیر داس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا: "مسٹر بابر! یہ ہمارے باس مسٹر کِم کریزی ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ حیرانی سے میرا منہ تک رہا تھا۔ یقیناً سوچ رہا ہوگا کہ جو مرچکا ہے، وہ نظروں کے سامنے زندہ کس طرح نظر آرہا ہے۔ میں نے پوچھا: "کیا آپ کے ہاں مصافحہ کرنے کا دستور نہیں ہے؟"

اس نے چونک کر ہاتھ بڑھایا۔ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا: "کیا واقعی آپ مسٹر بابر ہیں؟"

میں نے کہا: "اپنی داستان کا کچھ حصہ مسٹر کبیر کو سنا چکا ہوں۔ میں فرداً فرداً کیا بتاؤں کہ میرے ساتھ کیسے حالات پیش آرہے ہیں۔"

کِم کریزی نے کہا: "آرام سے بیٹھو۔ صرف ایک بار تفصیل سے اپنے بارے میں بتاؤ۔ اس کے بعد تم سے کوئی تمھاری داستان نہیں سنے گا۔ بہتر ہوگا کہ ہم تمھاری باتوں کو ریکارڈ کرلیں تاکہ جو بھی تمھارے بارے میں پوچھے، ہم وہی کیسٹ اسے سنا دیا کریں۔ کیا تمھیں یہ منظور ہے؟"

"جی بہتر ہے، میں رٹتے ہوئے سبق کی طرح اپنی رُوداد سناتے سناتے تھک گیا ہوں۔"

ہم الگ الگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میرے سامنے ایک ٹیپ ریکارڈر لاکر رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد اسے آن کرتے ہی کِم کریزی نے سوال کیا: "تمھیں کب پتا چلا کہ یادداشت گم ہو گئی ہے اور تم اس دنیا میں بالکل اجنبی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو پہچاننا بھی بھول گئے ہو؟"

میں زرینہ کے دماغ سے معلوم کرچکا تھا، اب سے ایک ہفتے پہلے اس نے بابر کو ہلاک کیا تھا اور اسے تہ خانے

پھنکوا دیا تھا۔ اسی کے مطابق میں نے کہا: "جب میں آنکھیں کھول کر خود کو اجنبی محسوس کیا اور مجھے کوئی بات نہیں آرہی تھی تو میرے ایک اجنبی میزبان سے معلوم ہوا، اتوار کا دن تھا۔ جولائی کی دس تاریخ تھی۔ میزبان کہہ رہا کہ مجھ پر بڑے مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ مجھے ایسی اذیتیں ائی گئی ہیں جن کا کوئی نشان جسم پر نہیں ملتا لیکن اندرونی چوٹیں ۔ وہ میرا علاج کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اور اس کے ن سلوک سے پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔"

کِم کریزی نے سوال کیا: "تم اس ڈاکٹر کے ہاں کیسے پہنچ ے تھے؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے کہا نا، جب میں نے آنکھ ولی اور خود کو اجنبی محسوس کیا تو میں اس ڈاکٹر کے مکان میں تھا۔"

اتنے میں زرینہ آگئی۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ یرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں سمٹ کر ایک طرف دگیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولی: "کیا ہوا؟"

میں نے دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہا: "تم وہاں بیٹھو۔"

"یہاں بیٹھوں، تو کیا ہرج ہے؟"

"میں اسی لیے آمنہ کے پاس سے بھاگ کر آیا ہوں۔ ہ بھی مجھ سے فری ہونا چاہتی تھی۔ میں نے اس حد تک لیم کرلیا کہ شاید اس کا شوہر ہوسکتا ہوں لیکن جب تک مدیق نہ ہو، میں اس کے قریب نہیں جاسکتا تھا۔ میرے دماغ یا یہ بات آتی ہے کہ عورتوں سے دُور رہنا چاہیے۔"

وہ میرے قریب جُھک کر سرگوشی میں بولی: "لیکن میں رف عورت نہیں، آگ بھی ہوں، پانی بھی ہوں۔ جلنا چاہو گے اؤں گی۔ بجھنا چاہو گے تو بجھاؤں گی۔ مرنا چاہو گے تو میں نے ی مرنے والوں کو بھی مایوس نہیں کیا ہے۔ بڑی محبت ے ابدی نیند سُلا دیتی ہوں۔"

میں ذرا اور سمٹ گیا اس سے ذرا اور دُور ہوگیا۔ کِم کریزی ے کہا: "زرینہ! سوال کرو۔"

وہ سوال کیا کرتی، اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔ اسے ایک ر دیکھنے والے اپنا دل ہار جاتے تھے۔ کل مرنے والے آج مرنے تیار ہو جاتے تھے لیکن میں اس سے کترا رہا تھا۔ بہرحال سانے کِم کریزی کے کہنے کے مطابق سوال کیا: "جب تم اپنے زبان ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو تمھارا حُلیہ کیا تھا، لباس کیا تھا؟"

میں یہ سب اس کے ہی دماغ سے معلوم کرچکا تھا۔ میں ہ جواب دیا: "میں نے نیلی پتلون اور نیلی دھاری دار قمیص ی ہوئی تھی اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی، لباس میلا ہوگیا تھا۔"

زرینہ نے شدید حیران ہوکر کہا: "مسٹر کِم! بالکل اسی لباس کا ذکر ہے جو بابر اس وقت پہنے ہوئے تھا۔" پھر وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی: "اچھا یہ بتاؤ، تمھارے میزبان ڈاکٹر نے تمھارے متعلق کیا رائے قائم کی ہے؟"

میں نے ذرا دیر سوچنے کی ایکٹنگ کی۔ پھر کہا: "وہ کہتا تھا، جو لوگ مجھے اس کے دروازے کے سامنے پھینک کر گئے ہیں، وہ مجھے کسی قبرستان سے اٹھا کر لائے تھے۔"

کِم کریزی نے چونک کر پوچھا: "اس نے یہ رائے کیسے قائم کی؟"

"وہ کہتا تھا، میری جیب سے ایک ہڈی کا ٹکڑا نکلا ہے، وہ انسانی ہڈی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، میں کسی ٹوٹی ہوئی قبر میں پڑا ہوا تھا۔ پھر وہاں سے لانے والے مجھے ڈاکٹر کے دروازے پر شاید اس لیے پہنچا گئے کہ وہ انسانی ہمدردی رکھتے تھے لیکن کسی قانونی معاملات میں ملوّث نہیں ہونا چاہتے تھے۔"

زرینہ اور کِم کریزی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت زرینہ کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: "یہی بابر ہے، یہی بابر ہے۔ جس تہ خانے میں اسے پھینکا گیا تھا، وہاں کتنے ہی ہڈیوں کے ڈھانچے پڑے تھے۔ ایسے لوگوں کو بھی تہ خانے میں پھینک دیا جاتا تھا جو پوری طرح مرتے نہیں تھے لیکن وہاں پہنچ کر مرجاتے تھے۔ انھی ہڈیوں کے ڈھانچوں میں سے کسی ہڈی کا ٹکڑا بابر کی جیب میں جانے کیسے چلا گیا ہو۔"

وہ پریشان ہوکر سوچ رہی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ میں کس طرح تہ خانے سے نکل آیا۔ جبکہ وہاں سے کوئی نکل نہیں سکتا تھا اور یہ سوال وہ مجھ سے نہیں پوچھ سکتی تھی کیونکہ میری یادداشت گُم ہوچکی تھی اور میں خود نہیں جانتا تھا کہ کبھی یادداشت واپس آجانے کی ایکٹنگ کروں گا اور بابر کے ماضی کو سمجھ لینے کا اظہار کروں گا تو اس سوال کا جواب کیسے دوں گا جبکہ وہاں سے کوئی نکل نہیں سکتا تھا۔

فی الحال میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ بحیثیت بابر میری یادداشت کبھی واپس ہی نہیں آئے گی اور نہ ہی میں اس سوال کا جواب دوں گا۔ کِم کریزی نے پوچھا: "ہم کیسے یقین کریں کہ تمھاری یادداشت گُم ہوچکی ہے؟"

"آپ یقین کیوں کریں گے؟ اور کیوں نہیں کریں گے؟ آپ کیوں میری ذات میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"تم اسپتال سے اس لیے بھاگ کر آئے ہو کہ طبّی معائنے سے شاید تمھارا فراڈ ثابت ہو جائے۔ ڈاکٹر یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمھاری یادداشت گم نہیں ہوئی ہے۔"

"میں ایک نہیں، ہزار بار طبّی معائنے کے لیے تیار ہوں

لیکن جس انداز میں وہ چاہتے ہیں، اس انداز میں نہیں ۔"

"انھوں نے کیا انداز اختیار کیا تھا؟"

"پہلے تو آمنہ میرے پیچھے پڑی رہی پھر انھوں نے آمنہ کو کسی اور ڈیوٹی پر لگا دیا اور میرے ساتھ گلزاری بیگم کو اسپتال بھیج دیا۔"

گلزاری بیگم کا نام سنتے ہی کِم کریزی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر اس نے پوچھا "کیا وہ تمھارے ساتھ اسپتال آئی تھی؟"

"آئی تھی نہیں، اب بھی وہیں ہوگی اور مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔"

"کیا تم ہمیں ان سب کے متعلق بتا سکتے ہو؟"

"میں جن لوگوں کے ساتھ پیرس سے آیا ہوں اور جن کے نام وغیرہ معلوم ہیں، میں ان کے متعلق بتا سکتا ہوں۔ مجھے بتانے میں کیا ہرج ہے۔ وہ کون سے میرے سگے ہوتے ہیں۔"

میں نے ان تمام افراد کے نام بتائے جو پیرس سے ہمارے ساتھ طیارے میں آئے تھے پھر کچھ پنجاب چلے گئے تھے اور کچھ سرحد کی طرف۔ وہ لوگ بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہے تھے انھیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میری یادداشت گم ہو گئی ہے۔ اگر میں بابر کی حیثیت سے خود کو پہچانتا تو آمنہ کی خاطر اس گروہ کے راز کو کبھی ان پر فاش نہ کرتا اور ان کے ایک ایک آدمی کی رپورٹ نہ سناتا۔ صرف رپورٹ کی ہی بات نہیں تھی بلکہ مائخل شوف نے میرے سامنے آمنہ کو، گلزاری بیگم کو، مجھ کو اور دوسروں کو جس اہم مشن پر بھیجا تھا میں نے اس اہم مشن کی تفصیل بھی بیان کر دی تھی۔ ایسے میں وہ مجھ پر کیسے شبہ کر سکتے تھے کہ میں فراڈ کر رہا ہوں۔ کِم کریزی نے کہا "ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تم پر اعتماد نہیں کیا۔ واقعی تم یادداشت کھو چکے ہو۔ اب ہمیں سچ سچ بتاؤ، اسپتال سے کیوں چلے آئے؟ کیا چاہتے ہو؟"

"میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ کیا چاہتا ہوں۔ گھبرا جاتا ہوں تو اٹھ کر کہیں چل دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کسی طرح میری یادداشت واپس آ جائے، میں اپنے آپ کو پہچاننے لگوں۔"

"اس کا تو یہی طریقہ تھا کہ تم اسپتال میں رہتے۔"

"میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ عورتوں سے گھبراتا ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری ایک بیوی اس دنیا میں کہیں ہے اور میرے بچّوں کی پرورش کر رہی ہے۔ وہ سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر میں کسی عورت کے قریب جاؤں گا اور اس کے دام میں پھنس جاؤں گا تو میری بیوی اور بچّوں کا حق مارا جائے گا۔ میں جب تک اپنی پچھلی زندگی کو یاد نہیں کروں گا، اپنے متعلق وثوق سے نہیں سمجھوں گا کہ کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں، میرے بیوی بچّے ہیں یا نہیں؟ اس وقت تک میں کسی عورت کے قریب نہیں جا سکتا۔ اس لیے یہاں آتے ہی پہلے میں نے آمنہ سے نجات حاصل کی، اس کے بعد گلزاری بیگم کے پاس سے بھی بھاگ آیا۔"

کِم کریزی نے زرینہ کو اشارہ کیا۔ وہ میرے پاس سے اٹھ کر دوسرے صوفے کی طرف جاتے ہوئے بولی "میں تمھارے قریب نہیں آؤں گی۔ تمھاری خوشی ہماری خوشی ہے۔"

کِم کریزی نے کہا "ہم نہیں چاہتے کہ تم عورتوں سے گھبرا کر ہمارے پاس نہ رہو اور یہاں سے بھی بھاگ جاؤ۔ تمھیں یہاں پناہ ملے گی۔ ہم تمھارا علاج کرائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ جلد سے جلد تمھاری یادداشت واپس آ جائے۔"

زرینہ کی سوچ کہہ رہی تھی "میں خوب سمجھتی ہوں، کِم کبھی اس کی یادداشت واپس آنے نہیں دے گا۔ اگر اس نے خود کو بابر کی حیثیت سے اور آمنہ کے شوہر کی حیثیت سے پہچان لیا تو یہ سائمن دی گریٹ کی طرف چلا جائے گا اور پھر ہمارے کام کا نہیں رہے گا۔"

کِم کریزی نے کہا "مسٹر بابر! تم آمنہ کے پاس سے آ گئے، یہ بہت اچھا کیا۔ وہ اچھی عورت نہیں ہے۔ وہ اچھی فائٹر ہے لیکن ابھی مجھ سے پالا نہیں پڑا ہے۔ جس دن میرے ہتھے چڑھ جائے گی، اس دن اپاہج بن کر رہ جائے گی۔"

وہ وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس کے پیچھے زرینہ اور کرم داد بھی چلے گئے۔ ریحانہ دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی "مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم عورتوں سے بھاگتے ہو لیکن ماں، بہن اور بیٹی بھی تو عورت ہوتی ہے۔ اگر میں تمھیں بھائی کہوں تو؟"

جب کوئی عورت مجھے بھائی کہتی ہے تو میں خوف سے لرز جاتا ہوں۔ اب سے پہلے میں نے جسے بھی بہن بنایا، دشمنوں نے اس کے ذریعے مجھے کمزور بنانے کی کوشش کی۔ وہ بے چاری بہنیں میری وجہ سے بے موت ماری گئیں۔ راولپنڈی میں ایک بہن ریحانہ تھی جس کا انجام میں دیکھ چکا تھا۔ میرے سامنے یہ دوسری ریحانہ، بہن بننے آئی تھی جیسے دوبارہ میرے لیے جنم لیا ہو اور مجھ سے کہہ رہی ہو، مجھے پھر بہن بنا لو۔ میں پھر تمھارے لیے جان دینے آئی ہوں۔

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں بہن نہیں بنا سکتا۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "کیوں؟ بہن اور بھائی کا رشتہ تو بڑا مقدس ہوتا ہے اور تم اس سے کیوں کترا رہے ہو۔"

"اس لیے انکار کر رہا ہوں کہ ایک غیرت مند بھائی اپنی بہن کو ایسے ماحول میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں پہلے جن لوگوں کے ساتھ تھا، وہ بھی غلط لوگ تھے اور یہ بھی غلط لگ رہے ہیں۔"

ایک باڈی بلڈر نے غرّا کر کہا "تم نے کیا بکواس کر رہے ہو۔ منہ توڑ دوں گا۔"

میں چاہتا تو عملی طور پر اسے منہ توڑ جواب دے سکتا تھا، لیکن جب انھیں آپس میں لڑانا ہی بہتر تھا تو مجھے خود ہاتھ پاؤں چلانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ریحانہ کو دیکھتے ہوئے کہا "جسے تم بھائی بنانا چاہتی ہو، اس کا منہ توڑا جا رہا ہے۔"

ریحانہ نے گھور کر اس باڈی بلڈر کو دیکھا پھر کہا۔ "تم اپنی گرم مزاجی سے باز نہیں آؤ گے؟"

"میں تم سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ ہم سب کی توہین کر رہا ہے۔ میں اسے جواب دے رہا ہوں۔"

"تم ایک کمزور آدمی کو چیلنج کر رہے ہو۔ اگر چیلنج کرنا ہی ہے تو کرم داد کو کرو۔"

"تم کیا سمجھتی ہو کیا میں کرم داد سے دبتا ہوں؟"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہتا لیکن میں نے اس کی زبان سے گالی نکلوا دی۔ ریحانہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی، چیخ کر بولی "کرم داد اِدھر آؤ۔ دیکھو اس نے تمھیں کتنی گندی گالی دی ہے۔ یہ میری توہین کر رہا ہے۔"

اس کے بولتے بولتے کرم داد دوڑتا ہوا پہنچ گیا، پھر اس نے غرّا کر پوچھا "کیا بات ہے؟ کون گالی دے رہا ہے؟ کس نے تمھاری توہین کی ہے؟"

میں نے کہا "یہ ریحانہ مجھے بھائی بنانا چاہتی تھی۔ یہ پہلوان کہہ رہا ہے کہ منہ توڑ دے گا۔ پتا نہیں کرم داد کس کا نام ہے۔ اس نے اس بے چارے کو بھی گندی گالی دی ہے۔"

میری بات ختم ہوتے ہی اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی تھی فضا میں اڑتا ہوا گیا تھا اور باڈی بلڈر کے سینے پر ایک لات ماری تھی۔ وہ لات کھا کر پیچھے گیا۔ شاید اپنے پاؤں پر کھڑا رہتا لیکن ایک تپائی سے ٹکرا کر گر پڑا۔ فوراً ہی اٹھ کر اس نے جوابی حملہ کرنا چاہا۔ کرم داد نے اس سے پہلے ہی اس پر تابڑ توڑ کراٹے کے حملے کیے۔ باڈی بلڈر مار کھا رہا تھا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا تو اس نے بھی جوابی حملے کیے۔ وہ بھی زبردست تھا۔ پھر کِم کریزی کے ڈانٹنے کی آواز سنائی دی "یہ کیا ہو رہا ہے، رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں، فوراً ہاتھ روک لو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ کرم داد کسی کی دھونس میں آنے والا نہیں تھا لیکن کِم کریزی ان کا سرغنہ تھا اور ٹی ڈی سینٹر میں یہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا کہ سرغنہ خواہ مزاج کے خلاف حکم دے، اس پر عمل کرنا ہوگا۔ لہٰذا وہ حکم کے مطابق رک تو گیا مگر جھنجلا کر بولا "اس نے مجھے خواہ مخواہ... گندی گالی دی ہے۔ میری بیوی کو چیلنج کیا ہے۔ ابھی انصاف کیا جائے ورنہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

کِم کریزی نے گھور کر باڈی بلڈر کو دیکھا، پھر پوچھا۔ "کیا تم نے گالی دی تھی؟"

"مجھے غصہ آ گیا تھا۔ منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی۔"

"تمھاری سزا یہ ہے کہ چُپ چاپ کھڑے رہو۔ کرم داد تمھاری پٹائی کرے گا۔"

وہ سر جھکا کر اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ کرم داد نے جھنجلا کر پاؤں پٹختے ہوئے کہا "مسٹر کریزی! کیا تم مجھے بزدل سمجھتے ہو۔ میں للکارنے والوں کی زبان کھینچ لیتا ہوں، گردن توڑ دیتا ہوں۔ یہ تو سر جھکائے کھڑا ہے۔"

"اگر یہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا ہے اور اس نے تمھارے سامنے سر جھکا لیا ہے تو معاف کر دینا چاہیے۔"

کرم داد نے کریزی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "یو مسٹر کریزی! تمھارے ماسٹر کی نے ایک بنیادی بات سمجھائی ہے کہ دشمن خواہ کتنا ہی سر جھکا لے، معصوم بن جائے، اپنی کمزوری کا اعتراف کرے لیکن اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہی وقتی طور پر کمزور ہونے والا دشمن بعد میں طاقت حاصل کر کے خطرہ بن سکتا ہے۔ میں ٹی ڈی سینٹر سے جو کچھ سیکھ کر نکلا ہوں، تم اس کے برعکس مجھے سکھا رہے ہو۔"

"کبھی کبھی مصلحتاً اصول کے خلاف چلنا پڑتا ہے تاکہ دوستی قائم رہے۔ اگر یہ آئندہ تمھارا دشمن بنے گا یا کبھی تمھارے لیے گالی نکالے گا تو میری طرف سے کھلی چھٹی ہے، تم اسے مار ڈالنا یا خود مر جانا۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔"

ریحانہ نے کرم داد کے قریب آ کر اس کے بازو کو تھام کر کہا "ہمیں اپنے لیڈر کی بات مان لینی چاہیے۔ غصہ تھوک دو۔ یہ آئندہ گالی دے گا تو اس کے منہ پر تھوک دینا۔"

معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ کِم کریزی اور زرینہ وغیرہ پھر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ کرم داد بھی ان کے ساتھ

تھا۔ وہ اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ بابر کو کس طرح اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ کِم کریزی کہہ رہا تھا۔ "اسے پھر ساتھن دی گریٹ کے گروہ میں بھیج دیا جائے۔ وہاں پہنچ کر یہ ہمارے لیے جاسوسی کرتا رہے گا اور ان کے ساتھ رَل مِل کر رہے گا۔"

کرم داد اور زرینہ نے پوچھا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہاں جانے کے بعد یہ ہمارے لیے کام کرتا رہے گا۔ اوّل تو یہ کسی طرح ہمارے قابو میں نہیں رہے گا جب اس کی یادداشت واپس آئے گی تو ہمارے ہاتھ بالکل نہیں آئے گا۔"

کبیر داس نے کہا۔ "ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے لیکن یہ اپنے آپ کو بھول چکا ہے، اپنی کسی کمزوری کو کیا یاد رکھے گا۔ البتہ کوئی ایسی تدبیر سوچی جائے کہ یہ ہمارا محتاج بن جائے۔ ہمارے سہارے کے بغیر ایک قدم نہ چل سکے۔ تب یہ ہمارے احکامات کی تعمیل کرے گا۔"

وہ سب باری باری بول رہے تھے۔ اپنے طور پر مشورے دے رہے تھے۔ کِم کریزی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "ایک تدبیر ذہن میں ہے۔ بابر کی باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اسے اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت ہے حالانکہ بیوی آمنہ ہی ہے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے۔ ہوسکتا ہے ہماری معلومات غلط ہوں۔ آمنہ سے پہلے بھی اس کی بیوی اور بچے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں اس کی نفسیات سے کھیلنا ہوگا۔ ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ واقعی اس کی بیوی اور دو چار بچے ہیں جو اس کی گمشدگی سے پریشان ہیں۔ اگر وہ بیوی بچے اچانک اسے مل جائیں تو یہ ان میں گھل مل جائے گا۔ انھیں دل کی گہرائیوں سے اپنائے گا پھر ہم ان بیوی بچوں کو اس کی کمزوری بنا سکیں گے۔"

زرینہ نے کہا۔ "یہ تو لمبا کھیل ہے۔"

"کوئی لمبا کھیل نہیں ہے۔ چٹکی بجا کر یہ کام ہو جائے گا۔ ہم اسے باہر لے چلیں گے، سیر کرائیں گے اور وہیں اچانک بیوی بچے مل جائیں گے۔"

"ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارے سنڈیکیٹ میں ایسی کون عورت ہے جس کے دو چار بچے ہوں۔"

کریزی نے کہا۔ "ہماری 'سی' کلاس میں ایسی بہت سی عورتیں ہیں جو فیملی لائف گزار رہی ہیں۔ جن کے شوہر بھی ہیں اور بچے بھی۔"

دہشت گردوں کی تنظیم میں ہر طرح کے، ہر مزاج کے اور ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایسی تنظیم کی 'اے' کلاسوں میں کِم کریزی جیسے اونچے درجے کے افراد ہوتے ہیں جو دولتمند، باصلاحیت اور وسیع ذرائع کے مالک ہوتے ہیں۔ 'بی' کلاس میں کرم داد، ریحانہ، زرینہ اور کبیر داس جیسے افراد ہوتے ہیں۔ ان کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ آل راؤنڈر یعنی ہر فن مولا ہوتے ہیں۔ یہ 'اے' کلاس بھی مانے جاتے ہیں اور 'سی' کلاس کا کام بھی کر جاتے ہیں۔ کسی کام سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ جہاں ذہانت آزمانے کی بات ہو یہ وہاں ذہانت آزماتے ہیں۔ جہاں لڑنے مرنے کی بات ہو یہ وہاں موت بن کر چھا جاتے ہیں۔

بہرحال بات یہ طے پا رہی تھی کہ میرے لیے فیملی کا انتظام کیا جائے اور فوراً ہی کیا جائے۔ کبیر داس نے کہا۔ "ہماری 'سی' ٹیم میں ایک ایسی بنگالی فیملی ہے جو یہاں برسوں سے آباد ہے۔ وہ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں نہیں گئے۔ پاکستان میں ہی اس لیے رہ گئے کہ ہمارے سینٹر سے یہی حکم دیا گیا تھا۔ آج وہ خاندان ہمارے کام آسکتا ہے۔"

کریزی نے پوچھا۔ "اس فیملی میں کوئی ایسی عورت ہے جو ہمارے کام آسکے؟"

"عورت اور مرد دونوں ہی ہمارے کام آتے رہے ہیں۔ عورت کی عمر زیادہ ہے۔ اس کے جوان بچے ہیں۔ ایک جوان لڑکی ہے۔ بنگالی ہے لیکن اس نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے ہمارا کام اس طرح بن سکتا ہے کہ آمنہ اور بابر بھی سابق مشرقی پاکستان سے نیپال گئے تھے، نیپال سے پیرس پہنچے تھے۔ وہ لڑکی آمنہ کا رول ادا کرے گی۔ اپنا نام آمنہ نہیں کچھ اور بتائے گی اور یہ ہسٹری بیان کرے گی کہ اپنے شوہر یعنی بابر کے ساتھ سابق مشرقی پاکستان سے نکل کر نیپال آئی تھی، وہاں سے کراچی آگئی تھی۔ رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک دن بابر اپنے ایک دولتمند دوست کے ساتھ پیرس چلا گیا۔ وہ اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ اس کی طرف سے کوئی خط بھی نہیں آیا۔ کوئی خبر بھی نہیں ملی۔ اس وقت تک وہ اس کے ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔"

زرینہ نے کہا۔ "لیکن بابر کے دماغ میں تو یہ بات ہے کہ اس کے دو چار بچے ہیں۔"

"اس کے دماغ میں ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی یادداشت خود اس کے لیے قابلِ یقین نہیں ہے۔ جب اس کی بیوی کہے گی کہ وہ اس کے ایک ہی بچے کی ماں ہے تو اسے تسلیم کرنا ہوگا۔"

کِم کریزی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "بنگالی فیملی میں چھوٹے بچے بھی ہوں گے یعنی اتنے چھوٹے جن کی عمر زیادہ سے زیادہ تین برس ہو۔ یہ کہا جائے کہ جب وہ بابر کے ساتھ

بنگلہ دیش سے آرہی تھی تب ماں بننے والی تھی۔ بابر سے بچھڑنے کے بعد ماں بن گئی۔ اس لیے بچہ اپنے باپ کو صورت شکل سے نہیں پہچانتا ہے۔"

کرم داد نے کہا۔ "لیکن وہ بچہ تو اسی بنگالی فیملی کا ہوگا۔ اس لڑکی کا بھائی ہوگا۔"

ریحانہ نے کہا۔ "یہ تو اور اچھی بات ہے، وہ بچہ اپنی بہن کو بہن ہی کہتا ہو اور اس کی بہن بابر کی بیوی کی حیثیت سے یہ بتائے گی کہ بچہ نانا نانی کے پاس پرورش پاتا رہا اور اپنی ماں کو بہن سمجھتا رہا۔ ماں باپ نے بھی اسے ماں کہنے نہیں دیا۔ ان کا خیال تھا کہ بابر نہیں آئے گا تو کہیں اس کی شادی کر دیں گے اور لوگوں کو یہ نہیں بتائیں گے کہ وہ ایک بچے کی ماں ہے۔ بعض خاندانوں میں اس قسم کے فراڈ ہوتے ہیں۔ بابر ہمارے اس ڈرامے کو حقیقت سمجھ کر قائل ہو جائے گا۔"

اس پلاننگ سے سبھی متفق ہو گئے۔ کِم کریزی نے حکم دیا۔ "کبیر! تم فوراً اس بنگالی فیملی کے ہاں جاؤ۔ اس لڑکی کے لیے بابر کے سلسلے میں تمام ضروری معلومات فراہم کرو۔ زرینہ تمھارے ساتھ جائے گی اور اس لڑکی کو مکمل معلومات اور۔۔۔ اہم مشورے دے گی۔"

کبیر اور زرینہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے کی دوسری پیالی پی رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے وہاں رکھے ہوئے انگریزی کے رسالے کھول کر ورق گردانی کرنے لگتا تھا اور اس طرح خیال خوانی کرتا جاتا تھا۔ زرینہ اور کبیر کے جانے کے بعد ان کا سرغنہ کِم کریزی میرے پاس آگیا تھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے مجھے مزید آزماتا جا رہا تھا۔ میری اسٹڈی کرتا جا رہا تھا کہ وہ مجھے کس حد تک اپنے کام کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ آخر اس نے رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "نو بج رہے ہیں مسٹر بابر! کیا خیال ہے، ہم کہیں باہر چلیں، کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔ چاندنی رات میں سمندر کے ساحل پر بڑا لطف آتا ہے۔"

اس کی بات سنتے ہی میں نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔ پھر خلا میں تکتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "چاندنی رات، سمندر کا ساحل اور، اور۔۔۔"

کِم کریزی نے میری طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمھیں کچھ یاد آرہا ہے؟"

میں نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو تھام لیا پھر کہا۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے چاندنی رات کا اور سمندر کے ساحل کا میری زندگی سے گہرا تعلق ہو۔"

وہ چٹکی بجا کر بولا۔ "پھر تو ہم ضرور ساحل پر چلیں گے۔ ہوسکتا ہے تمھیں کچھ اور باتیں یاد آجائیں۔ ذرا ایک منٹ، میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ باتھ روم جانے کے بہانے دوسرے کمرے میں گیا۔ فوراً چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکال کر اسے آپریٹ کیا۔ زرینہ سے رابطہ قائم ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "اس لڑکی کو یہ سمجھا دو کہ بابر نے ابھی کچھ باتیں یاد کی ہیں۔ ان کا تعلق چاندنی رات اور سمندر کے ساحل سے ہے۔ ان دو باتوں کو لے کر وہ لڑکی کوئی ڈراما پلے کر سکتی ہے۔ ڈیٹس آل۔"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کرم داد کو ٹرانسمیٹر دیتے ہوئے کہا۔ "اسے ہماری گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھ دو اور تم ریحانہ کے ساتھ یہیں رہو۔ میں بابر کو لے کر جا رہا ہوں۔"

میں دس منٹ کے بعد ہی کِم کریزی کے ساتھ کار میں بیٹھا سمندر کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے ذرا پریشان ہو کر پوچھا۔ "تم مجھے اتنی آزادی سے لیے جا رہے ہو۔ اگر آمنہ یا گلزاری بیگم نے یا مائخل شوف نے دیکھ لیا تو؟"

"میں ان کو چٹکیوں میں مَسل سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ ویسے وہ تمھیں نہ دیکھ سکیں تو بہتر ہے کیونکہ تم میرے بہت کام آسکو گے۔"

"میں تمھارے کس طرح کام آسکتا ہوں؟"

"یہ ابھی نہ پوچھو۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنے ماتحتوں کو حکم دیا ہے، وہ تمھارے بیوی بچوں کو تلاش کریں گے۔ میرا ایک بہت ہی دلیر ساتھی ہے۔ وہ مائخل شوف کی کوٹھی میں جائے گا اور ان کے خفیہ ریکارڈ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ہوسکتا ہے، تمھارے ماضی کے متعلق انھیں بہت کچھ معلوم ہو۔ تمھارے بیوی بچوں کا پتا شاید وہ جانتے ہوں۔ اس طرح ہم جلد ہی تمھارے عزیزوں کو تمھارے پاس لے آئیں گے۔"

میں نے احسان مندی سے کہا۔ "آپ کتنے اچھے ہیں۔ مجھے ایسے ہی لوگ پسند ہیں۔ جانے کیوں مجھے عورتوں سے نفرت ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ پہلی ہی ملاقات میں انگلی نہیں پکڑتیں، پہنچا پکڑ لیتی ہیں۔ توبہ توبہ۔۔۔"

میں اس سے باتیں کرتا تھا جب وہ جواباً مجھ سے باتیں کرنے لگتا تو میں کچھ سنتا تھا اور کبھی خیال خوانی کی پرواز کرتا ہوا زرینہ اور کبیر کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ وہ جو سکھا رہے تھے، لڑکی سیکھ رہی تھی۔ میں آسانی سے اس لڑکی کے دماغ میں بھی پہنچ رہا تھا اور بہت کچھ معلوم کرتا جا رہا تھا۔

ہم نے کلفٹن کے ریستوران میں رات کا کھانا کھایا کھانے کے بعد میں نے عادت کے مطابق چائے پی پھر کِم کریزی نے کہا۔ "آؤ ذرا ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں دور تک چلیں۔"

میں دُور تک جانے کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ پلاننگ کے مطابق وہ مجھے ملنے والی تھی۔ پورے چاند کی روشنی بڑی ہی صاف شفاف اور اُجلی تھی۔ دور تک کھلا آسمان نظر آرہا تھا۔ سفید بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ حدِ نظر تک سمندر کو بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ ہم ننگے پاؤں ریت پر چلنے لگے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چلنے سے ایک تو ٹھنڈک محسوس ہوتی تھی دوسرے ہلکی ہلکی سی گدگدی ہوتی تھی۔ خصوصاً ایسے وقت جب سمندر کی کوئی لہر آتی اور ہمارے پاؤں کو چھوتی ہوئی دور نکل جاتی۔ جب لوٹ کر آتی تو ہمارے قدموں تلے سے ریت سرکنے لگتی۔ ایسے ہی وقت گدگدی کا احساس ہوتا تھا جیسے کوئی چھیڑ رہا ہو اور چھیڑنے والا نظر نہ آرہا ہو۔

پھر وہ نظر آگئی۔ ہم ٹہلتے ہوئے دور نکل آئے تھے۔ منصوبے کے مطابق وہ دور ویرانے سے چلی آرہی تھی۔ ابھی وہ دس گز کے فاصلے پر تھی کہ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ جہاں تھی وہیں رک گئی۔ ہولے سے بڑبڑانے کے انداز میں بولی۔

"بابر! کیا تم ہو؟"

میں یہ سنتے ہی ایک دم سے رک کر اسے یوں تکنے لگا جیسے کوئی جانی پہچانی آواز سنائی دی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جانی پہچانی تھی۔ ایسی صورتیں، سراپا مورتیں خوابوں میں، خیالوں میں آتی ہیں اور جان پہچان کر کے چلی جاتی ہیں۔ پھر زندگی کے کسی موڑ پر اچانک ہی سامنے آجاتی ہیں۔

ساری کو دلکش انداز میں پہننے کا ہُنر بنگالی عورتوں پر ختم ہے۔ میں نے ململ کی ساری میں سحرِ بنگال کو آنکھیں مَل مَل کے دیکھا۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ میں کبھی بنگال نہیں گیا اگر جاتا تو کبھی نہ آتا۔ سُنا ہے وہاں جانے کے سو راستے ہیں، آنے کا ایک راستہ بھی نہیں ہے۔ بنگال کا جادو ایک عالم میں مشہور ہے اور وہ جادو میرے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ اٹھائے میری طرف یوں آہستہ آہستہ آرہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو، خواب میں دیکھ رہی ہو اور مجھے چھو کر یقین کرنا چاہتی ہو کہ گمشدہ جیون ساتھی خواب میں بھی مل سکتا ہے یا نہیں؟

پھر اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ "تم، تم! میرا مطلب ہے میں کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟"

کِم کریزی نے پوچھا۔ "مس! تم کون ہو۔ کیا میرے دوست کو پہچانتی ہو؟"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "پہچانتے تو وہ ہیں جو بھولتے ہیں۔ میں اپنے جیون ساتھی کا چہرہ مرتے دم تک نہیں بھول سکتی بابر! تم خاموش کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں۔ کیا پردیس جا کر مجھ جیسی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کو بھلا دیا؟ مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے کبھی دیکھا نہ ہو۔ میں تمھارے ایک ایک قدم کی، ایک ایک سانس کی ساتھی رہی ہوں۔"

میں نے ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ آنکھیں بند کر کے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کیے، جیسے دماغ پر بوجھ پڑ رہا ہو۔ پھر میں نے کہا۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ آواز میں نے سنی ہے۔ یہ چہرہ میں نے کہیں دیکھا ہے۔ تم کون ہو؟"

وہ حیرانی سے بولی۔ "کیا؟ کیا تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو؟"

کریزی نے کہا۔ "مس! مجھے تمھیں مس نہیں کہنا چاہیے کیونکہ تمھاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم میرے دوست کی بیوی ہو۔ میں تمھیں بتا دوں، یہ بے چارہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔ اپنے بارے میں سب کچھ بھول چکا ہے۔"

وہ بے یقینی سے دیکھنے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔ غضب کی اداکارہ تھی۔ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے دل ٹوٹ کر آنکھوں میں آگیا ہو۔ "آہ! تم اور مجھے بھول گئے۔ مجھے کیسے یقین آئے کہ تمھاری یادداشت گم ہو گئی ہے۔ کیا تم مجھ سے کترانا چاہتے ہو؟ مجھے چھوڑ کر کسی اور کو اپنانا چاہتے ہو؟"

کریزی نے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ بے چارہ آپ کو نہیں پہچانتا ہے، تمھیں کیسے پہچانے گا۔ اگر واقعی تم اس کی وائف ہو تو کسی طرح اس کی یادداشت واپس لاؤ۔ اسے بھولی بسری باتیں یاد دلاؤ۔"

وہ بڑی محبت سے میرے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ "بابر! میری طرف دیکھو، مجھے پہچانو، میں حُور بانو ہوں تمھاری حُور۔"

میں نے سوچنے کے انداز میں لفظ حُور کو ذرا کھینچ کر ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "حُور؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں"

میں نے یاد کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "بانو؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہاں تمھیں یاد آگیا نا؟ تم نے پہچان لیا ہے، نا؟"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔"

"یاد نہیں آرہا ہے تو اتنا سوچو کہ ایک شریف [illegible] خواہ مخواہ کسی کو اپنا شوہر کیوں کہے گی؟ تم سے میرا دل کا، دماغ کا، روح کا، مذہبی اور قانونی رشتہ ہے۔ میں اس سمندر کے ویران ساحل پر تو کیا انسانوں کی بھری آبادی میں چیخ چیخ کر دعویٰ کروں گی کہ تم میرے شوہر ہو۔ میرے مجازی خدا ہو۔"

میں نے دُور ایک طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی یہی دعویٰ کرتی تھی۔ وہ بھی دنیا والوں کے سامنے مجھے شوہر کہتی تھی۔"

"کون؟ وہ کون چڑیل ہے جس نے تم پر جادو کر دیا ہے، جس نے تمھارا دماغ میری طرف سے پھیر دیا ہے؟"

"اس نے میرا دماغ نہیں پھیرا ہے۔ بس مجھے یاد نہیں آتا۔ جانے یہ عورتیں میرے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہیں؟ اس کا نام آمنہ ہے۔ وہ پیرس سے یہاں تک میری بیوی بن کر آئی۔ یہاں آتے ہی ان لوگوں نے ایک دوسری عورت کو میری بیوی بنا کر مجھے ہسپتال بھیج دیا۔ مجھے کسی کا خواہ مخواہ بیوی بن جانا اچھا نہیں لگتا۔ یہ کتنی غلط بات ہے۔ تم عورتوں کو شرم آنی چاہیے۔"

"شرم انھیں آنی چاہیے جو خواہ مخواہ بیویاں بنتی ہیں۔ میں تمھاری جائز بیوی ہوں۔ تمھارے بچے کی ماں ہوں۔"

"میرا بچہ؟" میں نے چونک کر یوں کہا جیسے بچے کی محبت جوش مار رہی ہو۔ کِم کریزی نے کہا۔ "ہاں، بابر! یاد کرو۔ تم نے بتایا تھا کہ تمھاری ایک بیوی ہے اور بچے ہیں۔ وہ اس دنیا میں کہیں تمھارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمھیں کچھ یاد نہیں آتا پھر بھی تمھارا دل کہہ رہا تھا۔ اب یہ سچ ثابت ہو رہا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں، یہ حُور بانو تمھاری بیوی ہے اور اس کا بچہ تمھارا بچہ ہے۔"

"بچہ کہاں ہے؟"

حُور بانو نے کہا۔ "اپنے نانا، نانی کے پاس ہے۔ اِدھر میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے، ایک طرف لے جاتے ہوئے کبھی سمندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر، کبھی آسمان کی طرف چاند دکھا کر کہا۔ "یاد کرو، یہ وہی ماحول ہے، یہ وہی منظر ہے جہاں ہم بارہا آتے رہے ہیں اور اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ تمھارے جانے کے بعد میں اس جگہ کو بھلا نہ سکی۔ اکثر اس چاندنی رات میں آتی رہی ہوں۔ آج بھی تمھاری یاد دل کے سہارے یہاں تک آگئی۔ تم اکثر کہا کرتے تھے۔ "حور بانو! تمھاری آواز میں رس ہے، ترنم ہے۔ مجھے چاندنی اور ساحل سے متعلق کوئی گیت سناؤ" اور میں سناتی تھی۔ ہم جب بھی یہاں آتے تھے میں وہی گیت گاتی تھی۔ بار بار گانے کے باوجود گیت کے بولوں میں ایک نیا جذبہ، ایک نئی امنگ کا احساس ہوتا تھا۔ پھول کی خوشبو، چاند کی چاندنی اور ایک کتاب کی سچائی کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھو، مجھ میں پھول کی خوشبو ہے۔ چاندنی کا نکھار ہے اور ایک کتاب کی وہ سچائی ہے جو عورت کی وفا میں ہوتی ہے۔ کیا میں پرانی ہو سکتی ہوں؟ نہیں، ہرگز نہیں، مجھے دیکھو، مجھے پہچانو، مجھے یاد کرو۔"

میں سحر زدہ ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ سچ مچ سحر زدہ ہو گیا تھا۔ وہ صرف حسین اور جوان نہیں تھی، اس میں صرف حسنِ ادا نہیں تھی، وہ حسنِ کلام کو بھی سمجھتی تھی۔ نہایت باذوق تھی۔ شاعرانہ انداز میں بولتی تھی۔ اس کا ذوق بتا رہا تھا کہ وہ صرف اوپر سے نہیں، اندر سے بھی، دل سے بھی، دماغ سے بھی اور اپنے خیالات کے اعتبار سے بھی حسن کا حرفِ آخر ہے۔

کِم کریزی نے ہمارے قریب آکر کہا۔ "مسز حور بانو! بابر کو یقین نہیں آئے گا کیونکہ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے لیکن مجھے یقین آگیا ہے، تم واقعی ان کی وائف ہو۔ میرا خیال ہے، اگر تم انھیں اپنے ساتھ رکھو گی اور آہستہ آہستہ پچھلی باتیں یاد دلاؤ گی تو انھیں سب کچھ یاد آجائے گا۔"

وہ حُور بانو کو مجھے ساتھ رکھنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ میری یہ حالت تھی کہ میں خود اس کا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اداکاری لازمی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا مجھے پھر ایک نئی بیوی کے ساتھ رہنا ہوگا؟"

کریزی نے کہا۔ "بے وقوف! یہ تمھاری اصلی بیوی ہے۔"

"مسٹر کریزی! میں کتنی بیویوں سے بھاگتا پھروں گا۔ اس کے ساتھ رہوں گا تو یہ میرا پیچھا کرے گی۔"

"ہم تمھاری نگرانی کریں گے۔ حفاظت کریں گے۔ کوئی دشمن تمھارے قریب نہیں پہنچے گا۔ مسز حور بانو! بہت سے جانے، انجانے دشمن تمھارے شوہر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اگر تم ان کی بھلائی چاہتی ہو اور ان کی یادداشت واپس لانا چاہتی ہو تو تمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا تاکہ ہم ان کی حفاظت کرتے رہیں۔"

"میں ان کے ساتھ دنیا کے آخری سرے تک چلنے کو تیار ہوں۔"

"بہتر ہوگا، تم اپنے گھر والوں کو فون کے ذریعے اطلاع دے دینا کہ آج نہیں آسکو گی۔"

"ہمارے پڑوسی کے ہاں فون ہے۔ میں اطلاع دے دوں گی۔"

میں نے پوچھا۔ "اور وہ بچہ جسے تم مجھ سے منسوب کر رہی ہو کیا تم میری خاطر بچے کو چھوڑ دو گی؟"

"بچہ یوں بھی اپنے نانا اور نانی سے ہلا ہوا ہے۔ وہ مجھے ماں نہیں، بہن کہتا ہے۔ اب میں تمھیں کیا بتاؤں۔ تقریباً تین برس گزر رہے ہیں۔ تم نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ میرے والدین مجبور کرتے رہے کہ میں دوسری شادی کرلوں اور میں اب تک انکار کرتی رہی ہوں ــــ انھوں نے میری شادی کرانے کے لیے میرے بچّے کو سکھایا ہے کہ وہ مجھے بہن کہے تاکہ کہیں بھی میری شادی ہو تو کوئی مجھے بچّے والی عورت نہ سمجھے۔"

"اگر وہ میرا بچہ ہے تو میں اس سے ضرور ملوں گا۔ اسے ضرور دیکھوں گا۔"

"پھر میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میرے والدین تم سے مل کر خوش ہوں گے۔ ان کے دماغ سے میری دوسری شادی کی بات نکل جائے گی۔ ویسے دوسری شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ہم وہاں سے حُور بانو کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ خوب ڈراما ہو رہا تھا۔ ہماری اتنی بڑی دنیا میں اور ہوتا کیا ہے؟ سب ایک دوسرے کے ساتھ ڈراما کرتے ہیں۔ ایک شخص سمجھتا ہے کہ وہی دوسرے سے کھیل رہا ہے۔ اسے خبر نہیں ہوتی کہ دوسرا بھی اس سے کسی نہ کسی انداز میں کھیل رہا ہوتا ہے۔ پھر نتیجہ سامنے آنے کے بعد ہی اصل کھیل کا پتا چلتا ہے۔

ہم حُور بانو کے مکان میں پہنچ گئے۔ وہاں اس کے والدین پہلے سے ہی سکھائے پڑھائے گئے تھے۔ انھیں بتایا گیا کہ میں پردیس سے واپس آگیا ہوں اور اچانک سمندر کے کنارے ملاقات ہوئی ہے۔ انھوں نے بھی حیرانی اور خوشی کا اظہار کیا۔ بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے پوچھا۔ "میرا وہ بیٹا کہاں ہے؟"

میری خواہ مخواہ کی ساس بچّے کو لینے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میرے خواہ مخواہ کے سسر نے کہا۔ "جب تم یہاں سے گئے تو بیٹا پیدا ہونے ہی والا تھا۔ وہ تو تمھیں پہچانتا ہی نہیں ہے پھر ہم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ حور بانو اس کی ماں ہے۔"

وہ وہی کہہ رہا تھا جو اسے سکھایا گیا تھا گویا کہ ریکارڈ کی طرح بج رہا تھا پھر ایک تین برس کا خوبصورت سا لڑکا آیا۔ میں نے اسے گود میں لے کر پیار کیا۔ اس کا نام پوچھا۔ حور بانو بچّے کو میری گود میں دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ وہ اس کا بھائی تھا لیکن اس کے دماغ میں شہنائیاں سی بج رہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی "میری بھی شادی ہوگی۔ کوئی ایسا ہی شوہر ہوگا جس سے میں پیار کروں گی۔ اس کی خدمت کروں گی۔ اس کے لیے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دوں گی۔ وہ بھی اسی طرح میرے بچّے کا ٹھاکس پیار کرے گا۔"

میں نے اس کی سوچ میں سوال پیدا کیا "کیا وہ ایسا ہوگا۔ بالکل بابر کی طرح؟"

اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میرے چہرے پر ایک آئیڈیل کی تمام خصوصیات کو تلاش کر رہی تھی پھر اعتراف کر رہی تھی۔ "ہاں ایسا ہی ہوگا، میرا وہ ہونے والا شوہر ایسا ہی ہوگا۔"

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ یوں گھبرا گئی جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ اس وقت بیوی کا رول ادا کرنا بھول گئی تھی۔ اس لمحے یہی بات دماغ میں بسی ہوئی تھی کہ وہ آئیڈیل دیکھ رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی شرما کر نظریں جھکا لیں۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "یہ کیا ہے مجھے اپنے شوہر سے اس طرح نہیں شرمانا چاہیے آنکھیں ملانا چاہیے۔"

اس کے لیے بڑی مشکل ہوگئی۔ عمر بیوی بننے کی نہیں تھی مگر حالات اسے نقلی بیوی بننے پر مجبور کر رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے نظریں اٹھائیں۔ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں قربان ہو رہی ہو۔ دل پوچھ رہا تھا کیا بیوی کی حیثیت سے قربان ہو رہی ہے یا آئیڈیل پر؟ وہ پھر پریشان ہوکر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے بلو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بلو ہمارے ساتھ جائے گا؟"

حُور بانو نے چونک کر اپنے والدین کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ "بلو میری امّی کے بغیر نہیں رہتا۔ ہمارے ساتھ جائے گا تو پریشان کرے گا۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا۔ "لیکن بلو میرے ساتھ رہے گا تو میری حفاظت کرے گا۔ جب بھی میرا نام ذہن میں آنا چاہے گا، میں بلو کو کسی نہ کسی طرح جگا دوں گی۔"

اس کی اپنی سوچ نے کہا۔ "یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ اگر میں اس کے ساتھ جاؤں گی تو پھر کیا ہوگا؟ ادہ گاڈ! میں تو بری طرح پھنس جاؤں گی۔"

اس نے فوراً ہی کہا۔ "بلو ہمارے ساتھ جائے گا۔ میں اسے لے جا رہی ہوں۔ کل لے آؤں گی۔"

بلو نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔"

حور بانو نے کہا۔ "تم چلو تو سہی۔ تمھیں بہت سے کھلونے دلاؤں گی۔ تم کھلونے بھی خریدنا چاہتے تھے نا؟"

وہ خوشی سے راضی ہوگیا۔ کوئی بھی شخص کباب میں ہڈّی نہیں چاہتا لیکن میں چاہتا تھا۔ میں نے حور بانو کے دماغ کو، اس کی ہسٹری کو اچھی طرح پڑھ لیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت چالاک تھی۔ غضب کی اداکاری کرتی تھی۔ اس کے والدین دہشت گردوں کی تنظیم میں رہ کر طرح طرح کے فراڈ کرتے آئے تھے۔ نہ جانے کتنے جرائم کیے تھے۔ حور بانو ان کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے والدین سے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن ابھی تک بے حیائی نہیں سیکھی تھی۔

ہر لڑکی کی طرح اس کے دل میں بھی ایک آئیڈیل کی آرزو تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ چاہنے والا کون ہوگا، کیسا ہوگا مگر ایک دُھندلا دُھندلا سا خاکہ اس کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ کسی ایک سے محبت نباہنے اور کسی ایک کے لیے جینے مرنے والی لڑکی تھی لیکن اس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں اس کے اُجلے دامن پر بدنما دھبّہ لگ سکتا تھا۔ اگرچہ اس تنظیم میں بعض عورتیں شادی کرکے ازدواجی اور گھریلو زندگی گزارتی تھیں لیکن کسی مشن کے دوران وہ نہ تو کسی کی بیوی ہوتی تھیں، نہ کسی کی ماں، نہ کسی کی بہن، نہ کسی کی بیٹی۔ ماسٹر کی حکم دیتا تھا اور وہ کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت میں آجاتی تھیں۔ پھر حور بانو تو حسین بھی تھی، جوان بھی اور غیر شادی شدہ بھی تھی۔ تنظیم کا سربراہ ماسٹر کی یا کِم کریزی جیسے خاص ماتحت اپنے مفاد کی خاطر حور بانو کو کسی کے بھی سامنے چارے کے طور پر پھینک سکتے تھے۔ یہ بات حور بانو جانتی تھی۔ اس موضوع پر سوچتی تھی، پریشان ہوتی تھی، الجھتی رہتی تھی۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دیتی تھی، ایسا کوئی وقت آئے گا تو وہ اپنا دامن بچائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔

میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اسی لیے حُور بانو کے دل میں یہ بات پیدا کر دی تھی کہ اپنے تحفظ کے لیے بلو کو ساتھ لے جانا چاہیے۔ میں نے عورتوں کے دماغوں میں پہنچنے اور ان کے دلوں کو جبراً اپنے قابو میں رکھنے کے لیے کبھی ٹیلی پیتھی کا غلط استعمال نہیں کیا۔ جب میں نے دیکھا کہ کوئی گمراہ ہے تو اس راہ میں گم ہوگیا۔

ہم بلو کو لے کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ کِم کریزی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر میں حور بانو کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ کریزی چاہتا تھا کہ حور بانو مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب رہے اور میں اس کی طرف مائل ہو جاؤں لیکن حُور بانو نے میرے اور اپنے درمیان بلو کو بیٹھا دیا تھا۔

کریزی عقب نما آئینے میں کبھی کبھی دیکھتا تھا اور ہمارے درمیان بلو کو دیکھ کر ناگواری سے منہ بناتا تھا۔ اسے یہ پسند نہیں تھا کہ ڈیوٹی کے...... دوران کوئی بھی لڑکی اپنی پارسائی دکھائے۔ یقیناً اس سلسلے میں آئندہ حور بانو کو تنبیہہ یا سزا ملنے والی تھی۔

اس بے چاری نے صرف فاصلہ رکھا تھا۔ ورنہ مجھے ٹریپ کرنے کے سلسلے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام لے رہی تھی۔ مجھ سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ میرا ماضی مجھے یاد دلا رہی تھی جیسے واقعی میری شریکِ حیات رہ چکی ہو اور اس نے ہی میرے لیے بلو کو جنم دیا ہو۔

میں اس کی باتیں سنتا جا رہا تھا۔ کبھی بلو کو چھیڑتا بھی جاتا تھا لیکن اس دوران کرم داد کے پاس بھی پہنچ جاتا تھا۔ ابھی کار کے ذریعے ہمارا سفر طویل تھا۔ حور بانو کے گھر سے ہماری وہ کوٹھی بہت دور تھی، جہاں کِم کریزی نے اپنی ٹیم کے افراد کو پناہ دے رکھی تھی۔

میں نے ان افراد کے درمیان لڑائی کرا دی تھی۔ اگرچہ کرم داد نے اس باڈی بلڈر کو وقتی طور پر معاف کر دیا تھا۔ کریزی کے کہنے پر باڈی بلڈر نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا لیکن دونوں طرف ابھی اپنی اپنی اَنا کے باعث اپنی اپنی برتری کا غرور موجود تھا۔ پھر ـــــ میں اس غرور سے فائدہ کیوں نہ اُٹھاتا؟

کرم داد نے کہا تھا۔ کِم کریزی کے کہنے سے وہ اس باڈی بلڈر کو معاف کر رہا ہے لیکن وہ آئندہ گالی دے گا تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اس سے پہلے کہ کریزی ہمیں لے کر اس کوٹھی میں پہنچتا، میں نے پھر باڈی بلڈر کی زبان سے گالی نکلوا دی۔ اگر وہ اچانک ہی کسی جواز کے بغیر گالی دیتا تو شبہ ہوتا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے یا پھر یہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ میں نے ایسی غلطی نہیں کی، اس کا جواز پیدا کیا۔ پھر اسے گالی دینے پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دونوں الجھ پڑے۔ اس بار کرم داد نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ صرف باڈی بلڈنگ سے کچھ نہیں ہوتا آدمی صرف طاقت سے نہیں، اپنے داؤ پیچ سے برتری حاصل کرتا ہے۔ دوسرے باڈی بلڈر نے دیکھا کہ اس کا ساتھی زیر ہو رہا ہے۔ کرم داد سے خالی ہاتھ لڑنا حماقت ہوگی۔ اس نے چاقو سے حملہ کیا۔ کرم داد اگرچہ زخمی ہوا لیکن اس کے قدم اکھڑنے والے نہیں تھے۔ اس نے چاقو والے کو ایسے داؤ میں الجھایا کہ ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر گر پڑا۔ پھر تو اس کی بھی شامت آگئی ابتدا میں ریحانہ نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی تھی لیکن جب

اس نے دیکھا کہ کرم داد پر چاقو سے بھی حملہ کیا جا رہا ہے تو اس نے فرش پر گرے ہوئے چاقو کو کرم داد کی طرف اُچھال دیا۔اس کے بعد مجھے خیال خوانی کے ذریعے وہاں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔جب ہم کریزی کے ساتھ اس کوٹھی میں پہنچے تو کریزی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔پھر غصّے سے دہاڑتے ہوئے پوچھا" یہ کیا ہو گیا؟"

کرم داد کے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا۔اس کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔اس نے بھی جواباً غراتے ہوئے کہا "مسٹر کریزی! وہی ہوا جس کی پیشنگوئی ماسٹر کی نے کی تھی۔اس نے تم سب کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میں اپنے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا۔اس الّو کے پٹھے نے پھر مجھے گالی دی تھی اور میں نے اس کے جواب میں اپنا چیلنج پورا کر دیا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے خون آلود چاقو کو کریزی کے سامنے پھینک دیا۔حور بانو بلو کا منہ اپنے سینے میں چھپا کر دوسرے کمرے میں جانے لگی۔کریزی اس کے پیچھے پاؤں پٹختا ہوا گیا۔دوسرے کمرے میں پہنچ کر اس نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی میں کہا"تم بہت پارسا بننے کی کوشش کر رہی ہو۔اس بچّے کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی اور لے کر آئی ہو تو اس کے اور اپنے درمیان اسے دلوار کیوں بناتی ہو۔پھر اس کا منہ چھپا کر اس کمرے سے یہاں کیوں آ گئیں۔کیا تم نہیں جانتیں کہ جو شخص ہماری تنظیم سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے ذریعے اس کی بیوی بچّے سبھی اس تنظیم کے مزاج کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔بچّے اسی مزاج کے مطابق پرورش پاتے ہیں۔یہ بلو اگر دو لاشوں سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا تو اسے اور دیکھنا چاہیے۔تم نے اس کا مُنہ کیوں چھپایا؟"

وہ عاجزی سے بولی" مجھے معاف کر دیجیے۔زندگی میں پہلی بار تنظیم کے ایسے مس[illegible]ں ہو رہی ہوں۔میں نے اب تک انسانوں کی طرح زندگی گزا[illegible] ہے۔اب نہیں گزاروں گی۔آپ کا حکم ہو گا تو بلو کو لاشو[illegible]ے سرہانے بٹھا دیا کروں گی۔"

اس نے سر سے پاؤں تک [illegible]ے گھور کر دیکھا۔پھر تسلیم کرتے ہوئے کہا" واقعی تم پہلی بار ہمارے مشن میں شریک ہو رہی ہو۔ویسے تم نے بہت اچھا رول ادا کیا ہے۔آئندہ کے لیے محتاط رہو۔اسے اچھی طرح یاد رکھو۔تمہارے بیڈ روم میں بلو نہیں جائے گا۔"

"مسٹر کریزی! یہ اجنبی ماحول میں میرے بغیر نہیں [illegible] ہے گا۔میرے بغیر نہیں سوئے گا۔"

"پہلے اسے سُلانے کی کوشش کرو۔"

"جی بہت اچھا۔"

وہ بلو کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔وہاں بستر پر اسے لٹا کر تھپکنے لگی۔سمجھانے لگی"میرے اچھے بھائی سو جاؤ۔یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔تم نے دیکھا تھا۔دو آدمی مارے گئے ہیں۔جو بچّے بات نہیں سنتے، انھیں یہ مار ڈالتے ہیں۔اس لیے سو جاؤ۔"

بچّوں کو اَن دیکھے بھوتوں سے ڈرایا جائے تو وہ ڈر کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سو جاتے ہیں جبکہ اس بچّے نے تو، دو لاشیں دیکھی تھیں اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر وہ بات نہیں مانے گا تو اسے بھی مار ڈالا جائے گا۔اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔دوسری طرف کریزی اور کرم داد وغیرہ کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔وہ کوٹھی کے پیچھے بڑا سا گڑھا کھود کر دونوں لاشوں کو چھپا رہے تھے۔کریزی نے مجھ سے کہا"تم اپنی وائف کے ساتھ آرام کر سکتے ہو۔ہم پتا نہیں کتنی رات کو سوئیں گے۔"

میں نے حور بانو سے پوچھا" بلو کہاں ہے؟"

"وہ سو رہا ہے۔"

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔پہلی بار میں اپنے بیٹے سے مل رہا ہوں۔پہلے اس سے باتیں کروں گا۔اس سے شرارتیں کروں گا۔پھر اسے سونے دوں گا۔"

کریزی نے کہا"مسٹر بابر! بچّہ سو رہا ہے اسے سونے دو۔"

میں نے کہا" اگر وہ سو رہا ہے۔تو میں اسے نہیں جگاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی میں نے خیال خوانی کے ذریعے بلو کو جگا دیا وہ اٹھ کر اجنبی ماحول میں چاروں طرف دیکھنے لگا پھر میں نے اسے چیخنے پر مجبور کیا" دیدی، بانو دیدی، تم کہاں ہو۔"

کریزی نے پریشان ہو کر اس کمرے کی طرف دیکھا۔میں نے کہا" دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ میرا بیٹا ہے۔ابھی میرے بغیر نہیں سوئے گا۔"

یہ کہہ کر میں اس کمرے میں گیا اور بلو کو اٹھا کر لے آیا۔اگر حور بانو اسے اٹھا کر لاتی تو یہ کریزی کے مزاج کے خلاف ہوتا۔وہ مجھ پر اعتراض نہ کر سکا۔میں نے حور بانو سے کہا" آؤ ہم اسے سُلائیں گے۔"

ہم ایک بہت ہی خوبصورت سے بیڈ روم میں آئے روا[illegible]ے کو بند کیا پھر بلو سے باتیں کرنے لگی۔وہ چاہتی تھی کہ پہلے میں سو جاؤں، اس کے بعد وہ بلو کو سلائے گی۔

جب تک وہ بہل رہی ہے اور بچّے کو بہلا رہی ہے، اس وقت تک میں ذرا جمال احمد جسکانی کی خبر لے لوں۔اس کے بعد ان تمام واقعات کو یکجا کر کے اس نتیجے پر پہنچوں گا کہ دشمن آخر ہمارے ملک میں چاہتے کیا ہیں؟

گوٹھ سارنگ میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔رجب علی سارنگ کی بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔یہ وہی بیٹی تھی جس کی منگنی اب سے دو برس چار ماہ پہلے ہوئی تھی۔اس منگنی کی تقریب میں جمال احمد جسکانی کی اندھی بہن لبنیٰ بھی شریک ہوئی تھی۔

اندھوں کو شادی بیاہ کی خوشیوں سے کیا سروکار، انھیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔تاہم دوسروں کی خوشیوں سے اندازہ لگا کر وہ خوش ہوتے ہیں۔اندھی لبنیٰ کو اس تقریب میں اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ بہت اچھا گاتی تھی۔گوٹھ میں جہاں بھی شادی بیاہ کی تقریبات ہوتی تھیں۔وہاں لبنیٰ کو بلایا جاتا تھا۔سبھی اس کی مترنم آواز کی تعریفیں کرتے تھے۔وہی بے چاری اندھی جب اس تقریب سے واپس گھر کی طرف آئی تو اغوا کر لی گئی۔اس کے بعد کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔

یہ قصہ پرانا ہو چکا تھا۔غریب کی عزت جاتی ہے تو کوئی قیامت نہیں آ جاتی لیکن دو برس چار ماہ بعد قیامت آ رہی تھی۔وڈیرے رجب علی سارنگ کی بڑی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہونے والی تھی۔بڑے زور و شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں اسی دوران وڈیرے رجب علی کو اغوا کر لیا گیا۔یہ خبر اس کا منشی لے کر آیا۔وہ سائیں سارنگ کے ساتھ شادی کے سلسلے میں خریداری کے لیے کراچی گیا تھا۔واپسی میں تنہا آیا۔اس نے بتایا کہ ڈاکوؤں نے اسے اغوا کر لیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ پچاس ہزار روپے کل شام تک جنگل میں نہ پہنچائے گئے تو وڈیرے کی لاش ملے گی۔

گوٹھ سارنگ کے تھانیدار نے اپنے اعلیٰ افسران سے درخواست کی کہ اسے پولیس پارٹی کی ضرورت ہے تاکہ جنگل میں جا کر اغوا ہونے والے وڈیرے سارنگ کو تلاش کیا جا سکے۔

افسران کی جانب سے تھانیدار کو بارہ مسلح سپاہی فراہم کیے گئے۔ایک جیپ کار بھی دی گئی۔وہ سب اسے تلاش کرنے کے لیے جنگل کی طرف روانہ ہوئے ——— اغوا کی خبر دور دور کے علاقوں تک پہنچ گئی تھی۔دوسرے دن کے اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہوئی۔ڈاکوؤں نے دوسرے دن شام تک کی مہلت دی تھی۔اس سے [illegible] گھنٹے پہلے گوٹھ سارنگ کا تھانیدار سپاہیوں کو لے کر جیپ میں بیٹھ کر جنگل کی طرف گیا تھا۔دوسری صبح ہونے سے پہلے آٹھ سپاہی زخمی حالت میں واپس آئے۔پتا چلا چار سپاہی مارے گئے تھے اور تھانیدار بھی غائب تھا۔

زخمی سپاہیوں نے بتایا کہ ڈاکوؤں کے پاس جدید اسلحہ ہے۔وہ کلاشنکوف اور اسٹین گن سے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں ان سپاہیوں کی پرانی بندوقیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ان سے پوچھا گیا۔کیا انھوں نے ڈاکوؤں کو پہچان لیا ہے؟

ایک نے کہا" میں پہچانتا ہوں۔وہ ڈاکو رانگا ہے۔اس نے دھمکی دی ہے اگر شام تک پچاس ہزار روپے نہ ملے تو وڈیرے کے ساتھ اب تھانیدار کی بھی لاش ہی ملے گی۔"

آخر ان کی شرائط کے مطابق وڈیرے کا منشی پچاس ہزار روپے لے کر جنگل کی طرف گیا۔آدھی رات کے بعد تھانیدار اور وڈیرہ سارنگ واپس آ گئے۔اس علاقے میں ڈاکو رانگا ماما کی دہشت پھیلی ہوئی تھی لیکن واپس آنے والے رجب علی سارنگ اور تھانیدار نے جو بیان دیا اسے سن کر جمال احمد جسکانی پر شبہ ہوتا تھا۔

ان کا بیان تھا کہ پچاس ہزار دینے کے بعد بھی جان چھوٹ نہیں سکتی۔ڈاکو رانگا ماما نے کہا ہے کہ وڈیرے رجب علی سارنگ کی بڑی بیٹی کی شادی میں سب موجود ہیں لیکن وہ اندھی نہیں ہے جو سہاگ کے گیت لہک لہک کر گاتی تھی۔لہٰذا شادی اسی شرط پر ہو سکے گی کہ اس اندھی کی کمی پوری کی جائے۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے رجب علی سارنگ اور تھانیدار کو جو مشورے دیے گئے تھے۔وہ ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔مشورے یہ تھے کہ رجب علی سارنگ اپنی دوسری بیٹی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے عارضی طور پر اندھی بنا لے۔وہ اندھی بن کر سہاگ کے گیت گائے گی۔پھر اس تقریب کے اختتام پر رجب علی سارنگ کی ملازمہ اسے اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھر سے باہر لے جائے گی۔ایسے وقت تھانے کے دو سپاہی اس عارضی اندھی کو اغوا کر کے تھانیدار کے گھر پہنچا دیں گے۔

اس مشورے پر نہ تو رجب علی سارنگ عمل کر سکتا تھا اور نہ ہی تھانیدار قانون اور اخلاق کے خلاف کوئی کام کر سکتا تھا۔کرنے کو تو لوگ چھپ کر سب کچھ کر لیتے ہیں مگر جس بات کی پبلسٹی ہو رہی تھی۔اس میں ملوث ہو کر بھلا کون اپنے آپ کو بدنام کرتا ہے۔ایسا تو کوئی پاگل ہی کر سکتا تھا۔

جب تک وہ ڈاکو رانگا ماما کے مشوروں پر عمل نہ کرتے اس وقت تک اس کی بڑی بیٹی کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔اس سلسلے میں جمال احمد جسکانی پر شبہ ہوا۔وڈیرے رجب علی سارنگ نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ ڈاکو رانگا ماما کے پیچھے جمال احمد جسکانی کا دماغ کام کر رہا ہے۔اس کے متعلق تحقیقات شروع ہوئیں۔گرفتے

مُردے اکھاڑے گئے۔ پتا چلا۔ وہ قتل کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا تھا لیکن وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔

اعلیٰ افسران نے اس کیس کی فائل طلب کی۔ دوسرے دن تک پتا چلا۔ فائل غائب ہے۔ بات اور آگے بڑھی تو پتا چلا عدالتی ریکارڈ بھی غائب ہو چکا ہے۔ جمال احمد جسکانی کے خلاف کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ صرف وہ چند گواہ ہیں جو آج بھی اپنے وڈیرے رجب علی سارنگ کے حکم کے مطابق اس کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں۔

تفتیش کے دوران انکشاف ہوا۔ جمال احمد جسکانی کراچی شہر میں موجود ہے اور پہلے کی طرح ایک مل میں اکاؤنٹنٹ کی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے اور مزدوروں کی یونین کا صدر بھی ہے۔ افسرانِ بالا کے حکم سے جب اسے گرفتار کرنے کے لیے ایک پولیس انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پہنچا تو وہ ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کر رہا تھا اور بڑی ہی جوشیلی تقریر کر رہا تھا۔ ہر طرف سے تالیاں بج رہی تھیں۔ انسپکٹر نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ اگر وہ ایسے وقت گرفتار کرتا تو پورا مجمع ان کے خلاف ہو جاتا۔ اس نے بڑی نرمی سے کہا "مسٹر جمال احمد جسکانی! آپ ہمارے ساتھ تھانے چلیں۔"

جمال احمد نے اپنے بیگ میں سے ایک کاغذ نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "چونکہ میں مزدوروں کا لیڈر ہوں اور کسی وقت بھی پولیس والے مجھے گرفتار کر سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے قبل از گرفتاری ضمانت لے رکھی ہے۔ یہ میرے ساتھ میرے وکیل بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ ضمانت نامہ ہے۔"

دوسری طرف گوٹھ سارنگ میں اندر ہی اندر لوگوں میں دہشت پھیل رہی تھی۔ جو جمال احمد جسکانی کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ تھے۔ وہ اپنے وڈیرے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہہ رہے تھے۔ "سائیں! ہم جمال کے خلاف گواہی نہیں دیں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہماری بہو بیٹیوں کی عزت نہیں رہے گی۔ ہمیں بھی اغوا کیا جائے گا۔"

جو بہت عرصہ پہلے جمال احمد جسکانی کے خلاف گواہی دے چکے تھے۔ انھوں نے اپنے پاس سے ایک ایک پرچی نکال کر وڈیرے کو دکھائی اور کہا "یہ ہمیں دھمکی والے خط ملے ہیں۔ یہ بھی دھمکی دی ہے کہ یہ خط پولیس والوں تک پہنچے گا تو ہماری خیریت نہیں رہے گی۔"

وڈیرہ رجب علی سارنگ ان خطوط کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا لیکن ان میں یہ دھمکی بھی لکھی ہوئی تھی کہ رجب علی سارنگ ان خطوط کو پولیس والوں کے حوالے کرے گا تو اس بار ایک لاکھ روپے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

ان تمام گواہوں نے اپنے وڈیرے کو وہ خطوط دکھانے کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے انھیں جلا دیا۔ اب جمال احمد جسکانی کے خلاف یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مختلف ذرائع سے دھمکیاں دے رہا ہے۔ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر شہر سے اطلاع ملی کہ جمال احمد جسکانی کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے پاس قبل از گرفتاری کے سلسلے میں ضمانت نامہ موجود ہے۔

وڈیرہ رجب علی سارنگ اب سے پہلے اتنا کمزور کبھی نہیں پڑا تھا۔ اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بیٹی کی شادی رک گئی تھی اور آئندہ کبھی یہ شادی ہو سکے گی یا نہیں اس کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ جمال نے اپنی بہن کے مجرم تھانیدار کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ دوسرا مجرم خود وڈیرہ سارنگ تھا۔ اسے بھی اپنے زندہ بچ رہنے کی امید نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کسی نہ کسی دن جمال اسے سخت اذیتیں دے دے کر مار دے گا۔

وہ دیوار سے لٹکی ہوئی رائفل کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا یہ رائفل کس کام آئے گی جبکہ پولیس والے بے بس ہو گئے۔ جمال نے پورے گوٹھ سارنگ والوں کے سامنے تھانیدار کو قتل کیا تھا۔ وہ اب قانون کی نظروں میں مجرم نہیں تھا۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اور کوئی گواہی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب وہ اپنی حفاظت کیسے کرے گا؟

جمال احمد جسکانی بڑی شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ اب وہ مل مالکان کا بھی ساتھ دیتا تھا۔ اس لیے مالکان اس سے خوش تھے۔ اسے رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ دے دیا تھا اور آنے جانے کے لیے ایک چھوٹی سی کار بھی دی تھی۔ وہ چاہتا تو تنظیم کی طرف سے بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ شاندار محل نما کوٹھی بنا سکتا تھا، ایئر کنڈیشنڈ گاڑیاں رکھ سکتا تھا لیکن فی الحال وہ قانون کو یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ اپنے مل مالکان کے طفیل یہ شاندار زندگی گزار رہا ہے۔

وہ ایک رات اپنے بنگلے میں پہنچا تو وہاں وڈیرے رجب علی سارنگ کی دونوں بیٹیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بنگلے کے برآمدے میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے ملازم ساتھ تھے۔ جمال نے بنگلے کے دروازے کو کھولتے ہوئے کہا "اندر آ جاؤ۔"

وہ اندر آ گئیں۔ ملازم باہر کھڑے رہے۔ جمال احمد جسکانی نے دونوں کو گھورتے ہوئے پوچھا "کیا وڈیرہ میرے خلاف کوئی نئی چال چل رہا ہے؟"

دونوں بہنوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بڑی بہن نے کہا "ہمارے بابا سائیں میں اتنی سکت نہیں رہی کہ وہ تمھارے خلاف سازش کر سکیں۔ تم نے انھیں عبرتناک سزا دی ہے۔"

"میں نے کوئی سزا نہیں دی اور بھلا میں سزا دینے والا کون ہوتا ہوں۔ میں تو گوٹھ کا ایک معمولی آدمی ہوں۔ ہم جیسے معمولی اور غریب آدمیوں کو تمھارا باپ پاؤں تلے کچلتا ہوا گزر جاتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ کوئی کچلا گیا ہے۔ تم دونوں غلط دروازے پر آئی ہو۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ چھوٹی بہن نے کہا۔ "ہم جانتے ہیں۔ وقت اور حالات نے تمھیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ ہمارا بابا سائیں پرانے وڈیروں کی طرح چالیں چلتا ہے اور تم گھاگ سیاستدانوں کی طرح سازشیں کرنا سیکھ گئے ہو۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولی "مجھے دیکھو، اب سے شاید دس برس پہلے میں نے تمھیں دیکھا تھا۔ شاید تم نے بھی مجھے اس وقت سے نہیں دیکھا۔ میں وہی ہوں جس کی آنکھوں پر پٹی بندھوا کر تم تھانیدار کے گھر پہنچانا چاہتے ہو۔ ہمارا بابا سائیں مر جائے گا مگر ایسا ہونے نہیں دے گا۔"

بڑی بہن نے کہا "میں وہ لڑکی ہوں جس کی شادی تم نے رکوا دی ہے۔ ہمارے بابا سائیں کو فکر لگ گئی ہے۔ وہ نہ ٹھیک سے کھاتے ہیں۔ نہ راتوں کو سو سکتے ہیں۔ پولیس والے اور گوٹھ والے کہتے ہیں۔ جب تک تم زندہ ہو، میری شادی نہیں ہو سکے گی اور میرے بابا سکون کی نیند نہیں سو سکیں گے۔ پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکیں گے۔ یہ کیسا انصاف ہے کہ تم مرد اپنے آپس کے جھگڑوں میں عورتوں کو نشانہ بناتے ہو۔ ان کے ذریعے ایک دوسرے سے انتقام لیتے ہو۔ میں نے یا میری بہن نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ تمھیں انتقام لینا ہے تو بابا سائیں سے لو۔ پولیس والوں سے لو۔ ہم کمزور عورتیں ہیں، ہمیں تو بخش دو۔"

"یہی بات میں تمھارے بابا سائیں کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ وہ عورتوں کو بیچ میں نہ لایا کرے۔ جتنی کمینگی دکھانا ہو، جتنے ظلم کرنے ہوں۔ مردوں پر کرے، عورتوں کو ذلیل نہ کیا کرے۔"

چھوٹی بہن نے آگے بڑھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "جمال! اگر تم مجھے قبول کر سکتے ہو تو اپنے قدموں میں رکھ لو۔ بیوی بنا کر رکھو یا کنیز بنا کر لیکن میری بہن کی شادی ہونے دو۔ میرے بابا کو فکروں سے نجات دلا دو، انھیں معاف کر دو۔ انھوں نے جو غلطیاں کی ہیں، جو ظلم ڈھائے ہیں۔ میں وہ تمام ظلم تمھارے قدموں میں رہ کر برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "اگر مجھے عورتوں پر ہاتھ اٹھانا ہوتا تو بہت پہلے تم میں سے کسی ایک کو تو ختم کر چکا ہوتا یا منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑتا لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔"

اس کی بڑی بہن نے کہا "ہم سے کوئی ایسی شرط منوا لو جس سے ہماری عزت پر آنچ نہ آئے۔ دیکھو عزت بچانے کی خاطر ہی میری بہن تمھارے قدموں میں رہنا چاہتی ہے یعنی کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ ہماری عزت کو، ہماری غیرت کو، ہماری حیا کو سمجھو۔"

"حیا والے حیا کو سمجھتے ہیں۔ اگر تم سمجھتی ہو تو پھر میری بہن کی بے عزتی کے متعلق سوچو۔ وہ حیا والی کس طرح مر گئی۔ اس پر غور کرو۔ پھر اپنے باپ کے پاس جا کر پوچھو..... اگر تم چاہتی ہو کہ میں لڑکیوں کی عزت کروں اور ان کی حیا کا بھرم رکھوں، تو میں تمھاری بھی عزت کروں گا۔ شرط یہ ہے کہ بے حیائی کرنے والے باپ کو اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو۔"

وہ دونوں گم صم ہو کر اس کا منہ تکنے لگیں۔ جمال نے کہا۔ "اس بات کو اس طرح سوچو کہ تم میں سے کسی ایک کی عزت لٹ جاتی تو تمھارا باپ اس لٹیرے کو کیسی سزا دیتا۔ یقیناً موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ میں بھی اپنی بہن کے مجرموں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اگر تم چاہتی ہو کہ عزت آبرو سے رہو اور یہ دشمنی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تو دشمن کو ختم کر دو جو صرف میری بہن کا ہی نہیں، ہر اس مظلوم عورت کا دشمن ہے۔ جو اس کے آگے بے بس ہو جاتی ہے۔ تم نے مجھے حیا کا واسطہ دیا ہے میں یہی واسطہ تمھیں دے کر کہتا ہوں، حیا کے دشمن کو زندہ نہ رہنے دو۔"

"کیا تم ہمارے بابا سائیں سے دشمنی ختم نہیں کر سکتے؟"

"میری دوستی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم میرے دشمن کی بیٹیاں ہونے کے باوجود میرے گھر سے باعزت واپس جا رہی ہو، اب جاؤ۔"

ایک بہن نے کہا "ہمیں پہلے ہی اندازہ تھا کہ اگر ہمارے بابا سائیں مر جائیں گے تو تم ہمارے ساتھ دشمنی نہیں کرو گے۔ ہم بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔"

اس کی بہن نے کہا "ہمارے بابا سائیں بھی یہی کہتے ہیں۔ کئی بار انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ خودکشی کر لیں گے، اپنی جان دے دیں گے تاکہ ہماری زندگیاں برباد نہ ہوں۔"

"اپنے ظالم بابا سائیں کو جا کر سمجھا دو۔ وہ اپنی مرضی سے جس موت کا انتخاب کرے گا۔ وہ مجھے منظور نہیں ہوگی۔ اسے میری مرضی کے مطابق، میری پسند کی موت مرنا ہوگا۔ اپنی ایک

پسند میں تم دونوں کو بتا چکا ہوں۔ جاؤ اور اپنے ہاتھوں سے اس شیطان کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دو۔ اگر منظور ہو تو ابھی میرے سامنے وعدہ کرو۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ اسے کس طرح ہلاک کیا جائے۔"

بڑی بہن نے حقارت سے کہا "تم ہمیں بتاؤ گے کہ اپنے باپ کو کس طرح ماریں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اگر ہمیں مارنا ہی ہوگا تو جس طرح غیرت مند باپ اپنی بیٹی کو زہر دے کر مار ڈالتا ہے اسی طرح ہم بیٹیاں اپنے باپ کو زہر دے سکتی ہیں۔"

جمال نے انکار میں اپنا سر اور ایک ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، میری بہن نے گھر سے باہر بھٹکتے ہوئے اندھی آنکھوں کے سامنے اندھیروں سے لڑتے ہوئے ڈھلان میں لڑھکتے ہوئے جان دی تھی۔ وہ بھی اسی طرح بھٹکتا رہے گا اور بھٹکتے بھٹکتے تم دونوں کے ہاتھوں بے بسی کی موت مرے گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں چاہتا ہوں۔ وہ اس طرح مرے کہ تم دونوں پر قتل کا الزام نہ آئے، میں صرف اسے مارنا چاہتا ہوں۔ تم دونوں سے نہ انتقام لینا چاہتا ہوں۔ نہ تمھاری زندگیاں برباد کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا جو کہتا ہوں، اسے توجہ سے سنو۔"

دونوں بہنیں اس کا منہ تک رہی تھیں۔ وہ کہنے لگا۔ اگر میری شرط منظور ہو تو اپنے گھر پہنچنے کے بعد آج رات تاریکی میں گھر سے نکل جانا اور اسی جنگل کی طرف جانا جہاں تمھارے باپ کو لے جایا گیا تھا۔ میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں، تمھاری عزت آبرو پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ جو لوگ تمھیں جنگل میں پکڑ کر لے جائیں گے۔ وہ تم سے کسی طرح کی دشمنی نہیں کریں گے۔ صرف تمھارے باپ کو یہ دھمکی دے کر بلائیں گے کہ وہ جنگل میں نہ آیا اور مطلوبہ رقم ادا نہ کی تو اس کی بیٹیوں کی لاشیں اس کے پاس پہنچائی جائیں گی۔ اس دھمکی کے بعد وہ ضرور آئے گا اور جب آئے گا تو ڈاکو رانگا ماما تم دونوں کو ایک ایک ریوالور دے گا اور تمھارے باپ کو شکار کرنے کے لیے تمھیں جنگل میں چھوڑ دے گا۔ پھر وڈیرہ رجب علی سارنگ اپنی زندگی کی بھیک مانگتا اور بھاگتا پھرے گا۔ اپنی بیٹیوں کے سامنے گڑگڑائے گا اور بیٹیاں اسے غیرت دلائیں گی۔ اسے گولی مارتے ہوئے کہیں گی کہ جن عورتوں کی عزت سے وہ کھیلتا رہا۔ وہ بھی اس کی بہنیں اور بیٹیاں تھیں۔ وہ بیٹیاں تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں لیکن یہ بیٹیاں اس کی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہیں۔"

وہ دونوں چپ چاپ سن رہی تھیں۔ جمال نے پوچھا۔ "بولو منظور ہے؟"

دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پھر کہا "منظور ہے۔"

"یہ خیال ہرگز دماغ میں نہ لانا کہ میرے مشورے کے خلاف عمل کرو گی یا چپ چاپ اپنی جان دے دو گی تو تمھارا باپ زندہ بچ جائے گا۔ تم اپنی جانیں دے کر بھی اس کی جان نہیں بچا سکو گی۔"

بڑی بہن نے پوچھا "جمال! ہماری جنگل سے واپسی کے بعد کون یقین کرے گا کہ ہم باعزت واپس آئے ہیں؟ ہمارے معاشرے میں عورت موم کی مورت ہوتی ہے۔ ذرا آنچ لگتے ہی صورت بگڑ جاتی ہے۔"

جمال احمد جسکانی نے قائل ہو کر کہا "ہاں، میں پلاننگ کرتے وقت یہ بھول گیا تھا، تم دونوں جنگل سے واپس آکر بدنام ہو جاؤ گی۔"

بڑی بہن نے کہا "میں تمھاری ہر بات پر عمل کروں گی۔ تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے باپ کو گولی مار دیں تو پھر جنگل میں چھپ کر مارنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم بابا سائیں کو ہمارے ہاتھوں مرتے دیکھنا چاہتے ہو تو ہم تمھاری یہ خواہش پوری کر دیں گے۔ ہمیں ریوالور دے دو۔"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے دونوں بہنوں کو دیکھا پھر کہا "جب تم گھر پہنچو گی تو تمھیں اپنے تکیے کے نیچے ریوالور مل جائیں گے۔"

وہ وہاں سے چلی آئیں۔ دوپہر کو اپنے گوٹھ پہنچیں۔ ان کے پختہ دو منزلہ مکان کے سامنے گوٹھ والوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ان کے درمیان ان کا باپ وڈیرہ سارنگ اونچی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا دونوں بیٹیاں ملازموں کے ساتھ ان کے سامنے سے گزر کر مکان کے اندر جانے لگیں۔ باپ نے آواز دے کر پوچھا "کیا ہوا، کیا جمال سے ملاقات ہوئی؟ میں ابھی ان لوگوں سے یہی کہہ رہا تھا کہ میں صلح صفائی کا راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی بیٹیوں کو اس کے پاس بھیجا ہے تاکہ ہمیشہ کی دشمنی ختم ہو جائے۔"

بڑی بیٹی نے تمام گوٹھ والوں کی طرف دیکھا پھر اپنے بابا سائیں کو دیکھتے ہوئے کہا "جمال نے کہا ہے جب ہم گھر پہنچیں گے تو ہمیں اپنے تکیے کے نیچے ریوالور ملیں گے۔ ذرا ٹھہریے ہم دیکھ لیں کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ کیا واقعی ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ریوالور پہنچ چکے ہیں۔"

دونوں بہنیں اندر گئیں جب باہر آئیں تو ان کے ہاتھوں میں ایک ایک ریوالور تھا۔ سب نے حیرانی سے دیکھا۔ رجب علی سارنگ نے پوچھا "یہ ریوالور؟ کیا یہ بھرے ہوئے ہیں؟"

"ہاں، انسان زندگی سے بھرا ہوتا ہے ریوالور موت سے بھرے ہوتے ہیں۔ میں تمام گوٹھ والوں سے پہلی اور آخری بار کہتی ہوں۔ سب دور چلے جائیں۔ اگر ذرا بھی دیر کی تو میں گولی چلا دوں گی۔"

چھوٹی بہن نے بھی للکار کر کہا "میں بھی یہی کہتی ہوں ہمارے ریوالوروں میں جتنی گولیاں ہیں، وہ تم سب پر چلیں گی لہٰذا یہاں سے فوراً دور چلے جاؤ۔"

رجب علی سارنگ نے اٹھ کر غصے سے کہا "کیا تم دونوں کا دماغ چل گیا ہے؟"

"نہیں بابا سائیں! دماغ تو تمھارا خراب ہو گیا تھا مگر ہم بیٹیوں کو باپ کی محبت میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔"

چھوٹی بیٹی نے کہا "جب اندھی لبنیٰ کے ساتھ زیادتی ہوئی تو ہمیں کچھ احساس ہوا تھا۔ پھر ہم نے سوچا۔ غریب اور چھوٹے درجے کی عورت کی عزت بھی چھوٹی ہوتی ہے۔ اگر لٹ گئی تو کیا ہے ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن جب تمھارے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ مجھے اندھی لبنیٰ کی جگہ عارضی طور پر اندھا بنایا جائے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے تھانیدار کے گھر پہنچایا جائے تو میں شرم سے مر گئی۔ تب سمجھ میں آیا، کوئی عورت چھوٹی نہیں ہوتی کسی کی عزت چھوٹی نہیں ہوتی۔ جو داؤ پہ لگ جائے بس وہی کھوٹی ہوتی ہے۔"

بڑی بیٹی نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا "بابا! جتنی تیزی سے بھاگ سکتے ہو۔ بھاگنا شروع کر دو۔ ایک باپ کا نشانہ لیتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، لیکن میں گولی ضرور چلاؤں گی۔"

چھوٹی بیٹی نے روتے ہوئے کہا "بابا! دیکھ رہے ہو۔ میں رو رہی ہوں مگر میں تمھیں گولی ضرور ماروں گی۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ لبنیٰ بھی تمھاری بیٹی کی طرح تھی؟"

وہ دونوں ہاتھ انکار کے انداز میں ہلا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگا "نہیں، نہیں۔ تم دونوں پاگل ہو گئی ہو۔ ارے سوچو تو سہی۔ میں نے تم دونوں کو گود میں کھلایا ہے۔ تم دونوں کو کتنے لاڈ پیار سے پروان چڑھایا ہے۔ تم میرا کھاتی رہی ہو۔ میرے سائے میں پرورش پاتی رہی ہو۔ تم میرے نام سے پہچانی گئی ہو۔ تم دونوں کی عزت، مان اور مرتبہ میری ولدیت سے ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ٹھائیں سے گولی چلی لیکن نشانہ پکا نہیں تھا۔ وہ بچ گیا۔ بچتے ہی وہاں سے بھاگنے لگا۔ دونوں بیٹیوں نے بھی اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ بھاگنے والا آگے جا کر لڑکھڑایا اور اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ بھاگنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بیٹی نے کہا "ہمارے گوٹھ کی بے شمار لڑکیوں کی عزت، مان اور مرتبہ بھی ان کی ولدیت سے تھا لیکن ان کی عزت کو ان کی ولدیت کو تم نے کس طرح خاک میں ملایا۔ جب یہاں کوئی بڑا آفیسر آتا تھا تو تم اسے موسم کے پھلوں کے ساتھ غریبوں کی عزت بھی پیش کیا کرتے تھے۔ رشوتیں دیتے تھے۔ آج ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ ہم کھلے ہوئے ذہن سے تمھارا چہرہ دیکھ رہے ہیں تو ہمیں باپ کا چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے۔"

یہ کہتے ہی پھر ٹھائیں سے گولی چلی۔ اس بار نشانہ صحیح بیٹھا رجب علی سارنگ اپنی بیٹی کے ہاتھ سے گولی کھا کر زمین پر تڑپنے لگا۔ دوسری بیٹی نے گولی چلائی تو اس میں تڑپنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ اٹک اٹک کر سانسیں لینے لگا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ منہ کھل گیا تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے دیدے ساکت ہو گئے اور زندگی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں بہنیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ان کی عجیب حالت تھی۔ روتے روتے قہقہے بھی لگاتی جاتی تھیں۔ ایک نے اپنا سینہ پیٹتے ہوئے کہا "مار ڈالا، ہم نے ایک ایسے درندے کو مار ڈالا جو صرف اپنی بیٹی کو بیٹی سمجھتا تھا۔ صرف اپنی بیٹی کو بیٹی سمجھنے والا انسان نہیں ہوتا اور جو انسان نہیں تھا، اسے ہم نے مار ڈالا۔"

دوسری بہن نے چیختے ہوئے گاؤں والوں کو مخاطب کر کے کہا "دیکھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔ سب آ جاؤ، قریب آ جاؤ۔ اب ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ آج ہم نے وہ کام کیا ہے۔ جس کے بعد یہاں سے دور دور تک کے علاقوں میں کوئی باپ کسی پرائی بیٹی کی عزت لوٹنے سے پہلے بار بار سوچے گا کہ کہیں اس کی اپنی بیٹی اسے گولی نہ مار دے۔"

بڑی بہن نے کہا "جب تک ہم دوسروں کی عزت کو عزت نہیں سمجھیں گے۔ اس وقت تک اپنی عزت برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ اس کا نتیجہ آج ہم بھگت رہے ہیں۔ ہماری عزت نہیں رہی۔ آج ہم دو کوڑی کی نہیں رہیں۔ کیوں بہن! کیا خیال ہے؟"

چھوٹی بہن نے کہا "وہی خیال، جو ہم نے پہلے ہی قائم کیا تھا۔ تم مجھے اس دنیا سے اٹھا دو، میں تمھیں اٹھا دیتی ہوں پھر یہ خاندان ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گا۔"

اس کے ساتھ ہی چھوٹی بہن نے اپنی بڑی بہن کی طرف گولی چلا دی۔ اُدھر سے بھی ایک گولی چلی۔ دونوں لڑکھڑاتے

ہوئے پیچھے گئیں۔ دونوں نے پھر ایک ایک فائر کیا۔ پھر وہ لڑکھڑائیں۔ اس بار ان کے ہاتھوں سے ریوالور چھوٹ گئے تھے وہ چکراتی ہوئی زمین پر گر پڑیں۔

تمام لوگ گم صم کھڑے تھے۔ کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بوڑھے کیا بچے، یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے سے قیامت کا منظر گزر گیا ہے۔ کسی کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ تین لاشوں کو ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ شام ہو چلی تھی ہوا ابھی تیز چل رہی تھی۔ مرنے والیوں کے دوپٹے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ کبھی بہت اوپر کی طرف اٹھتے، جیسے اڑنا چاہتے ہوں۔ پھر وہ دوپٹے اُڑنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی کتنے ہی نوجوان دوڑتے ہوئے آئے کچھ لوگوں نے دوپٹوں کو پکڑنا چاہا۔ کچھ لوگوں نے اپنے کاندھے کی چادر اُتاری۔ پھر ان چادروں سے ان شرم والیوں کو ڈھانپ دیا۔

شرم آتی ہے مگر دیر سے آتی ہے۔

میں نے جمال احمد جسکانی کے دماغ میں رہ کر یہ تمام رُوداد معلوم کی۔ جس وقت اس کے دماغ میں پہنچا۔ تو وہ ایک اہم میٹنگ میں شامل ہونے جا رہا تھا۔ جتنی دیر میں نے اس کے دماغ سے یہ رُوداد سنی، اتنی دیر میں اس کی کار ناتھ ناظم آباد کے دور اُفتادہ علاقے میں پہنچ گئی تھی۔ ان دنوں کراچی شہر کا وہ علاقہ آج کی طرح آباد نہیں تھا۔ دور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اکا دُکا کوٹھیاں نظر آتی تھیں۔ ان میں سے ایک کوٹھی کے سامنے اس نے اپنی کار روک دی۔ کار سے اتر کر وہ ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا۔ بہت سی عورتیں اور مرد اس کے منتظر تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ سب ہنس بول رہے تھے۔ اسے بھی ایک پیگ پیش کیا گیا۔ اس نے ہاتھ میں جام کو تھامتے ہوئے پوچھا۔ "باس کہاں ہے؟"

"اس کا سوال ختم ہوتے ہی جواب ملا۔ "میں یہاں ہوں۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا چچا سام کھڑا ہوا تھا۔ اس امریکی شخص کو سبھی چچا سام کہتے تھے۔ اس نے جام والے ہاتھ کو بلند کرتے ہوئے کہا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اِٹ از ٹائم ٹو کم اینڈ کیلکولیٹ یور اچیومینٹس" (خواتین و حضرات، آئیے اور اپنے اپنے کارناموں کا حساب کیجیے)

وہ ایک بڑی سی میز کے پیچھے جا کر ایک بڑی سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس میز کے اطراف سب بیٹھ گئے۔ جنھیں جگہ نہیں ملی، وہ بیٹھنے والوں کے پیچھے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ ان میں زرینہ اور کبیر داس بھی تھے۔ چونکہ زرینہ کی خاصی اہمیت تھی۔ اس لیے اسے جمال جسکانی کی طرح چچا سام کے قریب ہی جگہ دی گئی تھی۔ پاکستان کے ہر علاقے سے البامہ ڈی ٹی سینٹر اور ماسٹر کی سنڈیکیٹ کے تمام اہم دہشت گرد وہاں جمع ہوئے تھے۔

چچا سام نے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جمال جسکانی کی طرف سے شروع ہونے والی مہم اپنا پہلا مرحلہ مکمل کر چکی ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے جمال احمد جسکانی کا خیال تھا کہ وہ لب دماغ پر، اپنے غصے پر قابو نہیں پا سکتا۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے کر ہی رہے گا۔ ہم جانتے تھے، یہ جوان صرف فائر لائنگ ہی نہیں اس میں فلاور لائنگ بننے کی بھی صلاحیتیں ہیں۔ اب اس نے فلاور لائنگ بن کر نہایت ٹھنڈے دماغ سے اس مرحلے کو طے کیا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمنوں کو قتل نہیں کیا بلکہ ہم نے ایک گائیڈڈ لائن دی۔ اس پر اس نے عمل کیا جس کے نتیجے میں وڈیرہ اور اس کی بیٹیاں ختم ہو چکی ہیں۔"

کبیر داس نے پوچھا۔ "سر! اس سے ہماری تنظیم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مانا کہ جمال نے فائر لائنگ بن کر نہیں، فلاور لائنگ بن کر آپ کی مرضی کے مطابق اس کام کو انجام دیا ہے۔ لیکن ہمیں کیا فائدہ؟"

چچا سام نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا پھر کہا۔ "کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنے لوگوں کو چھوٹے چھوٹے فائدے پہنچانا پڑتے ہیں۔ بڑے صبر سے کام لینا ہوتا ہے۔ ہم نے جمال کے اندر جو انتقام کی آگ تھی اسے کسی حد تک بجھا دیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہاں دہشت پیدا کر دی۔ اس صوبے کے بیشتر علاقوں میں جمال احمد جسکانی ڈاکو رانگا ماما کے نام کی دہشت بیٹھ گئی ہے لوگ رانگا ماما کو ڈاکو سمجھ کر اس سے ڈرتے ہیں اور جمال احمد جسکانی کو ایک ایسا چالاک اور سازشی سمجھتے ہیں جو قانون کو بھی بے بس کر دیتا ہے کوئی اس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ قانون کی ہتھکڑیاں اس کی کلائی تک پہنچتے پہنچتے پگھل جاتی ہیں۔"

اس نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔ "دہشت پھیلانے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ لوگوں کو پہلے چند شخصیات کے زیر لایا جائے۔ اب غور کریں۔ اس ملک میں جب انتخابات کا دور آئے گا یا کوئی انقلاب لانے کی بات ہوگی تو یہ سب دہشت زدہ لوگ کس سے مرعوب ہوں گے، کس کی بات سنیں گے؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔ "اس سے مرعوب ہوں گے، اس کی بات سنیں گے جو اس علاقے کے نئے وڈیرے یا نئے لیڈر کے لوگ ہوں گے اور وہ نئے وڈیرے اور نئے لیڈر قسم کے لوگ ہم سے مرعوب ہوں گے۔ جمال سے، رانگا ماما سے دشمنی مول لینے کی جرأت نہیں کریں گے۔ وہ ہمارے ہی پیچھے ہوں گے اور یہ اچھی طرح سمجھتے ہوں گے کہ جب بھی انھوں نے ہمارے

کے خلاف انتخابات میں حصہ لیا یا ہماری مرضی کے خلاف کوئی انقلاب برپا کیا تو وہ اس دنیا سے نابود کر دیے جائیں گے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ علاقے کے عوام ان وڈیروں اور لیڈر قسم کے لوگوں سے متاثر ہوں گے اور جو متاثر نہیں ہوں گے، مرعوب نہیں ہوں گے انھیں جمال احمد جسکانی اور رانگا ماما سیدھا کر دیں گے۔ گویا ان تمام علاقوں میں موجودہ قانونی حکومت کے بجائے ہماری غیر قانونی حکومت ہے۔"

اس نے پھر ذرا توقف کے بعد کہا۔ "میرے ذہین اور جاں نثار دوستو! ہمارا طریقۂ کار یہی ہے کہ آہستہ آہستہ ہر علاقے میں دہشت پیدا کر دو یا بڑی محبت سے طلبا تنظیموں میں شامل ہو جاؤ۔ کسانوں اور مزدوروں کا دل جیتنے کے لیے ان کے حق میں پُرجوش تقریریں کرتے رہو۔ انھیں ایک سیلاب کی طرح اپنے پیچھے بہاتے ہوئے لے چلو۔ پھر دیکھو کہ آنے والی ہر نئی حکومت کس طرح ہمارے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگی۔"

سب لوگ اس کی باتیں توجہ سے سن رہے تھے۔ پھر اس نے کہا۔ "میں ان ابتدائی کلمات کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں اور کبیر داس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرے۔"

اس نے جو رپورٹ پیش کی۔ وہ میرے متعلق تھی۔ سب لوگ توجہ سے سننے لگے۔ کیونکہ ان کے مخالف گروہ کا ایک آدمی یعنی بابر جلال ان کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اب وہ بابر جلال کو اپنے مقاصد کے لیے کس طرح استعمال کرنے والے تھے۔ اس پر بحث ہونے لگی تھی۔ میں دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ بڑی دیر سے آمنہ کی خبر نہیں لی تھی۔ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن احساس ہوا کہ اپنی جگہ سے دیر تک غیر حاضر رہا ہوں۔ اتنی دیر میں بلو سو گیا تھا۔ حور بانو پلنگ کے پائنتی بیٹھی مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں اس کی طرف آؤں گا اور اسے کھا جاؤں گا۔ وہ بڑی دیر تک اسی انتظار میں رہی پھر حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی کیونکہ میں ایک طرف خلا میں تک رہا تھا اور خیال خوانی میں مصروف تھا۔ دماغی طور پر واپس آتے ہی احساس ہوا کہ حور بانو میرا منہ تک رہی ہے اور حیران ہو رہی ہے۔ میں اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

وہ جو کہتے ہیں کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

یہ بات حور بانو پر صادق آئی۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ آتے ہی اس کی جان جانے لگی۔ میں نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں خیالوں میں ڈوبا رہا۔ جب سے خود کو اجنبی سمجھنے لگا ہوں۔ تب سے سوچتا ہوں، میں کون تھا؟ کیا تھا، کہاں سے آیا ہوں۔ میرے اپنے کون ہیں تو پھر میں سوچتا ہی چلا جاتا ہوں۔ اب نہیں سوچوں گا۔ تمھارے پاس رہوں گا۔"

میں اس کے پاس کھسکنے لگا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے بولی۔ "نہیں کوئی بات نہیں۔ تمھیں سوچنا چاہیے خوب سوچنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ساری باتیں یاد آ جائیں۔ میرا کیا ہے۔ میں ساری رات یونہی جاگتی رہوں گی۔ دعائیں مانگتی رہوں گی کہ تمھیں پچھلی زندگی یاد آ جائے۔"

وہ اپنی جگہ سے ہٹنا چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ "کیوں نہ ہم دونوں مل کر دعا مانگیں۔ تم آخر مجھ سے دور کیوں جا رہی ہو؟"

"نہیں تو۔ مم، میں تمھارے پاس ہوں۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔"

"کہ میں تمھارا شوہر نہیں ہوں۔"

"آں؟" اس نے ایک دم سے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ، کیا واقعی تم میری بیوی ہو؟ تمھارے چہرے کی تازگی، تمھاری آنکھوں کی شرم بتا رہی ہے کہ تم پر کسی مرد کا سایہ نہیں پڑا؟ دیکھو، میں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں۔ جو عورت ملتی ہے۔ وہی مجھے اپنا شوہر کہتی ہے۔ تم ایک عورت ہو۔ مرد سے زیادہ عورت کو اپنی عزت کا پاس ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنی حفاظت کرتی ہے۔ تم مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا تم میری بیوی ہو؟"

وہ کبھی اپنے دونوں ہونٹوں کو بھینچتی تھی۔ کبھی نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دباتی تھی۔ کبھی پریشان ہو کر مجھے اور بلو کو دیکھتی تھی۔

"اگر میں بلو کو دوسرے کمرے سے نہ لاتا تو؟"

"میں لے آتی۔ یہ میرے بغیر نہیں سوتا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم اپنے گھر سے بھی اسے نہ لاتیں وہ تو میں نے اسے ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔"

"تم خواہ مخواہ بلو کی بات لے بیٹھے ہو۔ یہ ہمارے ساتھ آتا یا نہ آتا، میں تو ہر حال میں تمھاری بیوی ہوں۔"

"ہاں، تم میری بیوی ہو اور ابھی یہ بہانہ کرو گی کہ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے ہم ندی کے دو کنارے بن کر رہیں۔ کیوں تم نے یہی سوچا ہے، نا؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "یہ نہ سمجھو کہ میں دلوں کے بھید معلوم کر لیتا ہوں۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے اور میں نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ تمھاری جیسی عورتیں کیسی باتیں بناتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم کب تک باتیں بناتی رہو گی۔ کتنے دنوں تک بناتی رہو گی؟"

وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی جو باتیں میری زبان سے نکل رہی تھیں۔ وہی اس کے دل میں تھیں۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ نہ جانے یہ ناٹک کب تک کھیلنا پڑے۔ وہ کب تک

باتیں بنا سکے گی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
"اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر بیوی ہو تو شوہر کی خدمت کرو اور اگر نہیں ہو تو یہ کسی بھی شریف زادی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی کے دباؤ میں آ کر ایک غیر مرد کو اپنا شوہر کہنے لگے۔"

یکبارگی اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ میں چپ چاپ اس کے دماغ کو پڑھ رہا تھا۔ اگرچہ وہ رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی زبان سے ظاہر کر رہی تھی کہ یہ سب فراڈ ہے لیکن ڈر بھی رہی تھی کہ کم کریزی کو معلوم ہوگا تو وہ اسے اور اس کے والدین کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ببلو کو بے دردی سے قتل کر دے گا۔ میں نے ذرا دور ہٹ کر کہا "میں نے فاصلہ قائم کر دیا ہے اور یہ فاصلہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ آنسو پونچھ لو۔"

اس نے اپنے چہرے سے دونوں ہاتھوں کو ہٹا کر بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ وہ اب تک اپنی ماں کی زبانی اور تنظیم کے دوسرے افراد کے ذریعے سنتی آئی تھی کہ جب ایک بار کسی مشن کے دوران کسی لڑکی کو چارہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے کھلونا بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ میرا منہ حیرانی سے تک رہی تھی۔ کیونکہ میں نے اسے کھلونا نہیں بنایا تھا۔ اس کی عزت رکھ رہا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا اسے صحیح راستہ دکھا رہا تھا اور یہ اتنے تعجب کی بات تھی کہ تخریب کاری کے عزائم رکھنے والی تنظیموں کے افراد کسی ایسے شخص کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ جو ایک نوجوان لڑکی کو سیدھا راستہ دکھاتا ہو۔

مجھے ہلکی سی آہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے فوراً ہی خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ کرم داد کے پاس پہنچ کر دیکھا وہ ہمارے کمرے کے باہر بند دروازے کے دوسری طرف کھڑا ہوا تھا اور کم کریزی سے پوچھ رہا تھا "یہ کیا کر رہے ہو۔ کسی کی خواب گاہ میں جھانکنا اچھی بات نہیں ہے۔"

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ کم کریزی کی ہول کے ذریعے ہمارے کمرے میں جھانکتا رہا تھا۔ کریزی نے سرگوشی میں کرم داد سے کہا "کیا اچھا ہے، کیا برا، میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے اپنا کام کرنے دو۔"

"لیکن تم معلوم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

کریزی نے آہستگی سے کہا "وہ پارسا بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ الو کی پٹھی ہمارا کام بگاڑ دے گی۔"

کرم داد نے کہا "مسٹر کریزی! ذرا اس کمرے سے چلیں میں کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری ضروری بات بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ ابھی مجھے ان کی اسٹڈی کرنے دو۔ ورنہ کام بگڑ جائے گا۔"

"میری ضروری باتیں بعد میں نہیں ہو سکتیں جب میرے اندر کھلبلی پیدا ہوتی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ جھنجلا کر اسے دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں آیا۔ پھر غصے سے بولا "کیا بات ہے؟"

کرم داد نے ہمارے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو مسٹر کریزی! میں بدمعاش ہوں، مجرم ہوں، قاتل ہوں، درندہ ہوں لیکن کبھی کسی عورت کو چھیڑنا پسند نہیں کرتا۔ جب زندگی میں پہلی بار میرے دشمن کی یہ بیٹی ریحانہ میرے سامنے آئی تو میں نے اسے برباد کرنا چاہا لیکن اس کے ساتھ ہی میرا سکون بھی برباد ہو گیا۔ مجھے میرا ضمیر ملامت کرتا رہا۔ آخر میں نے اسے بربادی سے بچا کر ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔"

کریزی نے جھنجلا کر کہا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ مشکل تو یہ ہے کہ جو بات کرتے ہو۔ پہلے اس کی تمہید باندھتے ہو۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ ٹو دی پوائنٹ بات کیا کرو۔"

اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا "تم اس کمرے میں جھانکنا چھوڑ دو۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تمہیں ان لوگوں سے کیا دلچسپی ہے اور میرے جھانکنے سے تمہارا کیا نقصان ہوتا ہے؟"

"مجھے اسی بات پر اعتراض ہے کہ حور بانو کو اس کی خواب گاہ میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ بابر معصوم ہے۔ وہ اپنے متعلق کچھ نہیں جانتا اور وہ بے چاری غیر شادی شدہ لڑکی ہے۔ اس کے اپنے سپنے ہوں گے، اس کی اپنی آرزوئیں ہوں گی۔ جب میں اپنے دشمن کی بیٹی کی آرزوؤں کو، اس کے سپنوں کو برباد نہ کر سکا تو حور بانو میری کون سی دشمن ہے۔ میں کیسے اسے برباد ہوتا دیکھ سکوں گا؟"

کریزی نے غصے سے پوچھا "تو پھر اب تک خاموش کیوں تھے۔ کیوں انہیں کمرے کے اندر جانے دیا؟"

"یہ بات میں نے ریحانہ سے کہی تھی۔ ریحانہ نے مجھے سمجھایا کہ مشن کے دوران ہمیں اپنے لیڈر کی کسی بات پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ حور بانو بابر کی بیوی کا رول ادا کر رہی ہے اس طرح اگر ان دونوں کے دل مل جاتے ہیں تو پھر ہم ان کی شادی کرا دیں گے۔ میں ریحانہ کی بات پر خاموش ہو گیا لیکن دل نہیں مان رہا تھا۔ بے چینی سے ٹہلتا ہوا اُدھر آیا تو تمہیں کی ہول سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"کرم داد! میں تمہارا پارٹی لیڈر ہوں۔ میں تنظیم کے مفاد کی خاطر کسی کے کمرے میں بھی جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔ جاسوسی کر سکتا ہوں۔"

"کیا تم ہمارے کمرے میں بھی جھانکتے رہے ہو؟"

"کیوں نہیں! مجھے تمام حالات کا علم رکھنا پڑتا ہے کہ تنہائی میں کون کیا کر رہا ہے۔"

کرم داد نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں پھر دانت پیس کر پوچھا "کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم میرے کمرے میں بھی جھانکتے رہے ہو۔"

"ہاں ہاں، جھانکتا رہا ہوں۔ تم اتنا غصہ کیوں دکھا رہے ہو؟"

اس کی بات پوری ہوتے ہی کرم داد کا ایک زبردست گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ کم کریزی لڑکھڑاتا ہوا ذرا پیچھے گیا لیکن سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔

کریزی صرف فلاور لائک نہیں بلکہ فائٹر لائک بھی تھا۔ فائٹر کی حیثیت سے کرم داد وغیرہ کا استاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں، وہ یوگا کا ماہر بھی تھا۔ اس نے فوراً ہی سانس روک لی۔ پھر ہاتھ کے اشارے سے کرم داد کو دعوت دی کہ وہ آگے بڑھے اور اس پر حملے کرے۔ کرم داد سوچ میں پڑ گیا۔ ٹریننگ کے دوران وہ کم کریزی سے مقابلہ کر چکا تھا۔ ماسٹر کی کے خاص ماتحتوں میں کریزی کے علاوہ اور بھی کچھ لوگ تھے جو اسی طرح یوگا کے ماہر تھے اور نئے رنگروٹوں کو لڑنا سکھاتے تھے اور انہیں چیلنج کرتے تھے کہ وہ انہیں مار کر گرا دیں یا چوٹ پہنچا دیں۔

کم کریزی نے بڑی سفاکی سے کہا "تم نے ایک گھونسا مارا۔ اس کے بعد میں تمہیں گھونسا اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔ چلو مجھ پر حملہ کرو۔"

کرم داد نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے اپنے اندر حرارت پیدا کرنے لگا۔ ایسا کرنے کے دوران اس نے یکبارگی آگے بڑھ کر ایک زبردست گھونسا کریزی کے منہ پر رسید کیا۔ کریزی کا منہ ایک ذرا سا گھوما۔ پھر سیدھا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھونسے کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ چہرے سے اور آنکھوں سے ذرا تکلیف ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

اور ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ یوگا کے فن میں مہارت حاصل کرنے والے جب اپنی سانس روکتے ہیں تو اپنے اوپر سے بھاری بھرکم ٹرک کو گزار دیتے ہیں۔ منوں وزنی پتھر اپنے سینے پر رکھ کر اپنے شاگردوں سے کہتے ہیں کہ وہ ہتھوڑے سے مار کر توڑیں اور وہ پتھر توڑ دیے جاتے ہیں مگر سینہ نہیں ٹوٹتا۔ جسم سلامت رہتا ہے اور وہ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یوگا کے سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ سانس انسانی زندگی کی بنیاد ہے جس کی سانس مضبوط رہے گی مستحکم رہے گی جو اپنی سانسوں پر مستقل قابو پانا جانتا ہوگا۔ وہ ہمیشہ صحت مند رہے گا۔ جسم کے اندر بھری ہوئی سانسیں جسمانی توازن کو قائم رکھتی ہیں۔ اگر انہیں ایک طرف سے دھکا دیا جائے تو وہ دوسری طرف سے توازن رکھتے ہیں۔ انہیں گھونسا مارا جائے تو گھونسا لگتا ضرور ہے لیکن جہاں لگتا ہے، وہاں سے یوں واپس چلا آتا ہے جیسے ربڑ کی گیند کو مارا ہو۔

کرم داد نے پے در پے حملے کیے کبھی گھونسے اور کبھی کراٹے کے فن کو آزمایا۔ پھر گھوم کر لات ماری۔ اس کا بھی اثر نہ ہوا تو وہ ذرا دور گیا۔ پھر دوڑتے ہوئے آ کر فلائنگ کک ماری۔ اس بار کم کریزی کے قدم ذرا سے اکھڑے۔ پھر وہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ کرم داد کمزور نہیں تھا۔ جسامت کے اعتبار سے وہ پہاڑ تھا۔ مضبوطی کے لحاظ سے فولاد تھا کسی چیتے کی طرح حملہ کرتا تھا۔ اپنے شکار کو ہمیشہ کامیابی سے دبوچتا تھا اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا تھا جب تک اس کی جان نہ نکل جاتی۔

وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے اچانک ہی گھوم کر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ایک لیمپ اسٹینڈ کو اٹھا لیا۔ وہ اسٹینڈ لوہے کے راڈ کا تھا۔ اچانک کم کریزی نے اس پر چھلانگ لگائی۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ کریزی یہ کبھی نہ چاہتا کہ اس پر لوہے کے راڈ سے حملہ کیا جائے۔ انسان کا جسم ہزار یوگا کے فن سے مضبوط ہو جائے۔ وہ اپنے جسم پر سے ٹرک گزار لے۔ منوں وزنی پتھر سینے پر رکھ کر تڑوا لے لیکن جسم پھر بھی گوشت و پوست کا ہوتا ہے۔ کسی ہتھیار سے حملہ کیا جائے تو یقیناً وہ زخمی ہوتا ہے۔ لوہے کا راڈ بھی ہتھیار تھا اور کریزی یہ ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے حور بانو سے کہا "کسی کمرے میں چیزوں کے گرنے کی آوازیں آ رہی ہیں معلوم ہوتا ہے وہ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ تم یہاں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔"

اِدھر دونوں میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔ دونوں نے ہی راڈ کو پکڑ لیا تھا اور ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ چونکہ دونوں کے ہاتھ راڈ کو تھامے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اپنے سروں سے ایک دوسرے کو ٹکریں مار رہے تھے، لاتیں چلا رہے تھے۔ کبھی زور آزمائی کرتے ہوئے گرتے تھے تو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو کر لڑھکتے چلے جاتے تھے۔ میں نے وہاں پہنچ کر پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

اس وقت تک وہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے تھے

اوراب بھی زور آزمائی کرتے ہوئے راڈ کو چھین لینا چاہتے تھے۔ کِم کریزی نے کہا: "مسٹر بابر! فوراً اسے قابو میں کرو۔ اس سے راڈ چھین لو۔ یہ تمھاری بیوی کے بارے میں بڑی شرمناک باتیں کر رہا تھا۔"

وہ ایسا کہہ کر مجھے طیش دلانا چاہتا تھا لیکن کرم دلو کو طیش آگیا۔ اس نے گالیاں دیتے ہوئے کہا: "کمینے! بدذات! تو مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہا ہے جبکہ میں تجھے ان کے کمرے میں جھانکنے سے منع کر رہا تھا۔ تجھے شرم دلا رہا تھا۔ جب تو مجھ پر جھوٹا الزام لگا ہی رہا ہے تو میں سچ بولوں گا اور سچ یہ ہے کہ حور بانو، بابر کی بیوی نہیں ہے۔ تم مائخل شوف کے گروہ سے فراڈ کرنے کے لیے بابر کو دھوکا دے کر اپنا آلۂ کار بنانا چاہتے ہو۔"

کریزی نے کہا: "یہ بکواس کر رہا ہے۔ بابر! کیا دیکھ رہے ہو۔ راڈ کو چھین لو یا پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لو۔ ہم اس اُلّو کے پٹھے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے کرم داد کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "ہم کیوں اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ مسلمان، میں مسلمان، یہ پاکستانی میں پاکستانی۔ اس نے اور میں نے پنجاب کی بھینسوں کا دودھ اور لسّی پی ہے۔ ہم دونوں دودھ لسّی بھائی ہیں۔"

یہ کہتے ہی میں نے اس کے منہ پر ایک زبردست گھونسا رسید کیا۔ اس نے سانس روک لی تھی۔ کمبخت پر نہ تو ٹیلی پیتھی اثر کر سکتی تھی۔ نہ ہی گھونسا۔ میں نے کہا: "کرم داد! تم اسے سنبھالے رکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں اپنے بیڈروم میں آیا۔ اسٹور روم میں جاکر وہاں سے ایک مضبوط سی رسّی لی اور کمرے سے نکلنے لگا تو حور بانو نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

"صیّاد اپنے دام میں خود آرہا ہے۔ اس نے تمھارے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔ تمھاری عزت کو شکار کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ خود شکار ہو رہا ہے۔"

میں اس کمرے میں آگیا اور پنکھے سے رسّی کے ایک سرے کو مضبوطی سے باندھ کر دوسرے سرے میں پھندا بنایا۔ اس وقت تک کرم داد اور کِم کریزی زور آزمائی میں مصروف تھے۔ کِم کریزی نے جب دیکھا کہ میں پھندا ڈال رہا ہوں تو اس نے راڈ کو چھوڑ کر وہاں سے فرار ہونے میں اپنی عافیت سمجھی۔ وہ چیلنج کر رہا تھا: "اگر میں زندہ رہا تو تم لوگوں کو کتّوں کی موت ماروں گا۔"

میں نے کہا: "تم پہلے ہی کب انسان سمجھتے ہو۔ ان لوگوں کو کتّوں جیسی زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتے آرہے ہو۔ ان سے وہی کام لے رہے ہو جو شکاری اپنے شکاری کتّوں سے لیتے ہیں۔"

وہ بھاگنا چاہتا تھا۔ میں سینٹر ٹیبل پر چڑھا ہوا تھا۔ پھندا بنا چکا تھا۔ فوراً ہی وہاں سے چھلانگ لگائی اور اسے دبوچ لیا وہ میرے اکیلے کے بس کا نہیں تھا لیکن کرم داد نے بھی اسے آکر پکڑ لیا تھا۔ پھر ہم اسے کھینچتے ہوئے لائے۔ کرم داد نے اس کی گردن دبوچ رکھی تھی اور میں اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل ہی دل میں اعتراف کر رہا تھا کہ واقعی یوگا کا فن انسان کو تقریباً ناقابلِ شکست بنا دیتا ہے۔ کم از کم دو چار پر برتری حاصل کرنے کی صلاحیتیں پیدا کر دیتا ہے۔

ہم دونوں اسے کسی طرح کھینچتے ہوئے گھسیٹتے ہوئے سینٹر ٹیبل کے پاس لائے۔ پھر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ ہماری گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر کرم داد بھی کچھ کم نہ تھا اس نے پیچھے سے اس طرح اس کی گردن دبوچی ہوئی تھی کہ کریزی کے لیے اس کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی سانس نہ گھٹتی۔ وہ یوگا کے ذریعے مرنے سے محفوظ رہتا۔

آخر میں نے اس کی گردن میں پھندا ڈال کر حلقہ تنگ کر دیا۔ گرہ مضبوط تھی اور حلقہ تنگ تھا۔ ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ اٹھا کر پھندے کو ڈھیلا کرتا۔ ہم نے فوراً ہی چھلانگ لگائی۔ فرش پر پہنچے اور اس کے نیچے سے سینٹر ٹیبل کو کھینچ لیا۔ اب وہ لٹک رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ ہم دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ہی اس نے تڑپنا مچلنا چھوڑ دیا۔ چپ چاپ لٹکتا رہا۔ رسّی گھوم رہی تھی۔ وہ بھی گول گھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔

کرم داد نے ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو، اس کی آنکھیں بند ہیں۔ حالانکہ پھندا گلے میں پڑتے ہی آنکھیں کھل جاتی ہیں، دیدے نکل آتے ہیں۔ یہ کمبخت زندہ ہے۔" کبھی ایک ناممکن بات ممکن ہو جاتی ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ گلے میں پھندا پڑے اور اس پھندے سے لٹکنے والا زندہ رہ سکے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ فوراً ہی سانس رک جاتی ہے اور لٹکنے والا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے لیکن وہ خاموشی سے لٹک رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا۔ کرم داد نے غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے کہا: "ابے او، کب تک سانس روکے رکھے گا۔ چھوڑتا ہے کہ نہیں، سانس چھوڑ دے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "کیوں اپنے دماغ کو گرم کر رہے ہو۔ چپ چاپ تماشا دیکھتے رہو۔ آخر یہ کتنی دیر تک سانس روک سکے گا۔ اب تمھیں اس کے متعلق نہیں، اپنے متعلق سوچنا چاہیے۔ کیا یہ کبھی ہمارے ہو سکتے ہیں۔ جو ہمارے نہیں ہو سکتے وہ ہمارے ملک کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ سازشیں کر رہے ہیں۔ کیا تمھیں احساس نہیں ہے کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے وطن کی زمین ویران کرنے آئے ہیں۔"

کریزی لٹک رہا تھا اور گھور کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا: "اب تمھارا آخری وقت آچکا ہے۔ اس لیے میں بتا دوں کہ میری یادداشت گم نہیں ہوئی ہے جب زرینہ نے مجھے تہ خانے میں پھنکوایا تھا تو اس وقت میری جان نہیں نکلی تھی۔ مجھ میں اتنی سکت تھی کہ میں موت سے لڑ سکتا۔"

کرم داد نے حیرانی سے پوچھا: "تم تہ خانے سے کس طرح نکلے تھے؟"

"زرینہ کے اس غلام نے نکالا تھا جو اس کے عشق میں اس کی غلامی قبول کر چکا تھا۔ اس آس میں کہ شاید کبھی زرینہ اس پر مہربان ہو جائے۔ میری تقدیر اچھی تھی کہ وہ ان دنوں زرینہ سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ محبت اور نفرت کا کھیل عجیب ہوتا ہے محبت ہوتی ہے تو شدید ہوتی ہے۔ نفرت ہوتی ہے تو وہ بھی شدید ہو جاتی ہے۔ اس نے انتقاماً مجھے اس تہ خانے سے رہائی دلا دی۔"

حور بانو وہاں پہنچ گئی تھی۔ میری باتیں سن رہی تھی۔ وہ سحر زدہ سی میری طرف بڑھی اور میرے سامنے پہنچ کر اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا: "میں نے سنا تھا کہ انسانوں کے درمیان عظیم تر انسان بھی ہوتے ہیں۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ جس طرح آپ نے مجھے گناہوں کی دلدل سے بچایا ہے۔ میں اسے کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔"

ریحانہ بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے کہا: "ایسی کوئی عورت نہیں ہوگی جو عورتوں کی شرم رکھنے والے کو سلام نہ کرتی ہو۔ میں تمھیں سلام کرتی ہوں۔"

میں نے کہا: "تم اور کرم دلو اتنے اچھے ہو۔ پھر ایسے گمراہ کیوں ہوتے جا رہے ہو۔ کیوں ایسی تنظیم میں شامل ہو گئے جو ہمارے ملک کے خلاف ہے؟"

کرم داد نے کہا: "میں کیا بتاؤں جی، یہ لوگ دعوے سے کہتے ہیں کہ خدانخواستہ ملک قائم نہیں رہے گا۔ جو قائم نہ رہے، اس سے محبت کرنا حماقت ہے۔ ہماری محبت، ہماری وفاداری ماسٹر کے لیے ہونی چاہیے۔"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا: "یہ کیا بات ہوئی کہ جو قائم نہ رہے اس سے محبت اور وفا نہ کی جائے۔ تمھارے والد قائم رہنے والے نہیں تھے۔ وہ اس دنیا سے اٹھ گئے۔ کیا اب تم ان سے محبت نہیں کرتے ہو؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کے باپ کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ میں نے ریحانہ سے پوچھا۔ "دنیا کے ہر انسان کی طرح کرم داد بھی فانی ہے۔ یہ قائم نہیں رہے گا۔ کیا تمھاری محبت اور وفا اس کے لیے نہیں ہے؟"

وہ فوراً آگے بڑھی اور کرم داد کے بازو سے لگ کر بولی۔ "ہم بڑی غلطی پر تھے۔ تم نے اتنے اچھے دلائل پیش کیے ہیں کہ آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

کرم داد نے کہا: "یہ میرے دشمن کی بیٹی ہے۔ مگر میری محبت ہے میں انتقام میں اندھا ہو گیا تھا۔ اتنی سمجھ نہ آئی کہ جب دشمن کی بیٹی سے محبت کر سکتا ہوں تو اپنے وطن سے کیوں نہیں کر سکتا۔"

اچانک ہی بازی پلٹ گئی۔ فرش پر دھپ کی آواز سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ ہم چونک کر دیکھتے۔ کِم کریزی نے فرش پر پڑے ہوئے لوہے کے راڈ کو اٹھا لیا تھا۔ اس راڈ کو لاٹھی کی طرح گھماتے ہوئے کہہ رہا تھا: "خبردار، کوئی قریب آئے گا تو اپنی جان سے جائے گا۔"

ہم سب پیچھے ہٹ گئے لیکن حور بانو ایک جگہ ہی کھڑی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کریزی نے پیچھے پہنچ کر بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ دائیں ہاتھ میں راڈ موجود تھا اور وہ کہہ رہا تھا "میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ یہ تم لوگوں کی خوش نصیبی ہے کہ میری جیب میں ریوالور نہیں ہے اور یہ سمجھ چکا ہوں، تم دونوں مجھ پر بھاری پڑو گے۔ لہٰذا آج اپنی زندگی کی آخری رات گزار لو۔ تم میں سے کوئی صبح نہیں دیکھ سکے گا اور یہ لڑکی جو اپنی پارسائی جتا رہی تھی۔ میں اس کی پارسائی کے ساتھ اس کے پورے خاندان کو تباہ کر دوں گا۔"

وہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دروازے کی طرف جا رہا تھا اور ہمیں وارننگ دے رہا تھا۔ پھر وہ دروازے کے باہر چلا گیا۔ کرم داد آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اس کی طرف جا رہا تھا۔ موقع کی تلاش میں تھا۔ جب بھی کوئی اچھا موقع ہاتھ آتا تو وہ اس پر جھپٹ پڑتا

لگاتا۔ وہ کمرے سے باہر جا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے میں تنہا رہ گیا تھا لیکن خیال خوانی کے ذریعے کرم داد کے ارادوں کو سمجھ رہا تھا اور اس کو خیال میں سمجھا رہا تھا۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے حور بانو کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

کم کریزی حور بانو کی گردن دبوچ کر اس کمرے میں لے گیا جہاں ببلو سویا ہوا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے حور بانو کو چھوڑ دیا اور ببلو کو ایک ہاتھ سے اٹھا لیا۔ پھر کہنے لگا "اب تم میرے قبضے میں ہو۔ اگر ان کا ساتھ دو گی۔ مجھ سے بھاگنا چاہو گی تو میں تمہارے بھائی کو مار ڈالوں گا۔"

وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی "نہیں، خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ تم جو کہو گے وہ کروں گی۔"

"تو پھر کرم داد سے بولو۔ وہ میرے راستے میں نہ آئے۔ اسی کمرے میں رہے۔ اگر میرا پیچھا کرے گا تو ببلو۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ حور بانو نے چیخ کر کہا "نہیں نہیں کرم داد! خدا کے لیے تم اس کا پیچھا نہ کرو۔ میرے بھائی کی زندگی خطرے میں ہے۔ مجھے اس کے ساتھ جانے دو۔ خدا کے لیے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔"

ریحانہ نے کرم داد کے بازو کو تھام کر کہا "تم ایک قدم بھی اٹھاؤ گے تو بچہ زندہ نہیں رہے گا۔ حالات کا تقاضا یہی ہے چپ چاپ کھڑے رہو۔"

وہ خاموش کھڑے رہنے پر مجبور تھا۔ کم کریزی ببلو کو اٹھا کر بیڈ روم سے باہر گیا۔ حور بانو بھی اس کے پیچھے چلنے لگی۔ کرم داد دانت پیس کر کہہ رہا تھا "کمبخت کو گولی بھی نہیں مار سکتا۔ اتنی دیر میں وہ بچے کا گلا گھونٹ دے گا۔"

کم کریزی نے راہداری کے آخری سرے پر پہنچ کر کمرے کی جانب دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے کے اندر کرم داد بے بسی سے کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا، تیزی سے چلتا ہوا اس بنگلے کے باہر آیا۔ پورچ میں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے حور بانو سے تحکمانہ لہجے میں کہا "چلو اگلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔"

وہ دوسری طرف گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر آیا۔ پھر ببلو کو اپنے اور حور بانو کے درمیان بٹھا کر کار اسٹارٹ کی۔ اسے آگے بڑھایا اور بنگلے کے احاطے سے باہر لا کر تیزی سے بڑی شاہراہ پر ڈرائیو کرنے لگا۔ ببلو رو رہا تھا۔ حور بانو نے اسے اپنی گود میں لے کر پوچھا "تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "ان سے پوچھو جو تمہیں میرے ساتھ جانے سے نہ روک سکے۔ الّو کے پٹھے مجھے پھانسی پر چڑھا رہے تھے۔"

اس نے پھر قہقہہ لگایا "ہا ہا ہا۔ پھانسی اور مجھے ہا ہا ہا۔ دنیا کا کوئی پھندا میری سانس کی آمد و رفت کو نہیں روک سکتا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی اچانک اس کے گلے میں ایک پھندا آ پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا۔ اس پھندے کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ پھندے کا دوسرا سرا میرے ہاتھ میں تھا اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کم کریزی! واقعی تم کریزی (خبطی) ہو۔ یہ تو سوچ لیتے کہ جس پھندے کو کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ یہاں بھی تمہاری گردن تک پہنچ سکتا ہے۔

لو، یہ پہنچ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق تم نے پھندے سے نکلتے ہوئے دس منٹ تک سانس روکی تھی۔ ہم باتوں میں مصروف رہے۔ اسی دوران تم نے ایک ہاتھ سے رسّی کو تھام لیا۔ پھر پوری قوت سے بلند ہو کر پھندے کو ڈھیلا کر لیا اور آزاد ہو گئے اب اس پھندے کی رسّی میرے ہاتھ میں ہے۔ جتنی جدوجہد کر سکتے ہو۔ کر لو۔ تم نے بنگلے سے نکل کر کار تک آنے میں جتنی دیر لگائی۔ میں اتنی دیر میں کچن سے چاقو لا کر اس رسّی کو کاٹ کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں چاقو بھی ہے۔ پھندے سے آزاد ہونے کی کوشش کرو گے تو چاقو کے پھل کو تمہارے حلق پر رکھ دوں گا اور سانس تو حلق سے ہی آتی جاتی ہے۔"

وہ ایک دم سے ساکت ہو گیا تھا۔ عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

وہ خاموش رہا۔ میں نے حلقے کو تنگ کرتے ہوئے کہا۔ "اسٹارٹ کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں صرف پھندا استعمال کروں گا۔ چاقو نہیں۔۔۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے آگے بڑھا دیا۔ آہستہ آہستہ ڈرائیو کرنے لگا۔ میں نے اسے معقول رفتار سے ڈرائیو کرنے کا حکم دیا تو اس نے رفتار بڑھا دی۔ حور بانو اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی "میرا ارادہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "سنو، کریزی! اب زندگی اور موت کا کھیل شروع ہو رہا ہے۔ تم جتنی دیر تک سانس روکے رہو گے، زندہ رہو گے۔ اگر زندہ رہ سکو گے تو ہم پر غالب آ جاؤ گے۔ اپنے ارادے کے مطابق حور بانو کو اپنے ساتھ لے جا سکو گے۔"

"کم کریزی! اب دیکھنا یہ ہے کہ تم حور بانو کو اغوا کرتے ہو یا میں تمہاری زندگی کو اغوا کر لیتا ہوں۔"

صورتِ حال

کچھ یوں تھی کہ کم کریزی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں تھا۔ گویا کہ وہ صرف ایسی کار نہیں تھی جو پٹرول سے چلتی تھی۔ وہ لگام سے بھی چلتی تھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ لگام ہاتھ میں ہو اور کار دوڑتی جا رہی ہو لیکن ایسا ہو رہا تھا۔

میں نے پھندے کے حلقے کو اس حد تک تنگ کیا ہوا تھا کہ کریزی کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا دم نکل جاتا مگر وہ دم روکے ہوئے تھا۔ یوگا کے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور سانس روکے کار ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچتا جا رہا ہو گا۔ افسوس میں اس کے خیالات نہیں پڑھ سکتا تھا۔

حور بانو نے ببلو کو اپنے سینے سے لگا کر گود میں سمیٹا ہوا تھا۔ وہ بار بار سر گھما کر پچھلی سیٹ پر مجھے عقیدت سے دیکھتی تھی پھر نظریں جھکا لیتی تھی۔ میں نے سوچا، دشمن کے خیالات تو نہیں پڑھ سکتا، دوست کے ہی پڑھ لو۔

حسن بنگالی کی ۔۔۔ ت ہو ۔ تھیں۔ سیاہ لانبی گھنی ریشمی زلفوں کے سائے میں وہ سوچ رہی تھی "یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ آج ۔ م تک میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری زندگی میں ایسا انقلاب آنے گا۔ اچانک اطلاع ملی کہ اپنی تنظیم کے لیے مجھے کسی کی بیوی اور ایک بچے کی ماں کا رول ادا کرنا ہے۔ مجھے بڑا عجیب سا لگا لیکن میرے والدین نے مجھے اچھی خاصی ٹریننگ دے رکھی تھی۔ میں ہر طرح کا رول ادا کرنے میں خاصی مہارت رکھتی ہوں لیکن سمندر کے کنارے جب میں نے اسے دیکھا تو ٹھٹک گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں سچ مچ ایکٹنگ کر رہی ہوں لیکن اس ٹھٹکنے کی وجہ کچھ اور تھی جو میرے لاشعور میں تھی جسے میں سمجھ نہ سکی۔ اب اس شخص کی محبت، مہربانیاں اور انسانی ہمدردیاں مجھے سمجھا رہی ہیں کہ میری زندگی میں میرا کوئی آئیڈیل ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہو گا یا ایسا ہی کوئی ہو گا۔"

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی۔ جیسے اس کی چوری پکڑی جا رہی ہو۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں انجان بنا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی "یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہاں جان پر بنی ہے۔ پتا نہیں" یہ اس پھندے سے مر سکے گا یا نہیں۔ ایکبار تو اسے پھانسی دے چکے ہیں۔ کمبخت پھر بھی زندہ رہا۔ پتا نہیں یہ بابر اسے کیوں ڈھیل دے رہا ہے۔ چاقو ہاتھ میں ہے۔ اسے ختم ہی کر دیتا تو یہ بلا ہمیشہ کے لیے ٹل جاتی۔

میں نے کہا "کریزی! تقریباً پندرہ منٹ گزرنے والے ہیں۔ تمہاری یہ صلاحیت واقعی قابلِ تعریف ہے۔ تم نے ابھی تک سانس روکی ہوئی ہے۔ بھلا اور کتنی دیر تک روک سکتے ہو؟"

وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے حور بانو سے پوچھا "اس کھیل کو کب تک جاری رہنا چاہیے؟"

وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی "تم سارے ہی مرد ایک جیسے ہو۔ جان جانے کا خطرہ ہو تب بھی خواہ مخواہ مردانگی دکھاتے ہو۔ یہ نہیں سوچتے کہ دشمن کو موقع ملے گا تو وہ کبھی مردانگی دکھانے کا موقع نہیں دے گا اور ہمیں مار ڈالے گا۔"

"تم درست کہتی ہو لیکن کسی بھی مقابل کو اس کی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقع نہ دینا ناانصافی ہے۔ میں اسے موقع دے رہا ہوں۔ بولو کریزی! اور کتنی مہلت چاہیے؟"

میری بات ختم ہوتے ہی گاڑی کے اندر جیسے زلزلہ آ گیا۔ وہ دائیں بائیں ذرا ڈگمگائی۔ اس کے ساتھ ہی حور بانو کی چیخ سنائی دی۔ گاڑی سڑک سے اتر گئی تھی۔ ڈھلان میں دوڑتی جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک بہت بڑے درخت سے ٹکرا گئی۔ ایک زبردست دھماکہ سا ہوا۔ جسمانی تو نہیں مگر ذہنی دھماکہ نہ ہوا میں دونوں سیٹوں کے درمیان دبک گیا تھا اس لیے محفوظ رہا۔ کم کریزی بھی سامنے ڈیش بورڈ سے ٹکرا نہیں سکتا تھا۔ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے کا سرا میرے ہاتھوں میں تھا اور میں نے اب تک اسے بڑی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی سیٹ سے لگا رہا۔ ایک بار مجھے احساس ہوا کہ اس نے پھندے سے خود کو نجات دلانے کی جدوجہد کی۔ اس کے بعد وہ ساکت ہو گیا۔

اپنے حواس درست کرنے میں چند سیکنڈ گزر گئے پھر مجھے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے غور کیا تو وہ ببلو کی آواز تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر دونوں سیٹوں کے درمیان سے اٹھتے ہوئے اگلی سیٹ کی طرف دیکھا، وہ خالی تھی نہ حور بانو تھی نہ ببلو مگر ببلو کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے رسّی کو چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی کم کریزی ایک طرف لڑھکتا ہوا کار کے کھلے ہوئے دروازے سے نیچے کی طرف گر پڑا۔ اس کا آدھا دھڑ کار کے اندر تھا۔ آدھا باہر۔ میں اسی حالت میں اسے چھوڑ کر کار سے نکل کر دوڑتا ہوا سڑک کی طرف گیا۔ وہاں حور بانو ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور ببلو دوسری طرف پڑا رو رہا تھا۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ میں نے ببلو کو گود میں اٹھا لیا۔ اسے تھپک کر تسلیاں دیں۔ پھر حور بانو سے پوچھا "تم خیریت سے تو ہو کیا زیادہ چوٹیں آئی ہیں؟"

اسے موت کا خوف تھا۔ دشمن حواس پر چھایا ہوا تھا۔

اس نے پوچھا "کیا وہ زندہ ہے؟"

تب میں نے گھوم کر کار کی طرف دیکھا۔ وہاں سے بلو کو لے کر دوڑتا ہوا کریزی کے پاس پہنچا۔ وہ اسی طرح آدھا کار کے اندر اور آدھا باہر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ اس کے دماغ میں پہنچ کر دیکھوں پھر میں نے سوچا، یہ دانشمندی نہ ہوگی۔

میں نے قریب پہنچ کر اس کی کلائی کو تھام لیا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ میں نے سنا بھی تھا، پڑھا بھی تھا اور جرائم کی دستاویزی فلموں میں دیکھا بھی تھا ۔ سانس روکنے والے یوگا کے فن میں مہارت حاصل کرنے والے اس طرح سانس روکتے ہیں اور خود کو مردہ بنا لیتے ہیں کہ ان کی نبض کا اور دل کی دھڑکنوں کا پتا نہیں چلتا۔ اس وقت مجھے بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ جسم نہ تو بالکل ہی سرد تھا نہ گرم۔ یوں بھی مرنے کے فوراً بعد جسم سرد نہیں پڑتا۔ ہلکی سی حرارت ضرور رہتی ہے۔

میں وہاں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دُور جا کر توجہ سے اسے دیکھنے لگا۔ اگر وہ زندہ ہوگا تو ایک ذرا حرکت ضرور کرے گا پھر مجھے خیال آیا، یہ ضروری نہیں ہے۔ جو لوگ سانس روک کر مراقبے میں پہنچ جاتے ہیں، وہ ایک ذرا بھی حرکت نہیں کرتے۔ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت ہو جاتے ہیں۔ باہر کی کوئی چیز انھیں چھو کر نہ تو گرما سکتی ہے، نہ سردی سے ٹھٹھرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور نہ ہی چیونٹی وغیرہ کے کاٹنے کا احساس ہو سکتا ہے۔

حُور بانو میرے قریب آ گئی تھی۔ میں نے کہا "یہاں سے فوراً بھاگنا چاہیے۔ اچھا ہے کہ رات کا وقت ہے اور یہ ویران راستہ ہے اگر اِدھر سے گاڑی والے گزریں گے تو ہم سے طرح طرح کے سوالات کیے جائیں گے۔ میں تھانہ کچہری کے معاملات میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں تیز چل رہا تھا۔ وہ کبھی دوڑنے لگتی کبھی چلنے لگتی۔ ہم وہاں سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ایک لمبا راستہ کاٹ کر پھر اسی سڑک پر پہنچنا چاہتے تھے تاکہ کسی گاڑی میں لفٹ مل جائے۔ اس نے چلتے چلتے میرے بازو کو تھام لیا۔ میں نے اسے دیکھا۔ وہ کہنے لگی "تم تھک گئے ہو گے۔ بلو کو مجھے دے دو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جب سے تم ملی ہو۔ تب سے میں ایک بیوی کا بوجھ اٹھاتا آ رہا ہوں۔ بھلا بلو کا بوجھ کیا ہوگا؟"

وہ بھی ہنسنے لگی۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگی۔

"نجومی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب میں تقدیر کی قائل ہو رہی ہوں۔"

"نجومی نے کیا کہا تھا؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

وہ اپنی بائیں ہتھیلی کو دیکھنے لگی۔ اگرچہ نیم تاریکی میں ہاتھ کی لکیریں نظر نہیں آ سکتی تھیں۔ تاہم وہ تصور میں نجومی کو دیکھ رہی تھی۔ نجومی اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "تمہارے نصیب میں بھٹکنا لکھا ہے۔ تنہا نہیں کسی کے ساتھ بھٹکتی رہو گی۔"

حور بانو نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اب اپنے سوال کا جواب معلوم کرنا ضروری نہیں تھا۔ وہ چلتے چلتے دور تاریکی میں دیکھتے ہوئے بولی "میرا تمہارا کتنی دیر کا ساتھ ہے۔ ہمارا ناٹک ختم ہو چکا ہے۔ میں گھر پہنچوں گی پھر اپنے گھر کی ہو جاؤں گی تم اپنے راستے چلے جاؤ گے۔"

"تم گھر کیسے جا سکو گی؟" اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"دشمن اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ ابھی شہر پہنچتے ہی میں ٹیلیفون کے ذریعے کرم داد اور ریحانہ سے رابطہ قائم کروں گا۔ انھیں اپنے خیال کے مطابق ڈھال چکا ہوں لیکن زرینہ اور کبیر داس جب واپس آئیں گے تو انھیں حالات کا علم ضرور ہوگا۔ درخت سے ٹکرانے والی کار کے متعلق بھی کسی نہ کسی سے خبر ملے گی اور وہاں کم کریزی کی لاش بھی ملے گی۔ پتا نہیں کمبخت مر چکا تھا یا سانس روکے ہوئے تھا۔ اگر اس حادثے میں زندہ بچ گیا تو واپس آ کر اپنی ٹیم کے تمام افراد کو ہمارے پیچھے لگا دے گا۔ وہ لوگ سب سے پہلے تمہارے گھر پر دھاوا بولیں گے۔ لہٰذا تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔"

"بلو کا کیا ہوگا؟"

"ہم اسے تمہارے والدین کے پاس پہنچا دیں گے۔"

"وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"تم اطمینان رکھو۔ ہم کوئی چال ایسی چلیں گے کہ وہ بلو کو اور تمہارے والدین کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

ہم تاروں بھرے آسمان کے سائے میں چل رہے تھے نیم تاریکی تھی۔ برائے نام روشنی میں راستہ واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی وہ چلتے چلتے لڑکھڑا جاتی تو میرے بازو کو تھام لیتی۔ وہ بڑی محتاط تھی۔ اپنے آپ میں سمٹی رہتی تھی۔ اس کے باوجود حالات اسے میرا سہارا لینے پر، میرے پاس آنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

کئی بار میں نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سمندر کے ساحل پر چاند کی بھرپور روشنی تھی۔ وہاں میں نے اسے وضاحت سے دیکھا تھا۔ اب چاند ڈوب گیا تھا، اس کے باوجود چاندنی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ چاند بادلوں میں چھپتا ہے۔ وہ اپنے آنچل میں چھپتی جا رہی تھی۔

ہم تقریباً ایک میل کا لمبا چکر کاٹ کر پھر اسی شاہراہ پر پہنچ گئے۔ میں شاہراہ کے کنارے کنارے چل سکتا تھا لیکن وہ تھک گئی تھی، بلو بھی پریشان کر رہا تھا۔ ہم وہیں سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ کسی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد ہی ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ وہ ابھی دور تھیں۔ حور بانو بے چینی سے ہاتھ ہلانے لگی۔ میں نے کہا "ذرا ٹھہر جاؤ۔"

مگر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ میں اس کے پیچھے بلو کو لے کر چل رہا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ رک رہی تھی پھر ہم سے کچھ فاصلے پر ذرا دیر کے لیے رکی۔ اس کے بعد گاڑی کے اندر سے آواز آئی "چلو یار، یہ تو بچے والی ہے۔"

گاڑی نے پھر رفتار پکڑ لی اور فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ جی چاہتا تھا، ابھی ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ کروں اور ان کی گاڑی کو واپس لے آؤں لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ میں اس بات کی مشق کر رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ ہر بات میں خیال خوانی کی جو عادت پڑ گئی ہے اسے کم کرتا جاؤں۔ زیادہ ضروری ہو تو ٹیلی پیتھی کو استعمال کروں ورنہ عام آدمیوں کی طرح زندگی گزاروں۔

حُور بانو نے دور جاتی ہوئی گاڑی کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "بدمعاش لوگ تھے۔ اچھا ہوا گاڑی نہیں روکی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "بے چاروں نے تمھیں تنہا سمجھ کر گاڑی روکی تھی پھر بلو نظر آیا یعنی کباب میں ہڈی دکھائی دی۔ اس کے بعد بڈّا نظر آنے لگا۔ پھر وہ کیسے ٹھہرتے؟"

"اب کیا ہوگا۔ پتا نہیں کوئی گاڑی آئے گی بھی یا نہیں؟ بہت رات ہو چکی ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک کار کی ہیڈ لائٹس نظر آنے لگیں۔ میں نے بلو کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا "میں اس درخت کے پیچھے جا رہا ہوں۔ تم ہاتھ اٹھا کر لفٹ لینے کی کوشش کرنا۔ جیسے ہی وہ گاڑی روکے گا، تم دروازہ کھولو گی میں بھی بلو کو لے کر پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے یہی کیا۔ تنہا ہاتھ اٹھا کر لفٹ مانگنے کے انداز میں گاڑی کو روکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ رات کا وقت تھا، ویرانہ تھا۔ ایک جوان اور حسین عورت لفٹ مانگ رہی تھی اور گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ایسے میں تو زندگی ٹھٹک جاتی ہے۔ موت رک جاتی ہے پھر بھلا گاڑی کیسے نہ رکتی۔ جیسے ہی وہ رکی۔ حُور بانو نے کھڑکی کی طرف جھک کر کہا "میں شہر جانا چاہتی ہوں۔ پلیز، آپ مجھے پہنچا دیں گے۔"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

وہ دروازہ کھولنے کے لیے جھک رہا تھا پھر مجھ پر نظر پڑ گئی۔ میں بلو کو لے کر آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

"یہ میرے شوہر اور یہ میرا بچہ ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر کچھ کہے سنے بغیر اسے تیز رفتاری سے آگے بڑھاتا چلا گیا مگر اب میں اسے اس طرح جانے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ شرافت سے اور سیدھی انگلی سے کبھی گھی نہیں نکلتا۔ میں نے اسے آگے جا کر رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دروازہ کھول کر اتر گیا اور سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ حور بانو نے کہا "یہ کیا؟"

میں نے کہا "میں ابھی بلو کو جھاڑیوں کے پاس لے گیا تھا۔ وہ بے چارا بھی جا رہا ہے۔ چلو، موقع اچھا ہے۔"

ہم تیزی سے دوڑتے ہوئے اس گاڑی کے پاس آئے، وہاں پہنچتے ہی ہم دونوں نے دونوں طرف کا دروازہ کھولا اور اندر بلو کو لے کر بیٹھ گئے۔ پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس کے ساتھ گاڑی والے کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ اب وہ کار کے پیچھے دوڑتا ہوا آ رہا تھا، چلّا رہا تھا۔ اپنی کار کے لیے دہائی دے رہا تھا۔ ہم اس کی آواز زیادہ دیر تک نہ سن سکے۔ گاڑی بہت دور نکل آئی تھی۔ حُور بانو ہنس رہی تھی، دل کھول کر ہنس رہی تھی۔ کیا ترنم ہنسی تھی۔ میں پہلی بار اسے ہنستے ہوئے سن رہا تھا۔ اس کی آواز میں رَس تھا، گفتگو میں شاعرانہ سلیقہ تھا۔ وہ ہر اعتبار سے ایسی مکمل لڑکی تھی جو کسی بھی باذوق شخص کے گھر کو جنت بنا سکتی تھی۔

میں نے ایک ذرا ریحانہ کے دماغ میں جھانک کر دیکھا، وہ اور کرم داد میرے متعلق بحث کر رہے تھے۔ ریحانہ کہہ رہی تھی "اچانک بابر کہاں غائب ہو گیا۔ اِدھر کریزی، حُور بانو کو لے گیا ہے۔ اُدھر وہ چلا گیا۔"

کرم داد نے کہا "میں یقین سے کہتا ہوں۔ وہ کریزی کا پیچھا کر رہا ہوگا۔ میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے مگر اسے بڑی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ وہ میری طرح ضدی ہے۔ کسی بات کے پیچھے پڑ جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

میں دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔ میں چاہتا تھا، ریحانہ اور کرم داد وہاں سے نکل جائیں۔ آہستہ آہستہ میں ان بھٹکے ہوئے جوانوں کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ دشمن جنھیں ملک کے خلاف منظم کر کے لائے تھے، میں انھیں دشمنوں کے خلاف

منظم کرنا چاہتا تھا۔

حور بانو کے مکان سے بہت دور میں نے گاڑی ایک جگہ روک دی پھر اس گاڑی کو چھوڑ کر وہاں سے پیدل چلتے ہوئے اس کے گھر پہنچے۔ اس کے والدین نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ حور بانو جلدی جلدی تمام واقعات سنانے لگی۔ اس کی ماں نے کہا: "بیٹی! یہ تو غضب ہوگیا۔ وہ ظالم تمھارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور تمھاری وجہ سے ہم سب کو بھی ختم کر ڈالیں گے یا ہمارے لیے مصیبت بنے رہیں گے۔"

میں نے کہا: "ماں جی! آپ پریشان نہ ہوں۔ جیسے ہی وہ آئیں تو قسم کھا کر ان سے کہہ دیں کہ میں زبردستی حور بانو کو لے گیا ہوں اور یہ کہہ کر لے گیا ہوں کہ جو میری بیوی بن کر مجھے دھوکا دینا چاہتی تھی، میں سچ مچ اسے بیوی بنا کر رکھوں گا تیجے کی مجھے ضرورت نہیں ہے، اس لیے اسے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ یہ باتیں سننے کے بعد یقیناً وہ آپ لوگوں سے ہمدردی کریں گے اور اعتماد کریں گے کیونکہ آپ اب تک ان کے وفادار رہے ہیں۔"

وہ میری باتوں سے قائل ہوگئے۔ اگر میری بات نہ مانتے تب بھی ان کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ تنظیم والوں کے رحم و کرم پر تھے اور حور بانو کو ان کے آگے اب چارہ بنا کر پیش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا مشن کے دوران کسی سے کوئی غلطی ہو جائے اور اس غلطی سے مشن کو نقصان پہنچتا ہو تو غلطی کرنے والے کو سخت سے سخت سزا دیتے تھے۔

میں نے کہا: "آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ میں ان دشمنوں کو ٹھکانے لگاؤں گا اور حور بانو کے سر سے یہ الزام مٹاؤں گا کہ اس کی غلطی نہیں تھی۔ ساری چالیں میں چل رہا تھا اور جب تنظیم والوں کو آپ لوگوں کی طرح حور بانو پر بھی اعتماد ہونے لگے گا تو میں اسے آپ کے پاس چھوڑ دوں گا۔"

حور بانو نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا: "نہیں، اب میں یہاں واپس نہیں آؤں گی۔ یا تو میری امی اور پاپا کو بھی یہ تنظیم چھوڑنی ہوگی یا میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ میں ان کی آلۂ کار بن کر اپنی عزت کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتی۔"

"حور بانو! یہ بڑی لمبی بحث ہے اور ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جو بھی فیصلہ ہوگا وہ ہم بعد میں تمھارے والدین کو بتاتے رہیں گے۔ اس وقت تو فوراً چلو۔"

اس نے اپنے ضروری کپڑے سمیٹے۔ انھیں ایک اٹیچی میں رکھا۔ اپنا کچھ اور ضروری سامان بھی اس میں رکھ کر میرے ساتھ باہر آگئی۔ ہم ایک سڑک پر پہنچے۔ اتفاق سے ٹیکسی مل گئی۔ میں فون کے ذریعے ریحانہ اور کرم داد سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا لیکن کراچی شہر میں کہیں سڑک کے کنارے فون بوتھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ آخر میں نے نائٹ پوسٹ آفس کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پھر حور بانو کے ساتھ پوسٹ آفس میں آیا۔ وہاں سے ٹیلیفون کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ کرم داد نے میری آواز سنتے ہی پوچھا: "ارے بابر! تم کہاں ہو؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں ساری باتیں بعد میں بتاؤں گا۔ میں نے حور بانو کو اس کے چنگل سے چھڑا لیا ہے۔ اگر میرا مشورہ مانو اور مجھ پر اعتماد کرو تو وہ جگہ فوراً چھوڑ دو۔ اپنا اور ریحانہ کا سامان سمیٹو، ایک سوٹ کیس میں رکھو اور حیدرآباد جانے والی بس کے اڈے پر پہنچ جاؤ۔"

میں باتیں کر رہا تھا اور خیال خوانی کے ذریعے کرم داد کو دیکھ رہا تھا۔ ریحانہ اس کے قریب کھڑی ہوئی ریسیور سے کان لگائے میری بات سن رہی تھی۔ اس نے ریسیور ہاتھ میں لے کر کہا: "میں تمھاری باتیں سن رہی ہوں اور تمھاری تجویز سے اتفاق کرتی ہوں۔ ہم جلد ہی بس کے اڈے تک پہنچنے والے ہیں۔ ہمارا انتظار کرو۔"

"سنو ریحانہ! کرم داد ذرا گرم مزاج کا آدمی ہے۔ اگر زرینہ اور کبیر داس وہاں پہنچ جائیں تو مصلحت سے کام لینا۔ کریزی وغیرہ کے سلسلے میں لاعلمی ظاہر کرنا۔ ان کی موجودگی میں اپنا سامان چھوڑ دینا۔ صرف ٹہلنے کے انداز میں باہر نکل کر یہاں پہنچ آنا۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ جیسے حالات ہوں گے ویسا ہی کروں گی، تم اطمینان رکھو ہم آ رہے ہیں۔"

میں وہاں سے مطمئن ہو کر حور بانو کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ وہاں سے ہم بس اڈے تک گئے۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔ ہم ریحانہ اور کرم داد کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے کہا: "حور بانو! میں دشمنوں کے سلسلے میں پلاننگ کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ چاروں طرف نظر نہ رکھ سکوں۔ تم محتاط رہو اور آس پاس دیکھتی رہو۔ اگر کسی پر شبہ ہو کہ وہ اس تنظیم کا آدمی ہے اور ہمیں تاڑ رہا ہے تو مجھے فوراً بتا دینا۔"

وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی: "میں کیا بتاؤں، یہاں تو کتنے ہی لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر کہا: "مجھے نہیں تمھیں دیکھ رہے ہیں۔"

وہ سر پر آنچل رکھ کر اپنے چہرے کو گھونگھٹ میں چھپانے لگی۔ میں خیال خوانی کے ذریعے زرینہ کے پاس پہنچا۔ وہ کبیر داس اسی محفل میں شریک تھے، جس میں جمال احمد جسکانی وغیرہ تھے۔ میٹنگ ابھی ابھی برخواست ہوئی تھی۔ وہ لوگ اٹھ کر

جا رہے تھے۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ چچا سام نے ریسیور اٹھا کر سنا پھر زرینہ کو آواز دیتے ہوئے کہا: "رک جاؤ۔ کبیر داس! تم بھی اِدھر آؤ۔"

وہ دونوں اس کے قریب آئے۔ چچا سام ریسیور کان سے لگائے باتیں سن رہا تھا۔ میں اس کے دماغ میں پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ ان سب کا سرغنہ تھا تو یقیناً یوگا کا ماہر ہو سکتا تھا۔ اس لیے محتاط رہنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر تک ریسیور سے باتیں سنتے رہنے کے بعد اس نے کہا: "اوہ کریزی! یہ کیسے ہوگیا؟"

یہ کہہ کر اس نے دوسری طرف کی آواز سنی۔ کریزی یقیناً کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سننے کے بعد بولا: "تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ماسٹر کی نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کرم داد ایک جنگلی بھینسا ہے۔ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قابو میں رکھا جائے۔ تم نے اسے ناراض کیوں کر دیا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ تمھیں کی ہول سے نہیں جھانکنا چاہیے۔ اگر تم اس کی بات تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے، اسے وہاں سے ٹال دیتے۔ اس کے بعد. . ."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید دوسری طرف سے کریزی کچھ کہنے لگا تھا۔ چچا سام نے کہا: "اچھی بات ہے، ہم اس معاملے میں پھر بحث کریں گے۔ تمھارا خیال درست ہے۔ وہ حور بانو کو لے کر اسی کے مکان کی طرف گیا ہوگا۔ ہم ابھی اپنے آدمی روانہ کرتے ہیں۔ تمھارے لیے بھی ایک گاڑی روانہ کی جا رہی ہے انتظار کرو۔"

اس نے ریسیور رکھ کر زرینہ اور کبیر داس کو دیکھتے ہوئے کہا: "گڑبڑ ہوگئی ہے۔ پہلے تو تمھارے ان دونوں باڈی بلڈرز نے کرم داد کو طیش دلایا۔ کریزی نے صلح صفائی کرا دی تھی۔ کرم داد نے کہا تھا، دوسری بار کسی نے اسے گالی دی تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گا اور یہی ہوا۔ دوسری بار اس کمبخت نے پھر اسے گالی دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں باڈی بلڈرز اس سے لڑ پڑے اور اسے زیر نہ کر سکے۔ دونوں ہی مارے گئے۔"

زرینہ نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا: "تنظیم کے کتنے ہی آدمی حرام موت مرتے ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہ ہوئی۔"

"خاص بات یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کریزی کا دماغ بھی کچھ چل گیا ہے۔ وہ خواہ مخواہ کرم داد سے الجھ پڑا ہے۔"

"وہ بھلا خواہ مخواہ کیوں الجھے گا؟"

"جب وہ آئے گا تو ہم تفصیل معلوم کریں گے۔ ابھی تو بات بگڑ گئی ہے۔ اس کے اور کرم داد کے درمیان جھگڑا ہونے لگا تو بابر نے فائدہ اٹھایا اور انکشاف کیا کہ اس کی یادداشت گم نہیں ہوئی ہے۔ جانتی ہو وہ اس تہ خانے سے کس طرح نکلا تھا؟"

زرینہ نے حیرانی سے پوچھا: "کس طرح؟"

"تمھارے اس غلام نے اسے رہائی دلائی تھی جو ہمیشہ تمھارے قدموں سے لگا رہتا تھا اور تمھارا سچا عاشق ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔"

زرینہ نے کہا: "اوہ مائی گاڈ! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی، وہ ایسی حرکت کرے گا۔ میں جب بھی پیرس پہنچوں گی، اسے ضرور اس تہ خانے میں ڈالوں گی اور دیکھوں گی کہ وہ خود وہاں سے کیسے نکلتا ہے۔"

"ابھی اس غلام کی بات کر کے وقت ضائع نہ کرو۔ کبیر! تم فوراً باہر جاؤ۔ جمال احمد جسکانی کو بلا کر لاؤ۔ کم کریزی کے بیان کے مطابق بابر حور بانو کو اس کے گھر لے گیا ہوگا اور میری عقل، میرا تجربہ کہتا ہے، بابر اسے مائخل شوف کے پاس لے جائے گا۔ جب اس کی یادداشت گم نہیں ہوئی تھی تو یقیناً وہ مائخل شوف کی طرف سے ڈراما پلے کر رہا تھا اور تم لوگوں کے درمیان گھس کر ہمارے متعلق اہم معلومات حاصل کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس نے خود کو ظاہر کر دیا۔ اگر چاہتا تو یادداشت گم ہونے کا بہانہ کرتا رہتا اور ہمارا اعتماد حاصل کرتا رہتا۔ ویسے وہ کچا کھلاڑی ہے۔"

میں کچا کھلاڑی دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہوگیا۔ حور بانو نے اچانک میرے بازو کو تھام لیا تھا۔ میں نے دیکھا، ایک حوالدار ہم سے کچھ فاصلے پر ایک ہاتھ میں ڈنڈا نچاتے ہوئے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لانبے قد کا بھاری ڈیل ڈول والا مکرانی بھی حور بانو کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: "کیوں رے، کہاں سے اڑا کے لایا ہے؟"

میں نے جواب دیا: "ارے اپنی بہن کو نہیں پہچانتا؟ تیرے باپ کے گھر سے اڑا کر لا رہا ہوں۔"

میری بات اسے گولی کی طرح لگی۔ اس نے تڑپ کر جیب میں ہاتھ ڈالا پھر جو ہاتھ باہر آیا تو ایک کھٹاکے سے چاقو کا پھل چمکنے لگا۔ حوالدار نے ڈنڈا اس کے آگے کرتے ہوئے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا: "خبردار! حوالدار میں ہوں۔ میں قانون کا محافظ ہوں۔ میں اس بدمعاش کو حوالات میں بند کروں گا اور اس لڑکی سے اس کے ماں باپ کا پتا معلوم کروں گا۔"

وہ پھر ڈنڈے کو نچاتا ہوا ہمارے قریب آیا۔ ڈنڈے کے ایک سرے کو اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا: "میں حوالدار ہوں، قانون کا محافظ۔ سیدھی طرح میرے ساتھ تھانے چلتے ہو یا. . ."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے سوسو

کے نوٹ جیب سے نکال لیے۔ ایک ایک کر کے گننے لگا۔ وہ پانچ سو تھے۔ حوالدار کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس کا ڈنڈا ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا' میں نے تھام لیا۔ ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے مکرانی کے تیور بدل گئے تھے۔ وہ گھور کر دیکھ رہا تھا لیکن اس نے چاقو کو بند کر لیا تھا اور اسے جیب میں رکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "میں قانون کے محافظوں کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اگر میں یہ سو سو کے پانچ نوٹ تمھیں دوں گا تو یہ رشوت ہو جائے گی۔ ایسا کرتا ہوں کہ یہ روپے تمھارے اس چمچے کو دیتا ہوں جس نے ابھی چاقو نکالا تھا۔"

حوالدار نے تائید میں سر ہلا کر کہا "بے شک' میں کبھی رشوت نہیں لیتا۔ میں قانون کا محافظ ہوں' حرام کھانے والوں کو حوالات میں پہنچاتا ہوں۔ اے چلو' صاحب سے روپے لے لو۔ ہی ہی ہی' بے چارہ غریب آدمی ہے۔ بال بچوں والا ہے۔ کچھ دنوں تک اس کا چولہا جلتا رہے گا۔"

وہ رقم لینے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "لیکن ایک شرط ہے۔ اسے اعتراف کرنا ہوگا کہ میری بیوی اس کی بہن ہے۔"

حوالدار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں ہاں، کیوں نہیں' پرائی بہو بیٹیاں تو ہماری بھی بہو بیٹیاں ہوتی ہیں، ہماری بہنیں ہوتی ہیں' ابے چل' جلدی سے بہن بول دے۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ حوالدار نے اس کے سر پر ڈنڈا بجاتے ہوئے کہا "کیوں غیرت مند بن کر مال چھوڑ رہا ہے۔ غیرت تو یہی ہے کہ کسی دوسرے کی بیوی کو بہن سمجھا جائے۔ میں مجبور ہوں' قانون کا محافظ ہوں اور اس رقم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ تو اسے لے کر مجھے ادھار دے گا تو دوسری بات ہوگی۔"

اس نے جھجکتے ہوئے کہا "بہن! مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم دونوں کو غلط سمجھا تھا۔ میں تمھیں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

میں نے پانچ سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ وہ خوش ہو گیا۔ دوسری طرف حوالدار کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے چمچے کو ڈنڈے سے ہانکتے ہوئے ہم سے دور لے جانے لگا۔ میں نے کہا "دیکھو حور بانو! ابھی یہ کتنا خطرناک غنڈہ لگ رہا تھا' چاقو نکال چکا تھا۔ جیسے ہمارے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا لیکن چند نوٹوں نے اسے نالی کا کیڑا بنا دیا۔"

یہ کہتے ہی میں اس چمچے کے دماغ پر قابض ہو گیا۔ اس نے گھوم کر حور بانو کو دیکھا لیکن ایسی نظروں سے جیسے کسی مقدس رشتے کو دیکھ رہا ہو۔ حوالدار نے کہا "بیٹے! اس میں سے میں تجھے پچاس دوں گا۔ زیادہ کا لالچ کرے گا تو ڈنڈا ملے گا۔"

اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا "آہ! میری بہن۔"

حوالدار نے ناگواری سے پوچھا "ابے کہاں کی بہن۔ روپے نکال۔"

وہ حوالدار کو نظر انداز کرتے ہوئے حور بانو کی طرف بڑھ گیا۔ پھر دور ہی سے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بڑی عقیدت سے چیخ کر بولا "آہ میری بہن! میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میں اپنی بہن سے' اپنے بہنوئی سے ایک پیسہ بھی لوں۔ نہیں نہیں، یہ رقم مجھے سانپ کی طرح ڈس رہی ہے۔ میری غیرت کو للکار رہی ہے۔"

وہ حور بانو کی طرف بڑھنے لگا۔ حوالدار اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے کہنے لگا "ابے ابے، یہ کیا کر رہا ہے۔ میرے تیرے باپ نے بھی ایک رات میں پانچ سو روپے نہیں دیکھے ہوں گے۔ کیوں واپس کرنے جا رہا ہے۔ کیا تیری کھوپڑی گھوم گئی ہے؟"

اس نے پیچھے سے اس کی قمیص کے دامن کو پکڑ لیا۔ وہ اپنا دامن چھڑاتے ہوئے بولا "چھوڑ دو' میرے راستے میں نہ آؤ۔ اب میں دنیا کی ساری دیواریں توڑ کر بہن کے مقدس رشتے کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گا۔"

پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے سو سو کے پانچ نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔ حور بانو حیران پریشان کبھی اسے دیکھ رہی تھی، کبھی مجھے اور کبھی حوالدار کی بے بسی کو سمجھ رہی تھی۔ میں نے کہا "حور بانو! ایک بھائی اپنی محبت' عقیدت اور تمام تر غیرت کے ساتھ یہ روپے واپس کر رہا ہے، لے لو' دیکھو ہماری دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ ہمارا ملک کتنا اچھا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے ہی قانون پسند حوالدار پیدا ہوتے رہیں اور ایسے غیرت مند بھائی ہر عورت کو اپنی بہن سمجھتے رہیں تو ہمارا ملک اخلاقیات کے اعتبار سے دنیا کا عظیم ترین ملک ہوگا۔"

اتنے میں ہمارے قریب ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ ریحانہ اور کرم داد پہنچ گئے تھے۔ ریحانہ نے ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا۔ کرم داد سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس نے حور بانو کو دیکھتے ہوئے کہا "تھینکس گاڈ، تم خیریت سے ہو۔ بلو کہاں ہے؟"

ہم بلو کے متعلق مختصر طور پر بتانے لگے۔ تمام باتیں سن کر ریحانہ نے کہا "یہ تم نے اچھا کیا کہ بلو کو والدین کے پاس چھوڑ دیا۔ یہ دشمن اب تمھیں چین سے رہنے نہیں دیں گے۔"

کرم داد نے کہا "ہمیں کب چین سے رہنے دیتے ہیں۔"

"ہم تو عادی ہو چکے ہیں۔ حور بانو اگرچہ ذہین ہے اور معاملہ فہم ہے لیکن زندگی میں پہلی بار عملی تجربات سے گزرنے کے لیے گھر کی چار دیواری سے نکلی ہے۔"

میں نے کہا "مگر اکیلی نہیں ہے۔ ہم سب اس کے ساتھ ہیں' ہم اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گے۔"

اس نے جھکی جھکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز میں احسان مندی تھی۔ میں نے کہا "اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

ریحانہ نے پوچھا "کچھ معلوم تو ہو' کہاں جائیں گے' کیا کریں گے؟ حالات تو اچانک ہی ایسے بدل گئے کہ راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"ایک ہی راستہ ہے۔ ہم بس کے ذریعے پہلے حیدر آباد پہنچیں۔ اس وقت نہ ٹرین مل سکتی ہے اور نہ ہی کوئی فلائٹ ہے۔"

"اگر کوئی فلائٹ ہوتی تو ہم کہاں جاتے۔"

مجھ سے پہلے ہی کرم داد نے کہا "لاہور۔"

میں نے کہا "ہاں فلائٹ کے ذریعے شاید ہم سیدھے لاہور پہنچ جاتے لیکن ہمیں خشکی کے راستے سفر کرنا ہے۔ پتا نہیں لاہور کب پہنچیں گے۔ ہمارا ملک بین الاقوامی سازشوں کا گڑھ بن رہا ہے۔ بہر حال موقع ملا تو لاہور سے ہوتے ہوئے جائیں گے۔"

ہم بس میں سوار ہو گئے۔ ریحانہ اور کرم داد اگلی دو سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ان کی پچھلی دو سیٹوں پر میں حور بانو کے ساتھ آ گیا۔ کرم داد نے پیچھے کی طرف سر گھما کر مجھ سے کہا "ہمارے حالات اتنی تیزی سے بدل گئے ہیں کہ دوست دشمن ہو گئے اور دشمن' دوست بنتے جا رہے ہیں۔ میرا اشارہ تمھاری طرف ہے۔ تم سائمن دی گریٹ کے آدمی ہو۔"

"پہلے تھا۔ اب نہیں ہوں۔"

"بہر حال ہمیں اپنے موجودہ حالات پر اور مختلف مسائل پر بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ ہمارے درمیان دوستی ہونے کے باوجود ابھی اجنبیت ہے لیکن یہاں لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے میں کب تک سر گھما گھما کر تم سے باتیں کروں گا۔ پھر یہ کہ آس پاس کے لوگ ہماری باتیں سن بھی سکتے ہیں۔"

میں نے تائید کی "ہاں بڑی مجبوری ہے۔ ہم بہت سے اہم معاملات پر گفتگو نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہ میں تمھارے پاس پچھلی سیٹ پر آ جاؤں اور یہ خواتین اگلی سیٹ پر بیٹھی رہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہوتے حور بانو نے یوں میرے ہاتھ کو تھام لیا تھا جیسے زبانِ بے زبانی سے کہہ رہی ہو۔ "نہ جانا' میرے پاس سے نہ جانا۔"

مجھے شبہ ہوا' کرم داد نے حور بانو کے اشارے کو دیکھ لیا ہے یا سمجھ لیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے کے لیے اس کے دماغ میں پہنچا لیکن اس کی سوچ سے پتا چلا کہ اُدھر اگلی سیٹ پر بھی ریحانہ نے کرم داد کے ہاتھ کو پکڑ لیا ہے۔

بظاہر دونوں عورتوں نے کچھ نہیں کہا تھا مگر قید کر لیا تھا۔ ہم فولادی دشمنوں کی فولادی دیواروں کو توڑ کر آتے تھے لیکن پھولوں کی زنجیر کو نہیں توڑ سکتے تھے۔ بے بسی سے ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔ کرم داد ریحانہ کی طرف متوجہ ہوا۔ میں آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ حور بانو میرے ذرا قریب ہو کر آہستگی سے بولی "تمھاری یادداشت گم نہیں ہوئی ہے۔ تم نے اپنی بیوی آمنہ کو کیسے بھلا دیا ہے۔ کیوں اسے چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

"وہ میری بیوی ایسی ہی ہے جیسی تھوڑی دیر پہلے تم تھیں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بھئی' ہم مختلف خطرناک تنظیموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے جو ٹریننگ حاصل کی ہے' وہ یہی ہے کہ کبھی بھائی کا' کبھی باپ کا' کبھی بیٹے کا اور کبھی شوہر کا رول ادا کرتے رہو۔ اسی طرح تم بھی اپنی تنظیم والوں کی طرف سے ایک بیوی کا رول ادا کرنے میرے پاس آئی تھیں' آمنہ سے میری شادی کبھی نہیں ہوئی' بس ہماری شادی کا چرچا کیا گیا لیکن وہ پٹ پٹ خود کو میری بیوی سمجھنے لگی ہے اور ہمیشہ بیوی بن کر رہنا چاہتی ہے جبکہ میں اس سے کتراتا ہوں۔"

"کیوں کتراتے ہو؟"

"دل کسی ایک پہ آتا ہے۔ یہ بات اس وقت تمھاری سمجھ میں آئے گی، جب تمھارا دل کسی پر آئے گا۔"

وہ فوراً ہی ہٹ گئی۔ اپنی سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آنچل ڈھلک کر شانے پر آ گیا تھا۔ اسے سینے پر رکھ کر اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں اس کے چور خیالات پڑھ سکتا تھا لیکن ہیچ

اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا

اگلی سیٹ پر کرم داد اور ریحانہ آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف تھے۔ مجھے یقین تھا' وہ میرے ہی متعلق کچھ باتیں کر رہے ہوں گے پھر اس کی تصدیق ہو گئی۔ اسی وقت کرم داد نے اپنی سیٹ پر سے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پھر وہی سوال کیا جو حور بانو کر چکی تھی یعنی میں آمنہ کو چھوڑ کر کیوں جا رہا ہوں؟

میں نے اسے بھی وہی جواب دیا۔ ریحانہ سن رہی تھی' اس نے یقین کر لیا۔ ان خطرناک تنظیموں میں جتنے بھی آلۂ کار ہوتے تھے' وہ مختلف قسم کے رول ادا کرتے تھے۔ کوئی کسی کا میاں نہیں ہوتا تھا' کوئی کسی کی بیوی نہیں ہوتی تھی۔ اگر ہوتے بھی تو تنظیم کی خاطر ایک دوسرے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا رول ادا کرنے کے لیے کسی مشن پر روانہ ہو جاتے تھے۔

ریحانہ نے کہا "کاش ہمیں معلوم ہو [illegible] زندہ ہے یا مر چکا ہے؟"

مجھے تو معلوم ہو چکا تھا لیکن میں بتا نہیں سکتا تھا۔ ویسے کم گھڑی سے پہلے آمنہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ آخر وہ بابر کی بیوی تھی اور اس وقت میں بابر تھا۔ میں نے حور بانو کو یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ مجھے آمنہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سچی بات یہ نہیں تھی۔ آمنہ کا رشتہ میرے لیے محترم تھا۔ اس کا شوہر مر چکا تھا، یہ بات میں اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ میں اس کے شوہر کے روپ میں تھا۔ دوسرے لفظوں میں آمنہ میرے پاس مرحوم بابر کی امانت تھی اور میں اس امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے کرم داد سے کہا "میں تھک گیا ہوں۔ ذرا بیٹھے بیٹھے نیند پوری کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی ہم تین بجے تک حیدر آباد پہنچیں گے۔"

کرم داد کے بجائے ریحانہ نے کہا "ہم بھی تھکے ہوئے ہیں، اس لیے کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔"

میں پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ حور بانو کی طرف دیکھا تو اس نے آہستگی سے کہا "آپ کو تھکن اتارنا چاہیے۔ آنکھیں بند کر لیجیے۔ نیند آئے یا نہ آئے ذرا سکون تو ملے گا۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور آمنہ کے پاس پہنچ گیا۔ مائیکل شوف نے تنظیم کے مختلف فرائض ادا کرنے کے لیے، ہمیں مختلف اہم افراد کو پھانسنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ گلزاری بیگم میرے ساتھ اسپتال میں آ کر عبدالباقی کو زیرِ دام لانے کے بجائے ٹیلی پیتھی کے طفیل خود ڈاکٹر کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ وطن کی محبت دل میں رکھتی تھی لیکن دہشت گرد تنظیم میں اس کے دماغ کو ایسا واش کیا گیا تھا کہ اب وہ انقلاب لانا چاہتی تھی اور اس انقلاب کی آڑ میں ٹیرر ٹریننگ سینٹر والے کس طرح اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتے تھے، یہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ واقعات سے بہت کچھ ظاہر ہوتا جا رہا ہے۔ آئندہ بھی ظاہر ہوتا جائے گا۔

بہ حال گلزاری بیگم کی طرح آمنہ بھی سلطان عابدی کو پھانسنے گئی تھی۔ اس کا کیا بنا؟ یہ مجھے معلوم کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ اب فرصت ملتے ہی اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ داستان آگے بڑھانے سے پہلے ایک ضروری بات کہہ دوں۔ دہشت گردی کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ کہیں بم کے دھماکے کیے جائیں، کسی کو قتل کیا جائے، کہیں آگ لگا دی جائے اور اس طرح عوام سے لے کر حکومت تک کو پریشان کیا جائے اور انھیں دہشت میں مبتلا رکھا جائے۔

دہشت گردی میں صرف شدت ہی نہیں ہوتی، دھیما پن بھی ہوتا ہے۔ تنظیم کے اہم عہدے دار اور باصلاحیت آلۂ کار اپنے اپنے سینٹرز میں جو ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے مطابق حکومت کے اہم شعبوں میں کسی نہ کسی طرح چھا جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح آپ پڑھ چکے ہیں کہ عالی جناب ایک بہت ہی اعلیٰ عہدے دار تھا۔ اس کے ایک اشارے سے عارضی طور پر قانون بدل جاتا تھا۔ ہر برسرِ اقتدار پارٹی اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایسے اعلیٰ عہدے دار تخریب کار تنظیموں کے ذریعے ضرور پھانسے جاتے ہیں اور رعونت جہاں عرف رعونا جیسی عورتیں ہی یہ کام کرتی ہیں۔

میرے قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمارے ملک کے اہم شعبے کس طرح دشمنوں کی سازشوں میں گھرے رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح آمنہ سلطان عابدی سے اہم معلومات حاصل کرنے گئی تھی۔ بہت سے اہم معاملات ایسے ہوتے ہیں جنھیں ملک کے مفاد کی خاطر اخبارات تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک اہم بات جو ہمارے اخبارات میں شائع نہیں ہوتی جسے چھپایا جاتا ہے، وہی بات دوسرے ممالک کے اخبارات میں شائع ہو جاتی ہے۔ ہزار جتن کے باوجود راز فاش ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دشمن ہمارے ہر شعبے کو اپنی نظر میں رکھتے ہیں اور یہاں کے راز اُڑا لے جانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ یہی کوشش آمنہ کرنے آئی تھی۔

سلطان عابدی صاحب اس کے چکر میں آ گئے تھے۔ آخر کیوں نہ آتے۔ انسان انسان ہی ہوتا ہے، اگر فرشتہ بن جائے، تب بھی کوئی عورت اسے انسان بلکہ شیطان بنانے کے لیے پہنچ جاتی ہے۔ جس وقت میں اس کے پاس پہنچا، عابدی صاحب کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی تھی اور ایک کلب سے نکل کر ان کے بنگلے میں جا رہی تھی۔ عابدی صاحب نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تم حسین بھی ہو اور سنگین بھی۔"

آمنہ نے ایک ادائے ناز سے مسکرا کر پوچھا "سنگین کیسے؟"

"بھئی کل رات تم بارہ بجے تک میرے ساتھ رہیں مگر اپنے آنچل کی ہوا دے کر چلی گئیں۔ میں رات بھر تمھارے بارے میں سوچتا رہا، کروٹیں بدلتا رہا۔"

وہ بڑی ہی مترنم آواز میں ہنسنے لگی۔

"کسی کو تڑپا کر بہت مزہ آتا ہے۔ مرد جسمانی طور پر مضبوط تو ہوتا ہے لیکن عورتوں کی طرح سنگدل نہیں ہوتا۔ کچھ اپنی سنگدلی پر غور کرو۔"

"ہم کچھ اور باتیں کر رہے تھے۔"

"دیکھو، پھر ٹال رہی ہو۔ کیا آج بھی چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"میں مجبور ہوں، آپ کو بتا چکی ہوں۔ دور کے رشتے داروں کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"کیا تمھارے رشتے دار تم سے یہ نہیں پوچھتے کہ آدھی آدھی رات تک باہر تنہا کہاں رہتی ہو۔ کس کے ساتھ وقت گزارتی ہو؟"

"میں نے انھیں اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ ایک اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہوں اور ایسے شعبے میں ہوں، جہاں رات کو کام ہوتا ہے۔ بھئی آپ گھوم پھر کر میری ہی بات لے بیٹھتے ہیں۔"

"آمنہ! تم سمجھتی نہیں ہو۔ میں اتنے اہم شعبے سے تعلق رکھتا ہوں اور اتنے اہم عہدے پر ہوں کہ مجھ سے ملنے والے اور ملنے والیوں کو اچھی طرح پرکھنا ہوتا ہے۔ میں تمھارے ساتھ اتنا وقت گزار رہا ہوں تو یقیناً اینٹلی جنس والوں کی نظریں ہم پر ہوں گی۔ اگر خدانخواستہ تم کوئی غلط عورت ثابت ہوئیں تو میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا، آپ اطمینان رکھیں۔ آپ مجھے رعونت جہاں کے متعلق بتائیں۔"

"کیا بتاؤں۔ اس نے تو پریشان کر دیا ہے۔"

آمنہ لی ہاروی ٹی ٹی سینٹر یعنی سائمن دی گریٹ کی تنظیم سے تعلق رکھتی تھی اور رعونت جہاں بہرام علی ٹی ٹی سینٹر سے آئی تھی۔ دونوں کا مفاد ایک تھا اور دونوں کے گٹھ جوڑ سے ان کے آلۂ کار پاکستان میں اپنا اپنا کام دکھا رہے تھے۔ آمنہ بہت اچھی طرح رعونت جہاں کے متعلق جانتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے پوچھا "آخر یہ رعونت ہے کون؟"

"ایک حسین بلا ہے۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا "کیا مجھ سے بھی زیادہ؟"

سلطان عابدی صاحب نے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے دیکھا پھر ایک سرد آہ بھر کر بولے "وہ یقیناً حسین ہو گی، تب ہی ایک اہم شخصیت اس کے دام میں آ گئی ہے۔ یقین سے کہتا ہوں، وہ تم سے زیادہ حسین نہیں ہو گی"

"آپ کو رعونت جہاں کے سلسلے میں پریشانی کیا ہے؟"

"ایک بہت ہی اہم خبر ہے۔ ہم نے اسے اخبارات تک پہنچنے سے روک دیا ہے لیکن جانے کیسے یہ بات لیک آؤٹ ہو گئی۔ رعونت جہاں کی کوٹھی میں، اس کے ایک سیکرٹری کا قتل ہو گیا اور قتل کرنے والی رعونت جہاں کی باڈی گارڈ سرداراں ہے۔"

آمنہ نے پوچھا "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ایسے سنگین جرائم ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بھیانک قتل ہوتے ہیں۔"

"تم نہیں سمجھو گی۔ اصل بات اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ قتل کی واردات کے بعد ایک اہم شخصیت رعونت جہاں کی کوٹھی میں پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ اس قتل میں اس شخصیت کا ہاتھ نہیں ہے لیکن..."

آمنہ نے بات کاٹ کر پوچھا "اس شخصیت کا کوئی نام تو ہو گا۔"

عابدی صاحب نے پھر کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ ذرا سوچا۔ وہ نام بتانا نہیں چاہتے تھے، آمنہ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا تو انھوں نے کہا "ان کا نام عالی جناب ہے۔ عالی جناب کی اس سلسلے میں مداخلت نے ہم سب کو پریشان کر دیا ہے۔ ایک تو وہ قتل کے مقدمے کو خصوصی عدالت میں رازدارانہ طور پر بھگتانا چاہتے ہیں۔ دوسرے رعونت جہاں کو تو خیر بچانا ہی چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قاتلہ سرداراں کو بھی بے قصور ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ کی طرح ان معاملات کو بھی راز میں رکھا تھا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو یہ تمام باتیں کیسے معلوم ہو گئیں۔"

"آخر کیسے معلوم ہوئیں کچھ معلوم تو ہونا چاہیے۔"

"تم یہ پوچھ کر کیا کرو گی۔ کیا اس بلیک میلر کو پکڑ کر ہمارے سامنے لے آؤ گی؟"

وہ بڑی محبت سے بولی "میرا دل چاہتا ہے چٹکی بجا کر آپ کی پریشانی دور کر دوں۔ اس بلیک میلر کا پتا ٹھکانا معلوم ہو تو اس کے گھر جا کر اسے گولی مار دوں۔"

عابدی صاحب نے اسے مسکرا کر بڑی محبت سے دیکھا کیونکہ آمنہ کی ان باتوں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایسے میں ہر مرد یہ سوچتا ہے کہ اسے چاہنے والی اتنا چاہتی ہے کہ اس کی خاطر اس کے دشمن کو گولی بھی مارنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ چاہنے والی حسین ہو تو دل دیوانہ اور دیوانہ ہو جاتا ہے۔ عابدی صاحب نے بڑی محبت سے ہنستے ہوئے پوچھا "ان نازک ہاتھوں سے گولی چلاؤ گی؟"

"یہ صرف آپ کے لیے نازک ہیں۔ آپ کو نقصان پہنچانے والوں کے لیے آہنی شکنجہ ہیں۔ آپ کا جو دشمن آمنہ کا سامنا کرے گا، وہ پھر کبھی زندگی کا سامنا نہیں کر سکے گا۔"

عابدی صاحب نے فوراً ہی گاڑی کو سڑک کے کنارے روکتے ہوئے اسے دیکھا۔ آمنہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ حیرانی سے بولے "ابھی تم یہ بات کہہ رہی تھیں

تو تمھاری آواز اور لہجے میں فولاد کی سی سختی تھی۔ میں یہی دیکھنے کے لیے رک گیا ہوں کہ کیا تم وہی نازک سی مترنم ہنسی والی آمنہ ہو۔"
وہ ہنسنے لگی۔ اس کی مترنم ہنسی کانوں میں رس گھولنے لگی۔
پھر اس نے ڈیش بورڈ کھول کر چھوٹی سی شراب کی بوتل نکالی اور عابدی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "آپ کا نشہ کم ہو گیا ہے۔"
انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا: "نہیں میں زیادہ نہیں پیتا۔ ورنہ آؤٹ ہو جاتا ہوں۔"
"میں آؤٹ نہیں ہونے دوں گی۔ ذرا سی پی لو گے تو کچھ اور بہکنے لگو گے۔ سنا ہے کسی حسین منزل تک پہنچنے کے لیے بہکنا ضروری ہے۔"
عابدی صاحب نے بوتل کھولی۔ اسے منہ سے لگایا پھر غٹا غٹ کئی گھونٹ حلق سے اتار لیے۔ اس کے بعد بوتل واپس کرتے ہوئے کار کو دوبارہ اسٹارٹ کیا اور اپنے بنگلے کی طرف چلنے لگے۔ راستے میں آمنہ لچھے دار باتیں کرتی جا رہی تھی۔ اپنے حسن اور اپنی محبت کے سبز باغ دکھاتی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بوتل بھی بڑھا دیتی تھی۔ اس نے کلب میں بھی بہت خاص پلا دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنگلے تک پہنچتے پہنچتے سلطان عابدی بری طرح بہکنے لگے۔ اپنے پیروں پر چل کر جانے کی سکت نہیں تھی۔ انھوں نے آمنہ کا سہارا لیا۔ اسے یقین دلاتے رہے کہ وہ نشے میں نہیں ہیں بس ذرا مستی میں آ گئے ہیں۔ ہر پینے والا یہی کہتا ہے کہ نشہ نہیں ہوا، صرف مستی چھا رہی ہے اور چالاک عورت کہتی ہے جو مستی میں آتا ہے میں اس کی مستی مٹا دیتی ہوں۔
عابدی صاحب کے ایک خاص ملازم نے سہارا دینا چاہا۔ آمنہ نے کہا: "میں انھیں اندر پہنچا دوں گی۔ تم جلدی سے گرم کافی بنا کر لے آؤ تاکہ ان کا نشہ اتر جائے۔"
ملازم کچن کی طرف گیا۔ آمنہ انھیں بیڈ روم میں لے آئی۔ وہ وہاں پہنچتے ہی بستر پر گر پڑے۔ اس نے ان کے جوتے کھولے جرابیں اتاریں پھر انھیں بستر پر سیدھا کر دیا۔ اس دوران توجہ سے دیکھتی رہی کہ عابدی صاحب پوری طرح مدہوش ہو چکے ہیں یا نہیں۔ جب یقین ہو گیا تو وہ بیڈ روم سے نکل کر کچن کی طرف دیکھ [illegible]۔ ملازم کافی تیار کر رہا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس نے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ فوراً ہی [illegible] رابطہ قائم ہو گیا۔ اس نے کوڈ ورڈز میں کہا۔ "ہم نے زندہ دلان لاہور میں سے ایک زندہ دل کو ایک حسین پھول پیش کیا تھا لیکن اس پھول کے ساتھ کانٹا بھی تھا۔
اس کانٹے کو ایک مالن نے توڑ ڈالا تھا۔ کیا آپ کے لیے یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ وہ کانٹا دوسرے باغ سے آیا تھا اور ہمیں اس کی خبر تک نہ ہو سکی، وہ ہمارے پھول سے لگا رہا۔ میں آدھے گھنٹے میں یہاں سے نکلنے والی ہوں۔ فوراً گاڑی بھیج دیں۔ ڈیٹس آل۔"
اس نے ریسیور رکھ دیا۔ کوڈ ورڈز کا مطلب یہ تھا کہ لاہور کے زندہ دل کو یعنی ایک اہم شخصیت کو ایک پھول پیش کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ رعونت جہاں تھی۔ پھول کے ساتھ ایک کانٹا تھا جسے مالن نے توڑ دیا۔ مالن سرداراں تھی اور جو کانٹا توڑ دیا گیا وہ سیکرٹری تھا۔ وہ کانٹا دوسرے باغ سے آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رعونت جہاں کا سیکرٹری دوسری تنظیم سے تعلق رکھتا تھا اور ایک عرصے سے اس تنظیم میں وفاداری کا ثبوت دیتا رہا تھا۔ اس پر کسی نے شبہ نہیں کیا تھا۔
میں آمنہ کے دماغ سے کوڈ ورڈز کا مطلب معلوم کرتا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں پوچھا: "یہ کیسے معلوم ہوا کہ رعونت جہاں کا سیکرٹری کسی مخالف تنظیم سے تعلق رکھتا تھا؟"
آمنہ کی سوچ نے بتایا: "جب وہ سلطان عابدی کے جوتے اور جرابیں اتار رہی تھی، اس وقت عابدی صاحب نے سیکرٹری کا نام بڑبڑایا تھا۔ بڑبڑاہٹ کے دوران کہا تھا کہ اس سیکرٹری کا بھائی بلیک میل کر رہا ہے۔
وہ ٹیلیفون کے پاس سے اٹھ کر بیڈ روم میں آئی۔ عابدی صاحب پھر بڑبڑا رہے تھے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچی۔ کان لگا کر سننے لگی۔ وہ کہہ رہے تھے: "وہ ہمیں بلیک میل کرتا ہے۔ کہتا ہے، رعونت جہاں کو عالی جناب سے دور کر دیا جائے۔"
وہ اتنے دھیمے انداز میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بڑبڑا رہے تھے کہ زبان سے الفاظ بڑی مشکل سے ادا ہو رہے تھے پھر بھی آمنہ نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ اسی وقت ملازم کی آواز آئی: "مادام! کافی۔"
وہ فوراً ہی دروازے کے پاس آئی۔ ملازم سے کافی کی ٹرے لی پھر کہا: "تم کوارٹر میں جا کر آرام کرو۔ ضرورت ہوگی تو بلا لیا جائے گا۔"
وہ چلا گیا۔ آمنہ نے ٹرے کو تپائی پر رکھا پھر دبے قدموں چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی۔ ملازم بیرونی دروازے سے باہر جا رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا، نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اب باہر سے کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے بیڈ روم میں آئی۔ اس نے [illegible]

[illegible] صاحب کو آواز دی: "اٹھیے، ذرا کافی پی لیجیے۔ نشہ اتر [illegible]" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس نے انھیں ہولے [illegible] جھنجھوڑا لیکن وہ ہوں ہاں کہہ کر پھر بے سُدھ پڑے رہے۔ [illegible] آنکھیں بند تھیں اور سانس گہری گہری چل رہی تھی۔ وہ مطمئن [illegible] ان کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ ایک جیب سے چابیاں برآمد [illegible] ہیں۔ وہ انھیں لے کر دوسرے کمرے میں گئی۔ وہ کمرہ [illegible] عابدی صاحب کا اسٹڈی روم تھا۔ وہ اپنے ضروری کاغذات [illegible] یہاں رکھتے تھے۔ اس نے وہاں کی الماریاں کھولنے کے لیے [illegible] مختلف چابیاں آزمائیں اور کامیاب ہوتی رہی۔ کسی الماری میں [illegible] فائلیں بھری ہوئی تھیں، کسی میں ان کے ذاتی قسم کے کاغذات [illegible] اور بے شمار ڈائریاں تھیں۔ جنھیں نہ جانے کتنے برسوں سے [illegible] لکھتے چلے آ رہے تھے۔
وہ ہر فائل کو کھول کر اس پر سرسری نظر ڈالتی رہی۔ چند [illegible] فائلوں کے ذریعے چند اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ جن کاغذات [illegible] کو اس نے ضروری سمجھا، انھیں فائل سے نکال کر اپنے پاس [illegible] رکھ لیا لیکن ایک الماری میں ان کے ذاتی کاغذات میں ایسے [illegible] خطوط رکھے ہوئے تھے جن سے ان کی ہوس پرستی کا کھلم کھلا [illegible] اظہار ہوتا تھا، وہ خطوط اس بات کے ثبوت تھے۔ ایک خط [illegible] تو ایک بہت ہی معزز خاتون نے ان کے بارے میں بہت کچھ [illegible] لکھا تھا۔ اگر یہ راز فاش ہو جاتا تو دونوں کا کیریئر تباہ ہو جاتا اور [illegible] بڑے پیمانے پر اسکینڈل بنا کر ان کو بدنام کیا جاتا۔
اس نے وہ خط بھی اپنے پاس رکھ لیا۔ باقی تمام کاغذات [illegible] فائلوں کو ان کی جگہ رکھا، الماریاں پہلے کی طرح بند کیں پھر [illegible] آ کر وہ چابیاں عابدی صاحب کی جیب میں رکھ دیں۔ [illegible] کے سرہانے ایک بٹن لگا ہوا تھا جسے دبانے سے [illegible] سرونٹ کوارٹر میں گھنٹی بجتی تھی۔ اس نے وہ بٹن دبایا پھر باہر [illegible]۔ ملازم نے پوچھا: "جی فرمائیے۔"
"تمھارے صاحب گہری نیند میں ہیں۔ انھوں نے کافی [illegible] نہیں پی۔ تم رات کو کوٹھی میں رہو گے۔ شاید کسی وقت بھی [illegible] کی آنکھ کھل جائے۔ میں جا رہی ہوں۔ ان سے کہنا، کل [illegible] ملاقات کروں گی۔"
اس بنگلے کے باہر ذرا فاصلے پر ہی ایک جانی پہچانی گاڑی [illegible] رکی ہوئی تھی۔ وہ اس میں جا کر بیٹھ گئی۔ ملازم اس گاڑی کو [illegible] جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی [illegible] تو وہ تیزی سے پلٹ کر اندر گیا۔ بیڈ روم میں پہنچتے ہی اس [illegible] نے کہا: "صاحب! وہ صاحبہ جا چکی ہیں۔"
عابدی صاحب نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر پوچھا: "کیا آج بھی اس کے لیے گاڑی آئی تھی؟"
"جی ہاں، اسی جگہ دور کھڑی ہوئی تھی۔"
عابدی صاحب اٹھ کر ٹیلیفون کے پاس گئے۔ نمبر ڈائل کیے۔ پھر جماہی لیتے ہوئے کہا: "ہیلو، کیا مزید معلومات حاصل ہوئیں؟"
جواباً کہا گیا: "ہاں، آپ کے اسی ٹیلیفون پر اس نے کسی سے رابطہ قائم کیا تھا اور کوڈ ورڈز میں گفتگو کی تھی۔ تمام باتیں ریکارڈ کر لی گئی ہیں جس سے باتیں کی گئی تھیں، وہ بہت ہی چالاک ہے۔ صرف ہوں، ہاں کرتا رہا اور آمنہ کی باتیں سنتا رہا۔ جس نمبر پر آمنہ نے رابطہ قائم کیا تھا، اس نمبر کے فون کا اور اس فون کے مالک کا سراغ نہیں مل رہا ہے۔ ہم نے مجبور ہو کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا ہے کہ آمنہ کا تعاقب کرتے رہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"
عابدی صاحب نے کہا: "میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ آمنہ کو ڈھیل دی جائے۔ اسے احساس نہ ہونے دیا جائے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اگر ذرا بھی شبہ ہوگا تو وہ کہیں گم ہو سکتی ہے پھر اس کا بھی سراغ لگانا مشکل ہو جائے گا۔"
"ہم اسے گم نہیں ہونے دیں گے۔ آپ نے بہت اچھا رول ادا کیا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"
"شکریہ بعد میں ادا کر لینا۔ مجھے یقین ہے، آمنہ وہ فرضی عشقیہ خط ضرور لے گئی ہوگی جس کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کی ایک معزز خاتون سے میرے مراسم رہے ہیں۔ وہ ضرور اس خط کو لے گئی ہوگی۔ اس کے ذریعے بہت بڑا اسکینڈل بن سکتا ہے۔ میں مفت میں بدنام ہو جاؤں گا۔"
"عابدی صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔ آپ پر ایک ذرا آنچ نہیں آئے گی۔ وہ جو خط لکھا گیا ہے، اس نام کی کوئی خاتون اول تو ہمارے علم میں نہیں ہے اگر ہوگی بھی تو وہ اتنی معزز اور کوئی اعلیٰ عہدے دار نہیں ہوگی کہ اس کا کیریئر تباہ ہو اور اس کے ذریعے آپ بدنام ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔"
انھوں نے ر[illegible] کو [illegible] سے اپنے بیڈ روم میں آئے، وہاں تپائی پر کافی [illegible] ہوئی تھی۔ انھوں نے ملازم کو اشارے سے کہا کہ ٹرے لے جائے۔
جب وہ چلا گیا تو انھوں نے جیب سے چابی نکالی۔ ایک خوبصورت سے اسٹینڈ پر ایک کیبنٹ رکھا ہوا تھا۔ اسے کھولتے ہی ایک چھوٹا سا بار برآمد ہوا۔ اس میں سے ایک بوتل کا انتخاب کرنے کے بعد انھوں نے اپنے لیے ایک پیگ بنایا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی پینے کے بعد انھیں نشہ کیوں

نہیں ہوا تھا؟

آمنہ جیسی چالباز عورت کو دھوکا دینا آسان نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات بڑے سے بڑے چالباز بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ جس بوتل سے انھیں پلا رہی تھی' اس میں یقیناً شراب تھی لیکن پانی ملا ہوا تھا۔ بوتل کا رنگ نیلا تھا' اس لیے شراب کا اصلی رنگ باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ صرف مہک سے پتا چلتا تھا کہ وہ شراب ہے۔

انھوں نے جام کو فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا "آمنہ' میں شراب میں پانی ملا کر نہیں پیتا۔ چیئرز۔"

اور وہ پینے لگے۔ میں ان کے دماغ سے واپس آنا چاہتا تھا' اسی وقت فون کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ ڈرائنگ روم میں آئے' ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو سلطان عابدی دِس اینڈ۔"

"میں رشید احمد بول رہا ہوں۔"

وہ انٹیلی جنس کے ڈی جی تھے۔ انھوں نے کہا "عابدی صاحب! آپ نے ہم لوگوں سے خوب تعاون کیا ہے لیکن میرے اور آپ کے درمیان جو بات طے ہوئی ہے' وہ ابھی پولیس والوں کو بھی نہ معلوم ہو۔"

"آپ اطمینان رکھیں۔ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق بڑبڑاتے ہوئے آمنہ کو یہی تاثر دیا ہے کہ رعونت جہاں کا سیکرٹری ہمارے لیے عذاب جان بنا ہوا ہے اور اس کا کوئی آدمی ہمیں بلیک میل کر رہا ہے لیکن آپ کی یہ چال میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ آپ نے سچ سچ باتیں آمنہ تک کیوں پہنچائیں؟"

"آپ پورے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں کئی خطرناک تنظیمیں ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی ہیں اور ہمارے خلاف سازشیں بھی کر رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں' یہ تنظیمیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔ ان کے آپس کے ٹکراؤ سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ ان کے آلۂ کار ہماری نظروں میں آتے رہیں گے۔"

مجھے انٹیلی جنس کے ذہین اور محبِ وطن ڈی جی رشید احمد صاحب کی یہ تدبیر بہت پسند آئی۔ میں خود اسی طریقۂ کار پر عمل کر رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد دو تنظیموں کے اہم افراد کو ٹکرانے والا تھا۔ میں نے سوچا، آئندہ موقع ملا تو رشید احمد صاحب کے دماغ میں جھانک کر ان کے دل کی گہرائیوں تک ان کے متعلق معلوم کروں گا اور موقع ملتا رہا تو ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس طرح ان سے تعاون کروں گا کہ انھیں کبھی ٹیلی پیتھی کا علم نہیں ہوگا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بس تیز رفتاری سے سپر ہائی وے پر دوڑتی جا رہی تھی۔ میرے پاس بیٹھی ہوئی حور بانو کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے [...] کے درمیان کبھی نیند نہیں آتی۔ دھڑکا سا لگا رہتا ہے لیکن [...] اجنبی تھا جس پر وہ ہزار شناساؤں کو قربان کر سکتی تھی۔ اس [...] میری محبت اوڑھ لی تھی۔ اب اسے دشمنوں کا ڈر نہیں رہا تھا [...] لیے گہری نیند میں تھی۔

اگلی سیٹ پر ریحانہ بھی سو گئی تھی۔ کرم داد کی آنکھیں [...] تھیں لیکن وہ بہت ہی محتاط رہنے والا آدمی تھا۔ سوتے سوتے [...] جاگتا رہتا تھا۔ بہرحال اس وقت آنکھیں بند کیے جاگ رہا [...] سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اپنوں کو چھوڑ کر زرینہ کے دماغ [...] پہنچ گیا۔

وہ زرینہ' جسے بڑا ناز تھا کہ اسے ایک نظر دیکھنے [...] اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اسے دولت سے' طاقت [...] ذہانت سے' مکاریوں سے' ہر ہتھکنڈے سے حاصل کرنا چا[...] اور وہ اپنے چاہنے والوں کو ٹھینگا دکھاتی رہتی ہے۔ اس مغرو[...] کو زندگی میں پہلی بار میں نے ٹھینگا دکھایا تھا۔ وہ مائخل شو[...] اس کے آلہ کاروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے قریب تر ہونا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک [...] کہ وہ اپنی توہین کے احساس سے تلملانے لگی تھی لیکن تنظیم کی خاطر مجھے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اس وقت وہ کر[...] اور کبیر داس کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی مائخل شوف کی کو[...] طرف جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی "کریزی! میں پہلے ہی [...] بابر مکار ہے ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ اگر تم پہلے سے جانتی تھیں تو نہیں بتایا؟"

"میں کیا بتاتی۔ اس نے اپنی پارسائی کا ایسا ناٹک [...] کر میری بھی توہین کر ڈالی اور۔۔۔ میں تلملاتی رہتی تھی۔ کیونکہ تھا اسے عورتوں سے نفرت ہے۔ وہ آمنہ سے بھی دو[...] ہے۔ گلزاری بیگم سے بھی دور بھاگ کر اسپتال سے چلا آیا [...] مجھ سے بھی اس نے بیزاری ظاہر کی۔"

کریزی نے کہا "تم عورتیں یوں تو ہر معاملے میں [...] ہوتی ہو لیکن جہاں تمھاری انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہاں [...] بن جاتی ہو۔ اگر تم ذرا عقل سے کام لیتیں" اسے ٹریپ [...] کی کوشش کرتیں تو یہ کوئی مشکل کام نہ ہوتا۔ بہ حال وق[...] چکا ہے۔ اب ہم بابر کو مائخل شوف کے ہاں ضرور گھ[...]"

"کیا وہ اتنا نادان ہوگا کہ مائخل شوف کے ہا[...] لے گا؟"

"اگر وہ نہیں ہوگا تو مائخل شوف اور اس [...] ہلاہلہ پہ پھ کم اہم تو نہیں ہیں۔"

اس بار کبیر داس کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ شہر کے تمام راستوں کو جانتا تھا اور مائخل شوف کی کوٹھی کا پتا بھی اسے معلوم تھا۔ اس نے اس کوٹھی سے ذرا فاصلے پر کار روک دی۔ وہ سب باہر آ گئے۔ کبیر داس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ تیسری کوٹھی ان کا اڈہ ہے۔"

کریزی نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "پچھلے حصے کی طرف لے چلو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ دوبارہ اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال کر اسے اسٹارٹ کیا۔ زرینہ کریزی کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے پوچھا "کیا میں بھی تمھارے ساتھ کوٹھی میں چلوں گی؟"

کریزی نے کہا "کوئی تفریحی پروگرام ہوتا تو ساتھ لے جاتا۔ وہاں زندگی اور موت کا پروگرام ہے۔"

کار اس کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف پہنچ گئی۔ کریزی نے اترتے ہوئے کہا "تم دونوں کسی اسنیک بار میں وقت گزار سکتے ہو۔ پینتالیس منٹ بعد یہاں پہنچ جانا۔"

کبیر داس زرینہ کو لے کر چلا گیا۔ اب میں کریزی کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ کس طرح کوٹھی میں داخل ہونے والا ہے؟ آمنہ کو سلطان عابدی کے مکان سے روانہ ہوتے تقریباً ایک گھنٹا ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً وہاں پہنچ گئی ہوگی۔ میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا۔ وہ مائخل شوف کی کوٹھی کے ڈائننگ روم میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ میز کے دوسری طرف مائخل شوف بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں سائمن دی گریٹ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک شخص وہاب لاکھن بھی تھا۔ باقی مائخل شوف کے بہرام علی سینٹر والے تھے جن میں سے ایک کا نام بارود خان اور دوسرے کا نور محمد گامے تھا۔ وہ سب رات کا کھانا کھا چکے تھے۔ آمنہ کو اب کھانے کا موقع ملا تھا، وہ کھا رہی تھی اور مائخل شوف کو اپنی کارکردگی کے متعلق رپورٹ سناتی جا رہی تھی۔

اچانک وہ خاموش ہو گئی۔ ہاتھ اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ دروازے کی چوکھٹ کے اوپر ایک سرخ بلب جل بجھ رہا تھا۔ مائخل شوف نے آہستگی سے کہا "کوٹھی کے پچھلے حصے میں کوئی ہے۔"

بارود خان نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا "تم لوگ اِدھر بیٹھ کے رہو۔ ہم باہر جا کے دیکھے گا۔ کوئی خنزیر کا بچہ یا بچی ہوگا۔"

مائخل شوف نے کہا "نہیں، تم ٹھہرو۔" اس نے نور محمد گامے سے کہا "تم بلندی سے چھلانگ لگا سکتے ہو۔ لہٰذا پہلے چھت پر جاؤ اور دیکھو' کوٹھی کے پچھلے حصے سے آنے والا ایک ہے یا ایک سے زیادہ ہیں۔"

نور محمد گامے فوراً ہی اٹھ کر چلا گیا۔ مائخل شوف نے وہاب لاکھن کو مخاطب کیا "لاکھن! تم بھی جاؤ اور پچھلے تینوں دروازوں کے کرنٹ کا سوئچ آن کر دو۔"

"بہتر ہے سر!"

وہاب لاکھن بھی چلا گیا۔ آمنہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی۔ مائخل شوف نے کہا "بارود خان! ہمارے ساتھ آؤ۔"

وہ تینوں وہاں سے چلتے ہوئے مائخل شوف کے بیڈ روم میں پہنچے۔ وہ الماری کھول کر ضروری کاغذات' اہم تصاویر کے لفافے اور مائیکرو فلم کے کیپسول وغیرہ نکال کر اٹیچی میں رکھنے لگا ساتھ ہی کہنے لگا "بارود خان! کوٹھی کے اگلے حصے کی طرف سے کوئی خطرے کا سگنل نہیں ہے تم فوراً جاؤ اور ہماری گاڑی گیراج سے نکال لو۔ زیادہ خطرہ ہوگا تو یہ اہم چیزیں لے کر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

بارود خان نے مائخل شوف سے کہا "اوئے لال بابا، تم ہم کو بھاگنے والا آدمی سمجھتی ہے۔ اُدھر گامے اور لاکھن کو مقابلہ کرنے بھیجتی ہے' ہم کو بزدل سمجھتی ہے۔ ہم بولتی ہے۔۔۔"

آمنہ نے اسے ٹوک دیا "بولتا ہے۔"

"ہم غصے میں بولتی ہے' ہزار بار بولتی ہے۔ جدھر خطرہ نہیں ہے' اُدھر عورت کو جانے دو، جدھر خطرہ ہے اِدھر یہ مرد کا بچہ جائے گی۔"

آمنہ نے مسکرا کر پوچھا "بارود خان! تم شطرنج کا کھیل جانتے ہو' نا؟"

"بیشک جانتی ہے۔"

"تم یہ بھی جانتے ہو' شطرنج کی بساط پر سب سے پہلے پیادے ہوتے ہیں پھر دوسرے مہرے رکھے جاتے ہیں یعنی جو مضبوط مہرے ہوتے ہیں وہ پیچھے ہوتے ہیں' بادشاہ کی حفاظت کرنے کے لیے۔ لہٰذا تم مائخل شوف کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط قلعے کی طرح ہو۔ جو بھی دشمن آ رہا ہے اگر گامے اور لاکھن کو شکست دے کر آئے گا تو تم سے ضرور شکست کھائے گا۔"

وہ خوش ہو گیا۔ میں انھیں چھوڑ کر نور محمد گامے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کوٹھی کے پچھلی طرف چھت کے ایک سرے پر لیٹا ہوا نیچے دیکھ رہا تھا۔ پچھلے حصے میں ایک بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں ایک سیاہ پوش نظر آ رہا تھا۔ گامے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چھت کے سرے پر پہنچ کر اس نے ایک اندازہ لگایا پھر اچانک ہی سیاہ پوش کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس نے یہ چھلانگ تقریباً پچیس فٹ کی بلندی سے لگائی تھی اور صحیح سلامت زمین پر پہنچا تھا۔ کم کریزی

نے پلٹ کر دیکھا، اسی وقت اس کے منہ پر ٹھوکر پڑی۔ پھر تو گامے نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ کریزی تھوڑی دیر تک مار کھاتا رہا، پیچھے ہٹتا رہا۔ پھر اس نے جوابی حملے کیے تو گامے کے ہوش اڑنے لگے۔ اس نے بھی کریزی پر کئی داؤ آزمائے۔ کبھی کامیاب ہوا، کبھی ناکام ہوا۔ اتنا سمجھ میں آگیا کہ مقابل لڑنے کے فن سے صرف واقف ہی نہیں ہے بلکہ استاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ لڑنے کے دوران ایک ایسی سچویشن آئی کہ کریزی کی گردن گامے کے ہاتھوں میں آگئی۔ اس نے پوری طاقت سے دبوچ لی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ مخالف کی گردن ہاتھ میں آجائے تو پھر وہ زندہ سلامت نہیں نکل سکتا۔ وہ تقریباً ایک منٹ تک اسے دبائے رہا۔ بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا مقابل کون ہے۔ اس نے سوچا، ایک منٹ بہت ہوتا ہے پھر بھی احتیاطاً ایک منٹ تک اور گردن دبائے رکھنا چاہیے۔

اس نے احتیاطاً یہ بھی کر لیا بلکہ تین منٹ پورے ہونے لگے تب اس نے دیکھا کریزی کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ہیں اب اس کی جدوجہد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گامے نے اپنی زندگی میں اتنی دیر تک کسی کو سانس روکتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر کریزی کی صلاحیتوں پر اسے یقین کیسے آتا۔ اس کے باوجود جب اس نے چھوڑا تو اس وقت تین منٹ بھی گزر چکے تھے۔ کریزی کا بے جان جسم گھاس پر گر رہا تھا۔ لاش گرتی ہو تو گرتے گرتے کبھی نہیں اٹھتی۔ اس میں زندگی نہیں ہوتی، وہ اٹھے گی کیسے؟ لیکن گامے نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ لاش اس سے پہلے کہ زمین تک پہنچتی، قلابازی کھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ نور محمد گامے سنبھلتا، اچانک ہی اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ ایک خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔

اس نے آخری تمام قوتوں کو سمیٹ کر چیختے ہوئے کہا۔ "یہاں صرف ایک دشمن ہے، گھبرانے کی بات نہیں ہے، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ کریزی نے پھر چاقو سے حملہ کیا۔ گامے نے اسے ایک ہاتھ سے روک لیا۔ حالانکہ ہاتھ زخمی ہوا لیکن وہ مقابلہ نہ کر سکا، لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ ایسے وقت میں کریزی نے پھر چاقو سے بھرپور حملہ کیا۔ یہ آخری حملہ تھا۔ اس کے بعد گامے زمین سے نہ اٹھ سکا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ میں اس کے دماغ میں تھا لیکن اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ کریزی کو دماغی طور پر ٹریپ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت اس کے کام آئی تھی۔ وہ اس طرح سانس روک کر دشمنوں کو دھوکا دیتا تھا کہ فتح اس کے نصیب میں لکھی جاتی تھی۔ جب گامے اس کی گردن دبوچ رہا تھا، تب میں نے ہی تین منٹ کے بعد اسے چھوڑنے پر غیر شعوری طور پر مجبور کر دیا تھا تاکہ گامے اسے چھوڑنے کے بعد دوسرے داؤ آزمائے اور اسے زیر کر لے لیکن اس مقابلے سے پتا چلا کہ نور محمد گامے میں سب سے بڑی خوبی صرف یہ تھی کہ وہ ۔۔ بلندیوں سے چھلانگیں لگاتا تھا۔ دشمنوں سے لڑنا جانتا تھا مگر لڑنے میں اتنی زیادہ مہارت نہیں تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ زمین پر پڑا ہوا ۔۔۔ دم توڑ رہا تھا۔ اس کے ذریعے میں نے دیکھا۔ کم کریزی ایک دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر دائیں بائیں محتاط نظروں سے دور تک دیکھا پھر دروازے کو ہاتھ لگایا۔ اسی وقت حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ دروازے میں روشنیوں کا جھماکا سا ہوا۔ اسے بجلی کا جھٹکا اتنا شدید پہنچا تھا کہ وہ زمین سے کئی فٹ اچھل کر پھر گر پڑا تھا۔ دروازے پر جلتے ہوئے بلب بجھ گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کرنٹ کے سوئچ کو آف کر دیا گیا تھا۔

پھر دروازہ کھل گیا۔ وہاں لاکھن نے دروازے پر سے ہی دور گامے کی پڑی ہوئی لاش کو دیکھا پھر باہر آ کر کریزی کے ساکت جسم کو ٹھوکر ماری۔ وہ ٹھوکر کھانے کے بعد بھی بے حرکت پڑا رہا۔ اتنا شدید جھٹکا پہنچا تھا کہ اس کے اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لاکھن نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا پھر اسے کھینچتا ہوا اندر لے آیا۔ آمنہ، مائخل شوف اور بارود خان دوسرے کمرے سے اُدھر چلے آئے۔ مائخل شوف نے پوچھا "کیا ہوا؟ یہ مر چکا ہے؟"

"بجلی کا شدید جھٹکا لگا ہے۔ اس کا تو باپ بھی نہیں بچ سکتا تھا۔"

آمنہ نے کہا۔ "یہ بُرا ہوا، اسے زندہ رہنا چاہیے تھا۔"

اسی وقت کریزی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آمنہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تمھاری خواہش پوری کر رہا ہوں۔ تمھارا آدمی ہماری حور بانو کو پکڑ کر لے گیا ہے۔ لہٰذا میں تمھیں لے جانے آیا ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا ذرا دُور گیا پھر اچانک ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کھڑے ہو کر کیا کرے گا۔ یکبارگی چاقو کا چمکتا ہوا پھل آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، چاقو فضا میں پرواز کرتا آیا اور لاکھن کے سینے میں پیوست ہو گیا

صرف اتنا ہی نہیں، اس نے فضا میں فلائنگ کک کے لیے چھلانگ لگائی۔ جب لاکھن کے پاس پہنچا تو اس نے

وہیں لات ماری جہاں چاقو پیوست تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور گہرائی تک پیوست ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ فلائنگ کک مارنے کے بعد جیسے ہی وہ زمین پر پہنچا، اس کے منہ پر ایک زبردست گھونسا پڑا اور وہ بارود خان کا گھونسا تھا۔

وہ دوسرا گھونسا مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ کریزی نے پیچھے ہٹتے ہوئے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "ٹھہرو، ذرا آرام سے مارو۔"

"خنزیر کا اولاد بولتی ہے آرام سے مارو۔ ماں بھی اولاد کو آرام سے نہیں مارتی ہے۔"

کریزی نے کہا۔ "بھئی! آرام کا مطلب یہ ہے کہ دو باتیں میں تمھاری اس بلبل سے کروں گا اور ایک گھونسا تم سے کھاؤں گا مگر نہیں، پہلے تمھارے اس مینڈک کو چیلنج کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں، تو مائخل شوف! تم نے مجھے پہچان لیا ہو گا اور اگر نہیں تو آج کے بعد ہمیشہ یاد رکھو گے۔ تمھاری یہ اٹیچی میں لے جاؤں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی منہ پر ایک گھونسا پڑا۔ بارود خان نے کہا۔ "اپنا شرط کو مت بھولو، دو بات بولے گی، ایک گھونسا کھائے گی۔"

کم کریزی نے اپنے جبڑے کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے" پھر اس نے آمنہ سے پوچھا۔ "بابر اور حوُر بانو کو کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"میں نہیں جانتی، بابر کہاں ہے اور یہ حور بانو کون ہے؟"

"میں تمھیں اپنے ساتھ لے جا کر بتاؤں گا۔"

اس کے ساتھ ہی بارود خان نے آگے بڑھ کر پھر گھونسا مارنا چاہا مگر اس بار گھونسا اسی کے منہ پر پڑا۔ پھر تو کریزی نے تابڑ توڑ کئی گھونسے مارے۔ کراٹے کے ہاتھ جمائے۔ بارود خان پیچھے ہٹتا ہوا دیوار سے جا کر لگ گیا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "اے! پہلے تم آرام سے مار کھاتی تھی۔ اب اپنا وعدہ توڑتی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے آگے بڑھ کر حملہ کیا۔ اس سے پہلے ہی آمنہ نے ایک فلائنگ کک ماری۔ لات کریزی کے سینے پر پڑی۔ ذرا لڑکھڑایا، ایک قدم پیچھے گیا پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ آمنہ نے پینترا بدل کر کراٹے کے ہاتھ رسید کیے۔ اس نے ایک دو ہاتھوں کو برداشت کیا پھر اچانک ہی آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا اور ایک جھٹکے سے اسے دوسری طرف گھما دیا۔ اسی وقت بارود خان نے اس پر حملہ کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھونسا آمنہ کے منہ پر پڑا۔ وہ بوکھلا کر اپنے آپ سے بولا۔ "اوئے بارود خان! یہ تم کیا کرتی ہے، ایک عورت کو مارتی ہے، یہ تو بے غیرتی ہے۔ اوئے بلبل! ہم عورت سے معافی کبھی نہیں مانگتی۔ اس لیے تم ایک گھونسے کے بدلے ہم کو بھی گھونسا مارو۔"

کریزی کا گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے چلا گیا۔ مائخل شوف نے آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ان کے بیچ میں نہ جاؤ، موقع دیکھتی رہو۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

کریزی نے کہا۔ "میں تمھاری یہ حسرت پوری نہیں ہونے دوں گا۔"

اسی وقت بارود خان نے اس پر پھر حملہ کیا۔ بڑے زبردست حملے کرتا گیا۔ پھر جواباً کریزی نے بھی حملے کیے۔ وہ اس کے حملوں کی تاب نہ لا کر لڑکھڑاتا ہوا پھر ایک بار دیوار سے جا لگا۔ اس نے سر کو جھٹک کر آنکھیں پھاڑ کر کریزی کو دیکھا پھر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اوئے ذرا ٹھہرو، ہمارا پیٹرول ختم ہو گئی ہے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نسوار کی ڈبیہ نکال لی۔ کریزی محتاط انداز میں پینترے بدلنے لگا۔ وہ سمجھ رہا تھا، ڈبیہ کوئی خطرناک چیز ہے۔ شاید بارود خان اس سے کوئی دھماکا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ تو اسے کھول کر اس میں سے کچھ نکال رہا تھا اور ایک چٹکی اپنی ایک داڑھ میں دبا رہا تھا۔ پھر اس نے ڈبیہ بند کر کے واپس جیب میں رکھ لی۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر اس کے مقابل آ کر پینترے بدلنے لگا۔ نسوار استعمال کرنے کا دستور یہ ہے کہ اسے ایک طرف داڑھ میں دبایا جاتا ہے پھر چند سیکنڈ کے بعد تھوکا جاتا ہے۔ اس نے یکبارگی کریزی کے منہ پر تھوک دیا۔ وہ ذرا سا بوکھلایا۔ اسی وقت ایک گھونسا ناک پر پڑا، پھر منہ پر۔ پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے بارود خان نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا جا کر ایک طرف دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ بارود خان نے اس کے ہاتھ کو اسی طرح تھامے رکھا تھا۔ اس نے پھر اسے جھٹکا دیا۔ کریزی کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی گھونسا منہ پر پڑتا تھا، کبھی پیٹ پر، کبھی لات منہ پر پڑتی تھی، کبھی وہ اپنے سر سے اس کے سر پر اتنی زور کی ٹکر مارتا تھا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگتے تھے۔ یقیناً کریزی سوچ رہا ہو گا کہ آخر اس ڈبیہ میں کیا ہے، جسے منہ میں رکھتے ہی وہ سُپرمین بن گیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں رہا کہ کریزی ادھ مُوا ہو چکا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر جیسے ہی زمین پر گرا، بارود خان نے اس کی گردن کو اپنی دونوں رانوں کے درمیان دبوچ لیا۔ مائخل شوف نے کہا۔

"بارود خان! دیر نہ کرو، اس کا کام تمام کردو۔"

"یہ تو تمام ہوگئی۔ اب ہم آرام سے اس کی گردن دبائے گی اور تھوڑا نسوار کھلائے گی۔"

اس نے جیب سے نسوار کی ڈبیہ کو نکال کر کھولا۔ پھر ایک چٹکی نسوار لے کر کریزی کے ناک کے ایک نتھنے میں... ڈال دی۔ پھر دوسری چٹکی لے کر دوسرے نتھنے میں ڈالی۔ اس طرح اس کے دونوں نتھنوں میں نسوار اچھی طرح بھر دی۔ اگر وہ سانس لیتا تو چھینکوں کے مارے اس کی حالت غیر ہوجاتی۔

آمنہ اور مائخل شوف اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب اس نے چھینک نہیں ماری تو انھیں یقین ہوگیا کہ اس کی سانس جاچکی ہے، وہ مرچکا ہے۔ میں نے آمنہ کی سوچ میں کہا "ضروری نہیں ہے کہ مرچکا ہو۔ یہ یوگا کا ماہر بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے سانس روک لی ہو۔"

آمنہ نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ نبض ٹٹول کر دیکھی۔ پھر سینے کی دھڑکن کا بھی معائنہ کیا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ کبھی شبہ ہوتا تھا کہ دھڑکن برائے نام ہے اور کبھی وہ برائے نام سی دھڑکن بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ آخر آمنہ نے اپنے بالوں سے ایک پن نکالی اور اس کے بازو میں چبھو دی۔

یوگا کا فن مشرق سے چلا ہے۔ ہندوستان کی دھارمک تاریخ کے مطابق جتنے رشی منی، گیان دھیان میں مصروف رہتے تھے، وہ اپنی تپسیا کے دوران سانس روک لیتے تھے۔ ان حالات میں نہ انھیں سردی لگتی تھی نہ گرمی، نہ برسات ان پر اثر انداز ہوتی تھی۔ گیان دھیان میں مصروف رہنے والے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو اپنے تمام بدن میں سوئیاں چبھو لیتے تھے اور سانس روکے کئی کئی گھنٹے بیٹھے رہتے تھے۔ جب سانس روکنے میں مہارت حاصل ہوجاتی ہے اور اندر کا جسمانی نظام اپنے کنٹرول میں آجاتا ہے تو باہر سے ہونے والے حملے، باہر سے چبھوئی جانے والی سوئیاں بے اثر ہوجاتی ہے۔ آمنہ نے جو سوئی چبھوئی تو اس کا کریزی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح لاش کی مانند پڑا رہا۔

مائخل شوف نے کہا "وقت برباد نہ کرو۔ تین لاشوں کو چھپانے کا مسئلہ ہے۔ بارود خان! فوراً پچھلے حصے کا بلب بجھادو۔ تاریکی میں اتنا بڑا گڑھا کھودو کہ تینوں لاشیں اس میں چھپائی جاسکیں۔"

آمنہ نے کہا "یہ تو مرچکا ہے لیکن اس کے پیچھے اس کے ساتھی ضرور آئیں گے۔ تعجب ہے انھیں ہمارا ٹھکانہ کیسے معلوم ہوگیا؟"

مائخل شوف نے کہا "اور کیسے معلوم ہوگا۔ تم ہی اپنے پیچھے لگا کر لائی ہو۔"

"آپ فضول باتیں نہ کریں۔ میں ایسی اناڑی نہیں ہوں۔ جب سلطان عابدی کے مکان سے نکلی تو مجھے شبہ ہوا تھا۔ میں نے تعاقب کرنے والوں کی پہلے تصدیق کی۔ اس کے بعد ایسا چکر دیا کہ وہ اب تک چکرا رہے ہوں گے۔"

"بہرحال تمھاری یہ بات درست ہے کہ اس شخص کے دوسرے دشمن آتے ہی رہیں گے۔ ہم اپنی چیزیں یہاں چھپا کر نہیں رکھ سکتے۔ لہٰذا انھیں دوسری محفوظ جگہ پہنچا دیا جائے۔"

آمنہ نے پوچھا "بارود خان! کیا تم ان تینوں کو ٹھکانے لگادوگے یا ہماری مدد کی ضرورت ہے۔"

اس نے نسوار کی ڈبیہ کو جیب میں رکھ کر وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا "تم جاؤ، ہمارا فکر مت کرو۔ ہم اپنا کام کرلے گا۔"

مائخل شوف نے اٹیچی اٹھالی۔ آمنہ اس کے ساتھ باہر آئی۔ اسی وقت آواز سنائی دی "آنک چھی۔"

چھینک کی آواز کے ساتھ بارود خان بڑبڑا رہا تھا "اوئے مُردہ ہوکر بھی چھینکتی ہے۔"

آمنہ نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، کریزی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن بارود خان نے اسے ایک ٹھوکر ماری تھی۔ وہ چھینکتا ہوا پھر الٹ گیا تھا۔ اس بار اس نے پھرتی دکھائی اور اچھل کر کھڑا ہوگیا تھا لیکن مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اتنی دیر سانس روکنے کے بعد جب اس نے اچانک سانس لی تو نسوار کے باعث چھینکیں آنے لگی تھیں۔ وہ نسوار کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا مگر ضرور سوچ رہا تھا کہ بارود خان کی اس چھوٹی سی ڈبیا میں یقیناً ایسا بارود ہوتا ہے جو یوگا کے ماہر کو بھی سانس لینے اور چھینکتے رہنے پر مجبور کردیتا ہے۔

آمنہ، مائخل شوف کے ساتھ تیزی سے چلتے ہوئے کار کے پاس گئی۔ اس نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ مائخل شوف اس کے برابر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی کار اسٹارٹ ہوئی، اس کی آواز سن کر کریزی چونک گیا۔ اس نے غرّا کر بارود خان کو دیکھا جو دیوار بنا ہوا تھا۔ اس وجہ سے آمنہ ہاتھ سے نکلی جارہی تھی اور مائخل شوف کی وہ اٹیچی بھی بہت اہم تھی۔ اس نے اچانک اچھل کر ایک فلائنگ کک ماری۔ بارود خان لڑکھڑا کر گیا۔ ادھر یہ دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ بارود خان نے "اوئے عورت کا بچّی، مقابلہ چھوڑ کر بھاگتی ہے مگر کدھر بھاگے گی۔"

وہ اٹھ کر پیچھے دوڑ لگانے لگا۔ اس وقت تک کار ڈرائیو کرتے ہوئے کوٹھی کے احاطے سے نکل چکی تھی۔ کریزی تیزی سے دوڑتا ہوا، شارٹ کٹ اختیار کرتا ہوا باؤنڈری وال سے چھلانگ لگاتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا۔ ادھر سے آمنہ ڈرائیو کرتی ہوئی آرہی تھی۔ اس نے بڑی بے دردی سے کار اس پر چڑھادی۔ کریزی کی چیخ سنائی دی۔ وہ ٹکرا کر ایک طرف گرا پھر لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ کار آگے نکل گئی تھی۔ پھر رک گئی۔ مائخل شوف نے پوچھا "کیوں روک رہی ہو۔ فوراً چلو۔"

آمنہ نے کار کو واپس موڑتے ہوئے کہا "نہیں، پہلے اس کا کام تمام کرنا ہوگا۔ کمبخت آدمی ہے یا بھوت۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے مُردہ قبر سے اٹھ کر چلا آیا ہو اور اس پر موت کے حملوں کا کوئی اثر نہ ہوتا ہو۔"

اس نے گاڑی واپس موڑ کر کریزی کی طرف دوڑائی۔ وہ بیچ سڑک پر پڑا ہوا تھا۔ اٹھنا چاہتا تھا پھر کار کو آتے دیکھ کر چاروں شانے چت ہوگیا۔ آمنہ نے رفتار بڑھائی۔ اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھام کر تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی کریزی کو کچلتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اسے یقین تھا کہ اس بار کار کے پہیے کریزی کے سینے پر سے گزر گئے ہیں۔ ایسے میں اس کا بچنا ممکن نہیں ہے۔

کریزی کی لاش سڑک پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ بارود خان اس کے پیچھے دوڑتا آیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا کہ کس طرح کریزی ایک بار کار سے ٹکرایا تھا۔ دوسری بار کار کے پہیے اس پر سے گزر گئے تھے۔ اس نے قریب آکر دیکھا پھر واپس کوٹھی کی طرف بھاگنے لگا کیونکہ وہ کسی لاش کے پاس کھڑے ہوکر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ کوٹھی کے اندر اور پچھلے حصے میں پہلے ہی لاکھن اور گامے کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ انھیں چھپانے کا مسئلہ تھا۔ جب وہ چلا گیا، اس کے قدموں کی آواز دور ہوگئی تو کریزی نے لیٹے ہی لیٹے ایک گہری سانس لی ہوگی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا ہوگا۔ سر کو جھٹک کر آس پاس دیکھا ہوگا اور آمنہ کے اور اٹیچی کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس کیا ہوگا۔

میں لفظ "ہوگا" اس لیے استعمال کررہا ہوں کہ اس وقت میں کریزی کے دماغ کو نہیں پڑھ سکتا تھا۔ بعد میں میری داستان کے ایک موڑ پر وہ اچانک سامنے آیا تو مجھے پتا چلا کمبخت کو مارنا بہت مشکل ہے۔ اس کا دعویٰ تھا "مجھے خداوند مسیح نے پیدا کیا ہے، وہی مجھے مارے گا۔ یہ کسی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ہم حیدرآباد پہنچنے والے تھے۔ میں نے حور بانو کو دیکھا۔ حسنِ خوابیدہ کا نظارہ قابلِ دید تھا۔ وہ سونے کے دوران میری طرف ڈھلک گئی تھی۔ اس کا سر میرے شانے پر آگیا تھا۔ حسنِ بے پناہ کو پناہ مل گئی تھی۔ ریلنگ تھام کر کھڑے ہوئے مسافر یا وہاں سے گزرتے ہوئے لوگ اسے رہ رہ کر دیکھتے تھے اور دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ شاید میری خوش قسمتی پر رشک کررہے ہوں گے۔

ریحانہ اور کرم داد نے اگلی سیٹ کی طرف سے گھوم کر دیکھا۔ پھر حور بانو کو اس انداز میں سوتے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ اس نے کہا۔ "جب ریحانہ میری پناہ میں سوتی ہے تو سوچتا ہوں، رات لمبی ہوجائے۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے مسکراتے ہوئے حور بانو کو دیکھا۔ پھر کہا "میں سوچتا ہوں عمر لمبی ہوجائے۔"

کرم داد نے کہا "فی الحال یہ راستہ لمبا نہیں ہوسکتا۔ ہم منزل کے قریب آگئے ہیں۔ اسے جگاؤ۔"

ریحانہ نے کہا "ہمارا جگانا مناسب نہیں ہے۔ یہ جھینپ جائے گی کہ نیند میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

انھوں نے فیصلہ کیا، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے آخری اسٹاپ پر دیکھا جائے گا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے حور بانو کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں کو دیکھا، وہ آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں کے پیچھے جو سپنا دیکھ رہی تھی، اس سپنے کو میں بھی دیکھنے لگا۔

وہ پھولوں بھری رنگا رنگ وادیوں میں گھوم رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی اور طرح طرح کے پھول چُن رہی تھی۔ بہت خوش تھی جیسے ساری دنیا کی خوشی مل گئی ہو۔ اس کی آواز میں رس تھا۔ وہ پھولوں کی انجمن میں خوشبو کی طرح بہتی ہوئی میرے پاس آگئی۔ میں جھرنے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بہت سے چُنے ہوئے پھول میری گود میں ڈال دیے۔ پھر میرے پاس بیٹھ کر میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ میں نے سرگوشی میں کہا "لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، بھلا یہاں کوئی کیسے آسکتا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف میں ہوں اور تم ہو۔ تیسرا کوئی نہیں ہے۔"

"بھئی، تیسرے بھی ہیں، چوتھے بھی ہیں ذرا دیکھو تو سہی۔"

میں نے دکھایا۔ اسے کچھ لوگ نظر آئے جو درخت کی ٹہنیاں تھامے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ کچھ لوگ بس کی ریلنگ تھامے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ اس نے جھینپ کر مجھے دیکھا۔ پھر جلدی سے ساری کا آنچل درست کرنے لگی۔

ہم نے حیدرآباد پہنچ کر ایک ہوٹل میں دو کمرے حاصل کیے۔ کرم داد نے کہا "تم سب نے کچھ نہ کچھ نیند پوری

کی ہے۔ میں تو اپنی سیٹ پر جاگتا ہی رہا۔"

ریحانہ نے کہا "جھوٹ نہ بولو۔ ایک بار میری آنکھ کھلی تو تمھیں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"میں آنکھیں بند کیے سکون سے بیٹھا ہوا تھا اور جاگ رہا تھا۔"

میں نے کہا "بھئی میں بھی اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔"

حور بانو نے مسکراتے ہوئے کہا "پھر میں کیوں پیچھے رہوں میں بھی کہتی ہوں کہ میری بھی صرف آنکھیں بند تھیں اور میں..."

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اچانک اسے خیال آیا، اگر وہ کہے گی کہ سو نہیں رہی تھی، جاگ رہی تھی تو کیوں میری طرف ڈھلک گئی تھی؟ اور میرے شانے پر سر رکھ دیا تھا؟

اس نے پریشان ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ ریحانہ اور کرم داد ہنسنے لگے۔ کرم داد نے کہا۔ "بھئی پہلے گرما گرم چائے منگوائی جائے۔ اس کے بعد ہم اپنے موجودہ حالات پر ضروری گفتگو کریں گے آخر میں سونے کا پروگرام بنایا جائے گا۔"

ہم سب نے اس سے اتفاق کیا۔ چائے کا آرڈر دیا پھر ہم بستروں پر بیٹھ گئے۔ اس چھوٹے سے ہوٹل میں کرسیاں نہیں تھیں۔ ایک کمرے میں دو بستر تھے۔ کرم داد اور ریحانہ اپنا کمرہ چھوڑ کر ہمارے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے آگئی۔ ملازم کے جانے کے بعد میں نے چائے کی ایک چسکی لی پھر کہا۔ "تقدیر نے ہمیں ایسے مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں ہم اجنبی ایک ہو گئے ہیں۔ حالات نے ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا سکھا دیا ہے۔ میں ایک سوال کرتا ہوں۔ اسی کے جواب سے ہماری بحث کا آغاز ہوگا۔ سوال یہ ہے، کیا ہم موجودہ طرز کی زندگی گزارتے رہیں گے یا اپنی روش بدلنا چاہیں گے؟"

ریحانہ نے کہا "پہلے میں جواب دیتی ہوں۔ اب سے تقریباً ڈھائی برس پہلے کرم داد سے میری پہلی ملاقات ہوئی جن حالات میں یہ ملاقات ہوئی میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ اتنا کہتی ہوں کہ ان دنوں کرم داد ایک سیدھا سادا مجبور اور مظلوم انسان تھا۔ اس پر طرح طرح کے ظلم ہو رہے تھے میں اس سے متاثر ہو گئی۔ میں نے سوچا اسے ایسی جگہ پہنچا دوں گی جہاں یہ دنیا کو دیکھے گا، سمجھے گا اور جینے کے ڈھنگ سیکھے گا۔ اگر کوئی اس سے ایک کوڑی چھینے گا — تو یہ اسے دو کوڑی کا کر دے گا اور آج میں نے اسے اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔"

اس نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا "لیکن میں موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں ایک عورت ہوں اور میں چاہتی ہوں، میرا جیون ساتھی ہر طرح محفوظ رہے۔ ہم ایک خوشحال پُرامن اور پُرسکون زندگی گزاریں جبکہ ہماری زندگی میں ہنگامے ..."

حور بانو نے مجھے جھکی جھکی نظروں سے دیکھا، پھر کہا "ریحانہ صرف تم نہیں، دنیا کی ہر عورت چاہتی ہے کہ وہ پُرسکون گھریلو زندگی گزارے۔ وہاں اس کا چاہنے والا شوہر اور اس کے پیارے پیارے بچے ہوں۔ ہماری دنیا بچوں سے شروع ہوتی ہے کبھی ہم بھی بچے تھے اور ہمارے بڑے بھی بچے تھے۔ لہٰذا جب یہ دنیا بچوں کے لیے ہے، بچوں سے شروع ہوتی ہے اور ہم اس دنیا کو بچوں کے حوالے کر کے چلے جاتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ قتل و غارت اور یہ تخریب کاری بچوں کی معصومیت کو قائم رہنے دے گی؟"

میں نے کہا "میں اس مرد کو مرد نہیں سمجھتا جو اپنی بیوی اور بچوں کی حفاظت نہ کر سکے اور انھیں ایک پُرسکون اور خوشحال زندگی کے ذرائع فراہم نہ کر سکے۔"

کرم داد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہمیں باری باری دیکھا پھر کہا "میں بات کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں نے کیسی باتیں چھیڑ دی ہیں۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، اس کا تعلق ان باتوں سے ہے جو یہ عورتیں کہہ رہی ہیں۔ اس لیے کہ عورتیں اپنے گھر اور دنیا کو آباد رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ ان کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ کرم داد کیا تم ریحانہ کے ساتھ ایک اچھی پُرسکون زندگی نہیں چاہتے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ ہمیشہ دشمنوں کا کھٹکا لگا رہے۔ تم کسی کام سے باہر جاؤ، ریحانہ تنہا رہ جائے اور تمھارے دل میں یہ اندیشہ جڑ پکڑتا رہے کہ تمھاری غیر موجودگی میں کوئی اسے جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مختلف دشمنوں کے گروہ ہیں۔ کون کب لاعلمی میں حملہ کرے گا، کیا تم معلوم کر سکتے ہو؟"

"میں معلوم نہیں کر سکتا لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہم دلدل میں بُری طرح دھنس گئے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر ملک کے جانباز سپاہی کی طرح ہی سرحد کی وفادار ہو تو کبھی دلدل میں نہیں دھنسو گے۔ اس بات کا خطرہ نہیں ہوگا کہ کوئی پیچھے سے حملہ کرنے والا ہے۔ اگر دوسرے ملک کی سرحدوں سے سازشیں کرنے آئیں گے تو اپنے ساتھ باہر کے دشمنوں کو بھی لاؤ گے اور اس ملک کے لوگوں کو بھی دشمن بنا لو گے۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا "تمھاری بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ جس کم کریزی کی رہنمائی میں ہم یہاں آئے تھے وہ ہمارا دشمن بن گیا ہے۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے بھی مجھے گالیاں دیں۔ واقعی غیر آخر غیر ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ جب سے کریزی دشمن بن گیا ہے تب سے میرے دماغ میں یہی بات آ رہی ہے کہ اگر لڑنا اور مرنا ہے تو ہم اپنے ملک کی خاطر ان دشمنوں سے لڑیں جو باہر سے آکر سازشیں کر رہے ہیں۔"

میں نے خوش ہو کر کہا "شاباش، میں یہی سمجھانا چاہتا تھا۔ اگر ہم اپنے گھر کو محفوظ نہیں رکھیں گے، اپنے ملک کی حفاظت نہیں کریں گے تو ہماری سلامتی ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔"

حور بانو نے کہا "لیکن ہم چار ہیں اور دشمن شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔"

"ہم صرف چار نہیں ہیں۔ ہم پاکستان میں ہیں، پورا پاکستان ہمارے ساتھ ہے۔"

"کیا پولیس اور انٹیلی جنس والے ہمارا ساتھ دیں گے؟"

"ہر شعبے میں کچھ بُرے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ اچھے ہوتے ہیں۔ ہم اچھے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوششیں کریں گے۔"

"کیا ہمیں اس سلسلے میں اعلیٰ افسران سے رابطہ قائم کرنا چاہیے؟"

"ضرور کرنا چاہیے۔ ہم اپنی نیند پوری کریں گے پھر یہاں کے انٹیلی جنس کے ڈی جی رشید احمد سے رابطہ قائم کریں گے۔ مجھے ان کا فون نمبر معلوم ہے۔"

مجھے رشید احمد صاحب کا فون نمبر معلوم نہیں تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ جب وہ سب مطمئن ہو گئے۔ ریحانہ اور کرم داد اپنے کمرے میں سونے کے لیے جانے لگے تو حور بانو نے پریشان ہو کر کبھی انھیں اور کبھی مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "ریحانہ تم اپنے کمرے میں حور بانو کے ساتھ جاؤ۔ کرم داد میرے پاس رہے گا۔"

ریحانہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ کرم داد میرے ہی کمرے میں دوسرے بستر پر لیٹ گیا۔ ہم تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر ہم نے منہ پھیر کر کروٹ بدلی اور سونے لگے۔ مجھے سونے اور جاگنے میں ایک ذرا دیر نہیں لگتی۔ پلک جھپکتے ہی سو جاتا ہوں اور جاگنا چاہوں تو پلک جھپکتے ہی جاگ جاتا ہوں۔ میں نے دماغ کو ہدایات دیں۔ جاگنے کا وقت مقرر کیا اور سو گیا۔

لیکن سونے سے پہلے میں نے انٹیلی جنس کے ڈائرکٹر جنرل کا فون نمبر معلوم کر لیا تھا۔ جناب رشید احمد صاحب ایک فرض شناس افسر تھے۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے مجھے یقین ہو گیا کہ ہم ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں اور ان کے ذریعے قانون کی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم صبح دس بجے سو کر اٹھے۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس تبدیل کیا۔ پھر ناشتا کرنے کے لیے اس رہائشی ہوٹل سے نکل کر کسی اعلیٰ معیاری ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ کرم داد نے سڑک کے کنارے پیدل چلتے ہوئے کہا "جی چاہتا ہے کسی کی کار چھین لوں۔ مجھے اس طرح چلنے کی عادت نہیں ہے۔"

"اور دشمنوں کا تعاقب کرنے کے لیے یا جان بچانے کے لیے چلنا اور بھاگنا پڑے تو؟"

"تو ایسے وقت لہو گرم ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کانٹوں کے بستر پر سو سکتا ہوں اور انگاروں پر چل سکتا ہوں۔"

ہم جلد ہی ایک اچھے معیاری ریستوران کے فیملی روم میں پہنچ گئے۔ وہاں آرام سے بیٹھ کر ناشتے کا آرڈر دیا۔ پھر میں نے کہا "رات میں نے کہا تھا کہ انٹیلی جنس کے ڈی جی کا ٹیلیفون نمبر مجھے معلوم ہے لیکن سوچتا ہوں، اگر ہم نے پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے رابطہ قائم کیا تو وہ ضرور ہم سے ملنا چاہیں گے۔"

ریحانہ نے کہا "ہم قانون کی مدد چاہیں گے، قانون ہماری مدد چاہے گا۔ اس کے لیے ملنا ضروری ہے۔"

"لیکن جب قانون کے محافظ کہیں گے کہ ہمیں کراچی شہر سے باہر نہیں جانا چاہیے یا حیدر آباد تک محدود رہنا چاہیے۔ قانونی کارروائیوں سے گزرنا چاہیے تو کیا ہم ان کی پابندیوں میں رہ سکیں گے؟ اور یہ تو ہم نہیں جانتے کہ کب تک قانون کے محافظوں کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔"

کرم داد نے انکار میں سر ہلا کر کہا "میں یہ نہیں مانتا۔ اگر کوئی افسر ڈانٹ کر بات کرے گا یا ہمیں کمتر سمجھے گا تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔ اس سے بہتر ہے ہم ان سے دور رہیں۔"

میں نے کہا "ہم ان سے دور رہ کر بھی قانون کی مدد کر سکتے ہیں۔"

حور بانو نے کہا "یہی مناسب ہے۔ اگر ہم پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے قریب جائیں گے تو وہ بھی ہمارے متعلق تحقیقات کریں گے۔ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں؟ مجھے تو میرے والدین کے پاس واپس پہنچا دیا جائے گا۔ والدین کے ہوتے ہوئے، ایک گھر کے ہوتے ہوئے، ایک لڑکی کو قانوناً دوسروں کے ساتھ بھٹکنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ قانون کی اور بھی بہت سی پیچیدگیاں ہیں جس کی وجہ سے تم سب مشکلات میں گھر جاؤ گے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فیملی کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی پھر پردہ ہٹ گیا۔ ایک پولیس انسپکٹر نظر آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے دو چار سپاہی دکھائی دیے۔ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے بغیر اجازت آ رہا ہوں مگر دستک دے چکا ہوں۔"

ہم نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھیے "

وہ بیٹھتے ہوئے بولا "تم چاروں کل رات ہوٹل رینبو میں ٹھہرے تھے۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"کراچی سے "

"میں پوچھتا ہوں، کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے حیرانی سے کہا "کہہ تو رہا ہوں، کراچی سے آ رہے ہیں "

وہ جھنجلا کر بولا "اوہ گاڈ! یہ سمجھتے کیوں نہیں، کراچی سے تو سبھی آتے ہیں۔ کسی محلّے، کسی مکان کا نام تو ہوگا؟"

ریحانہ نے اپنے بیگ میں سے اپنا اور کرم داد کا پاسپورٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "ہم پیرس سے آئے ہیں۔ لاہور جانے والے ہیں۔ مسٹر بابر اور ان کی وائف لاہور میں ہمارے مہمان رہیں گے۔ ہمارے بہت اچھے دوستوں میں سے ہیں "

انسپکٹر نے وہ پاسپورٹ لے کر دیکھنا شروع کیا۔ میں اس کے دماغ میں پہنچ کر معلومات حاصل کر رہا تھا۔ وہ پاسپورٹ کو صرف دکھاوے کے طور پر دیکھ رہا تھا۔ ورنہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا "بروقت ان کمبختوں تک پہنچ گیا۔ ورنہ یہ حیدر آباد سے بھی آگے نکل جاتے اور میری بیس ہزار روپے کی رقم ہاتھ سے نکل جاتی "

سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بیس ہزار روپے کی رقم اس کے ہاتھ سے کیسے نکل رہی ہے؟

اس کی سوچ نے جواب دیا۔ سائیں سراج آدم نے یہ پیشکش کی ہے۔ سائیں نے انسپکٹر کو یہ تین تصویریں دی تھیں۔ ایک کرم داد کی تھی، دوسری ریحانہ کی اور تیسری حور بانو کی۔ اس نے کہا تھا، ان کے ساتھ ایک اور شخص ہوگا۔ جس کا نام بابر ہے۔ اس نے بابر کا یعنی میرا حلیہ بتا دیا تھا اور انسپکٹر خوش ہو رہا تھا کہ اسے یہ چاروں بیک وقت ایک ساتھ مل گئے تھے۔

اس کی سوچ کے مطابق سائیں سراج آدم ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ حیدر آباد سے تقریباً پچیس تیس میل کے فاصلے سے اس کی زمین شروع ہوتی تھی۔ خوب کھانے اور کھلانے والا آدمی تھا۔ پولیس کو ہمیشہ خوش رکھتا تھا۔ جو بھی افسر اس کے دروازے پر جاتا، جھولیاں بھر کر آتا تھا۔

جو انسپکٹر ہمارے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سائیں آدم ہم چاروں کو کیوں طلب کر رہا ہے۔ بس اتنا ہی کہا گیا تھا کہ اگر یہ چاروں اس کے دروازے پر پہنچا دیے جائیں تو انسپکٹر کو بیس ہزار روپے انعام کے طور پر ملیں گے۔ یہی پیشکش کراچی، سکھر، نواب شاہ وغیرہ کے پولیس والوں کے لیے بھی تھی۔ جو بھی ہم چاروں کو سائیں تک پہنچاتا، اسے بیس ہزار مل جاتے۔

انسپکٹر نے پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "مجھے افسوس ہے، میں نے آپ لوگوں کو پریشان کیا۔ اب اجازت چاہوں گا "

اسی وقت ملازم ناشتا لے کر آ گیا۔ میں نے کہا "جناب! ہمارے ساتھ چائے تو پی کر جائیں "

اس نے انکار کیا۔ ریحانہ اور حور بانو نے بھی کہا تو وہ مسکرا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ناشتے کے دوران پوچھا "آپ سب لاہور کیسے جائیں گے؟ آج کل ٹرین میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ پندرہ دن پہلے ریزرویشن کرانا ہوتا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں سرکاری کام سے لاہور کی طرف جا رہا ہوں، آپ سب میری گاڑی میں سفر کر سکتے ہیں "

ریحانہ نے سوالیہ نظروں سے کرم داد کی طرف دیکھا، کرم داد مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں انسپکٹر کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتا تھا لیکن میں نے حور بانو سے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے؟"

اس نے چونک کر مجھے، ریحانہ کو اور کرم داد کو باری باری دیکھا۔ پھر کہا "مجھ ناچیز کی رائے پوچھی جا رہی ہے تو میں تو یہی کہوں گی کہ انسپکٹر صاحب کے آنے سے پہلے ہم قانون کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے۔ یوں تو پھر ہائی وے پر سفر کرنے سے کبھی کبھی کوئی خطرہ پیش آتا ہے لیکن قانون کی پناہ میں سارے خطرات ٹل جاتے ہیں "

"گویا تم یہ کہہ رہی ہو کہ ہمیں انسپکٹر صاحب کے ساتھ لاہور تک سفر کرنا چاہیے؟"

کرم داد نے کہا "میں تائید کرتا ہوں "

ریحانہ مسکرا رہی تھی۔ انسپکٹر نے خوش ہو کر کہا "چلیے یہ طے ہو گیا کہ ہم سب لاہور جا رہے ہیں۔ میں ابھی گاڑی کا انتظام کرتا ہوں "

اس نے چائے پی۔ پھر ہمارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا "آپ سب ہوٹل رینبو میں میرا انتظار کریں، میں گاڑی لے کر پہنچ جاؤں گا "

وہ چلا گیا۔ میں نے اس کے جانے کے بعد کیبن کے باہر جھانک کر دیکھا، اب کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاں دروازہ جہاں سے ریستوران سے باہر نکلا جاتا تھا، وہاں ایک شخص نظر آیا۔ وہ ہمارے کیبن کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے مشکوک لگ رہا تھا۔ میں نے کرم داد سے کہا "تم ذرا اس شخص کے پاس جاؤ اور سگریٹ جلانے کے لیے ماچس طلب

کرو۔ اس دوران اسے سمجھنے کی بھی کوشش کرو کہ کیا وہ ہماری تاک میں ہے۔ اگر ہے تو صبر سے کام لینا اور چپ چاپ یہاں چلے آنا "

کرم داد نے میری ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ وہاں جا کر اس سے ماچس طلب کرے اور جواباً کوئی بات کہے۔ جب اس نے ماچس دیتے ہوئے کہا۔ "جناب، ماچس میں دے رہا ہوں۔ آپ ایک سگریٹ عنایت کر دیں "

کرم داد نے اسے سگریٹ دیا پھر دونوں نے اپنے اپنے سگریٹ جلائے۔ اس دوران میں اس کے دماغ کو پڑھ چکا تھا اور معلوم کر چکا تھا کہ انسپکٹر نے اسے ہماری نگرانی کے لیے مقرر کیا ہے۔ جب وہ سگریٹ سلگا کر واپس آیا تو میں نے پوچھا "تمھارا کیا خیال ہے؟"

اس نے جواب دیا "مشکوک لگتا ہے۔ ہماری نگرانی کر رہا ہے "

"اگر یہ مشکوک لگتا ہے اور ہماری نگرانی کر رہا ہے تو اسے کیسے پتا چلا کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

کرم داد نے کہا "یہی تو سمجھ میں نہیں آتا "

"سمجھنے کے لیے عقل پر زور دینا پڑتا ہے۔ ابھی ایک پولیس انسپکٹر ہمارے متعلق بہتیری باتیں معلوم کر کے گیا ہے۔ اس کے جانے کے بعد تمام سپاہی چلے گئے بس سفید لباس میں ایک شخص دروازے پر کھڑا ہوا ہے اور وہاں سے ہمارے کیبن کو پوری طرح دیکھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسپکٹر کوئی چال چل رہا ہے "

ریحانہ نے فوراً کہا "بابر! تم درست کہہ رہے ہو "

حور بانو نے پوچھا "یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پولیس آفیسر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کیوں کرے گا۔ کیوں ہمیں پھانسنے کی کوشش کرے گا؟"

میں نے کہا "تم کیا سمجھتی ہو، یہ جو دہشت گردی کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں، یہ خاص ذرائع کے بغیر یہاں اپنی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے پولیس، انٹیلی جنس اور کسٹمز وغیرہ کے شعبوں میں ایسے لوگوں کو تاڑ رکھا ہے جو رشوت خور ہیں، بددیانت ہیں اور ملک کے مفاد کے خلاف ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ایسا ہی ایک پولیس انسپکٹر یہ بھی تھا جو ہمارے پاس سے اٹھ کر گیا ہے۔ یہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ کہاں لے جانا چاہتا ہے، ہم میں سے کوئی نہیں جانتا " (حالانکہ میں جانتا تھا)

"پھر تو ہمیں انسپکٹر کے ساتھ نہیں جانا چاہیے "

میں نے کہا "ضرور جانا چاہیے۔ میں اور کرم داد کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ راستے میں ہمارے ساتھ کوئی کھیلا کرے گا تو ہم ایسا سبق پڑھائیں گے کہ یہ ساری زندگی یاد رکھے گا بلکہ ہمارے لیے اس کے ساتھ جانا فائدہ مند ہے۔ ہم اس کی گاڑی میں جائیں گے۔ راستے میں یہ دھوکے باز ثابت ہوا تو اس کی گاڑی ہمیں یہاں سے بہت دور لے جائے گی "

کرم داد نے خوش ہو کر میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "یہ ہوئی مردوں جیسی بات۔ میں تمھاری پلاننگ سے متفق ہوں۔ ہم انسپکٹر کے ساتھ ضرور جائیں گے "

ہم نے ناشتے سے فارغ ہو کر . . . بل ادا کیا پھر ہوٹل رینبو میں آ کر اپنا سامان پیک کیا۔ اتنے میں انسپکٹر آ گیا۔ اس نے کہا "بھئی تیار ہو۔ میں گاڑی لے آیا ہوں "

ہم اس کے ساتھ ہوٹل سے نیچے اترے، گاڑی میں سوار ہو گئے۔ وہ ایک چھ سیٹر ویگن تھی۔ اسٹیرنگ سیٹ کے ساتھ ایک اور شخص بیٹھ سکتا تھا۔ وہاں پولیس انسپکٹر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر حور بانو، ریحانہ اور کرم داد بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے والی سیٹ پر میں دو سپاہیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں سپاہی اور پولیس انسپکٹر مسلح تھے۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ پچھلا دروازہ ضرورت کے وقت کھولا جا سکتا تھا۔

ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ پہلے ہم ہائی وے پر چلتے رہے کئی میل تک جانے کے بعد پولیس کی ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ اس نے اشارے سے رکنے کے لیے کہا۔ ہماری گاڑی رک گئی۔ اس جیپ سے ایک انسپکٹر نے اتر کر ہماری گاڑی کے انسپکٹر سے کہا "آگے ایک مرڈر کیس ہو گیا ہے۔ ایک فرلانگ کے فاصلے پر بائیں جانب کچا راستہ گیا ہے۔ اُدھر آگے جا کر گوٹھ ملنگ کے علاقے میں آپ معلومات حاصل کریں۔ آپ کو کیس کی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں، آپ وہاں موجود رہیں۔ میں ابھی پولیس پارٹی لے کر پہنچتا ہوں "

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ انسپکٹر نے پلٹ کر کہا "ایک ذرا فرائض کی مجبوری ہے۔ اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو ہم پہلے گوٹھ ملنگ چلیں گے۔ اس کے بعد اپنے راستے پر لگ جائیں گے۔ ویسے ہم جلد ہی لاہور پہنچ جائیں گے "

میں نے کہا "فرائض کو ہمیشہ اوّلیت دینی چاہیے۔ آپ ضرور گوٹھ ملنگ چلیں "

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں سمجھ رہا تھا، کیا چال ہے۔ دراصل جو جیپ کار ہماری طرف آئی تھی اور اس میں جو پولیس انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا، وہ نقلی انسپکٹر تھا اور پلاننگ کے مطابق اس نے آ کر وہی بات کہی تھی جو پہلے سے طے شدہ

تھی تاکہ ہمیں گوٹھ ملنگ کی طرف لے جایا جاسکے۔
میرے آس پاس دو سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ میں ایک سپاہی سے باتیں کرنے کے بعد اس کے دماغ پر قابض ہوگیا۔ اس نے چپکے سے اپنی رائفل کھڑکی سے باہر نکالی پھر اسے پھینک دیا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے دماغ پر قابض رہا پھر اسے آزاد چھوڑ دیا۔ اسے احساس تک نہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہوچکا ہے کیونکہ پہلے اس کی رائفل ایک طرف رکھی ہوئی تھی۔ وہ آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے دھیان رائفل کی طرف نہیں گیا۔
میں نے دوسرے سپاہی کے ساتھ بھی یہی طریقۂ کار اختیار کیا۔ جب دونوں نہتے ہوگئے تو میں نے انسپکٹر کی خبر لی۔ اس سے پوچھا "انسپکٹر صاحب! آپ ہمیں گوٹھ ملنگ کیوں لے جارہے ہیں؟"
"بھئی، میں نے کہا نا" وہاں ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔"
"اگر ہم انکار کرنا چاہیں تو؟"
اسی وقت انسپکٹر نے ہولسٹر سے ریوالور نکالا۔ میں نے کرم داد کے دماغ میں پہنچ کر اسے مستعد کر دیا۔ اس نے فوراً ہی اگلی سیٹ کی طرف جھک کر انسپکٹر کے ایک ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی کلائی کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر کہا "میرا یار تم سے کوئی سوال کر رہا ہے اور اس کے جواب میں تم ریوالور نکال رہے ہو، بات کیا ہے؟"
اس نے کہا "اگر تم خیریت چاہتے ہو تو مجھے چھوڑ دو ورنہ میرے سپاہی تمھیں گولی مار دیں گے۔"
میں نے کہا "کرم داد [illegible] کی باتوں میں [illegible]
میرے آس پاس بیٹھے ہوئے سپاہی نہ جانے کیوں اپنی اپنی رائفلیں کھڑکی کے باہر پھینک چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔"
اس نے انسپکٹر کی گردن کو اور مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا "میں سمجھ گیا، ہمارے خلاف چالیں چلی جارہی ہیں۔ انسپکٹر تم اپنی خیریت چاہتے ہو اور اپنی سلامتی چاہتے ہو تو سچ اُگل دو۔"
میرے آس پاس بیٹھے ہوئے دونوں جوان اپنے صاحب کی مدد کے لیے اُٹھنا چاہتے تھے، میں نے دونوں کہنیاں ان کے پیٹ میں ماریں۔ وہ کراہتے ہوئے ذرا جھکے تو میں نے دو گھونسے دونوں کے منہ پر جڑ دیے۔ پھر دونوں کی گردنیں اپنے بازوؤں میں دبوچ لیں۔ اس کے بعد کہا "میں نے پیچھے والوں کو سنبھال لیا ہے۔ آگے والوں کو تم سنبھالو۔"

گاڑی ڈرائیو کرنے والا بھی انسپکٹر کا آدمی تھا۔ اس نے فوراً ہی گاڑی روک دی۔ اپنے صاحب کی مدد کرنے لگا لیکن کرم داد کے آگے یہ دونوں کچھ نہیں تھے۔ اس نے انسپکٹر کے ریوالور والے ہاتھ کو چھوڑ دیا۔ دوسرے ہاتھ سے ڈرائیور کی گردن دبوچ لی۔ انسپکٹر میں سکت نہیں رہی تھی۔ وہ ریوالور نکال کر کرم داد کا نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔ گردن اتنی سختی سے دبی ہوئی تھی کہ اس کا دَم گھٹ رہا تھا۔
ادھر [illegible] نے ان دونوں کی گردنیں دبوچی ہوئی تھیں میں نے کہا "کرم داد! [illegible] جو وہی میں کر رہا ہوں۔ میرے دو بازوؤں میں ان [illegible] کی گردنیں ہیں۔ لہٰذا قصہ ختم کرو۔"
اس نے اچانک ہی دونوں کی گردنیں چھوڑ دیں اور پلک جھپکتے ہی ہولسٹر سے انسپکٹر کا ریوالور نکال لیا۔ وہ سہم کر دروازے سے لگ گیا۔ اس کا ہاتھ اس طرف جارہا تھا جدھر سے دروازے کو کھول سکتا تھا۔ کرم داد نے گرج کر کہا "خبردار! کوئی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"
اس نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی پھر کہا "تمھی اصل مُہرے ہو، تمھاری جان خطرے میں رہے گی تو سپاہی اور ڈرائیور میرے حکم کی تعمیل کریں گے اور میں حکم دیتا ہوں کہ یہ تینوں گاڑی سے باہر جاکر کھڑے ہوجائیں۔"
اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ وہ ڈرائیور اور دونوں سپاہی باہر جاکر کھڑے ہوگئے۔ کرم داد نے کہا "ویل انسپکٹر، بی فیئر وِدھ اَس۔ اَدر وائز یو وِل بی نو مور (چلو انسپکٹر، جو سچ ہے وہ اُگل دو۔ ورنہ تم نابود ہوجاؤ گے)۔"
انسپکٹر نے عاجزی سے گڑگڑا کر کہا "دیکھو، ٹریگر نہ دبانا۔ میں کچھ نہیں جانتا کہ سائیں سراج آدم نے تم لوگوں کو کیوں طلب کیا ہے۔ میرا مفاد اس سے کچھ زیادہ نہیں ہے کہ مجھے بیس ہزار ملنے والے تھے۔"
"یہ سائیں سراج آدم کون ہے؟"
"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ ایک پُراسرار اور بااثر شخص ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس کے شعبوں پر چھایا رہتا ہے اور تو اور سب سے تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے علاقے میں کبھی کوئی ڈاکو حملہ نہیں کرتا۔ گوٹھ ملنگ کے قریب ہی گوٹھ سارنگ ہے۔ جہاں جمال احمد جبکانی نے تباہیاں مچا دیں۔ وہاں کے وڈیرے کو مرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی دونوں بیٹیوں نے اسے قتل کیا اور خود کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ اس کے قریب ہی گوٹھ ملنگ کا یہ زمیندار سائیں سراج آدم عجیب و غریب شخص ہے۔ اس کے علاقے میں جمال احمد جبکانی یا ڈاکو رانگا ماما

نہیں آئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کے خطرناک ڈاکو بھی سائیں سراج آدم کا احترام کرتے ہیں۔ اب اس کے پیچھے کیا بات ہے" یہ میں نہیں جانتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم لوگوں کو وہاں پہنچانے کے بعد مجھے بیس ہزار مل جاتے۔"
میں نے پوچھا "یہ گاڑی سرکاری نہیں ہے۔ پھر کہاں سے لائے ہو؟"
حالانکہ میں اس کے دماغ سے معلوم کر چکا تھا لیکن اس کا جواب کرم داد وغیرہ کو سنانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ بھی سائیں سراج آدم کی گاڑی ہے۔ سائیں نے اسے ہمارے استعمال کے لیے رکھ چھوڑا ہے اور ہم اسے سائیں کے کاموں کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔"
اب تم گاڑی سے نکل کر اپنے آدمیوں کے ساتھ چپ چاپ کھڑے ہوجاؤ۔ یاد رکھو، ہم نے تمھاری باتیں ریکارڈ کر لی ہیں۔ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر تم نے ہمارے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی تو ہم یہ ریکارڈر عدالت میں پیش کر دیں گے۔ پھر تم سے پوچھا جائے گا کہ تم اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر ہمیں سائیں آدم کے پاس کیوں لے جارہے تھے۔ سمجھ گئے، نا؟"
کرم داد نے دروازے کو کھول کر انسپکٹر کو باہر دھکا دیا پھر خود گاڑی سے اتر کر اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ دروازے کو بند کیا، گاڑی اسٹارٹ کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا چل پڑا۔ وہ عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا اور میں پیچھے گھوم گھوم کر دیکھتا جارہا تھا۔ انسپکٹر اپنے آدمیوں کے ساتھ کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ ہماری گاڑی دور نکل آئی تھی۔ کرم داد نے کہا "کبھی کبھی میری چھٹی حس خطرے سے آگاہ کر دیتی ہے بابر! جب تم نے انسپکٹر سے سوال کیا تھا تو اچانک میرے دماغ میں یہ بات آئی تھی کہ وہ ریوالور نکال رہا ہے۔ اسے کور کرنا چاہیے۔"
میں مسکرا کر رہ گیا۔ حالانکہ میں نے ہی اس کے دماغ میں یہ بات پیدا کی تھی۔ ریحانہ نے پوچھا "یہ کمبخت سراج آدم کون ہے۔ اسے ہم سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟"
میں نے کہا "انسپکٹر کے بیان کے مطابق جو ڈاکو گوٹھ سارنگ اور آس پاس کے علاقوں پر حملہ کرتے ہیں، تباہیاں مچاتے ہیں، وہ گوٹھ ملنگ میں ایسا نہیں کرتے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ ڈاکوؤں سے گوٹھ ملنگ کے زمیندار سراج آدم کا گٹھ جوڑ ہے۔"
ریحانہ نے پوچھا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ

ڈاکو ہمیں سراج آدم کے ذریعے طلب کر رہے ہیں؟"
"ہاں، ابھی تم نے انسپکٹر کی زبان سے جمال احمد جبکانی اور ڈاکو رانگا ماما کا نام سنا ہے۔ یہ دونوں الیاس ریٹی سنیٹر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جمال احمد جبکانی اور کرم کریزی کا گٹھ جوڑ ہے۔ وہ کرم کریزی کے لیے ہمیں حاصل کرنا چاہتا ہے، اسی لیے سراج آدم کو اس نے ذریعہ بنایا ہے اور سراج آدم اپنے علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"
حور بانو نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا، وہ دونوں سپاہی جو آپ کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ہی نہتے کیسے ہوگئے؟ ان کی رائفلیں کیا ہوئیں؟"
میں نے کہا "میں خود حیران ہوں۔ وہ نہتے بھی ہوگئے تھے اور جب میں نے ان پر حملہ کیا اور ان کی گردنیں دبوچ لیں تو انھوں نے زیادہ جدوجہد بھی نہیں کی۔ بالکل چوہے بن گئے تھے۔"
کرم داد نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا "یہ سرکاری گاڑی نہیں ہے۔ سراج آدم مشہور و معروف شخص ہے۔ اس کی گاڑی پہچانی جائے گی۔ آگے جو دیہات یا شہر آئیں گے وہاں کے پولیس والے بھی ہماری تاک میں ہوں گے۔ جب وہ ایک پولیس انسپکٹر کو اپنے اشاروں پر چلا سکتا ہے تو دوسرے علاقے کے پولیس والوں کو خریدنا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔"
ہمارا سفر ہائی وے پر جاری تھا۔ کبھی کبھی ہائی وے کے اطراف کچے راستے نظر آتے تھے۔ یہ راستے مختلف شہروں اور مختلف گوٹھ وغیرہ کی طرف گئے تھے۔ اچانک ہی ہمارے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ سامنے بہت دور سے ایک جیپ کار آرہی تھی۔ اس کی پچھلی سیٹ پر چار رائفل بردار کھڑے ہوئے تھے اور وہ ہماری طرف فائر کرتے آرہے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دن دہاڑے اس طرح کھلی فائرنگ ہوگی اور ہمارا راستہ روکا جائے گا۔ میں نے کہا "کرم داد! آگے بائیں طرف کچا راستہ ہے۔ اُدھر موڑ لو۔"
کرم داد نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے پاس انسپکٹر کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔ صرف چھ گولیوں سے ان رائفل بردار دشمنوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کرم داد نے کچے راستے پر گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، ہائی وے دور رہ گیا تھا۔ وہ جیپ والے ہمارا تعاقب کر رہے تھے مگر ہم سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ کرم داد نے کہا "وہ عقب نما آئینے میں نظر نہیں آرہے ہیں بابر، ان پر نظر رکھو۔"
"میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔"

کچّے راستے پر گرد اُڑ رہی تھی۔ پیچھا کرنے والے بہت دور رہ گئے۔ گرد و غبار میں گم ہو گئے۔ نظر نہیں... آ رہے تھے۔ البتہ کبھی کبھی فائرنگ کی آواز سنائی دیتی تھی۔ فائرنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت دور ہیں۔ حور بانو نے پوچھا "وہ ہمارا تعاقب تیزی سے کر سکتے تھے۔ پھر پیچھے کیوں رہ گئے؟"

ریحانہ نے کہا "ہو سکتا ہے وہ ہماری طرف سے جوابی فائرنگ کی توقع کر رہے ہوں۔ یہ خوف بھی ہو گا کہ گرد و غبار کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آئے گا تو ان کا کوئی نہ کوئی آدمی مارا جائے گا۔"

حور بانو نے انکار میں سر ہلا کر کہا "نہیں، انھیں یہ اطمینان ہے کہ ہماری طرف سے فائرنگ نہیں ہو گی۔ جب دو فوجیں یا دو دشمن آپس میں ٹکراتے ہیں تو چیلنج کے طور پر ایک دوسرے کی طرف فائرنگ کرتے ہیں۔ تاکہ یہ ثابت ہوتا رہے کہ دونوں کمزور نہیں ہیں، دونوں نہتّے نہیں ہیں اور ہم نے اب تک فائرنگ نہ کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم نہتّے ہیں۔"

حور بانو جب سے میرے سامنے رہ رہی ہے، میں اس کی ذہانت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں۔ وہ ہمیشہ چبھتی ہوئی باتیں کرتی ہے یا ایسے تبصرے کرتی ہے جس کی طرف دوسروں کا دھیان نہیں جاتا۔ مثلاً تھوڑی دیر پہلے اس نے سوال کیا تھا کہ دونوں سپاہی اچانک نہتّے کیسے ہو گئے تھے۔ اسے میں نے کسی طرح ٹال دیا تھا۔ اب وہ تعاقب کرنے والوں کے متعلق بڑی ذہانت سے سوچ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ان کی جیپ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔"

اس نے جواباً کہا "جس طرح ہمیں گھیرا جا رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہائی وے پر سفر کرنے کی اطلاع انھیں بہت پہلے سے تھی۔ اسی لیے دشمن ہمارے سامنے سے فائرنگ کرتے ہوئے آ رہے تھے جب دشمن سفر کے رُوٹ کو سمجھ رہے ہیں تو ہمیں گھیرنے کے لیے کبھی ایسی گاڑی استعمال میں نہیں لائیں گے جس میں کوئی خرابی ہو یا آئندہ کوئی خرابی پیدا ہو سکتی ہو۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ وہ ہمیں ہائی وے سے ہٹانا چاہتے تھے، انھوں نے ہٹا دیا، ہمارا راستہ بدل دیا۔ اب خود ہی سن لیں، فائرنگ کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ راستہ بدلنے والوں کا کام ختم ہو چکا ہے۔"

میں نے اسے تعریفی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا "اگر تمھاری بات درست ہے تو جلد اس کی تصدیق ہو جائے گی۔"

کرم داد اسی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ آگے جا کر وہ کچّا راستہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک راستہ جنوب مغرب کی طرف جاتا تھا اور دوسرا مغرب کی طرف۔ ہم نے دیکھا جنوب مغرب کی سمت جانے والے راستے سے ایک اور تیز رفتار جیپ چلی آ رہی تھی۔ اس جیپ کے پچھلے حصّے پر بھی چند رائفل بردار کھڑے ہوئے تھے اور ہمیں دیکھتے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اب ہمارے سامنے صرف وہی راستہ تھا جو مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ ہم اس جیپ والے راستے کی طرف نہیں جا سکتے تھے۔ کرم داد ہماری گاڑی کو اسی سمت سے جانے لگا جو مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ ہم فائرنگ کی زد سے دور نکل گئے تھے مگر وہ جیپ والے ہمارے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ اب سڑک پر زیادہ گرد نہیں اُڑ رہی تھی۔ ہمارے آس پاس ہریالی نظر آ رہی تھی۔ ہماری تیز رفتاری ہمیں رفتہ رفتہ گھنے جنگل میں لیے جا رہی تھی۔

ہم نے دیکھا، تعاقب کرنے والے پھر پیچھے رہ گئے تھے۔ حور بانو نے کہا "میں پھر پیشگوئی کرتی ہوں، یہ پیچھے رہ جائیں گے اور گم ہو جائیں گے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس وقت تک فائرنگ کرتے رہیں گے جب تک کہ ہمیں آواز سنائی دیتی رہے۔"

اور یہی ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی وقفے سے فائرنگ ہوتی تھی، پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد آواز بالکل ختم ہو گئی۔ میں نے حور بانو سے کہا "شاباش، تم بیدار ذہن رکھتی ہو۔ حالات کا فوری تجزیہ کر کے ایک خاص نتیجے تک پہنچ جاتی ہو۔ واقعی وہ ہمیں اپنے راستے پر لگا رہے ہیں، اُدھر جانے پر مجبور کر رہے ہیں، جہاں وہ پہلے سے ہمارے منتظر ہوں گے۔"

کرم داد نے پوچھا "کیا میں گاڑی واپس گھما لوں؟"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کچّے راستے پر وہ جیپ والے موجود ہوں گے۔ اگر ان سے مقابلہ کر کے واپس جائیں گے تو دوسرے جیپ والے بھی ہمارا راستہ روکیں گے۔ جب وہ ہمیں گھیر رہے ہیں اور اپنے ہی راستے پر آہستہ آہستہ ہانکتے لے جا رہے ہیں تو اس کا انھوں نے پہلے سے مکمل انتظام کر رکھا ہو گا۔ اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دو اور آگے بڑھتے رہو۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔"

آگے وہی ہوتا ہے جو ہونا چاہیے لیکن ہم ہونی کو سمجھتے ہوئے بھی اس پر توجہ نہیں دیتے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی جھٹکے کھانے لگی، رُکنے لگی۔ پتا چلا پٹرول ختم ہو چکا ہے۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ گاڑی

چلتی رہے گی تو پٹرول خرچ ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گا لیکن ہم دشمنوں سے دور نکل جانے کی دُھن میں یہ بھول گئے تھے اور اگر یاد بھی رکھتے تو پٹرول کہاں سے حاصل کر سکتے تھے۔ انھوں نے شاید اسی لیے ہمیں ہائی وے سے ہٹا دیا تھا کہ ہم کسی پٹرول پمپ پر نہ پہنچ سکیں۔ جب حیدر آباد سے سفر شروع کیا تھا تو اس وقت یہ گاڑی ہمارے قبضے میں نہیں تھی۔ ورنہ ہم گاڑی کی ٹنکی ضرور چیک کرتے اور اسے فل کرا لیتے۔

ہم گاڑی سے باہر آ گئے۔ کرم داد نے غصّے سے گاڑی کو ایک لات ماری۔ ریحانہ نے پوچھا "غصّہ کیوں دکھا رہے ہو اگر پٹرول ہوتا تو کہاں جاتے؟ زیادہ سے زیادہ اور گھنے جنگل میں پہنچ جاتے۔"

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ ہریالی ہی ہریالی تھی۔ دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ کتنے ہی درختوں پر پرندے بول رہے تھے جیسے ہمیں خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ ہم سے بہت دور کئی جنگلی بھیڑیں نظر آئیں جنھیں اڑیال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جانور سندھ کے جنگلوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اچانک ہی حور بانو چیخ مار کر میرے پاس آ گئی اور ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم نے دیکھا، ایک عظیم الجثہ اژدہا تھا۔ تقریباً دس فٹ لانبا ہو گا۔ ہمیں دیکھتے ہی زمین میں سوراخ کر کے اندر جانے لگا یوں لگا جیسے زمین اسے نگلتی جا رہی ہو، وہ گم ہوتا جا رہا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی ہمارے سامنے نہیں تھا۔ ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا سانپ یا اژدہا دیکھا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے زمین میں سوراخ کر کے اندر چلا جاتا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ سندھ کے جنگلوں میں اس جانور کو مور خور کہتے ہیں۔

ریحانہ نے پریشان ہو کر کہا "یہ ہم کہاں آ کر پھنس گئے ہیں۔ ہمیں واپس جانا چاہیے۔"

حور بانو نے کہا "جو ہمیں یہاں آنے پر مجبور کر چکے ہیں، انھوں نے واپسی کا راستہ بھی بند کر دیا ہو گا۔"

کرم داد نے کہا "بہرحال ہمیں واپس تو جانا ہی ہو گا۔ اس ریوالور میں چھ گولیاں ہیں۔ میں اس پر بھروسا نہیں کرتا بلکہ اپنے حوصلے اور اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر یہاں سے نکلنا ہو گا۔"

ہم نے گاڑی کے اندر سے اپنا سامان نکال لیا۔ سامان ہی کیا تھا۔ سفری بیگ تھے جنھیں ہم نے کاندھوں سے لٹکا لیا۔ حور بانو کے پاس ایک اٹیچی تھی۔ میں نے کہا۔ "اس گاڑی کی ڈِکی کھول کر دیکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، ہماری ضرورت کا کوئی سامان مل جائے۔"

کرم داد نے اس کی ڈِکی کھولی۔ وہاں رسّیوں کا ایک بنڈل اور دو کلہاڑیاں نظر آئیں۔ پلاسٹک کا ایک بڑا سا ڈبّہ تھا جس میں پٹرول رکھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے فوراً ہی کھول کر دیکھا تو پٹرول نہیں تھا، پانی بھرا ہوا تھا۔

میں نے کہا "ان کلہاڑیوں اور رسّی کے بنڈل سے پتا چلتا ہے کہ یہ گاڑی اکثر ان ہی جنگلات سے گزرتی ہے۔"

کرم داد نے رسّی کے بڑے سے بنڈل کو اپنے شانے پر لاد لیا۔ ایک کلہاڑی اس نے اٹھائی، دوسری میں نے۔ ریحانہ نے پانی سے بھرے ہوئے پلاسٹک کین کو اٹھا لیا۔ پھر ہم وہاں سے واپسی کے راستے پر چلنے لگے۔ اس گھنے جنگل میں بھٹکنے والے شاذ و نادر ہی وہاں سے نکل پاتے ہوں گے ہمارے لیے صرف وہی ایک کچّا راستہ تھا جو ہمیں ہائی وے تک پہنچا سکتا تھا۔

ابھی ہم نے صرف ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں پناہ لینے کے لیے مختلف درختوں اور ٹیلوں کے پیچھے جانا پڑا۔ یعنی اس کچّے راستے کو چھوڑنا پڑا۔ میں نے کہا "کرم داد! صرف اس حالت میں فائر کرنا جب کوئی مسلح دشمن نشانہ بن سکے۔ اس طرح اس کا ہتھیار ہمیں حاصل ہو سکے گا۔"

"میں یہی کروں گا۔ چھ گولیاں میرے ریوالور سے نکلیں گی اور چھ ہتھیار حاصل ہوں گے۔ میں ایک گولی بھی ضائع نہیں کروں گا۔"

ہم پیچھے ہٹتے جا رہے تھے، فائرنگ کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس کچّے راستے سے بہت دور نکل آئے۔ دشمنوں کو معلوم تھا کہ ہمارے پاس صرف ایک ریوالور ہے۔ وہ چاہتے تو ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر اس ایک ریوالور کو بھی چھین سکتے تھے یا ہمیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔

حور بانو کا اندازہ قدم بہ قدم درست ہوتا جا رہا تھا۔ وہ فائرنگ کے ذریعے ہمیں ہانک رہے تھے، کسی مخصوص مقام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے محسوس کیا کہ فائرنگ کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ ہم نے تھوڑی دیر تک انتظار کیا۔ دس منٹ، پندرہ منٹ، بیس منٹ پھر آدھے گھنٹے بعد یقین ہو گیا کہ اب فائرنگ نہیں ہو گی۔ دشمنوں کا کام پورا ہو چکا تھا۔ وہ ہمیں کچّے راستے سے بہت دور ہانک چکے تھے۔

سہ پہر کے تین بجے تھے۔ سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ دھوپ تیز تھی اور ہم پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ پیاس بھی لگ رہی تھی۔ صبح ہلکا سا ناشتہ کیا تھا۔ بھوک

لگ رہی تھی مگر برداشت کی جاسکتی تھی۔
حور بانو نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مجھے پیاس لگ رہی ہے"
اس پلاسٹک کے کین کو دیکھا گیا۔ اسے کھول کر پہلے سونگھا گیا۔ ریحانہ نے کہا "پٹرول کی بُو نہیں ہے۔ پانی بھی صاف لگتا ہے"
میں نے اس پانی سے اپنی انگلی کو بھگوتے ہوئے کہا "میں ذرا چکھ کر دیکھتا ہوں"
چکھنے سے پہلے ہی حور بانو نے میرے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ انکار میں سر ہلا کر بولی "اس میں زہر بھی ہو سکتا ہے یا کوئی ایسی دوائی ہو سکتی ہے جسے پینے کے بعد ہم اعصابی طور پر کمزور ہو جائیں یا بے ہوش ہو جائیں"
میں نے کہا "تمھیں پیاس لگ رہی ہے۔ اسے آزمانا تو ہوگا۔ لہٰذا میں ہی آزماتا ہوں"
میں نے پھر انگلی کو اپنے منہ کی طرف لے جانا چاہا مگر میرا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔ اس نے مجھ سے پہلے میری انگلی کو اپنی طرف بڑھایا اور اسے منہ میں رکھ لیا۔
اسے وفا کی ادا کہتے ہیں۔ اس پانی میں زہر یا مضر دوا تھی یا نہ تھی لیکن اس نے مجھے کوئی خطرہ مول لینے کا موقع نہیں دیا۔ اس سے پہلے ہی وہ اسے اپنے ہونٹوں تک لے آئی۔
وہ میری کلمے کی انگلی تھی یا زہر میں بجھی ہوئی موت؟ میں اس کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس سے پتا چل سکتا تھا کہ وہ اپنے اندر کوئی زہریلی چیز محسوس کر رہی ہے یا نہیں؟ میں اس کی سوچ میں پہنچا تو اس کا دل بے اختیار دھڑک رہا تھا۔ پانی میں زہر نہیں تھا۔ انگلی زہرِ عشق بن گئی تھی۔ اسی لیے دل بے اختیار دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا کہ وہ بے خیالی میں ایک انگلی کے بہانے مجھے اپنی ذات کی چار دیواری میں لے آئی ہے۔
اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے اسے پانی پلایا۔ پھر ہم نے سمت کا تعین کیا اور اُدھر چل پڑے۔ خیال تھا اگر سیدھے چلتے رہیں گے تو شاید اندھیرا ہونے سے پہلے ہائی وے تک پہنچ جائیں گے۔
ریحانہ اور کرم داد جان بوجھ کر آگے چل رہے تھے تاکہ حور بانو میرے ساتھ پیچھے رہے۔ محبت کو جتنا پیچھے چھوڑو، اتنا ہی آگے بڑھتی ہے۔ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تم مجھے چاہنے لگی ہو"
وہ سر جھکائے خاموشی سے چل رہی تھی۔ "حور بانو! اس سے پہلے کہ تم میری چاہت میں بہت آگے نکل جاؤ، میں تمھیں اپنے متعلق بتا دینا چاہتا ہوں۔ تمھیں اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ مجبوری یہ ہے کہ میں کسی ایک ملک میں نہیں ٹھہرتا۔ وقت کی طرح گزرتا جاتا ہوں۔ مجھ میں اور وقت میں اتنا سا فرق ہے کہ وہ پلٹ کر نہیں آتا اور میں پلٹ کر اپنی محبتوں کی طرف جاتا رہتا ہوں"
حور بانو کچھ نہیں بول رہی تھی لیکن اس کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ مایوس ہو گئی تھی۔ اندر سے نڈھال ہو چلی تھی۔ اب تک میرے ساتھ نہ جانے خیالوں میں کہاں کہاں پرواز کرتی رہی تھی۔ جیسے اس کے پر کٹ گئے تھے اور وہ زمین بوس ہو رہی تھی مگر چل رہی تھی۔
مجھے افسوس ہو رہا تھا مگر میں اتنی حسین، ذہین اور جست کرنے والی لڑکی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے دل میں میری محبت جڑیں پکڑ لیتی، میں نے ابتدائی مرحلے پر ہی اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے اور کسی اچھے ہم مزاج جیون ساتھی کا انتخاب کرے۔
جنگل کی زمین کہیں پتھریلی تھی اور کہیں سرسبز و شاداب۔ دور دور تک [illegible] گھاس بچھی ہوئی نظر آتی تھی۔ سورج [illegible] افق تک پہنچا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا ہونے والا تھا۔
اب کئی طرح کے جانور نظر آ رہے تھے۔ درختوں پر بندر اچھل کود رہے تھے۔ ہم نے ہرن بھی دیکھے، وہ نظر آتے تھے پھر قلانچیں بھرتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ میں نے کہا "یہ جانوروں کی فطرت ہے کہ اندھیرا ہونے سے پہلے اپنی پناہ گاہوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ مگر ہم انسان اپنی پناہ گاہوں سے دور بھٹک رہے ہیں"
ریحانہ نے کہا "میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ جنگل میں رات کیسے گزرے گی"
کرم داد نے کہا "تم نہیں گزارنا چاہو گی، تب بھی گزرے گی۔ صبح معلوم ہوگا کہ رات گزار دی"
یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ ریحانہ میٹھی ناراضگی سے بولی "میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے جنگل میں نہیں، کسی خیالی جنت میں پہنچ گئے ہو"
"جہاں محبت کرنے والی عورت ہو، وہیں جنت آباد ہو جاتی ہے"
اس کی بات پر میں نے حور بانو کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی فوراً منہ پھیر کر ریحانہ کے

پاس چلی گئی۔ کرم داد نے کہا "ہمیں یہیں رات گزارنا چاہیے"
وہ کہتے کہتے [illegible] چونک کر ایک طرف دیکھا۔ بہت دور ایک بھیڑیا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نوکیلے دانت دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ اس جنگل میں بھیڑیے جیسے دوسرے خونخوار جانور بھی پائے جاتے تھے۔ اب رات ہونے والی تھی۔ پتا نہیں کتنے خونخوار درندوں نے ہم انسانوں کی بُو سونگھ لی ہوگی۔
ریحانہ نے کہا "ہم یہاں محفوظ نہیں رہ سکیں گے"
کرم داد نے کلہاڑی سنبھالتے ہوئے کہا "ہم کہیں بھی محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ حفاظتی تدابیر کرنا ہوں گی۔ چلو بابر، ہم لکڑیاں کاٹیں۔ رات بھر لکڑیاں جلتی رہیں گی، آگ روشن رہے گی تو درندے ہم سے دور رہیں گے"
میں زندگی میں پہلی بار لکڑہارا بن گیا۔ ہم نے ایک گھنٹے تک مسلسل محنت کی۔ کلہاڑیاں چلاتے رہے۔ جس کے نتیجے میں اتنی لکڑیاں جمع کر لیں جو رات بھر جلنے کے لیے کافی تھیں۔ اس دوران گیدڑ بڑی بھیانک آواز میں بولتے رہے۔ ان کی آوازیں دور تک گونجتی رہیں۔
رات ہو چکی تھی لیکن آسمان پر وہی چاند مسکرا رہا تھا جو سمندر کے ساحل پر حور بانو سے پہلی ملاقات کے وقت مسکرا رہا تھا۔ اس گھنے اور بھیانک جنگل میں قدرت کی طرف سے ایسی روشنی مل چکی تھی جسے دشمن [illegible] بجھا نہیں سکتے تھے۔
ہم نے لکڑیوں کے ڈھیر میں سے چند لکڑیاں اٹھا کر ایک کھلی جگہ پر رکھیں۔ کرم داد نے انھیں لائٹر سے سلگایا اور تھوڑی دیر میں آگ نے لکڑیوں کو پکڑ لیا۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ جنگلی درندوں سے محفوظ رہنے کی تدبیر ہو چکی تھی۔۔۔
لیکن اب بھوک سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ یوں تو ہم اب بھی برداشت کر سکتے تھے لیکن جنگل میں اتنی دور تک چلتے رہے تھے۔ ذہنی تھکن بھی تھی۔ بھوک کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، کچھ کھانے کو مل ہی جائے۔
ہم آگ سے ذرا دور بیٹھ گئے تھے۔ سب چپ چپ سے تھے۔ میں نے پوچھا "بھئی، یہ خاموشی کس لیے؟ کیا بھوک ستا رہی ہے؟"
ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا "ہم نے ٹی ٹی سینٹر میں جہاں ہر طرح کی ٹریننگ حاصل کی ہے، وہاں بھوکے پیاسے رہنا بھی سیکھا ہے"
میں نے حور بانو کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "میں تو بنگال میں پیدا ہوئی ہوں اور بنگال ہمیشہ سے بھوکا رہا ہے"
کرم داد نے کہا "اور بابر، ہم تو مرد ہیں۔ مرد اپنی عورتوں کو پہلے کھلاتے ہیں پھر خود کھاتے ہیں۔ کیا خیال ہے شکار کی تلاش میں نکلا جائے"
ریحانہ نے آنکھیں دکھاتے ہوئے پوچھا "کیا ہمیں چھوڑ کر جاؤ گے؟"
"بھئی ساتھ ہی چلیں گے۔ ذرا دور ادھر اُدھر بھٹکتے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی حلال جانور ہاتھ لگ جائے"
ریحانہ نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر بڑا سا چاقو نکالا پھر کہا "حلال تو چاقو سے ہی کیا جاتا ہے"
ویسے ہمیں شکار کی تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم تو جنگل میں ہی تھے اور ہمارے آس پاس، دور دور تک کتنے ہی جانور گزرتے نظر آتے تھے۔ وہ آگ کی وجہ سے قریب نہیں آ رہے تھے۔ دور ہی رہ کر ہمیں حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیں بھی حسرت تھی کہ کوئی حلال جانور نظر آ جائے۔
سچ ہے، بڑا ایمان افروز حقیقت ہے کہ محنت اور کوشش کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جنگل میں بھی رزق پہنچاتا ہے۔ ایک ہرن شامت کا مارا کہیں سے آ گیا۔ وہ قریب آ گیا تو پھر کرم داد کے نشانے سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے نشانہ لے کر گولی داغ دی۔ جنگل کے سناٹے میں دور تک فائر کی آواز گونجتی چلی گئی۔ کتنے ہی پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے درختوں سے اڑے اور دیر تک شور مچاتے ہوئے اڑتے رہے۔ جو جانور دور کھڑے ہوئے تھے، وہ بدک کر بھاگ گئے۔
ہم نے فوراً ہی جلتی ہوئی لکڑیاں ایک ایک ہاتھ میں لیں اور دوڑتے ہوئے ہرن کے پاس پہنچے۔ کرم داد نے اس کی ٹانگ پر گولی ماری تھی تاکہ وہ بھاگ نہ سکے اور گولی کھانے کے بعد بھی زندہ رہے اور ہم اسے ذبح کر سکیں۔
ہمارے ساتھ ریحانہ اور حور بانو بھی چلی آئی تھیں۔ بھلا وہ جنگل میں ہمارے پیچھے تنہا کیسے رہ سکتی تھیں۔ میں نے ہرن کے پاس پہنچ کر فوراً بسم اللہ پڑھتے ہوئے اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔ اس کے بعد ہم اسے اٹھا کر آگ کے پاس لے آئے۔ جہاں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہم نے آگ کو اور زیادہ روشن کیا۔ ایک درخت کی نیچی شاخ پر رسی ڈال کر اس رسی کے ذریعے ہرن کو لٹکایا پھر اس کی کھال اتارنے لگے۔ مہماتی زندگی میں آدمی کو شکاری بھی بننا پڑتا ہے اور قصائی بھی۔ اگر ہمارے ساتھ عورتیں

نہ ہوتیں تو ہم باورچی بھی بن جاتے۔

گوشت بھون کر کھانے کے لیے نہ تیل گھی، مسالہ تھا اور نہ ہی نمک تھا۔ جو بھی میسر آیا، اسی پر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ گوشت کو بھون کر پیٹ بھرنے کی حد تک کھایا۔ کھانے کے بعد آرام سے لیٹنا لازمی تھا کیونکہ ہم دن بھر کے تھکے ہوئے تھے، ہری بھری گھاس کا بستر تھا اور ہمارے پاس بچھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ویسے تھکن سے چُور ہو کر آرام کرنا اور بات تھی لیکن اس بھیانک جنگل میں کسی کو نیند نہیں آسکتی تھی۔

کرم داد نے کہا "نیند آئے یا نہ آئے، سونے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم نیند پوری نہیں کریں گے تو کل اپنا راستہ تلاش نہیں کر سکیں گے۔ ہو سکتا ہے، دشمنوں کا سامنا ہو، ایسی صورت میں ہم تازہ دم نہیں رہیں گے۔ بے خوابی کے باعث دماغ بوجھل ہوگا تو دشمن ہم پر غالب آجائیں گے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا "دشمنوں کی چال یہی ہے، اسی لیے انھوں نے ہمارا تعاقب نہیں کیا ہے۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہے تاکہ ہم بھٹکتے رہیں، پریشان ہوتے رہیں۔ بھوکے بھی رہیں، پیاسے بھی رہیں اور رات بھر جاگتے رہیں تاکہ دوسرے دن ہم ان کے سامنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہ رہیں۔"

حور بانو نے مجھ سے کہا "تمھیں اور کرم داد کو لازماً سونا چاہیے۔ میں اور ریحانہ باری باری جاگتی رہیں گی۔ کوئی خطرے کی بات ہوگی تو تمھیں جگا دیں گی۔"

"تم عورتوں کا جاگنا ضروری نہیں ہے۔ میں اور کرم داد باری باری پہرہ دیں گے۔"

کرم داد نے کہا "پہلے تم سو جاؤ، میں جاگتا رہوں گا۔"

"نہیں پہلے تم سو جاؤ۔"

ریحانہ نے کہا "پہلے تم اور پہلے تم میں صبح ہو جائے گی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ایسا کرتے ہیں، ہم سب اپنی اپنی جگہ آرام سے لیٹے رہتے ہیں جس کو نیند آئے گی، وہ سو جائے گا اور دوسرا جاگتا رہے گا۔"

کرم داد یوں بھی لیٹا ہوا تھا۔ ریحانہ اس کے پاؤں دبانے لگی۔ میں لکڑیوں کے ڈھیر سے ٹیک لگائے، پاؤں پھیلائے بیٹھا ہوا تھا۔ حور بانو میرے قدموں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ میں نے انکار میں اپنی ایک انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں حور بانو، تم میرے پاؤں کو ہاتھ نہ لگانا۔ ابھی تمھیں آرام کرنا چاہیے۔ چلو ریحانہ کے پاس جا کر سو جاؤ۔"

اس نے آہستگی سے سر جھکا کر کہا "میرا جی چاہتا ہے، تمھاری خدمت کروں۔"

"پھر کبھی کر لینا۔ ابھی تمھیں آرام کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

میرے منع کرنے کے باوجود وہ میرے جوتے اتارنے لگی۔ میں نے کہا "یہ کیا کر رہی ہو۔ اگر اچانک کوئی افتاد آپڑی تو میں ننگے پاؤں رہ جاؤں گا۔"

وہ خدمت سے باز آنے والی نہیں تھی۔ خدمت کرنے لگی۔ میں اس کی سوچ پڑھ رہا تھا۔ اگرچہ میں نے اپنے متعلق اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔ اسے دکھ بھی پہنچا تھا اور اس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ مجھ سے دور رہنے کی کوشش کرے گی لیکن قدم قدم پر متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اس بار اس نے دل کو سمجھایا تھا کہ میں کوئی محبت کرنے تو نہیں جا رہی ہوں۔ خدمت کرنے جا رہی ہوں اور وہ خدمت کے بہانے قریب آگئی تھی۔

میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ جب وہ میرے پاؤں دبانے لگی تو میں آہستہ آہستہ اس کے دماغ کو ٹریپ کرنے لگا۔ ٹیلی پیتھی کی لوری سنانے لگا۔ وہ پاؤں دابتے دابتے اونگھنے لگتی تھی پھر چونک کر مجھے دیکھتی تھی۔ اس کے بعد اور مستعدی سے پاؤں دابنے لگتی تھی لیکن ایسا کب تک ہو سکتا تھا۔ ٹیلی پیتھی غالب آگئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے میرے قدموں کے پاس آہستگی سے لیٹ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی، شاید تھکن نے اسے بے حال کر دیا ہے اور محبت کا جذبہ اسے قدموں کے پاس لیٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔

اس طرح وہ سو گئی۔ اس کے بعد میں نے کرم داد کو سُلایا۔ ریحانہ نے مسکرا کر کہا "کرم داد نے تمھیں پہلے سونے کے لیے کہا تھا مگر دیکھو، کیسے تھکے ہوئے ہیں، خود سو گئے۔"

"تم بھی سو جاؤ۔ میں آدھی رات کے بعد جگا دوں گا۔"

وہ وہیں لیٹ گئی۔ اس بھیانک جنگل میں فوراً نیند نہیں آسکتی تھی۔ آخر دل میں دہشت تھی کہ پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔ میں نے اسے بھی ٹیلی پیتھی کی لوری سنا کر سُلا دیا۔

اب وہ تینوں سو رہے تھے اور میں جاگ رہا تھا۔ آخر ٹیلی پیتھی کا اتنا فائدہ تو ہونا چاہیے کہ دوستوں کو آرام پہنچے۔ میں نے کرم داد کے پاس سے ریوالور لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ لکڑیاں جل رہی تھیں۔ میں نے آگ میں کچھ اور لکڑیاں ڈال کر شعلے بھڑکا دیے۔ میں وقت گزارنے کے لیے کبھی سونے والوں کے چاروں طرف گھومتا تھا، کبھی دور دور تک دیکھتا تھا اور کبھی ایک جگہ آکر بیٹھ جاتا تھا مگر محتاط رہتا تھا۔ اگر سامنے دیکھتا تھا تو کان پیچھے ہونے والی آہٹوں پر لگے رہتے تھے۔ کبھی جانوروں کے چلنے سے پتے چٹختے تھے، کبھی پرندے بولتے تھے، کبھی ہوائیں اتنی زور سے چلتیں کہ درخت بھی بولتے ہوئے سے سنائی دیتے تھے۔

پھر وہ سچ مچ جیسے انسانی آواز میں بولنے لگے۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی تیز ہوائیں کسی کی آواز مجھ تک پہنچا رہی تھیں۔ کوئی دور، بہت دور سے بول رہا تھا "بابر!"

اور بابر کہنے کا انداز ایسا تھا کہ پہلے با کو بہت کھینچ کر ادا کرتا تھا اور پھر بر کہتا تھا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوہِ ندا سے آرہی ہو۔ "بابر! بابر! تم جاگ رہے ہو۔ تمھارے ساتھی سو چکے ہیں۔ تمھیں بھی سو جانا چاہیے۔"

میں چاروں طرف گھوم گھوم کر آواز کی سمت کا تعین کرنے لگا مگر آواز یوں آرہی تھی جیسے جنگل بول رہا ہو اور جنگل چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ دشمن دہشت زدہ کرنا چاہتے ہیں، اگر عورتیں جاگتی رہتیں تو یہی سمجھتیں کہ جنگل کے بھوت بول رہے ہیں اور اگر جنگل کے بھوت بولتے تو وہ مجھے بابر نہیں، میرے اصلی نام فرہاد سے مخاطب کرتے کیونکہ بھوت جب بابر کا نام جان سکتے ہیں تو بابر کے اندر چھپے ہوئے فرہاد کو بھی مخاطب کر سکتے ہیں۔

میں بھوتوں کے فریب میں نہیں آسکتا تھا۔ کوہِ ندا سے آواز دینے والے کے فرشتے بھی یہ نہیں جان سکتے تھے کہ جسے ٹریپ کرنا چاہتے ہیں، دہشت زدہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ٹیلی پیتھی جانتا ہے اور اس کی کھوپڑی کو بارود کے دھماکے کی طرح اڑا سکتا ہے۔

میں نے ایک بار اور گھوم گھوم کر دیکھا۔ اس آواز کو اچھی طرح سنا۔ اس کے لہجے کو اپنی گرفت میں لیا پھر اس کی کھوپڑی میں پہنچ گیا۔

کیا شاندار کھوپڑی تھی۔ اس کی پیشانی پر دو سینگ نکلے ہوئے تھے۔ انسان کے سر پر سینگ نہیں ہوتے لیکن اس نے ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لیے جو وِگ پہنی تھی، اسے خاص طور پر اسی طرح بنایا گیا تھا کہ دو طرف دو سینگ [illegible] گئے تھے۔ چہرے پر کالک ملی گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سفید رنگ کے حلقے بنائے گئے تھے تاکہ رات کو وہ بڑی بڑی اور ڈراؤنی آنکھیں نظر آتی رہیں۔ وہ تعداد میں چھ تھے اور سب کے سب گھوڑوں پر سوار تھے اور سب کا حلیہ ایک جیسا تھا۔ جیسے وہ کسی جنگلی قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں اور درندوں سے زیادہ درندے ہوں۔

بیشک وہ سفاک درندے تھے۔ انھوں نے جو جوتے پہن رکھے تھے، ان کے آگے کیلیں نکلی ہوئی تھیں۔ انھیں حکم دیا گیا تھا، جب رات ہو جائے تو ہم چاروں کو ہانک کر اس طرح لایا جائے کہ وہ چھ سوار گھوڑوں پر رہیں اور اپنے جوتوں سے ہمیں ٹھوکریں مارتے رہیں، ان کی کیلیں ہمارے جسموں سے چبھتی رہیں اور ہم ان کے آگے آگے بھاگتے رہیں۔

جس کی کھوپڑی میں میں پہنچ چکا تھا، اس نے آنکھوں سے دوربین لگائی، مجھے دیکھا پھر بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ کمبخت ابھی تک تنہا جاگ رہا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو جگانا نہیں چاہتا۔ کیا یہ ہماری آواز سے دہشت زدہ نہیں ہے۔"

دوسرے نے کہا "یہ سب ٹی ٹی سینٹر کے تربیت یافتہ ہیں۔ ہمارے طلسماتی رعب میں نہیں آئیں گے۔"

مجھے آواز دینے والے نے ایک بار پھر میگافون کو اپنے منہ تک لا کر مجھے مخاطب کیا "اب ہم آرہے ہیں، چاہو تو اپنے ساتھیوں کو جگا دو تاکہ وہ نیند میں نہ مارے جائیں۔"

یہ کہنے کے بعد اس نے میگافون کے سوئچ کو آف کیا اور اسے گھوڑے کی زین سے ایک طرف لٹکا دیا پھر زین کے ایک ہینگر سے اپنی رائفل نکالتے ہوئے کہا "اب ہمیں چلنا چاہیے۔ وہ ایسے نہیں جگائے گا۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر ان سونے والوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔"

یہ کہتے ہی انھوں نے اپنے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ پھر رات کے سناٹے میں ٹاپیں گونجنے لگیں۔ ان حالات میں میرے تینوں ساتھیوں کو بیدار ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ گہری نیند میں تھے۔

ایسی نیند جنگل میں کبھی نہیں آسکتی جبکہ خطرہ بھی درپیش ہو اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین بھی دہل رہی ہو لیکن کیا کیا جائے، ٹیلی پیتھی کے ذریعے لائی جانے والی نیند ایسی ہی ہوتی ہے۔ میں نے ان کے دماغوں کو ہدایت دی تھی کہ جب تک میری سوچ کی مخصوص لہر ان کے دماغ تک نہ پہنچے، اس وقت تک وہ سوتے رہیں، سوتے ہی رہیں۔ چاہے قیامت گزر جائے۔

وہ گھڑ سوار آخر ہمارے قریب آپہنچے۔ آگ روشن تھی، شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں نے اس کی روشنی میں دیکھا، وہ سب بڑے ہی بھیانک لگ رہے تھے۔ ان کے سروں پر سینگ ابھرے ہوئے تھے۔ اگر ریحانہ اور حور بانو جاگتی ہوتیں تو ہزار حوصلہ مند ہونے کے باوجود دہشت زدہ

ہو جاتیں۔ وہ گھڑ سوار ہم سے ذرا فاصلہ رکھ کر چاروں طرف گھوم رہے تھے، گھوڑوں پر فاتحانہ شان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں اور وہ گھور گھور کر مجھے دیکھتے جا رہے تھے۔ میں بھی چاروں طرف گھوم گھوم کر انھیں دیکھ رہا تھا پھر وہ ہمارے چاروں طرف پھیل کر رک گئے۔

میں نے مسکرا کر کہا "اب سے پہلے میں نے آپ حضرات کو فلموں میں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار زندگی میں دیکھ رہا ہوں۔"

ایک نے اپنی رائفل سیدھی کر کے میرا نشانہ لیا۔ میں جانتا تھا، وہ مجھے یا میرے ساتھیوں کو نہیں ماریں گے کیونکہ ہمیں زندہ گرفتار کر کے لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ ہاں اتنی اجازت دی گئی تھی کہ وہ ہمیں اپنے جوتوں کی کیلوں سے زخمی کرتے رہیں۔

میں نے رائفل کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "میں مرنے سے پہلے آپ سب کا تعارف چاہتا ہوں۔"

"موت اپنا تعارف خود ہوتی ہے۔"

یہ تیسرا شخص تھا جس کی میں نے آواز سنی تھی۔ میں نے چوتھے کی طرف گھوم کر کہا "بھئی، تم ہی اپنا نام بتا دو۔"

اس نے گرج کر کہا "بکواس مت کرو۔ اگر تم انھیں نہیں جگاؤ گے تو ہم گولی مار دیں گے۔"

اس نے گولی مارنے کے لیے رائفل سیدھی کی۔ میں نے اس کی رائفل سے اس گھڑ سوار کا نشانہ لیا جس کی آواز ابھی تک سن نہیں پایا تھا اور اب سننا ضروری بھی نہیں تھا۔ رائفل سیدھی کرنے والے کی انگلی یک بیک ٹرائگیر پر دبی۔ ٹھائیں کی ۔۔۔۔۔ آواز کے ساتھ ہی اس کا ایک ساتھی گھوڑے کی پیٹھ پر سے الٹ کر گرنے والا تھا لیکن رکاب میں پاؤں پھنس گیا تھا اور گھوڑا بدک کر بھاگنے لگا تھا۔

یہ ایسا حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعہ تھا کہ اس کے ساتھی حیران رہ گئے۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ اس نے ایسی حماقت کیوں کی۔ اپنے ہی آدمی کو گولی کیوں ماری۔ اس سے پہلے ہی اس نے ایک اور سوار کو گولی مار دی۔

میں نے دوسرے کے دماغ میں پہنچ کر اس کی سوچ میں کہا "یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔ ہم اپنے ساتھی کو مار تو نہیں سکتے لیکن زخمی کر کے اس کے ہاتھ سے رائفل گرا دینا چاہیے۔"

اس نے میری سوچ پر عمل کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے بازو پر گولی مار دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گولی کھانے والے کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گر پڑی۔ اس نے رکاب میں سے پاؤں نکالتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر سے اچھلتے ہوئے زمین پر پہنچنے کی کوشش کی لیکن وہاں سے لڑھکتا ہوا جلتی ہوئی لکڑیوں کے پاس آ گیا۔ میں نے اسے زخمی حالت میں چھوڑ کر دوسروں کی خبر لی۔ اب وہاں یہی ہو رہا تھا کہ جس کے دماغ میں پہنچتا تھا، وہ اپنے دوسرے ساتھی کا نشانہ لیتا تھا اور اسے گولی مار دیتا تھا۔ صرف پندرہ منٹ کے اندر چار گھڑ سوار مارے گئے۔ ایک زخمی ہو کر وہیں جلتی ہوئی لکڑیوں کے پاس پڑا کراہتا رہا اور چھٹا سوار جو میگا فون سے مجھے مخاطب کرتا رہا تھا، وہ بھاگنے کی سوچ رہا تھا لیکن بھاگنے سے پہلے مجھے گولی مارنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "کیوں حماقت کرتے ہو۔ تمہارے مالکوں نے حکم دیا ہے کہ ہمیں زندہ گرفتار کر کے لایا جائے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے اسی طرح معلوم ہوا جس طرح تمہارے ساتھیوں کی موت کا علم ہو گیا تھا اور یہ بھی علم ہے کہ چند منٹ کے بعد تم اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر کر ۔۔۔۔۔ رکاب کے ذریعے لٹکتے ہوئے یہاں سے جاؤ گے۔"

اس نے تھوک نگل کر کہا "نن نہیں۔۔ تمھاری یہ پیشگوئی بھی درست ہو سکتی ہے۔ تم یقیناً کوئی جادوگر ہو۔ تم نے کوئی عمل کیا ہے۔ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو۔ رائفل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے گولی مارو۔"

اس نے میرا نشانہ لیا، ٹرائگیر پر انگلی دبائی لیکن گولی اس کے زخمی ساتھی کو جا کر لگی۔ میں نے کہا "افسوس، تمہارے مالکان اتنے احمق ہیں، ایسے اناڑی رائفل چلانے والوں کو بھیجا ہے جو اپنے ہی ساتھیوں کو نشانہ بنا دیتے ہیں۔ چلو ایک بار پھر کوشش کرو۔"

اب وہ بہت ہی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے کیا مارتا۔ فوراً ہی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں سے بھاگنے لگا۔ میں نے آواز دی "ارے بھائی! کیوں تکلیف کر رہے ہو۔ ابھی واپس آ جاؤ گے۔"

لیکن وہ بھاگتا چلا گیا۔ جب وہ تھوڑی دور پہنچ گیا تو میں نے اس کی کھوپڑی پر قبضہ جمایا۔ اس نے گھوڑے کو لگام کھینچ کر روکا پھر واپس موڑ دیا۔ اب وہ تیزی سے میری طرف چلا آ رہا تھا۔ جب قریب آنے لگا تو میں نے اس کے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس نے چونک کر اپنے آپ کو دیکھا۔ گھوڑے کی پیٹھ سے گرتے گرتے بچا۔ پھر اس نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکا۔ میری طرف دہشت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ تم واپس کیوں آ گئے؟ چلو کوئی بات نہیں، پھر بھاگنے کی کوشش کرو۔"

اب اس میں کوشش کرنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ بڑی آہستگی سے گھوڑے کی پیٹھ سے اتر گیا۔ رائفل میرے سامنے پھینک دی، گھٹنے ٹیک دیے۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولا "بھائی تم کون ہو؟"

یہ کہتے ہی وہ دھپ سے زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میں نے اس کے سامنے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا "بیوقوف کے بچے سجدہ کرنا ہے تو خدا کے آگے کر۔ ڈرنا ہے تو خدا سے ڈر اور اس عبرتناک بات کو اچھی طرح یاد کر لے کہ آدمی دولت، طاقت اور دنیا بھر کا اسلحہ رکھنے کے باوجود کمزور ہوتا ہے۔ مقدر میں شکست لکھی ہو تو وہ کبھی فاتح نہیں بن سکتا۔"

وہ میری بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ میں نے اس کے دماغ میں چھلانگ لگائی، پتا چلا کہ وہ دہشت کے مارے بیہوش ہو گیا ہے۔ میں اس کے پاس گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔ پھر اسے زمین پر گھسیٹتا ہوا آگ کے قریب لے آیا۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے دیکھتے ہی پھر گڑگڑانے لگا۔ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش رہو زیادہ بکواس کرو گے تو ابھی گنی کا ناچ نچاؤں گا۔"

وہ ایک دم سے چپ ہو گیا۔ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کے سامنے ہی زمین پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر سوال کیا "ہاں، تو تمھیں کس نے بھیجا ہے؟"

وہ ہکلاتے ہوئے بولا "مم ۔۔ ماما نے۔"

"ماما کوئی نام نہیں ہوتا۔ پورا نام بتاؤ۔"

"اس جنگل میں سبھی اسے ماما کہتے ہیں۔ رانگا ماما۔ یہ نام سن کر بڑے بڑے ڈاکو بھی اپنا راستہ بدل کر گزر جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "رانگا ماما کے ساتھ جمال احمد جسکانی ضرور ہو گا۔"

"جسکانی صاحب شہروں اور دیہاتوں کے بے تاج بادشاہ ہیں اور رانگا ماما جنگلوں کا۔ جب ہمارا ماما شہروں اور دیہاتوں میں جاتا ہے تو وہاں جمال احمد جسکانی صاحب کا مہمان ہوتا ہے اور جب جسکانی صاحب جنگل میں آتے ہیں تو وہ رانگا ماما کے مہمان ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔"

"ہم ادھر جنگل میں بھٹکائے گئے ہیں۔ جمال احمد جسکانی نے ضرور رانگا ماما سے کہا ہو گا کہ وہ ہمیں گھیر کر اس کے حوالے کر دے۔"

"جی کچھ ایسی ہی بات ہے۔ جسکانی صاحب کل ادھر آنے والے ہیں۔ یہاں ان کے استقبال کی بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جنگل میں منگل منایا جائے گا۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دو۔ میں ساری زندگی تمھارا غلام بنا رہوں گا۔"

میں نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اگر میں اسے فرمانبردار بنا کر رکھنا چاہتا تو یہ کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن اس پر اعتماد کرنے کے لیے اس کے دماغ کو اچھی طرح پڑھنا لازمی تھا کہ یہ کس حد تک میرا ساتھ دے سکتا ہے اور اس نے کسی مرحلے پر ساتھ چھوڑ دیا جیسا کہ اب ڈاکو رانگا ماما کا ساتھ چھوڑ کر میرا تابعدار بننے پر آمادہ ہو گیا تھا تو ایسے لوگوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جب اعتماد نہیں کروں گا تو بار بار اس کے دماغ میں موجود رہنا ہو گا تاکہ یہ میری ٹیلی پیتھی کا راز فاش نہ کر دے۔

میں نے اس کی سوچ کے ذریعے معلوم کیا "یہاں سے کوئی ایسا راستہ ہے جہاں سے ہم گزر کر کسی ہائی وے تک یا کسی شہر یا گاؤں تک پہنچ سکیں؟"

اس کی سوچ نے بتایا "صرف وہی راستہ ہے جہاں سے ہم آئے ہیں اور وہاں ان کے آدمیوں کا پہرہ ہے۔ وہ ہمیں واپس نہیں جانے دیں گے۔"

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ اسے زندہ چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ اپنوں میں جا کر اپنے اور ساتھیوں کی موت کی ناقابلِ بیان روداد پیش کرے اور رانگا ماما اور جمال احمد جسکانی کا شبہ ٹیلی پیتھی کی طرف جائے۔

میں نے پوچھا "اگر میں تمھیں زندہ چھوڑ دوں تو واپس اپنے آدمیوں میں جا کر کیا بیان دو گے؟"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے قدموں میں رہوں گا۔ واپس نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ یا تو واپس جاؤ گے یا مر جاؤ گے۔"

وہ گڑگڑا کر بولا "نن۔۔۔ نہیں، آپ کا حکم ہے تو واپس جاؤں گا۔"

"میں پوچھ رہا ہوں، وہاں جا کر کیا بیان دو گے؟"

"جناب! اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہم شیطان ہیں اور آپ پر خدا کی رحمت ہے۔ آپ کو غیبی امداد حاصل ہوئی اور ہمارے آدمی ایک دوسرے کو مار کر مر گئے۔"

"اگر ایسا بیان دو گے تو میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں

گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھ سے دور جانے کے بعد محفوظ رہ سکو گے۔ جانتے ہو تم خود ہی مرنا پسند کرو گے۔ حالانکہ موت سے ڈرتے رہو گے۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنا ریوالور اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "اسے اٹھا کر خودکشی کر لو۔ تم نہیں چاہو گے لیکن خودکشی پر آمادہ ہوتے رہو گے۔ دیکھو یہ کیسے ہوتا ہے۔"

اس نے زمین پر اپنے سامنے رکھے ہوئے ریوالور کو دیکھا۔ وہ اسے اٹھانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے اسے اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ حیرانی سے سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ہاتھ ریوالور کی نال کو اس کی کنپٹی کی طرف لے جا رہا تھا اگرچہ وہ انکار کرتا جا رہا تھا۔ دل میں یہ کہتا جا رہا تھا "نہیں، میں خودکشی نہیں کروں گا۔ میں اپنے آپ کو گولی نہیں ماروں گا۔"

ایسا کہنے کے باوجود ریوالور کی نال اس نے اپنی کنپٹی سے لگالی۔ میں نے مسکرا کر کہا "دیکھ رہے ہو! اس وقت تم خودکشی کی پوزیشن میں ہو۔ میں چاہوں تو ابھی گولی چل جائے گی۔"

اس نے ایک ہاتھ انکار میں جلدی جلدی ہلاتے ہوئے کہا "ن... نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے زندہ رہنے دو۔ میں مانتا ہوں تم جب چاہو مجھے مار سکتے ہو۔ چاہے میں قریب رہوں یا دور چلا جاؤں۔"

اس کا ریوالور کنپٹی سے ہٹ گیا۔ آہستہ آہستہ وہ ہاتھ نیچے آ گیا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ مجھے احسانمندی سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "ریوالور میری طرف پھینک دو۔"

اس نے آگے بڑھ کر جھکنے کے انداز میں ریوالور میرے قدموں کے پاس رکھ دیا۔ وہ میرے حکم کے مطابق ریوالور پھینک سکتا تھا لیکن اتنا فرمانبردار اور اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ میری طرف کوئی چیز پھینکنے کو گستاخی سمجھتا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو اور اس پر عمل کرتے رہو کیونکہ اسی میں تمھاری سلامتی ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد تم رانگا ماما یا کسی سے بھی ایسی کوئی بات نہیں کہو گے جس سے میری کسی غیر معمولی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہو۔"

وہ بڑی فرمانبرداری سے ہاں، ہاں کے انداز میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "تمھارا بیان یہ ہوگا کہ جب تم اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ہمیں گھیرنے اور ہمیں لے جانے کے لیے آئے تو یہاں دو عورتیں دیکھیں۔ تمھارے چار ساتھیوں کی نیت بدل گئی۔ وہ کہنے لگے کہ پہلے ان عورتوں کو اپنے خفیہ اڈوں میں لے جائیں گے اس کے بعد ہمیں گھیر کر رانگا ماما کے پاس پہنچائیں گے۔ ساتھیوں کی اس بات پر تم نے اعتراض کیا۔ پہلے تم نے انھیں سمجھایا کہ رانگا ماما کے حکم کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور تمھارے ساتھیوں نے تم پر اور تمھارے ایک ساتھی پر فائر کرنا چاہا۔ تم لوگوں نے جوابی فائرنگ کی جس کے نتیجے میں وہ چاروں ہلاک ہو گئے لیکن اسی فائرنگ کے نتیجے میں تمھارا ساتھ دینے والا بھی مر گیا۔ اس طرح پانچوں آپس میں لڑتے ہوئے مر چکے ہیں اور تم تنہا رانگا ماما کے پاس یہ رپورٹ دینے پہنچے ہو۔"

اس نے خوش ہو کر کہا "یہ بیان تو سراسر میرے حق میں جاتا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں رانگا ماما کا وفادار ہوں۔ آپ نے جیسا سمجھایا ہے، بالکل ویسا ہی بیان دوں گا۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ وہ بھی اٹھ گیا۔ میں نے کہا "تم جا سکتے ہو۔ میں تمھیں چھوڑ رہا ہوں۔"

وہ آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھونا چاہتا تھا، میں ایک طرف ہٹ گیا "خبردار، میرے سامنے نہ جھکنا، نہ میرے قدموں کو ہاتھ لگانا۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس نے اپنی رائفل اٹھائی پھر اپنے گھوڑے کے پاس گیا۔ اس کی لگام کو تھامتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اب بھی اسے یقین نہیں تھا کہ میں اسے زندہ سلامت جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ اس نے پوچھا "جناب! میں جا رہا ہوں۔ اگر رانگا ماما نے حکم دیا کہ مجھے دوسری ٹیم لے کر آپ کے پاس آنا ہوگا اور آپ لوگوں کو گرفتار کرنا ہوگا تب میں کیا کر سکوں گا؟"

"رانگا ماما کے حکم پر عمل کرنا اور یہاں چلے آنا۔ جب تک میرے وفادار رہو گے، میں تمھیں جانی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

اس نے رکاب میں پاؤں ڈالے، گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا پھر ایک ہاتھ اٹھا کر کہا "شکریہ میرے محسن، بہت بہت شکریہ۔ میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کا غلام رہوں گا۔"

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑے نے اچانک رفتار پکڑ لی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہوا سے باتیں کرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اکثر لوگ نظروں سے دور ہوتے ہی نظریں بدل لیتے ہیں۔ میں اس کے دماغ کو پڑھ رہا تھا۔ اب اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ نظریں بدل سکتا۔ وہ اب بھی میرا فرمانبردار تھا۔ دل ہی دل میں عہد کر چکا تھا کہ بظاہر تو رانگا ماما کے حکم کی تعمیل کرتا رہے گا لیکن دل کی گہرائیوں سے میرا تابعدار رہے گا۔

وہ جا چکا تھا۔ رات پھر گہرے سناٹے میں ڈوب چکی تھی۔ ہمارے قریب پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ میرے تینوں ہمسفر بھی بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ٹیلی پیتھی نے انھیں تمام احساسات سے اور دنیا کی تمام آوازوں سے محروم کر دیا تھا۔

ذرا فاصلے پر چار عدد گھوڑے اب بھی موجود تھے۔ ان میں سے صرف ایک سوار کا گھوڑا بدک کر بھاگ گیا تھا۔ وہ چاروں شاید بھوکے تھے۔ اس لیے ہری ہری گھاس پر منہ مار رہے تھے۔ میں نے انھیں باری باری قابو میں کیا پھر انھیں پکڑ کر مختلف درختوں سے باندھ دیا۔

رانگا ماما کا اڈہ وہاں سے تقریباً بیس یا بائیس میل کے فاصلے پر تھا۔ جنگل کے راستے دشوار گزار بھی تھے اور درندوں کا خطرہ بھی تھا۔ آتے وقت اس کے پانچ ساتھی تھے۔ اس لیے اسے درندوں کا خوف نہیں تھا لیکن اب وہ تنہا تھا، میرے حکم کے مطابق عمل کرنے کے لیے اپنے سردار کے پاس جا رہا تھا۔ کم از کم ڈیڑھ یا دو گھنٹے میں وہاں پہنچنے والا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ جنگل کی رات بڑی گہری اور بڑی طویل لگتی ہے۔ میں نے حور بانو کے پاس آ کر اسے دیکھا۔ خوابیدہ حسن میں بلا کی کشش تھی۔

اس لمحے اس کی بند آنکھوں کے پیچھے کوئی سپنا نہیں تھا۔ ریحانہ اور کرم داد بھی کسی سپنے کے بغیر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دماغ پر خوابِ غفلت کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ٹیلی پیتھی کی ہدایت کے مطابق وہ کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ بعض خواب چونکا دیتے ہیں، آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس لیے میں نے ہدایات دیتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ وہ خوابوں سے محروم رہیں۔

مجھے یقین تھا کہ اس لمحے حور بانو اگر خواب دیکھتی تو مجھے دیکھتی۔ کم از کم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جنگل، ویرانی، سناٹا اور تنہائی ہو تو ایسے میں شیطان ضرور ہوتا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کب نہیں ہوتا، کہاں نہیں ہوتا۔ وہ تو انسان کے اندر ضرور ہوتا ہے۔ یہی انسان کی سب سے بڑی عظمت ہے کہ وہ اپنے اندر کے شیطان کو دبائے رکھتا ہے۔ اس سے لڑتا ہے اور اپنی انسانیت کو برقرار رکھتا ہے۔

اسی انسانیت کے ناتے میں نے حور بانو کو اپنے متعلق صاف صاف بتا دیا تھا تاکہ وہ میرے متعلق شدت سے نہ سوچے۔ دلی اور دماغی طور پر میرے زیادہ قریب نہ آئے۔ میں نے اپنے متعلق صاف صاف اس لیے بھی بتا دیا تھا کہ اس جنگل میں جانے کب تک اس کا ہمسفر رہنا ہوگا۔

میں آگ کے پاس سے ہٹ گیا۔ بیشک ہم آگ کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں تو بھی وہاں سے کوئی چنگاری اڑ کر ہم تک پہنچ سکتی ہے، دوری زیادہ بہتر ہے۔ میں نے پانی کا کین اٹھایا پھر کرم داد کے پاس آ کر ایک چلو میں پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ اس کے ساتھ ہی خیال خوانی کے ذریعے اسے بیدار ہونے کا حکم دیا۔ وہ ایکدم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے کہا "تعجب ہے، تم تو گھوڑے بیچ کر سو رہے ہو جبکہ گھوڑے بیچنے والے چار عدد گھوڑے ہمیں دے کر چلے گئے ہیں۔"

وہ ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شدید حیرانی سے کبھی گھوڑوں کو اور کبھی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے میری طرف پلٹ کر پوچھا "یہ کیا؟ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ میری آنکھ کیوں نہ کھلی؟"

"اسی بات پر میں حیران ہوں۔ دیکھ لو، ابھی تک حور بانو اور ریحانہ بھی سو رہی ہیں۔ میں صرف تمھی کو نہیں، انھیں بھی آوازیں دے چکا ہوں۔"

"تم ہمیں جھنجوڑ کر اٹھا تو سکتے تھے۔"

"دشمنوں نے اتنے عجیب تماشے دکھائے ہیں اور مجھے اس طرح گم صم کر رکھا تھا کہ تمھارے پاس آ کر تم لوگوں کو جھنجوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ تماشا ختم ہونے کے بعد میں نے تمھارے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے ہیں۔"

میں نے تھوڑا تھوڑا سا پانی چلو میں لیا۔ باری باری حور بانو اور ریحانہ کے منہ پر چھینٹے مارے اور خیال خوانی کے ذریعے انھیں بھی بیدار کرتا گیا۔ وہ بھی آنکھیں کھولنے کے بعد پہلے تو گم صم سی ہمیں دیکھتی رہیں۔ جب گھوڑوں کے ہنہنانے سے ان کی توجہ اُدھر گئی تو وہ بھی شدید حیرانی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں، طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔ میں نے کہا "یہاں چھ گھڑ سوار آئے تھے۔ انھوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ شاید ہمیں اپنے سردار کے پاس لے جانا چاہتے تھے لیکن ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔"

کرم داد نے پوچھا "کیسا اختلاف؟"

میں نے حور بانو کی طرف دیکھا پھر ریحانہ کو دیکھتے ہوئے کہا "ان میں سے چار گھڑ سواروں کی نیت خراب ہو گئی تھی۔ وہ ریحانہ اور حور بانو کو یہاں سے کسی خفیہ ٹھکانے میں لے جانا چاہتے تھے۔ باقی دو گھڑ سوار ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان میں تکرار ہونے لگی۔ وہ چاروں اسی بات پر بضد تھے کہ پہلے حور بانو اور ریحانہ کو یہاں سے لے جایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار کے وفاداروں میں سے ایک نے غصے میں فائرنگ کی۔ جس کے نتیجے میں ایک ہلاک ہوا۔

کرم داد نے اپنے سر کو شدید جھنجلاہٹ سے ہلاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، میں یقین نہیں کر سکتا۔ میرے قریب فائرنگ ہوئی اور میں سوتا رہا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ لاشیں تم خود ہی دیکھ رہے ہو۔ تم سوتے رہے، فائرنگ صرف ایک بار نہیں ہوئی تھی کئی بار ہوئی، کئی نشانے خطا ہوئے اور کئی نشانوں پر گولی لگی جس کے نتیجے میں پانچ لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ جب چھٹا سوار تنہا رہ گیا تو مجھے ریوالور نکالنے کا حوصلہ ہوا لیکن اس سے پہلے ہی وہ یہاں سے بھاگ گیا۔"

حور بالو نے بھی شدید حیرانی سے پوچھا "یعنی تم نے ایک گولی بھی نہیں چلائی اور یہ پانچوں مر گئے اور چھٹا بھاگ گیا؟"

ریحانہ نے کہا "مجھے بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ یہاں اتنی زبردست فائرنگ ہوئی۔ پانچ لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ چار گھوڑے بندھے ہوئے ہیں اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔"

"ان چاروں کو تو میں نے باندھا ہے۔ یہ آئندہ ہمارے کام آئیں گے۔ البتہ مجھے بھی شدید حیرانی ہے، تم تینوں میں سے کسی ایک کی بھی آنکھ کیوں نہیں کھلی۔"

کرم داد ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں سر کے بالوں کو جکڑ کر کہہ رہا تھا "میں نے اتنی زبردست ٹریننگ حاصل کی ہے۔ ٹی ٹی سینٹر کا انسٹرکٹر کہتا تھا کہ میں بہت محتاط اور چوکس رہنے والا آدمی ہوں، سوتا بھی ہوں تو ایک آنکھ سے، ایک آنکھ سے جاگتا رہتا ہوں لیکن آج کیا ہو گیا؟ میں کیسے سوتا رہ گیا؟"

میں نے ہرن کے بچے ہوئے گوشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے، تم لوگوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا مگر میں نے برائے نام چکھا تھا۔ اسی لیے میں جاگتا رہا ہوں اور تم تینوں سوتے رہے ہو۔ پیٹ بھر کر کھانے کی وجہ سے تھکن کے باعث بھی گہری نیند میں تھے۔"

"جتنی بھی گہری نیند ہو" میں پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود اور تھکن کے باوجود ہلکی سی آہٹ پر چونک جاتا ہوں آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر آج ایسا کیوں نہیں ہوا؟"

"تم تو بار بار ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں نے تمھیں لوری دے کر سلایا ہو اور تمھیں اٹھنے سے منع کر دیا ہو۔"

ریحانہ نے کہا "کرم داد! اپنے دماغ سے جھنجلاہٹ کو دور کرو۔ میں سمجھتی ہوں، تمھیں اس بات کی شرمندگی ہے کہ بابر تنہا دشمنوں کے درمیان جاگتا رہا اور تم گہری نیند سوتے رہے۔"

حور بالو نے کہا "بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ ہمیں اب آئندہ پیش آنے والے حالات کے متعلق سوچنا ہو گا۔ ورنہ جو ایک شخص یہاں سے بھاگ کر گیا ہے، وہ دوبارہ ضرور آئے گا اور اب کے اچھی خاصی فوج کے ساتھ آئے گا کیونکہ پانچ آدمیوں کا انجام اس کے سامنے ہے۔"

کرم داد اور ریحانہ ان لاشوں کے پاس گئے اور پھر ان کی کمر سے اور شانوں سے کارتوس کی پیٹیاں اتارنے لگے۔ ان کی رائفلیں بھی سمیٹ کر لے آئے۔ اس دوران کرم داد نے کہا "ہمیں یہاں سے کچھ دور جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہیے۔ اب کی بار کسی درخت پر مچان بنانا چاہیے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ کافی رات گزر چکی ہے۔ ابھی تو گیارہ بج کر پچیس منٹ ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم درختوں پر مچان بنا کر چھپیں گے لیکن نیچے گھوڑے بندھے رہیں گے۔ ہم انھیں یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

کرم داد نے کہا "ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے، گھوڑے یہیں بندھے رہیں گے۔"

"نہیں کرم داد، یہاں پانچ لاشیں ہیں۔ ہرن کا بچا ہوا گوشت ہے۔ تم دیکھ رہے ہو گیدڑ اور مردار کھانے والے جانور جمع ہوتے جا رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ اگر ہم گھوڑے چھوڑ کر جائیں گے تو خونخوار درندے انھیں بے بس اور بندھا ہوا دیکھ کر ان پر بھی حملہ کریں گے۔"

کرم داد نے قائل ہو کر کہا "ہم گھوڑے ساتھ لے چلیں گے۔ جہاں مچان بنائیں گے، اسی درخت کے نیچے باندھ کر رکھیں گے۔ دشمن ان کے ذریعے ہم تک پہنچ سکتے ہیں تو پہنچنے دو۔ ہمارے پاس اتنے ہتھیار ہیں اور اتنے کارتوس ہیں کہ صبح تک فائرنگ کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔"

یہ طے پانے کے بعد ہم نے تمام سامان سمیٹا۔ ایک ایک رائفل اپنے شانے سے لٹکائی اور کارتوس کی پیٹیاں کمر سے باندھ لیں۔ بیگ پشت پر لاد لیا پھر ایک ایک گھوڑے کی لگام پکڑ کر وہاں سے چل پڑے۔

ہم وہاں سے چند قدم تک گئے تھے کہ اچانک ہی زمین جیسے قدموں کی آوازوں سے دہلنے لگی۔ چاروں طرف سے دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے اپنی اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔ دیکھا تو جانور ان لاشوں کی طرف دوڑتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ ہم فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے تیز قدم اٹھاتے ہوئے جانے لگے۔ کرم داد نے پوچھا "ہم گھوڑوں پر کیوں نہ چلیں؟"

حور بالو نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں نے کبھی گھوڑے کی سواری نہیں کی۔ گر پڑوں گی۔"

ہم تیزی سے چلتے ہوئے، باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ریحانہ نے کہا "ایک گھوڑا خالی رہے گا۔ اس کی لگام تھام لی جائے گی۔ تم بابر کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ نظریں ملتے ہی سر کو جھکا لیا۔ چپ چاپ چلنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ میں کیسے بیٹھوں، اللہ! میں نہیں بیٹھوں گی۔ مجھے شرم آتی ہے۔

میں نے کہا "ریحانہ! تم حور بالو کو اپنے ساتھ بٹھا لو۔"

یہی ہوا۔ ہم چاروں تین گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ریحانہ نے حور بالو کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ دوسرے خالی گھوڑے کی لگام میں نے تھام لی۔ اس لیے ہم چلنے کی تھکن سے بچ گئے گھوڑوں کی رفتار تیز نہیں تھی کیونکہ جنگل کے راستے دشوار گزار تھے۔ حالانکہ چاندنی رات تھی، راستہ صاف نظر آ رہا تھا پھر بھی ہم نے ایک مناسب رفتار قائم رکھی۔ تقریباً دو گھنٹے میں ایک اندازے کے مطابق چھ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔

کرم داد نے ایک جگہ رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے ہی بیٹھے چاروں طرف گھومتے ہوئے بولا۔ "یہ جگہ زیادہ مناسب ہے۔ اگر ہم کسی درخت پر مچان بنا لیں تو دور تک آنے والے دشمنوں کو دیکھ سکتے ہیں۔"

ان چھ گھڑسواروں کے پاس میگافون کے علاوہ ایک دوربین بھی تھی جسے میں نے اپنے گلے سے لٹکا لیا تھا۔ میں نے اس دوربین کو آنکھ سے لگاتے ہوئے چاروں طرف دیکھا پھر ایک سمت رک گیا۔ بہت دور ہلکی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ جیسے کوئی لالٹین یا دیا جل رہا ہو۔ میں نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ کسی کا مکان ہو یا ڈاکوؤں نے اپنی ایک چھوٹی سی چوکی بنا رکھی ہو۔"

کرم داد گھوڑے کو دوڑاتا ہوا میرے پاس آیا پھر مجھ سے دوربین لے کر اسی سمت دیکھنے لگا۔ اس کے بعد بولا "ٹھیک ہے، ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔ کچھ دور جانے کے بعد گھوڑوں سے اتر جائیں گے اور آہستہ آہستہ اس روشنی کی طرف جائیں گے پھر جیسے حالات ہوں گے، ویسا ہی کیا جائے گا۔"

ہم نے ویسا ہی کیا۔ تقریباً اس روشنی سے آدھے فرلانگ کے فاصلے پر رک گئے۔ وہ ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ دوربین کے ذریعے لالٹین کی روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک شخص چارپائی پر لیٹا ہوا تھا، شاید سو رہا تھا۔ اس کی رائفل دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ ہم نے باری باری دوربین لگا کر دیکھا۔ کرم داد نے کہا "میں سونے والے دشمن پر کبھی حملہ نہیں کرتا۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ ایک ہے یا اور بھی کچھ لوگ ہیں جو اندر آرام کر رہے ہیں۔"

"جب انھیں جگانا ہے اور مقابلہ کرنا ہے تو پھر دبے قدموں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم سب اپنے اپنے گھوڑوں پر جائیں گے اور اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔ وہاں جو بھی ہیں، وہ گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر جاگ جائیں گے اور ہمیں للکاریں گے۔ کیا حور بالو نے کبھی رائفل چلائی ہے؟"

"میں نے کالج میں باقاعدہ رائفل شوٹنگ کی تربیت حاصل کی ہے۔"

"ہم جس طرح اس مکان کے چاروں طرف محاذ بنانے والے ہیں، تم اس کے مطابق ریحانہ کے ساتھ سوار ہو کر... اس محاذ پر جاؤ گی جبکہ دو عورتوں کا ایک محاذ پر رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟"

میں نے کہا "دو عورتیں ایک جگہ ہوتی ہیں تو تمام جھگڑے بھول کر باتوں میں لگ جاتی ہیں۔"

ریحانہ نے ہنستے ہوئے کہا "حور بالو! یہ بات نہیں ہے، دراصل میرا ابھی دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا یہ پہلا عملی تجربہ ہے۔ ہم دونوں ایک محاذ پر نہیں رہ سکتیں۔ ایسا کرو، تم بابر کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں کرم داد کے ساتھ رہوں گی۔ اس طرح ہم اس مکان کو آگے اور پیچھے دو طرف سے گھیر لیں گے۔"

حور بالو کو اس تجویز پر عمل کرنا ہی تھا، نہ کرتی تو اور کیا کرتی۔ ریحانہ کے گھوڑے سے اتر کر آہستہ آہستہ آئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "ہمارا کام یہ ہو گا کہ فائرنگ میں کروں گا۔ خالی رائفل تمھیں دیتا جاؤں گا۔ تم رائفل لوڈ کر کے دیتی رہو گی۔"

ہم وہاں سے آگے بڑھے۔ کرم داد اور ریحانہ مکان کے اگلے حصے کی طرف جا رہے تھے اور ہم پچھلے حصے کی طرف۔ پھر اس مکان کے قریب پہنچتے ہی کرم داد نے جنگلیوں کی طرح ایک نعرہ لگایا "اہی۔ ہاہا..."

اس نے ایڑ لگائی۔ اسی طرح چیختا چنگھاڑتا ہوا گھوڑے کو دوڑانے لگا۔ میں نے بھی یہی کیا۔ اس مکان میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ کرم داد نے دو بار فائرنگ کی تھی۔ میں بھی مکان کے پچھلے حصے تک پہنچتے پہنچتے دو چار فائر کر چکا تھا۔ پھر ایک بڑے سے درخت کے پیچھے جا کر رک گیا۔ حور بالو کے ایک ہاتھ کو تھام کر کہا "فوراً نیچے اترو اور درخت کی آڑ میں کھڑی ہو جاؤ۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس کے بعد میں بھی اترا۔ ہم نے اپنے دونوں گھوڑے اسی درخت کے ساتھ باندھ دیے۔ پھر میں نے کہا "اب میرے ساتھ دوڑتی ہوئی اس سامنے والے درخت کی طرف چلو۔"

اس دوران اندر سے ایسی چیخنے کی آوازیں سنائی دیں جس کے متعلق ہم توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں مرد نہیں، عورتیں چیخ رہی تھیں۔ میں نے کرم داد کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا۔ سامنے برآمدے میں جو شخص سویا ہوا تھا، وہ بیدار ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی مگر وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "دیکھو، فائر نہ کرنا۔ یہاں کوئی مقابلہ نہیں کرے گا۔ یہاں عورتیں ہیں۔"

وہ مکان دور سے چھوٹا لگتا تھا مگر قریب جانے پر پتا چلا کہ اچھا خاصا بڑا سا مکان ہے۔ اس میں کئی کمرے ہوں گے۔ کرم داد نے کہا "اگر تم تنہا ہو اور اندر عورتیں ہیں تو ہم گولی نہیں چلائیں گے۔ تم رائفل کو نال سے پکڑ کر اوپر ہاتھ اٹھائے ہوئے ہمارے پاس آجاؤ اور عورتوں کو حکم دو کہ وہ چادر اوڑھ کر مکان سے نکل کر ایک قطار میں کھڑی ہو جائیں۔"

اب اندر کمروں میں بھی روشنی ہو گئی تھی۔ مکان کے پچھلے دروازے کھل رہے تھے۔ میں نے للکار کر کہا "خبردار، یہاں سے کوئی فرار ہونے کی کوشش کرے گا تو گولی مار دوں گا۔"

چند عورتیں دروازے پر نظر آئی تھیں۔ وہ واضح طور سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن لالٹین کی زرد روشنی اور چاندنی میں اتنا سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ عورتیں ہی ہیں۔ وہ میری للکار کو سنتے ہی دروازے پر رک گئی تھیں اور ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر للکار کر کہا "دروازے بند کر دو۔ جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل کرو۔ تم سب سامنے والے دروازے سے باہر نکل سکتی ہو۔"

ایک عورت کچھ دلیر تھی۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ "تم جو کوئی بھی ہو ہمارے لیے تو رحمت کا فرشتہ ہو۔ یہ ڈاکو ہمیں زبردستی پکڑ لائے ہیں۔ اگر تم پولیس والے ہو تو ہماری مدد کرو۔"

میں فوراً ہی اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس کے ذریعے اس مکان کے اندرونی منظر کو دیکھا۔ کچھ عورتیں تھیں اور یا بوالعجبی جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے، وہ بھی تھے یعنی کہ تیسری صنف والے بھی موجود تھے۔ ایک خسرے نے تالی پیٹ کر اس عورت سے کہا "اے کلموہی، بولے جا رہی ہے۔ ٹھائیں سے گولی لگے گی، تجھے نہیں لگے گی، مجھے لگ جائے گی۔ تیرا کیا جائے گا، میں بھری جوانی میں اٹھ جاؤں گی۔"

میں نے اس عورت کے ذریعے معلوم کر لیا۔ مکان میں صرف چار کمرے تھے۔ کسی کمرے میں بھی کوئی مرد چھپا ہوا نہیں تھا حالانکہ وہ عورتیں ان کو بھی مرد کہہ رہی تھیں۔ انھیں کسی حال میں بھی اپنے جیسی عورتیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

میں نے حور بانو سے کہا "اب اپنی رائفل سنبھالو اور چلو۔ وہاں صرف عورتیں ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

ہم نے اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامیں اور مکان کے پچھلے حصے میں پہنچے۔ لکڑی کے ستون سے دونوں گھوڑوں کو باندھنے کے بعد رائفل کے کندے کو دروازے پر مارتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو ہم آگئے ہیں۔"

دروازہ کھول دیا گیا۔ میرے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر اُن عورتوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ہم اندر آئے تو عورتوں اور خسروں کی اچھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ سب ایک کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً پچیس ہوگی۔ ایک خسرا تالی پیٹ کر آگے بڑھا، میرے سامنے آکر میری بلائیں لیں اور کہا "ہائے، کیا بانکا جوان ہے۔ میرا نام بانکی ہے۔"

اس نے ایک ذرا کمر لچکا کر انگڑائی لی۔

انگڑائی لیتے ہی حور بانو میرے سامنے ڈھال بن کر آگئی۔ رائفل تان کر غصے سے بولی "ہم دلیواتوں کو گولی مار دیتے ہیں۔ بتاؤ وہ دو دلیو لانے کون ہیں؟"

خسرا سہم گیا۔ ہائے اللہ کہہ کر اچھلتے ہوئے ذرا پیچھے گیا پھر خسروں کے پیچھے چھپنے لگا۔ ہم ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اگلے دروازے کو کھول کر باہر آئے۔ سامنے پہرہ دینے والے نے اپنی رائفل کرم داد کے سامنے پھینک دی تھی اور اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ میں نے کہا "ہم دیکھ چکے ہیں، اندر کوئی چھپا ہوا نہیں ہے۔ یہاں کچھ اصلی عورتیں ہیں اور کچھ خودکار۔"

کرم داد نے پوچھا "یہ خودکار کیا ہوتی ہیں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی اندر تالیاں پیٹنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی خسرے ایک ساتھ بلند آواز سے لہک لہک کر گانے لگے۔

یہ کیسا کل جُگ ہائے
جنگل میں منگل ہائے
یہ جان ہے اس کی امانت
جو ہم کو بچانے آئے
ہائے ہائے ہائے

کرم داد حیرانی سے دیدے پھیلا کر اپنا سر کھجانے لگا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "ہم سب کو دہشت گردی کی تنظیم میں بڑے بڑے خطرناک دشمنوں سے نمٹنے کے ہزاروں داؤ پیچ سکھائے گئے ہیں۔ ذرا ان خسروں سے نمٹ کر دکھاؤ۔"

ریحانہ نے پوچھا "لیکن ان عورتوں اور خسروں کی بھیڑ کیوں لگائی گئی ہے؟"

پہرہ دینے والے نے کہا "کل رانگا ماما کے ہاں شہر کے بڑے بڑے معزز مہمان آ رہے ہیں۔ ان کا استقبال کرنے، انھیں خوش کرنے کے لیے عورتوں اور خسروں کو بلایا گیا ہے۔"

ایک عورت نے دروازے کے باہر آکر چیختے ہوئے کہا "یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ہمیں بلایا نہیں گیا، زبردستی لایا گیا ہے۔ ہم پر ظلم کیا گیا ہے۔ ہمیں جانوروں کی طرح پانچ میل دور سے ہانکتے ہوئے لایا گیا ہے۔ ان کے آدمی گھوڑوں پر سوار تھے اور ہمیں پیدل چلایا گیا۔"

کرم داد نے رائفل کے کندے سے چوکیدار کو ایک ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے زمین پر گر پڑا۔ "ذلیل آدمی! تم عورتوں کی عزت نہیں کرتے تو ان کی بے عزتی تو نہ کرو۔ انھیں تم نے پیدل چلایا ہے۔ ہم تمھیں گھوڑے کی زین سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے۔ بتاؤ تمھارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا "رات ہو گئی تھی۔ ان عورتوں کو جنگل سے لے کر گزرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ تھکی ہوئی بھی تھیں اور سہمی ہوئی بھی، اس لیے ہم نے یہاں پڑاؤ کیا۔ صبح ہمارے آدمی آئیں گے اور انھیں لے جائیں گے۔"

باری باری عورتیں نکلتی جا رہی تھیں اور اپنا دکھڑا سناتی جا رہی تھیں۔ ان میں تقریباً سبھی شریف گھرانے کی غریب عورتیں تھیں۔ ان علاقوں کے جاگیرداروں، وڈیروں اور بااثر لوگوں نے ان کے والدین کو مجبور کیا تھا، انھیں دھمکیاں دی تھیں کہ اگر وہ اپنی لڑکیوں کو دو دن کے لیے ان کے حوالے نہیں کریں گے تو جبراً اغوا کیا جائے گا۔ پھر اس کے بعد لڑکیوں کی واپسی ممکن نہیں رہے گی۔ اگر وہ اپنی عزت چاہتے ہیں تو چپ چاپ لڑکیوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ وہ امانت کے طور پر لے جائیں گے اور دو دن کے بعد واپس کر دیں گے۔

کتنے ہی غریب والدین نے سوچا کہ لڑکیاں چپ چاپ جائیں گی اور چپ چاپ آئیں گی تو عزت رہ جائے گی۔ انھوں نے لڑکیوں کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ نے انکار کیا تھا جس کے نتیجے میں کسی کے والدین مارے گئے تھے اور کسی کے ہاں سے زبردستی لڑکیاں اٹھائی گئی تھیں۔

وہ چوکیدار ابھی تک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ حور بانو نے آگے بڑھ کر اس کے حلقوم پر اپنا ایک پاؤں رکھ دیا۔ پھر شدید نفرت سے اسے ٹھوکر مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر اپنی رائفل سنبھالتے ہوئے بولی "بابر! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ رائفل شوٹنگ آتی ہے یا نہیں۔ میں اپنا نشانہ دکھانا چاہتی ہوں۔"

چوکیدار تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ پھر گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے معاف کر دو۔ میں تو صرف پہرہ دے رہا تھا۔"

کرم داد نے پوچھا "اگر اس مکان میں تمھاری بیٹی اور بہن کو لایا جاتا تو کیا تم اس وقت بھی اسی طرح پہرہ دیتے اور ڈاکوؤں کو دوسری صبح انھیں یہاں سے لے جانے کی اجازت دیتے؟"

وہ چپ رہ کر تھوک نگلنے لگا۔ حور بانو نے کہا "چلو اٹھو، میں تمھیں یہاں سے بھاگنے کا موقع دیتی ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا تو ہو گیا مگر اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ وہ التجا کر رہا تھا "مجھے معاف کر دو۔ میں یہاں سے جاؤں گا۔ پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی ایسا کام نہیں کروں گا۔"

"موت کے آگے سبھی توبہ کرتے ہیں تاکہ دوسری زندگی مل جائے، اگر تمھارے نصیب میں دوسری زندگی ہوگی تو میرا نشانہ خطا ہوگا اور تم بچ جاؤ گے۔ چلو جاؤ، بھاگنے کا موقع مل رہا ہے بھاگو۔"

وہ پلٹ کر بھاگنا چاہتا تھا، حور بانو نے ڈانٹ کر کہا۔ "رک جاؤ۔ میں نے اس طرح نہیں کہا تھا۔ تم ان عورتوں کو پیدل چلا کر لائے ہو۔ پتا نہیں کتنوں کو گھسیٹا بھی ہوگا۔ لہٰذا اپنے ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک دو اور جانوروں کی طرح رینگتے ہوئے جاؤ۔ تم نے عورتوں کو انسان نہیں سمجھا۔ میں تمھیں کیسے انسان سمجھوں۔"

اس نے بے بسی سے حور بانو کی طرف دیکھا۔ میں نے ڈپٹ کر کہا "تم نے حکم نہیں سنا؟ کیا تم چاہتے ہو، فوراً گولی مار دی جائے، تمھیں بھاگنے کا موقع نہ دیا جائے؟"

اس نے فوراً ہی ہاتھ پاؤں زمین پر ٹیک دیے پھر کسی چوپائے کی طرح دوڑنے لگا۔ وہ تیزی سے دوڑتا جا رہا تھا۔ حور بانو نے زمین پر دونوں گھٹنے ٹیک دیے، رائفل کو کاندھے سے لگایا پھر اس کا نشانہ لینے لگی۔ وہ رینگتے ہوئے چیخ رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا "نہیں نہیں، مجھے گولی نہ مارو، مجھے نہ مارو۔"

وہ کبھی اِدھر بھاگ رہا تھا کبھی اُدھر تاکہ گولی چلے تو اس کا نشانہ نہ بن سکے جیسے سانپ بل کھا کر کبھی دائیں جاتا ہے کبھی بائیں اور اس طرح دور نکلتا جاتا ہے۔ وہ بھی دور نکلتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے کہا "فائر۔"

ٹھائیں سے ایک گولی چلی اور وہ رینگنے والا زمین سے اچھل کر پھر زمین بوس ہو گیا۔ حور بانو نے اٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "کیسا نشانہ ہے؟"

میں نے قریب آکر آہستگی سے کہا۔ "آج تک کسی عورت کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ کسی بھی مرد سے پوچھ لو۔"

اس نے بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے گھور کر دیکھا۔ گھورنے کے انداز میں بڑا پیار تھا۔ چاندنی اس کی جھیل جیسی شفاف آنکھوں میں اتر رہی تھی اور اس کی چمک میرے دل تک پہنچ رہی تھی۔ ہم مکان کے اندر آئے۔ کرم داد نے کہا۔ "آدھی رات باقی ہے۔ دشمن صبح آئیں گے۔ تم تمام عورتیں یہاں آرام کرو۔ کسی بات کی فکر نہ کرو۔ جب تک ہم زندہ ہیں، تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔"

ایک عورت نے کہا۔ "خدا کے لیے ہمیں ان خسروں سے الگ رکھو، ہمیں ایک کمرہ دے دو۔ ہم اسی میں رات گزار لیں گے۔"

ایک خسرے نے آگے بڑھ کر تالی پیٹتے ہوئے کہا۔ "اے ہم کوئی اچھوت ہیں؟ ہم بھی تمھاری جیسی عورتیں ہیں۔ ہماری بھی تو کوئی عزت ہے۔"

کرم داد نے کہا۔ "اپنا منہ کھولو میں دیکھوں گا۔ تمھاری کتنی عزت ہے۔"

اس نے تالی پیٹ کر کہا۔ "لے کیا منہ کھولنے سے عزت نظر آجائے گی؟"

"ہاں، منہ صاف ہو تو دل صاف ہوتا ہے۔ دل صاف ہو تو عزت میلی نہیں ہوتی۔ منہ کھولو۔"

اس نے جیسے ہی منہ کھولا، کرم داد نے رائفل کی نال منہ میں گھسیڑ دی اور سخت لہجے میں بولا۔ "ذرا بھی حرکت نہ کرنا۔ گولی چل جائے گی۔"

اب وہ خسرا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ منہ کے اندر رائفل کی نال گھسی ہوئی تھی۔ دوسرے خسرے بھی سہمے ہوئے تھے۔ کرم داد نے کہا۔ "میں تم سب کو مجبوراً برداشت کر رہا ہوں جب تک تمھاری واپسی کا بندوبست نہ ہو، اپنی بے سری آوازیں نہ سنانا۔ جو میری اجازت کے بغیر منہ کھولے گا، اس کے منہ میں رائفل کی نال اسی طرح گھسیڑ دی جائے گی اور گولی آر پار ہو جائے گی۔"

اتنی سی دھمکی کافی تھی۔ ذرا سی دیر میں تمام خسروں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور دوسرا کمرہ عورتوں کے لیے مخصوص کیا گیا، کرم داد نے کہا۔ "میں سامنے والے کمرے میں رہوں گا اور بابر تم پچھلے کمرے میں رہو تاکہ ہم دونوں طرف نظر رکھ سکیں۔"

میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو نیند آرہی ہے۔"

حور بانو نے کہا۔ "تمھیں ضرور سونا چاہیے۔ ہم نے تو کسی حد تک نیند پوری کر لی ہے۔"

وہ میرے ساتھ پچھلے کمرے میں آئی۔ ہر کمرے میں کئی کئی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر بستر لگے ہوئے تھے۔ اس سے پتا چلتا تھا، ڈاکو جب بھی ادھر سے گزرتے ہیں تو یہاں قیام کرتے ہیں۔ پھر صبح اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ میں تھکے ہوئے انداز میں بستر پر گر پڑا۔ حور بانو نے میرے ہاتھ سے رائفل لیتے ہوئے کہا۔ "آرام سے لیٹ جاؤ۔ آنکھوں کو بند کرو۔ میں تمھیں سلا دوں گی۔"

"کیا لوری سناؤ گی؟"

وہ ہنستے ہوئے میرے سرہانے آگئی۔ وہاں ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھ کر میرے سر کو سہلاتے ہوئے بولی۔ "اس طرح سلاؤں گی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس تابعدار کے دماغ میں پہنچ گیا جو اپنے سردار رانگا ماما کے پاس گیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے یہ اطمینان کیا کہ اس نے میری غیر معمولی صلاحیت کے متعلق کچھ کہا تو نہیں ہے؟

مجھے اطمینان ہو گیا۔ یوں بھی میں اس کے دماغ کو پڑھ کر پہلے ہی مطمئن ہو گیا تھا۔ اس رپورٹ کو سننے کے بعد سردار رانگا ماما نے غصے سے کہا تھا۔ "میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے آدمی کبھی دو حسین عورتوں کی خاطر بنتے ہوئے کام کو بگاڑ دیں گے۔ مجھے افسوس ہے، وہ مر گئے۔ میری حسرت رہ گئی۔ اب انھیں اپنے ہاتھوں سے نہیں مار سکوں گا۔"

پھر اس نے قریب آکر میرے تابعدار سے پوچھا تھا۔ "کیا واقعی وہ عورتیں بے حد حسین ہیں؟"

"جی ہاں، بے حد حسین ہیں۔ ان میں ایک تو ایسی تھی جیسے چاند کے سائے میں چاند سو رہا ہو۔ اس کے حسن کی تعریف نہیں کر سکتا۔ بس یہی کہتا ہوں کہ آسمان چاند سے روشن تھا اور زمین کا وہ ٹکڑا اس کے حسن سے منور تھا۔"

رانگا ماما کے دانت نکل رہے تھے۔ وہ بڑی ہوسناکی سے مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "بولو، بولو، اور آگے بولو۔ میں اس کے متعلق سننا چاہتا ہوں۔"

"اور کیا بول سکتا ہوں۔ ہمارے آدمیوں نے آپس میں لڑنے مرنے کا جو تماشا پیش کیا تھا اس کے بعد میں اس عورت کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ مجھے اپنی جان بچا کر یہاں تک آنا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔"

رانگا ماما نے اپنی سیاہ گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ پھر مونچھوں کو تاؤ دیا۔ اس کے بعد دوسرا ہاتھ میرے تابعدار کے شانے پر مارتے ہوئے کہا۔ "تم پھر جاؤ گے۔ اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ جوانوں کو لے جاؤ مگر اس حسینہ کو پیدل چلا کر نہ لانا۔ اس کے پاؤں میلے ہو جائیں گے۔"

میرے تابعدار سے سردار رانگا ماما کی اس گفتگو کے وقت میں موجود نہیں تھا۔ اب تابعدار خاصی تعداد میں جوانوں کو لے کر وہاں سے روانہ ہونے والا تھا۔ رانگا ماما نے حکم دیا تھا کہ میرا تابعدار پہلے ان نوجوانوں کے ساتھ ہمارے پاس پہنچے اور اس حسینہ یعنی حور بانو کو گھوڑے پر بٹھا کر آرام سے اس کے پاس روانہ کر دے۔ پھر باقی نوجوانوں کے ساتھ وہ اس مکان کی طرف جائے جہاں مختلف علاقوں سے نوجوان لڑکیاں اور خسرے لا کر جمع کیے گئے تھے۔ ہم سب کے لیے حکم تھا کہ ہمیں پیدل چلایا جائے اور گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار ہو کر جوتے کی نوک سے مارتے ہوئے لایا جائے۔

میرے تابعدار کا سفر طویل تھا۔ یعنی وہ رانگا ماما کے خفیہ اڈے سے تقریباً بیس جوانوں کے ساتھ چلا تھا۔ اسے پہلے ادھر جانا تھا جدھر ہم نے آگ روشن کر کے رات ساڑھے گیارہ بجے تک قیام کیا تھا۔ پھر وہاں سے اس مکان کی طرف آنا تھا۔ اس کے خیالات سے پتا چلا کہ یہاں پہنچتے پہنچتے صبح ہو جائے گی۔

میں نے خیال خوانی ختم کر دی۔ ہلکی ہلکی سی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ حور بانو میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے بڑے ہی میٹھے سروں میں گنگنا رہی تھی۔ ایسے میٹھے انداز میں سلایا جائے تو کون نہیں سوئے گا لیکن میرا ذہن کسی بھی لوری کا یا گنگناہٹ کا یا میٹھے سروں کا محتاج نہیں ہے۔ میری خیال خوانی مجھے پلک جھپکتے میں سلا دیتی ہے اور پتہ بھی ہلکے سے کھڑکے تو جگا دیتی ہے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں سمجھی اتنی دیر سے سو رہے ہو۔"

"مجھے یوں نیند نہیں آئے گی۔ پہلے تم سو جاؤ۔"

جب تک میں جاگتا رہتا وہ کبھی نہ سوتی۔ میرے سامنے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا، وہ میرے بعد سوئے گی۔

وہ انکار کرنا چاہتی تھی، میں نے اس کے دماغ پر قابض ہو کر اسے جماہی لینے پر مجبور کیا۔ اس کے دماغ سے تمام خدشات، اجنبی جگہ کے اندیشے اور سوچ و فکر نکال دیے۔ جب کسی کے دماغ میں سوچ و فکر نہ ہو، اندیشے نہ ہوں پھر بھلا وہ ہلکا پھلکا کیوں نہیں ہو گا۔ اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ انکار کرنے کے بجائے بولی۔ "میں سونا تو نہیں چاہتی تھی مگر نہ جانے کیوں اچانک نیند آنے لگی ہے۔"

"اچانک نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پہلے تمھاری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے جگا دیا تھا۔ اب آرام سے سو جاؤ۔"

اس نے شرماتے اور جھجکتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں نے دوسری طرف کروٹ بدل کر کہا۔ "میں تمھیں نہیں دیکھوں گا۔ آرام سے، اطمینان سے، مجھ پر اعتماد کر کے سو سکتی ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اعتماد تو میں بہت کرتی ہوں۔ اتنا کہ شاید آج تک زندگی میں کسی پر نہ کیا ہو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی، بستر پر لیٹنا نہیں چاہتی تھی لیکن نیند پریشان کر رہی تھی اور میری ٹیلی پیتھی اس کے ذہن کو اس طرح تھپک رہی تھی کہ احساس نہیں ہو رہا تھا اور وہ نیند کی وادیوں میں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے بھی مجھے دیکھا کہ کہیں میں کروٹ لے کر اس کی طرف دیکھ تو نہیں رہا ہوں۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔ میں نے اسے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں ڈوب چکی تھی۔

ایک تو میں نے اسے اپنے متعلق سچ سچ بتا دیا تھا کہ نہ تو شادی کرنے والوں میں سے ہوں، نہ گھر گرہستی سے دلچسپی رکھنے والوں میں۔ میں ایک سیلانی آدمی ہوں اور وقت کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وقت کبھی واپس نہیں آتا، میں کبھی کبھی چاہنے والوں کی طرف لوٹ آتا ہوں۔

دوسری بار میں نے اپنے جاگنے کے دوران اسے سونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میری ذات سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتی تھی کہ میں اس کی تعریفیں کرتا ہوں۔ اسے چاہتا بھی ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی عزت بھی کرتا ہوں۔

میں نے ایک بار کمرے پر نظر ڈالی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے دماغ کو ہدایت دی کہ رات کے تین بجے تک گہری نیند سوتا رہوں۔ اگر اس دوران کوئی آہٹ ہو۔ کوئی غیر معمولی بات ہو تو آنکھ فوراً کھل جائے۔

یہ ہدایت دے کر میں سو گیا۔ میں اپنی داستان میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دماغ کو ہدایت دینا، اس کے مطابق سونا، اس کے مطابق جاگنا، یہ سب کچھ ٹیلی پیتھی کا کمال نہیں ہے۔ ایک عام آدمی بھی مشق کر کے ایسا کر سکتا ہے لیکن مشق کرنے کے لیے لازمی ہے کہ اپنے ذہن کو ایک مرکز پر لائے۔ تمام خیالات دل سے نکال کر صرف ایک بات کو ذہن میں رکھے کہ وہ سونے جا رہا ہے اور اپنے دماغ

کو جو ہدایت دے رہا ہے اسی ہدایت کے مطابق وہ سوئے گا اور اسی ہدایت کے مطابق جاگے گا۔ نیند کے دوران کوئی غیر معمولی بات ہوگی یا آہٹ سنائی دے گی تو آنکھ فوراً کھل جائے گی۔

دنیا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو ٹیلی پیتھی سے ذرا بھی واقفیت نہیں رکھتے لیکن اپنے وقت کے ایسے پابند ہوتے ہیں کہ رات کو سوتے وقت جو ارادہ کر لیتے ہیں اسی کے مطابق صبح ان کی آنکھ کھلتی ہے اور اگر رات میں کوئی غیر معمولی بات ہو جائے تو اس وقت بھی وہ فوراً بیدار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک آزمودہ بات ہے جسے کوئی بھی آزما کر دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے آپ پر پوری طرح اعتماد کرتے ہوئے یہ ذہنی مشق جاری رکھے۔ میں یقین سے کہتا ہوں، صرف ایک ہفتے کے اندر سونے اور جاگنے کے معاملے میں اس کا دماغ اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگے گا۔

رات کے تین بجے میری آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا۔ لالٹین کی روشنی برائے نام رہ گئی تھی۔ شاید اس میں مٹی کا تیل ختم ہونے والا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر حور بانو کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ پھر میں نے کرم داد کی خبر لی۔ وہ مکان کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ دوسری رائفل شانے سے لٹکی ہوئی تھی اور ریوالور جیب میں رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی ذمے داریوں اور اپنے فرائض سے غفلت برتنے والا شخص نہیں تھا۔ اسے دو باتیں پریشان کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ جب چھ گھڑسوار آئے تھے تو بابر تنہا جاگ رہا تھا اور وہ خود سو رہا تھا۔ اس کی نیند کے دوران پانچ دشمن مارے گئے تھے اور اس کا کریڈٹ بابر کو حاصل ہو گیا۔ وہ مجھ سے جلتا یا حسد نہیں کرتا تھا لیکن جہاں مردانگی، شجاعت اور اپنے جوہر دکھانے کی بات آتی تھی، وہاں وہ کسی بھی بابر سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔

دوسری پریشانی یہ تھی کہ وہ گہری نیند کیسے سوتا رہ گیا جبکہ ہمیشہ ایک آنکھ سے سونے اور ایک آنکھ سے جاگنے کا عادی رہا ہے۔

رات کے تیسرے پہر وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا۔ اب یہ میرے بس میں نہیں تھا کہ میں دشمنوں کو کہیں سے بلاتا اور اس کے دل کی بھڑاس نکال دیتا۔ تاکہ وہ تنہا ان سے مقابلہ کر کے کم از کم پانچ دشمنوں کو مار کر میری برابری کر لے۔ اگر دشمن اس وقت آتے تو میں یہیں سے ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کے کام آتا رہتا۔ اسے پتا بھی نہ چلتا اور اس کی ذہنی پریشانی دور ہو جاتی۔
میں نے ریحانہ کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ کرم داد اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس وقت جاگ کر پہرہ دینے میں ایک یہ جذبہ بھی موجود تھا کہ وہ اپنی محبت کے لیے جاگ رہا ہے اور اسے آرام سے سلا رہا ہے حالانکہ وہ اس کے دشمنوں کی بیٹی اور بہن تھی لیکن اس نے اس کا جس انداز میں ساتھ دیا تھا، اسے جس طرح زمین سے آسمان تک پہنچایا تھا، کرم داد کبھی اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریحانہ کو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

اچانک رات کی خاموشی مجروح ہونے لگی۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ دور بہت دور سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی گاڑی چل رہی ہو۔ یقیناً اس جنگل سے کوئی کچا راستہ بھی گزرتا ہوگا ورنہ گاڑی کی آواز سنائی نہ دیتی۔ وہ کوئی کار، جیپ، یا منی ویگن تھی۔ میں نے کرم داد کے دماغ سے معلوم کیا۔ وہ آواز سن رہا ہے یا نہیں؟ بھلا وہ کیسے نہ سنتا۔ وہ تو ہلکی سی آہٹ پر چونک جانے والا آدمی تھا۔ وہ فوراً ہی مکان کے پچھواڑے پہنچ گیا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔

اس کی یہ بڑی خواہش تھی کہ میری آنکھ نہ کھلے اور وہ تنہا آنے والوں کا مقابلہ کر سکے۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آنے والے دشمن ہی ہوں گے۔

میں نے اس کے دماغ میں یہ بات پیدا کی۔ اگر آنے والوں نے اس مکان کو گھیر لیا تو وہ تنہا چاروں طرف سے ہونے والی فائرنگ کا کس طرح جواب دے سکے گا جبکہ مکان کی چھت پر بھی نہیں چڑھا جا سکتا تھا۔ وہ پھونس کی چھت تھی۔ اس کے وزن سے بیٹھ سکتی تھی۔

مگر وہ کوئی معمولی آدمی تو نہیں تھا کہ دشمنوں سے دہشت زدہ ہو جاتا۔ اس نے زبردست تربیت حاصل کی تھی۔ دماغ حاضر رہتا تھا۔ اس نے فوراً ہی مکان کی طرف سے ادھر دوڑ لگائی جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ وہ آنے والوں کو مکان کے قریب آنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ ادھر آ سکیں گے اور نہ ہی مکان کو چاروں طرف سے گھیر سکیں گے اور اگر فائرنگ دور ہوگی تو بابر کی آنکھ بھی نہیں کھلے گی اور وہ اکیلا ہی میدان مار لے گا۔

وہ اپنا شوق پورا کرنا چاہتا تھا اور میں آڑے نہیں آنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا۔ صرف احتیاطاً آنے والے دشمنوں کی آوازیں سنوں گا۔ اگر کرم داد نے تنہا میدان مار لیا تو ٹھیک ہے اور اگر اس کے سامنے دشواریاں پیدا ہوئیں تو ۔۔۔ چپ چاپ اس کے کام آؤں گا۔ اس طرح اس کی خوش فہمی برقرار رہے گی۔

جنگل میں اتنی گہری خاموشی ہوتی ہے کہ دور کی آواز بھی

قریب محسوس ہوتی ہے۔ میں نے ایک اندازہ لگایا تھا کہ وہ آواز ہم سے تقریباً دو چار فرلانگ کے فاصلے پر ہو گی لیکن کرم داد تقریباً چھ فرلانگ کا فاصلہ تیزی سے طے کر چکا تھا۔ آواز اس کے قریب آتی جا رہی تھی اور وہ آواز کے قریب پہنچتا جا رہا تھا مگر پھر بھی فاصلہ نہیں گھٹ رہا تھا۔

اب جو آواز سنائی دے رہی تھی، وہ پہلے سے زیادہ بھاری بھر کم تھی یعنی آواز ایک گاڑی کی نہیں دو گاڑیوں کی تھی۔ شاید تین چار گاڑیاں تھیں۔ جنگل کے ویرانے اور سناٹے میں آواز کے ذریعے صحیح تعداد کا پتا نہیں چلتا، جنگل میں رہنے والوں کو پتا چلتا ہو گا۔ میں پہلے لیٹا ہوا تھا، اب پوری طرح محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔ پریشانی یہ تھی کہ تین چار گاڑیاں ہوں گی تو دشمن کی تعداد بھی ہماری توقع سے زیادہ ہو گی۔ اب مجھے کرم داد کے دماغ میں بہت ہی حاضر دماغ اور چوکس رہنا تھا۔ میری ذرا سی غفلت اسے لے ڈوبتی۔

پھر ان گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آنے لگیں۔ صرف تین گاڑیاں تھیں۔ ان تینوں کے اندر تاریکی تھی۔ اندر بیٹھنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ کرم داد چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ وہ تنہا لڑنے کا فن جانتا تھا۔ اس کے دماغ نے سمجھایا کہ جنگل کی تاریکی میں وہ ایک فائر اچانک کرے گا تو آواز چاروں طرف گونجے گی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ آواز کی سمت کا تعین نہیں کر پائیں گے۔ تب تک وہ دوڑتا ہوا دوسری طرف جائے گا اور دوسری طرف سے فائر کرے گا۔ اس طرح یہ تاثر پیدا ہو گا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔

گاڑیاں جیسے ہی قریب آنے لگیں، اس نے یہی کیا۔ اچانک فائر کیا۔ جس کے نتیجے میں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔ وہ دوڑتا ہوا ایک سمت سے دوسری سمت گیا۔ وہاں سے بھی اس نے فائر کیا پھر زمین پر لیٹ گیا۔ وہاں سے رینگتا ہوا گاڑی کے قریب جانے لگا۔ اب ادھر سے کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی "کون ہے؟ فائر نہ کرے۔ ہم دوست ہیں۔ مال لے کر آ رہے ہیں۔"

وہ بولنے والا اب آسانی سے کرم داد کی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا اور وہ یہی کرنے جا رہا تھا لیکن وہ تو میرا شکار تھا اس کے ذریعے میں دوسروں تک پہنچ سکتا تھا۔ جیسے ہی کرم داد نے فائر کیا، میں نے اس کا نشانہ ذرا سا خطا کرا دیا۔ گولی یب کاڑی کی باڈی پر جا کر لگی۔ میں چاہتا تو وہی گولی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر کسی کی زندگی کو توڑ سکتی تھی۔

دشمن بھی چالاک تھے۔ وہ جنگلوں میں اور اندھیروں میں رہ کر جنگ کرنے کا طریقہ جانتے تھے۔ انھوں نے فوراً ہی تینوں گاڑیوں کو تین مختلف رُخ پر موڑ کر ہیڈ لائٹس آن کر دیں تاکہ فائرنگ کرنے والے نظر آ سکیں۔ اب کرم داد زیادہ سے زیادہ کسی ٹیلے کے یا کسی درخت کے پیچھے چھپ سکتا تھا اور وہ یہی کر رہا تھا۔

میں جس کے دماغ میں پہنچ گیا تھا، اس نے بتایا کہ وہ تین ڈرائیور ہیں۔ جن کے پاس ریوالور ہیں۔ باقی تین ساتھیوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ ان میں سے دو بندوق بردار گاڑیوں کی چھت پر پہنچ کر لیٹ گئے تھے۔ ایک بندوق والا ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں نے کھڑکی کی طرف محاذ بنا لیا تھا۔

میں جس کے دماغ میں تھا، اس کے قریب ہی ایک رائفل بردار چھت پر سے دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا "ہمیں دوستی کے جواب میں دوستی کا پیغام نہیں ملا ہے۔ کیوں نہ ایک ساتھ فائرنگ کی جائے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ جوابی فائر کرنے والے کتنے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تیسری گاڑی سے کسی نے للکار کر کہا "جو بھی ہمارا راستہ روک رہا ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے ہم رانگا ماما کے ساتھی ہیں۔ آج تک ہمارا راستہ روکنے کی کسی نے جرأت نہیں کی۔ دوستی چاہتے ہو تو ہمارے سامنے آ جاؤ ورنہ دشمن بن کر تمھیں کترانے کا موقع نہیں دیں گے۔"

ابھی میں تین آدمیوں کے دماغوں میں پہنچا تھا، تین باقی تھے۔ اسی وقت انھوں نے بیک وقت فائرنگ شروع کی۔ وہ چاہتے تھے، اچانک فائرنگ شروع کریں اور اچانک خاموش ہو جائیں۔ اس کے بعد جوابی فائرنگ ہو گی اس سے سمت کا تعین ہو جائے گا لیکن کرم داد اناڑی نہیں تھا۔ اس نے فائرنگ کے ان ہی ایک گاڑی کی اگلی کھڑکی پر گولی چلائی۔ اتنا تو معلوم ہی تھا کہ اگلی سیٹ پر ضرور کوئی موجود ہو گا۔ موجود کا مطلب ہے وجود میں رہنا۔ اور جہاں وجود ہوتا ہے، وہیں زندگی کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ اس اگلی کھڑکی کے پاس سے زندگی د آخری چیخ سنائی دی۔ پھر موت کے سناٹے میں ڈوب گئی۔

کرم داد نے میرا کام آسان کر دیا۔ چوتھے کے دماغ میں پہنچنے کی زحمت نہیں دی۔ دوسری گاڑی سے کسی نے چیخ کر گالی دی۔ پھر جواباً فائر کیا۔ کرم داد گالی برداشت کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن لڑتے وقت دماغ کو ٹھنڈا رکھنا جانتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چھت پر لیٹنے والے کو گولی مارے گا تو نشانہ خطا ہو سکتا ہے اور وہ ایک گولی بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اس گالی دینے والے کو ذرا سا اٹھا دیا۔ اگر چہ تاریکی تھی اور اس وقت چاند ڈوب چکا تھا تاہم تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کے باعث چھت کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کا سایہ سا نظر آیا۔ اتنا ہی کافی تھا۔ کرم داد کی رائفل سے ایک گولی چلی۔ پھر وہ گاڑی کی بلندی سے چیختا ہوا لڑھک کر نیچے پہنچ گیا۔ دشمن مختلف گاڑیوں سے اس کی طرف فائرنگ کرنے لگے۔ وہ زمین پر رینگنے کے باعث ابھی تک محفوظ تھا لیکن خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی کسی کی گولی اسے لگ سکتی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنے ایک معمول کا نشانہ اس کی طرف کر دیا جس کی آواز میں نے نہیں سنی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ گاڑی میں کہاں بیٹھا ہوا ہے۔ جیسے ہی اسے گولی لگی اس کے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دشمن اُدھر ہے اور تم نے اِدھر گولی چلا کر اپنے ہی آدمی کو ختم کر دیا۔"

اس نے جواباً گالی دیتے ہوئے کہا "ہاں میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں تمھیں بھی گولی مار سکتا ہوں۔"

اس نے اپنی دھمکی پر عمل کیا۔ ایک گولی چلائی لیکن گولی کا نشانہ بننے والا بچ گیا۔ وہ فوراً ہی جھکائی دے کر دروازہ کھولتا ہوا باہر آیا تاکہ اس پاگل آدمی کو ختم کر دے لیکن باہر آتے ہی وہ کرم داد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

اب دو رہ گئے تھے۔ دونوں کو باری باری ٹریپ کرنے کے بعد کرم داد کے نشانے پر لانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ مجھے یقین تھا کہ کرم داد دونوں سے بہ آسانی نمٹ لیتا۔ میں نے محض اس کا کام آسان کر دیا جب چھ مارے گئے اور سناٹا چھا گیا تو میں نے کرم داد کی سوچ میں کہا "اب کوئی نہیں ہے۔"

وہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ صرف چھ ہی تھے۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر گاڑی کی طرف پھینکا۔ پھر دوسرا پتھر دوسری گاڑی کی طرف۔ تیسرا پتھر تیسری گاڑی کی طرف۔ وہ ہر طرح اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا اور وہ ایسے طریقے اختیار کرتا ہوا گاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔

جب پہنچ ہی گیا تھا تو پھر اس میں ایسا حوصلہ پیدا ہوا جیسے موت کے سامنے پہنچ کر ہو سکتا ہے۔ یا تو آدمی مر جاتا ہے یا موت کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کو بچا لے جاتا ہے۔

وہ ایک گاڑی کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ اس بار اس نے بائیں ہاتھ میں رائفل لی۔ اس کے کندے کو کاندھے سے لگایا۔ پھر بائیں ہاتھ میں بھی رائفل لی۔ ان سے دو سمتوں میں فائرنگ کی تاکہ پتا چلے کہ دو سمتوں سے فائرنگ ہو رہی ہے لیکن جواب میں سناٹا چھایا رہا۔ کوئی جوابی فائرنگ کرنے والا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے یقین ہو گیا۔ اب وہ گاڑیوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ ان میں کس قسم کا مال جا رہا ہے۔ ان تین گاڑیوں میں شراب کی بڑی بڑی پیٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ موسم کے تازہ پھل اور خشک میوے تھے۔ ان کے علاوہ چند نئی رائفلیں، نئے ریوالور، نئے پستول اور دو کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ رانگا ماما نے کل ہونے والے جشن میں اپنے معزز مہمانوں کو تحفے دینے کے لیے یہ نئے ہتھیار منگوائے تھے۔

کرم داد یہ نہیں جانتا تھا۔ اس لیے ایک ایک گاڑی کے اندر جا کر تمام پیٹیاں کھول کر دیکھتا جا رہا تھا۔ پہلی گاڑی میں موسم کے تازہ پھل اور خشک میوے تھے۔ وہ پیٹیاں کھول کھول کر دیکھتا جا رہا تھا، میوے چکھتا جا رہا تھا اور ایک آدھ کیلا توڑ کر کھاتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوسری گاڑی کو چیک کیا۔ اس کی پیٹیاں کھولیں تو ہتھیار برآمد ہونے لگے۔ کسی میں رائفلیں تھیں۔ کسی میں ریوالور وغیرہ تھے اور کسی پیٹی میں ہینڈ گرنیڈ بھرے ہوئے تھے۔ لکڑی کے دو لانبے بکسوں میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں۔ کئی پیٹیاں کارتوسوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دوسری اور تیسری گاڑی میں سجاوٹ کا سامان بھی تھا یعنی رنگین جھنڈیاں، رنگین ربن اور کاغذ کے پھول وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ رنگین قمقمے، بلب اور ٹیوب لائیٹس وغیرہ تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا، اس جنگل کے دور افتادہ حصے میں کہیں جنریٹر کا انتظام تھا اور اس کے ذریعے روشنی کر کے صرف دن کو ہی نہیں، رات کو بھی جشن منانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔

اس نے تیسری گاڑی کے آخری حصے کو جب دیکھا تو وہاں بہت سی لکڑی کی پیٹیاں نظر آئیں۔ اس نے ایک پیٹی کو کھولا۔ پھر اس کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ شراب کی بوتلیں دیکھتے ہی اس نے ایک بوتل پر ہاتھ مارا۔ اسے اٹھا کر کھولتے ہی منہ سے لگا کر غٹاغٹ پینے لگا۔ یورپ میں رہ کر جہاں اس نے اور بہت کچھ سیکھا تھا وہاں پینا بھی سیکھ لیا تھا۔ اسے کل شام سے پینے کا موقع نہیں ملا تھا اب پیاس بجھا رہا تھا۔ میں نے چند گھونٹ کے بعد ہی اسے روک دیا۔ ذرا سا ٹھسکا لگا تو وہ کھانسنے لگا۔ میں نے اس کے دماغ میں سوچ پیدا کی "دشمن اس مکان کی طرف ضرور آئیں گے جہاں انھوں نے لڑکیوں اور خسروں کو رکھا ہے۔ اس کے

بے ہوش میں رہنا ہو گا۔ میں مدہوش ہو جاؤں گا تو بابر تنہا مقابلہ کرے گا۔ یا تو ہم سب مارے جائیں گے یا اس نے میدان جیت لیا تو مجھ سے زیادہ اسے کریڈٹ حاصل ہو جائے گا۔"

وہ مجھے بہت چاہتا تھا لیکن کسی بھی موقعے پر کارہائے نمایاں انجام دینے کے معاملے میں مجھ سے برتر ہی رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی اس کمزوری کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے بوتل کو بند کر دیا۔ دوسری گاڑی سے پھلوں اور میوے کی پیٹیاں اٹھا کر پہلی گاڑی میں رکھیں جس میں ہتھیار تھے پھر اس گاڑی کو ڈرائیو کرتا ہوا ہمارے مکان کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ گاڑی کی آواز سن کر تقریباً سبھی بیدار ہو گئے تھے۔ یوں بھی وہ سہمے ہوئے تھے۔ سو رہے تھے مگر کچی نیند میں تھے۔ حور بانو بھی بیدار ہو گئی۔

اب وہ حیران تھی کہ میری موجودگی میں کیسے سو گئی جب کہ میں جاگ رہا تھا۔ وہ بیدار ہو کر مجھے نیند کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے آواز دے کر مجھے جگانا چاہا لیکن میں بیدار ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اٹھ کر اپنے بستر کو یوں دیکھا جیسے بستر سے ہی پوچھ رہی ہو کہ اس نے اسے کیسے سلا دیا جب کہ ایک جنبی شناسا اس کے قریب ہی جاگ رہا تھا اور اس کے سونے کے بعد بھی شاید پتا نہیں کب تک جاگتا رہا ہو۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔ میری شرافت کی قائل ہو کر مجھ سے متاثر ہونے لگی۔ متاثر تو وہ پہلے سے تھی۔ میرا رنگ کچھ اور چڑھنے لگا۔ پھر وہ خیالات سے چونک گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

اس نے دروازے کو کھول دیا۔ ریحانہ کے ساتھ کرم داد بھی اندر آیا۔ اس نے مجھے آواز دی پھر قریب آ کر آہستگی سے جھنجوڑا۔ میں نے کروٹ لی اور نیند کی حالت میں دوسری طرف منہ پھیر کر سو گیا۔ کرم داد نے کہا "تعجب ہے جس طرح ہم کھلی فضا میں بے ہوش ہو جانے کی حد تک سوتے رہے تھے اسی طرح اس پر بے ہوشی طاری ہے۔"

اس نے پھر جھنجوڑا۔ میں اوں آں کہہ کے رہ گیا مگر آنکھ نہیں کھولی۔ میرے سرہانے جگ میں پانی رکھا ہوا تھا۔ کرم داد نے ایک چلو لے کر میرے منہ پر چھینٹا مارا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بوکھلا کر اسے دیکھنے لگا۔ ریحانہ اور حور بانو ہنسنے لگیں۔ ریحانہ نے کہا "بالکل ہماری جیسی نیند سو رہے تھے۔ جس طرح تم نے پانی کے چھینٹے مارے تھے، اس کا بدلہ تم سے لے لیا گیا ہے۔ اب ہوش میں آ جاؤ۔ کرم داد نے بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ تم نے پانچ دشمنوں کو ٹھکانے لگایا تھا اس نے چھ کو ٹھکانے لگایا ہے۔"

میں ان کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔ کرم داد اپنی کارکردگی کے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا۔ میں اس کی باتیں سنتا ہوا گاڑی کے پاس آیا۔ اندر رکھی ہوئی تمام چیزوں کو دیکھا۔ پھر کہا "بھئی تم نے تو کمال کر دیا۔ میری بیداری کے دوران جو پانچ دشمن مارے گئے انھوں نے تو ایک دوسرے پر حملے کیے تھے۔ خود لڑے تھے خود مر گئے تھے۔ لیکن تم نے تنہا چھ کو ٹھکانے لگا دیا۔"

اس نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جب جان پر کھیل جانے کی بات آتی ہے تو میں دشمنوں کی تعداد نہیں دیکھتا۔ خواہ وہ ایک ہوں یا... ایک درجن۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "تم نے چھ مارے ہیں، میں بارہ دشمنوں کو ان کے آخری انجام تک پہنچاؤں گا۔"

"یہ بات ہے۔"

"ہاں، یہی بات ہے۔ اب فیصلہ کرو ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم یہ گاڑی لے کر ہائی وے کا راستہ تلاش کریں یا ان ڈاکوؤں کے اڈے تک جائیں۔"

حور بانو نے کہا "خواہ مخواہ ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے راستے لگنا چاہیے۔"

"حور بانو! یہ جو لڑکیاں اس مکان میں ہیں، یہ تمھاری طرح معصوم ہیں۔ اپنے والدین کی اولاد ہیں۔ غربت انھیں ڈاکوؤں کے اڈے پر لیے جا رہی ہے۔ وہاں ان بےچاریوں کے ساتھ جو سلوک ہو گا کیا تمھیں اس کا احساس نہیں ہے؟"

حور بانو نے سر کو جھکا لیا۔ ریحانہ نے کہا "میں بھی اس بات کی قائل ہوں کہ ہمیں اپنے راستے لگنا چاہیے لیکن لڑکیوں کو دیکھ کر سوچتی ہوں، آخر یہ بے انصافی، یہ ظلم کب تک ہو گا۔ یہ دیہات کی غریب لڑکیاں کب تک جاگیرداروں، وڈیروں اور دوسرے افسروں کی خود غرضیوں کا نشانہ بنتی رہیں گی؟ نہیں بابر ہم اپنی جان پر کھیل کر ان ظالموں کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ یہ پھر کسی غریب اور شریف زادی کو اس کے گھر سے اٹھا لے جانے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔"

میں نے اور کرم داد نے لکڑی کے لانبے بکس میں سے کلاشنکوف رائفلیں نکالیں۔ کرم داد نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ بابر بارہ مارے گا تو مجھے چوبیس مارنے ہوں گے۔"

میں نے کلاشنکوف رائفل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔" ہتھیار صرف مارنے کے لیے نہیں ہوتے، اپنی حفاظت کے لیے بھی ہوتے ہیں اور دشمنوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے بھی۔ لہٰذا ہمیں یہ بات دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ کون کتنے دشمنوں کو مارے گا۔ یہ یاد رکھو کہ دشمن وقت آنے پر دوست بھی بن سکتے ہیں۔ ہمیں سوچ سمجھ کر ان ہتھیاروں کو استعمال کرنا ہے۔"

"دشمنوں سے دشمنی کرنے یا انھیں دوست بنانے کا انحصار حالات پر ہے۔ ابھی یہ سوچو ان عورتوں اور خسروں کو کس طرح کسی قریبی آبادی تک پہنچایا جائے؟"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ـــــ ڈاکوؤں کی گاڑیوں میں ہم ان سب کو یہاں کی کسی قریبی آبادی میں پہنچا دیں گے۔ اگر وہاں تھانہ ہوا تو پولیس کی بھی مدد حاصل کر لیں گے۔"

ریحانہ نے کہا۔" ہم نے ایک پولیس والے کی مدد حاصل کر کے اس کا انجام دیکھ لیا۔ اس فرض ناشناس کی وجہ سے ہی ہم اس جنگل میں آ پھنسے ہیں۔"

"تمام پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے ہمیں کسی قریبی آبادی میں کوئی ایسا افسر مل جائے جو ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کرے۔"

آخر یہی فیصلہ ہوا۔ ہم نے تمام عورتوں اور خسروں کو ان گاڑیوں میں بٹھا دیا۔ گاڑیاں ناکافی تھیں۔ عورتوں کو اندر بٹھایا گیا۔ خسروں کو چھت پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ جنھوں نے انکار کیا انھیں بندوق دکھا کر دھمکی دی کہ چھت پر نہیں بیٹھو گے تو پیدل چلنا پڑے گا یا پھر یہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ آخر وہ چھت پر بیٹھنے کے لیے راضی ہو گئے۔

جب ہمارا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا تو دن نکلنے ہی والا تھا۔ ہمارے تجربے میں یہ بات تھی کہ پولیس والوں سے دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر انھوں نے تمام ہتھیاروں پر قبضہ جما لیا اور ہمیں ایک بھی ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ دی تو وہ قانوناً درست ہوں گے لیکن ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے اور کرم داد نے راستے میں گاڑی روکی۔ کلاشنکوف رائفلوں کو ان کے لکڑی کے بکسوں میں رکھا اور رائفلوں میں استعمال ہونے والی گولیوں کی دو پیٹیاں بھی ساتھ لے کر راستے سے کچھ دور ہٹ کر چاقوؤں سے گڑھا کھود کے اس میں وہ دونوں رائفلیں اور کارتوس کی پیٹیاں دفن کر دیں اور مٹی برابر کر دی۔ اس کے بعد سیدھے اس درخت کے پاس آئے جس کے ذریعے ہم پہچان سکتے تھے کہ ہم نے کہاں گڑھا کھودا ہے۔ وہاں تک قدموں کا بھی حساب کر لیا تھا۔ پھر ہم نے اپنے اپنے ریوالوروں میں سائلنسر لگائے۔ میں نے اس درخت پر فائرنگ کی۔ اس کے تنے کا کچھ حصہ اُدھڑ گیا۔ یہ نشان ہمارے لیے کافی تھا۔ ہم وہاں سے چلتے ہوئے تقریباً چھٹے درخت کے بعد ساتویں درخت کے پاس رک گئے۔ وہاں بھی ہم نے فائرنگ کے ذریعے نشان بنایا اور پھر ہم گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ جہاں سے گاڑی گزرتی تھی وہاں سے ہم کچھ دور کسی درخت پر گولی کا نشان بنا دیتے تھے۔ صبح سات بجے ہم ایک بستی میں پہنچ گئے۔ بستی کے سرے پر ہی ایک چھوٹا سا تھانہ تھا۔ وہاں ایک نوجوان انسپکٹر نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی تھے۔ گاڑیوں کی آواز سن کر وہ ایک کچے مکان سے نکل آئے تھے۔ وہ کچا مکان ہی دراصل پولیس اسٹیشن تھا۔

جب ہم رائفلیں لے کر گاڑی سے نکلے تو دونوں پولیس کے سپاہی سہم کر پیچھے ہٹ گئے لیکن انسپکٹر دلیر تھا، وہ اپنی جگہ تن کر کھڑا رہا اور ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ ہمارے بعد پچھلی دونوں گاڑیوں سے تمام لڑکیاں اُتر رہی تھیں۔ خسرے بھی چھت پر سے اُتر رہے تھے۔ مَیں نے کہا۔" یہ تمام مظلوم لڑکیاں ہیں۔ انھیں مختلف بستیوں سے اٹھایا گیا ہے۔ مختلف علاقوں کے جاگیردار، وڈیرے اور راشی افسران ڈاکو رانگا ماما کو خوش کرنے کے لیے اس قسم کے تحفے بھیجتے رہتے ہیں۔"

لڑکیوں نے ہماری تائید میں بیان دیا۔ میں نے اور کرم داد نے اپنی اپنی رائفلیں اس پولیس انسپکٹر کے سامنے پھینک دیں اور کہا۔" اس گاڑی میں ایسے بہت سے ہتھیار اور کارتوسوں کی پیٹیاں ہیں۔ ہینڈ گرینیڈ وغیرہ بھی ہیں ہم یہ سب آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ آپ انھیں سنبھال لیں۔"

اس نے دونوں رائفلیں لیتے ہوئے کہا۔" مجھے خوشی ہے کہ آپ قانون کا احترام کر رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کروں گا اور قانون توڑنے والے افراد کا محاسبہ بھی کروں گا۔"

اس نے ہم سے گاڑی کی چابیاں لیں۔ گاڑی کو لاک کیا۔ پھر ہمارے ساتھ تھانے میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہاں صرف ایک میز اور ایک کرسی تھی۔ باقی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے بے بسی سے کہا۔" مجھے افسوس ہے آپ لوگوں کو بٹھانے کے لیے کرسیاں نہیں ہیں۔ یہاں بستی والوں کے پاس بھی کرسیاں نہیں ہوتیں۔ لکڑی کی چوکیاں اور چارپائیاں ہوتی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔" آپ کے پاس صرف دو ہی سپاہی ہیں؟"

"چار ہیں۔ دو رات کو ڈیوٹی دیتے ہیں وہ ابھی سو رہے ہیں اور یہ دو میرے ساتھ ہیں۔"

"آپ اس خطرناک علاقے میں صرف چار سپاہیوں کے ساتھ ڈاکوؤں سے کس طرح نمٹ لیتے ہیں؟"

"مجھے یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے ہیں۔ میں سکھر کا رہنے والا ہوں۔ سکھر یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ میں وہاں سب انسپکٹر تھا۔ اب سے دو ہفتے پہلے میں نے ایک بہت ہی خطرناک مجرم کو گرفتار کیا تھا۔ ایک افسر نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اسے فرار ہونے کا موقع دے دوں۔ میں نے انکار کیا۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ اس کے خلاف ایف آئی آر درج نہ کروں۔ میں نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا اور اسے جیل بھجوا دیا۔ اب اس پر مقدمہ چل رہا ہے لیکن ان دو ہفتوں میں پتا نہیں کیا اُلٹ پھیر ہوئی کہ مجرم تو رہا ہو گیا اور مجھے سزا کے طور پر ٹرانسفر کر کے اس چھوٹے سے علاقے میں بھیج دیا گیا۔"

حور بانو نے پوچھا۔" یہاں سے ڈاکو اکثر گزرتے ہوں گے؟"

"ہاں، ایسا ہوتا رہتا ہے۔ کل یہاں سے دو لڑکیاں بھی اُٹھائی گئی ہیں۔"

ان لڑکیوں نے آگے بڑھ کر کہا۔" ہمارا تعلق اسی بستی سے ہے۔ خدا کے لیے ہمیں گھر پہنچا دو۔"

"پہلے میں تمھارا بیان قلم بند کروں گا۔ تمھارے دستخط لوں گا۔ پھر گھر پہنچا دیا جائے گا۔ ویسے میرا ایک سپاہی جا کر تمھارے گھر والوں کو لے آئے گا۔"

ایک خسرے نے تالی پیٹ کر کہا۔" اے، ہمیں بھی تو ہمارے گھر والوں تک پہنچا دو۔"

دوسرے نے کہا۔" اس سے تو اچھا تھا کہ ہم ڈاکوؤں میں چلے جاتے۔ وہاں ہماری عزت تو ہوتی۔ یہاں انھوں نے گاڑی کی چھت پر بٹھا دیا ہے۔ کیا ہم سر پر بٹھائے جانے کے قابل نہیں ہیں۔"

انسپکٹر نے انھیں ڈانٹ کر خاموش رہنے کے لیے کہا۔ مَیں نے پوچھا۔" آپ کو یہاں آئے دو دن ہوئے ہیں لیکن ڈاکو آ گئے تو آپ ان کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے؟"

"مَیں نے اس بارے میں اپنے اعلیٰ افسران کو لکھا ہے۔ اس تھانے کے پیچھے ایک پرانی سی جیپ کھڑی ہے۔ وہ بھی چلتے چلتے رُک جاتی ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ میں کن دشواریوں میں گھرا ہوا ہوں۔"

مَیں نے کہا۔" اگر آپ ہم پر اعتماد کریں تو ہم ڈاکو رانگا ماما کو آپ کے قدموں میں لا ڈالیں گے۔"

کرم داد نے کہا۔" ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آج ڈاکو رانگا ماما کے خفیہ اڈّے میں بڑا جشن منایا جائے گا۔ مختلف علاقوں کے بڑے بڑے لوگ وہاں پہنچنے والے ہیں یا پہنچ چکے ہوں گے۔ کیا آپ پولیس کی جماعت لے کر ہمارے ساتھ وہاں تک چل سکتے ہیں؟"

انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔" میری جماعت کل یہی چار سپاہی ہیں اور ایک پرانی سی جیپ۔"

"ہمارے پاس تین گاڑیاں ہیں اور اب یہ آپ کی ہیں۔ ان کے اندر رکھا ہوا تمام سامان آپ کا ہے۔ آپ صرف چار سپاہیوں کا حساب نہ کریں۔ میں، ریحانہ، حور بانو اور بابر درجنوں دشمنوں پر بھاری پڑیں گے۔"

انسپکٹر نے ریحانہ اور حور بانو کو بے یقینی سے دیکھا۔ ریحانہ نے کہا۔" وقت آنے پر ہمارا نشانہ دیکھ لینا۔ ہم بڑے سے بڑے آزمائشی مرحلے پر بھی گھبرانے والی عورتیں نہیں ہیں۔"

حور بانو نے کہا۔" اگر آپ قانونی کارروائی کریں گے اور اپنے اعلیٰ افسران سے اجازت لینا چاہیں گے تو جشن کا دن گزر جائے گا۔ بہت سی معزز شخصیتیں جو آج کا دن اور آج کی رات جنگل میں منگل منانے کے لیے آ رہی ہیں، وہ کل صبح تک چلی جائیں گی۔ لہٰذا آپ ہم پر اعتماد کریں، ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم چاہتے ہیں، کامیابی کا سہرا آپ کے سر رہے۔ آپ کی ترقی ہو اور آپ کو اس چھوٹے سے علاقے سے پھر ٹرانسفر کر کے بڑے شہر میں پہنچا دیا جائے۔"

ہم نے وہاں پہنچتے ہی جس انداز میں ہتھیار انسپکٹر کے سپرد کر کے وہ گاڑیاں اس کے حوالے کی تھیں، اس بات نے اسے متاثر کیا تھا۔ ورنہ ہم چاہتے تو انسپکٹر اور دونوں سپاہیوں کو وہیں ختم کر سکتے تھے لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم قانون کا احترام کرتے ہیں۔ اس نے کہا۔" میں قانون پسند لوگوں کا ساتھ دیتا ہوں۔ تم دونوں پر بھی اعتماد کرتا ہوں۔"

اتنے میں بستی کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ انسپکٹر نے کہا۔" یہ تمام لڑکیاں دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ مَیں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ انھیں ان کی بستیوں تک پہنچانے میں ہمارا ساتھ دیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ مَیں ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے ان محبِ وطن افراد کے ساتھ جا رہا ہوں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ جب تک واپس نہ آؤں اس وقت تک یہ تمام لڑکیاں تمھارے گھروں میں تمھاری بہو بیٹیوں کی طرح عزت سے رہیں۔ واپس آتے ہی انھیں ان کے رشتے داروں تک پہنچانے کے انتظامات

کروں گا۔"

پھر اس نے دونوں سپاہیوں کو حکم دیا کہ تمام لڑکیوں اور خسروں کا بیان قلم بند کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ بستی والوں کے بھی دستخط لیے جائیں۔ اس قانونی کارروائی میں تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ جب انسپکٹر کو اطمینان ہو گیا کہ تمام لڑکیوں کو بستی والوں کے گھروں میں پناہ مل گئی ہے تو وہ ہمارے ساتھ روانہ ہوا۔ ایک گاڑی ریحانہ ڈرائیو کرنے لگی۔ دوسری میں نے سنبھال لی۔ میرے ساتھ حور بانو بیٹھ گئی تھی۔ تیسری گاڑی میں کرم داد اور انسپکٹر تھے۔ وہ دونوں ڈاکوؤں کے خفیہ اڈے تک پہنچنے کے لیے منصوبہ بندی کرتے جا رہے تھے۔

انسپکٹر نے کہا: "اگر تم ان چھ آدمیوں میں سے کسی ایک کو بھی زندہ رکھتے تو اس کے ذریعے ڈاکوؤں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ سکتے تھے۔ اب تو یہی ایک صورت ہے کہ ان کا کوئی اور آدمی ہمارے ہاتھ آ جائے اور ہم اسے مجبور کر کے اس کام کے لیے آمادہ کر لیں۔"

"ایسے ایک نہیں، کئی آدمی ہاتھ آ جائیں گے۔ جس مکان سے ہم ان خسروں اور عورتوں کو لے کر آپ کے پاس پہنچے ہیں، اس مکان کو خالی دیکھ کر دشمن کے آدمی ضرور ہمیں تلاش کریں گے، وہ مکان ان ڈاکوؤں کے لیے ایک سرائے کی طرح ہے۔ یقیناً اب وہاں کچھ لوگ موجود ہوں گے۔"

کرم داد کا خیال درست ثابت ہوا۔ جب ہم اس مکان میں پہنچے تو وہاں دس مسلح ڈاکو نظر آئے۔ ان سے زبردست مقابلہ ہوا جس کے نتیجے میں صرف دو بچ سکے۔ ان دونوں میں سے ایک میرا تابعدار تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو ڈاکو رانگا ماما کے خفیہ اڈے تک ہماری رہنمائی کے لیے آمادہ ہو گیا۔

انسپکٹر نے اس سے کہا: "میں قانون کا محافظ ہوں۔ میرا نام علی مختار میمن ہے۔ میں جو وعدہ کرتا ہوں اسے پورا بھی کرتا ہوں۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ دھوکا نہ کیا اور اس خفیہ اڈے تک پہنچا دیا تو میں تمھیں سلطانی گواہ بنا کر سزا سے بچا لوں گا۔"

میں نے اس تابعدار کو اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ انسپکٹر علی مختار میمن اور کرم داد سے میری غیر معمولی صلاحیتوں کا ذکر کر سکتا۔ میں نے موقع پا کر تنہائی میں اسے سمجھا دیا تھا: "خبردار، میرے آدمیوں سے بھی یہ نہ کہنا کہ میری کسی صلاحیت کے باعث وہ پانچوں مارے گئے تھے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "میری کیا مجال ہے۔ میں آپ کے ساتھیوں سے بھی کچھ نہیں کہوں گا۔"

وہ ہمارا رہنما بن گیا اور ہم اس کے ساتھ خفیہ اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اس کے دماغ کے ذریعے اڈے کے متعلق جو معلومات حاصل کیں وہ کچھ یوں تھیں۔

سندھ کے جنگلات کئی ہزار مربع میل پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان گھنے جنگلات میں صرف ایک رانگا ماما ہی نہیں، کئی ڈاکو پناہ گزیں ہیں۔ جس طرح اس کرۂ ارض کو ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں مختلف علاقوں کی زمینوں کو مختلف زمینداروں اور جاگیرداروں نے تقسیم کر لیا ہے، اسی طرح سندھ کے وسیع و عریض جنگلات پر مختلف ڈاکوؤں کی حکمرانی ہے۔ ہر ڈاکو کا ایک مخصوص علاقہ ہے، یہ تمام آپس میں ٹکرانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی متنازعہ مسئلے پر ان کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ورنہ قانون سے تحفظ حاصل کرنے اور قانون کے محافظوں سے نمٹنے یا انھیں اپنا بنا کر رکھنے کے سلسلے میں سب ایک ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے کئی ڈاکو آج تک قانون کی دسترس سے محفوظ ہیں۔ کبھی پولیس مقابلے میں ان کا کوئی آدمی مارا جاتا ہے لیکن سردار ہمیشہ بچ کر نکل جاتا ہے۔

اس لیے بچ کر نکل جاتا ہے کہ وہ شہروں اور دیہاتوں کے معززین کو اور قانون کی بالادستی قائم رکھنے والے افسران میں سے چند راشی افسروں کو خوش کرنا جانتا ہے۔ انھیں سال میں ایک آدھ بار ضرور جنگل میں منگل منانے کی دعوت دیتا ہے۔ لوٹ مار اور اغوا کرنے کے سلسلے میں جو لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے، اس میں سے کچھ حصہ ان راشی افراد تک پہنچتا رہتا ہے۔ جاگیرداروں اور زمینداروں کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ دوستی جب تک قائم رہے گی ان کی جان و مال کو نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ ہی ان کے خاندان کی لڑکیاں اٹھائی جائیں گی۔ الیکشن کے زمانے میں دیہات کی اکثریت ڈاکوؤں سے خوفزدہ رہتی ہے۔ وہ بے چارے اسی طرف ووٹ ڈالتے ہیں جدھر ڈاکوؤں، وڈیروں اور جاگیرداروں کا اشارہ ہوتا ہے۔ اس طرح ملی بھگت سے وہ ہر آنے والی نئی حکومت کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

رانگا ماما کا خفیہ اڈہ اس جنگل میں ماما مسکن کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ماما مسکن اتنے گھنے درختوں کے درمیان تھا کہ پرواز کے دوران نظر نہیں آ سکتا تھا۔ خشکی کے راستے وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک تو پولیس پارٹی کے پاس گھوڑے نہیں ہوتے تھے۔ سرکاری طور پر اگر گاڑیاں ملتیں تو وہ ان گاڑیوں سے جنگلوں میں سے نہیں گزر سکتے تھے۔ پھر یہ کہ پولیس کی جماعت بڑی محدود ہوتی تھی اور ڈاکو لامحدود تھے۔ ماما

مسکن تک پہنچنے سے پہلے ہی جنگلات میں پھیلے ہوئے ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ رانگا ماما کا دعویٰ تھا کہ اس مسکن تک صرف دوست افسران اور معززین ہی پہنچ سکتے ہیں۔ دشمن پانچ میل دور ہی سے شکست کھا کر لوٹ جاتے ہیں یا پھر ان کی لاشیں بستیوں میں بھجوائی جاتی ہیں۔

ماما مسکن کو دلھن کی طرح سجایا گیا تھا۔ ہماری ایک گاڑی میں سجاوٹ کا جو سامان آیا تھا وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ایسے سامان مختلف علاقوں سے بھیجے گئے تھے۔ پہلے ہی شراب کی کئی پیٹیاں، موسم کے تازہ پھل، خشک میوے وغیرہ پہنچا دیے گئے تھے۔ اونٹ، گائے، بکرے، دنبے اور ہر طرح کے حلال جانور ذبح کیے گئے تھے۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ قانون کی پابندیاں توڑنے، مستی میں آ کر بہکنے اور انسان سے جانور بننے کا تمام سامان موجود تھا۔ شہریوں سے شہر اور جانوروں سے جنگل پہچانا جاتا ہے۔ جانور کبھی شہر میں آ کر انسان بننا گوارا نہیں کرتے البتہ انسانوں کی تاریخ یہ ہے کہ ہزاروں سال پہلے جب وہ مہذب نہیں تھا تو جانوروں جیسی زندگی گزارتا تھا۔ آج بھی ہمارے درمیان ایسے انسان موجود ہیں جو جنگلوں میں جا کر اپنے اسلاف کے کارنامے دہراتے اور فخر محسوس کرتے ہیں۔

ماما مسکن سے تقریباً دس میل پہلے ہمیں اپنی اپنی گاڑیوں سے اترنا پڑا۔ آگے دشوار گزار راستہ تھا۔ وہاں سے یہ گاڑیاں نہیں گزر سکتی تھیں۔ میں نے اور کرم داد نے وہ دونوں کلاشنکوف رائفلیں نکال لی تھیں جنھیں ہم نے چھپا کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ہم سب کے پاس ریوالور تھے۔ جن میں سائلنسر لگے ہوئے تھے۔ حور بانو، ریحانہ اور انسپکٹر علی مختار میمن کے پاس بھی ایک رائفل تھی۔ ہم سب نے کارتوسوں کی پیٹیاں اپنی کمر سے باندھی ہوئی تھیں اور شانے سے بھی دو دو پیٹیاں لٹکا رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے شانوں سے ایک ایک بڑا سا بیگ لٹکا ہوا تھا۔ ہر بیگ میں ہینڈ گرینیڈ اور فالتو کارتوس رکھے ہوئے تھے۔

ہم نے آگے بڑھنے سے پہلے وہاں رک کر پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ ہمارے تابعدار نے بتایا۔ پینے کے لیے پانی کی کمی نہیں ہوگی کیونکہ ہمارا سفر دریا کے کنارے کنارے ہوگا۔ ڈاکو بھی ایسی ہی جگہ مسکن بناتے ہیں جہاں سے آسانی کے ساتھ پانی دستیاب ہو سکے۔ ہم نے اپنی اپنی جیبوں میں تھوڑے تھوڑے خشک میوے رکھ لیے۔ میں نے کہا: "فکر نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو ہم رات کا کھانا بڑے آرام سے اور بڑی آزادی سے ماما مسکن میں بیٹھ کر کھائیں گے۔"

انسپکٹر نے ہمارے ساتھ چلتے ہوئے کہا: "تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے ڈاکو رانگا ماما کوئی تر نوالہ ہے۔"

میرے تابعدار نے کہا: "میں یقین سے کہتا ہوں، ہماری آمد کی اطلاع اب تک وہاں پہنچ چکی ہوگی۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ [illegible] مقابلے میں بچنے والے دو افراد میں سے ایک میرا تابعدار تھا جو اس وقت ہمارے ساتھ تھا۔ دوسرا فرار ہو کر رانگا ماما کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں اسی کے دماغ کے ذریعے وہاں کے حالات معلوم کر رہا تھا۔ اس نے ہمارے متعلق تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔

رانگا ماما نے غصے سے کہا: "پہلے ہمارے پانچ آدمی مارے گئے۔ پھر انھوں نے ان چھ آدمیوں کو مار ڈالا جو ہمارے لیے سامان لا رہے تھے۔ اس کے بعد اس مکان میں دس آدمی گئے تھے جس میں سے آٹھ ختم ہو گئے۔ ایک بھاگ کر یہاں آیا دوسرا ان کی گرفت میں ہے۔"

اس وقت تک رانگا ماما کے معزز مہمان پہنچ چکے تھے۔ ان میں ایک بڑا پولیس آفیسر تھا۔ دوسرا سائیں سراج آدم تھا۔ اسی کی طرح دوسرے وڈیرے اور جاگیردار بھی تھے جو مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ جمال احمد جسکانی کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ رانگا ماما نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: "مجھے جمال احمد جسکانی نے اطلاع دی تھی کہ بابر نامی ایک نوجوان نے ان کے درمیان پہنچ کر دھوکا دیا۔ ان کے ایک آدمی کرم داد کو باغی بنا دیا۔ اب وہ ریحانہ اور حور بانو نامی عورتوں کے ساتھ یا تو کراچی شہر میں کہیں چھپے ہوئے ہیں یا کہیں دوسری جگہ پناہ لینے گئے ہیں۔ اگر وہ ہائی وے سے سفر کر رہے ہوں تو راستے کے ہر شہر اور پولیس چوکی میں انھیں روکا جائے۔ انھیں ٹریپ کر کے میرے پاس پہنچایا جائے تاکہ آج جشن کے موقعے پر سب کے سامنے ان غداروں اور دشمنوں کو عبرتناک سزا دی جا سکے۔"

سائیں سراج آدم نے کہا: "رانگا! ہم نے تو اپنا کام کر دیا۔ انھیں جنگلوں میں بھٹکا دیا۔ اب یہ تمھارے آدمیوں کا کام تھا کہ انھیں تمھارے پاس لے آتے لیکن وہ اپنی نااہلی کی وجہ سے مارے گئے۔"

رانگا ماما نے ہاتھ ہلا کر کہا: "نہیں، نہیں، میرے لوگ نااہل نہیں ہیں۔ دشمن زیادہ چالاک ہیں۔ انھوں نے ٹی ٹی سینٹر میں رہ کر سائنسی حربے اور دماغی ہتھکنڈے سیکھے ہیں۔ وہ کس انداز میں حملے کرتے ہیں، کس طرح چالیں چلتے ہیں یہ جنگلوں میں رہنے والے سمجھ نہیں پاتے۔ اگر میرے اس آدمی کی اطلاع درست ہے کہ وہ انسپکٹر علی مختار میمن کے ساتھ

میرے مسکن کی طرف آ رہے ہیں تو پھر وہ اپنے پیروں سے چل کر واپس نہیں جا سکیں گے۔ انھوں نے میرے اُنتیس آدمی مارے ہیں۔ میں انھیں اتنے زخم پہنچاؤں گا کہ وہ اُنتیس کی گنتی ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے۔"

تمام مہمان آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے یعنی جنگل میں کرسیاں بھی مہیا کی گئی تھیں۔ وہ گھنے درختوں کے سائے میں تھے۔ ان کے آس پاس عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو عورتیں خدمت گزاری کے لیے حاضر ہو جاتی تھیں۔

رانگا ماما نے کہا: "اگر وہ ٹی، ٹی سینٹر سے استادوں کے استاد بن کر آئے ہیں تو میرا دوست جمال احمد جسکانی بھی کم نہیں ہے۔ وہ بھی مانا ہوا فائٹر اور حاضر دماغ ہے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ میرا دوست انھیں کاٹ کر رکھ دے گا۔"

سائیں سراج آدم نے کہا: "ہمیں تمھاری بات کا یقین ہے جسکانی صاحب ان چاروں کو عبرتناک سزا دیں گے اور یہاں سے زندہ واپس نہیں جانے دیں گے لیکن اس انسپکٹر علی مختار میمن کا کیا ہوگا؟ اگر وہ زندہ سلامت واپس جائے گا تو ہم سب کے خلاف قانونی کارروائی کرے گا۔"

پولیس آفیسر نے ہنستے ہوئے کہا: "بھئی اس کی فکر نہ کرو۔ میں کوئی معمولی افسر نہیں ہوں۔ میری ڈانٹ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے بندوق گر جائے گی۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ میں آگے خیال خوانی نہ کر سکا۔ ہم جنگل کے جس حصے سے گزر رہے تھے وہاں خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں دماغی طور پر حاضر ہو گیا۔ ہمارے چاروں طرف گھنے درخت تھے۔ دور تک راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہری بھری جھاڑیوں سے آگے راستہ ختم ہو گیا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ راستہ دوسری طرف سے ہے۔ وہاں اتنی گہری خاموشی تھی کہ ہمیں اپنے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اچانک ہمیں کچھ لوگوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم چلتے چلتے رک گئے۔

ہمارے رکتے ہی وہ آوازیں بھی رک گئیں۔ ہم دو قدم آگے بڑھے پھر آوازیں سنائی دیں۔ وہ آوازیں پھر چند لمحوں کے بعد ختم ہو گئیں۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارے دائیں اور بائیں طرف دشمن موجود ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ہم رکتے ہیں تو وہ بھی رک جاتے ہیں۔ میں نے اور کرم داد نے ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے انسپکٹر کے کان میں کہا: "آپ ہماری عورتوں کے ساتھ آگے چلتے رہیں۔ ہم آپ سے بعد میں آکر ملیں گے۔"

انسپکٹر نے پوچھا: "کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"ہم اس طرح جائیں گے کہ ہمارے قدموں کی آواز سنائی نہیں دے گی۔"

وہ تینوں پھر چلنے لگے۔ میں اور کرم داد زمین پر اوندھے لیٹ گئے تھے۔ ہمیں اپنے لوگوں کے ساتھ دوسروں کے بھی چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دوسرے کتنی دور ہیں اس کا اندازہ مشکل تھا۔ ہم دونوں دو سمتوں میں رینگتے ہوئے بڑھنے لگے۔ انسپکٹر نے ذرا رک کر ہمیں حیرانی سے دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا: "ان دونوں نے غضب کی ٹریننگ حاصل کی ہے۔ میں شہروں میں ڈیوٹی دینے والا ایک پولیس افسر ہوں۔ جنگلوں میں ان کی طرح سانپ کی مانند رینگتا ہوا نہیں جا سکتا۔"

وہ حور بانو اور ریحانہ کے ساتھ چلنے لگا۔ ہم تیزی سے رینگتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میں کبھی کبھی کرم داد کے دماغ میں جھانک کر دیکھتا تھا پھر آگے بڑھ جاتا تھا۔ ہم جس قدر بڑھتے جا رہے تھے قدموں کی آوازیں ہمارے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر میں نے دشمنوں کو دیکھ لیا۔

وہ سات تھے۔ ان میں سے دو آگے کی طرف دیکھتے جا رہے تھے دو دائیں اور بائیں دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے دو مسلح جوان پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے اُلٹے قدموں چل رہے تھے۔ ساتواں سب سے آگے تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا ہوا محتاط انداز میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سب جان بوجھ کر زمین پر پاؤں مارتے جا رہے تھے تاکہ ہمیں ان کے قدموں کی دھمک دور تک سنائی دے۔

میں ایک درخت کی آڑ میں تھا۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اسی طرح کرم داد بھی ایک ٹیلے کے پیچھے چھپ گیا تھا اور ایسے ہی سات دشمنوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ساتوں بھی اسی انداز میں پاؤں پٹختے ہوئے چل رہے تھے۔ اس نے اپنی کلاشنکوف رائفل سنبھالی۔ ایک ہاتھ بیگ میں ڈال کر ایک ہینڈ گرنیڈ نکالا اس کا ارادہ تھا۔ پہلے ایک ہینڈ گرنیڈ سے دھماکا کرے گا۔ اس کے بعد بھگدڑ مچے گی تو تڑا تڑ فائرنگ شروع کر دے گا۔

میں بھی وہی کرنا چاہتا تھا۔ جو وہ کرنے والا تھا تاکہ دونوں کا عمل ایک ساتھ شروع ہو اور ایک جیسا حملہ ہو۔ میں نے بھی کلاشنکوف رائفل سنبھال لی تھی۔ ہاتھ میں ہینڈ گرنیڈ تھا۔ چند لمحوں تک میں اس کے خیالات پڑھتا رہا۔ جیسے ہی اس نے اپنے منہ سے ہینڈ گرنیڈ کی چابی کھینچی میں نے بھی دی

کیا۔ پھر ہم نے ایک ساتھ اسے دشمنوں کی طرف پھینکا۔ ایک ساتھ دھماکے ہوئے، اور بھگدڑ مچ گئی۔ اُدھر بھی تڑا تڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ اِدھر بھی فائرنگ جاری تھی۔ یہ ایک جیسا عمل دونوں طرف کے دشمنوں کو بوکھلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ان میں سے دو چار اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکے تھے باقی زمین بوس ہو گئے تھے اور اسی زمین پر بے جان پڑے تھے جس پر ابھی پاؤں پٹخ پٹخ کر چل رہے تھے۔

جو زندہ بچ گئے تھے مجھے ان کے خیالات پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ آئندہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ میں اور کرم داد پھر انسپکٹر، ریحانہ اور حور بانو کے ساتھ آکر مل گئے۔ ان کے ساتھ چلنے لگے۔ انسپکٹر نے کہا: "بھئی بڑے زبردست دھماکے اور فائرنگ ہو رہی تھی۔ آخر دشمن کتنے تھے؟"

"کُل ملا کر چودہ تھے۔ شاید دو یا تین فرار ہونے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔"

انسپکٹر نے کہا: "میں اکثر سوچتا تھا کہ بے ایمان اور رشوت خور افسروں کے درمیان رہ کر کبھی قانون کے کام نہیں آسکوں گا۔ اگر نہ آسکا تو مجرموں سے لڑتے ہوئے جان دے دوں گا۔ قانون کی بالادستی قائم رکھنے والے محکمے میں ایسا ریکارڈ بھی ہونا چاہیے کہ کسی نے قانون کی خاطر مجرموں سے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ لیکن تم دونوں کی موجودگی میں میری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ میں جان نہیں دے سکوں گا۔ تم دونوں درجنوں پر بھاری ہو۔ میں درجنوں پر نہ سہی دو چار پر تو ضرور بھاری ہوں گا۔ اس طرح مجھے یقین ہے کہ فتح ہماری ہو گی۔"

ہم آگے بڑھتے رہے۔ اب ہمیں نہ تو قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں نہ کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ دشمنوں کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے رانگا ماما کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ اسی وقت ایک شخص یہ منحوس خبر لے کر پہنچا تھا کہ اس کے مزید گیارہ آدمی مارے گئے ہیں۔

رانگا ماما نے اپنی گھنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غرّا کر کہا: "میرے پاس کل باون آدمی تھے۔ میں فخر سے کہا کرتا تھا میرے پاس تاش کے باون پتے ہیں اور ہر پتہ ٹرپ کا پتہ ہے۔ آج تیس پتے کم ہو چکے ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دو چار بدمعاش میرے لیے اتنی بڑی تباہی کا سبب بنیں گے۔ میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ایک شخص گھوڑے کو دوڑاتا ہوا قریب آ رہا تھا۔ پھر اس نے رانگا ماما کے سامنے تقریباً دس گز کے فاصلے پر رک کر گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا: "سردار! جسکانی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

رانگا ماما نے اپنے سینے پر گھونسے مارتے ہوئے، خوش ہو کر کہا: "آ گیا میرا یار، میں دیکھتا ہوں یہ بدمعاش کس طرح زندہ سلامت جا سکیں گے آؤ دوستو! ہمیں جسکانی کے استقبال کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔"

آنے والے قاصد نے کہا: "لیکن سردار! وہ ادھر نہیں آ رہے ہیں۔ جب انھیں پتا چلا کہ بابر اور کرم داد آپ کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں تو انھوں نے اپنا راستہ بدل دیا۔ مجھے حکم دیا کہ اپنے سردار سے جا کر کہوں جمال احمد جسکانی خوش قدم ہے۔ وہ تمھارے سردار کے لیے خوشیاں لے کر آئے گا۔ میں جب دشمنوں کو پیش کروں گا تو ان کے شانوں پر سر نہیں ہوں گے۔ اگر ہوں گے تو وہ میرے یار کے سامنے جھکے ہوں گے۔"

رانگا ماما نے خوشی سے نعرہ لگاتے ہوئے کہا: "اسے کہتے ہیں یاروں کا یار۔ ہماری روایت ہے کہ ہم مہمانوں کو قیمتی تحائف پیش کرتے ہیں۔ میرا یار ایسا مہمان ہے کہ اپنے میزبان کو تحفہ دینے کے لیے دشمنوں کے سر لینے گیا ہے۔"

جمال احمد جسکانی پہلے بھی ذہین اور حاضر دماغ تھا۔ دہشت گردی کی تنظیم میں تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ کندن بن گیا تھا۔ اب وہ ہمیں کس طرح گھیرنا چاہتا تھا۔ کس طرح ہمیں گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ یہ میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ بہت پہلے ایک آدھ بار اس کی آواز سنی تھی لیکن مجھے اتنی خیال خوانی کرنا پڑتی ہے کہ ہر آواز میرے ذہن میں محفوظ نہیں رہتی۔ میں نے اس وقت جسکانی کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ سوچا تھا جب اس سے سامنا ہو گا تو اس کی آواز سن کر دماغ میں پہنچ جاؤں گا۔ اب مجھے انتظار تھا کہ وہ مجھے اپنی آواز سنائے۔

انسپکٹر علی مختار نے چلتے ہوئے کہا: "بڑی دیر ہو گئی ہے دشمن ابھی تک ہمیں گھیرنے نہیں آئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہمارے لیے کسی اور طرح کا جال بچھائے ہوں؟"

کرم داد نے کہا: "وہ ہماری چال نہیں سمجھ سکتے۔ ہم ان کی چالوں کو سمجھ نہیں پائیں گے۔ فرہاد اور رسونتی کی ٹیلی پیتھی کے متعلق بہت کچھ سنا ہے۔ کاش تھوڑی دیر کے لیے مجھے خیال خوانی آجاتی تو میں دشمنوں کو سمجھ کر فوراً جوابی کارروائی

شروع کر دیتا۔"

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر کہنے لگا۔" لیکن جو مزہ تجسس میں ہے وہ خیال خوانی میں نہیں ہے۔ میں ان سے بے خبر ہوں۔ تجسس میں مبتلا ہوں۔ ہر قدم پر ایک نیا خطرہ محسوس ہوتا ہے تو بڑا مزہ آتا ہے۔ ایسے میں دشمنوں سے لڑنا، اندھی چالیں چلنا اور پھر مردانگی دکھاتے ہوئے کامیابی حاصل کرنا بڑی بات ہے۔ یہ فرہاد اور رسونتی کیا سمجھتے ہوں گے۔"

میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ ہم کیا سمجھتے ہیں۔ ہم بھی اکثر ایسے حالات سے گزرتے ہیں جہاں ہماری خیال خوانی کی صلاحیتیں بے بس ہو جاتی ہیں۔ اُس وقت بھی میں جمال احمد جسکانی کے سامنے بے بس تھا۔ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ وہ کیسی چالیں چلنے والا ہے۔

ہم چلتے چلتے ٹھٹک گئے۔ ہمارے سامنے بہت دور آگ کا ایک شعلہ دکھائی دے رہا تھا۔ پھر دوسرا شعلہ دکھائی دیا۔ پھر تیسرا، چوتھا اور پانچواں یعنی دن کے وقت پانچ مشعلیں روشن تھیں۔ وہ تعداد میں پانچ تھے اور اپنے اپنے ہاتھ میں مشعل لیے گھوڑے کی پشت پر سوار تھے۔ ان میں سے چار کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور پانچواں سوار جو ان کے درمیان تھا وہ نہتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے۔ وہ گھڑ سوار صاف طور پر دکھائی دیتے گئے۔ ایک گھڑ سوار پتلون، بنیان اور جیکٹ میں ملبوس تھا۔ نہایت ہی خوبرو نوجوان تھا۔ اسے دیکھتے ہی کرم داد نے کہا۔" یہ تو جمال احمد جسکانی ہے۔"

جسکانی نے گھوڑے کو لگام کا ہلکا سا اشارہ دیا۔ وہ گھوڑا ایک طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا۔" ریحانہ اور کرم داد! تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ اگر بھول گئے ہو تو ٹیرر ٹریننگ سینٹر کے کمپیوٹر کا وہ فقرہ یاد کرو جس کا لبِ لباب یہی ہے کہ جمال احمد جسکانی ہزار ہا موت کے سامنے نہتا جاتا ہے اور کوئی آنچ کھائے بغیر واپس چلا آتا ہے۔ دیکھ رہے ہو کہ میں بالکل نہتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں جو مشعل ہے یہ محض ایک مجبوری ہے۔ میری معلومات کے مطابق تم لوگوں کے پاس صرف معمولی بندوقیں نہیں بلکہ کلاشنکوف رائفلیں ہیں اور دشمنوں میں افراتفری مچانے کے لیے ہینڈ گرنیڈ بھی ہیں۔ ایسی صورت میں میں نے صرف ایک مشعل کا سہارا لیا ہے تم چاہو تو دور سے گولی مار سکتے ہو لیکن مجھے مارنے کے بعد یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکو گے۔ نہ آگے بڑھنے کا راستہ ملے گا، نہ پیچھے ہٹنے کا۔"

اس نے گھوڑے کی لگام موڑ دی۔ اپنے چار ماتحتوں کے پاس واپس جانے لگا اور کہنے لگا۔" میں پہلی اور آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ مجھ پر گولی چلانے سے پہلے سوچ لینا کہ جمال احمد جسکانی صرف ایک مشعل کے سہارے تم لوگوں کے مقابلے پر کیوں آیا ہے؟"

اس کی وارننگ قابلِ غور تھی۔ میں نے اس کے دماغ میں بہت پہلے ہی چھلانگ لگائی تھی اور اس کی سوچ پڑھ رہا تھا۔ اس کی ذہانت کا قائل ہو رہا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے ہمیں بے بس کرنے آیا تھا۔ یعنی اتنی آسانی سے کہ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کے دماغ کو نہ جھٹکا پہنچا سکتا تھا، نہ اپنی مرضی کے مطابق اس سے کوئی عمل کرا سکتا تھا۔

جو کچھ میں نے معلوم کیا وہ خود اپنی زبان سے کہنے لگا۔" کرم داد، بابر اور مسٹر پولیس مین! تم لوگوں کے پاس اتنی عقل تو ضرور ہوگی کہ جنگل کی آگ کتنی تیزی سے پھیلتی ہے۔ اگر میں اس مشعل کو کسی جھاڑی سے، کسی سوکھی گھاس سے لگا دوں تو یہ اتنی تیزی سے پھیلے گی، جیسے چاروں طرف پٹرول چھڑک دیا گیا ہو۔ جتنی تیزی سے تم واپس بھاگو گے اتنی ہی تیزی سے یہ آگ تمھاری طرف لپکتی چلی جائے گی۔ یہاں سے دو سو گز کے فاصلے پر تمھیں کچھ اور مشعل بردار ملیں گے۔ وہ ادھر سے آگ لگائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ تم اُدھر جا سکو گے نہ اِدھر آسکو گے۔"

میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے کیا ایسی صورت میں، خیال خوانی کے ذریعے جمال احمد جسکانی کو ٹریپ کر سکتا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ سے وہ مشعل گر جاتی یا میں اس کے ذریعے اس کے ماتحتوں پر حملہ کراتا تب بھی آگ لگنے کا خطرہ تھا۔

میں جسکانی کے ماتحتوں کی آواز سن کر ان کے ذریعے ان کے باس کو ختم کرا سکتا تھا لیکن میں جمال کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے منصوبے کے مطابق آئندہ وہ ہماری ٹیم میں شامل ہونے والا تھا حالانکہ وہ پتھر کی طرح سخت ناقابلِ شکست، اپنے ٹی، ٹی سینٹر کا وفادار اور بہت ہی زبردست قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ جو فیصلہ کر لیتا تھا اسے بدلتا نہیں تھا۔ میں اسے کس طرح بدل سکوں گا یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ فی الحال اس آگ سے بچنے کی تدبیر کرنا تھی اور تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے گھوڑے کو پھر لگام کا ہلکا سا اشارہ دیا اور ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔" ذرا غور سے سنو۔ بہت دور جنریٹر کی آواز سنائی دے رہی ہوگی۔ یہ جنریٹر اسی لیے آن کیا گیا ہے کہ ہم آگ کو اپنی طرف پھیلنے نہیں دیں گے۔ اسے صرف تم لوگوں تک محدود رکھیں گے۔ اس کے لیے دُور دُور تک پانی کے بڑے بڑے پائپ ہیں جن کے ذریعے ہماری طرف بڑھنے والی آگ بجھائی جائے گی اور تمھاری طرف بڑھنے والی آگ کو بھڑکنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا۔"

کرم داد نے پینترا بدلنے کے انداز میں ایک طرف بڑھتے ہوئے کہا۔" جمال احمد جسکانی! تمھاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ تم نے واقعی ایک چال سوچی ہے کہ ہم بے بس ہو گئے ہیں لیکن ایک بات تمھارے دماغ میں نہیں آئی، وہ یہ کہ ہم بھی ٹی ٹی سینٹر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب جان ہتھیلی پر رکھتے ہیں تو جان لینے والوں کی ہتھیلی بھی زندگی سے خالی کر دیتے ہیں۔"

اچانک اس نے ریوالور کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔" خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ خواہ تم آگ ہی لگا دو۔ جب جل کر مرنا ہی ٹھہرا تو تمھیں بھی کیوں زندہ رہنے دیا جائے۔"

یہ کہتے ہی کرم داد نے گولی چلا دی۔ اس کا نشانہ مشکل سے ہی خطا ہوتا تھا لیکن میں نے خطا کرا دیا۔ اِدھر جسکانی بھی نادان نہیں تھا۔ فائر ہوتے ہی گھوڑے کی پیٹھ سے جھک گیا تھا اور مشعل کو ایک جھاڑی میں پھینک دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے ساتھیوں نے بھی گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ دور تک دوڑتے ہوئے گئے اور مشعلیں پھینکتے گئے۔ حور بانو، ریحانہ اور انسپکٹر سب کے سب فائرنگ کر رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب فائرنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آگ لگانے والے گھوڑوں پر سوار تھے اور ہم سے دور نکل گئے تھے۔ دونوں طرف سے آگ بڑھتی آرہی تھی۔ ہم پلٹ کر بھاگنے لگے۔ ہم سے بہت دور ... گھوڑوں کی ٹاپیں بھی ہمارے ساتھ ساتھ آرہی تھیں۔

جمال احمد جسکانی نے چیخ کر کہا۔" اب بھی خیریت چاہتے ہو تو اپنے تمام ہتھیار اور گولہ بارود پھینک دو۔"

کرم داد غصے میں آواز کی سمت فائر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سمجھایا۔" کیوں گولی ضائع کر رہے ہو۔ وہ فائرنگ رینج سے دور ہے۔"

ہم سمت بدل کر آگے بھاگنے لگے۔ آگ اُدھر بھی پھیلتی جارہی تھی۔ دشمن پانی کے پائپ کے ذریعے اُدھر آگ کنٹرول کر رہے تھے جدھر وہ خود تھے۔

ہم بھاگتے بھاگتے اچانک رک گئے۔ جدھر جاتے تھے ادھر دُور ہی سے آگ کے شعلے نظر آنے لگتے تھے۔ جسکانی نے درست کہا تھا۔ دو سو گز کے فاصلے پر ہمیں دوسری طرف سے بھی آگ نظر آئے گی۔ ہم ہر طرف سے گھیرے جارہے تھے۔ میں نے چیخ کر کہا۔" کرم داد! میری بات مانو اور تمام ہتھیار پھینک دو۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔" میں بزدل نہیں ہوں۔ میں نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی۔"

" مصلحت اندیشی یہی ہے کہ اسے وقتی طور پر تسلیم کر لو۔ ہو سکتا ہے اس آگ سے نکلنے کے بعد ہم اپنے بچاؤ کا کوئی اور راستہ اختیار کر سکیں۔ عقل اور ذہانت صرف جمال احمد جسکانی کی جاگیر نہیں ہے' یہ ہمارے پاس بھی ہے۔ ہم آئندہ اسے استعمال کریں گے۔ فی الحال میری بات مان لو۔"

انسپکٹر نے اپنے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا۔" بابر کا مشورہ مناسب ہے کرم داد! پلیز اپنے ہتھیار پھینک دو۔ اس وقت ہمیں آپس میں اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔"

جمال احمد جسکانی گھوڑا دوڑاتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔" بیوقوفو! اب بھی تمھاری جان بچ سکتی ہے۔ ہتھیار پھینک دو۔"

دوسرے ہی لمحے کرم داد نے جھنجلا کر ہتھیار پھینک دیے۔ میں نے چیخ کر کہا۔" جسکانی! ہم نے ہتھیار پھینک دیے ہیں، ہم خالی ہاتھ ہیں۔"

گھوڑے کی ٹاپیں رک گئیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔" جدھر سورج غروب ہو رہا ہے، اس طرف کی آگ بجھنے والی ہے' اس طرف سے پہلے اپنی ساتھی عورتوں کو آگے بڑھاؤ۔ ان کے ساتھ یا ان کے پیچھے تم لوگوں نے آنے یا کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ان عورتوں کو گولی مار دی جائے گی۔"

اس کے ساتھ ہی ادھر کی آگ بجھنے لگی۔ پانی کی تیز دھار آرہی تھی اور آگ کو کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ ہم نے ریحانہ اور حور بانو سے کہا۔" بے جھجک چلی جاؤ۔ ہم ابھی آئیں گے۔"

وہ دوڑتی ہوئی اس بجھے ہوئے حصے سے نکل کر آگ کے احاطے سے باہر چلی گئیں۔ ہم ایک جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے تھے، کیونکہ ہم نے ہتھیار پھینک دیے تھے۔ ہینڈ گرنیڈ بھی نیچے پڑے ہوئے تھے اور آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم نے تیزی سے دوڑ لگائی۔ بہت دُور نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ اچھا ہوا کہ عورتیں ہمارے ساتھ نہیں تھیں،

ورنہ وہ ہماری طرح تیزی سے دوڑ نہیں لگا سکتی تھیں۔ بہرحال جب ہم پچاس گز کے فاصلے پر پہنچ گئے تو اچانک دھماکے ہونے لگے۔ ہینڈ گرینیڈ جو آگ کی زد میں آ گئے تھے، وہ یکے بعد دیگرے پھٹتے جا رہے تھے اور کان پھاڑ دینے والا دھماکا کرتے جا رہے تھے۔

مشکل یہ تھی کہ دوسری طرف سے آگ ہمارے قریب پہنچ رہی تھی۔ نہ ہم آگے جا سکتے تھے نہ پیچھے پلٹ سکتے تھے۔ اسی وقت ایک طرف کی آگ بجھنے لگی۔ جسکانی کی آواز سنائی دی "تم لوگ ادھر سے آ سکتے ہو"

ہم نے یکبارگی دوڑ لگائی، جہاں آگ بجھ چکی تھی وہاں سے دوڑتے ہوئے، چھلانگیں لگاتے ہوئے آگ کے احاطے سے نکل آئے۔ قیامت کی آگ سے سلامت نکل آنے کے بعد ہمیں ہوش و حواس درست کرنے میں چند سکنڈ لگے اور ان چند سیکنڈ میں ہمارے چاروں طرف رائفلیں تن گئیں۔ ہم ان کے نشانے پر تھے۔

گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ جمال احمد جسکانی فاتحانہ انداز میں گھوڑے کی پشت پر سوار لے ایڑ لگاتا ہوا آیا اور کہنے لگا "اپنے بائیں طرف دیکھو۔ ادھر تمہاری عورتیں رسیوں سے بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہیں کہ تم سب اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ان کی موت کا تماشا دیکھو گے ابھی"

ہم نے اپنے اپنے ہاتھ بلند کر لیے۔ دشمنوں نے ہمارے قریب آ کر ہمارے ہاتھوں کو دوسری طرف لا کر پیچھے سے باندھ دیا۔ دونوں پاؤں بھی رسیوں سے اس طرح باندھ دیے کہ ہم چھوٹے چھوٹے قدم بڑھا کر آگے چل سکتے تھے، پھر ان کے حکم کے مطابق ہم چلنے لگے۔ وہ ہمیں ہانک رہے تھے اور گھوڑوں کی پشت پر سوار کبھی کبھی جوتوں کی نوک سے ٹھوکریں بھی لگاتے جاتے تھے۔ کرم داد جھلا کر پلٹتا تھا، غراتا تھا لیکن ریحانہ اور حور بانو کو بے بس اور مجبور دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔

میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ جمال احمد جسکانی، میں تمہیں دوست بنا کر رہوں گا۔ اسی لیے جوتوں کی ان ٹھوکروں کو برداشت کر رہا ہوں۔ یہ انسان کی عظمت ہے کہ وہ دشمن کو دوست بنانے کے لیے کچھ دیر تک ٹھوکریں بھی کھائے۔ اس میں ذلت کا احساس نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس کا انجام بہت خوش آئند ہے۔

آئندہ کیا حالات پیش آنے والے تھے، میں نہیں جانتا تھا۔ میں جسکانی کو دوست بنا بھی سکوں گا یا نہیں۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بس مجھے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ یہ صلاحیتیں بارہا مجھے دھوکا بھی دے چکی تھیں۔ اکثر میری ٹیلی پیتھی ناکام ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود میں جب ایمان کے راستے پر چلتا ہوں اور انسان سے انسان کی طرح سلوک کرنا چاہتا ہوں اور اسے دوست بنانا چاہتا ہوں تو اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہوں۔ اس وقت بھی میں اپنی زندگی کو ہی نہیں، اپنے پیاروں کو بھی داؤ پر لگا رہا تھا۔ ایک دن تو موت آئے گی۔ مجھے بھی آئے گی۔ میرے پیاروں کو بھی آئے گی تو پھر ایک نیک مقصد کے لیے کیوں نہ اپنی اس زندگی کو داؤ پر لگایا جائے۔

وہ ہمیں ہانکتے ہوئے ماماسکن تک لے گئے۔ جمال احمد جسکانی آگے آگے فاتحانہ انداز میں گھوڑے کی پشت پر سوار چل رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رانگا ملا نے خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا "یہ ہے یاروں کا یار، جان پر کھیل جانے والا۔ جو موت کے سامنے بھی خالی ہاتھ جاتا ہے اور موت کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر لے آتا ہے، دیکھو سارے دشمنوں کو جکڑ کر لے آیا ہے"

ایک موٹی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ ہم نے جس دشمن کے تیس آدمی مار دیے، وہ ہمیں گرفت میں لینے کے بعد ہم سے کس طرح کا سلوک کرے گا۔ پہلے تو رانگا ملا آگے بڑھ کر جسکانی سے لپٹ گیا۔ پھر اس کے ہاتھ کو محبت اور عقیدت سے تھام کر کہا "دوست! تم نے دوستی نباہ دی، میرے بہت بڑے نقصان کی تلافی کر دی۔ مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں ہے کہ میرے تیس بندے مارے گئے۔ جب تک اس ملک میں غربت ہے، آدمی انسان سے بلا بلا بے ایمان سے چور، چور سے ڈاکو بنتا رہے گا اور میرے گروہ کے افراد میں اضافہ ہوتا رہے گا"

پھر اس نے ہماری طرف دیکھا۔ جمال احمد جسکانی الگ ہو کر آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا اور دانت پیستے ہوئے کہنے لگا "میں پہلے تو تم سب کے منہ پر تھوکوں گا، اس کے بعد تمہیں ایسے ایسے زخم لگاؤں گا۔ ایسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ تم موت مانگو گے اور تمہیں موت نہیں ملے گی"

ایسا کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگا۔ پہلے اس کا رخ کرم داد کی طرف تھا اور یہ ناممکن سی بات تھی کہ کرم داد اسے تھوکنے کا موقع دیتا اور اسے کسی بھی مصلحت کے تحت برداشت کر لیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ سامنے پہنچ کر اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا، میں

کرم داد کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہو گیا۔ اس کے تحت اس نے کہا "تھوکنے سے پہلے یہ جان لو کہ میں سید ہوں"

رانگا ملا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا، جیسے بجلی کا جھٹکا پہنچا ہو۔ کرم داد واقعی خاندانی سید تھا، وہ یہ بات بھول گیا تھا مگر مجھے یاد تھی۔ سندھ کے علاقے میں سید کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ سیدوں سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے سامنے سر جھکائے رہتے ہیں۔ سید کی آؤ بھگت کی جاتی ہے، جیسے ان کے گھر کوئی فرشتہ آ گیا ہو۔ ایسا صرف سندھ کے دیہاتوں میں ہی نہیں ہوتا، جنگلوں میں رہنے والے ڈاکو بھی سیدوں کا ایسا ہی احترام کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ کرم داد کی زبان سے سید کا لفظ سنتے ہی ماما ایک قدم پیچھے چلا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جھنجلا کر کہا "جھوٹ بولتے ہو، تم سید نہیں ہو"

کرم داد نے بڑے تحمل سے کہا "میں جو کچھ ہوں، بتا چکا ہوں۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ میرے ساتھ جو سلوک کرنا چاہتے ہو، کرو"

رانگا ملا میں اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ آگے بڑھ کر کرم داد کی بے عزتی کرتا۔ اس نے پلٹ کر ریحانہ کی طرف دیکھا۔ کرم داد نے کہا "یہ ایک سید کی شریکِ حیات ہے"

اس نے بے یقینی سے کرم داد کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو سید نہیں ہے"

میں نے کہا "میں اور حور بانو سید نہیں ہیں لیکن سیدوں کے سائے میں ہیں"

رانگا ملا نے حقارت سے ایک ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ "اونہہ، میں اس بات کو نہیں مانتا۔ میں سیدوں کی عزت کرتا ہوں لیکن سیدوں کے سائے میں رہنے والے قاتلوں اور بدمعاشوں کی عزت نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے منہ پر تھوک کر بتاؤں گا کہ تم قابلِ نفرت ہو"

یہ کہتے ہوئے اس نے تھوکنے کے لیے آخ کیا لیکن اس سے پہلے ہی اس کے منہ سے نکلنے والا تھوک باچھوں تک آیا، پھر ٹھوڑی کی طرف بہتا ہوا، گردن سے ہوتا ہوا سینے کی طرف ٹپکنے لگا۔

دوست اور دشمن سب اسے حیرت زدہ ہو کر دیکھ رہے تھے۔ اس نے دوسری بار تھوکنے کی کوشش کی۔ دوسری بار بھی یہی ہوا۔ تھوک ہونٹوں کی دہلیز تک آیا پھر وہ باچھوں سے بہتا ہوا، ٹھوڑی سے گزرتا ہوا سینے پر ٹپک گیا۔

رانگا ملا کئی قدم پیچھے ہٹ کر ہم سب کو حیرانی اور بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ اگرچہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ سیدوں کی عزت کرنے سے خدا اور اس کے رسولؐ خوش رہتے ہیں، لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جن لوگوں نے اس کے تیس آدمیوں کو ہلاک کیا تھا، وہ سید ہیں اور اگر ہیں تو ان کے ساتھ کوئی غیبی مدد بھی شامل ہے۔

ایک پولیس آفیسر جو رانگا ملا کے معزز مہمانوں میں سے تھا، اپنی جگہ سے اٹھ کر انسپکٹر علی مختار میمن کے پاس آ کر بڑے رعب سے بولا "میں نہیں مانتا کہ تم سیدوں کے سائے میں آئے ہو تو میں تمہارے خلاف دفتری کارروائی نہیں کر سکوں گا، میں ضرور کروں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں سنبھلنے کا موقع دیتا ہوں اور تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میرا ساتھ دو گے اور ان سرپھروں کا ساتھ چھوڑ دو گے تو تمہاری ترقی کی سفارش کروں گا۔ تمہارا عہدہ بھی بڑھے گا اور تنخواہ بھی بڑھے گی تمہاری"

"میں ایسے عہدے اور ایسی تنخواہ پر تھوکتا ہوں، جو قانون کا مذاق اڑانے سے حاصل ہوتی ہو"

جمال احمد جسکانی نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ پھر قہقہے لگاتے ہوئے ایک طرف سے دوسری طرف گیا۔ وہاں سے پلٹ کر بولا "میرے یار رانگا! تو جنگل میں رہ کر جنگلی ہی ہو گیا۔ تم سب سیدوں کے فریب میں آ گئے۔ میں کہتا ہوں، ان پر تھوکو۔ انہیں ٹھوکریں مارو۔ انہیں ایسا ذلیل کرو کہ یہ مرنے سے پہلے موت کی دعائیں مانگیں اور انہیں موت نہ ملے۔ اگر تم یہ نہیں کر سکتے تو ایک طرف ہٹ جاؤ۔ میں وہ کر کے دکھاؤں گا جو کوئی نہیں کر سکتا"

میں نے کہا "واہ، جمال احمد جسکانی! کیا شیر نر ہو، شیروں کو پنجرے میں بند کر کے ان کے سامنے مردانگی دکھا رہے ہو، انہیں للکار رہے ہو۔ مرد ہو تو مجھے رسیوں سے آزاد کر دو۔ اپنے رائفل برداروں سے کہو کہ نالیں جھکا لیں پھر مجھ سے پنجہ لڑاؤ تاکہ لوگ دیکھ سکیں ہم میں سے کون شہ زور ہے"

جسکانی نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر کہا "صرف پنجہ لڑانے کی بات نہیں ہے۔ فری اسٹائل ہو گا، منظور ہے؟"

میں نے کہا "منظور ہے"

اس نے حکم دیا "بابر کی رسیاں کھول دی جائیں"

کرم داد نے تڑپ کر کہا "نہیں، میں مقابلہ کروں گا۔ بابر! اس سے مجھے لڑنے دو"

"نہیں کرم داد! اسے میں نے چیلنج کیا ہے۔ میں ہی اس سے مقابلہ بھی کروں گا"

اس نے بے بسی سے کہا "کیوں حماقت کر رہے ہو۔

یہ شخص صرف ہاتھ پاؤں سے ہی نہیں ذہانت سے بھی لڑتا ہے۔ مجھے موقع دو' میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں گا۔"

"ور جو فیصلہ ہونا تھا' وہ ہو چکا۔ تم چپ چاپ تماشا دیکھو۔"

جسکانی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "میرے یار رانگے! موسیقی تھمنے نہ پائے۔ رقص کا اہتمام کرو۔ رقص میں جام ہوگا' ہمارے معزز مہمان مستی میں ہوں گے اور میں دشمن کی ہستی مٹا رہا ہوں گا۔"

میری رسیاں کھول دی گئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر پینترا بدلتے ہوئے اس کے مقابل آکر کہا "جسکانی! ایک بات یاد رکھو۔ میں تمہیں دوست بنانا چاہتا ہوں۔ اگر تم یہ مقابلہ ہار گئے تو میرے بہترین دوست بن جاؤ گے؟"

وہ حقارت سے بولا "اپنی بزدلی کو دوستی کے پردے میں نہ چھپاؤ۔"

"میں نے تمہیں دوست کہہ دیا ہے۔ اس لیے پہلا حملہ میری طرف سے نہیں ہوگا۔ تم کوشش کر دیکھو۔ جب ناکام ہو جاؤ گے، تب میں بتاؤں گا کہ حملے کس طرح کیے جاتے ہیں۔"

اس نے یکبارگی پینترے بدل کر کراٹے کا پوز بنایا پھر ایک ماہر بلیک بیلٹر کی طرح زبردست چیخ ماری۔ ایسی چیخوں سے دشمن کو دہشت زدہ کیا جاتا ہے۔ اس نے کراٹے کا ایک ہاتھ مجھ پر رسید کیا۔ میں نے خود کو بچا لیا۔ پھر دوسرا ہاتھ رسید کیا ... نے اسے بھی روک لیا۔ پھر گھوم کر لات ماری۔ اس کی لات گھوم کر رہ گئی۔ اس نے صرف ایک ساعت کے لیے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے چھلانگ لگائی، فضا میں پرواز کی اور مجھے ایک فلائنگ کِک ماری۔ میں اُدھر سے ہٹ گیا۔ وہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ وہ اتنا پھرتیلا تھا کہ اس کے حملوں سے شاذ و نادر ہی کوئی بچ کر نکل سکتا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ میں خیال خوانی کے ذریعے اس کے ارادوں کو پہلے ہی سمجھ لیتا ہوں اور اپنا بچاؤ کر لیتا ہوں۔

میں اسے دماغی طور پر ذرا سا بہکا کر حملے کر سکتا تھا، اور زخمی کر سکتا تھا لیکن میں اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا اور دوست کو زخم نہیں پہنچائے جاتے۔

موسیقی کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ کئی عورتیں رقص کرنے کے لیے معزز مہمانوں کے سامنے آ گئی تھیں اور بڑی بے حیائی سے تھرک رہی تھیں۔ یہ مختلف شہروں کے بازارِ حسن سے لائی گئی تھیں ورنہ کوئی شریف زادی اس طرح تھرکنا پسند نہ کرتی۔

اس وقت اندھیرا ہو چلا تھا۔ جنریٹر کے ذریعے ماحول کو روشن کر دیا گیا تھا۔ ایک رقاصہ سائیں سراج آدم کے سامنے رقص کرتی ہوئی آئی تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف ہٹا دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کہنے لگا "رانگا! یہ کیا ہے؟ ایسی عورتیں تو ہمیں شہروں میں بہت مل جاتی ہیں۔ تم نے تو کہا تھا گاؤں، دیہات کی خوبصورت لڑکیاں رقص کریں گی۔ کہاں ہیں وہ حسین و جمیل لڑکیاں؟"

رانگا ماما نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دو بار تالی بجائی اور ... "لڑکیوں کو حاضر کیا جائے۔"

چند لمحوں بعد لڑکیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ انھیں چند مسلح جوان ہانکتے ہوئے، دھکیلتے ہوئے لا رہے تھے۔ سب سے آگے جو لڑکی تھی، وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "میں مر جاؤں گی لیکن کسی غیر کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

ایک نوجوان نے رائفل کے کندے سے اس کی پیٹھ پر ضرب لگائی۔ وہ چیختی ہوئی لڑکھڑاتی ہوئی آگے آ کر گری۔ پھر ایک پتھر پر سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ گئی۔ یکبارگی میرا دماغ روشن ہو گیا۔ بڑی تیزی سے ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ میں فوراً ہی اس لڑکی کے دماغ پر قابض ہو گیا۔ اب وہ زمین پر سے اٹھ رہی تھی اور سامنے دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر دیکھنے کا انداز ایسا ہو گیا جیسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو۔ وہ ایک ہاتھ آگے بڑھا کر بولی "کیا ہو گیا؟ اچانک اندھیرا کیوں چھا گیا؟ کیوں اندھیرا کر دیا گیا ہے؟ میں اس تاریکی میں بھی اپنی عزت کی حفاظت کر سکتی ہوں۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

وہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر چیخیں مارنے لگی "یہ کیا ہو گیا ہے؟ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہا ہے؟"

جسکانی لڑنا بھول گیا۔ اسے گہرے جذبوں سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کے پاس جا کر بولا "تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہاں بتیاں جل رہی ہیں۔ یہاں بہت تیز روشنی ہے۔ ٹھیک طرح سے دیکھو۔"

وہ دونوں ہاتھ آگے ... کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ راستہ ٹٹولنے کے انداز میں ... ہٹتے ہوئے بولی "مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ میں اندھی ہوں۔ کاش میرا بھائی یہاں ہوتا۔ میرا غیرت مند بھائی جو اندھی بہن کو کسی داؤ پر لگنے نہ دیتا۔ وہ صرف ڈاکوؤں سے نہیں، قانون سے ٹکرا جاتا۔"

اندھی کے یہ الفاظ نہیں تھے بارود کا دھماکا تھے۔ انھوں نے جمال احمد جسکانی کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا۔ اس کے دماغ میں پے در پے دھماکے ہو رہے تھے۔ ہر دھماکے کے ساتھ نظروں کے سامنے اپنی اندھی بہن لبنیٰ کا چہرہ طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی بہن راستہ ٹٹول رہی تھی اور پوچھ رہی تھی "مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ کس کے پاس لے جا رہے ہو؟"

دوسرے دھماکے کے ساتھ منظر بدل گیا۔ اب اس کی بہن ایک شیطان نما انسان کے گھر میں تھی۔ وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتی تھی اور اپنے بھائی کو آوازیں دے رہی تھی "بھیا! مجھے بچاؤ۔ میں اندھی ہوں، بے بس ہوں۔ مجھے ظالموں نے گھیر لیا ہے۔ میں تمہاری غیرت ہوں۔ تمہیں جب معلوم ہوگا کہ میری عزت خاک میں مل گئی ہے تو مارے غیرت کے تم مر جاؤ گے۔"

دوسرے ہی لمحے جمال احمد جسکانی نے بے اختیار اپنے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ چیخ کر کہا "نہیں نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی تم پر میلی نظر نہیں ڈال سکتا۔ رانگے" ابے او رانگے! یہ لڑکیاں کہاں سے لائی گئی ہیں؟ یہ کس گھر کی عزت ہیں؟ کس باپ کی بیٹیاں اور کس بھائی کی غیرت ہیں؟ یہ کیوں لائی گئی ہیں؟"

سائیں سراج آدم نے بھی اٹھ کر کہا "تم رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہو۔ یہ کس کی بیٹیاں ہیں؟ کس کی بہنیں ہیں ہمیں اس سے کیا غرض ہے۔ تم آم کھاؤ، پیڑ نہ گنو۔"

ایک زمیندار نے کہا "ہم ان دو ٹکے کی لڑکیوں کو، ان کے والدین کو کچل کر نہیں رکھیں گے تو یہ ہمارے منہ چڑھ آئیں گے۔"

جمال احمد جسکانی ایک ایک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے رانگا ماما کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے غرا کر پوچھا "انھیں تو کہاں سے لایا ہے؟ کس سے پوچھ کر لایا ہے؟ مجھے اپنا مہمان بنانے سے پہلے تو نے یہ کیوں نہ سوچا کہ جسکانی کبھی ایک نہایت غریب بہن کا غریب بھائی تھا۔ غریب باپ کا غریب بیٹا تھا۔ بہت مجبور تھا، بے بس تھا۔ میری بہن کو ایسے ہی وڈیروں اور زمینداروں نے کھلونا بنا دیا تھا۔ ایسے ہی ایک بد دیانت پولیس آفیسر نے اسے ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ تیری اس غلطی کی سزا تیری موت بھی ہو سکتی ہے اور وہ موت جمال احمد جسکانی کے ہاتھوں سے آئے گی۔"

رانگا ماما نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "دیکھ جسکانی! تو میرا یار ہے۔ میں تیری عزت کر رہا ہوں۔ تو میرا مہمان ہے۔ میں تیری اس بدتمیزی پر تجھے صرف سمجھا سکتا ہوں۔ میں اس جنگل کا بادشاہ ہوں۔ میں شہ زور ہوں لیکن میری بادشاہت کو قائم رکھنے میں ان پولیس افسروں، ان وڈیروں اور جاگیرداروں کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں انہیں خوش نہیں رکھوں گا تو میری بادشاہت قائم نہیں رہ سکے گی۔"

جسکانی نے اسے جھڑک کر کہا "بادشاہ کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں صرف ایک انسان ہوتا ہے، ہمارے تمہارے جیسا ایک معمولی انسان۔ تو اس جنگل میں ایک دہشت ناک ڈاکو ہے۔ اس میں تیری صلاحیت کا، تیری شہ زوری کا دخل نہیں ہے۔ جو کچھ ہیں، تیرے وہ فرمانبردار ہیں جو تیرے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ ہیں یہ وڈیرے اور جاگیردار ہیں جو تیرے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ جو کچھ ہیں یہ رشوت خور افسران ہیں جو قانون سے چھپ کر جنگل میں منگل منانے آتے ہیں اور اپنے حصے کی رقم لے جاتے ہیں اور تجھے چھوٹ دیتے رہتے ہیں۔ اگر ایک بار قانون تیری کلائی پکڑ لے پھر تو اپنی کلائی کبھی نہیں چھڑا سکے گا۔"

رانگا ماما نے پھر پیچھے ہٹ کر کہا "دیکھ جسکانی! میں تجھے آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ دوستی کو قائم رہنے دے۔"

"میں بھی تجھے آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ جتنی شریف بہو بیٹیاں اُٹھا کر لائی گئی ہیں، انہیں خود لے جا کر ان کے گھروں میں پہنچا دے ورنہ ..."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے رانگا ماما نے اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا "میرے یار! کیوں بے وقوف بن رہا ہے؟ کیوں بحث کر رہا ہے؟ مان جا، ہماری نظروں میں یہ شریف بہو بیٹیاں نہیں ہیں۔ دو کوڑی کی بھی نہیں ہیں۔"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جسکانی نے اپنے گریبان کو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا۔ پھر اس کے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے جھکا دیا۔ رانگا ماما دوسری طرف گھوم گیا۔ دوسرے ہی لمحے جسکانی نے اس کی گردن کو اپنے ایک بازو میں دبوچ لیا پھر ایک ہاتھ کو اٹھاتے ہوئے کہا "خبردار! کسی نے گولی چلانے کی کوشش کی تو یہ جسکانی کا ہاتھ ہے۔ یہ ہاتھ جس گلے کا زیور بن جاتے ہیں، وہاں سے آخری سانس کھینچ کر لے جاتے ہیں۔"

رانگا ماما کے دیدے پھیل رہے تھے۔ اس کی سانس اٹک اٹک کر آ رہی تھی۔ جسکانی نے درست کہا تھا۔ بادشاہ اپنی ذات میں ایک عام انسان ہوتا ہے۔ اس کی قوت کا سرچشمہ تو وہ چمچے ہوتے ہیں جو اس کے آس پاس ہوتے ہیں۔ جمال احمد جسکانی نے گرج کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہے کوئی مجھے گولی مارنے والا؟ اگر ہے تو پہلے اپنے سردار سے پوچھ لے۔ میں گولی کھانے کے بعد مر جاؤں گا یا تمہارے سردار کو بھی لے مروں گا۔"

میں مسکرانے لگا۔ بازی پلٹ گئی تھی۔ جمال احمد جسکانی نے اپنی زندگی کی ایک نئی کروٹ لی تھی۔ اس راستے پر قدم رکھ رہا تھا جو ہر بہن کی طرف اور میری دوستی کی طرف آتا ہے۔

رانگا ماما کے اب کتنے آدمی رہ گئے تھے؟

صرف بائیس آدمی۔ تیس آدمی پہلے ہی مارے جاچکے تھے۔اب جورہ گئے تھے' وہ سوچ رہے تھے، اپنے سردار کو جمال احمد جسکانی کے چنگل سے چھڑایا جائے یا اور انتظار کرلیا جائے۔کیونکہ وہ دونوں گہرے دوست تھے، اور دوست آپس میں لڑتے بھی ہیں اور گلے بھی ملتے ہیں۔

میں نے رانگا ماما کے ایک ماتحت کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا "اگر میں جسکانی کو گولی ماروں گا تو بعد میں رانگا میرے گلے پڑجائے گا۔ پوچھے گا' میں اس کے دوست کو گولی مارنے والا کون ہوتا ہوں۔ پھر مجھے سزائے موت ہوگی "

وڈیرے اور زمیندار وغیرہ جو مہمان بن کر آئے تھے' وہ تذبذب میں تھے۔ رانگا ماما اور جمال احمد جسکانی دونوں ہی اپنی جگہ ایسے دہشتناک تھے کہ وہ کھلم کھلا کسی ایک کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے اور کسی ایک کی مخالفت نہیں کرسکتے تھے۔

آخر رانگا ماما کے خاص مہمان پولیس آفیسر نے آگے بڑھ کر اپنے ریوالور کی نال جمال احمد جسکانی کی کنپٹی پر رکھ دی اور کہا۔ "ریوالور کسی کا دوست نہیں ہوتا۔اسے دشمنی کا موقع نہ دو۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں، رانگا ماما کو چھوڑ دو۔"

جمال احمد جسکانی نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے گولی مارنے سے پہلے اپنے دوست سے پوچھ لو۔گولی چلتے ہی اس کی ہڈی کس طرح ٹوٹ سکتی ہے "

رانگا ماما نے پھنسی پھنسی آواز کے ساتھ کہا "نن نہیں، اسے گولی نہ مارنا "

پولیس آفیسر نے کہا "تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو۔ گولی پلک جھپکتے ہی کھوپڑی میں سوراخ کردے گی۔ یہ اتنی جلدی تمہاری گردن نہیں توڑ سکتا "

انسپکٹر علی مختار میمن نے کہا "آفیسر! بڑے شرم کی بات ہے۔ آپ کو اس شخص کا ساتھ دینا چاہیے جو ڈاکو کی گردن دبوچ رہا ہے۔ اس کے برعکس آپ ڈاکو کا ساتھ دے رہے ہیں "

آفیسر نے ڈانٹ کر کہا "بکواس مت کرو۔تم کیا سمجھتے ہو' یہاں سے زندہ واپس جاسکو گے؟ "

"تم بھی یہی سمجھ رہے ہو۔اب میں تمہیں تم کہوں گا، آپ نہیں کیونکہ میں کسی بے ایمان اور قانون شکن کو اپنا آفیسر تسلیم نہیں کرسکتا "

جسکانی نے گرج کر کہا "میں رانگے کے تمام آدمیوں سے کہتا ہوں' وہ اپنے اپنے ہتھیار یہاں میرے سامنے پھینک دیں ورنہ اپنے سردار سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے "

پولیس آفیسر نے سوچا "چشم زدن میں گولی مارتے ہی سارا کھیل ختم ہوجائے گا " اس نے فوراً ہی ٹرائیگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا۔میں نے اس کے ساتھ ہی ریوالور والے ہاتھ کو جھٹکا پہنچا دیا۔ فائر ہوتے ہی رانگا ماما کے ایک آدمی کی چیخ نکلی۔ وہ زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔جمال احمد جسکانی نے اپنے ایک ہاتھ کی کہنی آفیسر کے پیٹ میں ماری۔ پھر دوسرا کراٹے کا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ آفیسر کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔جسکانی نے ریوالور والے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام کر جوڈو کا داؤ استعمال کیا تھا، جس کے باعث وہ قلا بازی کھا کر چاروں شانے چت گرا تھا۔

میں نے اس ہنگامے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کرم داد کو رسیوں سے آزاد کردیا اور جمال احمد جسکانی کے دماغ میں ایسا جذبہ پیدا کیا، جس کے تحت اس نے انسپکٹر کے ریوالور کو ہماری طرف اچھالتے ہوئے کہا "اسے سنبھالو، ابھی اور ہتھیار ملیں گے "

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے کرم داد نے ایک چھلانگ لگائی، آگے جاکر قلا بازی کھائی۔ پھر رانگا ماما کے پاس پہنچ گیا۔ وہ گھٹنے زمین پر ٹیک کر اپنے گلے کو سہلاتے ہوئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔کرم داد نے ریوالور کی نال اس کے گلے پر رکھتے ہوئے کہا "یہاں پہلے جسکانی کا ہاتھ تھا اب میرا ریوالور ہے۔ میں تمہارے یار کی طرح زیادہ چھوٹ نہیں دوں گا۔ فوراً اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ ہتھیار پھینک دیں ورنہ مجھے تین تک گنتی نہیں آتی "

تین گننے سے پہلے ہی رانگا ماما نے چیخ کر کہا "اپنے ہتھیار پھینک دو "

میں نے سائیں سراج آدم کے دماغ پر قابض ہوکر اسے مجبور کیا۔ اس نے بھی کہا "اپنے سردار کی بات مانو اور ہتھیار پھینک دو۔ اس کی زندگی ہمارے لیے قیمتی ہے۔ ہم ابھی جمال احمد جسکانی کو سمجھا لیں گے۔ ہتھیار فوراً پھینک دو۔ابھی دشمنی ختم ہوجائے گی "

میں نے وہاں موجود سب زمینداروں اور جاگیرداروں کی زبان سے بھی یہی کہلوایا۔ رانگا ماما کے ماتحت اپنی من مانی نہیں کرسکتے تھے۔ایک طرف سارے زمیندار اور وڈیرے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ دوسری طرف ایک پولیس آفیسر زمین پر چاروں شانے چت پڑا تھا اور اس کی گردن پر جمال احمد جسکانی کا پاؤں رکھا ہوا تھا اور آخری فیصلہ کن بات یہ تھی کہ ان کے سردار کے گلے سے ریوالور کی نال لگی ہوئی تھی۔

اس کے تمام ماتحتوں نے اپنی اپنی رائفلیں سردار کے

سامنے پھینک دیں۔ اس دوران میں نے حور بانو، ریحانہ اور انسپکٹر علی مختار میمن کو بھی رسیوں سے آزاد کردیا تھا۔ ہم سب نے رائفلیں اور کارتوس کی پیٹیاں اٹھالیں۔ اس کے بعد ایک دوسرے کی پشت سے پشت لگا کر اس طرح کھڑے ہوگئے کہ چاروں طرف نظر رکھ سکیں۔ کوئی ہماری مرضی کے خلاف کوئی حرکت نہ کرسکے۔ چاروں طرف ہماری رائفلیں تنی ہوئی تھیں۔

میرا تابعدار بہت خوش نظر آرہا تھا۔ جن رسیوں سے ہمیں باندھا گیا تھا' وہ تمام رسیاں اٹھا کر لے آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا "جنھوں نے آپ لوگوں کو باندھا تھا' کیا اب انہیں باندھا جائے؟"

انسپکٹر علی مختار میمن نے کہا "ہاں، سب سے پہلے اس قانون شکن کو باندھو جو خود کو پولیس آفیسر کہتا ہے، اور ہمارے محکمے کو بدنام کرتا ہے "

سب سے پہلے اسی کو باندھا گیا۔جسکانی کھڑا سوچ رہا تھا' اسے اچانک کیا ہوگیا ہے؟ یہ انقلابی تبدیلی اس میں کیسے آگئی؟ اس نے گھوم کر اس لڑکی کو دیکھا، جسے ایک ڈاکو نے رائفل کے کندے سے مارا تھا اور وہ زمین پر گر پڑی تھی۔ وہ ایک اندھی بہن کی مظلومیت کا مارا تھا۔ ہر اندھی اسے اپنی بہن نظر آتی تھی، ایسی بہن جو ڈاکوؤں کے درمیان گھری ہو' جس کی عزت خطرے میں ہو، اس کی حالت دیکھ کر جمال احمد جسکانی کے دل و دماغ میں انقلابی تبدیلی کیسے نہ آتی۔

وہ لڑکی دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اسی طرح زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جسکانی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں تمہارا بھائی ہوں "

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور خوش ہوکر بولی "یہ کیا؟ یہ تو مجھے پھر نظر آنے لگا ہے "

وہ خوش ہوکر اٹھ گئی۔چاروں طرف دیکھنے لگی۔جب گرنے کے بعد آنکھوں میں اندھیرا چھایا تھا' تب سے اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ انہیں کھولتے ہوئے گھبرا رہی تھی کہ پھر تاریکی ہی تاریکی نظر آئے گی۔ وہ خود کو اندھی سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ جسکانی نے کہا "میری بہن! یہ قدرت کی کاریگری ہے۔اس نے تمہاری آنکھیں بند کرکے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ دیکھ لو، میں نے ان سرکش ڈاکوؤں، مغرور وڈیروں اور زمینداروں کو کس طرح بے بس کردیا ہے "

وہ یہ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چپ ہوگیا۔ اس کی سوچ کہہ رہی تھی "واقعی بابر نے مقابلے کے دوران درست کہا تھا وہ مجھے دوست بنانے آیا ہے اور دوست بنا کر رہے گا "

حیرت ہے' میں نے انسپکٹر کا ریوالور اٹھا کر ان کی طرف کیوں پھینک دیا تھا۔ شاید اس طرح غیر شعوری طور پر ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور اب میں ان سے کس طرح دشمنی کرسکتا ہوں "

میں نے اس کی سوچ کے جواب میں تابعدار کے ذریعے کہلوایا "جناب جسکانی صاحب! یہ بابر صاحب اور ان کے آدمی، عورتوں کی بڑی عزت کرتے ہیں۔کل شام کو مختلف علاقوں سے شریف لڑکیوں کو لاکر یہاں سے تیس میل دور ایک مکان میں رکھا گیا تھا۔ وہ بھی یہاں لائی جانے والی تھیں، انھوں نے ان بہنوں اور بیٹیوں کو انسپکٹر میمن صاحب کے حوالے کردیا۔ اب وہ ایک بستی میں عزت و آبرو سے محفوظ ہیں۔ یہاں سے جانے کے بعد انھیں ان کے گھروں میں پہنچا دیا جائے گا"

جسکانی سن رہا تھا اور ہمیں عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ میری مرضی کے مطابق سوچنے لگا "اب تو دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں ایک اندھی لڑکی کو دیکھ کر اپنی مرحوم بہن کے دُکھ درد کو سمجھتا ہوں۔ حالانکہ آنکھوں والیاں بھی مظلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا' یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ مجھے ہر مظلوم لڑکی کو اپنی بہن سمجھنا چاہیے "

وہ یہ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی پھر اس نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ خود آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اس کی پیٹھ کو تھپکتے ہوئے کہا "یہ میری دوسری فتح ہے "

جسکانی نے پوچھا "دوسری فتح کا مطلب کیا ہوا؟"

"پہلے میں نے ریحانہ اور کرم داد کے دل جیتے تھے۔ اس کے بعد تمہیں جیت رہا ہوں۔ میں نے عزم کیا ہے، تخریب کاروں کے خلاف ایک ایسی منظم جماعت بناؤں گا، جس میں ہم سب ہوں گے۔ ہم نے مختلف ٹی ٹی سینٹروں سے جو کچھ سیکھا ہے' وہ ہم ان کے خلاف استعمال کریں گے "

جمال احمد جسکانی نے مجھ سے الگ ہوکر پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر کہا "یہ کیسے ممکن ہے۔ میں نے ٹیررسٹ ٹریننگ سینٹر میں اپنے انسٹرکٹر اور وہاں کے سربراہ کے سامنے حلف اٹھایا ہے۔ قسم کھائی ہے کہ ان کا وفادار رہوں گا "

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "جب تم پیدا

ہوئے تھے تو تمھاری ماں نے دودھ پلانے سے پہلے تمھیں اذان سنوائی تھی۔ یہ اذان ایک معاہدہ ہے، اپنے مذہب سے، اپنی زمین سے اور اپنی ماں سے کہ اسے ننھی سی جان، جب اذان سُننے کے بعد تم دودھ پیوگے تو جوان ہونے کے بعد دودھ میں پانی نہیں ملاؤ گے۔"

وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے کہا "بے شک، ایک نوزائیدہ بچّہ اپنی مرضی سے اذان نہیں سنتا لیکن ہم اس لیے سُناتے ہیں کہ بنیادی معاہدہ قائم رہے۔ اگر یہ پسند نہ ہو تو جوانی میں اسے توڑ دیا جائے۔ تم نے جوان ہو کر تعلیم اور شعور حاصل کرنے کے بعد اذان کے معاہدے کو کیوں نہیں توڑا؟ کیوں آج تک مسلمان ہو؟ اور اگر مسلمان ہی ہو تو اپنی قوم اور ملک سے الگ ہو کر کسی سے کوئی معاہدہ کیسے کر سکتے ہو؟"

جسکانی نے کہا "میں مسلمان ہوں اور انشاءاللہ مسلمان رہوں گا۔ باہر کا کوئی معاہدہ میرے خیالات تو بدل سکتا ہے مگر مذہب کو نہیں بدل سکتا۔"

"ایسے خیالات کیوں اپناتے ہو جن سے مذہب، ملک اور ملّت کو نقصان پہنچے۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ باہر کے ملکوں سے گٹھ جوڑ کر کے انقلاب لاؤ گے۔ باہر سے آنے والا کپڑا ہو، کاسمیٹکس کا سامان ہو یا انقلاب ہو۔ وہ بدیسی مال ہی ہوتا ہے اور بدیسی مال ہمارے ملک کی آب و ہوا اور مزاج کے موافق کبھی نہیں ہوتا۔"

میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر اس کی طرف انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا "جسکانی! تم ٹیرر سینٹر والوں کے دستِ راست بن کر یہاں سے پشاور تک چلے جاؤ۔ ہر مقام پر تمھارے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوتی جائے گی کہ تم ایسے لوگوں کا ساتھ دے رہے ہو جو تمھارے ملک میں آگ لگانا چاہتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں، وہ حکومت کو خوش کرنے کے لیے اور جنگل میں منگل منانے کے لیے تمھاری بہنوں اور بیٹیوں کی عزّت کو کھلونا بنا رہے ہیں۔"

وہ ذرا تلملا گیا۔ دونوں مٹّھیاں بھینچنے لگا۔ میں نے کہا۔ "کیا تمھارے ٹی ٹی سینٹر سے تربیت حاصل کرنے والی لڑکیاں یہاں آ کر بڑے بڑے افسران کو نہیں پھانستی؟ کیا وہ لڑکیاں ہمارے ملک سے تعلق نہیں رکھتیں؟ کیا وہ ہماری بہنیں نہیں ہیں؟ پھر تم انھیں ایسی حرکتوں کی اجازت کیوں دیتے ہو؟ ذرا غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہم سب نے مختلف ٹی ٹی سینٹروں میں جا کر صرف اپنے ملک کا سودا نہیں کیا بلکہ اپنی عورتوں کی عزتوں کا بھی سودا کیا ہے۔"

حور بانو نے جسکانی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "جس ٹی ٹی سینٹر سے تمھارا تعلق ہے اس سے میرے والدین کا تعلق برسوں سے ہے۔ میں نے اور بھی ایسے گھرانے دیکھے ہیں جو اس سینٹر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی بھی مشن کے دوران ہمارے لیڈر کا حکم ہوتا ہے کہ وہ اپنی جوان لڑکیوں کو کسی کے سامنے بھی چارہ بنا کر پیش کر دیں اور مشن کی تکمیل کریں۔ یہاں وفاداری یہی سمجھی جاتی ہے کہ اپنی عزت داؤ پر لگا کر اپنے مقاصد حاصل کیے جائیں۔"

ریحانہ نے آگے بڑھ کر کہا "پرسوں رات حور بانو کو بابر کی خواب گاہ میں بھیج دیا گیا، تاکہ بابر کو ٹریپ کر کے مائکل شون کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔"

حور بانو نے کہا "جمال احمد جسکانی! جانتے ہو، کیا ہوا؟ میں پرسوں رات اس کی خوابگاہ میں گئی لیکن وہاں سے ایسے ہی واپس آئی جیسے ماں کے پیٹ سے آئی تھی۔ کل کی رات بھی ہم نے ایک ہی کمرے میں گزاری۔ میں گہری نیند سوتی رہی اور یہ شخص میری عزت کا محافظ بنا رہا۔ ٹی ٹی سینٹر والوں نے مجھے بے شرمی کے جہنّم میں جھونک دیا تھا۔ مجھے باحیا و باکردار رکھنے والا کون ہے۔ تم بتاؤ، تمھارے ٹی ٹی سینٹر والے یا بابر؟"

جمال احمد جسکانی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "حور بانو! مجھے تمھارے متعلق بتایا گیا ہے کہ تم نے کم گریزی کو دھوکا دیا ہے۔ سینٹر کے مفاد کے خلاف کام کیا ہے اور بابر کے ساتھ فرار ہو گئی ہو لیکن تم لوگوں کی باتیں سُن کر اور کھلی حقیقتوں کو دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں تم سب سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے میں بھی تمھارے ساتھ ہوں۔"

حور بانو اور ریحانہ نے آگے بڑھ کر محبّت اور عقیدت سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ میں، کرم داد اور انسپکٹر علی مختار میمن آگے بڑھ کر اسے محبّت سے تھپکنے لگے۔

اسی دوران ہم اپنے دشمنوں کی طرف سے بھی محتاط تھے۔ ہمارے پاس ان کے ہتھیار پڑے ہوئے تھے اور کچھ ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ جسکانی کے وہ چاروں ماتحت جو اس کے ساتھ مشعلیں لیے گھوڑوں پر آئے تھے، انھوں نے میرے تابعدار کے ساتھ مل کر تمام ڈاکوؤں، وڈیروں، زمینداروں اور پولیس آفیسر کو الگ الگ درختوں سے باندھ دیا تھا۔ جمال احمد جسکانی نے رانگا ماما کی طرف بڑھ کر کہا "مجھے اپنے سینٹر سے ہدایت دی گئی تھی کہ یہاں پہنچ کر تجھ سے دوستی کروں اور میں نے دوستی کی لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ تو... بےغیرت دلال ہے۔ شریف بہو بیٹیوں کو ان کے گھروں سے

اُٹھا کر ان لوگوں تک پہنچاتا ہے جو معزز کہلاتے ہیں۔ انہیں خوش کرتا ہے۔ لعنت ہے تجھ پر۔"

انسپکٹر علی مختار میمن نے کہا "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم انہیں یہاں سے کسی قریبی بستی کی طرف لے جائیں یا پولیس کی بھاری جمعیت کو یہاں طلب کیا جائے؟"

میں نے کہا "انھیں باندھ کر یہاں سے اس طرح لے جایا جائے گا جس طرح یہ ہمیں بلانا چاہتے تھے، یعنی گھوڑوں کی پیٹھ پر ہم سوار ہوں گے اور انھیں ٹھوکریں مارتے ہوئے لے جائیں گے، لیکن اس میں کچھ دشواریاں بھی ہیں۔ راستے میں کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ بہتر ہے کہ کسی طرح قریبی بستی والوں سے رابطہ قائم کیا جائے۔ شاید وہاں ٹیلیفون ہو تو ہم پولیس کے اعلیٰ افسران سے رابطہ قائم کر سکیں گے۔"

جسکانی نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر نکالتے ہوئے کہا "میرے پاس یہ ہے۔ کیا انسپکٹر اس سے کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟"

علی مختار میمن نے ٹرانسمیٹر لے کر خوش ہوتے ہوئے کہا "مشکل آسان ہو گئی ہے۔ میں ابھی اعلیٰ افسران سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔"

وہ ایک طرف جا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور رابطہ قائم کرنے لگا۔ میں نے کہا "جسکانی! تم اگر ان کی نگرانی کرتے رہو تو میں اور کرم داد ذرا یہاں کی تلاشی لے لیتے ہیں۔"

"بے فکری سے جاؤ۔ اوّل تو یہ سب بندھے ہوئے ہیں۔ دوسرے کوئی آ کر ان کی مدد کرنا چاہے گا تو اپنی جان سے جائے گا۔"

اس نے تمام لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم یوں سمجھ لو کہ اپنے بھائیوں کی پناہ میں ہو۔ آزادی سے ہنستی بولتی رہو۔ یہاں کھانے کے جو انتظامات کیے گئے ہیں، وہ انتظامات اپنے ہاتھوں میں لے لو۔ معزز مہمان درختوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے سامنے بیٹھ کر کھائیں گے۔"

تمام لڑکیاں خوش ہو کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئیں۔ حور بانو اور ریحانہ... بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ماما مسکن بنایا گیا تھا۔ گھنے درختوں کے سائے میں یہ دور سے نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی فضائی پرواز کے دوران اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ پہاڑی کے دامن میں ایک قدرتی غار تھا، جسے رانگا ماما نے اپنی رہائش گاہ بنا لیا تھا۔ اسے [illegible] کے لیے [illegible] دامن میں چھوٹی چھوٹی جھگیاں بنا رکھی تھیں۔ میں نے اور کرم داد نے غار کے اندر پہنچ کر دیکھا۔ وہاں بھی جنریٹر کے [illegible] بلب روشن تھے۔ غار کے کتنے ہی حصّوں میں بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان صندوقوں کو کھول کھول کر دیکھا وہ سونے چاندی کے زیورات سے بھرے ہوئے تھے، ان میں نوٹوں کی گڈیاں بھی تھیں۔ جہاں زیورات تھے وہاں کچھ سہاگنوں کے جوڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے وہ جوڑے اُٹھا لیے۔ پھر غار سے باہر آ کر جمال احمد جسکانی کو دکھاتے ہوئے کہا "یہاں لاکھوں روپے کے زیورات اور نقدی موجود ہے۔ زیورات کے ساتھ یہ جوڑے بھی ملے ہیں۔ اس کا مطلب ہے تمھارے اس کمینے دوست رانگا ماما نے باراتوں کو بھی لوٹا ہے، یہ جوڑے ان دلھنوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان سُنا رہے ہیں۔"

جمال احمد جسکانی نے یہ سُنتے ہی رانگا ماما کے منہ پر ایک اُلٹا ہاتھ رسید کیا۔ علی مختار میمن نے کہا "اسے مارنا فضول ہے۔ میں اپنے افسران سے بات کر چکا ہوں۔ وہ پہلے تو یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ میں نے صرف چند جانباز ساتھیوں کی مدد سے تمام ڈاکوؤں پر قابو پا لیا ہے اور ان کے سردار رانگا ماما کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رانگا ماما کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "یہ ٹرانسمیٹر آن ہے۔ دوسری طرف ہمارے افسران ہماری باتیں سُن رہے ہیں۔ تم انہیں یقین دلاؤ کہ ہم نے تمہیں گرفتار کر لیا ہے۔"

وہ غصّے سے جھنجلا کر بولا "میں کیوں یقین دلاؤں۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔ میرا نام رانگا ہے رانگا۔ کوئی مجھے گرفتار نہیں کر سکتا۔ مجھے یہاں سے لے کر تو چلو۔ راستے میں میرے دوسرے ساتھی ضرور مجھے چھڑا کر لے جائیں گے۔"

انسپکٹر نے پوچھا "اچھا تو تم ہمارے افسران کو یقین نہیں دلاؤ گے کہ تم رانگا ماما ہو؟"

"میں تمھارے افسروں کے سامنے زبان تک نہیں کھولوں گا چاہے میری جان لے لو۔"

انسپکٹر نے مسکرا کر کہا "شکریہ۔ یہ ٹرانسمیٹر آن تھا۔"

دوسری طرف سے کہا گیا "انسپکٹر علی مختار میمن! تم نے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب اس گھنے جنگل میں پہنچنے کا مسئلہ ہے۔ رات کا وقت ہے۔ جیسا کہ تم کہہ چکے ہو، [illegible] میل کا فاصلہ گھوڑوں کی پیٹھ پر طے کرنا پڑتا ہے۔ یہاں گھوڑے دستیاب نہیں ہو سکتے۔ میں ابھی اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔ ان سے ہیلی کاپٹروں کی فراہمی کے لیے درخواست کروں گا۔ اگر یہ ہیلی کاپٹر مل گئے تو میں پولیس فورس کے ساتھ آدھی رات سے پہلے ہی وہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اس

دوران ہمارے درمیان رابطہ قائم رہے گا۔"

اب یہ ساری ذمے داری انسپکٹر علی مختار میمن کی تھی۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔ کرم داد اور جمال احمد جسکانی نے پیٹیاں کھول کر شراب کی بوتلیں نکال لی تھیں اور منہ سے لگا کر پینا شروع کر دیا تھا۔ ہری ہری گھاس پر دُور تک دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ اس پہ دستر خوان بچھانے کے بعد طرح طرح کے لذیذ کھانے چُنے جا رہے تھے۔ مرغِ مسلّم سے لے کر بکرے، دُنبے، گائے اور اونٹ وغیرہ کے گوشت وغیرہ کی بھی ڈشیں موجود تھیں۔ میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا "کرم داد! اس بات کو یاد رکھنا کہ زیادہ پینے سے اور زیادہ کھانے سے غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ پچھلی رات کا واقعہ یاد ہے نا؟"

وہ پیتے پیتے رُک گیا۔ اس نے بوتل کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آج یہ حماقت نہیں ہوگی۔"

وہ ریحانہ کے پاس کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔ جسکانی نے انسپکٹر کے پاس بیٹھ کر کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا "کیا ہیلی کاپٹر مل جائیں گے؟ پولیس پارٹی یہاں آدھی رات سے پہلے آسکے گی؟"

اس نے بندھے ہوئے لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ بظاہر بڑے معزز ہیں مگر باطن میں کمینے ہیں۔ ڈاکو رانگا ماما حکومت کو مطلوب ہے اور ہمارے پولیس آفیسر صاحب اپنے محکمے کے بہت بڑے آفیسر ہیں۔ یہ وڈیرے، یہ جاگیردار اور یہ زمیندار اپنے اپنے علاقوں میں سماجی اور سیاسی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو لینے کے لیے ہیلی کاپٹر کیوں نہیں بھیجے جائیں گے۔"

آدھی رات سے پہلے ہی دو ہیلی کاپٹر پرواز کرتے ہوئے نظر آئے۔ ماماسکن میں روشنی کا ایسا انتظام تھا کہ گھنے درختوں کے باوجود وہ صحیح مقام پر پہنچ گئے تھے۔ انسپکٹر علی مختار میمن نے ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ قائم کیا ہوا تھا، اور انہیں بتا رہا تھا کہ وہ کہاں اُتارے جا سکتے ہیں۔ تقریباً پندرہ منٹ کے اندر ہی ہیلی کاپٹروں کے گردش کرتے ہوئے پنکھوں کی آوازیں تھم گئیں۔ پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سُنائی دیں۔ چاروں طرف سے یوں زمین دہل رہی تھی جیسے ایک بڑی فوج ہر سمت سے حملہ کرنے چلی آ رہی ہو۔ پھر ہمیں بے شمار سپاہی دکھائی دیے۔ سب رائفلیں تانے ہوئے تھے۔ وہ چار پولیس افسروں کی رہنمائی میں آئے تھے۔ انسپکٹر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "میں انسپکٹر علی مختار میمن ہوں۔ یہاں کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے۔ جو مجرم تھے، وہ سب باندھے جا چکے ہیں۔"

آنے والے افسران نے علی مختار میمن سے مصافحہ کیا۔ اسے مبارک باد دی۔ پھر وہ ڈاکو رانگا ماما، اس کے ساتھیوں، اور اس کے معزز مہمانوں سے باری باری سوالات کرنے لگے۔ اس دوران یہ طے پایا کہ پہلے خاص مجرموں کو لوٹ کے مال کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر میں لے جایا جائے۔ دوسرے ہیلی کاپٹر میں ہمیں جانے کے لیے کہا گیا۔ باقی ڈاکوؤں کی... نگرانی کے لیے پولیس کی بھاری تعداد مقرر کر دی گئی۔ ہم ہیلی کاپٹروں کے ذریعے رات کے ایک بجے نواب شاہ پہنچ گئے۔ وہاں اتنی رات کو بھی اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ تمام شہر میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ ڈاکو رانگا ماما اور بہت سے اہم افراد گرفتار کیے گئے ہیں اور وہ یہاں لائے جانے والے ہیں۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران پہنچے ہوئے تھے۔ جب ہم پولیس ہیڈ کوارٹر میں آئے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جتنے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور باحیثیت افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی ضمانتیں لینے کے لیے مختلف شہروں سے بڑی بڑی... شخصیتیں چلی آئی تھیں۔ ان میں سیاسی اور سماجی لیڈر حضرات بھی تھے۔ حکومت میں دُور دُور تک رسائی رکھنے والے معززین بھی تھے۔

میں محتاط ہو گیا۔ اب سیاسی چالبازیاں شروع ہو رہی تھیں۔ ہم نے جتنے معزز حضرات کو مجرموں کی حیثیت سے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا، انہیں چھڑائے جانے کے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے تھے۔ میں چپ چاپ ایک جگہ بیٹھا ان سب کے دماغوں میں پہنچ رہا تھا۔ ایک ایک کے لب و لہجے کو سمجھ رہا تھا۔ ان کی خفیہ گفتگو سن رہا تھا۔

میں خیال خوانی میں مصروف تھا کہ کرم داد کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے بڑی بوریت ہو رہی ہے۔ اس قانونی کارروائی میں تو صبح ہو جائے گی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کہیں قریب ہی فائر کی آواز سنائی دی۔ شاید میں سے ایک گولی چلی تھی۔ سبھی چونک گئے۔ جس کمرے سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی، وہاں پولیس والے دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ میں بھی ادھر جانا چاہتا تھا لیکن ہمارا راستہ روک دیا گیا۔ سپاہیوں نے کہا "زیادہ بھیڑ مناسب نہیں ہے۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ گولی کس نے چلائی ہے۔"

جس کمرے میں گولی چلی تھی، وہاں جو افسر اور سپاہی گئے تھے، میں ان کے دماغوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب خبر ملی تو ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔ ہمارے ساتھی انسپکٹر علی مختار میمن نے خودکشی کر لی تھی۔ اپنے ہی ریوالور سے خود کو ہلاک کرنے سے پہلے اس نے ایک

خط لکھا تھا۔ خط میں کیا لکھا تھا، یہ معلوم نہ ہو سکا۔ کیوں کہ پولیس افسر اسے ایک دوسرے کمرے میں دوسرے افسران کے پاس لے گیا تھا۔

میں سپاہیوں کو اِدھر سے اُدھر دھکا دیتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا۔ ایک افسر نے ڈانٹ کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "جناب! یہاں سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہمارا ساتھی انسپکٹر ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا تھا۔ ہم اس کے ساتھ قانون کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے، اور وہ فرض شناسی کا ثبوت ہر قدم پہ دیتا جا رہا تھا۔ وہ بھلا کیسے خودکشی کر سکتا ہے۔ یہ ضرور کوئی چال ہے۔"

ایک بڑے آفیسر نے مجھے ڈانٹ کر کہا "زیادہ بکواس مت کرو۔ باہر بیٹھو۔ جب تمہیں بلایا جائے اور سوال کیا جائے تو جواب میں جو کہنا چاہو کہہ دینا، فی الحال گیٹ آؤٹ۔"

کاش میں خود کو فرہاد کی حیثیت سے ظاہر کر سکتا۔ اس آفیسر نے جتنی حقارت سے مجھے گیٹ آؤٹ کہا تھا، اس کے نتیجے میں وہ پلک جھپکتے میں تگنی کا ناچ ناچنے لگتا۔ میں نے بڑے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ کمرے سے باہر آیا۔ دروازے پر جمال احمد جسکانی اور کرم داد مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جسکانی نے کہا "اور قانون کی مدد کرو۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ ہمارے خلاف کیسی سازشیں ہو رہی ہیں اور ہم کس طرح پھانسے جانے والے ہیں۔"

کرم داد نے کہا "اگر ہم یہاں پھانسے گئے تو میں پولیس ہیڈ کوارٹر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ جب تک ہم قانون کا احترام کر رہے ہیں، اس وقت تک قانون کے محافظوں کو جواباً ہماری عزت کرنا چاہیے۔ بے عزتی ہوگی، ہمیں حقارت سے ٹھکرایا جائے گا، ہمارے خلاف جھوٹے الزامات عائد کیے جائیں گے تو..."

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب کوئی بات ہوگی تو ہم اپنے بچاؤ کا راستہ ڈھونڈ لیں گے لیکن وعدہ کرو کہ قانون کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گے۔"

جسکانی نے غصّے سے کہا "تم اب بھی قانون کا راگ الاپ رہے ہو۔"

"دیکھو جسکانی! آگ کو جب تک آگ سمجھ کر کھیلو گے تو جلتے رہو گے۔ اسے گلزار بنانا چاہتے ہو تو اپنے ایمان کو مستحکم رکھو۔ ہم ایمان اور سچائی کے راستے پر ہیں۔ قانون مجرموں کے لیے آگ ہے، ہمارے لیے گلزار بنے گا۔"

وہ دونوں میرے ساتھ چلتے ہوئے ریحانہ اور حور بانو کے پاس آئے۔ انھیں ساری باتیں بتانے لگے۔ جسکانی نے کہا "بابر! میں صرف ایک بات پوچھتا ہوں۔ اگر ہم اُلٹے پھانس لیے گئے تو کیا ہوگا؟"

"ہمارے پاس ذہانت ہے، حاضر دماغی ہے، صلاحیتیں ہیں اور یہ خوبیاں ایسے ہی آزمائشی مرحلوں میں کام آتی ہیں۔"

کرم داد نے کہا "اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو میں تمھاری بات نہیں سنوں گا۔ مجھے جو کرنا ہے کر گزروں گا۔"

جسکانی نے کہا "بابر! تم سے دوستی ایک الگ بات ہے۔ قانون کے محافظوں نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تو پھر میں تم پر بھی اعتماد نہیں کروں گا۔"

میں نے دونوں کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "دوستی کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ تقاضے پورے کرنے کے بعد تم جو چاہو، کر لینا۔"

"ہمیں بتاؤ، کیا تقاضے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں، کوئی مصیبت کی گھڑی آئے تو اپنے راستے الگ نہ ہوں۔ ہم تینوں مل کر جو کام کریں گے، اس میں استحکام ہوگا۔ اتحاد اور تنظیم آدمی کو ہمیشہ کامیابی کے راستے پر لے جاتی ہیں۔ اگر کوئی بُرا وقت آئے تو میری ایک شرط پوری کر دینا۔ اس کے بعد تم دونوں آزاد رہو گے۔"

"کونسی شرط؟"

"وہ بُرا وقت آنے دو تو میں بتاؤں گا۔"

آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں ایک بڑے سے ہال میں طلب کیا گیا۔ ہم سر جھکا کر وہاں پہنچے۔ سر اس لیے جھکے ہوئے تھے کہ اپنے ساتھی انسپکٹر علی مختار میمن کی بے وقت اور اچانک موت نے ہمیں دل برداشتہ کر دیا تھا۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنا اچھا ساتھی اچانک ہی خودکشی کرے گا اور اس کی خودکشی معمہ بن جائے گی۔

اس بڑے سے ہال میں چند افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس دُور تک کئی کرسیوں پر مختلف شہروں سے آنے والے کئی معززین، سیاسی اور سماجی لیڈر حضرات بھی تھے۔ وہاں اور بھی کئی کرسیاں خالی تھیں۔ ہم ان پر بیٹھنا چاہتے تھے کہ ایک آفیسر نے ڈانٹ کر کہا "کھڑے رہو۔ صرف خواتین بیٹھ سکتی ہیں۔"

ریحانہ نے ناگواری سے کہا "ہمیں بیٹھنے کا شوق نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کتنی عجیب بات ہے۔ جو مجرموں کی ضمانتیں لینے آئے ہیں، انھیں عزت سے بٹھایا گیا ہے، اور ہم نے مجرموں کو گرفتار کیا تو اس کے صلے میں یہاں کھڑا

رکھا جا رہا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ فرمائیے، ہمیں کس لیے طلب کیا گیا ہے؟"

ایک افسر نے کہا "انسپکٹر علی مختار میمن ایک باضمیر انسان تھا۔ وہ وقتی طور پر تم جیسے جرائم پیشہ افراد کے فریب میں آ گیا تھا۔ جب اس کے ضمیر نے ملامت کی تو اس نے خودکشی کر لی لیکن خودکشی کرنے سے پہلے یہ اعترافنامہ ہمارے حوالے کر گیا۔"

اس آفیسر نے علی مختار میمن کا آخری خط پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا:

"میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر یہ تحریری بیان دے رہا ہوں۔ میں بابر اور کرم داد نامی دو مجرموں کے فریب میں آ گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ جن کے نام حور بانو اور ریحانہ ہیں۔ انھوں نے میرے پاس آ کر کہا کہ میری شریکِ حیات ان کے ایک ساتھی جمال احمد جسکانی کے قبضے میں ہے۔ اگر میں ان کے احکامات پر عمل نہیں کروں گا تو وہ میری بیوی کو مار ڈالیں گے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے ایک کیسٹ سُنایا۔ جس میں میری بیوی کی آواز تھی۔ وہ رو رو کر، گڑگڑا کر کہہ رہی تھی کہ میں اس کی جان بچانے کے لیے ان مجرموں کی بات مان لوں۔

اور میں نے بات مان لی۔ مجھے بتایا گیا کہ ہمارا ایک پولیس آفیسر عالم زبیری پولیس کا دستہ لے کر ڈاکو رانگا ماما کو گرفتار کرنے اس کے اڈے کی طرف گیا ہے۔ اگر میں بابر، اور کرم داد کے حکم کے مطابق عمل کروں گا تو ڈاکو کی گرفتاری کا سہرا میرے سر ہوگا۔ سارا کریڈٹ مجھے حاصل ہوگا اور پولیس آفیسر عالم زبیری کو مجرموں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے گا۔

پھر یہی کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں سائیں سراج آدم اور دوسرے معزز وڈیروں، زمینداروں اور جاگیرداروں کو ایک پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے طلب کروں۔ جب میں نے طلب کیا تو انھوں نے ہتھیاروں کے ذریعے انھیں قابو میں کیا۔ رسیوں سے باندھ کر ڈاکو رانگا ماما کے اڈے پر لے گئے۔ وہاں ہمارے آفیسر عالم زبیری صاحب نے کامیاب چھاپا مارا تھا اور ڈاکو رانگا ماما کو گرفتار کر لیا تھا لیکن ہم نے بازی پلٹ دی۔ ڈاکو تو پہلے ہی سے گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ہم نے پولیس آفیسر کو اپنے قابو میں کر لیا۔ انھیں بھی مجرموں کی صف میں شامل کر دیا۔ مجھے افسوس تو ہو رہا تھا لیکن اپنی شریکِ حیات کی زندگی عزیز تھی۔ پھر میں دیکھ رہا تھا کہ میری اچانک ترقی ہونے والی ہے۔ بہت بڑا عہدہ ملے گا اور تنخواہ بھی بڑھے گی۔ میں نے اسی لالچ میں آ کر اپنے پولیس آفیسر زبیری کے ساتھ غداری کی اور قانون شکنی کی، اور جو مجرم نہیں تھے انہیں مجرم بنا کر رانگا ماما کے ساتھ لے آیا۔

آہ، بے ایمانی کبھی نہیں پھلتی۔ اب مجھے حقیقت کا علم ہوا ہے۔ میری بیوی کی آواز جب ریکارڈ کی گئی تو وہ صحیح سلامت تھی۔ اس کے بعد پتا چلا کہ جمال احمد جسکانی پہلے میری بیوی کی عزت کا دشمن بنا۔ پھر جان کا دشمن بن گیا۔ جس شریکِ حیات کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا، اب وہ اس دُنیا میں نہیں رہی تو میں رہ کر کیا کروں گا۔ اس لیے میں ہوش و حواس میں رہ کر خودکشی کر رہا ہوں۔

فقط راقم الحروف، انسپکٹر علی مختار میمن"

یہ خط پڑھ کر آفیسر نے اسے اپنے سامنے میز پر رکھ کر پھر ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ جمال احمد جسکا[نی] نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا "یہ جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔ انسپکٹر علی مختار میمن کبھی ایسا نہیں لکھ سکتا۔ نہ میں نے اس کی بیوی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے۔ میں نے تو اس بے چاری باحیا عورت کو کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔"

ایک افسر نے کہا "جمال احمد جسکانی! تم کتنے سچے اور کتنے شریف انسان ہو" یہ ہم اچھی طرح جان گئے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمھارے ماضی کا تمام ریکارڈ اور ماضی میں تمھارے خلاف ہونے والے مقدمے کی تمام فائلیں اور [دیگر] کاغذات کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

جمال احمد جسکانی نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس ا[فسر] کو دیکھا۔ جسکانی کا دماغ اندر ہی اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا [جمال احم]د جسکانی! تم بڑے پھنسے ہو، ٹی ٹی سینٹر والوں سے غدا[ری کی] ہے۔ وہ فائلیں اور کاغذات پھر برآمد کر لیے گئے ہیں او[ر]

سینٹر والوں نے تمھیں سزا دینے کے لیے ان کاغذات کو افسران کے پاس پہنچایا ہے۔"

جمال احمد جسکانی جو سوچ رہا تھا وہ درست تھا۔ اس افسر نے بھی ایک فائل اٹھا کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ وہی فائل ہے جس کے ذریعے تم قاتل اور جرائم پیشہ ثابت ہو سکتے ہو۔ تم نے آج سے دو برس آٹھ ماہ پہلے گوٹھ سارنگ کے ایک پولیس افسر کو قتل کیا تھا۔ تمھاری وجہ سے وہاں کا وڈیرا مارا گیا۔ اس کی دونوں بیٹیاں ماری گئیں۔ تم پر طرح طرح کے الزامات ہیں۔ ان الزامات سے تم فائلوں کی موجودگی میں انکار نہیں کر سکو گے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ جمال احمد جسکانی کو ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں۔"

ہمارے چاروں طرف مسلح سپاہی کھڑے ہوئے تھے۔ جمال احمد جسکانی وہاں سے نکل سکتا تھا۔ میں اس کی صلاحیتوں کا معترف ہوں لیکن میں نے کہا "جناب افسران! ہتھکڑیاں تو آپ سب کو پہنائیں گے لیکن پہلے ہم پر بھی الزامات عائد کر دیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم ایک ساتھ ہتھکڑیاں پہنیں۔"

"بکواس مت کرو۔ ہم نے جو حکم دیا ہے اسی پر عمل ہوگا۔"

میں نے کہا "جن لوگوں نے آپ کے پاس ہماری فائلیں پہنچائی ہیں، انھوں نے یہ ضرور بتایا ہوگا کہ ہم کتنے خطرناک ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم پُرامن طریقے سے خود گرفتاری کیلیے ہاتھ پیش کر دیں تو ذرا صبر سے کام لیں۔"

ان افسران نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یقیناً ہمارا فائل پیش کرنے والوں نے انھیں بتایا تھا کہ ہم سب ضدی، اور خطرناک ہیں۔ پھر ایک افسر نے ایک فائل اٹھاتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے۔ ابھی تم لوگوں کو بھی ہتھکڑیاں لگائی جائیں گی۔ یہ فائل ریحانہ اور کرم داد کا ہے۔ ان دونوں نے پیرس میں رہ کر جو جرائم کیے ہیں اور کرم داد نے جو قتل کیے ہیں ان کی تصاویر کے ساتھ پوری تفصیل اس میں موجود ہے۔"

ایک افسر نے ایک اور فائل اٹھاتے ہوئے کہا "بابر! یہ تمھاری اور آمنہ کی فائل ہے۔ اس میں تمھارے جرائم کی جو داستانیں درج ہیں وہ سب عدالت میں معلوم ہو جائیں گی۔ تم میں سے صرف حور بانو کو رہا کیا جائے گا اور اسے اس کے والدین کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اب میں حکم دیتا ہوں کہ چاروں کو ہتھکڑیاں لگا کر حوالات میں بھیج دیا جائے۔"

میں نے دانت پیستے ہوئے سوچا "یہ ہے وفاداری اور حُب الوطنی کا صلہ۔ کیا ہمارے ملک میں وفادار اور محبِ وطن نہیں رہے ہیں؟

بے شک ہیں، بے شمار محبِ وطن اور ملک و قوم پر جان دینے والے لوگ ہیں۔ میں اپنے ایمان، اور حُب الوطنی سے مایوس نہیں ہوں لیکن ہمارے ہاں۔ ایسے لوگوں کا دور دورہ ہے، ایسے لوگ انتظامیہ کی گاڑی کو چلاتے ہیں جو نہایت بے ایمان، منافع خور، اسمگلر اور بدترین قسم کے سازشی ہیں۔

جو افسران ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ہمارے خلاف الزامات عائد کر رہے تھے اور ہمیں گرفتار کرنا چاہ رہے تھے، ان میں سبھی بے ایمان نہیں تھے۔ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے دشمن بن گئے تھے اور اب پولیس والوں نے ہمارے چاروں طرف ہتھکڑیاں نکال لی تھیں۔ چار ہتھکڑیاں، ایک ریحانہ کے لیے، ایک کرم داد کے لیے، ایک جمال احمد جسکانی کے لیے اور ایک میرے لیے۔

اب سے دو برس آٹھ ماہ پہلے جمال احمد جسکانی ایک مجبور اور بے بس انسان تھا۔ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی گئیں۔ اس وقت اسے اپنے بچاؤ کے طریقے نہیں آتے تھے۔ کرم داد، ریحانہ اور میں ایسے تھے کہ اب تک ہمارے ہاتھوں میں کسی نے ہتھکڑی پہنانے کی جرأت نہیں کی تھی اور نہ ہی ہم نے ایسا موقع آنے دیا تھا۔ اس نے میری دوستی پر اعتماد کیا ہے۔ میں اس کے اعتماد کا بھرم رکھوں گا۔

سپاہیوں نے ہتھکڑیاں نکال لی تھیں اور انھیں کھولتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک ایسا منصوبہ پرورش پا رہا تھا جس پر عمل کر کے میں ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ کیے بغیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار ہونے سے بچ سکتا تھا اور پھر میں نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

ہتھکڑیاں ہماری طرف لا رہے تھے۔

اچانک میں نے حور بانو کو کہنے پر مجبور کیا۔ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی "پلیز، ایک منٹ کے لیے رُک جائیے"

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک بڑے افسر کے دماغ میں پہنچ کر اس کے دل میں ایک ذرا سی ہمدردی پیدا کی۔ اس نے کہا "رُک جاؤ۔ پہلے سُن لو' یہ محترمہ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

حور بانو نے کہا "میرے ان ساتھیوں پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں' انھیں اس سلسلے میں صفائی پیش کرنے کا موقع عدالت میں تو دیا ہی جائے گا لیکن میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ تھوڑا سا موقع اگر یہاں دے دیا جائے تو کیا یہ نامناسب نہ ہوگا؟ شاید آپ شرمندگی سے بچ جائیں کہ آپ نے بے گناہوں کو ہتھکڑیاں پہنائی تھیں"

اس افسر نے حور بانو کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ دراصل میں ہی اس کے دماغ میں سوچ پیدا کر رہا تھا کہ یہ لڑکی ٹھیک کہتی ہے۔ شاید یہ اپنی صفائی میں کوئی ایسی بات کہہ سکیں کہ انھیں ہتھکڑیاں پہنانے کی ضرورت نہ پڑے۔

ایک افسر نے کہا "یہ بکواس کر رہی ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ عدالت قائم کریں اور مجرموں کا بیان سُنتے رہیں۔ اس کے لیے عدالتیں موجود ہیں"

دوسرے آفیسر نے بھی اعتراض کرنا چاہا لیکن میں جس آفیسر کے دماغ میں تھا' اس نے کہا "نہیں' تھوڑی دیر ہم اور بیٹھ جائیں تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس لڑکی کی یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ شاید ہم شرمندگی سے بچ جائیں' شاید یہ مجرم نہ ہوں"

پھر اس افسر نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم چاروں کو دس دس منٹ کا وقت دیتا ہوں۔ اپنے بارے میں جو کہنا چاہتے ہو' جلدی سے کہہ ڈالو"

میں نے چپکے سے جمال احمد جسکانی کے قریب ہو کر کہا "اپنے حق میں جو بھی اُلٹی سیدھی باتیں کر سکتے ہو' کر ڈالو۔ دس منٹ کی مہلت کو ضائع نہ کرو"

جسکانی نے کہنا شروع کیا۔ اِدھر میں نے ریحانہ اور کرم داد کو بھی یہی سمجھا دیا۔ اس کے بعد خیال خوانی کی پرواز شروع کی اور اپنے بہترین رفیق اور اپنے عزیز سعید احمد کے دماغ میں پہنچ گیا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں سو رہے تھے۔ ان کے ساتھ سلمیٰ بھی تھی۔ سلمیٰ جو میری بہن شاہینہ کی نند تھی۔ میں نے سعید احمد کو بیدار کر کے ان کے دماغ میں کہا "میں فرہاد علی تیمور بول رہا ہوں۔ سلمیٰ کو اس بات کی خبر نہ ہو بلکہ کسی کو بھی یہ نہ معلوم ہو کہ میں نے آپ سے دماغی رابطہ قائم کیا ہے۔ فوراً اپنے بیڈ روم سے باہر نکلیں۔ میرے پاس صرف پینتیس منٹ کا وقت ہے اور پینتیس منٹ کے بعد میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی"

وہ فوراً ہی بستر سے اٹھے اور بیڈ روم سے باہر نکلتے ہوئے بولے "آخر بات کیا ہے؟ تم کہاں پھنسے ہوئے ہو؟"

"میں پاکستان میں ہوں اور اسی لیے آپ کی مدد حاصل کر رہا ہوں"

اوہ خدایا! تم اتنے پُراسرار بن کر رہتے ہو کہ ہمیں پریشان کر دیتے ہو۔ آخر یہاں آئے تھے تو ہمیں اطلاع تو دینا چاہیے تھی۔ بولو' کیا ہو رہا ہے؟"

"فوراً میرے بتائے ہوئے نمبر پر فون کریں۔ اس فون کے آس پاس پولیس کے محکمے کے بڑے بڑے افسران بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نواب شاہ کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہوں"

انھوں نے ریسیور اٹھا کر کہا "یہ بتاؤ کہ مجھے کہنا کیا ہے"

"آپ نمبر ڈائل کریں۔ خود کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے دماغ میں موجود ہوں' آپ روانی سے بولتے چلے جائیں گے"

انھوں نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا "بھئی کمال کے آدمی ہو۔ میں اسلام آباد میں ہوں' تم نواب شاہ میں اور وہاں سے میرے دماغ میں رہ کر بولو گے۔ چلو' منہ بند کیے لیتا ہوں"

انھوں نے نمبر ڈائل کیے۔ ان دنوں ڈائریکٹ ڈائلنگ نہیں تھی۔ اس کے باوجود ایک اہم افسر...... ٹرنک کال کے لیے نمبر دے رہا ہو تو رابطہ قائم ہونے میں دیر ہی کتنی لگ سکتی تھی' چنانچہ فوراً رابطہ قائم ہو گیا۔ ٹیلیفون ایکسچینج والوں نے بڑے ہی مودبانہ انداز میں اطلاع دی کہ انٹیلی جینس کے ڈائریکٹر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی میرے سامنے بیٹھے ہوئے افسر نے ریسیور کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے افسران کو یہ خبر سنائی۔ وہاں جیسے ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسی وقت ایکسچینج والوں نے سعید احمد کے فون سے ان افسران کے فون کا رابطہ قائم کر دیا۔ میں نے سعید صاحب کی زبان سے کہا "میں انٹیلی جینس کا ڈائریکٹر بول رہا ہوں' آپ کے سامنے پانچ افراد کے نام پیش کر رہا ہوں۔ انھیں نوٹ کریں اور میری ہدایت پر فوراً عمل کریں"

آفیسر نے قلم اٹھا کر کہا "ہم نوٹ کر رہے ہیں۔ آپ

حکم دیجیے"

میں نے سعید احمد صاحب کی زبان سے کہا "پہلا نام حور بانو' دوسرا ریحانہ' تیسرا کرم داد' چوتھا جمال احمد جسکانی اور پانچواں بابر۔ ان پانچوں کے ساتھ وی آئی پی ٹریٹمنٹ کیا جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آپ لوگوں کی شکایات مجھ تک پہنچائیں"

"سر! آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی"

"میرا دوسرا حکم یہ ہے کہ جتنے ڈاکو اور معزز قسم کے بدمعاش گرفتار کر کے لائے گئے ہیں' ان کی ضمانت قبول نہ کی جائے۔ یہ تمام لوگ عدالت تک پہنچائے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مزید احکامات جاری ہوتے رہیں گے۔ آپ لوگ الرٹ رہیں"

انھوں نے ریسیور رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا "فرہاد! اب تو بتا دو' معاملہ کیا ہے؟"

"ذرا صبر کیجیے۔ آپ کے حکم کے مطابق ادھر ہمیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملے گا' عزت و احترام سے رہنے کے لیے جگہ دی جائے گی تو اطمینان سے آپ کو بتاؤں گا۔ فی الحال خدا حافظ۔ آرام سے جا کر سو جائیے"

انھوں نے خلا میں گھونسا دکھاتے ہوئے کہا "بکواس مت کرو۔ منہ توڑ دوں گا۔ ایک تو مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے اور سونے کے لیے بھی کہہ رہے ہو۔ بھلا ایسے میں نیند آئے گی؟"

"اچھا بھئی' بتا دیتا ہوں۔ مجھے اتنا موقع تو دیجیے کہ تنہائی میں بیٹھنے کا اور آپ سے خیال خوانی کے ذریعے گفتگو کرنے کا موقع ملے۔ میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان رہ کر چُپ چاپ خیال خوانی تو نہیں کر سکتا"

"چلو' میں تمھارا انتظار کروں گا۔ جب بھی فرصت ہو مجھے مخاطب ضرور کرنا۔ خواہ میں سو رہا ہوں"

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ دس دس منٹ کا جو وقت ملا تھا' اس کے مطابق جمال احمد جسکانی' کرم داد اپنے طور پر صفائی پیش کر چکے تھے اور ریحانہ بھی صفائی پیش کر رہی تھی۔ ادھر تمام افسران ٹیلیفون کے ذریعے دوسرے اعلیٰ حکام سے رابطہ قائم کر رہے تھے۔ ایک ذمے دار افسر نے جو احکامات صادر کیے تھے' ان کے متعلق تصدیق کی جا رہی تھی۔

جب ریحانہ کے دس منٹ ختم ہو گئے تو میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "جناب! اب دس منٹ تک میں بولوں گا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو ہماری باتوں کا یقین آئے گا۔ پھر بھی..."

میں اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ جو افسر ٹیلیفون کے ذریعے سعید احمد سے گفتگو کر چکا تھا' اس نے کہا "بیان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ لوگ بے گناہ ہیں۔ ہم سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو رہی تھی"

اس عرصے میں تصدیق ہو چکی تھی کہ ایک بہت ذمے دار افسر نے ہی ہماری حمایت کی ہے۔ کوئی فراڈ نہیں ہے۔ وہ افسران فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ہماری طرف آئے۔ پھر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے ہم سے مصافحہ کرنے لگے۔ حور بانو' ریحانہ' کرم داد اور جمال احمد جسکانی شدید حیرانی سے ان کے بدلتے ہوئے رویے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان افسران کو ہماری بے گناہی کا کیسے یقین آ گیا ہے جب کہ جمال احمد جسکانی' ریحانہ اور کرم داد اُلٹے سیدھے بیان دے رہے تھے' ان پر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا' اس کے باوجود انھوں نے یقین کر لیا تھا۔ ہمیں گلے لگا رہے تھے۔ ہم سے معافی مانگ رہے تھے۔

ملک کے وہ بااثر لوگ جو مجرموں کی ضمانتیں لینے آئے تھے' ان میں سے ایک نے اُٹھ کر کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنی صفائی میں جو لمبا چوڑا بیان دیا تھا' اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس سے ان کی بے گناہی ثابت ہوتی ہو' پھر آپ لوگ ان کو یہ عزت کس بناء پر دے رہے ہیں؟"

ایک افسر نے جواباً کہا "ہمیں افسوس ہے' ہم آپ کو ان کی بے گناہی کے سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔ ہاں' آپ کے لیے ایک افسوسناک اطلاع ہے کہ آپ میں سے کسی کی ضمانت قبول نہیں کی جا سکتی۔ جو مجرم گرفتار کر کے لائے گئے ہیں' ان سب کو عدالت تک ضرور پہنچایا جائے گا"

ایک اور بڑے صاحب نے آگے بڑھ کر کہا "انسپکٹر علی مختار میمن نے خودکشی کرنے سے پہلے جو تحریر آپ کے لیے لکھی تھی' کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارے آدمی بے گناہ ہیں اور یہ سب مجرم ہیں"

"اس خط کو عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ہم اپنے طور پر تفتیش کریں گے۔ تحریر شناسی کے ماہرین سے رائے طلب کریں گے۔ پلیز' آپ اس سلسلے میں زیادہ بحث نہ کریں"

پھر اس افسر نے ہماری طرف پلٹ کر پوچھا "جناب! آپ کہاں رات گزارنا پسند کریں گے؟ اگر مناسب سمجھیں تو

پولیس ہیڈکوارٹر کے کچھ کمرے خالی کردیے جائیں یا کسی اچھے ہوٹل میں رہائش کا انتظام کرایا جائے؟"

جمال احمد جبکانی نے شدید حیرانی سے کہا "کمال ہے! آپ تو ہمیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں۔ بھئی ہمیں تو صرف رات گزارنی ہے، کہیں بھی گزار لیں گے۔ رات تو اس کمرے میں بھی گزر سکتی ہے اور باہر برآمدے میں بھی۔"

ایک افسر نے شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "جناب! آپ ہمیں اور شرمندہ نہ کریں۔ بھلا آپ اور باہر برآمدے میں رات گزاریں گے۔ آپ پانچ ہیں۔ ہم آپ لوگوں کے لیے اپنے کیمو کے پانچ کمرے خالی کرا دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دو کمرے کافی ہیں۔"

• ... منٹ کے اندر ہمیں دو کمرے مل گئے جن میں ضرورت کا سامان موجود تھا۔ ہمیں کھانے کے لیے بھی پوچھا گیا۔ پیٹ تو پہلے ہی بھرے ہوئے تھے البتہ ہم نے چائے پینے کی خواہش ضرور کردی۔ انھوں نے ایک سپاہی کو چائے کا انتظام کرنے بھیج دیا۔ ایک افسر نے ہمارے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کون ہیں؟"

میں نے کہا "فی الحال آپ کوئی سوال نہ کریں۔ ہم کچھ باہم مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو پندرہ بیس منٹ کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ چائے پینے کے دوران ہم آپ کے سوالوں کے جواب ضرور دیں گے۔"

وہ تمام افسران ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی جمال احمد جبکانی نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر پلٹ کر تیزی سے ہماری طرف آتے ہوئے بولا "آخر یہ چکر کیا ہے؟ ہم پر سنگین الزامات عائد کیے گئے۔ انسپکٹر مختار میمن کا آخری خط ہمیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی تھا۔ اس کے باوجود ہمیں رہا کر دیا گیا اور ہمیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا ہے۔"

کرم داد نے کہا "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ہم آسمان سے گر کے کھجور میں آ ٹکے ہیں اور اب کھجور سے گر کر کسی گہری کھائی میں پہنچنے والے ہیں۔"

حور بانو نے کہا "میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ شاید یہ لوگ ہمیں یہاں سے جانے نہ دیں۔"

میں نے کہا "ابھی یہ ہمارے پاس واپس آئیں گے تو ہم ان سے ٹرین میں سیٹ ریزرو کرانے کے لیے کہیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں ان کا جواب کیا ہوتا ہے۔ اگر یہ بہانے بنا کے ٹالنے کی کوشش کریں گے تبھی ہمیں انکی نیتوں کا صحیح علم ہو سکے گا کہ یہ پھانسنے کے لیے ہمارے خلاف مزید ثبوت فراہم کرنا چاہتے ہیں یا واقعی قسمت ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ فی الحال تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں تائیدِ غیبی حاصل ہو رہی ہے اور ہم اتنے بڑے الزامات سے بری ہو کر ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے ان سے معذرت کی اور باتھ روم کی طرف تیز قدموں سے چل دیا۔ حور بانو اور ریحانہ منہ دبا کر ہنس رہی تھیں۔ میں باتھ روم میں پہنچتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے سعید احمد صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے پوچھا، "پہلے یہ بتاؤ، تم پاکستان کب پہنچے اور نواب شاہ میں کیا کر رہے ہو؟"

"آپ یہ بتائیں، میرے راز کو ہضم کر سکتے ہیں یا اُگل دیں گے؟"

"کیا پہلے میں نے کبھی تمھارا کوئی راز فاش کیا ہے؟"

"پہلے آپ سنگل تھے، اب ڈبل ہو گئے ہیں۔ کیا آپ سلمیٰ سے ساری باتیں چھپا لیتے ہیں۔ اسے کوئی اہم راز تو نہیں بتلاتے ہو؟"

"فرہاد! میں ایک ایسے عہدے پر فائز ہوں، جہاں میری ذرا سی بھول سے ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے، میں اپنے معاملات سلمیٰ سے نہیں چھپاتا لیکن اپنے ملکی اور دفتری معاملات کا ذکر میں سلمیٰ سے بھی نہیں کرتا۔ خود سلمیٰ بھی کافی سمجھدار ہے۔ وہ جانتی ہے، میرے سینے میں کتنے راز دفن ہیں لیکن اس نے کبھی اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔"

"سلمیٰ آپ کی شریکِ حیات اور میری بہن ہے، اسے جب معلوم ہوگا کہ آپ کو میری یہاں موجودگی کی خبر تھی اور آپ نے یہ بات چھپائے رکھی تو میاں بیوی کے درمیان جھگڑا تو نہیں ہوگا؟"

"میں تمھاری خاطر اپنی سلمیٰ کی کچھ باتیں سن لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اپنی سناؤ۔"

"میں پیرس سے دہشت گردوں کی تنظیم میں شامل ہو کر یہاں آیا ہوں اور ان کے متعلق معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ اس وقت بھی ایک دہشت گرد کے روپ میں ہوں۔ فی الحال میرا نام بابر ہے۔"

"تمھارے باقی چار ساتھی بھی ٹی ٹی سینٹر سے تعلق رکھتے ہیں؟"

ہم سب کسی نہ کسی ٹی ٹی سینٹر سے تعلق رکھتے تھے مگر اب اپنی ایک ذاتی ٹیم بنا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں جتنے تخریب کار بڑے بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں، ہم ان کا محاسبہ کرنے، ان کا مقابلہ کرنے اور ان کا منہ توڑ جواب دینے یا انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے نکلے ہیں۔ ابتدا ہی میں ہمارا ڈاکو رانگا ماما سے ٹکراؤ ہو گیا۔ نتیجے میں ہم نے ڈاکو رانگا ماما کو ہی نہیں بلکہ پولیس کے ایک ذمے دار افسر کو بھی گرفتار کیا ہے۔ افسر ڈاکو رانگا ماما سے اچھی خاصی رقمیں وصول کرتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف علاقوں کے بااثر زمیندار، جاگیردار اور وڈیرے بھی گرفت میں آئے ہیں۔"

"انھیں جب ہم ایک پولیس پارٹی کی مدد سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے نواب شاہ لے کر آئے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان مجرموں کو چھڑانے کے لیے، ان کی ضمانتیں لینے کے لیے بڑی بڑی اہم شخصیتیں یہاں پہنچ گئیں اور انھوں نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیے کہ چور شریف اور شریف چور ٹھہرا دیے گئے۔ انسپکٹر علی مختار میمن جو بہت ہی دیانت دار اور فرض شناس افسر تھا، اس نے اپنے ہی ریوالور سے خودکشی کر لی۔" میں نے تمام حالات بلاکم و کاست ان کے گوش گزار کر دیے۔

سعید احمد صاحب نے پوچھا "جو پولیس انسپکٹر اتنا فرض شناس تھا اس نے تمھارے خلاف بیان کیوں دیا جب کہ تم لوگوں نے اس کا ساتھ دیا تھا؟"

"یہی تو حیرانی کی بات ہے۔ اس نے کن حالات میں خودکشی کی؟ کس طرح مجبور ہو کر وہ خط لکھا؟ یہ ہم نہیں جانتے۔ وہ ایک الگ کمرے میں تھا۔ ہم اس کے پاس نہیں جا سکتے تھے۔ خودکشی کے بعد ہم اسے نہیں دیکھ سکے۔ صرف اس کا آخری خط ہمیں پڑھ کر سنایا گیا۔"

"فرہاد! تم نے محبانِ وطن کی ایک ٹیم بنائی ہے۔ تمھاری اس ٹیم کے ساتھیوں کے خلاف کیا الزامات ہیں؟"

"اصل بات یہ ہے کہ یہ سارے ہی مختلف ٹی ٹی سینٹرز میں تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ تربیت حاصل کرنے کے دوران انھیں کسی نہ کسی مشن پر بھیجا گیا تھا۔ وہاں انھوں نے جو تخریب کاری کی اور قتل کیے، ان سب کی تصاویر اور ریکارڈ موجود ہے۔ اب میرے ان ساتھیوں نے بغاوت کر دی ہے اور پاکستان کے مفاد کے لیے ان کے خلاف کارروائی کر رہے ہیں تو سینٹر والوں نے انتقاماً وہ تصاویر اور سارا ریکارڈ یہاں کے افسران کے حوالے کر کے انھیں مجرم ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔"

"یعنی تم سب کی فائلیں، تصویروں کے ساتھ اور پورے ثبوت کے ساتھ افسران کے پاس موجود ہیں۔"

"جی ہاں، میں اسی کے لیے پریشان ہوں۔ ابھی میں نے اسی لیے آپ کو مخاطب کیا ہے۔ آپ کسی طرح وہ فائلیں اور انسپکٹر علی مختار میمن کا خط حاصل کر لیں۔ آپ کو ہمارے متعلق جو بھی معلومات درکار ہوں گی، میں وقتاً فوقتاً آپ کو مہیا کرتا رہوں گا۔ آپ میرا یہ کام فوراً کر دیں۔"

"میں ابھی ان سے رابطہ قائم کرتا ہوں۔"

میں خاموش رہ کر دیکھنے لگا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ انھوں نے پھر اپنے مخصوص ٹیلیفون ایکسچینج والوں کو کراچی کے ایک سیکرٹ ایجنٹ اولڈ مین سے رابطہ قائم کرنے کی ہدایت کی۔

وہ افسران جو کمرے سے گئے تھے، انھیں پندرہ منٹ بعد واپس آنا تھا مگر سعید احمد صاحب سے فون پر گفتگو میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے وہ واپس نہ آسکے۔ سعید صاحب نے ایک سینئر افسر سے کہا "بابر، ریحانہ، کرم داد اور جمال احمد جبکانی کے خلاف جو فائلیں پیش کی گئی ہیں انھیں سیل کر دیا جائے اور انسپکٹر علی مختار میمن نے جو آخری خط لکھا ہے، اسے بھی محفوظ رکھا جائے۔ کل صبح تک ہمارا آدمی آپ کے پاس پہنچے گا۔ آپ لوگوں کے درمیان کوڈ ورڈز کا تبادلہ ہوگا۔ میں تھوڑی دیر بعد وہ کوڈ ورڈز آپ کو بتا دوں گا۔ آپ وہ آخری خط اور تمام فائلیں اس آدمی کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد یہ کیس سیکرٹ سروس والے ڈیل کریں گے۔ پولیس کا اس سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں سر! آپ اس کیس کی سنگینی کو ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں لہٰذا میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ آپ کا جو بھی شخص کوڈ ورڈز کا تبادلہ کرے گا، میں یہ تمام چیزیں اس کے حوالے کر دوں گا۔"

سعید احمد صاحب نے ریسیور رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی کراچی کے سیکرٹ ایجنٹ سے رابطہ قائم ہو گیا۔ انھوں نے کوڈ ورڈز کے ذریعے اپنی شناخت کرائی۔ دوسری طرف سیکرٹ ایجنٹ دی اولڈ مین نے کہا "یس باس! کمانڈ می ٹوڈو اور ڈائی۔"

سعید صاحب نے کہا "ابھی ڈو اور ڈائی کا معاملہ نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ صبح تک نواب شاہ پہنچو۔ میں جن افسران کے نام لے رہا ہوں، ان سے ملاقات کرو۔ کوڈ ورڈز مجھے بتاؤ۔ میں وہ کوڈ ورڈز انھیں بتا دوں گا۔ وہاں ایک خط اور کچھ فائلیں تمھارے حوالے کی جائیں گی۔ ان کی حفاظت کرنا اور انھیں اسلام آباد پہنچانا تمھارا فرض ہے۔"

میں نے ان سے دماغی رابطہ ختم کر دیا۔ وہ اپنے معاملات

خود نمٹا رہے تھے۔ میں جیسے ہی باہر نکلا، کرم داد نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا باتھ روم بہت خوبصورت ہے؟ وہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ بھئی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

میں ان کے ساتھ چائے پینے بیٹھ گیا۔ ریحانہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "توبہ ہے۔ صبح کے چار بج رہے ہیں اور ہم سونے کے بجائے چائے پی رہے ہیں۔"

کرم داد نے کہا "مجھے چائے پی کر بھی نیند آجاتی ہے۔"

"تمھیں تو شراب پی کر بھی نیند آتی ہے۔"

سب ہنسنے لگے۔ جمال احمد جسکانی نے کہا "ابھی کرم داد نے بتایا ہے کہ ہم ان کے مہمان بن کر لاہور جا رہے ہیں۔"

"ہاں، ہماری منزل اسلام آباد ہے لیکن ہم لاہور ہوتے ہوئے جائیں گے۔"

"ہم سب کو ایک بات یاد رکھنا چاہیے۔ ہمارے دو مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک کے ذہین، تعلیم یافتہ اور باصلاحیت نوجوان جو مختلف ممالک کے ٹی ٹی سینٹرز میں رہ چکے ہیں اور تربیت حاصل کرنے کے بعد یہاں تخریب کاری میں ملوث ہیں، انھیں ہم راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں گے۔ جو ہماری بات مان لے گا، وہ ہمارا دوست ہوگا اور اس طرح ہم اپنی ٹیم کے افراد میں اضافہ کرتے جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارا سفر اسلام آباد کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ٹرین سے بھی سفر کریں گے اور ہائی وے اور دوسرے راستوں سے بھی گزریں گے۔ اگر سہولتیں میسر ہوئیں تو فضائی سفر بھی کریں گے یعنی اپنے ملک کے تمام اہم شہروں میں جائیں گے۔ اگر یہ دہشت گرد دیہاتوں میں ہیں تو ہم دیہاتوں میں بھی پہنچیں گے۔ ہم ہر محاذ پر ان کا مقابلہ کریں گے۔ یہاں تک کہ یا تو ہم ختم ہو جائیں گے یا وہ ہمارا ملک چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔"

جسکانی نے کہا "بابر! تمھارے صرف عزائم ہی بلند نہیں ہیں بلکہ تم مضبوط قوتِ ارادی کے مالک بھی ہو۔ جس وقت یہ افسران ہمیں گرفتار کر رہے تھے اور ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنانے والے تھے، میں تمھارا اعتماد دیکھ رہا تھا۔ تم ہمیں صبر و ضبط سے رہنے کی تلقین کر رہے تھے اور ایسے بااعتماد لگتے تھے جیسے آئندہ چند لمحوں کے بعد بازی پلٹ جانے کا پورا یقین ہو اور ہم دیکھ رہے ہیں، واقعی بازی پلٹ گئی ہے۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جب تک ہم ایمان اور سچائی کے راستے پر گامزن ہیں، ہمیں شکست نہیں ہوگی۔ البتہ آزمائشی مرحلے آتے رہیں گے۔"

دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں اٹھنا چاہتا تھا مگر مجھ سے پہلے ہی حور بانو نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہٹ گئی۔ دو افسر اندر آئے۔ آتے ہی انھوں نے اٹینشن ہو کر سیلیوٹ کیا۔ حور بانو، ریحانہ، کرم داد اور جمال احمد جسکانی کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ سوچ سوچ کر حیران اور پریشان ہو رہے تھے، آخر ایسی کیا بات ہے کہ اب افسران نے آکر سیلیوٹ کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔

میں سمجھ گیا تھا۔ جب سے سعید احمد صاحب نے یہ کہا تھا کہ یہ کیس سیکرٹ سروس کے حوالے کیا جائے تب سے افسران نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہمارا تعلق سیکرٹ سروس سے ہے اور ہمیں ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک آفیسر سے مسکراتے ہوئے کہا "آپ ہم سے ہمارے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے؟"

افسر نے کہا "نو سر! ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ کوئی حکم ہو تو ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔"

"ہم نہ تو حکم دینا چاہتے ہیں اور نہ ہی حکم سننے کے عادی ہیں۔ ہاں، ایک درخواست ہے۔ ہو سکے تو کل کسی ٹرین میں لاہور کے لیے سیٹیں بک کرا دیں۔ اگر کسی ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں ریزرویشن ہو جائے تو بہتر ہوگا۔"

"ریزرویشن ہو جائے گی اور حکم؟"

"شکریہ، اب ہم سونا چاہتے ہیں۔"

دونوں پھر سیلیوٹ کرنے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ حور بانو نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور وہیں گم صم کھڑی سوچتی رہی۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "تم سب کو کیا ہو گیا ہے؟"

وہ سب میری آواز سن کر چونک گئے۔ پھر سب نے باری باری کہنا شروع کیا۔ کسی نے کہا "کیا ہم خواب دیکھ رہے ہیں؟"

دوسرے نے کہا "ہاں، ایسا تو خواب میں ہوتا ہے کہ ہم کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں، کسی جرم میں ملوث ہو گئے ہیں، پھانسی کے تختے تک پہنچ رہے ہیں تو اچانک ہی پھانسی دینے والا جلاد رحم دل ہو جاتا ہے۔ گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے بجائے پھولوں کا ہار پہناتا ہے اور پوچھتا ہے حضور! آپ کس ٹرین سے تشریف لے جائیں گے اور ہم کہتے ہیں ایئر کنڈیشنڈ کوچ سے۔"

جمال احمد جسکانی ٹہل رہا تھا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ ہماری مدد کر رہا ہے لیکن کس کا ہاتھ ہے؟ وہ کون

ہے؟ وہ ہمیں کیسے جانتا ہے؟ اور کتنے بڑے ذرائع کا مالک ہے کہ پلک جھپکتے میں اس نے ہمارے خلاف ہونے والے فیصلے کو ہماری حمایت میں بدل دیا۔"

کرم داد نے کہا "یہی سوالات ہمارے دماغ میں بھی ہیں لیکن جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں ہے۔"

جمال احمد جسکانی آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے بالکل سامنے آیا۔ پھر اس نے ایک انگلی میرے سینے پر رکھ کر کہا "ان سوالوں کے جواب تمھارے پاس ضرور ہونے چاہئیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میرا دماغ، میری ذہانت کہتی ہے کہ حکومت کا کوئی بہت ہی مضبوط خفیہ ہاتھ تمھاری پشت پر ہے۔ اسی کے سہارے تم اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے ہم جیسے محبانِ وطن کی ایک ٹیم بنا رہے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"درست کہہ رہے ہو۔ صرف یہ غلط ہے کہ میری پشت پر حکومت کا مضبوط خفیہ ہاتھ ہے۔ تم سب اچھی طرح جانتے ہو، ہمیں یہاں آئے ہوئے چند دن ہوئے ہیں۔ میں پیرس سے آیا ہوں۔ بگم کریزی اور کرم داد وغیرہ نے میرا پاسپورٹ بھی دیکھا ہے۔ اب تم ہی سوچو کہ یہاں آتے ہی حکومت کے کسی ایسے اہم شخص سے کیسے رابطہ قائم کر سکتا ہوں اور وہ شخص اتنی جلدی مجھ پر کیسے اعتماد کرنے لگا کہ اتنے سنگین معاملے میں ساتھ دے کر ہمیں ہر طرح کے الزام سے بری کرا دے۔"

حور بانو نے کہا "مسٹر جسکانی! اگر بابر کا تعلق یہاں کی کسی اعلیٰ شخصیت سے ہوتا اور وہ خفیہ طور پر ہماری مدد کر رہا ہوتا تو بابر کو یہ بات ہم سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں بابر؟"

"تم درست کہہ رہی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں فخر سے تمھیں بتاتا تاکہ تم لوگوں میں اور حوصلہ پیدا ہوتا۔"

کرم داد نے کہا "کیوں نہ ہم ان افسرانِ بالا سے ہی معلوم کریں کہ یہ غیبی امداد ہمیں کہاں سے حاصل ہو رہی ہے؟"

میں نے کہا "ان افسران کے سامنے ہمارا بھرم قائم ہے۔ جہاں سے بھی امداد حاصل ہو رہی ہے، وہ سمجھ رہے ہیں کہ ان سے ہمارا گہرا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں سیلیوٹ کر رہے ہیں اور وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں۔ اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم اپنے ان محسنوں کو نہیں جانتے تو شاید ہمیں اتنی لفٹ نہ دی جائے۔"

ریحانہ نے کہا "تجسس کے مارے نیند نہیں آئے گی۔ ہم کیسے معلوم کریں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کون فرشتہ ہماری مدد کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ کوئی بات ہمیشہ چھپی نہیں رہتی۔ ذرا ضبط اور تحمل سے کام لو۔ ہو سکتا ہے کہ ہم سو کر اٹھیں تو ساری حقیقتیں سامنے آجائیں۔ اب ہمیں سو جانا چاہیے تاکہ ہم صبح تازہ دم ہو کر حالات کو سمجھ سکیں۔"

جمال احمد جسکانی نے پوچھا "کیا تمھیں نیند آجائے گی؟"

"صرف مجھ سے نہ پوچھو، کرم داد سے بھی پوچھو۔ کل ہم بھیانک جنگل میں گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔ یہ تو شہر ہے۔ یہاں ہماری حفاظت ہو رہی ہے پھر نیند کیوں نہیں آئے گی؟ رہ گیا یہ سوال کہ وہ تجسس جو تم لوگوں کے دلوں میں، دماغوں میں موجود ہے اس کی شدت مجھ میں کیوں نہیں ہے۔ اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ مجھ میں کچھ زیادہ ہی ضبط اور تحمل کا مادہ ہے۔"

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "بہت ہو چکا۔ تھوڑی دیر میں دن نکلنے والا ہے۔ ہم دو چار گھنٹے نیند پوری کر لیں۔ میں کم از کم چار گھنٹے سونے کے بعد ہی ملاقات کروں گا۔"

میں دروازہ کھول کر وہاں سے نکل گیا۔ ساتھ والے کمرے میں آیا پھر آرام سے ایک بستر پر چاروں شانے چت لیٹ گیا۔ میرے ساتھی درست کہتے تھے۔ تجسس کے مارے کبھی نیند نہیں آتی۔ میں خیال خوانی کے ذریعے یا دوسرے لفظوں میں اپنی عادت کے مطابق اپنے دماغ کو کنٹرول میں رکھ کر سو سکتا تھا لیکن میرے اندر بھی کئی سوالات بڑی شدت سے سر ابھار رہے تھے۔ انسپکٹر علی مختار میمن نے خودکشی کیوں کی؟ اور اگر کی تو ہمارے ساتھ مثبت انداز اختیار کرنے کے بعد اس نے ہمارے خلاف خط کیوں لکھا؟ وہ خط اسی کا تھا یا جعلی تھا؟ کیا واقعی خودکشی کی تھی یا خودکشی کا ڈراما کیا گیا؟

میں نے افسران کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ جس کے پاس وہ خط تھا، وہ دوسرے آفیسر سے کہہ رہا تھا "صبح ہونے میں صرف ایک گھنٹا رہ گیا ہے۔ پتا نہیں، وہ سیکرٹ سروس کا آدمی کب یہاں پہنچ جائے۔ اس سے پہلے خط کے سلسلے میں تصدیق ہو جانا چاہیے۔ ہمیں بھی تو کچھ پتا چلے کہ آخر یہ ڈراما کیا ہے؟"

دوسرے افسر نے کہا "وہ آتا ہی ہوگا۔ ہم نے ایک ماہر تحریر شناس کے پاس اسے بھیجا ہے۔ انسپکٹر علی مختار میمن کی دوسری تحریریں بھی بھیجی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ خط اس کا لکھا ہوا ہے یا نہیں؟ اگر اس نے نہیں لکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے خودکشی بھی نہیں کی۔"

میری خیال خوانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کوئی میرے کمرے کے دروازے تک آیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں ۔ فوراً ہی حور بانو کے دماغ میں جھانکا تو پتا چلا، وہی آئی ہے اور آہستگی سے دروازہ کھول رہی ہے۔ پھر وہ اندر آگئی ۔ اس نے مجھے سوتے ہوئے دیکھ کر اسی آہستگی سے پکارا تھا " کیا سو رہے ہو ؟ "

میں ٹس سے مس نہ ہوا ۔ چپ چاپ آنکھیں بند کیے پڑا رہا ۔ وہ میرے قدموں کے پاس آئی ۔ اس نے میرے جوتے اتارے جرابیں اتاریں ۔ پھر آہستگی سے میرے پاؤں کے تلوے ... سہلانے لگی۔

" اس کا انداز منفی نہیں تھا۔ وہ بہت اچھی اور محبت کرنے والی لڑکی تھی ۔ مجھ سے بے حد متاثر تھی ۔ ہر وقت میری خدمت کرنے کا جذبہ رکھتی تھی ۔ میں اس کے انداز کو ، اس کے مزاج کو، اس کی محبت کو، اس کے جذبوں کو سمجھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر اپنی نیند پوری کرلے ۔ لہٰذا میں نے اس کے دماغ کو آہستہ آہستہ تھپکنا شروع کیا ۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ جمائی لے کر وہاں سے اٹھی اور دوسرے پلنگ پر جاکر بیٹھ گئی ۔ سونا نہیں چاہتی تھی ۔ میری طرف دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کل سے مجھے کیا ہو رہا ہے ۔ ان کے پاس آتی ہوں تو میری رگ رگ میں نیند دوڑنے لگتی ہے ۔ جیسے نشہ سا دوڑ رہا ہو ۔ آپ ہی آپ غنودگی طاری ہو رہی ہو "

وہ ایک انگڑائی لے کر بستر پر دراز ہوگئی اور میری طرف کروٹ لے کر مجھے دیکھنے لگی ۔ دیکھتے دیکھتے پلکیں بوجھل ہونے لگیں ۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں ۔ میں نے اسے نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا ۔

اس سے فرصت ملتے ہی میں پھر افسران کے پاس پہنچ گیا ۔ اس وقت تک وہ ماہر تحریر شناس آکر اپنی رپورٹ دے چکا تھا ۔ میں نے ایک افسر کے ذریعے معلوم کیا ۔ اس نے بتایا تھا۔

" یہ تحریر تو انسپکٹر علی ممتاز میمن کی ہی ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس نے یہ خود نہیں لکھا ہے بلکہ زبردستی اسے لکھنے پر مجبور کیا گیا ہے ۔ بات جو کچھ بھی رہی ہو بہرحال یہ خط اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے "

یہ بات تو اب صاف ہوگئی تھی کہ وہ خط جبراً لکھوایا گیا تھا ۔ ریوالور کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی گئی ہوگی یا اسے کسی اور طرح مجبور کر دیا گیا ہوگا ۔ بلیک میل کیا گیا ہوگا یا کوئی اور صورت پیدا کی گئی ہوگی جس کے باعث وہ خط لکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

ایک افسر نے کہا " ابھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ انسپکٹر علی مختار میمن کی بیوی کو پچھلی شام قتل کر دیا گیا تھا ۔ اس کا مطلب ہے کہ خط کے مطابق جمال احمد جبکانی نے اس کی بیوی کو قتل کیا ہے یا پھر جبکانی پر الزام عائد کیا جا رہا ہے "

" چلو اچھا ہے ۔ یہ کیس ہمارے سر سے ٹل کر سیکرٹ سروس والوں کے پاس جا رہا ہے "

ایک اور افسر نے کہا " ان تمام اہم شخصیات نے جو پیش کش کی ہے اس کے متعلق آپ لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے ؟ "

ایک افسر نے جواب دیا " پیش کش تو بہت ہی زبردست ہے ۔ ہم ساری زندگی دن رات محنت کرکے بھی اتنی رقم نہیں حاصل کرسکتے لیکن معاملہ سیکرٹ سروس والوں تک پہنچ گیا ہے ۔ ہم اس فائل میں نہ کوئی تبدیلی کرسکتے ہیں نہ اس خط کی نقل کسی کو دے سکتے ہیں "

" دینے میں کیا حرج ہے ۔ سیکرٹ سروس والوں کو اصلی اور ڈپلیکیٹ فائلوں کا علم نہیں ہے ۔ ہم فوٹو اسٹیٹ کاپی کے ذریعے ان کی نقل تیار کریں گے اور وہی نقل ان کے پاس اس رپورٹ کے ساتھ بھجوائیں گے کہ ہمیں اوریجنل نہیں بلکہ نقل ملی تھی "

" اور وہ خط ؟ "

" ہمیں پیش کش کرنے والے کہتے ہیں ، خط کی نقل مل جانے سے کام چل جائے گا "

میں اپنی جگہ سوچ رہا تھا ۔ دنیا میں کیسے کیسے فراڈ ہوتے ہیں ۔ ایک محکمہ دوسرے محکمے سے بھی فراڈ کرتا ہے ۔ حالانکہ ایک ہی ملک کے لیے سارے محکمے کام کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لیے ، ایک دوسرے میں خامیاں نکالنے کے لیے چور دروازوں سے بڑی بڑی رقمیں حاصل کرنے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے اختیار کیے جاتے ہیں ۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ حور بانو کو دیکھا ، وہ گہری نیند میں تھی اور میری مرضی کے خلاف بیدار نہیں ہوسکتی تھی ۔ میں نے جبکانی کے دماغ میں جھانک کر دیکھا ۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا ۔ مگر جاگ رہا تھا ۔ اسی پریشانی میں تھا کہ وہ غیبی مدد کہاں سے حاصل ہو رہی ہے اور کون ان کا ساتھ دے رہا ہے ؟

ریحانہ اور کرم داد سو رہے تھے ۔ میں نے جمال احمد جبکانی کے دماغ کو تھپکنا شروع کیا ۔ صرف پانچ منٹ کے اندر ہی وہ گہری نیند میں تھا ۔ میں نے حور بانو اور جمال احمد جبکانی کی طرح ریحانہ اور کرم داد کے دماغ کو بھی ہدایت دی کہ وہ گہری نیند سوتے رہیں ۔ کمرے میں کوئی بھی آئے ، کیسی بھی آہٹ ہو ، ان کی آنکھ نہ کھلے ۔ جب تک ان کے دماغ میں کوئی سوچ کی لہر

اگر بیدار نہ کرے ۔

حور بانو نے میری جرابیں اور جوتے اتار دیے تھے ۔ وہ میں نے دوبارہ پہنے اور کمرے سے نکل گیا ۔ دور دور تک پولیس والوں کے لیے کوارٹر بنے ہوئے تھے ۔ پولیس افسران کے لیے بھی الگ مکانات تھے ۔ میں ایک مکان کے سامنے پہنچا ۔ وہاں کھڑے ہوئے دو مسلح پہرے داروں نے مجھے دیکھتے ہی الرٹ ہو کر سیلوٹ کیا ۔ میں دروازے تک جانا چاہتا تھا ، ایک نے معذرت کرتے ہوئے کہا " جناب ! آپ ذرا انتظار کریں ۔ ہم صاحب کو خبر کرتے ہیں "

ان کے صاحب نے اپنے پہرے داروں کو یہی حکم دیا تھا کہ کوئی بھی آئے تو پہلے انھیں اطلاع دی جائے ۔ اندر صاحب کے ساتھ چند راشی قسم کے افسران بیٹھے ہوئے تھے اور چور دروازے سے آنے والی رقم کو حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے ۔

میں نے گھور کر اس پہرے دار کو دیکھا اور کہا " کیا میں اطلاع دے کر تمہارے صاحب کے پاس پہنچوں گا ۔ ایک طرف ہٹ جاؤ "

وہ بے چارہ سہم کر سیدھا کھڑا ہوگیا ۔ میں نے برآمدے میں پہنچ کر دروازے کو دیکھا ۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا ۔ صاحب لوگوں کو اطمینان تھا کہ پہرے داروں کی موجودگی میں کوئی ایسا شخص اندر نہیں آسکتا جو ان کے لیے پریشانی کا سبب بن سکے ۔ میں نے دروازے پر ایک زور کی لات ماری ۔ اندر جیسے دھماکا ہوگیا ۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تمام افسران ہڑبڑا کر کھڑے ہوگئے ۔ باہر پہرے دار بھی ایک دم سے مستعد ہو کر میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے صاحب لوگوں کا حکم پاتے ہی مجھ پر گولی چلا دیں گے ۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا ۔ ایک آفیسر نے ہکلاتے ہوئے کہا " یہ ... یہ جناب ! یہ کیا انداز ہے ؟ آپ نے دروازے کو اس طرح کیوں کھولا ؟ کیا پریشانی ہے ؟ ہم سے کوئی شکایت ہے ؟ "

میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے صوفوں کے درمیان رکھی ہوئی میز کو دیکھا ۔ اس میز پر تمام فائلیں تھیں اور وہ لفافہ رکھا تھا جس میں انسپکٹر مختار علی میمن کا آخری خط تھا ۔ میں اطمینان سے چلتا ہوا اس میز کے پاس گیا ۔ پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ اپنا پاؤں میز پر رکھا ۔ وہ سب مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ کچھ گھبرائے ہوئے بھی تھے ۔ چور کو تو ہمیشہ کسی نہ کسی بات کا دھڑکا لگا ہی رہتا ہے ۔

میں نے ان پر ایک سطحی نظر ڈالتے ہوئے کہا " تم کیا سمجھتے ہو ، سیکرٹ سروس والے بالکل بے خبر رہتے ہیں ۔ ہم جانتے ہیں ، یہاں آئے ہوئے مجرموں کے حمایتی تم تینوں کو بیس لاکھ روپے دے رہے ہیں "

ایک نے ہچکچاتے ہوئے کہا " یہ ... یہ جھوٹ ہے ۔ کسی نے آپ کو غلط رپورٹ دی ہے "

" میں کسی کی رپورٹ پر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا ۔ تم مجھے غافل نہ سمجھو ۔ ہم ملک دشمنوں ، ان کے ایجنٹوں ، جو فعل بسا اوقات اور راشیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے جیسے طریقے اختیار کرتے ہیں ، ان کے متعلق تم سوچ بھی نہیں سکتے "

" مسٹر بابر ! ہم نے کچھ نہیں کیا ہے ۔ دیکھیے ، آپ کے سامنے یہ تمام اوریجنل فائلیں رکھی ہوئی ہیں ۔ انسپکٹر کا وہ خط بھی موجود ہے ۔ ہم نے کوئی ہیرا پھیری کی ہوگی تو ... "

" کیسے ہیرا پھیری کروگے ؟ اس سے پہلے ہی میں سر پر سوار ہوگیا ہوں ۔ چلو فون کا ریسیور اٹھاؤ اور اپنے اعلیٰ افسر سے رابطہ قائم کرو ۔ اس سے کہو ، بہت اہم معاملہ ہے ، اسے فوراً یہاں آنا چاہیے ۔ اگر وہ ٹالنا چاہے تو اسے چیف سیکریٹری کا حوالہ دے سکتے ہو "

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے ۔ رابطہ قائم ہوگیا ۔ وہ جو کہہ رہا تھا ، میں اس کے دماغ میں رہ کر سن رہا تھا ۔ انھوں نے وہی کہا ، جس کی میں نے ہدایت کی تھی ۔ دوسری طرف سے کہا گیا کہ ان کا اعلیٰ افسر وہاں پہنچنے والا ہے ۔

ریسیور رکھ دیا گیا ۔ ہم اس کا انتظار کرنے لگے ۔ ایک نے کہا " جناب ! آپ ہمارے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں کرسکیں گے اور نہ ہی ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے "

میں نے انھیں گہری سنجیدگی سے دیکھا " جب غلط کام نہیں کیا ہے تو خاموش رہو ۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا "

بیس منٹ کے اندر ہی وہ اعلیٰ افسر پہنچ گیا ۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا " کیا بات ہے ؟ "

" آپ کے یہ تین ماتحت افسران بیس لاکھ روپے لے کر یہ اوریجنل فائلیں ، خط سمیت ہمارے دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتے تھے اور اس کی نقل سیکرٹ سروس والوں کو دینا چاہتے تھے "

ان میں سے ایک نے کہا " یہ جھوٹ ہے ، غلط الزام ہے "

اعلیٰ افسر نے مجھ سے پوچھا " آپ کے پاس کوئی ثبوت موجود ہے ؟ "

میں نے تمام فائلیں اٹھالیں، اس خط کو بھی رکھ لیا۔ پھر کہا "آپ میرے ساتھ ان صاحب کے بیڈروم میں چلیں۔"

وہ افسر ذرا گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا "بیڈروم میں کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

میں نے اعلیٰ افسر سے کہا "یہاں تمھاری فیملی نہیں ہے پھر بیڈروم میں جانے پر اعتراض کیا ہے تمھیں؟"

افسر نے اس ماتحت کو گھور کر کہا "میرا خیال ہے ہمیں آپ کے بیڈروم میں چلنا ہی چاہیے۔"

وہ طوعاً و کرہاً ہمارے ساتھ بیڈروم میں آیا۔ میں نے کہا "مسٹر! اپنے پلنگ کے نیچے سے وہ بریف کیس نکالو جس میں بیس لاکھ روپے رکھے ہیں۔"

یہ بات بجلی بن کر گری۔ اس نے ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے لگ کر کہا "نن... نہیں یہ روپے میرے نہیں ہیں۔ یہ تو مسٹر سلیمان میرے پاس لے کر آئے تھے۔ میں انکار کر رہا تھا کہ میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کروں گا۔"

اعلیٰ افسر نے پوچھا "اچھا تو آپ انکار کر رہے تھے اور یہ بریف کیس آپ کے... پلنگ کے نیچے اتنی حفاظت سے رکھ دیا گیا، شاید خود پہنچ گیا اور مسٹر سلیمان، تم..."

اس اعلیٰ افسر کی بات پوری نہ ہو سکی۔ اس افسر نے، جس کا نام بھی سلیمان تھا، ریوالور نکال کر مجھے اور اعلیٰ افسر کو نشانے پر لے کر کہا "ایک تو یہ بیس لاکھ روپے کی خطیر رقم ہمارے ہاتھ سے نکل رہی ہے، دوسرے یہ بات آپ کے علم میں آجانے کے بعد ہم بھی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ اب ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں۔ جو لوگ ہمیں یہ رقم دے گئے ہیں، آپ کا تعاون حاصل ہونے کے بعد ہم ان سے اتنی رقم مزید حاصل کر لیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، سیکرٹ سروس والوں کو ہمارے فراڈ کا علم نہیں ہو سکے گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "ایک سیکرٹ سروس والا تمھارے سامنے کھڑا ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو، ہمیں علم نہیں ہوگا۔ یہ بتاؤ اگر ہم نے تمھارا ساتھ نہ دیا تو کیا کرو گے؟ اگر تم ہمیں گولی مار دو گے تو تم یہاں سے کیسے بچ کر نکلو گے؟ میرے متعلق کہہ سکتے ہو کہ مجھے سیکرٹ ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے، ایک عادی مجرم سمجھ کر گولی مار دی لیکن اپنے اعلیٰ افسر کے بارے میں کیا جواز پیش کرو گے؟"

ریوالور والے افسر نے کہا "جب جان پر بن آتی ہے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ دماغ دھندلا جاتا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نجات کا یہی راستہ نظر آتا ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبیں، میں تم دونوں کو لے ڈوبوں گا۔ بہتری اسی میں ہے کہ ہم سمجھوتا کر لیں۔"

میں نے کہا "سمجھوتا تو ہم کر لیں گے لیکن وہ اوپر والا..."

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر چھت کی طرف اشارہ کیا، ریوالور والے افسر نے اوپر دیکھا۔ بس اتنی سی مہلت کافی تھی۔ میں نے پھرتی سے اس کے ذہن کو بہکایا، کچھ اپنا داؤ استعمال کیا۔ ریوالور والے ہاتھ پر ایک ٹھوکر پڑی اور وہ فضا میں اچھلتا ہوا پلنگ کے پاس فرش پر پہنچ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ اس کے بعد پوچھا "اب کس کے پاس ریوالور ہے؟"

سب کو چپ لگ گئی۔ اعلیٰ افسر نے کہا "بڑے شرم کی بات ہے۔ میں آپ لوگوں پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس طرح میرے محکمے کو بدنام کریں گے۔ اخبارات والے چلاتے ہیں۔ ملک کی اکثریت ہم پر انگلی اٹھاتی ہے۔ ہم جیسے ایمان دار افسران اور پولیس کے وہ سپاہی جو دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں، وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ بدنام ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "جناب! آپ اپنے ماتحتوں کو نصیحتیں کریں یا ان کے خلاف اقدامات کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا ہوں اور کچھ دیر سونا چاہتا ہوں۔ ایک اہم بات سن لیں۔ میرے ساتھیوں کو میری اصلیت معلوم نہیں ہے، وہ نہیں جانتے کہ میں سیکرٹ ایجنٹ ہوں، لہٰذا ان کے سامنے ایسا کوئی تاثر نہ دیں یا میرے ساتھ ایسا رویہ نہ رکھیں، جس سے میری اصلیت ظاہر ہو جائے، بس اس کا خیال رکھیں۔ آپ یہاں کے اعلیٰ افسر ہیں ان کے خلاف جو کرنا چاہیں کریں لیکن یہ اوریجنل فائلیں اور مختار صاحب کا آخری خط آپ کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ سویرے ہمارا سیکرٹ ایجنٹ آئے گا اور یہ چیزیں آپ سے لے جائے گا۔"

میں نے واپس جاتے ہوئے بیڈروم کے دروازے پر رک کر اعلیٰ افسر سے کہا "جناب عالی! مجھے یقین ہے کہ میری یہ امانت آپ کے پاس محفوظ رہے گی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ ہم سیکرٹ سروس والے بظاہر دور رہتے ہیں مگر مخالفین کے دماغوں میں گھسے رہتے ہیں۔"

میں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔ دن نکل آیا تھا۔ جب اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو ایک جونیئر آفیسر نے آکر کہا "ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں آپ لوگوں کے لیے ریزرویشن ہو گئی ہے لیکن وہ ٹرین رات کو آئے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمارا آدھا دن تو سوتے ہوئے گزر جائے گا۔"

میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میرے تمام ساتھی گہری نیند میں تھے۔ میں نے ایک ایک کے دماغ میں پہنچ کر ہدایت دی کہ اب گہری نیند نہیں سوئیں گے۔ کمرے کے باہر کوئی غیر معمولی بات ہو یا کوئی اندر آنا چاہے تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی، وہ عام حالات میں سوتے رہیں گے اور اپنی مرضی کے مطابق بیدار ہو جائیں گے۔

دن کی روشنی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ میں نے دروازے اور کھڑکیوں کے پردے برابر کیے۔ روشندان کی ایک رسی کھینچ کر اسے بھی بند کر دیا۔ اب کمرے میں تیز روشنی نہیں رہی تھی، اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ میں نے جوتے اور جرابیں اتاریں پھر آرام سے بستر پہ لیٹ کر دماغ کو ہدایات دیں۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی طرح نیند میں گم ہو گیا۔

میں نے دماغ کو جو ہدایات دیں۔ ان کے مطابق دن کے دو بجے بیدار ہونا تھا لیکن اچانک ہی آنکھ کھل گئی۔ میں نے یکبارگی سانس روک لی۔ کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی۔ اس لیے میرے دماغ نے مجھے بیدار کر دیا تھا۔ سانس روکنے میں میرے ارادے کا دخل نہیں تھا، ایسا میں نے بے اختیار کیا تھا۔ شاید کسی کی سوچ کی لہریں میرے دماغ تک پہنچنا چاہتی ہوں۔ میں نے آہستہ آہستہ سانس لی، پھر مخاطب کیا "رسونتی! کیا تم ہو؟"

مجھے جواب نہیں ملا پھر اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اگر رسونتی کی سوچ کی لہریں میرے دماغ میں ہوتیں تو میں محسوس کر لیتا۔ میرے اندر صرف میری ہی سوچ کی لہریں تھیں۔

میں نے چپکے سے سونیا کے دماغ میں پہنچ کر معلوم کیا۔ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے، وہاں رات کے ڈیڑھ یا دو بجے ہوں گے۔ اس کی سوچ نے بتایا، رسونتی سو رہی ہے۔ وہ رسونتی کو تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ دونوں رات کو ایک ہی کمرے میں سویا کرتی تھیں۔

میں نے ثبانہ کے دماغ میں جھانک کر دیکھا۔ وہ بھی وادیٔ قاف میں اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی تھی اور آرام سے سو رہی تھی۔ فی الحال میں اپنی داستان کا وہ حصہ بیان کرتا جا رہا ہوں جو صرف مجھ سے متعلق ہے۔ میں نے سونیا، رسونتی، اعلیٰ بی بی، ثباتہ، مرجانہ اور ٹارزن بابا وغیرہ کو ابھی نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ ان کے ساتھ بھی پے در پے نت نئے واقعات پیش آتے جا رہے ہیں اور وہ سب وادیٔ قاف کو ایک نئی اور مثالی مملکت بنانے میں مصروف رہتے تھے۔

میں کبھی رسونتی، کبھی سونیا اور کبھی ثبانہ وغیرہ سے رابطہ قائم کر لیتا ہوں لیکن اپنی داستان کے موجودہ حصے میں اس کا ذکر نہیں کرتا۔ جب وقت آئے گا تو میری داستان کا وہ حصہ اس حصے میں آپ ہی آپ شامل ہو جائے گا۔

فی الحال میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ اچانک آنکھ کیسے کھل گئی۔ وہ کونسی غیر معمولی بات تھی جس نے مجھے نیند سے چونکا دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پردے کو ذرا سا ہٹایا، باہر جھانک کر دیکھا۔ اچھا خاصا دن نکلا ہوا تھا اور سورج چمک رہا تھا۔ میرے کمرے کے سامنے کوئی نہیں تھا حالانکہ دوسرے پولیس والے دور چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ ان کی موجودگی میں کوئی میرے دروازے کے پاس آکر اسے جبراً کھولنے کی کوشش کر رہا ہوگا اور میری آنکھ کھل گئی ہوگی۔

میں نے کھڑکی کے پردے کو برابر کیا پھر بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ سر اٹھا کر چھت کو دیکھا پھر روشندان کو۔ وہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو تشویش کا باعث ہوتی۔

میں نے حور بانو کو دیکھا تو ساری تشویش ڈھل گئی۔ ایسا دھلا دھلایا شفاف چہرہ تھا جیسے چاندنی ہوتی ہے۔ باہر تیز دھوپ تھی لیکن اندر نیم تاریکی تھی۔ وہ خواب خواب سی نظر آرہی تھی جیسے حقیقت نہ ہو، میرا خیال ہو، میں ہاتھ بڑھاؤں گا تو وہ گم ہو جائے گی۔

میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے خوابیدہ خیالات کو پڑھنے لگا۔ اب تو میں اس کے دل پر اور دماغ پر چھایا ہوا تھا، اس کے خوابوں اور خیالوں پر میری حکومت تھی حالانکہ میں جان بوجھ کر حکومت نہیں کر رہا تھا۔ وہ خود ہی مجھ سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ تاثر سوتے جاگتے قائم رہنا تھا لہٰذا سوتے وقت بھی قائم تھا۔

وہ دیکھ رہی تھی، میں اس سے بہت دور کھڑا ہوا اسے بلا رہا ہوں اور وہ شرما رہی ہے۔ میں پوچھ رہا ہوں "جب تم دل کی گہرائیوں سے مجھے چاہتی ہو تو پھر میرے پاس آنے میں کیسی شرم؟"

"میں کیا بتاؤں۔ تمھاری طرف آنا چاہتی ہوں تو یہ پاؤں روکتے ہیں۔ حیا صرف میری آنکھوں کا سرمہ نہیں ہے، میرے پاؤں کی زنجیر بھی ہے۔"

"میں تمھارے دل کی حالت جانتا ہوں۔ تم یہ زنجیر توڑ ڈالنا چاہتی ہو۔"

"مگر توڑ نہیں سکتی۔ سوچتی ہوں کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ میری شرم و جھجک باقی رہے۔ پاؤں کی زنجیر بھی ٹوٹ جائے اور میں تمھارے سانے میں پہنچ کر محبت سے چکنا چور

ہو جاؤں ؟

" ایک صورت ہے۔ تم میری بن سکتی ہو لیکن تمھیں اس کی خبر نہیں ہوگی۔ تم خوابیدہ دماغ سے میرے قریب رہو گی اور بیدار ذہن سے دُور رہا کرو گی۔"

" وہ کیسے ؟ "

" ہپناٹزم کے ذریعے۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ، میں تم پر تنویمی عمل کروں گا۔"

خوابوں کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ اب خواب کا منظر بدل گیا تھا۔ وہ سبز گھاس کے فرش پر لیٹی ہوئی تھی اور میں اس کے خواب میں تنویمی عمل کر رہا تھا۔ اس سے پوچھ رہا تھا " تم آنکھیں بند کر چکی ہو۔ کیا میری آواز سُن رہی ہو ؟ "

" ہاں، تمھاری آواز سُن رہی ہوں۔"

" میرے سوا دُنیا کی کوئی آواز تمھیں سُنائی نہیں دے رہی ہے۔"

" ہاں، تمھارے سوا دنیا کی کوئی آواز مجھے سُنائی نہیں دے رہی ہے۔"

" دوبارہ جب آنکھیں کھولو گی تو تمھیں دنیا کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے گی، صرف میں نظر آؤں گا۔ دنیا کی کوئی آواز سُنائی نہیں دے گی، صرف میرے احکامات سُنائی دیں گے۔ دُنیا کی ہر ضرورت مر جائے گی، صرف میری ضرورت باقی رہے گی۔"

" وہ میری باتوں کو اپنے طور پر دُہرا رہی تھی۔ پھر میں نے حکم دیا۔ آنکھیں کھول دو۔"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس بھری دنیا میں اسے صرف میں نظر آ رہا تھا اور اس کے آس پاس دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف میں تھا۔ کوئی بھی محبّت کرنے والی ہستی کیا چاہتی ہے؟ یہی کہ محبّت کرنے والوں کے درمیان کوئی تیسرا نہ ہو۔ اگر دیکھا جائے تو تنویمی عمل اور محبّت کا عمل ایک جیسا ہوتا ہے، یعنی کوئی معمول یا معمولہ دنیا کی آوازیں نہ سُنے، محبوب کے نغمے سُنائی دیں۔ دُور دُور تک کوئی نہ ہو، صرف محبوب کا دیدار ہو۔ خاموشی ہو، سنّاٹا ہو، ویرانی ہو اور محبوب کی پل پل مہربانی ہو۔

پھر جب تنویمی عمل کی میعاد ختم ہوتی ہے، محبّت کا طلسم ٹوٹتا ہے تو حیران حیران آنکھیں سوچتی ہیں، دل دھڑک دھڑک کر پوچھتا ہے۔ زندگی کے یہ اتنے سارے لمحے کس نے چُرا لیے ؟ لمحے ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں کہ ہم انھیں گزاریں لیکن بعض حالات میں ایسے لمحے آنکھ مچولی کھیل کر چلے جاتے ہیں اور کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں نے ایک عامل کی حیثیت سے اسے حکم دیا تھا کہ تم تنویمی نیند سو رہی ہو۔ ایک گھنٹے کے بعد تنویمی عمل کا اثر زائل ہو جائے گا اور تمھاری آنکھ کھل جائے گی۔

پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چند لمحوں تک یونہی ساکت پڑی سوچتی رہی، جو لمحے آنکھ مچولی کھیل کر گئے تھے، وہ خواب خواب سے تھے اور وہ خواب کہہ رہے تھے، کچھ تو ہے جس کی بازگشت بیداری تک محسوس ہو رہی ہے۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اسے اپنے آپ میں ایک انقلابی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا، میں اسی طرح سو رہا تھا جیسے وہ سونے سے پہلے دیکھ چکی تھی۔ جس طرح اس نے میری جرابیں اور جوتے اُتار کر رکھے تھے، وہ تمام چیزیں ویسی ہی رکھی تھیں۔ اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میں تب سے سو رہا ہوں اور اب تک گہری نیند میں ہوں اور اس دوران میری آنکھ نہیں کھلی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد باتھ روم کے شاور سے پانی گرنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، کمرہ اس کے حسین وجود سے خالی تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک سُنائی دی۔ میں فوراً ہی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جسکانی، کرم داد وغیرہ کے دماغوں میں چھلانگ لگا کر پتا چلا، ان میں سے کوئی نہیں ہے۔ میں نے دوسری دستک کا انتظار کیا لیکن وہ دوسری دستک ساتھ والے دروازے پر سُنائی دی۔ وہاں میرے تینوں ساتھی سو رہے تھے۔ آواز سُن کر اُٹھ گئے۔ ایک نے پوچھا " کون ہے ؟ "

باہر سے آواز آئی " دی اولڈ مین۔"

یہ تو سیکرٹ سروس کا خاص سیکرٹ ایجنٹ تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کے دماغ میں پہنچ کر خیالات پڑھے۔ اس نے وہاں کے ایک اعلیٰ افسر سے وہ تمام فائلیں اور انسپکٹر علی مختار کا آخری خط وصول کر لیا تھا اور اب مجھ سے ملنے آیا تھا۔

سعید احمد صاحب نے اسے بتایا تھا کہ کسی بھی وقت فرہاد اگر تم سے دماغی رابطہ قائم کرے تو اسے کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ کسی دوسرے سیکرٹ ایجنٹ سے بھی اس کا ذکر نہ کرنا۔

میں نے فوراً ہی سعید احمد کے دماغ میں پہنچ کر پوچھا " آپ نے سیکرٹ ایجنٹ اولڈ مین کو میرے متعلق کیوں بتایا ؟ "

انھوں نے جواباً کہا " میں اور کیا کر سکتا تھا۔ اتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ تمھیں رابطہ قائم کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے تھا، اولڈ مین نے وہ تمام فائلیں اور خط حاصل کیے ہیں یا نہیں ؟ "

" میں نے معلوم کیا ہے، وہ سب اولڈ مین کی تحویل میں ہیں۔"

" اس کے علاوہ بھی کچھ اہم باتیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ بیرونی ممالک سے آنے والے تخریب کار مختلف شہروں اور دیہاتوں میں پھیل رہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے چیلنج ہے۔ میں تو اسے

غیبی مدد سمجھتا ہوں کہ تم پاکستان پہنچ گئے ہو۔ کچھ دیر پہلے دی اولڈ مین نے مجھے بتایا ہے کہ جو کچھ اس کی تحویل میں ہے اگر وہ اسے تنہا لائے گا تو کہیں نہ کہیں چوٹ ہو سکتی ہے۔ اس نے محسوس کیا ہے کہ اس کی سخت نگرانی ہو رہی ہے۔"

" اولڈ مین ہمارے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ میرے ساتھیوں کو میری اصلیت کا علم ہو، میں اولڈ مین کو اس کے اظہار سے روکنے جا رہا ہوں۔ پھر آپ سے رابطہ قائم کروں گا۔ خدا حافظ۔"

میں اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اسی وقت جسکانی نے دروازہ کھول کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا " ہیلو اولڈ مین ! تم ہم سے کیا چاہتے ہو ؟ "

میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر کہا " مسٹر! میں فرہاد علی تیمور ہوں۔ چونکنے اور حیرانی ظاہر کرنے کی حماقت نہ کرنا۔ تمھارے چیف نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم سے دماغی رابطہ قائم کر لوں۔ صرف آنا کہے دیتا ہوں کہ یہاں بابر کو اہمیت نہ دینا، جو کچھ کہنا ہو، کرم داد یا جسکانی سے کہنا۔ ان میں سے کسی ایک کو اہمیت دیتے رہنا۔"

جتنی دیر میں اس کے دماغ میں بولتا رہا، اتنی دیر وہ ایک ہاتھ سے سر کھجا کر سوچنے کی ایکٹنگ کرتا رہا۔ بڑا غضب کا اداکار تھا۔ وہ جسکانی کو دیکھ کر سوچنے کے انداز میں مہلت حاصل کر رہا تھا۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر کہا " ہیلو مسٹر جسکانی ! میں اولڈ مین ہوں۔"

جسکانی نے حیرانی سے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر مصافحہ کرتے ہوئے کہا " تم مجھے جانتے ہو مگر میں تمھیں نہیں جانتا۔ شاید تم نے یہاں میرا نام سُن لیا ہے۔"

" کیا مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے ؟ میں بہت اہم گفتگو کرنے آیا ہوں۔"

" ہاں ضرور تشریف لائیے لیکن یاد رکھیے، اگر دشمنوں کی طرف سے آئے ہیں تو یہاں سے اپنے قدموں پر چل کر واپس نہیں جا سکیں گے۔"

وہ ہنستا ہوا، واکنگ اسٹک کو فرش پر ٹیکتا کمرے کے اندر آ گیا۔ ریحانہ اور کرم داد کو دیکھ کر بولا " تم صرف تین تو نہیں پانچ تھے، باقی دو کہاں ہیں ؟ میں تم سب کی موجودگی میں ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔"

کرم داد نے آگے بڑھ کر پہلے اولڈ مین کی تلاشی لی۔ اس کے پاس صرف ایک واکنگ اسٹک اور ایک بریف کیس تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر ان کے کمرے میں آ گیا۔ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا " مجھے اپنے دروازے پر بھی دستک سُنائی دی تھی۔ اس کے بعد تم لوگوں کی آوازیں سن کر آیا ہوں۔ بات کیا ہے ؟ "

کرم داد نے کہا " یہ بڑے میاں ہم سے ملنے آئے ہیں۔ کیا مقصد ہے، ابھی پتا چل جائے گا۔"

کرم داد اور جمال احمد جسکانی اس کی چھڑی کو اور بریف کیس کو کھول کر دیکھ رہے تھے۔ دی اولڈ مین نے ہنستے ہوئے کہا " یہ ایک عام سی چھڑی ہے۔ بریف کیس کو اچھی طرح دیکھ لو۔ اس میں تم سب کی فائلیں ہیں اور انسپکٹر کا آخری خط بھی ہے۔ مجھے اوپر سے احکامات موصول ہوئے ہیں۔ ان احکامات کے مطابق یہ تمام اہم چیزیں جمال احمد جسکانی کے حوالے کرنے آیا ہوں۔"

جمال احمد جسکانی نے شدید حیرانی سے پوچھا " میرے حوالے کیوں ؟ اور یہ اوپر سے احکامات آنے کا کیا مطلب ہوا ؟ "

دی اولڈ مین نے کہا " میں کچھ نہیں جانتا، جو کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سُن لیجیے اور اس پر عمل کیجیے۔ یہ تمام فائلیں آپ کے دشمنوں کے لیے آپ لوگوں سے زیادہ اہم ہیں۔ وہ تمام وڈیرے، زمیندار، جاگیردار، اور معزز لوگ جو آپ لوگوں کی وجہ سے خطرے میں گھر گئے ہیں، اپنے بچاؤ کے لیے ان فائلوں اور اس خط کو حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے لہٰذا اسے یہاں سے اسلام آباد تک لے جانا گویا کہ جوئے شِیر لانا ہے۔"

جسکانی نے پوچھا " لیکن تمھارے بڑوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ جمال احمد جسکانی یہ جوئے شیر لا سکتا ہے ؟ "

" ہمارے بڑے سب کچھ جانتے ہیں۔ ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ میں جو چیزیں تمھاری تحویل میں دے رہا ہوں، ان کے ذریعے تم پھانسی بھی پا سکتے ہو اور ایک نئی زندگی کا آغاز بھی کر سکتے ہو۔ تمھاری نجات اسی میں ہے کہ ان فائلوں اور اس خط کی حفاظت کرتے رہو۔ جو لوگ انھیں تم سے حاصل کرنے کی کوشش کریں، تم انھیں قانون کے حوالے کر دو۔ اگر تم نے تعمیری انداز میں حُبّ الوطنی کا ثبوت دیا تو تم سب کے پچھلے جرائم نظر انداز کر دیے جائیں گے اور تم لوگوں کو ایک بہترین محبِ وطن شہری کی سند حاصل ہو جائے گی۔"

کرم داد نے کہا " ہم واقعی ماضی کو اپنی زندگی سے دھو دینا چاہتے ہیں، جو جرائم کیے ہیں ان کے داغ مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہیں لیکن ہماری حکومت نے ہمیں کیسے پہچان لیا کہ ہم ہی ان کے کام آ سکتے ہیں۔ اعلیٰ حکام ہم پر اتنا اعتماد کیسے کرنے لگے ہیں ؟ "

" یہ میں نہیں جانتا کہ کس بنا پر تم سب پر یہ اعتماد کیا جا رہا ہے۔ میرے سامنے تو صرف جمال احمد جسکانی کا نام لیا گیا ہے

میں یہ چیزیں ان کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ یقیناً حکومت ان پر بہت زیادہ یقین اور اعتماد رکھتی ہے۔ شاید اسی لیے ان چیزوں کے ساتھ یہ لائٹر بھی دیا ہے۔"

دی اولڈ مین نے جیب سے ایک لائٹر نکال کر جسکانی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم سب کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک طرف وطن کی حفاظت، دوسری طرف تخریب کاری۔ اگر تخریب کاری منظور ہو تو اس لائٹر کو پاس رکھو۔ میرے جانے کے بعد تمام فائلوں کو جلا دینا۔ پھر تمہارے پچھلے تمام جرائم مٹ جائیں گے، کوئی ثبوت نہیں رہے گا۔"

جسکانی نے لائٹر لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا "حکومت ہم پر اندھا اعتماد کرتی ہے تو ہم اس اعتماد کو اپنی جانیں دے کر بھی برقرار رکھیں گے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جب ہمارے تمام جرائم مٹا دینے کا ارادہ ہے اور ہمیں اچھے چلن کی سند بھی دی جا رہی ہے تو پھر ہم یہ خطرہ کیوں مول لیں کہ اپنے خلاف ان فائلوں کی صورت میں ثبوت لے کر اسلام آباد جائیں۔"

"مقصد صرف ایک ہے۔ یہ فائلیں جب تک تمہارے پاس رہیں گی، دشمن مختلف انداز میں تمہارے سامنے آتے رہیں گے اور تم سے مقابلے کے دوران وہ ہماری نظروں میں بھی آجائیں گے۔ تم اور تمہارے ساتھی تمام تخریب کاروں اور دہشت گردوں کا مقابلہ کر کے انھیں فنا کرنا چاہتے ہیں، اسی لیے تمہاری حفاظت حکومت نے اپنے ذمے لے لی ہے۔"

"آپ تخریب کاروں اور دہشت گردوں کو ہمارے ہاتھوں سے سزا دلانا چاہتے ہیں۔ آپ سفارتی سطح پر ان کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کرتے؟"

"سیدھی سی بات ہے، ہم سفارتی سطح پر کارروائی کریں گے تو کوئی ملک یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوگا کہ ان لوگوں کا تعلق اس سے ہے چنانچہ بات بن نہیں سکے گی جونکہ یہ معاملہ سفارتی سطح پر نہیں نمٹایا جا سکتا، اس لیے تم لوگوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔"

جسکانی نے بریف کیس کو بند کر کے اٹھاتے ہوئے کہا "یہ بریف کیس ہمارے ملک کی امانت ہے۔ حالانکہ اس کے ذریعے ہم پھانسی کے پھندے تک پہنچ سکتے ہیں لیکن ہم امانت میں خیانت نہیں کریں گے۔ اسے بحفاظت اسلام آباد تک پہنچائیں گے لیکن یہ ہمیں کس کے پاس پہنچانا ہوگا؟"

"یہ آپ کو بعد میں بتا دیا جائے گا۔ اچھا، اب مجھے اجازت دیجیے، خدا حافظ۔"

ہم چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے جمال احمد جسکانی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا "یہ کیوں مسٹر! تم تو مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اس غیبی امداد میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ اب ہم میں سے ہر شخص جان چکا ہے کہ ہمارے خلاف ہونے والے فیصلے کی اچانک تبدیلی کے پیچھے تمہارے علاوہ کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔"

جسکانی نے کہا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یقین کرو میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ کیا معاملہ ہے اور حکومت نے مجھ پر کیوں اعتماد کیا ہے؟"

کرم داد نے کہا "دیکھو، زیادہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم بہت گہرے ہو۔ جتنا زمین پر نظر آ رہے ہو اتنا زمین کے نیچے بھی ہو۔ یعنی آدھا ہم تمھیں دیکھ رہے ہیں اور آدھے تم نظر نہیں آ رہے ہو۔ پلیز، سچ سچ بتا دو، یہ معاملہ کیا ہے؟ اگر تم ملٹی نیشنل سے تعلق رکھتے ہوئے اپنے ملک کی خفیہ پولیس سے گہرے رابطہ رکھتے ہو تو اسے ہم سے کیوں چھپاتے ہو۔ ہم تو ایک دوسرے پر جان نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔"

جمال احمد جسکانی نے ہم سب کی طرف ہاتھ جوڑ کر کہا "خدا کے لیے مجھ پر شبہ نہ کرو۔ میں نہیں جانتا، یہ معاملہ کیا ہے۔ حکومت نے ہم پر یوں اچانک اس اندھے اعتماد کا اظہار کیوں کیا ہے؟ یہ خود میرے لیے حیران کن ہے۔"

میں نے کرم داد سے کہا "میں نہ کہتا تھا، ذرا صبر و تحمل سے کام لو۔ ابھی یہ مسئلہ الجھا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کل تک بہت سی باتیں سمجھ میں آجائیں۔ بہرحال اس حد تک تو بات صاف ہو گئی ہے کہ ہمیں حکومت کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ بے شک جسکانی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے۔ ہم اس پر اعتماد کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ہمارا بہترین دوست ہے اور اس نے اپنے وطن کی سلامتی کی خاطر تخریب کاری کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔"

جسکانی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تم سب آرام سے بیٹھ جاؤ۔ آج ہمیں بہت سے اہم معاملات در پیش ہیں۔ ہمیں حکومت کے موجودہ دوستانہ رویے پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ اس بریف کیس کو اسلام آباد تک پہنچانے کی تدبیر کرنی ہے۔ اس کے لیے ہم مل جل کر کوئی منصوبہ بنا لیں تو بہتر ہے۔ اس طرح یہ کام کچھ آسان ہو جائے گا۔"

ہم سب بیٹھ گئے تو ریحانہ نے پوچھا "حور بانو کہاں ہے؟"

میں نے ریحانہ سے کہا "جب میں یہاں آیا تھا تو وہ غسل خانے میں تھی۔ ذرا جا کر دیکھ لو۔"

وہ اٹھ کر حور بانو کی طرف چلی گئی۔ میں ویسے تو دماغی طور پر جمال احمد جسکانی اور کرم داد کے سامنے موجود تھا لیکن رہ رہ کر خیال خوانی کے ذریعے حور بانو کے پاس بھی پہنچ جاتا تھا۔ وہ گیلا

پاس پہنے ایک کرسی پر سمٹی بیٹھی تھی۔ ریحانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم نے کپڑوں سمیت غسل کیا ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ریحانہ نے پوچھا "پھر؟"

"پہلے میں نے کپڑے دھوئے پھر غسل کر کے انھیں پہن لیا۔"

"تم نے کپڑے کیوں دھوئے جب کہ معلوم ہے یہاں دوسرے کپڑے نہیں ہیں؟"

وہ بولی "مم... میں غسل کرنے کے بعد ایک بار کے اتارے ہوئے کپڑے دوبارہ اس وقت تک نہیں پہنتی، جب تک وہ دُھل نہ جائیں۔"

"بھئی، یہ گھریلو زندگی میں ہوتا ہے۔ ہم سفر میں ہیں اور ایک مہاتی زندگی گزار رہے ہیں، یہاں تو سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔ تم عملی تجربات کے لیے پہلی بار گھر سے نکلی ہو لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے، کبھی ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ بھوک سے مجبور ہو کر درختوں کے پتے چبانے پڑتے ہیں۔ تم وہی اپنے اتارے ہوئے کپڑے پہن لیتیں تو کیا فرق پڑتا؟"

حور بانو نے اپنی موٹی موٹی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر ریحانہ کو دیکھا۔ ریحانہ آخر عورت تھی، بہت کچھ سمجھ لیتی تھی۔ اس نے پوچھا "کوئی خاص بات ہے؟"

حور بانو کی پلکیں جھک گئیں۔ ریحانہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا "کیا بابر سے دوستی ہو گئی ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟"

اس نے تعجب سے پوچھا "کیا ہو گیا ہے۔"

"پتا نہیں، میں نے شاید خواب دیکھا تھا اور وہ خواب ہی ہو سکتا ہے۔ اگر حقیقتاً ایسا ہوتا تو مجھے آنکھوں کے سامنے سب کچھ نظر آتا۔"

"بھئی پہیلیاں نہ بجھواؤ، مجھے کچھ بتاؤ۔"

"مجھے یاد ہے کہ میں نے خود سونے سے پہلے انھیں گہری نیند میں دیکھا تھا، میں نے ان کے جوتے اور جرابیں اتاریں۔ جس طرح وہ جوتے اور جرابیں رکھی تھیں، وہ اسی طرح تھیں اور جس طرح وہ سو رہے تھے اسی طرح میری آنکھ کھلنے پر نظر آئے۔ میں باتھ روم میں چلی گئی تھی۔ جب وہاں سے واپس آئی تو وہ جا چکے تھے۔ دوسرے کمرے میں تم لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔"

"اتنی تفصیل نہ بتاؤ۔ صرف یہ بتاؤ کہ میں کیسے یقین کر لوں؟"

حور بانو نے عاجزی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "یقین کرو یا نہ کرو، کسی کے سامنے نہ کہنا۔ تمھیں میری قسم ہے، اپنے کرم داد سے بھی نہ کہنا۔ میں شرم سے مر جاؤں گی۔"

ریحانہ نے اس کے ہاتھ کو محبت سے تھام کر کہا "میرا مشورہ مانو، اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو، اتنا حوصلہ کہ بابر کے قریب جا سکو۔ اس سے کچھ فری ہو جاؤ، اسے اپنا لو۔ جب تم کہتی ہو کہ انجانے میں سہاگن بن جانے سے تمھیں دکھ نہیں ہوا، تم بابر کو بے انتہا چاہتی ہو تو پھر اس چاہت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تم اس کے قریب رہو۔ اگر انھی بھول بھلیوں میں رہو گی تو ایک دن بابر تم سے دور ہو جائے گا۔ تم نہیں جانتیں، مرد کی ذات بڑی بے مروت ہوتی ہے۔ طوطا چشمی میں جواب نہیں رکھتی۔ جہاں دوسری عورت دیکھی، وہیں نظر گھما لی۔ جب تم خود کو اس سے منسوب کر رہی ہو تو اسے بھرپور طریقے سے اپنانے کی کوشش کرو ورنہ پچھتاؤ گی۔"

وہ بے بسی سے بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہو گیا ہے، یہ ایک معمہ ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے شعور کی حدوں سے بہت دور یا تو عالمِ جنون میں یا عالمِ خواب میں یا عالمِ مدہوشی میں کسی کو دیکھا ہے تو اپنے بابر کو دیکھا ہے، کوئی دوسرا نظر آتا تو میں اسے کبھی قبول نہ کرتی۔"

ریحانہ نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا "یہ قبولیت تمہارے دل کی گہرائیوں سے ہے۔ میں یہی مشورہ پھر دوں گی کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنا لو۔ میں تمہارے کپڑوں کے لیے کچھ کرتی ہوں۔"

اِدھر میں کرم داد اور جمال احمد جسکانی کے پاس بیٹھا ہوا ان کی بحث میں حصہ لے رہا تھا۔ کبھی میں اِدھر رہتا تھا، کبھی اُدھر چلا جاتا تھا۔ ریحانہ آ رہی تھی۔ میں دماغی طور پر حاضر ہو گیا تھا۔ یوں بھی مجھے کرم داد اور جمال احمد جسکانی کی پلاننگ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ جب کہ میں جانتا تھا، ہمیں ہر حال میں وہ بریف کیس اسلام آباد تک پہنچانا ہوگا۔ راستے میں جو خطرات پیش آئیں گے، ان کا اندازہ کیا جا سکتا تھا اور اندازہ اس حد تک بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہ فائلیں اور اصل آخری خط کو حاصل کرنے کے لیے دشمن ہم پانچوں میں سے ایک ایک کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

ریحانہ نے کمرے میں آتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں انجان بنا رہا۔ پھر وہ میرے قریب آ کر ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "حور بانو نے غسل کیا ہے؟"

میں نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بے اختیار

پوچھا۔ "کیا غسل کرنا کوئی غیر معمولی بات ہے؟"

"وہ پگلی گیلے کپڑے پہن کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے زکام ہو جائے گا، سردی لگ جائے گی، بیمار پڑ جائے گی۔ اس کے لیے فوراً دوسرے لباس کا انتظام کرنا ہوگا۔"

ریحانہ یہ بات کہہ کر چپ ہو گئی لیکن کرم داد اور جمال احمد جسکانی مجھے گھور کر دیکھ رہے تھے اور مسکراتے بھی جا رہے تھے۔ میں نے بظاہر حیران ہو کر پوچھا۔ "مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

جسکانی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمیں یوں بھی شاپنگ کرنی تھی۔ کچھ ضرورت کی چیزیں خریدنی تھیں۔ اب ہماری بانو بھابی نے مجبور کر دیا ہے تو فوراً چلنا چاہیے اور ذرا آنگڑی قسم کی شاپنگ کرنی چاہیے۔"

اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس پانچ ہزار ہیں۔"

ریحانہ نے کہا۔ "پیسوں کی فکر نہ کرو۔ کیسے ہی ہنگامی حالات ہوں، خواہ جان پر بنی ہو، عورت پیسوں کو بھولتی نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی جاتی ہے، پیسے چھپا کر لے جاتی ہے۔ میرے پاس بھی بیس ہزار روپے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کسی کے پاس کچھ نہ ہوتا تب بھی فکر کی بات نہیں تھی۔ میں چشم زدن میں ہزاروں کیا، لاکھوں کروڑوں روپے نواب شاہ میں پیدا کر سکتا تھا مگر ذرا پاپڑ بیلنے پڑتے۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا اندیشہ ہوتا۔ بہرحال جسکانی اور ریحانہ نے مجھے اس مصیبت سے بچا لیا تھا۔

ہم نے ایک افسر سے دو گاڑیوں کی فرمائش کی۔ وہ فرمائش فوراً ہی پوری کر دی گئی۔ کرم داد اور جمال احمد جسکانی نے ان گاڑیوں کے انجن اور ان کے دوسرے حصوں کو اچھی طرح چیک کیا۔ ان کے نیچے جا کر بھی دیکھا۔ میں نے کہا۔ "کیوں زحمتیں اٹھا رہے ہو۔ دشمن ہمیں اس طرح نہیں ماریں گے۔ کیوں کہ ہمارے ساتھ بریف کیس جا رہا ہے۔ ہم دھماکے سے اڑائے جائیں گے تو بریف کیس اور فائلوں کے بھی چیتھڑے اڑ جائیں گے جس کا انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ حالانکہ وہ ان چیزوں کو بالکل صحیح حالت میں حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمیں عدالت تک گھسیٹ سکیں، سزا دلا سکیں اور اپنے آدمیوں کو صاف بچا کر نکال لے جائیں۔"

جسکانی نے کہا۔ "یہ بریف کیس جتنا ہمارے لیے اہم ہے اتنا ہی دشمنوں کے لیے ہے۔ اس سے زیادہ ہماری حکومت کے لیے ہے۔ اس کے ذریعے ہماری خفیہ پولیس ملک کے اندر پھیلے ہوئے بہت سے دہشت گردوں کو بے نقاب کر سکے گی۔"

ہم دو گاڑیوں میں تقسیم ہو کر بیٹھ گئے۔ میں اور جسکانی پہلی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حور بانو میرے قریب ہی رہتی تھی لیکن اس بار وہ ریحانہ کے بازو کو تھامے ہوئے شرما رہی تھی۔ مجھے جھکی جھکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ روانگی کے وقت وہ ریحانہ کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔ اس گاڑی کو کرم داد ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہماری گاڑیوں میں مسلح سپاہی بھی تھے۔ ہم شام کے پانچ بجے واپس آئے۔ ہمارے پاس اٹیچی کیس وغیرہ تھے۔ ہم نے اپنی ضرورت کے مطابق تمام سامان خرید لیا تھا۔ جو بہترین ریڈی میڈ لباس نواب شاہ میں دستیاب ہو سکتا تھا، وہ ہم نے خرید لیا تھا۔ کرم داد، جمال احمد جسکانی اور میں نے یہی کوشش کی تھی کہ ہمیں پتلون، شرٹ، بنیان یا جیکٹ وغیرہ مل جائے اور ہمیں ایسا لباس مل گیا تھا۔ اگرچہ شلوار قمیص میں بھی انسان ایکشن میں رہ سکتا ہے اور دشمنوں کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن ہم ٹی ٹی سینٹروں کے تربیت یافتہ تھے۔ وہاں ہم نے ایسے ہی ملبوسات میں ٹریننگ حاصل کی تھی۔ دوسرے کمرے میں حور بانو اور ریحانہ نے سندھی کڑھائی کیا ہوا کرتا اور شلوار پہن لیے تھے۔ دوپٹے بھی بڑے رنگا رنگ تھے۔ حور بانو نے آئینے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے زندگی میں پہلی بار سندھی خواتین کا لباس پہنا ہے۔"

ہم ٹرین کی آمد کے وقت اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ مسلح سپاہی ہماری نگرانی اور حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ٹرین کی آمد تک فرسٹ کلاس ویٹنگ روم خالی کرا دیا گیا۔ جو فرسٹ کلاس کے مسافر تھے، انھوں نے احتجاج بھی کیا لیکن کسی کی سُنی نہیں گئی۔ ہم بھی مجبور تھے۔ انھیں اپنے ساتھ بٹھا نہیں سکتے تھے۔ بعض حالات میں دوستوں اور دشمنوں کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ میں خیال خوانی کے ذریعے سمجھ سکتا تھا لیکن اپنے ساتھیوں کو کس طرح سمجھاتا کہ کس طرح دوستوں اور دشمنوں کی تمیز کر رہا ہوں۔

ٹرین آ گئی۔ ہم نے ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں پہنچ کر دیکھا۔ اس کوچ میں تین کیبن ہمارے لیے مخصوص کر لیے گئے تھے۔ ایک کیبن میں چار عدد برتھ ہوتی ہیں لیکن افسران نے شاید یہ سوچا تھا کہ دو کے ساتھ دو عورتیں ہیں اور جمال احمد جسکانی کنوارا ہے لہٰذا اس کے لیے تیسرا کیبن مخصوص کیا گیا تھا۔

ہم نے درمیانہ کیبن جمال احمد جسکانی کو دیا کیونکہ بریف کیس اس کے پاس تھا۔ دشمنوں کو اس کے پاس پہنچنے کے لیے یا تو کرم داد کے کیبن کے پاس سے گزرنا پڑتا یا میرے کیبن کے پاس سے ہو کر جانا پڑتا۔

ویسے پولیس والے کچھ زیادہ ہی ذمے داری دکھا رہے تھے ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ صرف اسٹیشن تک ہماری حفاظت کریں گے

لیکن دو مسلح سپاہی ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں ڈیوٹی دینے کے لیے موجود تھے۔ کوئی ہمارے کیبن کے پاس سے گزر کر دروازے کی طرف جاتا تو اسے توجہ سے دیکھتے تھے۔ جب تک وہ واپس اپنے کیبن میں نہیں جاتا، وہ بالکل مستعد اور محتاط رہتے تھے۔

ٹرین میں سوار ہوتے ہی حور بانو ریحانہ کے کیبن میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ ریحانہ نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ "جو مشورہ میں نے دیا ہے اس پر عمل کرو یا پھر اس کی محبت کو دل سے نکال دو۔ یہ دو راہے پر کھڑے رہنا اور ہمیشہ الجھنوں میں گرفتار رہ کر خود کو عذاب میں مبتلا کرتے رہنا، بہت بڑی حماقت ہے۔ محبت کو محبت سے اپنایا جائے تو وہ عذاب نہیں رہتی۔ اس کا انحصار ہم پر ہے کہ کس طرح اپنے مرد کو ہینڈل کرتی ہیں۔"

اس کے بہت سمجھانے بجھانے پر وہ میرے کیبن کے دروازے تک آئی۔ اس نے جھجکتے ہوئے اسے کھولا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ قدم لرز رہے تھے لیکن کیبن خالی تھا۔ اسے ایک گونہ اطمینان ہوا۔ وہ برتھ پر آ کر بیٹھ گئی۔ دروازے کو بند کر دیا لیکن باہر سے کسی کے گزرنے کی آواز آتی تو یوں چونک جاتی جیسے میں آ رہا ہوں۔

میں ائیر کنڈیشنڈ کوچ کے دوسرے سرے پر تھا، وہاں سے اپنے کیبن تک تمام مسافروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ انھیں دیکھنا اور پرکھنا چاہتا تھا۔ اکثر مسافر کیبن میں جانے کے بعد باہر نہیں آئے تھے، اندر ہی آرام کر رہے تھے۔ میں نہ تو انھیں دیکھ سکتا تھا نہ پرکھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تیسرا کیبن خالی تھا۔ اگلے شہر کے مسافروں نے اسے ریزرو کرا رکھا تھا۔

میں اپنے کیبن کی طرف جانے لگا۔ کرم داد اپنے کیبن سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں گھوم رہے تھے؟"

"میں دشمنوں کو تاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"صرف ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں دیکھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ دشمن اناڑی نہیں ہیں۔ وہ فرسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس یا عوامی کلاس میں ہو سکتے ہیں۔ موقع پا کر ادھر کا رخ کریں گے۔"

میں نے جسکانی کے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ "میں باہر بول رہا ہوں۔ کرم داد بھی ہے۔ دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھول کر کہا۔ "ہماری حکومت نے بریف کیس میرے حوالے کر کے بالکل ہی پابند کر دیا ہے۔ نہ میں ادھر جا سکتا ہوں نہ اُدھر۔ لاہور تک ایک ہی کیبن میں قید رہوں گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی، پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تمھاری ہماری ذمے داری ایک ہے۔ کہیں جانا ہو تو بریف کیس ہم میں سے کسی کے حوالے کر دینا۔ ہم اسے صرف حکومت کی امانت نہیں، تمھاری بھی امانت سمجھ کر دل و جان سے اس کی حفاظت کریں گے۔"

کرم داد نے کہا۔ "بائی دی وے، ہم یہ پوچھنے آئے ہیں کہ تم دشمنوں کے متعلق کیا سوچ رہے ہو؟ وہ تمھارے خلاف کیسی پلاننگ کر سکتے ہیں؟ بھئی، تم تو دشمنوں کو گھیرنے، ان کا راستہ روکنے اور انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دینے میں ماہر ہو جیسا کہ جنگل میں تم نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔"

"کرم داد ٹھیک کہتا ہے۔ تم خود ہی اپنے دشمن بن کر سوچو کہ بریف کیس چھین کر لے جانا ہوتا تو تم جمال احمد جسکانی کے خلاف کیا اقدامات کرتے؟"

اس نے دروازے سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کہا۔ "دشمن اناڑی نہیں ہیں۔ اگر ڈاکو رانگا ملا ہوتا یا یہ وڈیرے یا زمیندار، جاگیردار ہوتے تو دیسی قسم کی چالیں چلتے، ہمارا مقابلہ دہشت گرد تنظیموں سے ہے۔ وہ ایسی چالیں چلیں گے، جن کے متعلق ایک آدمی عام سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ہم عام آدمیوں میں سے نہیں ہیں۔ ہم نے بھی ٹی ٹی سینٹر میں اچھی خاصی تربیت حاصل کی ہے۔"

جسکانی نے پوچھا۔ "کیا تم یہ سوچ سکتے ہو کہ دشمن ہمارے کیبن کو گیس چیمبر بنا سکتے ہیں؟"

ہم دونوں ہی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "گاڑی روکنے کے لیے چین موجود ہے۔ وہ چین، پائپ کے ذریعے ہر کیبن میں پہنچائی گئی ہے۔ کیا ان پائپوں کے ذریعے ہمارے کیبنوں میں گیس نہیں پہنچائی جا سکتی؟"

"اوہ گاڈ! ہم نے تو ادھر توجہ دی ہی نہیں تھی۔"

میں اور کرم داد تیزی سے کیبن میں داخل ہو کر اس چین کی طرف دیکھنے لگے جو دو مختلف سمتوں سے آنے والے پائپ کے ذریعے نکلی ہوئی تھی۔ اسے پکڑ کر کھینچتے ہی تیز رفتاری سے دوڑنے والی ٹرین رک جاتی۔ میں نے پہلے اس چین کی طرف دیکھا پھر کھڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جسکانی! میں تمھاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔ تم بڑی دور تک سوچتے ہو لیکن یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ جب بھی اس پائپ لائن کے ذریعے گیس خارج ہو تم دروازہ کھول کر باہر نکل سکتے ہو۔ اگر دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا اور پہرے داروں کو ختم کر دیا گیا تو کھڑکی کے شیشے توڑ سکتے ہو۔ باہر سے تازہ ہوا اندر آنے لگی تو گیس کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

جسکانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "دشمن یہی تو چاہیں گے کہ گیس

خارج ہوتے ہی دروازہ باہر سے بند ہو تو میں کھڑکی کے شیشے توڑ دوں۔ باہر کی تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں تک پہنچانے کے لیے میں کھڑکی کے پاس جاؤں اور چھت سے لٹکنے والے دشمن مجھے گولی مار دیں۔ پھر کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہو کر بریف کیس لے جائیں۔"

ہم گم صم سے ہو کر کبھی اس چین کو دیکھنے لگے اور کبھی اس کھڑکی کو۔ جسکانی دُور کی کوڑی لایا تھا۔ دشمن بھی اس کی طرح سوچ سکتے تھے۔ جن کے متعلق ہم بھی سوچ تو سکتے تھے مگر اس پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ یہی سوچ کر رہ جاتے کہ کون اتنی گہری اور خطرناک باتیں سوچے گا مگر ہمارے دشمنوں کے تو ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ سازشیں بے نقاب ہوتی جا رہی تھیں۔ چند شخصیتیں بھی بدنامی کے دہانے پر کھڑی تھیں۔ ان حالات میں تو ان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔

کرم داد نے کہا "جسکانی! تمھیں اس کیبن میں تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ بریف کیس لے کر ہمارے کیبن میں آجاؤ۔"

اس نے کہا "جس کیبن میں بریف کیس جائے گا گیس بھی وہاں جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے ساتھ تمھیں اور ریحانہ کو بھی مصیبت میں ڈالوں۔ بھئی اس کی ضرورت کیا ہے۔ جب یہاں سے گیس خارج ہوگی تو میں کھڑکی کا شیشہ نہیں توڑوں گا۔"

"کیا دم گھٹ کر مر جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں ایسا احمق بھی نہیں ہوں۔ بھئی دروازہ تو ضرور پیٹوں گا۔ تم لوگوں تک آوازیں پہنچیں گی۔ میں مانتا ہوں جس طرح پہرے داروں کو ختم کر کے میرے کیبن کو باہر سے بند کیا جائے گا اسی طرح تمھارے کیبن بھی بند کیے جائیں گے لیکن ایک چال ہم چل سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ دشمنوں کی توقع کے مطابق میں کھڑکی کا شیشہ نہیں توڑوں گا۔ تم دونوں اپنی اپنی کھڑکی کے شیشے توڑو گے اور وہاں سے چھت کی طرف فائرنگ کرو گے۔ مجھے فائرنگ کی آواز سنائی دے گی تب میں اپنی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر باہر کی تازہ ہوا اپنے پھیپھڑوں تک پہنچاؤں گا۔"

میں نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا "ٹی ڈی سینٹر والے اگر تمھاری ذہانت سے ڈرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ تم ایسا کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑتے جہاں سے دشمن گزر کر آسکیں۔"

کرم داد نے کہا "ہمیں ہر پہلو پر نظر رکھنی چاہیے۔ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی پرانی چال کے ذریعے کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ ایسی چالیں چلنے سے باز نہیں آئیں گے۔ یعنی ٹرین کے کسی جنگل سے گزرتے ہوئے ہماری بوگی ٹرین سے کاٹی جا سکتی ہے تاکہ ٹرین کے آگے نکل جانے کے بعد وہ بہ آسانی ہمیں چاروں طرف سے گھیر سکیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ اپنی آخری سانس تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بریف کیس ان کے ہاتھ لگ جائے گا۔"

"جہاں تک دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا تعلق ہے تو ہم اتنی دیر تک انھیں فائرنگ کے ذریعے روک سکتے ہیں جب تک کہ آگے جانے والی ٹرین اگلے اسٹیشن نہ پہنچ جائے اور وہاں سے کارروائی نہ کی جائے۔"

"جسکانی! تم بیرونی ممالک میں رہ کر اپنے ملک کی انتظامی خرابیوں کو بھول گئے ہو۔ ہمارے ہاں ریلوے اسٹیشنوں پر پولیس کا عملہ زیادہ نہیں ہوتا پھر یہ کہ اگلے چند اسٹیشن بہت ہی چھوٹے ہیں۔ وہاں سے مسلح پولیس کی جماعت بنا کر یہاں نہیں لائی جا سکتی۔ یہاں جو کرنا ہوگا اپنے بل پر کرنا ہوگا، اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانا ہوگا۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم اس بریف کیس کی خاطر اپنی جانیں قربان کر سکیں گے یا نہیں۔ بریف کیس تو ہماری جانیں جانے پر بھی محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ ہمیں مار کر دشمن اسے حاصل کرے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسے کس طرح حفاظت سے اسلام آباد تک پہنچایا جائے؟"

جسکانی کیبن کے اندر ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے رُک کر کہا "ایک ہی راستہ ہے کہ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں۔ تم سب اپنا سفر جاری رکھو۔ میں اسلام آباد پہنچنے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کروں گا۔"

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "ہم بڑی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ حور بانو اور ریحانہ اپنے اپنے کیبن میں تنہا ہیں۔ ہمیں ان کی خبر لینا چاہیے اور ایئرکنڈیشنڈ کوچ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ یہاں چند کیبن ایسے ہیں جن کے مسافروں کو ہم نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

"میں ابھی جاتا ہوں۔ تین ہی کیبن ایسے ہیں، جن کے مسافر ابھی تک ہماری نظروں میں نہیں آئے ہیں۔ میں ان سے مل بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔" کرم داد نے کہا۔

وہ کیبن سے باہر چلا گیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ پہلے ایک کیبن کے دروازے پر دستک دے گا، جو بھی مرد نکلے گا اس سے سگریٹ جلانے کے لیے ماچس طلب کرے گا۔ حالانکہ ایک بھونڈا سا طریقہ تھا مگر کیبن کے اندر بند رہنے والے مسافروں کو باہر کسی طریقے سے نکالنا ہی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ماچس یا لائٹر طلب کرنے کے ساتھ یہ بھی مسکراتے ہوئے کہے گا کہ سگریٹ سلگانے کا تو بس بہانہ ہے۔ دراصل وہ اپنے ہمسفر لوگوں کو خصوصاً پڑوس کے کیبن والوں کو دیکھنا اور ان سے ملاقات کرنا اور ان کے مزاج کو سمجھنا چاہتا ہے۔

کرم داد اپنا فرض ادا کرنے گیا تھا۔ میں نے اپنا فرض ادا کرنا شروع کیا۔ اس کے جاتے ہی جسکانی کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اسے باتھ روم میں جانے کی ضرورت محسوس کرائی۔ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا "تم بیٹھو، میں ابھی ٹوائلٹ سے آتا ہوں۔"

وہ ٹوائلٹ میں گیا۔ دروازہ بند ہوا، اس کے ساتھ ہی میں نے بریف کیس کو اوپری برتھ سے نکال کر نچلی برتھ پر رکھا۔ مجھے، جسکانی اور کرم داد کو لاک نمبر معلوم تھے۔ میں نے انھی نمبروں کے ذریعے بریف کیس کو کھول لیا۔ اس میں میری، ریحانہ، جسکانی اور کرم داد کی فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بند لفافہ بھی تھا۔ وہ لفافہ اور وہ تمام فائلیں بڑی حفاظت سے بند کرنے کے بعد ان پر مہر لگا دی گئی تھی۔ میں نے انھیں نکال کر دوبارہ اسے نمبروں کے ذریعے مقفل کر کے اوپری برتھ پر رکھ دیا۔ پھر وہ تمام چیزیں سمیٹ کر میں نے کیبن کے دروازے کو آہستگی سے کھول کر باہر دیکھا۔ کرم داد ایک کیبن کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص تھا جس سے وہ باتیں کر رہا تھا۔ کرم داد کی پشت میری طرف تھی۔ میں وہاں سے نکل کر اپنے کیبن میں آیا۔ کیبن خالی تھا۔ حور بانو باتھ روم میں تھی۔ میں نے فوراً تمام فائلیں اور وہ خط اپنی اٹیچی میں ٹھونس دیے اور واپس جسکانی کے کیبن میں آگیا۔

وہ ٹوائلٹ سے باہر آیا تو میں برتھ پر اسی طرح بیٹھا ہوا تھا جس طرح وہ مجھے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے اپنی اٹیچی کھولتے ہوئے کہا "ہم آدھے گھنٹے میں خیرپور پہنچ جائیں گے۔ میں اپنی اٹیچی تم لوگوں کے پاس چھوڑ دوں گا۔ صرف نقد روپے اپنے پاس رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ کل دوپہر تک لاہور پہنچ جاؤں گا۔ ریحانہ اور کرم داد کا پتا میرے پاس ہے۔"

میں نے کہا "ہم تمھارے لیے فکرمند رہیں گے۔ کوشش کرنا کہ دوپہر یا شام تک پہنچ جانا۔ اس بریف کیس کی ذمے داری صرف تم پر ہی نہیں، ہم سب پر بھی ہے۔"

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا، اسی وقت ٹرین کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آگیا۔ باہر چاند کی روشنی میں دُور دُور تک کھیت نظر آرہے تھے۔ جسکانی نے کہا "یہ کوئی چھوٹا اسٹیشن بھی نہیں ہے۔ گاڑی آؤٹر سگنل کے پاس رُک رہی ہے شاید۔ یہ اچھا موقع ہے، خیرپور میں اُترنے سے بہتر ہے کہ چپ چاپ اس ویرانے میں اُتر جاؤں۔ کوئی مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔"

میں نے تائید کی۔ اس نے اوپری برتھ سے بریف کیس اٹھایا اور میرے ساتھ کیبن سے نکل کر کوچ کے دروازے پر آگیا۔ اس وقت تک ٹرین رُک گئی تھی۔ ہم نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ دور آؤٹر سگنل نظر آرہا تھا۔ گاڑی کو سگنل نہیں مل رہا تھا، اس لیے وہ رُک گئی تھی۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ خدا حافظ کہا پھر ٹرین سے اُتر کر جانے لگا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کھیتوں میں پہنچ کر ایک بار مُڑ کے میری طرف دیکھا اور پھر وہ کھیتوں میں گم ہوتا چلا گیا مگر میری خیال خوانی کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔

ٹرین چل پڑی۔ میں دروازے کو بند کر کے اپنے کیبن کی طرف چل دیا۔ دوسری طرف سے کرم داد آرہا تھا۔ میں نے قریب ہو کر چپکے سے کہا "وہ بریف کیس لے کر جا چکا ہے۔ ٹرین آؤٹر سگنل کے پاس رُک گئی تھی۔ تم لوگوں سے ملنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر وہ خیرپور اسٹیشن پر اُترتا تو دشمن اسے تاڑ لیتے۔"

"کوئی بات نہیں، دعا کرو وہ بخیریت اس ویرانے سے نکل جائے۔"

"اس نے وعدہ کیا ہے کہ کل دوپہر تک تمھارے پتے پر لاہور پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اب ہمیں اسی کی فکر رہے گی۔"

اس نے اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ریحانہ لیٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "اب آرام کرو۔ اگر ان تینوں کیبن کے مسافروں کے متعلق کوئی خاص بات ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ میں جس کیبن کے مسافر سے باتیں کر رہا تھا، وہ اپنے تین فیملی ممبرز کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ دوسرے کیبن کے مسافروں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے

اب ریحانہ کو بھیجوں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ میری ضرورت ہو تو بلا لینا۔ میں اپنے کیبن میں ہوں اور ہاں جسکانی اپنی اٹیچی چھوڑ گیا ہے۔“

”وہ ہم اپنے پاس رکھ لیں گے۔“

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے کے پاس آگیا، جہاں سے تھوڑی دیر پہلے جسکانی کو رخصت کیا تھا۔ میں ابھی اپنے کیبن میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں حور بانو آرام سے ایک برتھ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ میرے متعلق سوچ رہی تھی اور اپنے متعلق الجھن میں پڑ گئی تھی۔ اگر میں وہاں جاتا تو شاید یہ مسئلہ اس کی زبان پہ آتا۔ وہ شرمیلی تھی، زبان پہ نہ لاتی تب بھی گھما پھرا کر اس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتی۔

سیدھی سی بات ہے، اگر وہ اپنے سہاگن بننے پر پچھتاتی، اسے دکھ ہوتا تو میں اپنے آپ کو ملامت کرتا۔ میرا ضمیر مجھے مطمئن نہیں رہنے دیتا لیکن وہ خود میری تمنائی رہی تھی، دل سے بھی، دماغ سے بھی اور روح کی گہرائیوں سے بھی۔ پھر میں اس کی تمناؤں سے اسے باز کیوں رکھتا؟

میں آئندہ بھی اسے یہی سمجھانا چاہتا تھا کہ آج اس کے ساتھ ہوں، کل وقت جانے کہاں بہا کر لے جائے۔ وہ میرا انتظار کرتی رہے گی اور مجھے اپنی ذمے داریوں کا احساس دلاتی رہے گی۔ میں ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا

میں جمال احمد جسکانی کے پاس پہنچ گیا۔ ہمارے خیال کے مطابق اس دوران ٹرین سے کوئی دوسرا شخص نہیں اترا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ دشمنوں کو ہماری اس پلاننگ کی خبر نہیں تھی۔ جب جمال احمد جسکانی کھیتوں میں جا کر گم ہو گیا اور ٹرین چل پڑی تو اس ٹرین کے گزرنے کے بعد اس نے دور ریلوے لائن کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں اسے چار عدد انسانی سائے نظر آئے تھے۔

ہماری خوش فہمی ختم ہو گئی۔ دشمنوں کو ہماری ایک ایک حرکت کا علم تھا۔ یہ کتنی حیرانی کی بات تھی۔ ہم نے بند کمرے میں یہ منصوبہ بنایا تھا۔ دشمن ہم سے جانے کتنی دور رہنے کے باوجود جمال احمد جسکانی کو وہ بریف کیس گاڑی سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے، گویا ان کے پاس کوئی جادوئی آئینہ تھا جس میں وہ ہماری ہر حرکت کو دیکھتے رہتے تھے یا کوئی سائنسی کمال تھا کہ اِدھر ہم نے پلاننگ کی، اُدھر اُن کو خبر ہو گئی۔

ہماری ٹرین دور نکل گئی تو ریلوے لائن کے پاس کھڑے ہوئے چاروں دشمنوں میں سے ایک نے بلند آواز سے للکارتے ہوئے کہا ”جسکانی! بریف کیس ہمارے حوالے کر دو۔ ہم جانتے ہیں، تم کھیتوں میں کہاں چھپے ہوئے ہو۔“

میں اس وقت جسکانی کے دماغ میں نہیں تھا، ٹرین میں کرم داد سے باتیں کر رہا تھا۔ اگر موجود ہوتا تو اس للکارنے والے کے دماغ میں پہنچ کر ضرور معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ آخر انہیں ہمارے متعلق کیسے اطلاعات مل رہی ہیں حتیٰ کہ وہ جسکانی کی نشاندہی کھیتوں میں کر رہے تھے۔

جس وقت میں جسکانی کے پاس پہنچا، اس وقت وہ کھڑی فصلوں کے درمیان تیزی سے بھاگتا جا رہا تھا۔ ہوا تیز تھی، فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر شور مچا رہی تھیں۔ دشمن یہ نہ جان سکے کہ جسکانی کھیت کے کس حصے میں ہے اور کدھر سے گزر رہا ہے۔

اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ریوالور تھا۔ وہ کھیتوں میں زیادہ دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ ریلوے لائن کے قریب ہی رہ کر کسی آبادی تک پہنچنا چاہتا تھا۔

اچانک اسٹین گن سے فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ کے ایک برسٹ کے بعد کسی نے چیخ کر کہا ”دیکھو جسکانی! تم چھپنا چاہتے ہو لیکن ہمیں معلوم ہو جاتا ہے، کہاں چھپے ہوئے ہو۔ اگر تم زندگی چاہتے ہو تو دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو۔ تمہارے ایک ہاتھ میں بریف کیس نظر آنا چاہیے اور دوسرا ہاتھ خالی۔ پھر سیدھے ہماری طرف چلے آؤ۔ ہم تمہیں دو منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔“

میں مہلت دینے والے کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ٹرانسمیٹر پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی سوچ نے بتایا، ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس کا رابطہ کرم کریزی سے قائم ہے۔ وہ کہیں سے اطلاع دے رہا ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں تھا۔ میں اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ وہ جہاں بھی ہے، وہاں اسے کیسے اطلاع مل رہی ہے کہ جسکانی کھیتوں میں پہنچ گیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، کرم کریزی کو یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کھیتوں میں کس حصے سے گزر رہا ہے۔ وہ ٹرانسمیٹر کے ذریعے بتا رہا تھا کہ ریلوے لائن کی سیدھ میں دو گز کی دوری پر، جہاں سے کھیت دائیں طرف شروع ہوتے ہیں، وہاں سے صرف پچیس گز کے فاصلے پر جسکانی کھیتوں کے درمیان موجود ہے اور جھکا ہوا ان فصلوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔

یہ حیرانی میں مبتلا کرنے والے لمحات تھے۔ آخر کرم کریزی کو اتنی تفصیل کیسے معلوم ہو رہی تھی؟ ایسے میں خیال ٹیلی پیتھی کی طرف جاتا ہے لیکن کرم کریزی یوگا کا ماہر تھا، ٹیلی پیتھی نہیں جانتا تھا۔ اگر جانتا تو میں اس کے روبرو آچکا ہوتا۔ وہ میرے دماغ تک پہنچنے کی ضرور کوشش کرتا، مگر ۔ ۔ ناکام رہتا لیکن میں اس کی خیال خوانی کے انداز کو سمجھ لیتا۔

پھر خیال آیا، دہشت گردوں کی تنظیم میں کوئی ایسی ہستی ہے جو شاید خیال خوانی جانتی ہو اور وہ کرم کریزی کو پوری تفصیل بتا رہی ہو۔ اس کے مطابق کرم کریزی اپنے آدمیوں کو ہدایات دیتا جا رہا ہو۔

یہ بات قابلِ قبول نہیں تھی۔ اگر کوئی ہستی خیال خوانی کر رہی تھی اور وہ جمال احمد جسکانی کے دماغ میں رہ کر اس کی ایک ایک حرکت کو سمجھ رہی تھی تو وہ جسکانی کو دماغی طور پر ٹریپ کر کے مجبور کر سکتی تھی کہ وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بریف کیس کو اپنے دشمنوں تک پہنچا دے۔

جتنی دیر میں سوچتا رہا، اتنی دیر میں جسکانی نے جوابی فائرنگ کی جس کے نتیجے میں ایک دشمن ختم ہو گیا، تین رہ گئے۔ باقی تین کے پاس ریوالور تھے۔ ان میں سے ایک نے مُردہ ساتھی کی اسٹین گن اٹھائی تھی۔ میں پرانے ہتھکنڈے استعمال کر سکتا تھا یعنی ایک دوسرے پر فائرنگ کرانے کے بعد انہیں ختم کر دیتا لیکن کرم کریزی ٹرانسمیٹر کے ذریعے ان سے باتیں کر رہا تھا — اس لیے وہ تینوں ماتحت مرتے مرتے بھی کسی طرح یہ بتا سکتے تھے کہ ایک دوسرے پر فائرنگ کرتے ہوئے ختم ہو رہے ہیں۔

اگرچہ میں کسی ٹیلی پیتھی جاننے والے کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا تاہم میری عقل مجھے سمجھاتی تھی، کوئی ایسی ہستی ہے تو اطلاع کر مجھے اقدامات کرنا چاہئیں ورنہ یہ معلوم ہو جائے گا کہ کوئی ان ماتحتوں کے دماغ میں پہنچ کر انہیں ایک دوسرے پر فائرنگ کے لیے مجبور کر رہا ہے۔

اب میں محتاط ہو کر کبھی اس ٹرانسمیٹر والے کے دماغ میں پہنچتا تھا، کبھی جسکانی کے دماغ میں رہ کر چپ چاپ معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ کوئی اس کے دماغ میں آتا بھی ہے یا میرے دماغ میں خواہ مخواہ ایسے خیالات آرہے ہیں۔

تینوں میں سے ایک شخص اسٹین گن اٹھا کر فائرنگ کرنا چاہتا تھا اسی وقت ٹھائیں کی آواز کے ساتھ وہ زمین سے کئی فٹ اوپر اچھلا پھر نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ اسٹین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جسکانی کسی کا محتاج نہیں تھا۔ اسے میری مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر نپے تلے انداز میں فائر کرتا تھا کہ ایک گولی بھی ضائع نہ ہو۔

اب تیسرے نے اسٹین گن اٹھائی۔ اس وقت ٹرانسمیٹر سے کریزی کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی ”۔۔۔ بے وقوفو! کچھ اپنی عقل سے بھی کام لو۔ وہ تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ ریلوے لائن کے قریب آرہا ہے مگر کھیتوں میں

چھپا ہوا ہے۔ تم سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر ہے۔ اپنے بائیں طرف فائر کرو۔"

اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ کرتے 'ٹھائیں ٹھائیں' کی دو آوازیں خاموش فضا میں دُور تک گونجتی چلی گئیں۔ باقی رہنے والے دو دشمن بھی باقی نہ رہ سکے۔ آخر باقی نہ رہنے اور فنا ہونے کا کوئی بہانہ تو ہوتا ہے اور یہ حضرتِ انسان اپنے فنا کے خود ہی بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔

اب جمال احمد جسکانی کھیتوں سے نکل آیا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے میں ریوالور لیے دوڑتا ہوا ان کی طرف آرہا تھا۔ ذرا دُور دُور چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ پہلے اس نے اسٹین گن اٹھا کر دیکھی۔ وہ اسے لے کر شہر کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ پولیس والے پیچھے پڑ جاتے۔ اس نے مرنے والوں کے ریوالور اُٹھا لیے۔ صرف دو ریوالور کافی تھے۔ اس نے کارتوس جمع کیے۔ پھر انھیں بریف کیس کھول کر رکھنا چاہتا تھا، میں نے اسکی اپنی سوچ میں کہا۔" بریف کیس کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ریوالور جیب میں ٹھونس لیا جائے۔ دوسرے کو قمیص کے اندر چھپا لیا جائے۔"

مگر وہ پختہ ارادے کا مالک تھا۔ ایسے لوگوں کو صرف ان کی سوچ کے ذریعے تبدیل نہیں کیا جاتا' انھیں بدلنے کے لیے کچھ ان کے دماغ پر قابض ہونا پڑتا ہے' کچھ انھیں آزادی دے کر ان کے ہاتھ پاؤں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا پڑتا ہے' بہرحال اس نے بریف کیس کو کھول لیا۔

حیرت زدہ رہ جانے کی بات تھی۔ نواب شاہ سے چلتے وقت جب ہم لوگوں نے بریف کیس کو بند کیا تھا تو اس میں ایک خط اور سربمہر فائلیں تھیں۔ یہ چیزیں کہاں غائب ہو گئیں؟ جسکانی چند لمحوں تک حیران رہا، پھر مسکرانے لگا۔ وہ سمجھ گیا، بابر یا کرم داد نے اس کی عدم موجودگی میں یہ تمام چیزیں نکال لی ہیں تاکہ دشمن دھوکا کھا جائیں۔

وہ سوچنے لگا، ہم میں سے کس نے ایسا کیا ہے؟ وہ مجھ پر ہی شبہ کر سکتا تھا کیونکہ اس کے سامنے کرم داد کیبن سے نکل کر دوسرے کیبن والوں سے ملنے چلا گیا تھا۔ اس کے باتھ روم میں جانے کے دوران صرف میں اس کے کیبن میں رہ گیا تھا۔ میں ہی ایسا کر سکتا تھا۔

اس نے خالی بریف کیس کو دیکھتے ہوئے سوچا " بابر نے مجھ سے فراڈ کیا لیکن یہ فراڈ لازمی تھا۔ اس نے مجھے نہیں، میرے ذریعے دشمنوں کو دھوکا دیا ہے۔ اس طرح سیکرٹ سروس والوں کی امانت کم از کم لاہور تک تو پہنچ ہی جائے گی۔"

اس نے تینوں ریوالور بریف کیس میں رکھے۔ تمام کارتوس بھی اس میں رکھ دیے۔ اپنا ریوالور دوبارہ پوری طرح لوڈ کرنے کے بعد جیب میں رکھ لیا۔ بریف کیس کو بند کیا پھر وہاں سے اُٹھ کر جانے لگا۔ چند قدم چلتے ہی یکبارگی حیرت سے اُچھل پڑا۔ کوئی اس کے قریب بول رہا تھا۔

اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی پھر زمین پر پڑے ہوئے ٹرانسمیٹر کو دیکھا۔ آواز آرہی تھی "ہیلو، ہیلو، جسکانی! تم زیادہ دُور نہیں ہو۔ واپس آؤ' میری بات سنو۔"

اس نے واپس آکر زمین پر ایک گھٹنے کو ٹیکتے ہوئے ٹرانسمیٹر کو اُٹھایا "لو کریزی! میں تمھاری آواز اور لہجے سے بھی پہچان سکتا ہوں۔ کیا بات ہے؟ بکو جلدی سے۔"

"میں پوچھنا چاہتا ہوں، کیا خالی بریف کیس دیکھ کر تمھیں عقل نہیں آئی؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا "تمھیں کیسے پتا چلا کہ یہ بریف کیس خالی ہے؟"

دوسری طرف سے قہقہہ سُنائی دیا۔ پھر اس نے کہا "تم احمق نکلو گے' ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں تمھاری صلاحیتوں پر، تمھاری ذہانت اور حاضر دماغی پر بڑا ناز تھا۔ کیا تم ٹی ٹی والوں کو اتنا کمزور سمجھتے ہو؟ ان کے ذرائع لامحدود ہیں۔ میں تمھیں راز کی بات بتاتا ہوں۔ فرہاد علی تیمور ہمارے ٹی ٹی کا خفیہ سربراہ ہے۔ وہ تمھاری ایک ایک حرکت کے متعلق ہمیں بتاتا رہتا ہے، تم خود ہی سوچو، ہمیں فوراً ہی یہ کیسے معلوم ہوا تھا کہ تم نے بریف کیس کھولا تو وہ خالی تھا۔"

جسکانی نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا "اگر فرہاد تمھارے ساتھ ہے اور وہ تمھیں خالی بریف کیس کے بارے میں بتا سکتا ہے تو یہ بات فرہاد نے اس وقت کیوں نہ بتائی جب میں اسے لے کر ٹرین سے اُترا تھا؟"

اس نے جواب دیا " فرہاد کا حکم تھا کہ تمھیں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ ٹرین سے اُترنے کا موقع دیا جائے تاکہ تمھیں سزا ملے اور تم اتنی رات کو پیدل چلتے ہوئے شہر تک جاؤ۔ صبح سے پہلے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ دوستوں کا ساتھ چھوڑ کر دشمنوں کا ساتھ دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ ابھی وقت ہے' ہم تمھیں معاف کر سکتے ہیں اور تمھاری ذہانت کی وجہ سے تمھیں پھر اپنا سکتے ہیں۔"

وہ ٹرانسمیٹر سے ہونے والی کریزی کی گفتگو سُن رہا تھا۔ میں نے اس کی اپنی سوچ میں ایک سوال کیا۔ اس نے سوال دُہرایا "کریزی! اگر فرہاد علی تیمور تمھارے ساتھ

ہیں ایسے غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے سے ٹکرانے کی حماقت نہیں کروں گا۔ ایک بار اپنے فرہاد سے کہو کہ وہ مجھ سے دماغی رابطہ قائم کرے۔ مجھے موجودہ روش چھوڑ کر تم لوگوں کے پاس لوٹ آنے کی ہدایت کرے۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔ صرف یہی نہیں، بابر اور کرم داد کو بھی تمھارے قدموں میں جھکا دوں گا۔"

"میں یہی چاہتا ہوں کہ تم ان باغیوں کو عبرت ناک سزا دو۔ خواہ زندہ ہم تک نہ پہنچا سکو لیکن انھیں ایسی موت مارو کہ دوسرے غدّاری سے توبہ کر لیں۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا یہی بات فرہاد علی تیمور مجھ سے کہہ سکتا ہے؟"

ایک لمحے تک خاموشی رہی۔ پھر کم کریزی نے کہا " ذرا انتظار کرو' میں ابھی جواب دیتا ہوں۔"

وہ ٹرانسمیٹر اٹھا کر وہاں سے جانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کریزی کی آواز سُنائی دی " جسکانی! میری باتوں پر اعتماد نہیں کر سکتے ہو تو کر لو۔ ابھی فرہاد صاحب سے رابطہ قائم ہوا تھا۔ ان کا حکم ہے کہ تمھیں تمھارے حال پر چھوڑ دیا جائے، جب وہ ضروری سمجھیں گے تو تم سے دماغی رابطہ قائم کر کے تمھیں ہماری طرف لے آئیں گے۔ فی الحال بھٹکتے رہو اور ٹھوکریں کھاتے رہو۔"

وہ ریلوے لائن کے ساتھ چلتے ہوئے خیرپور کی طرف جا رہا تھا۔ اب میں کیبن میں جا کر آرام سے ذرا لیٹنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے حور بانو کے دماغ میں جھانک کر دیکھا' وہ سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے؟

اس کے سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی ایک حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ اب وہ بلاتکلف اٹھ کر میری برتھ پر رکھے ہوئے اٹیچی کے پاس جائے گی اور اسے کھول کر دیکھے گی۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی۔ کسی کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ کسی کی چیزوں پر نظر نہیں رکھتی تھی۔ نہ ہی اس میں یہ تجسس ہوتا تھا کہ کسی کے اٹیچی یا بیگ میں کیا سامان رکھا ہوا ہے۔

میں تیزی سے چلتا ہوا اپنے کیبن کے دروازے تک پہنچا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری اٹیچی کے پاس پہنچتی، میں نے دروازے کو کھولا۔ وہ ایک دم سے چونک گئی۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً ہی ٹھٹک گئیں۔ وہ اٹیچی کھولنا بھول گئی۔ اب اس کے دماغ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اتنی دیر سے جس کا انتظار تھا"

وہ آ گیا تھا۔ وہ اپنے اور میرے' اَن دیکھے اور پیار بھرے رشتے کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہی تھی۔

میں نے دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا" میں سمجھ رہا تھا' تم ریحانہ کے ساتھ اس کے کیبن میں ہو گی۔"

اس نے اپنی برتھ پر بیٹھتے ہوئے کہا" میں تو چاہتی تھی' ریحانہ کے ساتھ رہوں مگر وہ بڑی وہ ہے۔"

میں نے اپنی برتھ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا" یہ 'وہ' کیا ہوتا ہے؟"

وہ شرماتے ہوئے بولی" پتا نہیں، اس کے دماغ میں کیسی باتیں گھسی رہتی ہیں۔ وہ میرے اور تمھارے متعلق کچھ سوچتی رہتی ہے۔ زبردستی مجھے یہاں بھیج دیا۔"

میں نے انجان بن کر پوچھا" ریحانہ ہمارے بارے میں کیا سوچتی ہے؟"

وہ سر جھکا کر اپنے آنچل سے کھیلنے لگی۔ میں نے کہا" میں تمھیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں' میرا خیال دل سے نکال دو۔ میں ایک اجنبی ہمسفر ہوں' جب تک ہمسفر ہوں' اپنا اپنا سا لگ رہا ہوں۔ کبھی بچھڑ گیا تو پھر جانے کب حالات ہمیں ملائیں۔ تب کیا ہوگا؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی" میں کیا بتاؤں۔ جو میں سمجھتی ہوں' اس پر کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ یہ بات میں نے ریحانہ سے کہی مگر وہ بھی یقین نہیں کر رہی ہے۔"

" آخر بات کیا ہے؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اپنی الجھن کو کس طرح بیان کرے۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا" میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی وہ کچھ یوں ہے، ایک شہزادی کو خواب میں چلنے کی عادت تھی۔ وہ اپنے محل سے نکل کر اپنے شہزادے کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ پھر صبح ہونے سے پہلے اپنے محل میں واپس آجاتی تھی۔ جب صبح آنکھ کھلتی تو پورے یقین کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود سے کہتی کہ وہ شہزادے کے پاس گئی تھی۔ شہزادے کی ہو گئی تھی اور ساری زندگی اسی کی رہے گی۔"

اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا" بابر! کیا سمجھ سکتے ہو کہ یہ بات وہ آئینے سے کیوں کہتی تھی؟"

" وہ دنیا والوں سے کہتی تو کوئی یقین نہ کرتا۔"

جب یقین کرنے کی بات ہی نہ ہو تو کوئی کیسے یقین کرے۔ وہ.... شہزادی نیند کی حالت میں اُٹھ کر محل سے باہر شہزادے کے پاس جاتی تھی تو شہزادے سے باتیں کرنے اور صبح تک وہاں رہنے کے دوران کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوتی جس

سے شہزادی کی نیند ٹوٹ جاتی اور وہ خود کو دیکھتی کہ اپنی خواب گاہ
سے باہر، اپنے محل سے باہر ایک شہزادے کے پاس موجود ہے۔"
"اس کہانی میں یہ بھی لکھا تھا کہ شہزادی نیند میں ہوتی تھی تو
صبح تک اپنے آپ سے غافل رہتی تھی۔ ایسی غفلت کا شکار
رہتی جیسے کسی نے اس پر سحر طاری کر دیا ہو۔ ایسے وقت اس کی
آنکھ کھلی رہتی تھی۔ وہ باتیں بھی کرتی تھی لیکن یہ سب کچھ خواب جیسا
ہوتا تھا۔"
"ابھی ہم کچھ اور باتیں کر رہے تھے۔ تم کسی شہزادی اور شہزادے
کی کہانی لے بیٹھی ہو۔"
"اگر میں کہوں کہ میری بھی حالت اس شہزادی کی سی ہے۔ میں
بھی نیند میں چل کر تمہارے پاس آ جاتی ہوں تو کیا یقین کرو گے؟"
میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اگر نیند
میں چل کر میرے پاس آؤ گی تو کم از کم مجھے تو معلوم ہوگا۔"
"شہزادی دن کے وقت عالم بیداری میں شہزادے سے
یہی بات کہتی تھی اور وہ بھی تمہاری ہی طرح جواب دیتا تھا۔"
"بھئی تم کہانی کو زندہ حقیقت سے کیوں ملا رہی ہو۔ وہ
شہزادہ کوئی ساحر یا کوئی عامل ہوگا۔"
"ہاں، کہانی کے اختتام پر شہزادی کو پتا چلا کہ وہ بہت
بڑا جادوگر تھا۔"
میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں بھی کوئی جادوگر ہوں؟
اب سمجھ میں آیا، جب میں کیبن میں داخل ہو رہا تھا تو تم میری
اٹیچی کی طرف جھک رہی تھیں۔ شاید کوئی چیز تلاش کرنے جا رہی تھیں۔"
اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر انکار میں سر ہلا کر کہا۔
"نہیں، ہی بیٹھے بیٹھے دل میں یہ بات آئی تھی کہ ذرا اٹھ کر
تمہاری اٹیچی کھولوں اور دیکھوں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کیا
دیکھنا چاہتی تھی۔ دراصل میں بری طرح الجھی ہوئی ہوں۔ بے مسئلے
کا حل تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ شاید اسی لیے تمہار ی کھول کر
دیکھنا چاہتی تھی۔"
"اگر اسے کھولنے اور دیکھنے سے مسئلہ حل ہو سکتا
ہے تو یہ تمہارے سامنے ہے۔ آؤ، دیکھ لو۔"
"میں کیا دیکھوں۔ جب تم سر سے پاؤں تک میرے
سامنے ہو۔ میں تمہارے دل میں جھانک نہیں سکتی اور اپنے
دل کی بات بتا نہیں سکتی۔ میری بے بسی کو شاید تم سمجھ سکو اور اگر
نہ سمجھ سکو تو یہ میری بدنصیبی ہے۔"
بدنصیبی، خوش نصیبی میں صرف اس طرح بدل سکتی ہے ز
تم میرا خیال دماغ سے نکال دو ورنہ اسی طرح الجھنوں میں رہو گی۔

مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔"
"دوسری لڑکیاں بھی اپنے آئیڈیل کے متعلق نہ جانے
سوچتی ہیں لیکن ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا جو میرے ساتھ
رہا ہے۔"
"تمہارے ساتھ جو ہو رہا ہے، اسے تسلیم کر لو اور ا
آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو یا پھر پختہ ارادہ کر لو
جلد ہی کسی جیون ساتھی کا انتخاب کر لو گی اور اس کے ساتھ کہ
دور جا کر گھریلو زندگی گزارو گی۔"
وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ گہری آنکھوں سے مجھے دیکھ ر
تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں ڈوبنے سے بچنے کی کوش
کر رہا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "میں کسی اور کو جیون
کبھی نہ بنا سکوں گی۔"
"تمہاری مرضی ہے۔ میں اپنے متعلق صاف صاف
چکا ہوں، اسی لیے تم سے فاصلہ رکھا ہے اور جب تک جاگتا
گا، یہ فاصلہ قائم رکھوں گا۔"
اس نے چونک کر پوچھا۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہما
درمیان یہ فاصلہ تمہارے جاگنے تک ہے۔"
"تمہارے کہنے کے مطابق یہ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں
میں چلنے کی بیماری ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے بھی ایسی کوئی
ہو جس کا علم مجھے نہیں ہے۔ تم مجھے دیکھنا، یہ کہنا چاہتا
تو آج رات جاگتی رہو۔ میں تو سو رہا ہوں۔ نیند میں چل کر
طرف آؤں گا تو مجھے دھکا مار کر گرا دینا تاکہ میری آنکھ کھل جا
میں جوتوں سمیت برتھ پر دراز ہو گیا۔ اٹیچی اپنے
تکیہ بنا کر رکھ لی۔ پھر آنکھیں بند کرنے سے پہلے کہا۔ "میں
جا رہا ہوں۔ نیند کے دوران دروازے پر دستک ہو
جگائے بغیر کبھی نہ کھولنا ـــــ خواہ کرم داد
ریحانہ ہی کیوں نہ ہوں۔"
میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے وقت جبکہ جمال
جسکانی بھٹک رہا تھا اور کم کریزی جیسا دشمن یہ دعویٰ کر
کہ فرہاد علی تیمور ان کا خفیہ سربراہ ہے تو میں کیسے سو سکتا
دماغ میں یہ سوال گونج رہا تھا کہ اسے ایسی باتیں کیسے
جاتی تھیں جو صرف ٹیلی پیتھی کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہیں
ہماری دنیا میں ایسا کوئی سائنسی آلہ ایجاد ہو گیا ہے جسے
کے ساتھ منسلک کر دیا جائے تو ٹرانسمیٹر کے آس پا
ہزاروں دور بیٹھے ہوئے کم کریزی جیسے لوگوں کو نظر آتا رہے؟
اس کی حرکتیں بھی دکھائی دیتی رہیں؟ کریزی جانتے
اس نے خالی بریف کیس کو دیکھ لیا تھا۔

یہ محض قیاس آرائی ہے۔ ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔
اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام دہشت گرد تنظیمیں اپنی تخریب کاریوں
کے الزامات مجھ پر ڈالنا چاہتی ہیں۔ ہر جرم کی تان فرہاد علی تیمور
کی ٹیلی پیتھی پر توڑتی ہیں۔ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے،
وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہو رہا ہے۔ اس میں اب کچھ حقیقت نظر
آنے لگی تھی۔ اس حقیقت میں اگرچہ میری اور رسونتی کی ٹیلی پیتھی
کا ہاتھ نہیں تھا لیکن کچھ تو تھا جس کا علم نہ تو مجھے تھا نہ رسونتی کو۔
اب مجھے اسی انداز میں سوچنا تھا اور فرض کر لینا تھا کہ
ہمارے علاوہ بھی ایک تیسری ہستی ہے جو میرے دماغ کو چھیڑنا
نہیں چاہتی۔ وہ میرے ساتھیوں کو آلۂ کار بنا رہی تھی۔ میرے
کیبن میں آنے سے پہلے حور بانو میری اٹیچی کی طرف بڑھ رہی
تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ میری اٹیچی کھول کر
دیکھے۔ وہ خود اس بات کی وضاحت نہیں کر سکی تھی کہ اٹیچی کیوں
کھولنا چاہتی تھی لیکن میں اس کے دماغ سے معلوم کر چکا تھا۔ وہ یونہی
الجھنوں میں گرفتار ہو کر ایسا کرنا چاہتی تھی۔
میں رسونتی کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں شام کے سات
بجے تھے۔ پارس اپنے ننھے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس
آ رہا تھا۔ اور وہ ممتا بھری بانہیں پھیلا کر اسے اتنی محبت سے
دیکھ رہی تھی جیسے اس کی طرف کھنچی جا رہی ہو۔ میں نے اسے
مخاطب کیا تو اس نے فوراً ہی پارس کو اٹھا کر اپنے سینے
سے لگا لیا۔ پھر اس کے کان میں کہا۔ "دیکھو تمہارے پاپا
آئے ہیں۔"
پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو یہ
مجھے ماما کہتا ہے۔ ابھی اچھی طرح بول نہیں سکتا لیکن معصوم
ہونٹوں کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہی بھلی لگتی ہے۔
میں اس سے خود کو ماما ہی کہلواؤں گی۔ تمہیں پسند ہے؟"
"مجھے وہ سب کچھ پسند ہے جو تمہیں اور ہمارے بیٹے کو
پسند ہو۔"
میں بتا چکا ہوں کہ وقتاً فوقتاً رسونتی، سونیا، اعلیٰ بی بی
اور ثباتہ سے رابطہ قائم کرتا رہتا تھا۔ صرف رسونتی اور سونیا
کو معلوم تھا کہ میں پاکستان میں ہوں۔ کوئی میرے متعلق ان سے
پوچھتا تو وہ لاعلمی ظاہر کرتی تھیں۔ رسونتی کہہ دیتی تھی "جب
بھی میں ان کے دماغ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں، وہ سانس
روک لیتے ہیں۔ صرف کام کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد
مجھے موقع نہیں دیتے کہ ان کے ماحول کو یا ان کے آس پاس
رہنے والوں کو سمجھ سکوں۔"
میں نے رسونتی سے کہا۔ "تم جانتی ہو، یہاں میں کن حالات
سے دوچار ہوں، کن لوگوں کے ساتھ کہاں جا رہا ہوں۔ اس
دوران پیش آنے والے حالات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا
ہے کہ ہمارے علاوہ کوئی اور شخص بھی ٹیلی پیتھی جانتا ہے۔"
"یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ
ہمارے کسی ساتھی سونیا، ثباتہ، پوجا اور دانشور دکی میں سے کسی کے
بھی دماغ میں پہنچ کر ہمارے متعلق تمام معلومات حاصل کر سکتا ہے۔
آخر وہ کون ہے؟"
"یہی تو معلوم نہیں ہو رہا ہے۔ یوں بھی میں یقین سے نہیں
کہہ سکتا۔ صرف شبہ ہے کہ کوئی ہستی خیال خوانی کر رہی ہے۔"
"میں سمجھ گئی۔ مجھے تمہارے آس پاس رہنے والوں کے
دماغوں میں پہنچ کر اس کا سراغ لگانا ہے۔ تصدیق کرنی ہے، آیا
ایسی کوئی تیسری ہستی ہے بھی یا نہیں؟"
"میں یہی چاہتا ہوں۔ ویسے میں نے اپنے ساتھیوں کے
دماغوں کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا ہے۔ وہاں کسی کا سراغ نہیں مل
سکا۔ ہو سکتا ہے وہ بہت محتاط ہو۔"
"وہ محتاط کیوں ہے؟ کیا اسے شبہ ہے کہ تم
فرہاد ہو؟"
"شبہ تو نہیں ہے لیکن اس کا خیال ہوگا کہ کسی وقت
کسی کے دماغ میں بھی اس کا ہم سے ٹکراؤ ہو سکتا ہے لہٰذا
وہ شروع ہی سے محتاط ہے۔"
"کیا میں اس سلسلے میں سونیا سے مشورہ لوں؟"
"تم اسے یہاں کے حالات بتاؤ، میں تھوڑی دیر میں دوبارہ
رابطہ قائم کروں گا۔"
میں رسونتی کے پاس سے آ گیا۔ اس وقت حور بانو پوچھ رہی
تھی۔ "کیا ایک کمرے میں یا ایک کیبن میں دو افراد ہوں، ان میں سے
ایک آنکھیں بند کر کے سو جائے تو واقعی اسے نیند آ جاتی ہے۔
تم سمجھتے ہو کہ اس طرح مجھ سے کتراتے رہنے سے میں مایوس
ہو کر تمہارا خیال دل سے نکال دوں گی؟"
میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا
دل سے محبت نکال دینے سے نکل جاتی ہے؟ کیا یہ اتنی ہی
آسان سی چیز ہے کہ جب چاہو دل میں آ جائے اور جب چاہو دل
سے نکل جائے؟"
"حور بانو! ابھی تم نے عمل کے میدان میں قدم رکھا ہے۔
یہاں ایسے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے جب دل نہیں مانتا اور
دل کو منوانا پڑتا ہے۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو، ہو سکتا ہے کہ
کامیابی ہو۔ ہم جسمانی طور پر بہت دور نہیں ہیں مگر ذہنی طور پر
اس طرح دور رہ سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کو پسند کرتے رہیں گے، عزت کرتے

نیں گے لیکن محبت میں ازدواجی رشتوں کا معاملہ آئے گا تو ہمیں ایک دوسرے سے کترا کر نکل جانا چاہیے۔ اگر تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکو تو اچھی بات ہے۔ اگر ناکامی ہو تو تم میرے ساتھ اپنی مرضی سے جیسی بھی زندگی گزار لو لیکن حالات نے ہمیں جدا کر دیا اور میں لوٹ کر نہ آسکا تو مجھے الزام نہ دینا۔"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ میں نے کہا "ابھی سوچنے سمجھنے کے لیے کافی وقت ہے۔ ہم اسلام آباد تک ضرور ساتھ رہیں گے۔ اس کے بعد بھی ساتھ رہ سکتے ہیں جب کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ جب تم اچھی گھریلو زندگی کی ابتدا کرو گی تو میں تم سے دور چلا جاؤں گا۔"

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ میری زندگی میں سونیا، ردمانہ، شبانہ، اعلیٰ بی بی اور مرجانہ جیسی فولادی عورتیں رہی ہیں جو مر جاتی ہیں مگر رونا نہیں جانتیں۔ مجھے رونے والی عورتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ جو دو ٹوک فیصلہ نہ کر سکتی ہوں، جو حالات کا مقابلہ نہ کر سکتی ہوں اور اتنی قوتِ ارادی نہ رکھتی ہوں کہ اپنی مرضی کے مطابق دوسرا راستہ اختیار نہ کر سکیں تو میں ایسی عورتوں کو گلے کا ہار بنا کر نہیں رکھتا ہوں۔ میں ہار دیکھنے اور سونگھنے والوں میں سے ہوں پہننے والوں میں نہیں ہوں۔

میں نے کہا "اب واقعی سونے جا رہا ہوں۔ پلیز، مجھے آواز نہ دینا۔"

میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر دوسری طرف کروٹ لی۔ میں چاہتا تھا، میرے اس رویے سے وہ دل برداشتہ ہو جائے۔ جیسے میری عزت کرتی ہے، مجھے چاہتی ہے، اسی طرح چاہتی رہے۔ میں بھی اس کی عزت کرتا رہوں۔ وہ سنبھل جائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔ اگر سنبھلنا نہ چاہے تو اپنے بھلے برے کی خود ذمے دار ہوگی۔

اور وہ خود ذمے دار تھی۔ میں نے تنویمی عمل کے دوران اس سے اچھی طرح معلوم کر لیا تھا۔ معمول یا معمولہ بننے والے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ جو بات دل اور دماغ کی گہرائیوں میں ہوتی ہے وہ سچ سچ اگل دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہی مناسب تھا کہ اسے اس کے حصے کی محبت ملتی رہتی اور میں اپنے حصے کی دوری قائم رکھتا چلا جاتا۔

میں آنکھیں بند کر کے سونیا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ رسونتی سے باتیں کر رہی تھی۔ اور میرا انتظار بھی کر رہی تھی۔ جب میں نے مخاطب کیا تو اس نے کہا "میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ تم اتنے اطمینان سے اس ٹرین میں سفر کیوں کر رہے ہو؟ کیا اس خوبصورت بلا کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا؟"

"سونیا تمھاری یہی عادت اچھی نہیں لگتی۔ رابطہ قائم ہوتے ہی لڑائی شروع کر دیتی ہو۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ بلا کتنی خوبصورت ہے اور تم اس کے لیے کتنے نیک جذبات رکھتے ہو۔ جب یہ شبہ یقین کی حد تک ہے کہ تیسری ہستی خیال خوانی کر رہی ہوگی تو تمھیں اس کیبن میں نہیں رہنا چاہیے۔"

"میں تمھاری بات سمجھ رہا ہوں مگر اور ذرا وضاحت سے کہو۔"

"میں بھی تمھاری طرح کسی تیسری خیال خوانی کرنے والی ہستی کو فرض کر رہی ہوں۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس ہستی نے جسکانی کے ذریعے خالی بریف کیس کو دیکھا۔ اس نے ریحانہ اور کرم داد کے دماغ میں جھانک کر یہ معلوم کر لیا ہوگا کہ وہ خط اور فائلیں اُن کی اٹیچی میں موجود ہیں یا نہیں۔ ان کے دماغ نے لاعلمی ظاہر کی ہوگی۔ پھر وہ حور بانو کے پاس پہنچی ہوگی۔ جب ان تینوں کے پاس نہیں ہے تو چوتھے تم ہو۔ یقیناً تمھارے پاس وہ چیزیں ہونی چاہئیں۔ میں پیشینگوئی کرتی ہوں، اگلے کسی اسٹیشن پر گاڑی رُکے گی تو کیبن میں کہیں سے تم پر زبردست حملہ ہوگا۔"

"اور اگر ہم فرض نہ کریں کہ کوئی خیال خوانی کرنے والی ہستی ہے تو؟"

"تو بھی میری پیشینگوئی قائم رہے گی۔ یہ کم کریزی بہت گہرا آدمی ہے۔ ٹیلی پیتھی نہ سہی کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کے متعلق ایک ایک لمحے کی خبر انھیں ملتی رہتی ہے۔"

رسونتی نے کہا "اگر کوئی خیال خوانی کرنے والی ہستی ہوتی تو کریزی اس کا سہارا ضرور لیتا اور اس ہستی کو جسکانی کے دماغ میں پہنچنے کے لیے ضرور کہتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے اس نے تمھارے نام کا سہارا لیا ہے۔"

سونیا نے کہا "رسونتی کا یہ پوائنٹ بہت مضبوط ہے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کم کریزی نے جسکانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے یعنی وہ اب اس کے پیچھے لگے گا جس کے پاس وہ خط اور فائلیں موجود ہیں۔ خواہ تمھارے پاس ہوں، کرم داد کے پاس ہوں یا ریحانہ اور حور بانو کے پاس۔ تم چاروں اس ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں موجود ہو۔ تم سب پر حملے ہو سکتے ہیں لیکن زیادہ شبہ تم پر ہوگا۔"

"اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

"میں دشمنوں کو اپنے پیچھے دوڑنے پر مجبور کر دیتی۔ انھیں اور زیادہ تگنی کا ناچ نچاتی۔ فائلیں کھول کر ان کے ضروری کاغذات اپنے پاس رکھ لیتی۔ اور ایسے کاغذات چھوڑ دیتی جو میرے پاس رکھے ہوئے کاغذات کے بغیر نامکمل ہوتے۔ اسی طرح میں وہ لفافہ کھول کر خط نکال لیتی اور لفافے اور فائلوں کو دوبارہ اسی طرح سیلڈ کر کے اٹیچی میں چھوڑ کر ٹرین سے اتر جاتی۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ لفافے اور فائلوں میں ضروری کاغذات نہیں ہیں تو؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا "کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شروع سے یہ فراڈ ہوتا چلا آرہا ہے؟"

"ہاں، میں نے اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس بات کو صرف سعید احمد جانتے ہیں۔ اصل کاغذات اولڈ مین لے جا چکا ہے۔"

"تو پھر وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ تم لوگوں کا مقصد یہی ہے نا کہ ان نائلوں کے بہانے دہشت گرد تنظیموں کے افراد تم سے ٹکراتے رہیں تو چلو انھیں ٹکرانے کی دعوت دو۔ وہاں سے نکل بھاگو۔"

رسونتی نے کہا "سعید احمد صاحب کو جب یہ معلوم ہے کہ تم سب اس ٹرین میں سفر کر رہے ہو تو انھوں نے کچھ حفاظتی انتظامات بھی کیے ہوں گے۔"

"جب سے میں ٹرین میں سوار ہوا ہوں، مجھے سعید احمد صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ ورنہ یہ معلوم کر لیتا۔"

سونیا نے جل کر کہا "ہاں، وہ بے چاری فرصت نہیں دے رہی ہوگی اور تم بے چارے کو فرصت نہیں مل رہی ہوگی۔ بہتر ہے، تم تمام دہشت گرد تنظیموں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہہ دو تمھیں ایک مہینے کی چھٹی چاہیے۔ تم چاند پر شہد لگانے جا رہے ہو۔ کوئی دشمن چاند کے اس ٹکڑے کو گولی نہ مارے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "تمھارے اس جلنے کڑھنے میں بڑی اپنائیت ہے۔ میں ابھی سعید احمد صاحب کے پاس جا کر معلومات حاصل کرتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً کیبن سے نکلو۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹرین کسی اسٹیشن تک پہنچے، تم زنجیر کھینچ کر اتر جاؤ۔"

"چلو یہی کر رہا ہوں۔ تم خوش ہو جاؤ۔"

رسونتی نے خوش ہو کر کہا "فرہاد! تمھیں سونیا ہی سیدھا رکھ سکتی ہے۔"

میں نے کیبن سے نکلتے ہوئے کہا "تم عورتیں بڑی خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہو۔ میں تو اس لیے سونیا کی بات مان رہا ہوں کہ اچانک ہی گاڑی کسی جگہ رک گئی ہے۔ زنجیر کھینچنے کی ضرورت نہیں ہے اس وقت۔"

میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ گاڑی کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تھی۔ میں نے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ کر سونیا سے کہا "میں تمھارے کہنے کے مطابق کیبن سے نکل آیا ہوں لیکن حور بانو سے زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ میرا وعدہ ہے، جب تک اس کا کوئی ٹھکانا نہ ہو جائے، اس کی حفاظت کرتا رہوں گا۔"

"اللہ نے چاہا تو وہ تمھارے پاس ہی ٹھکانا بنائے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں ڈائننگ کار میں چائے پینے جا رہا ہوں۔ رسونتی، حور بانو کے دماغ میں موجود رہے گی۔ میں بھی خیال خوانی کرتا رہوں گا۔ جو حالات پیش آئیں گے ہم ان کے متعلق تمھیں بتاتے رہیں گے۔"

میں ٹرین کے آگے اور پیچھے دور تک دیکھتا ہوا ڈائننگ کار میں چلا گیا۔ وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد خیال خوانی کے ذریعے سعید احمد صاحب کو مخاطب کیا۔ انھوں نے پھر میری بے پروائی کی شکایت کی۔ میں نے کہا "میں بہت مجبور تھا۔ بہرحال تازہ رپورٹ سن لیجیے۔ جمال احمد جسکانی خیرپور سے بہت پہلے ہی خالی بریف کیس کے ساتھ ٹرین سے اُتر گیا تھا۔ دشمن بہت مستعد اور بڑے باخبر ہیں۔ وہ جسکانی کے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس نے تعاقب کرنے والے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انھیں ہماری ہر حرکت کا علم ہو جاتا ہے جیسے ان میں بھی کوئی خیال خوانی کر رہا ہو۔ بہرحال میں ایئر کنڈیشنڈ کوچ سے نکل آیا ہوں۔ کچھ وقت ڈائننگ کار میں گزاروں گا۔ اس دوران رسونتی، حور بانو، ریحانہ اور کرم داد کی نگرانی کرتی رہے گی۔ آپ بتائیں ہمارے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"تمھارے سلسلے میں کرنا ہی کیا ہے۔ تم سب نادان اور ڈرپوک بچے تو نہیں ہو کہ دشمنوں سے بچانے کے لیے فوراً ہیلی کاپٹر بھیج دوں اور اسلام آباد بلا لوں۔ تم لوگوں کو استعمال کرنے کا مقصد یہی ہے کہ دشمن ہماری نظروں میں آتے رہیں اور وہ آرہے ہیں۔"

"کیا انھیں گرفتار کیا جا رہا ہے؟"

"انھیں صرف دیکھا اور سمجھا جارہا ہے۔ ان کے راستے روکے جارہے ہیں۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ خیر پور سے پہلے جسکانی ٹرین سے اتر گیا تھا۔ جب اس کے بریف کیس کے خالی ہونے کا علم دشمنوں کو ہوا تو یقیناً خیر پور سے ہی تم پر حملے شروع ہو جاتے لیکن خیر پور اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں جو غیر ملکی نظر آئے تھے، ان سے ہمارے خفیہ آدمیوں نے پوچھ گچھ کی تھی۔ ان کے پاسپورٹ دیکھے تھے اور انھیں وارننگ دی تھی کہ ان کے ویزے میں جن شہروں کا اندراج ہے، وہ ان کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں نہ جائیں۔ خیر پور میں ان کی موجودگی غیر قانونی تھی اس لیے انھیں حکم دیا گیا کہ اسلام آباد پہنچتے ہی وہ اپنے سفارت خانے میں رپورٹ کریں۔ اس سے پہلے ہم ان کے خلاف رپورٹ پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح انھیں بھی احساس ہو گیا ہے کہ وہ انٹیلی جنس کی نظروں میں آچکے ہیں لہٰذا اب انھیں کسی غیر قانونی کارروائی میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا "شاید اسی لیے خیر پور میں ہم پر کسی نے حملہ نہیں کیا۔"

"اب تمھاری ٹرین روہڑی پہنچنے والی ہے۔ روہڑی اور رحیم یار خاں کے ویٹنگ روم میں بھی ایسے ہی غیر ملکی پائے گئے تھے۔ ان سب کا ایک جیسا بیان ہے۔ وہ اپنی ذاتی گاڑیوں میں کراچی سے لاہور اور لاہور سے اسلام آباد کی طرف سفر کر رہے تھے لیکن ان کی گاڑی خراب ہو گئی یا ان میں سے کسی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ لہٰذا اب وہ ٹرین کے ذریعے سفر کرنا چاہتے ہیں۔ روہڑی اور رحیم یار خاں سے انھوں نے اپنے لیے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں سیٹیں ریزرو کرائی تھیں۔ ہمارے آدمیوں نے ان کا ریزرویشن کینسل کرا دیا۔ تمھاری ٹرین کے گزرنے کے بعد ان کے لیے ریزرویشن کی سہولتیں فراہم کر دی جائیں گی۔ انھیں بھی وارننگ دی گئی ہے کہ وہ صرف ان شہروں تک محدود رہیں جہاں کا اجازت نامہ ان کے پاس ہے۔ وہ ہمیشہ پاکستانی انٹیلی جنس والوں کی نظروں میں رہا کریں گے۔ میرا خیال ہے ان کے لیے اتنی ہی دھمکی کافی ہے۔ وہ پاکستان کی سیر کر کے چپ چاپ واپس چلے جائیں گے۔ تم لوگوں سے ٹکرانے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

میں نے پوچھا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری ٹرین جیسے جیسے آگے بڑھتی جائے گی، آپ کے آدمی ہمارے لیے راستہ صاف کرتے جائیں گے اور مشکوک افراد کی فہرست تیار کرتے رہیں گے۔"

"غیر ملکی تو آسانی سے نظروں میں آجاتے ہیں لیکن ان تنظیموں میں ہمارے ملک کے لوگ بھی ہیں۔ ان میں پتا نہیں کتنے خطرناک قسم کے مجرم اس ٹرین میں سفر کر رہے ہیں، ان سے تم لوگوں کو ہوشیار رہنا ہے۔ یہ اس وقت ہماری نظروں میں آئیں گے جب تم سے ٹکرانے کی حماقت کریں گے۔"

اسی وقت رسونتی نے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے حور بانو کے دماغ میں پھر یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ تمھاری اٹیچی کھول کر دیکھے۔ وہ اس خیال سے باز آنے کی کوشش کرتی تھی مگر وہ خیال بار بار سر ابھارتا تھا۔ یقیناً اس کے دماغ میں اسی طرح کے مثبت اور منفی خیالات پیدا ہو رہے ہیں جیسے ہم اپنے معمول کے دماغ میں پیدا کرتے رہتے ہیں۔"

"تمھیں ایسی حالت میں حور بانو کو چھوڑ کر میرے پاس نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"میں نے سونیا سے مشورہ کیا تھا۔ اس نے کہا، حور بانو کو اٹیچی تک پہنچنے اور اسے کھول کر فائلوں کو دیکھ لینے دو تاکہ یہ بات دشمنوں تک پہنچے۔ اس طرح ہم اس بات کی تصدیق کر لیں گے کہ تیسری ہستی خیال خوانی کر رہی ہے یا نہیں۔"

"کیا حور بانو نے ان فائلوں اور لفافے کو دیکھ لیا ہے؟"

"وہ دیکھ چکی ہے اور اس سلسلے میں پریشان ہے کہ لفافے اور فائلیں تو بریف کیس میں رکھی ہوئی تھیں پھر بابر کی اٹیچی میں کیسے پہنچ گئی ہیں۔ تم نے اسے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ جسکانی ٹرین سے جا چکا ہے۔ اسے اس بات پر حیرانی ہے کہ اتنی اہم فائلیں تم نے یونہی اٹیچی میں کیوں چھوڑ دی ہیں اور ان کی نگرانی کے لیے اس بے چاری کو کیبن میں تنہا کیوں چھوڑ دیا ہے، بہر حال اس وقت وہ ریحانہ اور کرم داد کے کیبن میں ہے اور انھیں لفافے اور فائلوں کے متعلق بتا رہی ہے۔"

"تم ان کے پاس موجود رہو۔ میں ابھی سعید صاحب سے بات کر کے آتا ہوں۔"

"یہ سونیا تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

میں سونیا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا "تمھارا اس کیبن سے نکل آنے کا کوئی مقصد تو ہونا چاہیے۔ جب دشمن اس لفافے اور فائلوں کو کھول کر دیکھیں گے اور ان کی متوقع چیزیں انھیں نہیں ملیں گی تو یہی رائے قائم کریں گے کہ اصل کاغذات تم جیب میں ٹھونس کر چلے گئے لیکن کہاں گئے ہو؟ کیا اسی ٹرین کی ڈائننگ کار میں یا کسی دوسرے کمپارٹمنٹ میں؟ نہیں فرہاد، یہ چال نہایت نامناسب ہو گی۔ تمھیں اس ٹرین کو چھوڑ دینا چاہیے۔ دشمنوں کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ تمھارا تعاقب کریں۔"

"میں تمھاری بات سمجھ رہا ہوں۔ اگر دشمنوں کو اٹیچی کیس سے برآمد ہونے والے لفافے اور فائلوں میں کچھ نہیں ملے گا تو وہ مجھے گھیرنا چاہیں گے۔ میں انھیں بہ آسانی ٹرین میں مل جاؤں گا اور میری جیبیں خالی نظر آئیں گی تو معاملہ وہیں ختم ہو جائے گا۔ جبکہ ہمیں ان تخریب کاروں کو اپنے ساتھ دوڑاتے ہوئے اسلام آباد لے جانا ہے۔"

"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو، جہاں تک حور بانو کا تعلق ہے، اسے رسونتی پر چھوڑ دو۔ وہ اس کی حفاظت کر لے گی۔ میں اسے مشورہ دیتی رہوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ میں ٹرین کو چھوڑ رہا ہوں۔"

میں نے سعید احمد صاحب سے کہا "روہڑی اسٹیشن آرہا ہے، میں ٹرین کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں چھارہ ڈال کر جا رہا ہوں اس کے نتیجے میں ٹی ٹی سینٹر کا کوئی آلۂ کار ضرور میری اٹیچی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔"

ٹرین پٹریاں بدل رہی تھی۔ اسٹیشن آرہا تھا۔ میں نے جائے کا آخری گھونٹ لیا۔ اور پیسے دے کر دروازے پر پہنچ گیا۔ میں نے سعید احمد سے پوچھا "میں یہاں سے سکھر تک جانے کی کوشش کروں گا۔ کیا وہاں میرے لیے کوئی گاڑی فراہم کی جاسکتی ہے؟"

"تم سکھر پہنچو، سب انتظامات ہو جائیں گے۔ بائی دی وے، یہ میرے معاملات نہیں ہیں لیکن میں تمھاری خاطر دلچسپی لے رہا ہوں۔ سیکرٹ سروس کا چیف کہہ رہا تھا کہ مجھے تمھارا رابطہ اس سے کرا کے خود آرام کرنا چاہیے۔"

"آپ آرام فرمائیں۔ میں سیکرٹ سروس کے چیف سے رابطہ قائم رکھوں گا۔"

"سیکرٹ سروس کے چیف کی ایک اور خواہش ہے۔ کیا تم پوری کرو گے؟"

"اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور پوری کروں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

"بھئی! کچھ عرصے پہلے سونیا بھابی ہماری سیکرٹ سروس کی اعزازی عہدے دار رہ چکی ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی مرضی سے استعفیٰ دیا اور چلی گئیں۔ آج بھی ان کے لیے یہ اعزازی عہدہ مخصوص ہے۔ ایسے وقت جبکہ تخریب کار ہمارے ملک میں اڈے بنا رہے ہیں، کیا سونیا بھابی کا فرض نہیں ہے کہ وہ تمھاری طرح یہاں آکر تخریب کاروں کے قدم اکھاڑنے میں ہمارا ساتھ دیں۔ تم یہاں موجود ہو لیکن دوسرے روپ میں ہو۔ یہاں فرہاد کے نام کی دہشت نہیں ہے۔ جب سونیا کے نام کی دہشت ہو گی تو کتنے ہی دہشت گردوں کے خون خشک ہو جائیں گے۔"

"سعید صاحب! دشمن یہی چاہتے ہیں کہ مجھے بے نقاب کر دیں۔ اور سونیا، رسونتی اور مرجانہ کو دارئی تاف سے نکلنے پر کسی نہ کسی طرح مجبور کریں۔ اب یہی بات آپ فرما رہے ہیں۔ سونیا کو وہاں سے یہاں بلا کر، گویا دشمنوں کی دلی مراد پوری کرنا چاہتے ہیں۔ خیر میں سیکرٹ سروس کے چیف کی خواہش پر سونیا کو یہاں آنے کو کہہ دوں گا، اگر وہ آنا چاہے گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

روہڑی اسٹیشن آگیا۔ خاصی رات ہو چکی تھی۔ پھر بھی مسافروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس بھیڑ میں کسی تعاقب کرنے والے کو پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ میں جیسے ہی گیٹ پر پہنچا، ٹکٹ کلکٹر نے ٹکٹ طلب کیا۔ تب مجھے خیال آیا، میں تو سارا سامان ہی چھوڑ آیا ہوں۔ ٹکٹ بھی سامان میں ہے۔ اسی وقت میرے پیچھے سے آواز سنائی دی "ان کے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ مسٹر بابر! ہمارے ساتھ آئیے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ دو قد آور جوان تھے۔ کسی اجنبی کو چہرے سے پہچانا جاتا ہے۔ میں دماغ سے پہچاننے کے لیے ان کی کھوپڑی میں پہنچ گیا۔ پتا چلا، وہ انٹیلی جنس کے آدمی ہیں۔ انھیں ابھی ابھی اطلاع ملی تھی کہ بابر روہڑی اسٹیشن پر اتر رہا ہے۔ اسے فوراً پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں پہنچا دیا جائے تاکہ سیکرٹ سروس کے چیف سے گفتگو ہو سکے۔

تھوڑی دیر بعد میں اس کمرے میں موجود تھا۔ وہاں انٹیلی جنس کے جو لوگ تھے، وہ باہر چلے گئے، صرف سادہ لباس میں ایک نوجوان رہ گیا۔ اس نے دروازے کو بند کرنے کے بعد ایک ٹرانسمیٹر کو آپریٹ کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی سیکرٹ سروس کے چیف سے کوڈ ورڈز کا تبادلہ ہوا۔ اس کے بعد مجھے مخاطب کیا گیا۔ میں نے ٹرانسمیٹر کے سامنے آکر کہا "ہیلو چیف! مجھے توقع نہیں تھی، آپ اتنی جلدی مجھ تک پہنچ جائیں گے۔"

"اس نے کہا "میں اسلام آباد میں بیٹھے بیٹھے بجلی کے

کرنٹ کی طرح ملک کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہوں۔ مجھے سعید صاحب نے تمھارے متعلق بتایا اور میں روہڑی میں تم سے گفتگو کررہا ہوں۔ ویسے اب ہماری گفتگو دوسرے چینل سے ہوگی۔"

دوسرے چینل کا مطلب ٹیلی پیتھی تھا۔ میں نے خیال خوانی کے ذریعے کہا۔"یس چیف! آئندہ اسی چینل سے گفتگو ہوگی۔"

"باہر تمھارے لیے ایک ایئر کنڈیشنڈ کوچ موجود ہے۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور اور ایک مسلح جوان ہوگا۔ تمھاری ضرورت کا اسلحہ بھی موجود ہوگا۔ کوچ کے پچھلے حصے میں کچھ ایسا میکنزم ہے، جس کے ذریعے تم اپنے اور ڈرائیور وغیرہ کے درمیان ایک عارضی دیوار کھڑی کرسکتے ہو۔ جس سیٹ پر بیٹھوگے، اسے اپنے لیے بیڈ بناسکتے ہو۔ جو عارضی دیوار کھڑی کروگے اس پر ایک چھوٹا سا ٹی وی اسکرین ہے۔ اسکرین پر مختلف بٹنوں کے ذریعے گاڑی کے اگلے اور پچھلے حصے کے مناظر دیکھ سکتے ہو۔ تمھیں اپنے آگے جانے والوں یا تعاقب کرنے والوں کا علم ہوتا رہے گا۔ اسکرین کے ساتھ کچھ ایسے بٹن بھی ہیں جن کے ذریعے ٹارگٹ لینس نظر آسکتا ہے۔ اس لینس کے ذریعے ایک بٹن دباتے ہی آٹومیٹک فائرنگ ہونے لگے گی۔ جو بھی گاڑی تعاقب میں ہوگی وہ فائرنگ کی زد میں آجائے گی۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارے ملک میں ایسی جدید طرز کی گاڑی ہوگی۔ ایسی گاڑیاں پولیس کے محکموں کو دی جائیں تو بڑی آسانی سے بڑے بڑے مجرموں کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

چیف نے کہا۔"ایسی گاڑیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں اور ہمارا غریب ملک ان کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے سیکرٹ سروس کی یہ ایک گاڑی ہے جو میرے لیے مخصوص ہے۔ میرا اسسٹنٹ اسے سکھر لے گیا تھا۔ اب تم اسے اسلام آباد لے آؤگے۔"

میں اس کمرے سے نکل کر ریلوے پولیس اسٹیشن کے پیچھے آیا۔ وہاں ایک خوبصورت سی کوچ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا۔ کوچ سکھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ روہڑی کی حدود سے باہر نکلنے کے بعد چیف کے اسسٹنٹ نے پیچھے گھوم کر کہا۔"اگر آپ گاڑی کے کسی میکنزم کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں تو میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

"میں تھوڑی دیر بعد ان میکنزم کو آزماؤں گا۔ فی الحال خاموشی چاہتا ہوں۔"

میں نے رسونتی کی خبر لی۔ وہ حور بانو کے پاس موجود تھی۔ وہاں سے مطمئن ہوکر جمال احمد جسکانی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بے چارا میلوں پیدل چلتا ہوا خیر پور کی حدود میں پہنچا تھا۔ میں نے سیکرٹ سروس کے چیف سے رابطہ قائم کیا اور کہا۔"میرا ساتھی جمال احمد جسکانی خیر پور کی ایک دور افتادہ بستی میں پہنچ گیا ہے۔"

"مجھے گائیڈ کرتے رہو۔ وہ کس بستی میں ہے اور کن راستوں سے گزر رہا ہے۔ ہوسکے تو اسے کسی ایک جگہ روکے رکھو۔ ہمارا آدمی گاڑی لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔"

میں نے جسکانی کے دماغ میں یہ خیال پیدا کیا کہ اسے کسی چھوٹے سے ہوٹل میں ذرا دیر کے لیے سستانا چاہیے۔ یہ مشورہ اس کے حسب حال تھا۔ وہ تھکا ہوا تھا، فوراً ایک ہوٹل میں جا پہنچا، جہاں اندر اور باہر چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ قریب ہی ایک لاری اڈہ تھا۔ وہاں سے گزرنے والے ڈرائیور، کنڈیکٹر اور کلینر وغیرہ رات گزارنے ہوٹل میں آتے تھے۔ ایک چارپائی کے دو روپے ادا کرتے تھے۔ میں نے چیف کو بتادیا کہ جسکانی لاری اڈے کے سامنے والے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔

رسونتی نے مجھے مخاطب کیا۔"حور بانو کے پاس پہنچو۔ اس پر جنونی دورہ پڑ رہا ہے۔ وہ ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے ہے کہ وہ تمھاری تلاش میں جائے گی۔"

میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ رسونتی نے کہا۔"اس کے دماغ پر تھوڑی دیر متوجہ رہو۔ ایسا لگتا ہے، کوئی حور بانو کی سوچ میں اس ضد کو قائم رکھے ہوئے ہے کہ اسے تمھاری اٹیچی لے کر یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

اس وقت کرم داد اسے سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ "جب تک بابر نہیں آئے گا، تم ہمارے پاس اس کی امانت ہو۔ یوں بھی ہم سب نے تمھاری حفاظت کی ذمے داری لی ہے۔ ہم تمھیں تنہا کہیں نہیں جانے دیں گے۔"

ریحانہ نے کہا۔"آخر یہ بابر ہم سے کچھ کہے سنے بغیر کیوں چلا گیا؟ کہاں چلا گیا ہے؟"

"وہ نادان نہیں ہے۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی ہمیں چھوڑ گیا ہے۔ وہ چاہتا ہوگا، جسکانی کے بعد دشمن اس کے پاس پہنچ جائیں۔ اس طرح ہم اس لفافے اور فائلوں کو بحفاظت یہاں سے لاہور تک لے جاسکیں گے۔"

کرم داد کو مجھ پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے میری سوچ کے مطابق کہا۔"جس طرح جسکانی نے ہم سے لاہور میں ملنے کا وعدہ کیا ہے، اسی طرح بابر بھی ہم سے ملے گا۔ حور بانو! ذرا صبر اور تحمل سے کام لو۔ مہمات کے دوران بڑے نشیب و فراز آتے ہیں۔ بعض وقت میں اپنے ساتھی بھی دشمن لگتے ہیں۔ ایسے ہی وقت اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اعتماد نہ ہو تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ لاہور پہنچتے ہی بابر سے تمھاری ملاقات

کرادوں گا۔"

ریحانہ نے کہا۔"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ جب بابر کو جانا ہی تھا تو وہ لفافہ اور فائلیں ہمارے حوالے کرکے جاتا۔ وہ انھیں یوں چھوڑ گیا ہے جیسے ان کی کچھ اہمیت ہی نہ ہو اور حور بانو کو بھی ان کے متعلق کچھ نہیں بتایا، چپ چاپ چلا گیا۔ آخر کوئی تو بات ہوگی؟"

ریحانہ خود ایسی بات نہیں کہنا چاہتی تھی۔ آپ ہی آپ اس کے دماغ میں ایسی باتیں پیدا ہورہی تھیں اور وہ بے اختیار بولتی جارہی تھی۔ کرم داد نے پوچھا۔"اس لفافے اور فائلوں کو یوں چھوڑ کر چلے جانے میں کیا بات ہوسکتی ہے۔ تم کیا سوچ رہی ہو؟"

یہی کہ یہ اصل لفافہ اور فائلیں نہیں ہیں، اصل وہ ہیں جنھیں بابر ساتھ لے گیا ہے۔"

"اس کے پاس دوسری فائلیں کہاں سے آگئیں کہ وہ انھیں تبدیل کرسکے؟"

"وہ اس نے پہلے ہی چھپا رکھی ہوں گی۔ اب موقع پاکر نقل چھوڑ گیا اور اصل لے گیا۔"

"بھئی اس نے تبدیل بھی کیا ہے تو ہمارے تمھارے فائدے کے لیے ہی کیا ہے۔ ہمیں ان فائلوں سے کیا لینا ہے۔ ان کی فکر تو دشمنوں کو ہوگی لیکن میں دیکھ رہا ہوں، حور بانو کے ساتھ تم بھی ان فائلوں کے پیچھے پڑ گئی ہو، جیسے تم دونوں کو ہی ان کی جستجو ہو۔"

میں نے رسونتی سے کہا۔"تصدیق ہورہی ہے۔ کوئی تیسری ہستی خیال خوانی اس حد تک جانتی ہے کہ کسی کو اپنی مرضی کے مطابق سوچنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے پر مجبور کردے۔ چونکہ کرم داد، حور بانو اور ریحانہ کے سامنے آرہا ہے اس لیے وہ خیال خوانی کرنے والی ہستی دونوں عورتوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں لے پارہی ہے۔ کیوں نہ ہم کرم داد کو راستے سے ہٹادیں۔"

پھر کرم داد نے میری سوچ کے مطابق کہا۔"ہم بہت دیر سے کیبن میں بحث کررہے ہیں۔ ہمیں بابر کی بھی خبر لینی چاہیے۔ میں ابھی ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔"

وہ کیبن سے باہر چلا گیا۔ رسونتی، ریحانہ کے دماغ میں تھی اور میں حور بانو کے پاس موجود تھا۔ پھر رسونتی نے آکر کہا۔"فرہاد! ریحانہ کے پاس آؤ۔ اس کے دماغ میں بڑی سنسنی پیدا ہورہی ہے۔ وہ اس فائل کو اور لفافے کو کھولنے کے لیے مچل رہی ہے۔"

میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کے دیکھا۔ وہ سوچ رہی تھی اٹیچی کو کھول کر دیکھنا چاہیے۔ ایک خیال آتا تھا، کرم داد ناراض ہوگا۔ دوسرا خیال پیدا ہوتا تھا، ناراض ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ میں اسے منانا جانتی ہوں لیکن میری تسلی تو ہوجائے گی۔"

وہ میری اٹیچی کی طرف بڑھی۔ حور بانو نے پوچھا۔"کیا تم اسے کھول کر دیکھنا چاہتی ہو؟"

"کیا تمھیں اعتراض ہے؟"

"میں چاہتی ہوں، کسی طرح بابر کے یہاں سے جانے کا کوئی راز معلوم ہوجائے۔ مجھے تمھارے کرم داد کی باتوں سے تسلی نہیں ہورہی ہے۔"

"ابھی تسلی ہوجائے گی۔ آؤ اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے ریحانہ نے اٹیچی کھول کر لفافے کی سیل توڑ کر اسے کھولا۔ اس کے اندر سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ برآمد ہوا مگر وہ خط نہیں تھا۔ بس سادہ کاغذ تھا۔

وہ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ حور بانو نے کہا۔"ذرا ایک فائل کو بھی کھول کر دیکھو۔"

اس نے ایک فائل کی سیل توڑ دی۔ اسے کھولا۔ اندر سادے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ رسونتی نے کہا۔"فرہاد! بہتر ہوتا ہم انھیں اٹیچی کھولنے کا موقع نہ دیتے۔"

"نہیں، یہ بہتر ہوا کہ انھوں نے دیکھ لیا۔ اب دشمن ان تینوں کو نہیں چھیڑیں گے۔ تمام دشمنوں کی نظروں کا مرکز صرف میں جاؤں گا۔ یہ لوگ ہائی وے پر میرا تعاقب کرنا شروع کریں۔ آگے جتنے شہر اور بستیاں آئیں گی، وہاں بھی دشمن میرے منتظر رہیں گے۔"

"ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟"

"تم جو بھی کہوگی، محبت سے کہوگی۔ میں برا نہیں مانوں گا۔"

"جب تم کسی عورت کو چاہتے ہو تو اس کی حفاظت کرنے کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتے ہو۔ اب تم حور بانو کو بچانے کے لیے خطرات کو دعوت دے رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ حور بانو اس وقت تک میری ہمسفر ہے جب تک اس کا ٹھکانا نہ ہوجائے۔ میں نے سونیا سے بھی وعدہ کیا ہے، تم سے بھی وعدہ کرتا ہوں، تمھیں اس سلسلے میں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ رات زیادہ ہورہی ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ پارس کا خیال رکھو۔ کھانے پینے کے بعد آرام سے سوجاؤ۔ تمھاری ضرورت ہوگی تو آواز دے لوں گا۔"

"اپنی طرح اپنی عورتوں کو بھی بے مروت اور سنگدل سمجھتے ہو۔ تم خطرات میں گھرے ہوئے ہو تو میں آرام سے کیسے سو جاؤں گی۔"

"بھئی تمھیں سونے میں ایک پل نہیں لگے گا۔ اپنے دماغ

کو ہدایات دو اور سو جاؤ۔ میں نے کہا نا ضرورت ہو گی تو بلا لوں گا۔ خواہ مخواہ میرے ساتھ لگی رہو گی تو پھر لو لو ناراض ہو کر دکھاؤں ؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "میں جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے کرم داد کے پاس پہنچ کر دیکھا وہ کیبن میں آگیا تھا اور غصّے سے ریحانہ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بڑے ضبط سے کہا "حُور بانو! تم اپنے کیبن میں جاؤ۔ میں ابھی تمھیں بلا لوں گا۔"

حور بانو وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی کرم داد نے دروازے کو اندر سے بند کر کے غرّاتے ہوئے پوچھا "تم نے کس کی اجازت سے لفافے اور فائل کو کھول کر دیکھا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "دیکھ، دیکھ کرم داد! میں تیری ہوں۔ مجھے بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑاخ سے اس کے منہ پر طمانچہ پڑا پھر اس کی پٹائی شروع ہو گئی۔ وہ مار کھا رہی تھی، تکلیف سے کراہ رہی تھی اور محبت کا واسطہ دیتی جا رہی تھی۔ کرم داد نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "عورت آخر عورت ہوتی ہے۔ کہیں نہ کہیں حماقت کرتی ہے اور اپنی اصلیت ظاہر کر دیتی ہے بے وقوف عورت، بابر کچھ سوچ کر ہی یہ سارے کاغذ اور یہ مہر شدہ فائلیں ہمارے پاس چھوڑ گیا تھا۔ انھیں کھولنے کی ضرورت کیا تھی۔ اگر دشمن ہم پر حملہ کریں گے تو ہم انھیں دوبارہ کیسے سیل کریں گے۔ کس طرح چھپا کر رکھیں گے۔"

وہ کہہ رہا تھا، میں اس کی لاشعوری کیفیت کو سمجھ رہا تھا مار کھانے کے بعد ریحانہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگ کر گل تر ہو رہا تھا۔ اس کے گلابی لب ذرا سے کھُل گئے تھے جیسے محبت کا دروازہ کھل گیا ہو اور دروازے کے پیچھے سے اس کی ریحانہ کہہ رہی ہو "ہائے، کب تک پتھر مارو گے۔ پھول بھی تو مارو۔"

میں حوُر بانو کے پاس آگیا۔ وہ دوسرے کیبن میں ایک برتھ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سوچ رہی تھی "یہ کیا زندگی ہے! میں کہاں تھی اور کہاں پہنچ گئی یہاں سے اور نہ جانے کہاں پہنچوں گی۔ کس کا ساتھ ہو گا کس کا ساتھ چھوٹے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ کیوں چلا گیا۔ کیا میری کوئی بات بُری لگی تھی یا میں بُری لگتی ہوں۔"

میں نے اس کی سوچ میں کہا "مجھے اس انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔ بابر مجھے چاہتا ہے۔ میں اس کی چاہت کو اس کی نگاہوں سے پڑھ سکتی ہوں۔ وہ اُن لوگوں میں سے ہے جو جان ہار جاتے ہیں مگر زبان نہیں ہارتے۔ وہ مجھے کبھی منجدھار میں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ اس کے جانے میں بھی مصلحت ہے کرم داد ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ایسی مہمات کے دوران ساتھیوں کو ایک دوسرے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اعتماد نہ ہو تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔"

اس کے دل کو ڈھارس بندھ رہی تھی۔ اس کی سوچ کہہ رہی تھی "ہاں، کرم داد یہ بھی تو کہہ رہا تھا کہ جیسے جسکانی نے لاہور میں ملنے کا وعدہ کیا ہے اسی طرح بابر بھی ہم سے آکر ملے گا۔"

میں اسے اس کی ہی سوچ میں سمجھا بجھا کر واپس آگیا۔ ہم سکھر پہنچ گئے۔ آگے بیٹھے ہوئے چیف کے اسسٹنٹ نے پوچھا "اگر آپ ریفرشمنٹ چاہتے ہیں تو ہم تھوڑی دیر کے لیے رُک جائیں گے۔"

"نہیں۔ ہمارا سفر جاری رہے گا۔ ہمیں جلد از جلد لاہور پہنچنا ہے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا "ہم ملتان کب تک پہنچ جائیں گے ؟"

ڈرائیور نے کہا "میں صبح پانچ بجے تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔"

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ میں نے چیف کے اسسٹنٹ سے اس گاڑی کے مختلف میکنزم کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ پھر کہا "اب میں آرام سے لیٹنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی ضروری بات نہ ہو تو مجھے مخاطب نہ کرنا۔"

میں نے مختلف بٹنوں کو دبایا جس سے میرے اور اگلی سیٹ کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔ جس سیٹ پر میں بیٹھا ہوا تھا، وہ آرام دہ بستر کی طرح چوڑی ہو گئی۔ درمیانی دیوار پر مائک اور اسپیکر تھا جس کے ذریعے اگلی سیٹ پر بیٹھنے والوں سے بات کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسکرین تھا میں نے اسے آن کر کے دیکھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں سامنے آتے ہوئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اسے آف کیا پھر دوسرے بٹن کو دبایا۔ اب گاڑی کے پچھلے حصّے کے گزرتے ہوئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چاندنی رات میں واضح نہیں تھے پھر بھی کوئی گاڑی پیچھے سے آتی تو وہ اسکرین پر نظر آسکتی تھی۔ میں نے دوسرے میکنزم کو بھی سمجھا جن کے ذریعے آٹومیٹک فائرنگ ہو سکتی تھی۔ پھر آرام سے لیٹ گیا۔ میں گاڑی کے جس حصّے میں تھا، وہاں کی لائٹ آف کر دی۔ اوّل تو مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اگر آتی بھی تو سو نہیں سکتا تھا۔ ہمارے تعاقب میں رہنے والوں نے جمال احمد جسکانی کا خالی بریف کیس دیکھ لیا تھا۔ اٹیچی سے برآمد ہونے والے لفافے اور فائلوں کے سادہ کاغذات دیکھ لینے کے بعد میں ان سب کی توجہ کا مرکز

بن چکا تھا۔ اب وہ قدم قدم پر اور مضبوط جال بچھائیں گے آئندہ کیا ہونے والا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن اتنا یقین تھا کہ بہت کچھ ہونے والا ہے۔

کم گریزی کے بیان کے مطابق فرہاد علی تیمور ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ اگرچہ اس نے فرہاد کا نام غلط استعمال کیا تھا تاہم کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا ضرور ان کے ساتھ تھا، اس بات کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والا میرے دشمنوں کو کس طرح میرے تعاقب میں لگاتا ہے۔ جبکہ وہ میرے دماغ میں پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس گاڑی میں سفر کر رہا ہوں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے خود اپنے خیال کی نفی کی۔ یقیناً دشمنوں کو علم ہو سکتا ہے کہ میں کس راستے سے گزر رہا ہوں۔ وہ تیسرا ٹیلی پیتھی جاننے والا حور بانو، ریحانہ یا کرم داد کے ذریعے یہ معلوم کر چکا ہے کہ میں روہڑی اسٹیشن پر اُتر گیا ہوں، اب وہاں سے مجھے کسی دوسری ٹرین سے سفر کرنا ہے یا ہائی وے سے لاہور پہنچنا ہے لہٰذا وہ دونوں طرف کی ناکہ بندی کے انتظامات کر رہے ہوں گے۔ ہائی وے کے قرب و جوار میں کسی بھی بستی یا شہر میں مجھے روکا جا سکتا تھا۔

ایک گھنٹا خیریت سے گزر گیا۔ ہم صادق آباد سے آگے نکل گئے۔ اسسٹنٹ نے اسپیکر کے ذریعے مجھے مخاطب کیا "مسٹر بابر! بہت دور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دو گاڑیاں نظر آرہی ہیں اور کچھ سپاہی کھڑے ہوئے ہیں۔ شاید پولیس چوکی ہے، انھوں نے راستے میں عارضی رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔"

میں نے ٹی وی اسکرین کو آن کر کے دیکھا۔ اس کی بات درست تھی۔ میں نے مائک کے بٹن کو آن کر کے کہا "وہاں دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ہماری گاڑی کا نمبر تیسرا ہو گا۔ وہاں پہنچتے ہی کسی کو مخاطب کرنا۔ میں اسکرین پر اسے دیکھتا رہوں گا۔"

انھوں نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہماری گاڑی کو دیکھتے ہی ایک سپاہی نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے گاڑی اسی قطار میں تیسرے نمبر پر کھڑی کر دی۔ ڈرائیور نے پوچھا "بات کیا ہے۔ یہ چیکنگ کیوں ہو رہی ہے ؟"

سپاہی نے کہا "یہاں ایک قریبی بستی میں زبردست ڈاکا پڑا ہے۔ اس لیے ہم ناکہ بندی کر کے ہر گاڑی کو چیک کر رہے ہیں۔"

میں پولیس والے کے دماغ میں پہنچ گیا۔ پھر مائک کو آن کر کے کہا "کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر ان سے طاقت کے ذریعے نمٹنے کی کوشش کرو۔ یہ سب فراڈ ہے۔"

فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کی گئی۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے گاڑی کو پیچھے کیا۔ پھر آگے بڑھا کر تیز رفتاری سے رکاوٹیں توڑتے ہوئے گزر گئے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری طرف فائرنگ کی گئی۔ میں اسکرین پر پیچھے کے مناظر دیکھ رہا تھا اور جوابی فائرنگ کر سکتا تھا لیکن وہاں دو اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن میں سیدھے سادے لوگ سفر کر رہے تھے میں انھیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ہم وہاں سے نکل تو آئے مگر دشمنوں کو ہماری گاڑی کا نمبر وغیرہ معلوم ہو گیا۔ لہٰذا وہ ہمارے تعاقب کے بجائے وہیں رکے رہے گویا ان کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ کسی خیال خوانی کرنے والے نے ان کے دماغ سے ہماری گاڑی کا نمبر، رنگ اور ماڈل معلوم کر لیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے جس سپاہی سے گفتگو کی تھی، اس کے ذریعے خیال خوانی کرنے والا ہمارے ڈرائیور کے دماغ تک پہنچ گیا ہو، اس کے ذریعے یہ جان چکا ہو کہ میں گاڑی کے پچھلے حصّے میں موجود ہوں۔"

اسپیکر سے چیف کے اسسٹنٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا "مسٹر بابر! حیرانی کی بات ہے، آپ نے کیسے معلوم کر لیا، وہ لوگ فراڈ ہیں۔ ہمارے آگے بڑھتے ہی انھوں نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔"

میں نے جواب دیا "میں نے اپنے دشمن کو اسکرین پر دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ آگے پولیس چوکی ہو تب بھی گاڑی نہ روکنا۔ یہ پیچھے رہ جانے والے دشمن ٹرانسمیٹر کے ذریعے آگے والے دشمنوں کو ہمارے متعلق اطلاع دے رہے ہوں گے۔"

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی انھوں نے میری پیشینگوئی کو درست ہوتے دیکھا۔ سامنے چار گاڑیاں جا رہی تھیں۔ انھوں نے ہمیں اپنے پاس سے گزرنے کا موقع دیا لیکن ہماری گاڑی کی رفتار سے ان کی رفتار کچھ کم نہیں تھی۔ وہ گاڑیاں آہستہ آہستہ ہمارے دائیں بائیں ہو گئیں۔ ایک پیچھے اور ایک آگے چلنے لگی۔ میں آگے پیچھے کا منظر دیکھ سکتا تھا اور دائیں بائیں چلنے والی گاڑیوں کے متعلق ڈرائیور وغیرہ کے دماغ سے معلوم کر سکتا تھا۔ ہر گاڑی کی کھڑکی سے اسٹین گنیں جھانک رہی تھیں۔ ایک شخص چیخ کر کہہ رہا تھا "سلامتی چاہتے ہو تو گاڑی روک دو اور بابر کو ہمارے حوالے کر دو۔"

دوسری طرف سے کسی دوسرے نے چیخ کر کہا "ہم صرف ایک منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد گاڑی نہ روکی گئی

تو چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جائے گی۔"

اگلی سیٹ سے چیف کے اسسٹنٹ نے کہا "مسٹر بابر! آپ اطمینان رکھیں۔ ہم اپنی جان پر کھیل کر بھی آپ کو یہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے کہا "انھوں نے ایک منٹ کی مہلت دی ہے۔ یہ بہت ہے لیکن مقابلہ کرنے کے لیے نہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"درست کہہ رہا ہوں۔ مقابلہ کرو گے تو چاروں طرف سے فائرنگ ہوگی۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں ہیں۔ وہ چاروں پہیوں کو ناکارہ کر دیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟"

"کیا ہم ان کے سامنے شکست تسلیم کر لیں؟"

"ابھی ایک منٹ نہیں گزرا ہے، اسے گزرنے دو اور خاموشی سے تماشہ دیکھتے رہو۔"

پھر میں نے تماشہ دکھایا۔ پہلے اس دشمن کے دماغ میں پہنچا جس نے ہماری سلامتی کا حوالہ دیتے ہوئے گاڑی روکنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے دماغ میں پہنچتے ہی میں نے غصے سے کہا۔ "تم سب گدھے کے بچے ہو۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟"

وہ بوکھلا کر خلا میں تکنے لگا۔ میں نے کہا "میں وہی ہوں جس سے تمھارے باس کا رابطہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہوتا ہے۔ میں نے ہی اس گاڑی کے متعلق اطلاع دی تھی جس میں بابر سفر کر رہا ہے۔ بے وقوفو، وہ گاڑی پیچھے ہے۔ تم لوگوں نے گاڑی کا نمبر سننے میں غلطی کی ہے۔ اسے چھوڑو اور پیچھے آنے والی گاڑی کا انتظار کرو۔ ایسا نہ ہو کہ پیچھے آنے والی گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ یہ گھیراؤ دیکھ کر محتاط ہو کر اپنا راستہ بدل لیں۔ جلدی کرو۔ اسے چھوڑ کر دوسری طرف توجہ دو۔"

اس نے فوراً ہی ٹرانسمیٹر آن کیا اور اپنے ساتھ والی گاڑیوں سے رابطہ قائم کرتے ہوئے کہنے لگا "ہم غلطی پر ہیں۔ اس گاڑی کو چھوڑ دو۔ اصل گاڑی پیچھے آ رہی ہے۔"

بعض اوقات ایک منٹ چشم زدن میں گزر جاتا ہے اور کبھی اس ایک منٹ میں کئی مرحلے گزر جاتے ہیں، اس ایک منٹ میں ہی وہ گاڑیاں آہستہ آہستہ پیچھے رہ گئیں۔ ہماری گاڑی آگے نکل گئی۔ میں نے مائک کے ذریعے کہا "پوری رفتار سے گاڑی دوڑاؤ۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ کر پیچھے ہو گئے ہیں لیکن ہمارا تعاقب ضرور کریں گے۔ رفتار بڑھاتے چلے جاؤ۔"

ڈرائیور نے رفتار کو بڑھانا شروع کیا۔ پھر جیسے ہماری گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اس خیال خوانی کرنے والے کو یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ کسی دوسرے نے بھی خیال خوانی کے ذریعے ان کے ایک آدمی کو گمراہ کیا ہے اور بابر کو نکل جانے کا موقع دیا ہے۔ میں کسی کو یہ سمجھنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا پہلے اس کے دماغ میں پہنچ کر گمراہ کیا تھا، پھر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔

وہ چاروں گاڑیاں سڑک کے اطراف رک گئی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے مسلح افراد باہر آ گئے تھے اور پیچھے آنے والی کسی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا "تمھیں کیسے پتا چلا کہ ہم نے جس گاڑی کو گھیرا تھا وہ غلط تھی اور جس گاڑی کو گھیرنا چاہیے وہ اب آنے والی ہے؟"

وہ کہنا چاہتا تھا کہ کسی نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے یہ بات بتائی ہے لیکن میں نے کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے دماغ پر قابض ہو کر اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ایک نے حیرانی سے کہا "ارے یہ تو بھاگ رہا ہے مگر کیوں؟"

دوسرے نے کہا "بھاگنے کی وجہ یہی ہے کہ اس نے ہمیں مس گائیڈ کیا ہے۔ یقیناً آگے جانے والی گاڑی میں بابر تھا۔ معلوم ہوتا ہے یہ بابر اور اس کے ساتھیوں سے ملا ہوا ہے؟"

بھاگنے والا بھاگتا رہا پھر اس کے قدموں کی طرف فائرنگ ہونے لگی۔ اس کے پیچھے اس کے ساتھی دوڑتے آ رہے تھے اور کہہ رہے تھے "خیریت چاہتے ہو تو رک جاؤ۔ ہمیں حقیقت بتاؤ، تم نے ہمیں مس گائیڈ کیوں کیا؟"

مگر وہ دوڑتا جا رہا تھا اور میری مرضی کے مطابق کہتا جا رہا تھا "میں نے بابر سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا ساتھ دوں گا میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ اب چاہے میری جان بھی چلی جائے۔"

اس کے ساتھ ہی تڑتڑاتڑ کی آواز کے ساتھ کئی اسٹین گنیں شعلے اگلنے لگیں۔ بھاگنے والا زمین سے کئی فٹ اچھل کر نیچے گرا اور تڑپنے لگا۔ جب اس کے ساتھی اس کے قریب پہنچے تو وہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

اب وہ خیال خوانی کرنے والا کبھی یہ نہیں سمجھ سکے گا کہ کسی اور نے ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس کے آدمی کو ٹریپ کیا تھا اور نہ ہی اس کے ساتھی یہ سمجھ پائیں گے۔ ان میں سے ایک نے کہا "ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ گاڑی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی، چلو اس کا تعاقب کریں۔"

وہ دوڑتے ہوئے اپنی گاڑیوں کی طرف جانے لگے۔ میں نے ڈرائیور کے ذریعے اپنی گاڑی کی رفتار معلوم کی اور مطمئن

ہو گیا۔ ہم بہت تیز رفتاری سے جا رہے تھے۔ چیف کا اسسٹنٹ ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے آدمیوں کو اطلاع دے رہا تھا کہ ان کی گاڑی کا تعاقب ہو رہا ہے، لہٰذا تعاقب کرنے والوں کو روکا جائے۔

دوسری طرف سے جواب سنائی دیا "آپ فکر نہ کریں، آگے بڑھتے جائیں۔ ہم پیچھے آنے والوں کو روک لیں گے۔"

میں پھر آرام سے لیٹ گیا۔ واقعی انھوں نے ہمارا تعاقب کرنے والوں کا راستہ روک لیا ہوگا۔ مجھے خیال خوانی کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا ہی سمجھ لینا کافی تھا کہ دشمن ہمارے پیچھے نہیں آ رہے تھے۔

ڈرائیور نے وعدہ کیا تھا کہ صبح پانچ بجے تک ملتان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ راستے میں کتنی رکاوٹیں آ جائیں گی۔ ویسے یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں ہے۔ انسان اپنی زندگی سے سیکھنا چاہے تو یہ سیکھ سکتا ہے کہ جب مصیبت آ کے گزر جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آئندہ کوئی مصیبت نہیں آئے گی، وہ تو ضرور آتی ہے۔

وہ مصیبت کبھی سخت جان لیوا ہوتی ہے اور کبھی جان افزا بھی ہوتی ہے۔ کبھی بھیانک ہوتی ہے اور کبھی خوبصورت ہوتی ہے۔ اگر مصیبت خوبصورت ہو تو اسے مصیبت نہیں بلا کہتے ہیں اور وہ بلا آ گئی۔

چیف کے اسسٹنٹ نے مجھے مخاطب کیا "مسٹر بابر! دور سڑک پر کوئی عورت نظر آ رہی ہے۔"

میں نے اسکرین کو آن کیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دور بہت دور ایک عورت دونوں ہاتھ اٹھا کر دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ اسپیکر سے آواز سنائی دی "مسٹر بابر! یہ کوئی ڈراما ہو سکتا ہے۔ اس عورت کے ذریعے دشمن ہماری گاڑی کو رکوانا چاہتے ہیں۔"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ گاڑی ہرگز نہ روکی جائے مگر اس آنے والی کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ دوڑتی آ رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی "روکو، گاڑی روکو۔ اس گاڑی میں میرا شوہر ہے۔ میں اس کی شریک حیات ہوں۔ بابر، بابر، میری آواز سنو۔ میں تمھاری آمنہ ہوں۔"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسکرین پر آمنہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے کہا "گاڑی روک دو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"میں کہہ رہا ہوں، گاڑی روک دو۔"

گاڑی ٹھیک اس کے سامنے ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ گاڑی رکنے والی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ اسے کچلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس نے یکبارگی چھلانگ لگائی۔ فضا میں قلابازی کھائی پھر گاڑی کی چھت پر پہنچ گئی۔ چیف کے اسسٹنٹ نے کہا "میں پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ کوئی سیدھی سادی عورت نہیں ہے۔ دیکھیے، کیسے کرتب دکھا رہی ہے۔"

وہ چھت پر پہنچ کر اوندھی لیٹ گئی۔ پھر کھڑکی کی طرف جھکتے ہوئے، چیف کے اسسٹنٹ کو دیکھتے ہوئے بولی "میرا نام آمنہ ہے۔ آمنہ کا سامنا کرنے سے بہتر ہے، میرا آدمی میرے حوالے کر دو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہوتے میں نے دروازہ کھول کر چھت کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ کے نیچے کھینچ لیا۔ وہ دھڑام سے زمین پر آئی۔ میں نے اسے گاڑی کے اندر کھینچتے ہوئے کہا "بہت آمنا سامنا کرتی ہو۔ چپ چاپ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "گاڑی اسٹارٹ کرو اور پوری تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے چلو۔ جو بھی راستے میں آئے اسے کچل ڈالو۔"

آمنہ نے کہا "ارے یہ کیا کہہ رہے ہو۔ آگے ہمارے تمام ساتھی موجود ہیں۔ مائیکل شوف بھی انتظار کر رہا ہے۔"

"کیا مصیبت ہے۔ تم اس چنڈال چوکڑی کے ساتھ یہاں کیسے پہنچ گئیں۔ تمھیں کیسے پتا چلا کہ میں اس گاڑی میں سفر کر رہا ہوں؟"

وہ ایک دم سے میرے قریب ہو کے بولی "ہمیں ایک غیبی مدد حاصل ہو گئی ہے۔ اب کوئی ہم سے چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔ ہمیں سارے رازوں کا علم ہو جایا کرے گا۔"

میں نے کہا "میں کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ میں تمھارا شوہر نہیں ہوں۔ تم میرے اتنے قریب نہ آیا کرو۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "کیا تم اپنے آپ کو نہیں پہچانتے ہو۔ ہمیں ملنے والی تازہ ترین اطلاع کے مطابق تمھیں اپنی پچھلی زندگی یاد نہیں ہے۔ تم نے خود کو بابر کی حیثیت سے پہچان لیا ہے۔ خدا کے لیے مجھے بھی پہچان لو۔ میں کب تک نام کی سہاگن بنی رہوں گی۔"

"دشمنوں نے بے پر کی اڑائی ہے۔ بیزنس کام کی بات کرو۔ مجھے بتاؤ، تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس گاڑی میں سفر کر رہا ہوں؟"

اس نے گاڑی کی اس عارضی دیوار کو دیکھا جس کے

دوسری طرف اگلی سیٹ پر ڈرائیور اور چیف کا اسسٹنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے آہستگی سے پوچھا: "کیا ہماری آواز اُدھر جارہی ہے؟"

میں نے مائیک کے بٹن کو آف کرتے ہوئے کہا: "اب آواز نہیں جائے گی۔"

اس نے میری طرف جھک کر سرگوشی میں کہا: "تم تو اپنے ہی ہو۔ ہم تو اب دشمنوں کے بھی دل کی باتیں معلوم کرلیا کریں گے۔ تم نے فرہاد اور رسونتی کا نام سنا ہے نا؟"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "ہاں سنا ہے۔ آگے بولو۔"

"یہ بھی سنا ہوگا کہ فرہاد اور رسونتی میں ایک عرصے سے اختلافات چلے آرہے ہیں۔ دونوں الگ الگ زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں کے درمیان دشمنی بہت بڑھ گئی ہے۔ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ فرہاد اب ماسٹر کی اور کم کریزی وغیرہ کا ساتھ دے رہا ہے۔ انھیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہمارے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ اِدھر رسونتی ہمارے ساتھ ہوگئی ہے۔ کچھ دیر پہلے اسی نے اطلاع دی تھی تم اس گاڑی میں آرہے ہو۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا: "کیا ڈرامے بازی ہو رہی تھی۔ وہ خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی مرد تھی یا عورت؟ وہ واقعی ایک تھی یا دو؟ وہ میری اور رسونتی کی طرح دو مختلف ہستیاں تھیں یا ایک ہی ہستی تھی؟ ادھر کبھی ٹی ٹی سینٹر والوں کے کام آرہی تھی، اُدھر بھی مخالف ٹی ٹی سینٹر والوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ آخر وہ کون تھی؟ کیا چاہتی تھی؟"

اسپیکر سے آواز سنائی دی: "مسٹر بابر! سامنے پھر راستہ روکا جارہا ہے۔ بہت سے لوگ اور بہت سی گاڑیاں نظر آرہی ہیں۔"

میں نے اسکرین کو آن کرکے دیکھا۔ پھر کہا: "ان کے قریب لے جاکر گاڑی روک دو۔"

پھر آمنہ سے کہا: "تم گاڑی سے اُتر کر جاؤ اور مائخل شوف کو یہاں لے آؤ۔"

گاڑی رکنے کے بعد وہ اتر گئی۔ میں اسکرین پر دیکھ رہا تھا۔ وہ مائخل شوف سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر وہ آمنہ کے ساتھ میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ آکر بیٹھتے ہوئے بولا: "مجھے یقین تھا تم ہم سے غداری نہیں کروگے حالانکہ تمھارے خلاف ہمیں بہکانے کی بہت کوشش کی گئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تم دشمنوں سے جا ملے ہو۔ میں کہتا تھا بابر ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ وہ ضرور کوئی چال چل رہا ہوگا۔ آخر ہمیں ایک غیبی مدد حاصل ہوگئی۔ اس کے ذریعے پتا چلا، تمھارے پاس ایسے کاغذات ہیں جن سے ہم کم کریزی اور اس کے اہم ساتھیوں کے قدم اس ملک سے اکھاڑ سکتے ہیں۔ ان کے خلاف ایسے مقدمات قائم ہوسکتے ہیں کہ وہ یہاں ٹھہر نہیں سکیں گے۔ ہم اس طرح ماسٹر کی کو منہ توڑ جواب دیں گے۔"

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔ اور عارضی دیوار کو دیکھ کر آہستگی سے بولا: "کیا ہماری باتیں دوسری طرف سنی جارہی ہیں؟"

میں نے کہا: "اطمینان رکھو۔ کوئی ہماری باتیں نہیں سنے گا۔"

"لیکن بابر! ہمیں اطلاع دینے والی نے بتایا ہے تم سرکاری آدمیوں کے ساتھ سرکاری گاڑی میں جارہے ہو۔ کیا یہ آگے بیٹھے ہوئے لوگ سرکاری نہیں ہیں؟"

"بالکل ہیں اور چونکہ سرکاری ہیں اس لیے اب تم بھی سرکاری مہمان ہو۔"

اس نے چونک کر پوچھا: "کیا مطلب؟"

میں نے مائیک کے بٹن کو آن کرکے چیف کے اسسٹنٹ سے کہا: "لاک دی ڈور۔"

دوسرے ہی لمحے دروازہ آگے کی طرف سے کٹ ہوا بند ہو گیا۔ اب وہ مقفل تھا۔ کوئی اسے کھول نہیں سکتا تھا۔ وہ دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا، میں نے پیچھے سے کالر پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا پھر عارضی دیوار پر لگے ہوئے بٹنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ان بٹنوں کے ساتھ کیا کچھ لکھا ہوا ہے پہلے اسے پڑھ لو۔"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھنے لگا۔ میں نے کہا: "یہ چند بٹن ایسے ہیں جنھیں دباتے ہی کار کے چاروں طرف سے فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ تمھارے جو آدمی باہر کھڑے ہوئے ہیں، اس فائرنگ کی زد میں آجائیں گے۔ جواباً وہ بھی فائرنگ کریں گے لیکن میں اکیلا نہیں مروں گا۔ تمھیں بھی میرے ساتھ مرنا ہوگا۔"

آمنہ نے حیرانی سے پوچھا: "بابر! یہ تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ کیا تم سامن دی گریٹ سے غداری کروگے؟"

"دہشت گرد تنظیموں کے سربراہ ایک بات بھول جاتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب ہم اپنے وطن سے غداری کرسکتے ہیں تو کسی دن ان سے بھی غداری کرسکتے ہیں۔ میں ایسا کرتا ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ میرے ضمیر نے مجھے جھنجوڑا ہے۔ کل یہ تمھیں بھی جھنجوڑے گا۔"

مائخل شوف نے کہا: "آمنہ! یہ بکواس کر رہا ہے۔ تم جانتی ہو ہمارے بہرام ٹی ٹی سینٹر سے تمھارے سامن دی گریٹ کا کتنا گہرا دوستانہ ہے اور ہمارا کتنا پرانا معاہدہ ہے۔ تم ہماری وفادار ہو۔ آج تمھاری آزمائش ہے۔"

میں نے کہا: "ہاں آمنہ! تمھارے لیے یہ آزمائش کا وقت ہے۔ تم مجھے شوہر تسلیم کرتی ہو۔ ان حالات میں تم شوہر کا ساتھ دوگی یا وطن دشمنوں کا؟"

مائخل شوف نے کہا: "آمنہ! یہ تمھیں بیوی ہی تسلیم نہیں کرتا ہے۔ یہ فراڈ ہے، دھوکے باز ہے اگر یہ تمھیں بیوی تسلیم کرتا ہے تو اس سے پوچھو، کیا یہ ہمیں خطرات میں مبتلا کرے گا۔ کیا یہاں سے فائرنگ کی ابتدا کرے گا اور ہمارے آدمیوں کو جواباً فائرنگ پر مجبور کرے گا۔ کیا میرے ساتھ تمھاری بھی جان لے گا؟"

آمنہ کبھی اس کی باتیں سن رہی تھی، کبھی میری باتیں سن رہی تھی۔ کبھی مجھے دیکھ رہی تھی، کبھی اسے دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا: "فائرنگ کی ابتدا اس وقت ہوگی جب تم مجبور کروگے اور جب مجبور کروگے تو اکیلے تم نہیں مروگے اور میں صرف آمنہ کو مرنے کے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے ساتھ میں بھی جان دوں گا۔ پھر میں فریبی کیسے ہوا؟"

آمنہ نے کہا: "بابر! تم مجھے بیوی تسلیم نہیں کرتے ہو، حالانکہ ہماری شادی ہوچکی ہے۔ تم میرے مجازی خدا ہو۔ میں تمھیں اور مائخل شوف کو سمجھاتی ہوں، مجھے آزمائش میں مبتلا نہ کرو۔ ذہانت سے کام لو اور ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرو، ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟ میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گی کہ میرے مجازی خدا کو ذرا بھی نقصان پہنچے۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ مائخل شوف کو سرکاری مہمان بنایا جائے۔"

میں نے کہا: "اس کی ایک ہی صورت ہے۔ ہم آگے بڑھتے رہیں اور تمھارے تمام ساتھی اپنی گاڑیوں میں آگے پیچھے چلتے رہیں۔ اس دوران کسی مناسب سمجھوتے کی کوشش کریں گے۔"

مائخل شوف نے کہا: "اگر ہمارے ساتھی ہمارے آگے پیچھے رہیں گے تو میں تمھارے ساتھ کہیں بھی چلنے کو تیار ہوں۔"

میں نے مائیک والے بٹن کی طرف انگلی بڑھاتے ہوئے کہا: "اب میں اسے آن کر رہا ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرکے حکم دو کہ وہ ہماری گاڑی کے آگے پیچھے چلتے رہیں۔"

اس نے میرے مشورے کے مطابق عمل کیا۔ اس دوران میں نے سیکرٹ سروس کے چیف تک پہنچ کر موجودہ سچویشن بتائی اور کہا: "یہ گاڑیاں ہمارے آگے پیچھے چلتی رہیں گی۔ آپ کا اسسٹنٹ گاڑی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہے مگر اس کا ٹرانسمیٹر کے ذریعے کسی کو مخاطب کرنا مناسب نہیں ہے۔ آپ مخصوص ٹیم کو حکم دیں کہ وہ آگے کہیں ہم سب کو گھیر لے۔"

مائخل شوف اپنے آدمیوں کو حکم دے چکا تھا۔ میں نے بھی اپنے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی آگے بڑھائے۔ اس طرح ہمارا قافلہ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ میں نے کہا: "ہاں تو مسٹر مائخل شوف! وہ ہستی کون ہے جس نے میرے یہاں سے گزرنے کی اطلاع تم لوگوں کو دی۔"

وہ ان تمام بٹنوں کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا: "کیا اس گاڑی میں ریکارڈنگ سسٹم بھی ہے؟"

"گھبراؤ نہیں، تمھاری کوئی بات ریکارڈ نہیں کی جارہی ہے۔ یہاں ایسا کوئی سسٹم نہیں ہے۔"

میں نے اسے جھوٹی تسلی دی تھی حالانکہ سامنے بیٹھا ہوا چیف کا اسسٹنٹ ہماری باتیں ریکارڈ کر رہا تھا۔ ایسے ہی وقت میں نے مائخل شوف کو ذرا چونکتے ہوئے دیکھا وہ اپنے شانے سے لٹکے ہوئے چھوٹے سے بیگ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر معلوم کیا۔ اس بیگ سے اسے اشارہ موصول ہو رہا تھا۔ اس کے پاس ایک کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر تھا۔ ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس پُراسرار ہستی سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔ مائخل شوف اس کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کو بیگ سے نکالتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن دماغ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ضرور کوئی خاص اطلاع ہے۔

آخر اس نے بیگ کھول کر اسے نکالا۔ وہ ایک چھوٹے کیسٹ ریکارڈر کے برابر ٹرانسمیٹر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسکرین تھا۔ اسے اس طرح کمپیوٹرائزڈ کیا گیا تھا کہ اِدھر سے جو بات کہی جاتی تھی، جواباً اسکرین پر الفاظ کی صورت میں جوابات موصول ہوتے تھے۔ چونکہ اُدھر سے اشارہ موصول ہو رہا تھا لہٰذا اِدھر سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مائخل شوف نے ایک بٹن کو دبایا جس سے اسکرین آن ہوگیا۔ پھر اس نے جواب موصول ہونے والے بٹن کو دبایا۔ اسکرین پر کچھ لکھا ہوا نظر آنے لگا۔ میں نے اسے پڑھا۔

وہاں لکھا ہوا تھا: "خبردار، تمھارا ایک ایک لفظ ریکارڈ کیا جارہا ہے۔"

اس کے نیچے رسونتی کا نام لکھا ہوا تھا۔ مائخل شوف نے اسکرین کو آف کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا اور کہا۔ "ہماری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ بھئی، میں کوئی مجرم تو نہیں ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم آخر کیا ریکارڈ کرنا چاہتے ہو۔ میں رومانیہ سے آیا ہوں۔ میرے پاس تمام قانونی کاغذات موجود ہیں۔ ہمارا سفارت خانہ میرے بہترین کردار کی گواہی دے سکتا ہے۔"

"اگر تم بہترین کردار کے مالک ہو تو ہمارے ملک میں یہ ٹرانسمیٹر لے کر کیوں آئے ہو؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کون سا ٹرانسمیٹر؟ یہ تو ایک چھوٹا سا ریڈیو ہے اور اس کے ساتھ یہ چھوٹا سا ٹیلیویژن ہے۔ جب تمہارے یہاں ٹی وی پر وگرام ہو گا تو میں اسے آن کر کے بتاؤں گا یا ابھی ریڈیو پر کوئی گیت سننا چاہتے ہو تو ابھی سناتا ہوں۔"

وہ ایک بٹن آن کر کے مجھے ریڈیو کا کوئی پروگرام سنانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے مائک کے بٹن کو آن کرتے ہوئے چیف کے اسسٹنٹ سے کہا۔ "یہاں جو باتیں ہو رہی ہیں، انھیں ریکارڈ نہ کیا جائے سوئچ آف کر دیا جائے۔"

مائخل شوف اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا۔ وہ چھوٹا سا ٹی وی اور ریڈیو سیٹ تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے وقت اسے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے طور پر استعمال کر لیتا تھا۔ یہ بات میں ظاہر کر سکتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو جاتا کہ یہ سب کچھ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے معلوم کر رہا ہوں ورنہ اندر کی بات اور کون جان سکتا ہے؟

ہاں، وہ تیسری ہستی جان لیتی تھی۔ اس نے چیف کے اسسٹنٹ کے دماغ میں پہنچ کر دیکھ لیا تھا کہ اُدھر ریکارڈنگ ہو رہی ہے اور یہ بات اس نے کمپیوٹر کے ذریعے مائخل شوف کو بتا دی تھی، اس کم بخت نے نیچے رسونتی کا نام لکھ دیا تھا جب کہ اس وقت رسونتی اپنی جگہ گہری نیند میں تھی۔

میں نے کہا۔ "ہماری خاموشی سے کام نہیں چلے گا اگر کوئی سمجھوتا کرنا چاہتے ہو تو زبان کھولو۔ میں نے ریکارڈنگ سے منع کر دیا ہے۔ یقین نہ ہو تو اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔"

اس نے ٹرانسمیٹر کو آپریٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں بات کر سکتا ہوں؟"

یہ کہہ کر اس نے اسکرین کو آن کیا۔ پھر جواب والے بٹن کو پُش کیا۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر انگریزی میں لکھا ہوا نظر آیا۔ "باتیں کر سکتے ہو۔ خطرہ پیش آتے ہی سگنل موصول ہو گا۔"

وہ تیسری ہستی جو خیال خوانی کر رہی تھی، اس کا طریقۂ کار سمجھ میں آ گیا تھا۔ جمال احمد جسکانی بریف کیس لے کر گیا تھا کھیتوں میں کم کریزی ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے ماتحت سے گفتگو کر رہا تھا۔ بعد میں اس نے جسکانی سے اسی ٹرانسمیٹر کے ذریعے گفتگو کی تھی۔ اس وقت بھی کم کریزی کے پاس یقیناً ایسا ہی کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر ہو گا۔ وہ پُراسرار ہستی اُدھر بھی کمپیوٹر کے ذریعے اپنا جواب پہنچاتی ہو گی یعنی کسی کے دماغ میں پہنچنے کے بعد براہِ راست گفتگو نہیں کرتی ہو گی۔ اس کی ضرورت بھی نہ کیا تھی جب کہ یہ کام کمپیوٹر سے ہو رہا تھا۔ اس طرح وہ میری اور رسونتی کی ٹیلی پیتھی سے بالکل محفوظ تھی۔ ابھی ہمارے سامنے ایسا کوئی راستہ نہیں تھا جسے اختیار کر کے ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس تیسری خیال خوانی کرنے والی ہستی کے دماغ تک پہنچا جا سکتا۔

مائخل شوف نے مسکرا کر پوچھا۔ "وہ کاغذات کہاں ہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "کون سے کاغذات؟"

"دیکھو انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم نے انسپکٹر علی مختار یمن کا وہ خط لفافے سے نکال لیا۔ اس طرح ان فائلوں سے ضروری کاغذات بھی نکال لیے اور وہاں سادے کاغذات رکھ دیے۔ تم نے حور بانو، ریحانہ اور کرم داد کو بھی دھوکا دیا۔ ان سے کچھ کہے سنے بغیر چپ چاپ روہڑی اسٹیشن پر اُتر گئے۔ اس کے بعد اب اس گاڑی میں سفر کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تم یہ اس طرح بتا رہے ہو جیسے میرے ساتھ ساتھ موجود رہے ہو۔"

"تم نے اس اسکرین پر رسونتی کا نام پڑھ لیا ہے وہ تمہارے آس پاس رہنے والوں کے دماغوں میں پہنچ کر معلومات حاصل کر لیتی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق ہمیں ایسی بات بتائی ہے جس کے متعلق ہم پہلے نہیں جانتے تھے اور وہ یہ کہ تم یوگا کے ماہر ہو۔ جب بھی ملاہم رسونتی تمہارے دماغ میں پہنچنا چاہتی ہیں، تم سانس روک لیتے ہو۔"

مجھے یاد آیا۔ جب ہم نواب شاہ کے پولیس ہیڈکوارٹر کے کمرے میں سو رہے تھے اور میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی تھی کہ نیند پوری کرنے کے بعد ہی میری آنکھ کھلے گی یا پھر کسی غیر معمولی موقع پر بیدار ہو جاؤں گا، اس وقت وہی غیر معمولی واقعہ پیش آیا تھا۔ میری آنکھ اچانک ہی وقت سے پہلے کھل گئی تھی۔ میں نے کوئی غیر معمولی سی بات محسوس کی تھی۔ کبھی کھڑکیوں اور دروازوں کو دیکھا تھا، کبھی روشندان اور چھت کو تکتا رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ آخر رفتہ رفتہ اس خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی کے متعلق علم ہو گیا تھا وہ خود ہی منکشف ہوتی چلی گئی۔

آمنہ نے کہا۔ "بابر! مائخل شوف کے سوال کا جواب دے دو۔ وہ کاغذات کہاں ہیں؟"

"ہم سب سرکاری مہمان ہیں۔ وہ کاغذات بھی سرکار کی تحویل میں ہیں۔"

مائخل شوف نے کہا۔ "فی الحال تمہاری سرکار اس گاڑی تک محدود ہے۔ وہ کاغذات بھی اسی گاڑی میں ہیں۔"

"بے شک ہیں لیکن تم انھیں تلاش نہیں کر سکو گے اور نہ ہی تمہاری وہ رسونتی میرے دماغ میں پہنچ کر ان چھپے ہوئے کاغذات کا سراغ لگا سکے گی۔"

میں نے تمہاری رسونتی اس لیے کہا کہ وہ خیال خوانی کرنے والی ہستی سُن لے اور یہی سمجھے کہ میں اسے رسونتی ہی سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا۔ "ویسے ابھی آمنہ بتا رہی تھی کہ تم دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں نے فرہاد اور رسونتی کو آپس میں بانٹ لیا ہے۔ فرہاد تمہارے مخالف گروہ میں چلا گیا ہے اور رسونتی تم لوگوں کا ساتھ دے رہی ہے۔"

مائخل شوف نے کہا۔ "تم ہمارے سوال کو ٹال رہے ہو۔"

"پہلے اس بات کی وضاحت کر دو، کیا واقعی تمہارے ساتھ کوئی ٹیلی پیتھی کا چکر چل رہا ہے؟ جہاں تک رسونتی کا تعلق ہے، میں مان سکتا ہوں، وہ فرہاد کی دشمن ہے۔ اس لیے فرہاد کے ملک کے خلاف تم لوگوں کا ساتھ دے سکتی ہے لیکن فرہاد مخالف گروہ کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے؟"

مائخل شوف نے ناگواری سے کہا۔ "فرہاد نہایت ہی خود غرض اور لالچی ہے۔ نہ اس کا کوئی ملک ہے نہ اس کی کوئی قومیت ہے، نہ اس کا دین ایمان ہے، اسے جدھر اپنا مفاد نظر آتا ہے اُدھر چل پڑتا ہے۔"

میں مسکرا کر مائخل شوف کو دیکھنے لگا۔ ہمیں آگے بات بڑھانے کا موقع نہیں ملا۔ اسی وقت گاڑی رک گئی تھی۔ مجھے اسپیکر سے آواز سنائی دی۔ "مسٹر بابر! ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔"

میں نے اسکرین کو آن کر کے دیکھا۔ مائخل شوف کی جو گاڑیاں ہمارے چاروں طرف تھیں، وہ بھی رک گئی تھیں، انھیں بھی گھیر لیا گیا تھا۔ بہت دور کہیں میگا فون سے آواز آ رہی تھی۔ "تم سب کو ہدایات دی جاتی ہیں، گاڑیوں کے انجن بند کر دو۔ اور تمام مسلح افراد باری باری گاڑی سے نکل کر دور تک جائیں اور وہاں اپنے اپنے ہتھیار ڈال کر واپس گاڑی میں چلے آئیں کسی نے مقابلہ کرنے کی حماقت کی تو تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

میں فوراً ہی اس بولنے والے کے دماغ میں پہنچ گیا۔ مجھے معلوم تھا، وہ تیسری خیال خوانی کرنے والی ہستی بھی اس کے دماغ میں پہنچ کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی کہ میگا فون سے بولنے والا سرکاری آدمی ہے یا مخالف گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ مقامی پولیس پارٹی کا سربراہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا یہ بات کھلے۔ میں اس کے دماغ کی گہرائیوں میں پہنچ گیا تاکہ اس کے لاشعور سے یہ بات نہ نکلے کہ وہ سرکاری آدمی ہے۔ مائخل شوف کے ایک آدمی نے گاڑی سے نکل کر بلند آواز سے سوال کیا۔ "تم کون ہو۔ تمھیں ہم سے کیا دشمنی ہے؟"

میں نے میگا فون والے کو بولنے پر مجبور کیا۔ "میں تم لوگوں کا بدترین دشمن ہوں۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کم کریزی سے ٹکرانے والے کبھی صحیح سلامت اپنی منزل تک نہیں پہنچتے۔ ہاں، ایک شرط ہے۔ اگر ہتھیار ڈال دو گے تو میں سلامتی سے جانے کی اجازت دے دوں گا۔ تمہارے لیڈر کو سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے صرف پانچ منٹ کی مہلت دے رہا ہوں۔"

مائخل شوف تیزی سے سوچ رہا تھا اور بار بار کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو دیکھتا تھا۔ پھر اشارہ موصول ہونے لگا۔ اس نے فوراً ہی اسکرین کو آن کیا۔ پھر جواب موصول ہونے والے بٹن کو دبایا۔ اسکرین پر تحریر نظر آ رہی تھی وہاں لکھا تھا۔ "میگا فون سے بولنے والا اور اس کے ساتھ محاصرہ کرنے والے کم کریزی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

میری احتیاطی تدبیر کے باوجود اس پُراسرار ہستی نے حقیقت معلوم کر لی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیسے معلوم کر لی تھی؟

ایک بات سمجھ میں آئی۔ میں نے تو میگا فون سے بولنے والے کے لاشعور سے لے کر دماغ کی تہہ تک اسے لاک کر دیا تھا۔ کوئی خیال خوانی کرنے والا اس کے چور خیالات نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس طرح ثابت ہوا کہ جو رسونتی بن کر اِدھر مائخل

شوف وغیرہ کا ساتھ دے رہا تھا، وہی اُدھر فرہاد بن کر کم کریزی کے گروہ کی مدد کر رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میگا فون والے کے دماغ سے حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔ تو وہ کم کریزی کی طرف گیا ہوگا۔ پھر اس نے حقیقت معلوم کرتے ہی کمپیوٹر کے ذریعے مائیکل شوف کو آگاہ کر دیا تھا۔

اِدھر مائیکل شوف نے سوالیہ بٹن کو آن کرنے کے بعد پوچھا: "ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ تو یقیناً پولیس والے ہو سکتے ہیں۔"

جواب موصول ہوا: "پولیس والے ہی ہیں۔ اپنے آدمیوں سے کہہ دو، وہ ہتھیاروں پر انگلیوں کے نشانات نہ چھوڑیں میگا فون والے کے حکم کی تعمیل کریں اور ہتھیار ڈال دیں۔ تمھیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تمھارے پاسپورٹ، ویزے اور دوسرے ضروری کاغذات اس بات کا ثبوت ہیں کہ تم لوگ تخریب کار نہیں ہو۔ اس بات کی گواہی تم لوگوں کے سفارت خانوں سے دی جا سکتی ہے۔ تمھارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تم نے بابر کو یا کسی سرکاری گاڑی کو روکا ہے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق کہیں لے جا رہے ہو۔"

مائیکل شوف نے اس کے مشورے کو تسلیم کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ ہتھیاروں پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات مٹا کر خود کو قانون کے حوالے کر دیں پھر اس نے خود کو بھی قانون کے حوالے کر دیا۔

صرف دس منٹ کے اندر پولیس پارٹی نے چاروں طرف سے گھیر کر، ان کے پھینکے ہوئے ہتھیاروں پر قبضہ کر کے انھیں حراست میں لے لیا۔ چیف کے اسسٹنٹ نے میرے مشورے کے مطابق پولیس پارٹی کے سربراہ سے کہا — مائیکل شوف کے پاس جو چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر ہے، وہ ہمارے حوالے کر دیا جائے۔"

مائیکل شوف نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: "یہ کوئی غیر قانونی چیز نہیں ہے۔ میں اپنی تفریح کے لیے یہ چھوٹا سا ٹی وی اپنے پاس رکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ریڈیو بھی ہے۔"

"یہ ٹی وی اور ریڈیو اسلام آباد پہنچ کر تمھارے حوالے کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ یہ کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر ثابت نہ ہوا۔"

پولیس والوں نے انھیں ان کی ہی گاڑیوں میں بٹھایا۔ اپنے آدمی بھی ان کی نگرانی کے لیے بٹھا دیے۔ ان میں.... مائیکل شوف بھی تھا۔ میں نے کہا: "آمنہ میرے ساتھ سفر کرے گی کیونکہ یہ میری شریکِ حیات ہے۔"

اسے میرے پاس چھوڑ دیا گیا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "تم نے سب کے سامنے مجھے اپنی شریکِ حیات کیسے تسلیم کر لیا؟"

"نہ کرتا تو دوسرے یہ سوال کرتے کہ ایک انتہائی حسین عورت کے ساتھ بند کوچ میں کیوں سفر کر رہا ہوں۔"

"کیا اب بھی تسلیم کرتے ہو؟"

میں نے آرام سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ "دیکھو آمنہ! میں نہیں جانتا کہ بابر کون ہے، وہ جو کوئی بھی ہے تم اس کی امانت ہو۔ اگر شوہر کے دھوکے میں میرے قریب آؤ گی اور کل کبھی انکشاف ہوگا کہ تمھارا اپنا بابر تو کوئی اور ہے تب کیا تم اپنے آپ کو معاف کر سکو گی؟"

"اوّل تو ایسا نہیں ہوگا۔ تم ہی میرے بابر ہو اگر میرا اپنا بابر کوئی اور ہے اور وہ میرے سامنے آ گیا تو میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ میں تقدیر کو معاف نہیں کروں گی جو مجھے اپنے بابر کے دھوکے میں کسی اور مقام تک لے جائے۔ میں حالات کو معاف نہیں کروں گی جو ہمیشہ تمھیں میرے شوہر کی حیثیت سے میرے سامنے لاتے ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا: "میں بابر کا ہم شکل ہوں۔ تم اس حقیقت کو تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لو اور میرے ایک سوال کا جواب دو۔ اگر میں بابر کا ہم شکل ہوں تو کیا تم اپنے بابر کو چھوڑ کر میری بن سکتی ہو؟"

"جب میں جانتی ہوں کہ تم ہی...."

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "یہ بات تم کئی بار کہہ چکی ہو۔ میرے سوال کا جواب دو۔ میں بابر کا ہم شکل ہوں۔ کیا تم اپنے بابر کو چھوڑ کر میری بن سکتی ہو؟"

"نہیں، اس کے ہزار ہم شکل پیدا ہو جائیں لیکن میرے بابر کی طرح کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"پھر تم ایک مسلمان کی حیثیت سے میری قسم پر اعتبار کرو۔ میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتا ہوں، اپنے ایمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں تمھارا بابر نہیں ہوں۔ میری یادداشت بھی صحیح سلامت ہے۔ میں صرف اس کا ہمشکل ہوں۔"

"تم ہمشکل کیسے بن گئے۔ تم نے یادداشت گم ہونے کا ناٹک کیوں کھیلا؟"

"جو ناٹک میں نے کھیلا وہ میری اپنی مجبوری ہے۔ اور ہم شکل کیوں ہو گیا تو یہ قدرت کے کرشمے ہیں، یہ سوال تو قدرت سے کرو۔"

اس نے مایوسی اور ناگواری سے مجھے دیکھا۔ پہلے تو

مایوسی سے کہا: "تم اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہے ہو۔ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تسلیم کر رہی ہوں۔ اور یہ تسلیم کر رہی ہوں تو دل ڈوب رہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں، یہاں کیوں آئی، میں تو اس دھوکے میں آئی کہ اپنے شوہر کے ساتھ پیرس سے آ رہی ہوں۔ اگر تم میری زندگی میں نہ آتے تو میں کبھی ادھر نہ آتی۔ میں اپنے بابر کو تلاش کرتی رہتی۔ تم نے بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔ بتاؤ میں کہاں جاؤں، اسے کہاں تلاش کروں؟ میں چالاک اور خطرناک دشمنوں سے لڑتی ہوں اور منہ توڑ جواب دیتی ہوں مگر تقدیر سے کیسے لڑوں۔ اب تو دل یہ سوچ کر بھی ڈوبتا رہے گا کہ اتنے طویل عرصے تک کوئی لاپتا نہیں رہتا۔ وہ کوئی نادان بچہ نہیں ہے۔ اگر اس دنیا کے کسی حصے میں ہوتا تو ضرور کسی نہ کسی ذریعے سے رابطہ قائم کرتا۔ کیا وہ دنیا کے کسی حصے میں نہیں ہے؟"

اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر مجھ سے پوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟"

"بابر۔"

وہ ایک دم سے بپھر کر بولی: "بکواس مت کرو۔ دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک شخص کسی کا ہم شکل بھی ہو اور ہم نام بھی۔"

"تم بھول رہی ہو۔ میں نے مجبوری کی حالت میں یادداشت گم ہونے کا ڈراما کیا تھا۔ وہ مجبوری آج بھی ہے۔ اس لیے میرا نام بابر ہی ہے۔ میرا اصل نام کیا ہے، میری اصلیت کیا ہے، یہ نہ پوچھو۔"

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر کہا: "گاڑی رکواؤ، میں دوسری گاڑی میں جاؤں گی۔"

"کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"میں تمھاری طرف سے آنکھیں بند کرتی ہوں تو وہی صورت نظر آتی ہے جو میرے بابر کی صورت ہے وہی تمھاری صورت بھی ہے۔"

"تم تو بڑی حوصلہ مند ہو، سمجھ دار بھی ہو پھر ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا کیوں سمجھتی ہو۔ کیا میرے ایک اچھے مشورے پر عمل کرو گی؟"

"مجھے نصیحتوں اور مشوروں سے چڑ ہے۔"

"پھر بھی میں کہوں گا، ہر انسان کچھ نہ کچھ پانے کی تمنا کرتا ہے۔ بے شک اسے کچھ پانے کی توقع رکھنی چاہیے لیکن پا لینے کا یقین نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تم یقین کر لو گی کہ اسے پا سکتی ہو تو ہو سکتا ہے کبھی تمھارا یقین مجروح ہو اور تمھارے دل کو ایسی ٹھیس پہنچے کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے، لہٰذا صرف توقع کرو کہ وہ کبھی مل سکتا ہے۔ ہر کامیاب انسان تھوڑی سی ناکامی کی توقع ضرور رکھتا ہے۔"

"تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ حالانکہ یہ بات میں پہلے بھی کئی بار سن چکی ہوں لیکن آج اثر ہو رہا ہے۔ کیونکہ میں آج تک اپنے بابر کو پا لینے کا یقین کرتی آئی تھی اور ناکام ہوتی رہی تو مجھے ناکامی کا ہی یقین کرنا پڑے گا۔ کامیابی کی تو صرف ٹوٹی پھوٹی سی امید رہ گئی ہے۔"

ہم ملتان پہنچ گئے۔ مائیکل شوف اور اس کے گروہ کے تمام آدمیوں کو پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا تاکہ وہاں مکمل انتظام کے ساتھ انھیں اسلام آباد پہنچایا جا سکے۔ میں آمنہ اور اپنے دونوں ہم سفروں کے ساتھ ایک ہوٹل میں آ گیا۔ وہاں ہم نے چند گھنٹے گزارے۔ کچھ شاپنگ کی، غسل وغیرہ کر کے لباس تبدیل کیے، ناشتا کر کے تازہ دم ہوئے۔ سونا بھی چاہتے تھے لیکن سفر جاری رکھنا ضروری تھا۔ اس لیے پھر کوچ میں آ گئے۔ آمنہ نے کہا۔ "بہتر ہے، مجھے مائیکل شوف کے ساتھ جانے دو۔"

"میں تمھیں دشمنوں کے ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ تم پاکستانی ہو، تمھیں صرف پاکستان سے محبت کرنا اور اس کا وفادار رہنا چاہیے۔"

وہ ناگواری سے بولی: "تم کیا جانو کہ ہم نے پاکستان کے لیے کتنی قربانیاں دی ہیں۔ بہار سے مشرقی پاکستان گئے۔ مشرقی پاکستان سے یہاں آنا چاہتے تھے لیکن ہمیں قانون کے نام پر بھٹکنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو شاید ہم دہشت پسند اور دہشت گرد نہ کہلاتے۔"

"آمنہ! تمھارا اپنا ایک گھر ہو، جسے تم نے بڑی محنتوں سے بنایا ہو، اس میں تمھاری آرزوئیں اور تمھارے خواب شامل ہوں، اگر اس کا دروازہ کوئی بند کر دے، تمھیں اندر نہ آنے دے تو کیا تم دوسرا راستہ تلاش نہیں کرو گی؟ کیا تم اس گھر کو بم کے دھماکے سے اُڑا دو گی؟"

"میں اپنے گھر کو کبھی تباہ نہیں کر سکتی۔"

"پھر پاکستان کی تباہی کے لیے دشمنوں کے ساتھ کیوں آئی ہو؟ بے شک تمھارے لیے یہاں کا دروازہ بند کیا گیا تھا۔ تمھیں داخلے کے لیے کوئی اور راستہ تلاش کرنا چاہیے تھا۔ جب تم دہشت گردی میں اپنی طاقت اور ذہانت استعمال کر سکتی ہو تو اسی ذہانت سے کام لے کر کسی دوسرے راستے سے پاکستان نہیں آ سکتی تھیں اور اب جب کہ آ ہی گئی ہو تو اس کی حفاظت کرو۔ اس کی تباہی کے کیوں درپے ہو؟"

اس نے خشک لہجے میں پوچھا: "میں تمھاری بات

کیوں مانوں؟"

"کیونکہ ماننے والی بات مانی جاتی ہے۔ نہ ماننے والی بات سے انکار کیا جاتا ہے۔"

"اگر تم کہتے ہو کہ پاکستان ہمارا گھر ہے تو میں اس شرط پر ماننے کو تیار ہوں کہ ہمارا گھر جنّت بن جائے۔"

"تم بناؤ گی تو جنّت بنے گا۔"

"کوئی عورت شوہر کے بغیر اپنے گھر کو جنّت نہیں بنا سکتی۔ کہاں ہے میرا مجازی خدا؟ کہاں ہے میرا بابر؟"

"دنیا میں رشتے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ لوگ ملتے ہیں، بچھڑتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں، مرجاتے ہیں۔ اگر بابر مرجائے تو کیا تم گھر کو جہنم بنادوگی؟"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے ایک کراٹے کا وار مجھ پر رسید کیا۔ میں نے پیچھے ہٹ کر وار خالی دیا۔ جہاں اس کا ہاتھ پڑا' وہاں کی سیٹ پھٹ گئی —— پھر اس نے دوسرا حملہ نہیں کیا کیونکہ اس سے جو حرکت سرزد ہوئی تھی' وہ اضطراری تھی۔ وہ کسی کی زبان سے سننا نہیں چاہتی تھی کہ بابر مرچکا ہے۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا پھر بڑے دُکھ سے بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا۔ تم بہت اچھے ہو۔ میں دل سے تمھاری قدر کرتی ہوں۔ تمھاری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو میرا شوہر بن کر مجھے دھوکا دے سکتا تھا۔ تم میری فطرت کو سمجھتے ہو۔ میں ٹوٹنا جانتی ہوں' جھکنا نہیں جانتی مگر آج تمھاری اخلاقی اقدار کے سامنے سر جھکاتی ہوں۔"

"اگر تم اخلاقی قدروں کو سمجھتی ہو تو پھر یہ سمجھو، ہمارے ہی اخلاقی کردار سے یہ ملک خوبصورت بن سکتا ہے۔ ہمیں اسے بگاڑنا نہیں چاہیے۔"

وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔ دیکھنے کے انداز میں محبت بھی تھی اور عقیدت بھی۔ پھر اس نے کہا۔ "میں اپنے گھر کو بگڑنے نہیں دوں گی۔ جب گھر والا پاس نہیں رہتا' پردیس چلا جاتا ہے تو عورت اس کی تصویروں سے گھر کو سجاتی ہے۔ ان تصویروں کو دیکھتی ہے اور آنے والے کا انتظار کرتی ہے۔ کیا تم بابر کے آنے تک میرے لیے اس کی تصویر بن کر رہنا پسند کروگے؟"

"تم مثبت انداز میں فیصلہ کر رہی ہو تو میں تمھاری بات دل کی گہرائیوں سے مانوں گا۔ جب تک بابر نہیں آئے گا، ہم اچھے دوست بن کر رہیں گے۔ میرے پاس ہمیشہ وہ ایمان رہے گا جو عورت کی عزت کرنا سکھاتا ہے۔ تمھارے پاس وہ حیا رہے گی جو عورت کو اس کی حد میں رہنا سکھاتی ہے۔"

اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا۔ "پرامس؟"

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "پرامس۔"

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی جارہی تھی۔ میں نے ایک طرف رکھے ہوئے کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "اگر ہم اسے آپریٹ کریں تو وہ ٹیلی پیتھی جاننے والی ہستی ہماری باتوں کا جواب دے گی؟"

آمنہ نے اسے لے کر آپریٹ کیا —— پھر میرا سوال دُہراتے ہوئے اسکرین کو آن کیا۔ اس کے بعد جواب حاصل کرنے کے لیے ایک بٹن کو دبایا۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین پر جواب موصول ہونے لگا۔ وہاں لکھا تھا۔ "میری مرضی کے بغیر کوئی اسے آپریٹ کرے گا تو اسکرین ہمیشہ سادہ رہے گا۔ فی الحال میں جواب دے رہی ہوں۔ دوسرا سوال کرو۔"

میں نے کہا۔ "کسی حد تک تمھیں سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈبل رول پلے کر رہی ہو۔ بہرام علی ٹی ٹی سینٹر والوں اور سائمن دی گریٹ کے آدمیوں کے پاس آکر رسونتی بن جاتی ہو۔ سائمن کی اور البامہ ٹی ٹی سینٹر والوں کے پاس پہنچ کر فرہاد کا رول ادا کرنے لگتی ہو۔ تم میل ہو کہ فیمیل؟"

جواب موصول ہوا۔ "یہاں میرا نام رسونتی لکھا ہوا ہے اور رسونتی فیمیل ہے۔ ظاہر ہے جس گروہ میں رسونتی ہوگی' اس کے مخالف گروہ میں فرہاد ضرور انتقاماً ہوگا۔ تمھاری خوش فہمی ہے کہ تم بہت زیادہ ذہین ہو اور مجھے چشمِ تصوّر سے ڈبل رول پلے کرتے دیکھ رہے ہو۔ اور کوئی سوال ہے؟"

"ہاں۔ ابھی ہماری گفتگو کے دوران یقیناً تم آمنہ کے پاس تھیں۔ میں اسے حُبّ الوطنی پر آمادہ کر رہا تھا۔ دہشت پسند تنظیم سے نکال کر اپنی طرف لا رہا تھا۔ ایسے وقت تم اسے بہکا سکتی تھیں۔ اس کے دماغ میں رہ کر منفی سوچ کے ذریعے اپنی طرف مائل کرسکتی تھیں۔ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

اسکرین پر جواب لکھا ہوا نظر آیا۔ "تمھارے اس سوال کا جواب مشکل ہے۔ میں جلد ہی جواب دینے کی کوشش کروں گی۔ فی الحال معذرت چاہتی ہوں۔ کوئی اور سوال؟"

"میں اس کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کے ذریعے مائخل شوف کو قانون کے شکنجے میں لے آؤں گا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"نہیں لاسکوگے۔ میں نے مائخل شوف کو سمجھا دیا ہے۔ وہ اس کی ملکیت سے انکار کردے گا۔ جب وہ انکار کرے گا کہ یہ چیز اس کی نہیں ہے تو تم اس پر کیا الزام عائد کروگے؟"

میں نے کہا۔ "اگر الزام عائد نہ ہوسکے تو حکومت ایسے افراد کو ناپسندیدہ عناصر کی فہرست میں شامل کرکے ملک سے باہر جانے کا حکم دیتی ہے لہٰذا مائخل شوف کو ہمارا ملک تو چھوڑنا پڑے گا۔"

اسکرین پر جواب ملا۔ "کوئی دوسرا مائخل شوف آجائے گا۔"

"ہوسکتا ہے، آجائے مگر تیسرا نہیں آسکے گا۔ اس وقت تک میں تمھاری ٹیلی پیتھی جاننے والی کھوپڑی میں زلزلہ پیدا کردوں گا۔"

جواب میں اسکرین پر لکھا ہوا نظر آیا۔ "قہقہہ' میں اس وقت قہقہہ لگا رہی ہوں۔ افسوس تمھیں سنائی نہیں دے گا۔ کیونکہ کمپیوٹر نے ابھی قہقہہ لگانا نہیں سیکھا ہے۔"

میں نے اسکرین کو آف کردیا۔ ٹرانسمیٹر کو بند کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے جماہی لی۔ آمنہ نے پوچھا۔ "کیا نیند آرہی ہے؟"

"رات بھر جاگنے کے بعد بھی نیند نہیں آئے گی؟ میں سمجھتا ہوں، تمھیں بھی سوجانا چاہیے۔"

اس نے کوچ کی محدود جگہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں دو کیسے سوسکتے ہیں؟"

میں نے بٹن کو دبایا۔ ہماری سیٹ کی پُشت ذرا پیچھے ڈھلنے لگی۔ اس کے پیچھے ایک اور سیٹ نظر آئی۔ میں نے کہا۔ "تم میری دوسری سیٹ پر جاکر سوجاؤ۔ میں اس کی پُشت کو دیوار بنادوں گا۔ ہم ایک دوسرے کو نظر نہیں آئیں گے۔ لاہور تک آرام سے سوتے رہیں گے۔"

وہ پچھلی سیٹ پر چلی گئی۔ میں نے عارضی دیوار کھڑی کردی۔ اب اس گاڑی میں میرے دونوں طرف عارضی دیواریں تھیں۔ میں درمیان میں تنہا۔ گاڑی کی اگلی سیٹ پر وہ ڈرائیور جو رات بھر گاڑی چلاتا رہا تھا' اب سو رہا تھا۔ اس کی جگہ سیکرٹ سروس کا ایک خاص آدمی ڈرائیو کر رہا تھا۔ رات بھر چیف کا اسسٹنٹ میرے ساتھ رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی ملتان میں ختم ہوگئی تھی۔ گاڑی کے پچھلے حصّے میں آمنہ بھی سونے والی تھی۔ سب ہی کو نیند پوری کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ صرف میرے نصیب میں جاگنا تھا۔

جاگنا ضروری تھا۔ کوئی دشمن پُراسرار بن کر آئے تو نیند اُڑجاتی ہے۔ میری زندگی میں کتنے ہی دشمن پُراسرار انداز میں میری ٹیلی پیتھی کو چیلنج بھی کیا کرتے۔ ان کے دماغوں تک میں نہیں پہنچ سکتا۔ میرا جواب ہمیشہ ایک رہا کہ دنیا کا کوئی بھی انسان صرف خداوندکریم کے اسرار تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے برعکس ایک بندہ دوسرے بندے سے کبھی چھپ نہیں سکتا۔ خواہ وہ کتنی ہی غیرمعمولی صلاحیتوں کا مالک کیوں نہ بن جائے۔

اب خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی ہمارے لیے پُراسرار بن رہی تھی۔ مجھے اس کے لیے جاگنا تھا اور اس کے تعاقب میں رہنا تھا۔ تعاقب کرنے کا مقصد ہے کسی کے پیچھے پڑجانا اور میں اس تیسری ہستی کے پیچھے پڑگیا۔

وہ کون ہے؟ ہمارے موجودہ معاملات میں وہ کہاں سے چلی آئی؟ اب تک کہاں تھی؟ اگر ٹیلی پیتھی جانتی رہی تھی تو اس نے خود کو گمنام کیوں رکھا تھا؟ یوں تو اب بھی گمنام ہی تھی مگر پُراسرار بن کر ظاہر ہورہی تھی اور ظاہر بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا' جب بھی فرصت ملے گی' میں اطمینان سے سراغ لگاؤں گا۔ کوئی ایسا راستہ اختیار کروں گا جو مجھے اس پُراسرار ہستی کی طرف لے جاتا ہو۔ کسی اسرار تک پہنچنے کے لیے کسی بھید کو کھولنے کے لیے کافی عرصہ لگتا ہے، میرے پچھلے تجربات شاہد ہیں۔ اس ہستی نے دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں سے براہِ راست رابطہ قائم کیا ہوگا۔ ان سے نہ جانے کیسے معاملات طے کیے ہوں گے یا اسی لیے ان سربراہوں کے خاص ماتحتوں مثلاً کم کریزی اور مائخل شوف وغیرہ کا ساتھ دے رہی ہے۔

اس کے دماغ تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ میں تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کے دماغوں میں پہنچ کر انھیں ٹٹول کر دیکھوں۔ ان میں بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کا سربراہ کون تھا' یہ اب تک مجھے معلوم نہیں ہوسکا تھا لیکن اس تنظیم کے انسٹرکٹر کا نام واسکولائی تھا۔ جو روسی زبان بولتا تھا مگر انگریزی زبان بھی بول لیتا تھا۔ میں پہلے اسی کے دماغ کو ٹٹولنے لگا۔

اس سے پتا چلا کہ وہ کسی خیال خوانی کرنے والی ہستی کے متعلق نہیں جانتا ہے۔ وہ تو ایک انسٹرکٹر یا اتالیق تھا۔ اس سے تربیت حاصل کرنے والے دہشت گرد کہاں بھیجے جاتے ہیں' ان کے متعلق کیسی پلاننگ کی جاتی ہے' یہ اس کے بڑے جانتے تھے اور وہ اپنے بڑوں کو نہیں جانتا تھا۔

میں لی ہاروی ٹیررٹریننگ سینٹر کے سربراہ سائمن دی گریٹ کے دماغ میں پہنچ گیا۔ اس سے کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ آج سے دو دن پہلے ڈاک کے ذریعے اس کے پاس ایک پارسل پہنچا تھا۔ وہ کبھی ایسی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ کیونکہ ہزار دشمن تھے۔ کوئی پارسل کی صورت میں ٹائم بم ارسال کرسکتا تھا۔ اس کے ایک ماتحت نے اسے بہت دُور لے جاکر کھولا تو ایک کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر موصول ہوا۔ اس کے ساتھ تحریری

ہدایات بھی تھیں، جس میں بتایا گیا تھا کہ اسے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔

سائمن دی گریٹ نے ہدایات کے مطابق اسے آپریٹ کیا۔ ایک چھوٹے سے اسکرین پر لکھا ہوا نظر آیا۔ "ہیلو، سائمن دی گریٹ! اس وقت میں تمھارے دماغ میں موجود ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں فرہاد یا رسونتی ہوں۔ مجھے ٹیلی پیتھی جاننے والی تیسری ہستی کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنا پسند نہیں ہے' اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنی بڑی دُنیا میں ٹیلی پیتھی جاننے والی تیسری ہستی میں ہوں۔ میری حتی الامکان یہی کوشش ہوگی کہ میری شخصیت راز ہی رہے۔"

تم تمام دہشت گرد تنظیم کے سربراہ جس انداز میں رسونتی اور فرہاد کو اپنے جرائم کا مرتکب ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو' اس میں کسی حد تک بچکانہ پن ہے۔ اگر میں اس میں سچ مچ ٹیلی پیتھی کا رنگ بھر دوں تو رسونتی اور فرہاد کے خلاف جرائم کے ثبوت ملتے چلے جائیں گے۔

دوسری بات یہ کہ تمھاری مخالف دہشت گرد تنظیمیں جو کچھ کر رہی ہیں' ان کے تمام منصوبے، ان کے تمام راز تمھیں معلوم نہیں ہو سکتے۔ ایسا صرف میرے ذریعے ہو سکتا ہے۔"

سائمن دی گریٹ نے سوال کیا۔ "میں کیسے یقین کروں کہ تم رسونتی یا فرہاد نہیں ہو اور ہم سے کوئی لمبا فراڈ نہیں کر رہے ہو؟"

جواب ملا۔ "سانچ کو کیا آنچ۔ مجھے آزما کر دیکھ لو۔"

"ہاں، یہ آزمائش کا بہترین موقع ہے۔ اس وقت فرہاد کے ملک میں ہماری سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگر تم ہمارے آدمیوں کی مدد کرو اور اس ملک کے اہم راز چرا کر ہم تک پہنچاؤ تو یقین آجائے گا کہ تم کوئی تیسری خیال خوانی کرنے والی ہستی ہو۔"

کمپیوٹر کم ٹرانسیٹر کے ذریعے اسکرین پر تحریری جواب ملا۔ "صرف پاکستان میں ہی نہیں، دُنیا کے ہر ملک میں تمھارے آدمیوں کو میری مدد حاصل ہوگی لیکن کسی ملک کا راز چرانا میرے پروگرام میں شامل نہیں ہے، خواہ وہ پاکستان ہو یا کوئی اور ملک۔ ہاں، راز چرانے کے سلسلے میں تمھارے آدمیوں کی مدد کی جا سکتی ہے۔ ایسی چوریوں میں میری ذات براہِ راست ملوث نہیں ہوگی۔"

سائمن دی گریٹ نے کہا۔ "تمھارا جواب تحریر کی صورت میں موصول ہو رہا ہے اور تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ تم مرد ہو یا عورت؟"

"اس مخمصے میں نہ پڑو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔"

سائمن دی گریٹ نے پھر سوال کیا۔ "تمھاری گفتگو تحریر کے ذریعے کیوں ہوتی ہے جب کہ رسونتی اور فرہاد براہِ راست دماغ میں پہنچ کر بولتے ہیں؟"

"یہ میرا اپنا طریقۂ کار ہے۔ میں نے ٹیلی پیتھی کی عملی دنیا میں آنے سے پہلے اپنے چاروں طرف مضبوط حصار باندھ لیا ہے۔ اس طرح کوئی ٹیلی پیتھی جاننے والا میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

"تم اس کے عوض ہم سے کیا فائدے حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"جیسی خدمات حاصل کی جائیں گی، اسی کی مناسبت سے معاوضہ طلب کروں گی۔"

سائمن دی گریٹ نے کہا۔ "اگر مجھ سے فراڈ نہیں کیا گیا ہے تو آج کا دن میرے لیے بہت بڑی خوشی کا دن ہے۔ مجھے ٹیلی پیتھی کا سہارا ملے گا تو میں ساری دنیا کو جیت لوں گا۔ فی الحال میں تمھیں آزماؤں گا۔ پاکستان میں میرے آدمیوں کی مدد کرو۔ اس سلسلے میں تمھارے مطالبات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، میں ضرور پورے کروں گا۔"

میں نے سائمن دی گریٹ کے دماغ سے جو معلومات حاصل کیں، وہ بس اتنی ہی تھیں کہ وہ خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی کو نہیں جانتا تھا۔ اس کا رابطہ بھی ٹرانسیٹر اور کمپیوٹر کے ذریعے ہوتا تھا۔

دوسری معلومات یہ حاصل ہوئیں کہ وہ ابھی آزمائشی طور پر سائمن دی گریٹ کے آدمیوں کے لیے کام کر رہی تھی۔ یعنی ابھی ان کے درمیان اعتماد قائم نہیں ہوا تھا۔

الیامہ ٹی ٹی سینٹر کا پرنسپل بریگیڈیئر جنا تھن تھا۔ یہ وہی دہشت گرد تنظیم تھی جہاں سے جیکائی نے تربیت حاصل کی تھی۔ بریگیڈیئر جنا تھن کے دماغ نے بھی مجھے وہی بتایا جو سائمن دی گریٹ کے دماغ سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس خیال خوانی کرنے والی ہستی نے اس سے بھی اسی انداز میں رابطہ قائم کیا تھا۔ ایک اور دہشت گرد تنظیم کا سربراہ ماسٹر کِی تھا، جہاں کرم داد نے تربیت حاصل کی تھی۔ ماسٹر کِی یوگا کا ماہر تھا۔ کم کریزی کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کتنی دیر تک سانس روک سکتا ہے۔ ماسٹر کِی اس کا اُستاد ہے۔ اُستاد کتنی بار سانس روکتا ہوگا، اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ جب کم کریزی گلے میں پھندا لگا کر اور اپنے سینے پر سے کار گزار کر یوگا کے ذریعے زندہ سلامت رہ سکتا ہے تو اس کا استاد ماسٹر کِی کس قیامت کی صلاحیتیں رکھتا ہوگا' یہ وقت آنے پر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ میں ماسٹر کِی کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ البتہ اس کے دستِ راست جیکی وائز کے دماغ تک میری پہنچ تھی۔ اسی کے ذریعے میں نے تیسری ہستی کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ وہاں بھی وہی کچھ معلوم ہوا جو دوسری تنظیم کے سربراہوں کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا۔

اتنی چھان بین کے بعد یہ ایک بات تو صاف ہو گئی تھی کہ خیال خوانی کرنے والی صرف ایک ہی ہستی ہے جو ہر دہشت گرد تنظیم میں مختلف رول ادا کر رہی ہے اور ہر ایک سے مفادات حاصل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہی ہے۔ اس تیسری ہستی کا مقصد کیا تھا' وہ کیوں ایسا کر رہی تھی؛ یہ ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن جو کھیل میرے خلاف کھیلا جا رہا تھا وہ معلوم ہو گیا تھا۔

پہلے تو انھوں نے خواہ مخواہ ٹیلی پیتھی کا شوشہ چھوڑ کر مجھے بدنام کرنا چاہا تھا۔ بعد میں جب اس تیسری ہستی نے رابطہ قائم کیا تو اس جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن تمام دہشت گرد تنظیموں کا ایک مشترکہ مفاد اور مقصد یہ تھا کہ فرہاد جہاں کہیں بھی ہے اسے بے نقاب کیا جائے اور اس کام کے لیے تیسری خیال خوانی کرنے والی ان کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس نے تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فرہاد علی کو بہت جلد ڈھونڈ نکالے گی۔ پھر اسے چھپ کر رہنے کا موقع نہیں دے گی۔ میرا بھی یہی دعویٰ تھا کہ اسے جلد ہی بے نقاب کر دوں گا۔

ہم لاہور پہنچنے والے تھے۔ اس سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ رعونت جہاں اور عالی جناب کن حالات سے دوچار ہیں۔ عالی جناب کے گلے میں رعونت جہاں عرف رعونہ کا شاہکار حسن ہڈی کی طرح اٹک گیا تھا۔ وہ اس ہڈی کو اپنے گلے سے نکالنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ تھا ان میں کیونکہ اس بڑھاپے میں اتنی حسین عورت انھیں پھر کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ اس ہڈی کو نگلنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی تکلیف ان کے ماتحت افسروں کو ہو رہی تھی۔

پولیس، انٹیلی جنس اور دوسرے تمام چھوٹے بڑے افسران اس پریشانی میں تھے کہ کسی طرح عالی جناب کی عزت، شہرت اور ان کی سیاسی و سماجی شخصیت کا بھرم قائم رہ جائے۔ بہات اخبارات اور عوام تک نہ پہنچ جائے لیکن کوئی بلیک میل کر رہا تھا۔ بلیک میل کرنے والے کا مطالبہ تھا کہ رعونت جہاں کو عالی جناب کی زندگی سے دُور کر دیا جائے۔

اس کا مطالبہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ لوگ رعونت جہاں کے مخالف گروہ یعنی ماسٹر کی سینٹر اور الیامہ ٹی ٹی سینٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے کہ رعونت جہاں عالی جناب جیسی بڑی شخصیت کو اسیر کرے اور ان کی شریکِ حیات بن کر وہ تمام راز حاصل کرتی ہے جنھیں دوسرے ٹی ٹی سینٹر والے کبھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ رعونت جہاں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس کامیابی نے عالی جناب کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ ایک طرف اس کا حسن انھیں تسخیر کر رہا تھا تو دوسری طرف مخالف گروہ رعونت جہاں کو ان کی زندگی سے دُودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکنا چاہتا تھا۔ تیسری طرف یہاں کے ذمّے دار افسران بھی یہی چاہتے تھے مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی۔ وہ عالی جناب کو ان کے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر بھی وہ دبی دبی زبان سے کہتے تھے۔ "جنابِ عالی! یہ سب ٹیلی پیتھی کا فراڈ ہے۔ جو گمنام لوگ ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ... رعونت جہاں اور سرداراں نے کسی خاص مقصد کے تحت اپنے سیکریٹری کو قتل کیا تھا اور اس جُرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کا الزام فرہاد علی تیمور پر عائد کر رہے ہیں۔ اس قتل کی بھیانک واردات کو ٹیلی پیتھی کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔"

عالی جناب فرماتے تھے۔ "دنیا جھوٹ بول سکتی ہے لیکن رعونہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

پھر وہ دل میں کہتے تھے۔ جس کے منہ میں محبت کی زبان ہو اور جو مجھے والہانہ انداز میں چاہتی ہو' وہ بھلا کیسے جھوٹ بول سکتی ہے' کیسے دھوکا دے سکتی ہے؟"

ان کے ماتحت افسران ان کے دل کی بات سمجھ تو نہیں سکتے تھے لیکن انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ جب یہ کیس ختم ہوگا تو رعونت جہاں بیگم عالی جناب بن جائے گی۔ عالی جناب نے واردات کی دوسری ہی صبح بڑے بڑے افسران کا اجلاس طلب کیا تھا۔ انھیں اپنی کوٹھی میں بلایا تھا۔ پھر بند کمرے میں انھیں رازدارانہ طور پر مشورہ دیا۔ "کچھ بھی کرو یہ کیس چوبیس گھنٹے کے اندر ختم ہو جانا چاہیے۔"

جب کوئی بہت بڑی شخصیت قانون کا چہرہ بگاڑ کر اپنا کام نکالنا چاہتی ہے تو اس کے ماتحت افسران بھی اپنے ہاتھ پاؤں نکال لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑے افسر نے کہا۔ "جنابِ عالی! میں اپنا تبادلہ پنڈی کرانا چاہتا ہوں۔ آپ کی عنایت ہو گی تو میرا تبادلہ آسانی سے ہو جائے گا۔"

عالی جناب نے کہا۔ "درخواست لے آؤ۔ میں دستخط کر دوں

گا مگر میرا کام ہونا چاہیے "

ان کے یہاں اجلاس میں آنے والا ہر افسر موقع پاکر تنہائی میں ان سے پانچ منٹ کے لیے ملاقات کرتا تھا اور اپنی ضرورت پیش کرتا تھا۔ کوئی افسر اپنے سالے کو کسی اعلیٰ عہدے پر ترقی دلانا چاہتا تھا۔ کوئی اپنے بھائی یا بیٹے کو اپنے محکمے میں ملازمت دلانا چاہتا تھا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی ضرورت تھی اور وہ سب اچھی طرح جانتے تھے، اگر انھوں نے رعونت جہاں اور سرداراں کو اس کیس سے بری کر دیا تو عالی جناب کی آنکھ کے اشارے سے سب کے کام ہو جائیں گے۔

سیکریٹری کے قتل کو تاحال راز میں رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ بات اخبار میں آنے سے روک دی گئی تھی لیکن کوئی بلیک میل کرنے والا کہہ رہا تھا کہ اس کے پاس قتل کا ثبوت ہے اور یہ بھی ثبوت ہے کہ واردات کی رات جہاں لاش پڑی ہوئی تھی، وہاں عالی جناب بھی تشریف لائے تھے اور ایک کمرے میں رعونت جہاں سے بڑی رازدارانہ گفتگو کی تھی۔ اسے الزامات سے بری کرانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ یہ ساری باتیں بھی کسی نے ریکارڈ کر لی تھیں۔

عالی جناب کو پریشان دیکھ کر رعونت جہاں نے کہا "میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی لیکن یقین سے کہتی ہوں کسی نے ہماری باتیں ریکارڈ نہیں کی ہیں۔ یہ محض دھمکی ہے۔ اگر کوئی بلیک میل کرنے کے لیے آپ سے رابطہ قائم کرے تو اس سے آپ کیسٹ کا مطالبہ کریں۔ وہ اصل کیسٹ نہیں دے گا تو اس کی ڈپلی کیٹ تو آپ کے پاس پہنچا سکتا ہے "

پھر رعونت جہاں نے بڑی محبت سے عالی جناب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "محبت قربانی چاہتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ اپنی عزت، شہرت، مان اور مرتبہ میرے لیے قربان کر دیں۔ میں آپ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی جان دے سکتی ہوں "

عالی جناب اس کی انھی محبت بھری باتوں سے تڑپ جاتے تھے اور جواباً محبت سے کہتے تھے "بھئی رعونہ! تم اپنی جان دینے کی بات نہ کرو۔ تمھارے دم سے اب میرا دم ہے۔ جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو، مجھے لگتا ہے میری عمر پچیس برس کم ہو گئی ہے "

اتنے بڑے آدمی کے لیے قتل کی ایک واردات کو چھپا لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی لیکن ایک بلیک میلر درمیان میں آ گیا تھا، اس لیے قانونی طور پر رسمی کارروائی کی گئی۔ ایک بند کمرے میں عدالت قائم کی گئی۔ بلیک میل کرنے والے نے کہا "خواہ عدالت کیس قائم کرو لیکن رعونت جہاں کو عالی جناب کی زندگی سے نکال دو "

جواباً عالی جناب نے اس سے کیسٹ کی نقل طلب کی تھی۔ بلیک میلر نے کہا تھا "جس دن رعونت جہاں عالی جناب کی دلھن بننے جائے گی، اسی دن وہ کیسٹ پیش کیا جائے گا "

رعونت نے کہا "گمنام رہ کر بلیک میل کرنے والا محض فریبی ہے۔ اس کے پاس ہمارا کوئی کیسٹ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ فرہاد علی تیمور ہمارے ساتھ ہے۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں، فرہاد نے کہا ہے اگر کوئی عزت و آبرو سے مجھے اپنی دلھن بنائے گا تو وہ کبھی اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔ ہاں، اگر کوئی مجھ پر میلی نظر ڈالے گا تو اس کا انجام میرے سیکریٹری کی طرح ہو گا "

عالی جناب نے کہا "میرے اشاروں پر ناچنے والے افسران اس کیس کو توڑ مروڑ کر رکھ دیں گے۔ یہ کیس پھسپھسا ہو جائے گا۔ دوسرے فرہاد علی تیمور ہمارے ساتھ ہے تو پھر کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔ تقدیر نے تمھیں میرے نام لکھ دیا ہے اور میں تمھیں اپنا کر رہوں گا "

میں رعونت جہاں اور عالی جناب کے ان حالات کی روشنی میں پھر دہشت گرد مخالف تنظیموں کا ذکر کروں گا۔ جب ماسٹر کی اور الہامہ ٹی ٹی سینٹر والوں کو پتا چلا کہ مخالف دہشت گرد تنظیم کے افراد فرہاد کا نام لے رہے ہیں اور دعوے کر رہے ہیں کہ فرہاد ان کے ساتھ ہے تو انھوں نے اس تیسری پراسرار ہستی سے رابطہ قائم کیا اور پوچھا "کیا یہ درست ہے؟ "

اس نے کمپیوٹر کے ذریعے جواب دیا "پہلے درست نہیں تھا۔ بہرام علی ٹی ٹی سینٹر اور سائمن دی گریٹ کے جتنے آدمی پاکستان میں تخریب کاری کے لیے پہنچے ہیں وہ سب اپنے جرائم کو کسی نہ کسی طرح فرہاد سے منسوب کرتے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں، اس طرح فرہاد طیش میں آ کر ان کے خلاف اقدامات کرے۔ اس طرح وہ زیادہ عرصے چھپا نہیں رہ سکے گا پھر یہ کہ پاکستان میں فرہاد کی ساکھ بگڑ جائے گی۔ جب ہر طرف سے جرائم میں اس کا نام لیا جائے گا اور کچھ ایسے غیر معمولی واقعات ہوں گے، جن کا عملی طور پر ثبوت نہیں ملے گا تو یہی رائے قائم کی جائے گی کہ ایسی وارداتیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے ہو رہی ہیں تو ٹی ٹی سینٹر والوں کو دہرا فائدہ ہو گا۔ ایک تو ان کے آدمی قانون کی نظروں میں نہیں آئیں گے۔ دوسرے فرہاد سے چھیڑ چھاڑ سے اسے چین سے نہ بیٹھنے دینے کا عمل جاری رہے گا "

کمپیوٹر کے ذریعے اس تیسری ہستی نے کہا "تم سب کو یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ فرہاد نے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے ان سے دوستی کر لی ہے۔ وہ سچ مچ ان کا ساتھ دے رہا ہے "

ماسٹر کی نے کہا "میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ فرہاد اپنے ہی ملک میں تخریب کاروں کا ساتھ دے گا "

کمپیوٹر نے کہا "تمھارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ فرہاد کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس دنیا میں اب خیال خوانی کرنے والی ایک اور ہستی بھی ہے جو پراسرار طریقے پر کسی کے ساتھ رابطہ قائم کرتی ہے۔ اس نے یقیناً میرے دماغ تک پہنچنے کی کوشش کی ہو گی۔ ناکامی کی صورت میں اب وہی طریقہ کار اختیار کر رہا ہے جو میں کرتی آ رہی ہوں یعنی وہ بھی کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے بہرام ٹی ٹی سینٹر اور لی ہاروی سینٹر یعنی سائمن دی گریٹ وغیرہ سے رابطہ قائم کرتا ہے، اسی طرح جواب دیتا ہے جس طرح ابھی اسکرین پر لفظوں کی صورت میں میرا جواب نظر آ رہا ہے "

کمپیوٹر سے پوچھا گیا "وہ تمھارا طریقہ کار کیوں اختیار کر رہا ہے؟"

"وہ تم لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ میں تمھارے مخالف گروہ سے ملی ہوئی ہوں۔ اِدھر سے بھی مفادات حاصل کر رہی ہوں اور اُدھر سے بھی۔ اسے کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ وہ میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکا، اس لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے دوست یا دشمن مجھ پر کوئی اعتماد نہ کرے اور سب مجھے فراڈ سمجھتے رہیں۔ بہرحال میرا نقصان نہیں ہو گا۔ تم لوگ مجھ پر اعتماد کرو گے تو تمھارے کام آؤں گی۔ نہیں کرو گے تو دور رہ جاؤں گی لیکن زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر شاید دشمن بن کر بھی مل سکتی ہوں "

ماسٹر کی نے کہا "ہم تمھاری دشمنی نہیں چاہتے۔ دوستی بھی اس انداز میں چاہتے ہیں کہ تم سے ہمیں فائدہ حاصل ہو اور ہم سے تمھیں فائدہ حاصل ہوتا رہے۔ اگر اس دوران ہم سے کوئی فراڈ ہوا تو ہم سوچیں گے تمھارے خلاف کیا کر سکتے ہیں "

کمپیوٹر نے کہا "فرہاد مجھے لوگوں کی نظروں میں بے اعتماد بنانا چاہتا ہے۔ میں بھی اس کے خلاف کچھ ایسے ہی اقدامات کرنے جا رہی ہوں یعنی اپنے کمپیوٹر کے ذریعے میں خود کو کبھی رسوانتی ظاہر کروں گی اور موقع ملا تو فرہاد بن کر بھی اس کے نام سے فائدہ اٹھاؤں گی۔ اسے مختلف جرائم میں ملوث کرتی جاؤں گی۔ یوں سمجھ لو کہ میرے اور فرہاد کے درمیان ایک سرد جنگ ہے جو جاری رہے گی "

اب میں کمپیوٹر ٹیلی پیتھی کا ذکر کرنے کے بعد پھر رعونت جہاں اور عالی جناب کی طرف آ رہا ہوں۔ گزشتہ روز ایک بند کمرے میں عدالت قائم کی گئی تھی اور قتل کی اس واردات کی مکمل رپورٹ جج صاحب کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ جج صاحب نے تمام رپورٹ سننے کے بعد کہا "دنیا کی کوئی عدالت ٹیلی پیتھی کے عوامل کو تسلیم نہیں کرے گی۔ حالانکہ یہ علم ایک حقیقت ہے۔ ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جادو کے ذریعے بھیانک ... ت کی جا سکتی ہے اور جو شخص سحر زدہ ہو کر کوئی جرم کرتا ہے وہ قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ کسی نے اس پر سحر طاری کیا تھا تو پھر اس سحر طاری کرنے والے کو سزا دی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ موجودہ قتل کے کیس میں فرہاد علی تیمور کا ہاتھ ہے اور سرداراں بے قصور ہے اس پر محض سحر طاری کر کے اسے اپنا آلۂ کار بنایا گیا تھا تو پھر فرہاد علی تیمور کو اس عدالت میں پیش کرنا ہو گا "

سرداراں کی طرف سے وکیلِ صفائی نے کہا "فرہاد علی تیمور ایک سیلانی شخص ہے۔ وہ کب کہاں رہتا ہے، کوئی نہیں جانتا لیکن وہ اس عدالت میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنی حاضری پیش کر سکتا ہے "

"اگر یہ حاضری ٹیلی پیتھی کے مستحکم ثبوت کے ساتھ پیش کی گئی تو اسے تسلیم .... کیا جائے گا "

اس کے لیے رعونت جہاں کو پیش کیا گیا۔ رعونت جہاں نے کہا "جنابِ عالی! اس وقت میں دماغی طور پر حاضر ہوں اور اپنی زبان سے بول رہی ہوں لیکن میرے دماغ میں فرہاد علی تیمور موجود ہیں"

سرکاری وکیل نے جج کی اجازت سے کہا "بیگم رعونت جہاں کا بیان لیا جا چکا ہے۔ اس بیان میں شروع سے آخر تک صرف.. ٹیلی پیتھی کا رونا رویا گیا ہے۔ اب بھی یہ محترمہ یہی فرما رہی ہیں لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ فرہاد علی تیمور ان کے یا کسی اور کے
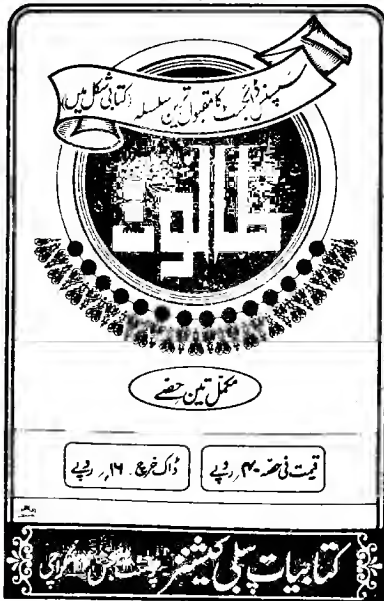
دماغ میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سب یوں سحر زدہ ہو کر بولنے آئے ہیں یا عمل کرنے آئے ہیں جیسے فرہاد علی نے سچ مچ انھیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے... "

بولتے بولتے وکیل کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ اپنا سر تھام کر خاموش ہو گیا۔ چند لمحے توقف کر کے اس نے کہا "معافی چاہتا ہوں۔ میری زبان اچانک ہی لڑکھڑا گئی تھی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ فرہاد علی تیمور فراڈ..."

فراڈ کہتے ہوئے ایک بار پھر اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ سنبھل کر بولا "نہیں، نہیں وہ فراڈ نہیں ہے۔ وہ کسی وقت بھی کسی کے دماغ میں پہنچ سکتا ہے اور اس وقت میرے دماغ میں پہنچ کر بول رہا ہے۔"

پھر وہ بھاری بھرکم لہجے میں کہنے لگا "محترم منصفِ اعلیٰ! میں فرہاد علی تیمور آپ سے مخاطب ہوں۔ میں عدالت کے وقار کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔ عدالت خواہ کھلی جگہ ہو یا بند کمرے میں، وہ انصاف کے تقاضے پوری کرتی ہے۔ آپ قانون کی زبان سے فیصلے کرتے ہیں لیکن بعض اوقات غلط ثبوت پیش کرنے اور قانون کو توڑنے مروڑنے کے بعد کیس کو پیش کیا جاتا ہے۔ آپ انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر اپنی دانست میں صحیح فیصلہ کرتے ہیں لیکن وہ غلط ثبوت کی روشنی میں غلط فیصلہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے ذمے دار آپ نہیں ہوتے۔"

"انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے جج صاحب اس سرکاری وکیل کو دیکھ رہے تھے، جو اب ملزمہ سرداراں کی حمایت میں بیان دے رہا تھا اور دعوے کر رہا تھا کہ اب وہ سرکاری وکیل نہیں بلکہ فرہاد علی تیمور ہے۔"

سرکاری وکیل کہہ رہا تھا "لیکن ٹیلی پیتھی ایک ایسا علم ہے، جس کے سامنے کوئی غلط ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔ میں اس علم کے ذریعے اس راز تک پہنچ جاتا ہوں جسے قانون کی نظر نہیں دیکھ سکتی اور قانون کے محافظ نہیں دکھا سکتے۔ جنابِ عالی! جو سیکریٹری قتل کیا گیا وہ ہمارے ملک کا دشمن تھا۔ ایک دہشت گرد تنظیم سے تعلق رکھتا تھا۔ جس سرکاری وکیل کی زبان سے میں ابھی بول رہا ہوں، یہ وکیل اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں چاہتا ہوں کہ عدالت مجھے ان کاغذی ثبوت کی روشنی میں فیصلہ دے۔ میں نے وہ کاغذات ملزمہ کے وکیل کے پاس پہنچا دیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتول سیکریٹری الباما ڈی سینٹر کا تربیت یافتہ تھا [illegible] تخریب کاری کے لیے آیا تھا۔"

سرداراں کے وکیل [illegible] لیکن جناب عالی [illegible] میرے پاس تو ایسا کوئی [illegible] نہیں ہے۔"

سرکاری وکیل نے کہا "میں نے تمھاری لاعلمی میں وہ کاغذات تمھاری فائل میں رکھوا دیے ہیں۔ اپنی فائل کھول کر دیکھو۔"

وکیل نے فوراً ہی اپنی فائل کو کھول کر تمام کاغذات کا جائزہ لیا۔ ایک کاغذ پر جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ الباما ڈی ٹی سینٹر۔ وہ اس دہشت گرد تنظیم کا سرٹیفکیٹ تھا۔ اس سرٹیفکیٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول سیکریٹری وہاں کا تربیت یافتہ ہے اور خاص طور پر تخریب کاری کے لیے پاکستان بھیجا جا رہا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کے ساتھ اور بھی کئی کاغذات تھے جو مقتول سیکریٹری کو ایک خطرناک مجرم ثابت کرتے تھے۔ وہ کاغذات جج صاحب کے سامنے پیش کیے گئے۔ ملزمہ سرداراں کے وکیل نے کہا "جناب! ان کاغذات کی روشنی میں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ سرداراں نے اسے قتل کیا ہے تو یہ ایک محبِ وطن خاتون ہے۔ اس نے پاک زمین سے ناپاک قدموں کے نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دیے لیکن میں پھر کہوں گا کہ سرداراں نے اسے قتل نہیں کیا۔ مسٹر فرہاد علی تیمور کو اس مقتول سیکریٹری کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کا بس یہی ایک راستہ سمجھ میں آیا کہ سرداراں کو آلۂ کار بنا کر اسے قتل کرا دیا جائے، ورنہ وہ عالی جناب جیسی شخصیت کو جانی نقصان پہنچا دیتا۔"

سرکاری وکیل نے کہا "میں فرہاد علی تیمور بول رہا ہوں۔ یہ درست ہے کہ اگر میں اسے وقت پر سرداراں کے ہاتھوں ہلاک نہ کراتا تو اس کے عزائم بہت ہی خطرناک تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اس سلسلے میں قانون کا سہارا کیوں نہیں لیا، یہ میری ہسٹری بتاتی ہے کہ میں قانون اور عدالت کے بکھیڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ جب بھی کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو انسانیت کے خلاف ہو، ملک و ملت کے خلاف ہو تو میں اپنے طور پر فیصلے کرتا ہوں اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ درست کیا۔ اب میں سرکاری وکیل کے دماغ سے جا رہا ہوں۔ ضرورت ہو گی تو پھر حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے میں اسی عدالت کے بند کمرے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں۔"

دوسرے ہی لمحے سرکاری وکیل نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے [illegible] جج صاحب کو دیکھا۔ پھر عدالت کے کمرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کہا "جنابِ والا! معافی چاہتا ہوں۔ میری دماغی حالت عجیب سی ہو گئی ہے۔ [illegible] محسوس کر رہا ہوں جیسے ابھی دماغی طور پر غیر حاضر رہا ہوں۔"

سرداراں کے وکیل نے اس کے پاس آ کر مسکراتے ہوئے [illegible] کہا "میں آپ کا شکر گزار ہوں [illegible] مخالفت کے باوجود ہماری حمایت میں بیان دیا ہے۔ آپ دماغی طور پر غیر حاضر تھے۔ اس کی گواہی منصفِ اعلیٰ بھی دے سکتے

ہیں کیونکہ آپ کے دماغ سے اب تک مسٹر فرہاد علی تیمور بول رہے تھے۔"

سرکاری وکیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ منصفِ اعلیٰ نے کہا "یہ میری زندگی کا سب سے عجیب کیس ہے۔ میری عدالت میں ایک ایسا قاتل پیش ہوا ہے جو جسمانی طور پر حاضر نہیں تھا مگر دوسرے کے دماغ سے اور زبان سے بول رہا تھا۔ اگرچہ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مقتول ایک خطرناک مجرم، دہشت گرد، اور تخریب کار تھا لیکن فرہاد علی تیمور نے قانون کو ہاتھ میں لے کر ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے، اسے چاہیے تھا کہ وہ جسمانی طور پر عدالت میں حاضر ہوتا۔ میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے فرہاد علی تیمور کو نیک مشورہ دوں گا کہ وہ میری عدالت میں حاضر ہو جائے۔ چونکہ اس نے ملک و ملت کے مفاد میں ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے اسے ہلکی سی سزا دی جائے گی تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں۔ میں کل تک کے لیے عدالت برخاست کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ فرہاد علی تیمور کو کل یہاں بہ نفسِ نفیس پیش کیا جائے گا۔"

میں یہ معلومات حاصل کرتے ہی سعید احمد صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ انھوں نے پوچھا "کیا تم لاہور پہنچ گئے ہو؟"

"ابھی میں ساہیوال کے قریب ہوں۔ میرا سفر جاری ہے۔ آپ ایک ضروری بات سن لیں۔"

میں نے انھیں رعونت جہاں اور عالی جناب کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ پچھلے دن جو بند کمرے میں عدالت قائم ہوئی تھی، اس کی پوری رپورٹ سنائی۔ انھوں نے کہا "یہ خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی ہم سب کے لیے مصیبت بن جائے گی۔"

"میں نے اسی لیے آپ کو مخاطب کیا ہے۔ آپ محتاط رہیں۔ سیکرٹ سروس کے چیف کو بھی سمجھا دیں۔ وہ اب کسی سے گفتگو نہ کریں۔ کچھ عرصے تک گونگے بنے رہیں۔ آپ گھر میں سلمیٰ سے بوقتِ ضرورت گفتگو کر لیا کریں۔ بہتر یہ ہو گا کہ سلمیٰ سے بھی تحریر کے ذریعے گفتگو ہو۔"

"لیکن فرہاد! یہ کب تک ہوتا رہے گا؟"

"میں کوشش کروں گا، جلد سے جلد اس تیسری ہستی کے دماغ تک پہنچ جاؤں۔ اس کے بعد آپ لوگوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ عالی جناب کے چاروں طرف جو دہشت گرد [illegible] ہیں، اسے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ فی الحال تو میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہوں گا تو وہ خیال خوانی کرنے والی ہستی میرے دماغ میں پہنچ جائے گی۔"

"فی الحال آپ خاموش رہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔ اس وقت دس بج رہے ہیں۔ بند کمرے میں عدالت قائم ہو چکی ہو گی۔ میں جا رہا ہوں۔ وہاں اپنے طور پر کارروائی کروں گا۔ آپ کو ان حالات سے اس لیے باخبر رکھا ہے کہ آپ کے آدمی رعونت جہاں اور سرداراں وغیرہ پر کڑی نظر رکھیں۔ میں جلد ہی بتاؤں گا کہ ان دونوں کے علاوہ وہاں دہشت گرد تنظیم کے اور کتنے لوگ موجود ہیں۔ فی الحال خدا حافظ۔"

میں اس بند کمرے کی عدالت میں پہنچ گیا۔ وہاں منصفِ اعلیٰ کے علاوہ سرداراں اور رعونت جہاں موجود تھیں۔ سرداراں کا وکیل اور سرکاری وکیل بھی تھا۔ جہاں رعونت جہاں ہوتی، وہاں عالی جناب کیسے نہ ہوتے۔ وہ بھی موجود تھے۔ اس کمرے میں زیادہ افراد کی گنجائش نہ ہونے کے باوجود پولیس، انٹیلی جنس اور انفارمیشن کے کچھ افسران اپنے بیان اور گواہی دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

جب میں پہنچا تو سرداراں کا وکیل کہہ رہا تھا "جنابِ عالی! فرہاد علی تیمور صاحب یہاں بہ نفسِ نفیس حاضر ہونے سے قاصر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے دشمن موجود ہیں۔ وہ لاہور میں موجود ہوتے تب بھی اس بند کمرے میں نہیں آ سکتے تھے۔ دشمن انھیں ان کی پناہ گاہ سے نکالنے کے لیے سو طرح کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے جو بلیک میلر رعونت جہاں اور محترم عالی جناب کو بلیک میل کر رہا ہے، اس کی چال یہی ہو کہ کسی طرح فرہاد علی تیمور یہاں حاضر ہو جائے تاکہ وہ اسے گولی مار سکے۔ لہٰذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ وہ فرہاد کی حاضری پر اصرار نہ کرے۔ اس میں اس کی جان کا خطرہ ہے۔"

سرکاری وکیل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "جنابِ عالی! کل میں نے آپ کے سامنے جانے کیا کچھ کہا، اس کے بعد سخت پریشان رہا، سوچتا رہا کہ میں دماغی طور پر کس طرح غائب رہا تھا۔ یہ تو مجھے احساس تھا کہ میں کچھ کہہ رہا ہوں لیکن جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہاں قانونی نکتہ یہ ہے کہ کل بھی میں نے اس عدالت میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا تھا اور اگر آج بھی فرہاد قابض ہو جائے تو یہ سرکاری وکیل اپنے طور پر کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ اس طرح قانون اور انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکیں گے۔ اگر مسٹر فرہاد علی تیمور میرے دماغ پر قابض ہونا چاہتے ہیں تو انھیں اس قانونی نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ میرے یا کسی سرکاری وکیل کے بغیر کسی ملزم یا ملزمہ کی حمایت میں یکطرفہ فیصلہ نہیں ہو سکتا۔"

منصفِ اعلیٰ نے کہا "آپ کا یہ قانونی نکتہ بہت اہم ہے۔ اگر سرکاری وکیل دماغی طور پر حاضر رہ کر اپنے نکتۂ نظر کو پیش نہ کر سکے تو پھر عدالتی کارروائی ادھوری رہ جاتی ہے۔ میں فرہاد علی تیمور سے

کہوں گا کہ وہ عدالت میں اپنی حاضری کا ثبوت پیش کرے اور سرکاری وکیل کے دماغ میں آکر اس کی زبان کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان نہ کرے۔"

سرداراں کے وکیل نے کہا "اگر اجازت ہو تو فرہاد علی تیمور میری زبان سے اپنی حاضری کا ثبوت پیش کرسکتا ہے۔"

سرکاری وکیل نے کہا "مجھے اعتراض ہے۔ مسٹر فرہاد کو یہاں کسی ایسے شخص کے دماغ میں آنا چاہیے جس کا تعلق موجودہ کیس سے نہ ہو۔"

چند سیکنڈ کے بعد ہی ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا "محترم منصفِ اعلیٰ! میں فرہاد علی تیمور اس سپاہی کی زبان سے بول رہا ہوں۔"

حالانکہ میں اس کی زبان سے نہیں بول رہا تھا۔ چپ چاپ خیال خوانی کے ذریعے عدالت میں ہونے والا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے سپاہی کے ذریعے یہ سنا تو فوراً اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تیسری خیال خوانی کرنے والی ہستی کوئی حماقت کرے گی تو میں اسے فوراً اپنی گرفت میں لے لوں گا۔

اس سپاہی کے دماغ میں جانے کے بعد کیا ہوا، یہ میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے میں اس بات کی وضاحت کردوں کہ کسی کے بھی دماغ میں مختلف سوچ کی لہروں کا عمل کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔

میں اس سے پہلے بھی یہ بیان کرچکا ہوں کہ انسان کا دماغ ایک تاریک خانہ ہے۔ اس تاریک خانے کے اندر اور کئی خانے ہیں جو بہت دور تک گہرائی میں چلے گئے ہیں، جسے ہم دماغ کی تہہ، لاشعور اور تحت الشعور وغیرہ کہتے ہیں۔ فی الحال اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ دماغ کا خانہ تاریک ہوتا ہے۔ سوچ کی لہریں اندھی ہوتی ہیں۔ جو لوگ یوگا کے ماہر ہوتے ہیں ان کی سوچ کی لہریں بہت حسّاس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے، رسونتی کے، ہم کرینزی اور ماسٹر کی وغیرہ کے دماغ میں کوئی اجنبی سوچ کی لہر پہنچے تو وہ فوراً ہی چونک جاتے ہیں اور اپنی سانس روک لیتے ہیں۔

میں جس سپاہی کے دماغ میں پہنچا وہ یوگا کا ماہر نہیں تھا۔ ورنہ میری سوچ کی لہروں کو محسوس کرلیتا یا مجھ سے پہلے جو سوچ کی لہریں اس کے دماغ میں آئی تھیں اور اس سپاہی کی اپنی سوچ میں جذب ہوکر اس کی زبان سے بول رہی تھیں، وہ سپاہی انہیں ضرور محسوس کرلیتا لیکن وہ بے حس معمول کی طرح تھا۔ میں اس کے دماغ میں پہنچ کر خاموش تھا۔ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی کی سوچ کی ہلکی سی لہر بھی مجھے مل سکتی ہے یا نہیں لیکن وہ چالاک تھی۔ اپنی سوچ کی لہروں کو لے کر کسی کے دماغ میں نہیں پہنچتی تھی۔ جس کے دماغ میں پہنچنا ہوتا پہلے اس کے لب و لہجے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے بعد اس کی سوچ کی لہر بن کر آتی تھی۔ اس طرح میں اس سپاہی کے دماغ میں صرف اسی کی سوچ کو پڑھ رہا تھا اور وہ سوچ تیسری ہستی کی بھی ہوسکتی تھی۔ بہر حال میں خاموش تماشائی بنا انتظار کر رہا تھا کہ اس سے کوئی غلطی ہو جائے۔

وہ سپاہی کہہ رہا تھا "محترم منصفِ اعلیٰ! میں نے کل فرہاد علی تیمور کی حیثیت سے مقتول سیکریٹری کے خلاف اہم ثبوت پیش کیا تھا۔ خواہ میں سرکاری وکیل کے دماغ میں رہوں یا اس سپاہی کے دماغ میں۔ عدالت کو ٹھوس ثبوت دیکھنا چاہیے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔"

میں نے فوراً ہی رسونتی کو مخاطب کیا اور کہا "فوراً میرے پاس چلی آؤ۔"

وہ پہنچ گئی۔ میں نے کہا "میں ایک سپاہی کے دماغ میں ہوں۔ اس کی آواز سن رہا ہوں۔ تم بھی اس کی آواز سن کر چلی آؤ۔"

اس نے یہی کیا۔ چند لمحوں بعد ہم اس کے دماغ سے نکل آئے۔ میں نے کہا "میں دوسری طرف مصروف رہوں گا۔ تم سپاہی کے دماغ میں رہو۔ وہ خیال خوانی کرنے والی تیسری ہستی اسے اپنا معمول بنائے ہوئے ہے۔ اس کی سوچ کے مطابق اس کی زبان سے بولتی جارہی ہے۔ ہوسکتا ہے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو اور تم اسے گرفت میں لے سکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے رسونتی کو اس کے دماغ میں چھوڑ دیا۔ پھر سرکاری وکیل کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ ایک میز پر جھکا ہوا کرسی پر بیٹھا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ایک دم سے اس کے دماغ پر قابض ہو گیا۔ وہ اپنی فائل سے ایک سادا کاغذ نکال کر قلم سے لکھنے لگا "ایڈوکیٹ حسن علی رضوی! میں اس وقت فرہاد علی تیمور تمہارے ہاتھ سے یہ مختصر سا بیان لکھ رہا ہوں۔ ہاتھ تمہارا ہے لیکن تحریر میری ہے۔ میری تصویر، میری آواز، میری تحریر اور میری پوری ہسٹری شیٹ دنیا کی ہر سیکرٹ سروس میں اور دنیا کی ہر خطرناک تنظیم کے دفاتر میں موجود ہے۔ آپ اس تحریر کا موازنہ میری تحریر سے کرا سکتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو سیکرٹ سروس کے دفاتر میں میرا ریکارڈ میری تحریر کے ساتھ مل جائے گا۔

جناب حسن علی رضوی صاحب! کل آپ کے ساتھ اس عدالت میں جو کچھ ہوا اس میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔ میں آپ کے دماغ میں موجود نہیں تھا۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ میرے ملک کی ایک عدالت کے وقار کو ٹھیس پہنچائی جارہی ہے۔ اسے تماشا بنایا جارہا ہے تو میں اپنا قومی فرض سمجھ کر آپ کے پاس بیان دینے حاضر ہو گیا ہوں۔

جناب رضوی صاحب! اس وقت آپ تنہا نہیں ہیں۔ آپ کے ساتھ صرف فرہاد نہیں ہے، رسونتی بھی ہے۔ آپ پورے اعتماد سے اٹھ کر اعلان کریں کہ ہم دو ٹیلی پیتھی جاننے والے آپ کے ساتھ ہیں۔ کل جس ہستی نے آپ کو دماغی طور پر فریب کیا تھا، آج وہ آپ پر کوئی ہتھکنڈا استعمال کرکے دکھائے۔

میرا اتنا ہی تحریری بیان کافی ہے۔ باقی حالات کے مطابق میں اور رسونتی اس عدالت میں موجود رہ کر آپ کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ فقط، راقم الحروف، فرہاد علی تیمور۔"

میں نے سرکاری وکیل حسن علی رضوی کو دماغی طور پر آزاد کردیا۔ وہ ذرا سا چونکے۔ پھر اس خط کو دیکھنے لگے جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا لیکن وہ ان کے ہاتھ کی تحریر نہیں تھی۔ وہ پڑھتے جارہے تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا مگر خوش ہو رہے تھے۔ پھر انھوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرا تحریری بیان اٹھاتے ہوئے کہا "جنابِ والا! کل سے اب تک ٹیلی پیتھی کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب فراڈ ہے۔ میں اسے ثابت کرنے کے لیے آپ کے سامنے فرہاد علی تیمور کا یہ تحریری بیان پیش کر رہا ہوں۔"

اس نے وہ کاغذ جج صاحب کے سامنے لے جاکر رکھ دیا۔ وہ اسے پڑھنے لگے۔ پھر انھوں نے کہا "اس خط نے کیس کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا ہے بشرطیکہ یہ مسٹر فرہاد علی تیمور کی تحریر ہو۔ میں انٹیلی جنس کے افسرِ اعلیٰ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے دفتر سے رابطہ قائم کریں اور فرہاد علی تیمور کا ریکارڈ نکال کر اس تحریر کا موازنہ کریں۔"

انٹیلی جنس کے افسرِ اعلیٰ نے آگے بڑھ کر جج صاحب سے میرا تحریری بیان لے لیا اور اس بیان کی وصولی کی ایک رسید لکھ دی۔ ایڈوکیٹ حسن علی رضوی نے کہا "جنابِ عالی! اس تحریر کا موازنہ تو ہوتا ہی رہے گا لیکن یہ ثابت ہوچکا ہے کہ کل میرے ساتھ ظلم ہوا۔ میرے دماغ پر کوئی تیسری ہستی قابض رہی۔ اب جب کہ فرہاد علی تیمور اور مادام رسونتی میرے ساتھ ہیں تو میں اس تیسری ہستی کو چیلنج کرتا ہوں کہ آج وہ مجھے بیان دینے سے روک دے۔"

اس نے آگے بڑھ کر سرداراں کے وکیل کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا پھر گھوم کر کہا "میں یقین سے کہتا ہوں فرہاد علی تیمور نے ملزمہ سرداراں کو ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنا آلۂ کار نہیں بنایا۔ اور نہ ہی اس قتل کے کیس میں فرہاد علی تیمور کا ہاتھ ہے۔ سرداراں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر سیکریٹری کو قتل کیا تھا۔ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو کل میرے دماغ پر قابض رہنے والی وہ پُراسرار ہستی آج مجھے میرے بیان سے پھیر دینے کی جسارت کرے۔"

وہ چپ چاپ ہو کر عدالت میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر سرداراں کے وکیل سے کہا "بلاؤ، اپنے اس جعلی فرہاد کو جو کل سے ہمارا اور عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہا تھا۔"

اس کے چیلنج کے جواب میں وہ تیسری پُراسرار ہستی اپنی ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی۔ وہ کسی دوسرے کی سوچ میں جس طرح پہلے آتی تھی، اب بھی آسکتی تھی۔ ہم اسے گرفت میں نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن پتا نہیں، اس میں کیا کمزوری تھی کہ وہ ہماری موجودگی کا علم ہوتے ہی خاموش ہو گئی تھی، جیسے وہاں سے جا چکی ہو۔ حالانکہ ہم سمجھ رہے تھے، وہ موجود ہوگی لیکن یہ کبھی ظاہر نہیں ہونے دے گی کہ وہ... کس کے دماغ میں ہے۔ چونکہ وہ خود کو ظاہر نہیں کر رہی تھی، اس لیے رعونت جہاں اور سرداراں کے حق میں کسی کے ذریعے کچھ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ ایڈوکیٹ حسن علی رضوی نے کہا "جنابِ والا! روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں مکھیاں حاضر ہوئیں۔ انھوں نے فریاد کرتے ہوئے کہا جب بھی ہم کہیں جاکر بیٹھتی ہیں تو ہوا آکر ہمیں اڑا دیتی ہے۔ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے اور ہوا کے ظلم کا محاسبہ کیا جائے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا، ہوا کو حاضر کیا جائے۔

ان کے حکم کے مطابق جب ہوا دربار میں حاضر ہوئی تو مکھیاں اُڑ گئیں۔ جنابِ عالی! وہ ایک مکھی تھی جو کل سے میرے دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آج فرہاد علی تیمور اور مادام رسونتی کے آتے ہی وہ اُڑ چکی ہے۔ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ آپ کی یہ عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہر طرح کے سحر سے آزاد ہے۔"

سرداراں کے وکیل نے کہا "یہ ہمارے یہ وکیل موصوف کچھ زیادہ ہی بول رہے ہیں اور یہ بھول چکے ہیں کہ کل جو کچھ انھوں نے کہا اور اس کے نتیجے میں مقتول سیکریٹری کے خلاف جو دستاویزی ثبوت پیش کیے وہ عدالت میں موجود ہیں۔ اس ثبوت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔"

ایڈوکیٹ رضوی صاحب نے کہا "بے شک انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مقتول سیکریٹری ایک دہشت گرد تنظیم سے تعلق رکھتا تھا لیکن اسے کن حالات میں قتل کیا گیا؟ سرداراں نے اسے کیوں قتل کیا؟ کیا سرداراں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قانون کو ہاتھ میں لے؟ جب کہ محترم عالی جناب جیسی شخصیت سے اس کی اچھی خاصی شناسائی تھی۔ وہ محترم عالی جناب سے قانونی امداد حاصل کرسکتی تھی، پھر اس نے کیوں اسے قتل کیا؟"

وکیلِ صفائی نے کہا "میری مؤکلہ ایک محبِّ وطن خاتون ہے۔ اسے وطن کا ایک دشمن نظر آیا۔ اس نے جوش اور جذبے میں اسے قتل کردیا۔ بے شک قانون کو ہاتھ میں لیا لیکن وطن دوستی کے جذبے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے لیے ویسی ہی ہلکی سزا تجویز کی جائے، جو کل فرہاد علی تیمور کے لیے جنابِ والا نے تجویز کی تھی۔"

میں نے حسن علی رضوی سے چپکے سے کہا "اب آپ..."

سے جو الفاظ ادا ہوں گے، وہ میری مرضی کے مطابق ہوں گے۔ آپ ذہنی طور پر حاضر رہ کر اسے سنتے رہیں گے۔"

دوسرے ہی لمحے میں نے ایڈووکیٹ رضوی صاحب کی زبان سے کہا "جناب والا! بات یہیں ختم نہیں ہوتی کہ سرداراں نے وطن دوستی کے جذبے سے ایک ملک دشمن تخریب کار کو ختم کیا بلکہ اس کے بعد بھی آگے بہت کچھ ہے اور وہ یہ کہ سرداراں اور رعونت جہاں بھی ایک دہشت گرد تنظیم سے تعلق رکھتی ہیں، میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ مجھے تھوڑی سی مہلت دی جائے۔ میں ان کے خلاف ایسے ہی دستاویزی ثبوت پیش کروں گا جو مقتول سیکریٹری کے سلسلے میں پیش کیے جا چکے ہیں۔"

رعونت جہاں پریشان ہو کر کبھی وکیل صفائی اور کبھی عالیجناب کو دیکھنے لگی۔ وہ سخت آزمائشی حالات میں بھی اپنے دماغ کو حاضر رکھنا اور حاضر دماغی سے فیصلہ کرنا جانتی تھی لیکن یہ بات اس کے لیے پریشان کن تھی کہ فرہاد علی تیمور اور رسونتی پیچ پیچ عدالت میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے حاضر ہو گئے ہیں اور اس کے خلاف بڑی مضبوط .... محاذ آرائی ہو رہی ہے۔

ایڈووکیٹ حسن علی رضوی صاحب نے کہا "اگر آپ مجھے تھوڑی سی مہلت دیں گے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان... دہشت گرد خوبصورت بلاؤں کے خلاف ٹھوس ثبوت پیش کروں گا اور جب مجھے مہلت دی جائے گی تو قانون کے مطابق رعونت جہاں کو بھی کڑی نگرانی میں رکھنا لازمی ہو گا۔ میں اس سلسلے میں عالی جناب سے درخواست کروں گا کہ جب تک رعونت جہاں کے خلاف ثبوت فراہم نہ کروں، اس وقت تک انھیں ایسی مشتبہ عورت سے ملاقات کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔"

وہ آگے بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن میں سن نہ سکا۔ اچانک ہی میرے قریب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ خیال خوانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ہماری تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی گاڑی اچانک رکتے رکتے دوسری طرف گھوم گئی تھی۔ آمنہ پچھلی سیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہہ رہی تھی "بابر کیا ہو گیا؟ فوراً اسکرین پر دیکھو، باہر نہ نکلنا۔"

میں نے بٹن آن کیا۔ اسکرین پر گاڑی کے سامنے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑی جس رخ پر جا رہی تھی، اس رخ سے سڑک پر دائیں طرف مڑ گئی تھی یعنی اب سڑک کا اگلا اور پچھلا حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے کھیت ہی کھیت تھے اور گھنے درخت نظر آ رہے تھے۔

میں نے اسے آف کر کے دوسرا بٹن دبایا۔ اب پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ پیچھے بھی دور تک ویسے ہی کھیت اور گھنے درخت نظر آنے لگے۔ میں نے سر اٹھا کر کھڑکی کے شیشوں کے پار دائیں بائیں دیکھا۔ آس پاس ایک انسان تو کیا، ایک جانور بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھماکے سے پتا چل گیا تھا کہ ہماری گاڑی کے ایک پہیے پر گولی ماری گئی ہے۔ گولی مارنے والا ایک ہو گا یا کئی ہوں گے اور وہ سب چھپے ہوئے ہوں گے۔

آمنہ نے پوچھا "کچھ نظر آیا؟"

"نہیں، چاروں طرف ویرانی ہے۔ گولی مارنے والے دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔"

میں نے ایک اور بٹن کو دبایا۔ سیٹ کی پشت پیچھے دھنس چلی گئی۔ آمنہ نظر آئی۔ وہ آگے بڑھ کر میری سیٹ پر آ گئی۔ میں نے سامنے والی عارضی دیوار بھی نیچے کر دی۔ ڈرائیور نے پوچھا "اب کیا کیا جائے؟ پہیہ بدلنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔"

میں نے کہا "ذرا چپ رہو اور مجھے سوچنے دو۔"

میں چپ رہ کر رسونتی کے پاس پہنچا اور اسے بتایا "میں جس جگہ ہوں، وہاں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ تم ایڈووکیٹ رضوی صاحب کے پاس موجود رہو۔ کوئی خاص بات ہو تب مجھے اطلاع دینا۔"

میں پھر دماغی طور پر اپنی گاڑی میں حاضر ہو گیا۔ ہماری گاڑی سڑک پر ترچھی کھڑی ہوئی تھی۔ ہائی وے پر اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ابھی دو گاڑیاں ہمارے پاس سے گزر گئی تھیں۔ انھوں نے ہماری طرف دیکھا مگر ہم اپنی سوچ میں تھے۔ انھیں مخاطب نہ کر سکے، نہ ہی انھوں نے ہماری طرف زیادہ توجہ دی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا "کوئی گاڑی گزرے تو اسے رکنے کے لیے کہنا۔ اسی طرح دو چار گاڑیاں ہمارے آس پاس رک جائیں گی۔ فائرنگ کا خطرہ کم ہو گا اور تم باہر جا کر پہیہ تبدیل کر سکو گے۔"

اسی وقت پاس والی سیٹ پر رکھے ہوئے کمپیوٹر ٹرانسمیٹر سے اشارہ موصول ہوا۔ میں نے اسے اٹھا کر آپریٹ کیا۔ اسکرین کو آن کر کے جواب موصول ہونے والے بٹن کو دبایا۔ اس پر لکھا ہوا تھا "بابر! آس پاس سے گزرنے والی گاڑیوں کو روکنے کی حماقت نہ کرنا ورنہ ہینڈ گرینیڈ پھینکے جا سکتے ہیں۔ اس طرح مسافر بسوں کو اور دوسری گاڑیوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر انھیں نقصان پہنچانا چاہتے ہو تو ایسا کر دیکھو۔"

اسکرین پر سے وہ فقرے مٹ گئے۔ پھر دوسرے فقرے ابھرتے چلے گئے۔ اب وہاں لکھا تھا "میں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں، تم گاڑی سے نکل کر ایک فرلانگ تک کھیتوں میں جاؤ گے تو تمھاری طرف کوئی فائر نہیں کرے گا۔ انسپکٹر علی مختار میمن کا آخری خط اور فائلوں کے تمام ضروری کاغذات اپنے پاس رکھو اور گاڑی

سے نکل پڑو۔ میں صرف آدھے منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔"

میں نے سوال کا بٹن دبایا۔ پھر کہا "مہلت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کاغذات ہمیشہ میرے پاس رہتے ہیں لیکن میرا گاڑی سے نکل کر کھیتوں میں ایک فرلانگ تک جانا کیوں ضروری ہے؟"

میں نے جواب موصول ہونے والے بٹن کو دبایا۔ پھر لفظوں کی صورت میں جواب ملنے لگا "میں زیادہ بحث نہیں کروں گی۔ ابھی دو طرفہ مصروفیات میں گھری ہوئی ہوں۔ ایک بند کمرے کی عدالت سے نکل کر آئی ہوں۔ پھر وہاں پہنچنا ہے۔ میں کہتی ہوں، فوراً نکلو ورنہ اس گاڑی کے ساتھ تم سب تباہ ہو جاؤ گے۔"

آمنہ نے میرے بازو کو تھام کر کہا "باہر تو نکلو، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

پھر اسکرین پر الفاظ بدل گئے۔ اب وہاں لکھا ہوا تھا۔ "مجھے ضرور ساتھ لے چلنا۔ یہاں نہ چھوڑنا۔ کھیل تو اب شروع ہو رہا ہے۔"

میں نے ناگواری سے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو دیکھا۔ اسے آف کیا پھر اسے آمنہ کے حوالے کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اب بھی دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا "جب ہم دور نکل جائیں تو گاڑی سے نکل کر پہیہ تبدیل کرنا اور گاڑی لے جانا۔ ہم کسی طرح لاہور پہنچ جائیں گے۔"

ڈرائیور کے پاس بیٹھے ہوئے سیکرٹ ایجنٹ نے گاڑی سے نکل کر کہا "مجھے حکم دیا گیا ہے، میں کسی حال میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ جب کہ اہم کاغذات آپ کے ساتھ ہیں۔"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا "یہ ٹرانسمیٹر نکالو اور اپنے چیف سے رابطہ قائم کرو۔ میں ان سے کہہ دوں گا کہ اپنی مرضی سے تنہا جا رہا ہوں۔ مجھے کسی سیکرٹ ایجنٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن ایسا کہتے کہتے رک گیا۔ خیال آیا، کمپیوٹر والی یقیناً آمنہ، یا اس سیکرٹ ایجنٹ کے دماغ میں ہو گی۔ ادھر میں نے سعید احمد اور سیکرٹ سروس کے چیف کو منع کیا ہے کہ وہ کسی کے سامنے زبان نہ کھولیں۔ ٹرانسمیٹر کے ذریعے مجھ سے گفتگو ہوتی تو ان کی آواز کمپیوٹر والی تک پہنچ جاتی۔

میں نے بے بسی سے سیکرٹ ایجنٹ کو دیکھا۔ پھر کہا "اگر اپنے بڑوں کے حکم سے مجبور ہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

میں، آمنہ اور وہ ایجنٹ تینوں وہاں سے چل پڑے۔ کھیتوں میں آئے اور تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے ایک طرف جانے لگے۔ میرے دونوں ساتھیوں کے پاس ریوالور تھے۔ میں نہتا تھا۔ اگرچہ ایسے وقت ضرور کوئی ہتھیار رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا، جب دو کے پاس ریوالور ہیں تو انھی سے کام چلاؤں گا۔ ان کے دماغوں میں پہنچ کر اپنی مرضی سے فائرنگ کراؤں گا اور دشمنوں کو باتیں کرتے رہنے پر مجبور کرتا رہوں گا۔

اس کمپیوٹر والی نے درست کہا تھا، ایک فرلانگ تک مجھ پر کوئی فائر نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود ہم کھڑی فصل کے درمیان سے گزرتے جا رہے تھے تاکہ فائرنگ کرنے والوں کو نظر نہ آ سکیں۔ میں نے چلتے چلتے گھوم کر دیکھا۔ ہائی وے بہت دور رہ گیا تھا۔ ہماری گاڑی نظر آ رہی تھی۔ وہاں کئی لوگ پہنچ چکے تھے۔ میں نے ڈرائیور کے دماغ میں چھلانگ لگائی۔ پتا چلا، ہمارے دشمن ہمیں ادھر کا رخ کرنے کے بعد گاڑی کے پاس پہنچ گئے ہیں اور تلاشی لے رہے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں نے وہ اہم کاغذات اسی گاڑی میں چھوڑ دیے ہیں یا اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔

میں نے ڈرائیور کے ذریعے ان میں سے ایک کے دماغ میں پہنچ کر معلوم کیا۔ وہ ڈرائیور یا گاڑی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ صرف اپنے مطلب کی چیز تلاش کر رہے تھے۔ نہ ملنے پر وہاں سے ہمیں گھیرنے چلے آتے۔

ہم تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اچانک ہی ایک طرف سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ہم ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ فائرنگ کی آواز گونجتی رہی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ ہم اپنی جگہ سے اٹھ کر جھک جھک کر چلنے لگے۔ حتیٰ کہ کھیتوں سے نکل گئے۔ اب دور دور تک گھنے درخت تھے اور ہموار سا میدان تھا۔ پھر اسی وقت فائرنگ ہوئی۔ اس بار فائرنگ کی سمت کا اندازہ کرتے ہوئے آمنہ اور سیکرٹ ایجنٹ نے متواتر فائرنگ کی۔ پھر ہم دوڑتے ہوئے ایک بڑے سے درخت کے پیچھے پہنچ گئے۔ کچھ دیر انتظار کیا پھر دوبارہ فائرنگ نہیں ہوئی تو ہم وہاں سے دوڑتے ہوئے دوسرے درخت کی طرف جانے لگے۔ اسی وقت گولیاں چلنے لگیں۔ ہم بھی جواباً گولیاں برسا رہے تھے اور رک رک کر درختوں کی آڑ لے کر بڑھتے جا رہے تھے۔ ارادہ تھا، قریب ہی کوئی بستی نظر آئے گی تو کسی کے گھر میں پناہ لے لیں گے مگر دور دور تک آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ وقفے وقفے سے فائرنگ ہوتی جا رہی تھی۔ سیکرٹ ایجنٹ نے پریشان ہو کر کہا "کارتوس ختم ہو گئے ہیں۔"

ادھر آمنہ کے پاس بھی ریوالور خالی ہو گیا تھا پھر ہمیں قہقہہ سنائی دیا۔ وہ قہقہہ بھاری بھرکم تھا اور دور تک گونج رہا تھا۔ کسی کی آواز جنگل میں اتنی گونج نہیں سکتی۔ وہ میگافون کے ذریعے قہقہہ

لگار رہا تھا۔ پھر اس کی آواز سنائی دی: "اگر قہقہے سے مجھے نہیں پہچان سکتے تو میری آواز اور میرے لہجے سے پہچان لو۔"
وہ کم کریزی تھا۔
آمنہ نے مجھے دیکھا، پھر آہستگی سے کہا: "اب سمجھ گئی، وہ کمبخت خواہ مخواہ فائرنگ کر رہا تھا تاکہ ہم بھی جوابی فائرنگ کرتے رہیں اور انجام کار خالی ریوالور ہاتھ میں رہ جائیں۔ اگر ایک بھی کارتوس ہوتا تو میں پہلی فرصت میں اسے گولی مار دیتی۔ ایسے تو وہ نہیں مرے گا۔"
"ہاں، اس کمبخت کو میں نے اور کرم داد نے پھانسی پر چڑھا دیا تھا لیکن وہ سانس روکے رہا۔ پھندا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"
"تم بارود خان کو جانتے ہو، کیسا شہ زور ہے۔ اس نے تقریباً کریزی کو مار ہی ڈالا تھا لیکن میں ماچس شوف کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکلی تو وہ زندہ تھا۔ ہمارا راستہ روکنے کے لیے گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔ میں نے گاڑی سے زوردار ٹکر ماری، وہ گر پڑا۔ پھر میں نے گاڑی کو گھما کر اس پر چڑھا دیا۔ ایسے میں اس کا بچنا ممکن نہ تھا لیکن یہ تو اس ویرانے میں جیسے کفن پھاڑ کر بول رہا ہے۔"
وہ بول رہا تھا: "بابر! ہماری دشمنی ختم ہو سکتی ہے۔ ہم دوست بن سکتے ہیں، صرف وہ کاغذات میرے حوالے کر دو۔"
میں نے بلند آواز سے کہا: "کریزی! وہ اہم کاغذات میرے پاس موجود ہیں۔ جس طرح میں تمہارے گلے میں پھندا ڈالنے کے بعد تمہارے جسم سے روح کو نہ نکال سکا، اسی طرح تم ہزار پھندے ڈال کر میری جیب سے وہ کاغذات نہیں نکال سکو گے۔"
میری بات ختم ہوتے ہی گولی چلی۔ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ہی میرے قریب درخت کے تنے کا چھلکا ذرا سا اکھڑ گیا۔ گولی وہیں سے گزری تھی۔ ہم دم سادھے کھڑے دوسرے فائر کا انتظار کرتے رہے۔ پھر آمنہ نے میرے بازو کو تھام کر کہا: "مجھے بائیں طرف سے آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ دوسری طرف چلو۔"
ہم فوراً ہی درخت کے تنے کے دوسری طرف چلے گئے۔
اسی وقت فائر ہوا۔ آمنہ کی سماعت بڑی تیز تھی۔ اس نے بروقت آہٹ سن لی تھی ورنہ کوئی ضرور اس کی گولی کا نشانہ بنتا۔ ہم تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے سوکھے پتوں پر کوئی چل رہا ہو۔
وہ کریزی تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں میگافون۔ اس نے ریوالور ہمیں دکھاتے ہوئے کہا: "خالی ہو گیا۔"
اس نے ایک طرف اسے پھینک دیا۔ پھر میگافون کو ہم پھینکتے ہوئے بولا: "آخری بار کہہ رہا ہوں، کاغذات میرے حوالے کر دو۔ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔ کیا ہوا اگر میں خالی ہو گیا ہوں تو تم تینوں بھی ہو۔ میرے آدمی یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ تم لوگوں کو اتنی چھوٹ نہیں دیں گے۔ چاروں طرف سے فائرنگ ہو گی۔ پھر میں تمہاری لاش پر سوار ہو کر وہ کاغذات تمہاری جیب سے نکال لوں گا۔"
میں نے کہا: "کریزی! میں مقابلے کے وقت میدان چھوڑنے کو بزدلی سمجھتا ہوں اور میں نے تمہارے مسلح آدمیوں کو اپنی گاڑی کے پاس دیکھ لیا ہے۔ وہ یقیناً ادھر آئیں گے۔ اس لیے کاغذات کی سلامتی کے لیے میرا بھاگنا ضروری ہے۔ اگر میرا پیچھا کر سکتے ہو تو آؤ، کرو۔"
یہ کہتے ہی میں نے آمنہ کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے بھاگنا شروع کیا۔ کریزی نے بھی دوڑ لگائی۔ ہم دونوں آگے بھاگ رہے تھے۔ میرے اور آمنہ کے پیچھے سیکرٹ ایجنٹ تھا۔ وہ بظاہر بھاگتا رہا لیکن اچانک ہی اس نے پلٹ کر کریزی پر چھلانگ لگائی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں نے بھاگنے کے دوران سیکرٹ ایجنٹ سے کہا: "وقت ضائع نہ کرو۔ اسے چھوڑ دو۔ ہمارے ساتھ آؤ!"
اس نے چیخ کر کہا: "تم دور نکل جاؤ۔ کسی آبادی تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں اس کمبخت کو روکتا ہوں۔"
سیکرٹ ایجنٹ بھی اچھا فائٹر تھا۔ کم کریزی اس سے کم نہیں تھا لیکن سیکرٹ ایجنٹ کے داؤ میں آگیا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے رک رک کر ادھر دیکھا۔ سیکرٹ ایجنٹ نے کم کریزی کی گردن میں بازو ڈال کر اسے جکڑ لیا تھا یعنی اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ میں نے کہا: "اسے تو پھانسی کا پھندا ابھی نہیں مار سکا۔ یہاں روکے رہے گا اور تمہارا وقت ضائع ہوتا رہے گا۔"
اسی وقت کریزی نے اپنی کہنی اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ پھر اس نے تواتر سے گھونسوں پر رکھ لیا۔ میں سمجھ رہا تھا، سیکرٹ ایجنٹ کی شامت آگئی ہے لیکن اس نے فوراً ہی بازی پلٹ دی۔ اب وہ کریزی پر حاوی ہو رہا تھا۔ آمنہ نے کہا: "تم تماشا دیکھنے کیوں رک گئے ہو۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"
میں اپنے کسی ساتھی کو تنہا مقابلے کے لیے نہیں چھوڑتا لیکن مصلحت یہی تھی کہ دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے پیچھے لگایا جائے اور دوسرے مسلح دشمن ہماری طرف پہنچنے ہی والے تھے۔ میں مجبور ہو کر آمنہ کے ساتھ جانے لگا۔ ہم تیز قدم اٹھاتے جا

رہے تھے۔ دوڑتے ہوئے بھی جا سکتے تھے مگر میں نے صرف اتنی رفتار رکھی کہ سیکرٹ ایجنٹ کریزی پر قابو پانے کے بعد ہم سے آملے۔
آمنہ نے کہا: "میری ایک بات مانو گے؟"
"ماننے والی بات ہو گی تو ضرور مانوں گا۔"
"وہ کاغذات مجھے دے دو۔ میں چھپا کر رکھ لوں گی۔"
"تم بھول رہی ہو۔ کمپیوٹر والی تمہارے دماغ میں بھی پہنچتی ہے۔ وہ پھر تمہارے ہی ہاتھوں سے کاغذات نکلوا لے گی۔"
وہ چپ چاپ چلنے لگی۔ میں نے سیکرٹ ایجنٹ کے دماغ میں پہنچ کر دیکھا۔ اس کی بری حالت ہو چکی تھی۔ کریزی صرف یوگا کا ماہر نہیں تھا بلکہ غضب کا فائٹر بھی تھا۔ وہ کرم داد وغیرہ کا استاد رہ چکا تھا۔ میں خیال خوانی کے ذریعے سیکرٹ ایجنٹ کی مدد کرنے لگا مگر مسلسل مدد نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی آمنہ مجھے مخاطب کرتی تھی۔ میری رفتار سست ہوتی تو مجھے تیز چلنے اور دوڑ لگانے پر مجبور کرتی تھی۔
تھوڑی دیر بعد ہی میرے قدم رک گئے۔ میں آگے نہ بڑھ سکا۔ میری خیال خوانی کی لہریں سیکرٹ ایجنٹ کے دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ آمنہ نے پوچھا: "کیا ہوا؟"
میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا: "کچھ نہیں، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ آ رہا تھا، ہم نے اسے تنہا مقابلے کے لیے چھوڑ دیا اور کریزی کو تم جانتی ہو، کتنا خطرناک ہے۔"
"بعض اوقات اپنے ساتھیوں کی صلاحیتوں اور دلیری پر اعتماد کر کے انہیں ان کے حال پر چھوڑنا پڑتا ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔ چلو۔"
وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ میں آگے نہ بڑھتا تو اور کیا کرتا۔ وہ بے چارہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ پیچھے پلٹ کر جانا حماقت ہوتی۔ ہم تیزی سے بھاگنے لگے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد کچھ مکانات نظر آنے لگے۔ ہم نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ دور تک کریزی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کمبخت کے دماغ میں پہنچ سکتا تو معلوم ہو جاتا کہ آخر وہ کہاں ہے اور کس طرح ہمیں گھیرنا چاہتا ہے۔
ہم مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تک پہنچ گئے۔ وہاں صرف چھ گھر نظر آ رہے تھے۔ جن میں سے دو گھروں کے دروازوں پر تالے پڑے تھے۔ باقی گھروں میں ایک دو عورتیں دکھائی دیں۔ بعد میں پتا چلا وہاں کے لوگ اپنی عورتوں بچوں کے ساتھ میلے میں گئے ہیں۔ مردوں میں صرف دو بوڑھے نظر آئے۔
ہم ایک مکان کے سائے میں پہنچ کر ہانپنے لگے۔ ایک بوڑھے نے کہا: "پتر ادھر کیا کر رہے ہو۔ یہاں آؤ، روٹی کھاؤ، ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پیو۔ پھر بتاؤ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جا رہے ہو؟"
آمنہ بڑے میاں کی طرف جاتے ہوئے ان سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ ڈرائیور کے پاس پہنچ کر دیکھا۔ اس گاڑی کے پاس جتنے دشمن چیکنگ کے لیے آئے تھے، ان میں سے کچھ مارے گئے تھے اور کچھ پکڑے گئے تھے۔ سیکرٹ سروس کے چیف نے جگہ جگہ ناکہ بندی کی تھی۔ وہاں سے پولیس پارٹی نے آکر انہیں گھیر لیا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اب مسلح دشمنوں سے خطرہ نہیں تھا۔ صرف ایک کم کریزی رہ گیا تھا۔ ویسے وہ ایک بھی دس کے برابر تھا۔ چالبازیوں میں بے مثال تھا۔ اس نے کتنی چالاکی سے ہمارے ریوالور خالی کرا دیے تھے۔ اب پتا نہیں کیسی چالیں چلتا آ رہا تھا۔
شیطان کو یاد نہ کرو، تب بھی وہ آ دھمکتا ہے اور اسے تو آنا ہی تھا۔ دور کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک بھینس دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ آمنہ میرے چونکنے پر بے اختیار ہنسنے لگی۔
ابھی اس کی ہنسی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک قہقہہ اس کی ہنسی میں گڈمڈ ہو کر بلند ہوا۔ وہ قہقہہ میگافون کے ذریعے دور تک گونج رہا تھا۔ وہاں جو عورتیں تھیں وہ گھروں میں چلی گئیں۔

بوڑھے نے پوچھا "یہ کس کی ہنسی سنائی دے رہی ہے؟"

آمنہ نے بابا کا بازو تھام کر اٹھاتے ہوئے کہا "آپ گھر کے اندر چلے جائیں۔ ایک بدمعاش ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اگر ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو نقصان پہنچا تو ہمیں افسوس ہوگا۔"

وہ بابا کو ایک مکان کے اندر لے گئی۔ اسی وقت کوئی چیز میرے پاس آکر زوردار آواز کے ساتھ پچھلی دیوار سے ٹکرائی۔ میں ایک دم سے بیٹھ گیا۔ اس نے دُور سے میگافون کھینچ کر مارا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھا۔ وہ دُور ایک درخت سے لگا کھڑا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا "تم آؤ گے یا میں آجاؤں؟"

اس سے پہلے ہی آمنہ تیر کی طرح دوڑتی ہوئی گئی۔ میں نے آواز دی "رُک جاؤ۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ میرے ہوتے ہوئے تم مقابلہ نہیں کرو گی۔"

وہ کریزی کے سامنے پہنچ کر رُک گئی تھی اور پینترا بدل رہی تھی۔ کریزی نے بھی جواباً پینترا بدلتے ہوئے کہا "دیکھو، تمہارا آدمی مقابلہ کرنے سے روک رہا ہے۔ مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگتا کہ کسی عورت پر ہاتھ اُٹھاؤں۔"

آمنہ نے اچانک ہی بڑھ کر حملہ کیا۔ کریزی نے اسے روک لیا مگر دوسرے حملے کو نہ روک سکا۔ کراہتا ہوا پیچھے چلا گیا۔ وہ بولی۔ "میں پہلی اور آخری بار پوچھ رہی ہوں۔ راستے سے ہٹ جاؤ گے یا آمنہ کا سامنا کرو گے؟"

میں نے اسے پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے کہا "تم زیادہ شیرنی بننے کی کوشش نہ کرو۔ ہم دونوں کو فیصلہ کرنے دو۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے غصّے سے بولی "میرا راستہ نہ روکو۔ میں ان کمبختوں سے بابر کا قرض چکانا چاہتی ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے میرے بابر کے ساتھ زیادتی کی۔ اُسے مجھ سے جدا کر دیا۔ یہی بتائیں گے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟"

کریزی نے مسکراتے ہوئے کہا "بے وقوف عورت ابھی تک اسے یاد کر رہی ہے جس کی ہڈیاں زرینہ کے قید خانے میں گل چکی ہوں گی۔ یہ بہروپیا اپنی یادداشت گم ہونے کا بہانہ کر کے تم سب کو بے وقوف بناتا آرہا ہے۔"

آمنہ کے دماغ میں یہ سُن کر سنسنی پیدا ہو رہی تھی کہ اس کے بابر کی ہڈیاں گل چکی ہوں گی۔ گویا وہ زندہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ غصّے میں آگے بڑھ کر حملہ کرتی میں نے کریزی پر حملہ کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ میرے ساتھ ساتھ آمنہ بھی حملہ کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا پہنچا تھا۔ وہ کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا تھا۔ اس نے جھنجلا کر اسکرین کو آن کیا۔ جواب موصول ہونے والے بٹن کو دبایا۔ وہاں لکھا ہوا تھا "آمنہ! تماشائی بن کر دُور رہو۔ ان کے درمیان جاؤ گی تو میں تمھیں دماغی طور پر کمزور بنا دوں گی۔ تم مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہو گی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ کریزی کو فوراً اس سے کاغذات حاصل کر لینے دو۔"

کریزی وہ کاغذات حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے آیا تھا۔ اس نے بڑے زبردست حملے کیے۔ مجھے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ پھر میں نے بھی اعتراف کروایا۔ وہ دل ہی دل میں مان رہا ہوگا کہ میں دہشت گرد تنظیم کا کوئی نوآموز فائٹر نہیں ہوں۔ برسوں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا رہا ہوں اور دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارتا رہا ہوں۔ پہلے دو چار زبردست حملوں میں ایک ہاتھ اس نے ایسا مارا کہ میری باچھوں سے خون رِسنے لگا۔ میں نے بھی دو چار داؤ آزمائے۔ پھر اس کے چہرے پر کراٹے کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ آنکھ کے نیچے جلد پھٹ گئی، خون رِسنے لگا۔

اتنا موقع نہیں تھا کہ آمنہ کے دماغ میں پہنچ کر اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتا۔ بعد میں اس نے بتایا تھا۔ جب بھی وہ کریزی پر حملہ کرنے کے لیے بڑھنا چاہتی تو قدم آپ ہی آپ رُک جاتے تھے۔ وہ بیٹھ جاتی تھی۔ جبراً آگے بڑھنا چاہتی تو زمین پر گر پڑتی تھی۔ سمجھ رہی تھی کہ ٹیلی پیتھی کا عمل جاری ہے۔ وہ اس سے آگے دم نہیں مار سکے گی لہٰذا مجبوراً تماشائی کی طرح ہمیں دیکھ رہی تھی اور اعتراف کر رہی تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی کسی سے کم نہیں ہے۔

میں دل ہی دل میں اعتراف کر رہا تھا کہ میں کچھ کم ہوں۔ میں نے ایک طویل عرصے تک بڑے آرام سے خیال خوانی کرتے ہوئے دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے زندگی گزاری تھی۔ جب تک بیلا ساتھ تھی، میں اس کے ساتھ عملی زندگی گزارتا تھا۔ اس طرح جسمانی ورزش اور مشقت ہوتی رہتی تھی۔ میرے مقابلے پر کم کریزی ایک دہشت گرد تنظیم کا استاد تھا۔ وہ صبح و شام زور آزماتا رہتا تھا اور اپنے شاگردوں کو داؤ پیچ سکھاتا رہتا تھا۔ صبح آفتاب طلوع ہونے سے پہلے یوگا کی مشقیں کرتا تھا۔ یعنی وہ عملی زندگی گزارتا تھا۔ اسے آج اپنے بے عمل رہنے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ میں یقیناً اس پر کامیاب حملے کرتا تھا لیکن جب وہ مجھ پر حملے کرتا تو آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگتے تھے۔

پانچ منٹ کی لڑائی کچھ کم نہیں ہوتی۔ میں اتنی دیر میں اس کے جسم پر اور چہرے پر لگنے والے زخموں کو گن سکتا تھا لیکن خود اپنے زخموں کا حساب نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو سر سے پاؤں تک خون میں نہایا ہوا تھا۔ میری باچھوں سے، میری ناک سے اور میری

پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم پر کئی جگہ زخم آئے تھے۔ اب میں پینترا بدلنے وقت کبھی کبھی لڑکھڑا جاتا تھا۔ ایسے ہی وقت اس نے میرے ایک حملے کو روک لیا اور حملہ کرنے والے ہاتھ کو مضبوطی سے کھینچتا ہوا ایک درخت سے لے جا کر ٹکرا دیا۔ میرے حلق سے چیخ نکلی۔ میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے پھر مجھے کھینچا اور کھینچتا ہوا، گول چکر کاٹتا ہوا دوسرے درخت سے ٹکرا دیا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی شدید چوٹیں آرہی تھیں اور میں کتنی شدید تکلیف میں مبتلا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بھاری بھرکم درخت خود آکر مجھ سے ٹکرا رہے ہوں۔ مجھے دو درخت اپنے درمیان پیس رہے ہوں۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ حلق سے چیخ نکال سکتا۔ کریزی نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ میں اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی کوشش میں ڈگمگا رہا تھا۔ پھر اسی طرح ڈگمگاتے ہوئے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ایک زخم ٹیسیں دے رہا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تقریباً اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ میری طرف آرہا تھا اور فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ اس لیے ٹیڑھی انگلی سے کاغذات نکالنے آرہا ہوں۔ دم خم ہے تو مجھے روک لو۔"

ابھی وہ مجھ سے تقریباً پانچ گز کی دوری پر تھا۔ میں نے اپنی دماغی قوتوں کو مجتمع کر کے خیال خوانی سے کام لینا چاہا۔ وہ زخموں سے چُور چُور تھا اور اس حالت میں میری سوچ کی لہروں کو نہیں روک سکتا تھا لیکن میں ٹیلی پیتھی کے زعم میں یہ بھول گیا تھا کہ میں اس سے زیادہ زخمی ہوں۔ میرا دماغ اس سے زیادہ کمزور ہو چلا ہے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بدستور دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں نے خیال خوانی کی پرواز کرنے کی کوشش کی تو نہ کر سکا۔ دماغ تھک گیا، جیسے زخمی پرندے نے پرواز کی کوشش کی ہو اور پَر مار کر رہ گیا ہو۔

دنیا کے تمام علوم خواہ معمولی ہوں یا غیر معمولی، وہ دماغ کی توانائی سے قائم رہتے ہیں۔ میرے جسم سے جانے کتنا لہو بہہ چکا تھا۔ دماغ کو کمزور ہونا ہی تھا اور وہ ہو رہا تھا یعنی میں اپنی مدافعت کے لیے ٹیلی پیتھی کا سہارا نہیں لے سکتا تھا۔ سچ ہے انسان کی ساری خوبیاں، ساری خرابیاں اور ساری صلاحیتیں جن پر اسے ناز ہوتا ہے وہ سب کی سب آخر وقت ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔

وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر میری طرف آرہا تھا۔ اب ہمارے درمیان صرف تین گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں اپنی خالی جیبوں تک اسے پہنچنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ دشمنوں کو اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہیے کہ وہ کاغذات میرے پاس موجود ہیں۔ مجھے اسی تدبیر پر عمل کرنا تھا لیکن کیسے؟ وہ تو اب مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ کسی لمحے بھی مجھے پھر زخم پہنچا کر میری جیبوں تک پہنچ سکتا تھا۔

میں نے ڈوبتی ہوئی امیدوں سے دُور آمنہ کی طرف دیکھا۔ وہ زمین پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ رینگتے ہوئے میری طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یقیناً اسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کیا جا رہا تھا۔ مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ اُدھر کریزی میرے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

اس نے میرے گریبان کو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "بولو اب مجھے روک سکتے ہو؟"

غرور کبھی نہیں پھلتا۔ وہ کسی لمحے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس غرور میں کریزی بھی یہ بھول گیا تھا کہ مخالف خواہ کتنا ہی کمزور ہو، اس کے بالکل قریب نہیں آنا چاہیے۔ اسی لمحے میں نے اس کے پیٹ میں زور سے گھٹنا مارا۔ وہ تکلیف کی شدت سے پیٹ پکڑ کر کراہتے ہوئے جھکنے لگا۔ میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی باندھی پھر دو انگلیاں انگریزی کے حرف "وی" کی طرح نکالیں۔ ان انگلیوں کو اپنی آخری تمام قوتیں صرف کرتے ہوئے آہنی سلاخوں کی طرح سخت کیا۔ وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے جھک رہا تھا۔ میں نے دونوں انگلیاں اس کی ناک کے نتھنوں میں گھسا دیں۔

وہ پیٹ کی تکلیف بھول کر بوکھلا گیا۔ ہڑبڑا کر سیدھا ہوگیا۔ اس کے دیدے پھیل گئے تھے۔ میں جانتا تھا، اس نے سانس روک لی ہے۔ وہ کمبخت اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اپنی ناک سے میری انگلیاں نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کمر کے بیلٹ کو پکڑا۔ پھر دوسرے ہی لمحے زمین سے اس کے قدم اُکھاڑ دیے۔ اسے اُوپر اُٹھانے لگا۔ اُوپر اٹھانے کا مطلب یہ ہوا کہ میری دونوں انگلیاں اس کی ناک کے نتھنوں کی گہرائی میں اور گھستی جا رہی تھیں۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگا۔ منہ سے سانس لینے لگا۔

میں نے اسے واپس زمین پر کھڑا کرتے ہوئے کہا "بس سانس لیتے رہو ورنہ... "

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر پھر اسے زمین سے اُکھاڑا اور ذرا بلند کیا۔ وہ پھر تڑپنے اور کراہنے لگا۔ ایسی حالت میں وہ سانس نہیں روک سکتا تھا۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ مجھ سے کمزور ہو چلا ہو۔ دراصل ہم دونوں ہی کمزور ہو چکے تھے۔ وہ بھی زخموں سے چُور تھا لیکن مجھ سے بہتر حالت میں تھا۔ میں نے اس کے سانس لینے کے راستے کو مسدود کر دیا تھا۔ میری انگلیاں اسے یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے دماغ تک پہنچتی جا رہی ہوں۔ بے شک وہ اپنے بچاؤ کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ جب بھی وہ میرے ہاتھ کو پکڑ کر انگلیوں کو ناک سے نکالنے کی کوشش کرتا، میں پھر اسے زمین سے اُکھاڑ دیتا تھا، جس کے نتیجے میں وہ... تلملانے لگتا تھا، جیسے دمِ آخر پھڑپھڑا رہا ہو۔

یکبارگی اس نے اپنی آخری تمام قوتوں کو مجتمع کیا، اچانک ہی پوری قوت سے پھڑپھڑاتے ہوئے زور سے اُچھلا اور اوپر جاتے ہی میری دونوں انگلیوں سے نجات حاصل کر لی۔ جب وہ زمین پر آیا تو اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ کمزوری سے لڑکھڑا گیا۔ وہ پیچھے کی طرف جاتے ہوئے زمین پر چاروں شانے چت ہوگیا۔ اسی وقت ایک بڑا سا بھاری بھرکم پتھر اس کے چہرے پر آکر لگا۔ میں نے دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ آمنہ نے وہ پتھر اُٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ اس کے حلق سے ایک نقاہت بھری چیخ نکلی۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی آمنہ کے حلق سے بھی چیخ نکلی تھی۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹتی چلی گئی تھی۔ یقیناً خیال خوانی کے ذریعے اس کے دماغ کو جھٹکا پہنچایا گیا تھا۔ میں ڈگمگاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس پتھر کو اٹھا لیا۔ اگرچہ دشمن مرنے ہی والا تھا مگر تجربات سمجھا رہے تھے کہ اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔ دوسری بار پتھر سے اس کا سر کچلنا لازمی تھا۔ وہ سانپ سے کم نہیں تھا۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ پتھر تو اٹھا لیا ہے لیکن اس پر حملہ نہیں کر سکتا۔ کوئی قوت مجھے روک رہی تھی۔ میرا کمزور دماغ کسی کی مٹھی میں تھا۔ ایسے وقت آمنہ کی حاضر دماغی کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہو گی۔ اتنی دیر میں وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اسے خیال خوانی سے ٹریپ کیا جا رہا ہے اور بابر کی مدد کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ میں پتھر اُٹھا کر دشمن پر حملہ نہ کر سکوں گا تو اس نے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ جب تک وہ خیال خوانی کرنے والی میرے دماغ سے اس کے دماغ میں پہنچتی، اس نے پتھر دے مارا۔

وہ جنونی انداز میں بولتی بھی جا رہی تھی "تم نے بابر کو مار ڈالا، ہاں اسے مار ڈالا۔ دوسرے کو نہیں مار سکتے۔ میں تمہارا سر کچل ڈالوں گی۔"

اور وہ سر کچل رہی تھی۔ میں وہاں سے پلٹ گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے درخت کے سائے کی طرف جانے لگا۔ مجھ میں اپنے پاؤں سے چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود ایک انجانی سی قوت مجھے ادھر لیے جا رہی تھی پھر میں ایسی جگہ گر پڑا، جہاں وہ کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرا ہاتھ بے اختیار اُدھر بڑھنے لگا۔ میں نے اپنی مرضی کے خلاف اس کے اسکرین کو آن کیا۔ اس کے بعد جواب موصول ہونے والے بٹن کو دبایا۔ پھر اسکرین پر لکھا ہوا نظر آیا "کم کریزی آج تک سانس روکتا رہا اور موت کو ٹالتا رہا، آج وہ اپنی موت کو نہ ٹال سکا۔"

"میں بار بار تمہارے دماغ میں آنے کی کوشش کرتی رہی اور تم اپنے دروازے بند کرتے رہے۔ میں نے کئی راستے اختیار کیے۔ آخر اس راستے نے مجھے میری منزل تک پہنچا دیا۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ تم... ذرا بھی سکت نہ ہونے کے باوجود یہاں تک کیسے چلے آئے۔ کس طرح تمہارے ہاتھ آگے بڑھے، کس طرح تم نے اسے آن کیا اور اب اپنی مرضی کے خلاف کمپیوٹر کے ذریعے میری باتیں سُن رہے ہو؟"

اسکرین صاف ہوگیا۔ پھر دوسری تحریر نظر آنے لگی۔ اب وہاں لکھا تھا "بے شک میں تمہارے دماغ میں موجود ہوں۔ کیا سانس روک سکتے ہو؟ مجھے باہر نکال کر دماغ کے دروازے بند کر سکتے ہو؟ نہیں کبھی نہیں، جب تک تمہاری دماغی توانائی بحال نہ ہو، اس وقت تک تمہاری اس کھوپڑی پر میرا قبضہ ہے۔ آخر میں نے تمہارے بِل سے تمہیں نکال ہی لیا فرہاد علی تیمور! "

اس کمپیوٹر کی زبانِ بے زبانی سے میں نے بس اتنا ہی سُنا کہ میرا راز فاش ہوگیا ہے۔ اب میں بابر کے خول میں چھپ کر نہیں رہ سکوں گا، اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ میں چاروں شانے چت ہوگیا۔ میرے سر پر کھلا آسمان تھا۔ پھر میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

میں اس قدر زخموں سے چُور تھا کہ بہت پہلے ہی زمین پر گر پڑتا لیکن اس خیال خوانی کرنے والی ہستی نے مجھے سنبھال رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں کسی طرح بھی ڈگمگاتے ہوئے کمپیوٹر کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں اس کے بس میں تھا۔ میری دماغی توانائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ مجھے اپنی ٹیلی پیتھی کے سہارے کمپیوٹر تک لے گئی تھی اور اپنی فتح.... کا مژدہ سناتی رہی تھی۔

بہرحال، میں ایک عالمِ نیست میں تھا۔ شاید یہ دنیا میرے لیے نہ تھی۔ اس دنیا کی کوئی آواز میری سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ ہی میں کسی کو دیکھ سکتا تھا۔ عجیب بیہوشی کا عالم تھا۔

پھر رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ میں اس دنیا میں موجود ہوں۔ میں جہاں بھی تھا، اس جگہ کو چھُو کر محسوس کر سکتا تھا اور وہ ایک آرام دہ بستر تھا۔ میری ناک تک ڈی ڈی ٹی ڈیٹول اور مختلف دواؤں کی بُو گڈمڈ ہو کر پہنچ رہی تھی۔ میرے کان کچھ آوازیں سن رہے تھے۔ وہ آوازیں ایسی ہی تھیں جیسے کوئی چیز کہیں سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ رکھی گئی ہو، کوئی قدم قدم جا رہا ہو یا کوئی نفس نفس آ رہا ہو پھر آنے والے نے میری کلائی تھام لی۔ میں دیکھے بغیر کہہ سکتا تھا کہ کلائی تھامنے والے ہاتھ پھول پھول سے ہیں۔ اگر وہ مُردے کو تھام لیتے تو شاید جی اٹھتا پھر میں کیسے آنکھیں نہ کھولتا۔

پٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ جیسے اس نے سوئچ دبایا ہو اور دنیا روشن ہوگئی ہو۔ وہ مجھکی ہوئی تھی۔ کیا من موہنی صورت تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہی تھی۔ گویا تبسم چھڑک چھڑک کر مجھ نیم جاں کو اور جاں سے گزار رہی تھی۔

مجھے اپنے دماغ میں رسونتی کی آواز سنائی دی "خدا کا خوف کرو۔ زندگی وفا نہ کرتی تو جان سے گزر چکے ہوتے مگر جان میں جان آتے ہی حُسن پرستی شروع کر دی۔ ہم یہاں بارہ گھنٹے سے تمہارے لیے پریشان ہیں۔ سونیا، اعلیٰ بی بی، مرجانہ، ثباتہ سبھی تمہارے لیے فکر مند ہیں۔ ابھی انھیں تسلیاں دے کر آ رہی ہوں کہ تمھیں ہوش آگیا ہے اور تم بخیریت ہو۔"

"اب تو وہ فکر مند نہیں ہوں گی؟"

"بھلا کیوں نہیں ہوں گی۔ میں نے انھیں مادام کمپیوٹر کے متعلق بتا دیا ہے۔ اس لمحے جب تم بیہوش ہونے والے تھے تو میں تمہارے پاس پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس کمپیوٹر کے ذریعے معلوم کیا تھا کہ وہ تمہارے دماغ میں پہنچ گئی ہے۔"

"اس سلسلے میں وہ کیا کہتی ہیں؟"

"ایک اہم سوال ہم سب کے دماغوں میں گردش کر رہا ہے۔ کیا اس نے تمام دشمنوں کو تمہارے متعلق بتا دیا ہوگا کہ تم کہاں ہو، کس روپ میں ہو اور کن معاملات میں مصروف ہو؟"

"یقیناً بتایا ہوگا۔ بیہوش ہوتے ہوتے میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت خوش تھی اور کیوں نہ ہوتی، اس نے میرے راز کو پا لیا تھا اور اب دشمنوں کے سامنے میری اصلیت پیش کر کے جانے کیسے کیسے مفادات حاصل کرنے والی تھی اور شاید کر رہی ہوگی۔"

"ثباتہ، مرجانہ اور ٹارزٹر بلبا ضد کر رہے ہیں۔ وہ تمہارے پاس آنا چاہتے ہیں۔ تمہارے محافظ بن کر رہنا چاہتے ہیں تاکہ دشمنوں کا سایہ بھی تم پر نہ پڑے۔"

"سونیا اور اعلیٰ بی بی کیا کہتی ہیں؟"

"ظاہر ہے، وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کی عادی ہیں۔ سونیا کہتی ہے، دشمنوں کا منصوبہ یہی ہوگا کہ فرہاد کے بے نقاب ہوتے ہی اس کے تمام ساتھی تیر کی طرح اس کی حفاظت کے لیے پہنچیں اور سازشوں کے جال میں اُلجھتے چلے جائیں۔ اس کا فیصلہ ہے، وہ وادیٔ قاف چھوڑ کر نہیں جائے گی۔"

"اور اعلیٰ بی بی؟"

"وہ ثباتہ کو سمجھا رہی ہے کہ اسے تمہارے پاس نہیں جانا چاہیے۔ مادام کمپیوٹر بڑی آسانی سے اس کے دماغ میں پہنچ سکتی ہے اور اس کے ذریعے آئندہ تمھیں نقصان پہنچا سکتی ہے لیکن ثباتہ بضد ہے۔ وہ جواز پیش کر رہی ہے کہ اس کے نہ جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہارے آس پاس جو لوگ رہتے ہیں، مادام کمپیوٹر ان کے ذریعے تمہارے قریب رہے گی اور تمہاری کسی بھی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی رہے گی۔"

"رسونتی! ماسٹر کی نے مجھے چیلنج کیا تھا کہ میرے پرانے دشمن ہماری راہ میں نہیں آئیں گے۔ اس نے یہ بھی چیلنج کیا تھا کہ میں اس کے یا اس کے ماتحتوں کے دماغوں میں کبھی پہنچ کر بتاؤں۔ اب وہ ہماری ٹیلی پیتھی کو قصۂ پارینہ بنا کر رکھ دیں گے۔"

"دشمنوں کے چیلنج کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ انھوں نے ماضی میں بھی بڑے بڑے چیلنج کیے۔ اگر مادام کمپیوٹر تمہارے دماغ

میں پہنچ گئی ہے تو یہ ایک عارضی سی بات ہے۔ جیسے جیسے تمہارے زخم بھرتے رہیں گے، توانائی حاصل ہوتی رہے گی، تم پھر مادام کمپیوٹر کو اپنے دماغ میں آنے سے روک سکو گے۔"

"بات ہماری تمہاری نہیں ہے، ہمارے ان ساتھیوں کی ہے جو میرے پاس آنا چاہتے ہیں، میری حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟"

"میرا جی چاہتا ہے، ابھی پرواز کروں اور تمہارے پاس پہنچ جاؤں۔ اعلیٰ بی بی کہتی ہے، اگر میں جاؤں گی تو میرے ساتھ پارس یقیناً جائے گا یوں دشمنوں کے لیے بڑی آسانیاں فراہم ہوتی جائیں گی۔ لہٰذا مجھے وادیٔ قاف سے نہیں نکلنا چاہیے۔"

"تمہارے پاس بہت ہی بیدار ذہن موجود ہے اور وہ اعلیٰ بی بی ہے۔ وہ جو بھی پلاننگ کرے گی' مادام کمپیوٹر اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکے گی۔ دشمن ہماری پلاننگ سے اور ہمارے عملی اقدامات سے بے خبر رہیں گے۔ لہٰذا اعلیٰ بی بی ہم سب کے لیے اہم رول ادا کر سکتی ہے۔"

رسونتی چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کہا "اعلیٰ بی بی کہہ رہی ہے' ابھی تمہارا دماغ کمزور ہے۔ خیال خوانی کے ذریعے اس کے پاس نہیں پہنچ سکتے اور اپنے دماغ میں آنے والی تیسری سوچ کی لہر کو روک نہیں سکتے۔ ہو سکتا ہے' اس لمحے مادام کمپیوٹر تمہارے دماغ میں موجود ہو اور ہماری گفتگو کے بعد بھی تمہارے دماغ کو کرید کر معلوم کرتی رہے کہ کیا پلاننگ ہو رہی ہے۔ بہرحال تم کسی طرح کی فکر نہ کرو۔ کھاؤ پیو' آرام سے اپنے زخم بھرنے کا انتظار کرو۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ اعلیٰ بی بی شطرنج کی نئی بساط بچھا رہی ہے۔"

"مجھے اس پر اعتماد ہے لیکن میں آرام سے کسی چار دیواری میں نہیں بیٹھا رہوں گا۔ میں نے برسوں بیٹھے بیٹھے خیال خوانی کر لی۔ کم کریمزی سے مقابلہ کرتے وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا اگر میں مصروفِ عمل نہ رہا' چار دیواری سے باہر دشمنوں سے نبرد آزمانہ ہوتا رہا تو میری جنگجویانہ صلاحیتیں زنگ آلود ہو جائیں گی۔ اگرچہ مجھے زخم بڑے آئے ہیں پھر بھی دو دن سے زیادہ بستر پر نہیں لیٹوں گا اور اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر میدانِ عمل میں آؤں گا۔"

رسونتی تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ وہ میری باتیں اعلیٰ بی بی وغیرہ تک پہنچا رہی تھی۔ وہاں ایک بڑے سے کمرے میں رسونتی، سونیا، اعلیٰ بی بی، مرجانہ، ثبانہ، ٹارزٹر غلبا اور ٹارزٹر بلبا وغیرہ موجود تھے۔ سب میرے متعلق معلومات حاصل کرتے جا رہے تھے اور معلومات کا ذریعہ صرف رسونتی تھی۔ اس وقت وہ من موہنی سی نرس مجھے دوا پینے کے لیے دے رہی تھی۔ میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے کہا "نہیں' اسی طرح لیٹے رہو۔ تم بہت زخمی ہو۔ اٹھ نہیں سکو گے۔"

میں نے بڑی نقاہت سے مسکرا کر اسے دیکھا پھر ایک ہاتھ کی کہنی ٹیک کر ذرا سا اٹھ گیا اور اس کے ہاتھ سے دوا لیتے ہوئے کہا "لوہا خود نہیں اٹھتا' اسے مقناطیس اٹھاتا ہے۔"

وہ مسیحانہ انداز میں مسکرانے لگی۔ نرس کی ڈیوٹی یہی ہے۔ مریض گورا ہو' کالا ہو' خوبصورت ہو' بدصورت ہو' وہ ہر حال میں مسکراتی ہے۔ ڈاکٹر مختلف مریضوں کے مختلف نسخے لکھتے ہیں۔ ان نسخوں میں تبدیلی کرتے جاتے ہیں' دوائیں بدلتے جاتے ہیں لیکن نرس کی ایک ہی دوا ہوتی ہے اور اس ایک ہی دوا سے وہ سیکڑوں ہزاروں مریضوں میں جان ڈال دیتی ہے۔

میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ میں رسونتی سے رابطہ قائم کروں اور معلوم کروں کہ وہ اعلیٰ بی بی وغیرہ کے ساتھ کیا باتیں کر رہی ہے۔ کیا مشورے ہو رہے ہیں؟

یہ بات جو میرے دماغ میں آ رہی تھی' میرے مزاج کے اور میرے حالات کے خلاف تھی۔ حالات یہ تھے کہ میں خیال خوانی نہیں کر سکتا تھا پھر بھلا رسونتی سے کس طرح رابطہ قائم کر کے اسے مخاطب کرتا اور اس سے پوچھتا کہ تم اتنی دیر سے کہاں گم ہو۔ اگر مشورے کر رہی ہو تو مجھے بھی بتاتی جاؤ۔

لیکن میں اس سے پوچھ نہیں سکتا تھا۔ خیال خوانی کے ذریعے اسے مخاطب نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میرے دماغ میں ایسی باتیں کیوں آ رہی تھیں؟ صاف ظاہر تھا کہ مادام کمپیوٹر چپکے چپکے میری ہی سوچ میں میرے ہی لب و لہجے کو اپنا کر یہ خیالات پیدا کر رہی تھی۔

میں دوا پینے کے بعد لیٹ گیا۔ نرس مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ میں نے اپنے کمزور دماغ کے خلا میں جھانکتے ہوئے پوچھا "مادام کمپیوٹر! تم مجھے اکسا رہی ہو تاکہ میں رسونتی کو مخاطب کروں۔ اس سے معلوم کروں کہ وہاں کیا مشورے ہو رہے ہیں اور تم میرے دماغ میں چپ چاپ رہ کر یہ ساری باتیں سنتی رہو۔ اگر تم مرد ہو تو مردوں کی طرح سامنے آؤ۔ عورت ہو تو مجھ سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے آج تک کسی عورت کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ہاں اگر کسی نے اپنی مرضی سے میری زندگی میں داخل ہو کر اپنی نادانی سے کوئی نقصان اٹھا لیا ہو تو اس کی ذمے داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔"

میں جواب کا انتظار کرنے لگا لیکن میرے دماغ میں بدستور سناٹا چھایا رہا۔ رسونتی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ میں نے پھر مخاطب کیا "میں فی الحال تمہیں مادام کمپیوٹر ہی کہوں گا۔ کیا درست کہوں گا؟"

مجھے جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ 'تھا' یا 'تھی' جو کچھ بھی تھی' مادام کمپیوٹر کی مناسبت سے یہی کہوں گا کہ وہ اپنی آواز سنا کر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

رسونتی نے آکر کہا "سوری' مجھے دیر ہو گئی۔ یہاں سونیا اور اعلیٰ بی بی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مجھے تمہارے دماغ میں زیادہ دیر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ میری کسی بات سے مادام کمپیوٹر کو اشارہ مل جائے گا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"یہ تم نے بتا ہی دیا کہ تم سب کسی خاص منصوبے پر عمل کرنے کے متعلق سوچ رہی ہو حالانکہ کھلے الفاظ میں نہیں کہا لیکن بات ظاہر ہو گئی۔ اعلیٰ بی بی اور سونیا درست کہتی ہیں۔ تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔"

"جب تم دماغی توانائی حاصل کر لو گے اور ہمیں یقین ہو جائے گا کہ مادام کمپیوٹر تمہاری مرضی کے بغیر تمہارے دماغ میں نہیں آ سکے گی تو ہم اس منصوبے کے متعلق تمہیں مکمل تفصیل بتائیں گے۔"

اس کی باتوں کے دوران آمنہ دروازے پر نظر آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے کا حسن پھیکا پڑ گیا تھا' زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر دیکھا تو وہ بھی کھل کر مسکرانے لگی۔ تیزی سے چلتی ہوئی آئی پھر پلنگ کے سرے پر بیٹھ کر میرا ہاتھ تھام کر بولی "خدا کا شکر ہے' تم ہوش میں آ گئے۔ مجھے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے پتا چلا ہے۔ یہ کمپیوٹر کہہ رہا ہے' اسے تمہارے پاس پہنچانا چاہیے تاکہ تم سے کچھ ضروری گفتگو ہو سکے۔"

رسونتی نے پوچھا "فرہاد! میں تمہارے پاس موجود رہوں؟"

"ہاں' مادام کمپیوٹر مجھ سے کیا گفتگو کرنا چاہتی ہے' تم بھی سنتی رہو۔"

پھر میں نے آمنہ سے پوچھا "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"میں کیا کروں۔ تم بُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ ہوش میں نہیں آ رہے تھے۔ میں کئی گھنٹے تک تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کرتی رہی' کمرے کے باہر ٹہلتی رہی۔ ڈاکٹروں نے کہیں جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں کہاں جاتی؟ سونا چاہتی تو نیند نہ آتی۔"

"اس کا مطلب ہے' تم پچھلی رات سے جاگ رہی ہو۔ آج کا سارا دن بھی گزر چکا ہے۔ پلیز آمنہ! میری فکر نہ کرو۔ میں خطرے سے باہر ہوں۔ تم آرام سے اپنی نیند پوری کر لو۔ ہاں' یاد آیا۔ خفیہ پولیس کے کچھ آدمی ضرور میرے کمرے کے آس پاس ہوں گے۔ کیا تم ان میں سے کسی کو پہچان سکتی ہو؟"

"تم پہچاننے کی بات کرتے ہو' میں ان سے گفتگو کر چکی ہوں۔"

"ان کے افسر کو بلاؤ۔ میں تمہاری رہائش کا انتظام کرتا ہوں۔"

"سارے انتظامات ہو چکے ہیں۔ میں تو صرف تمہارے لیے فکرمند تھی اور تم سے دور جا کر آرام نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"اب تو چلی جاؤ۔ نیند پوری کرو۔ رات کے نو بجنے والے ہیں۔ صبح تازہ دم ہو کر آنا۔ میرے زخموں کی ٹیسیں کچھ اور کم ہو جائیں گی' حالت سنبھل جائے گی پھر ہم آئندہ کے متعلق پلاننگ کریں گے۔"

"ذرا یہ تو دیکھ لوں کہ کمپیوٹر تم سے کیا کہتا ہے۔"

میں نے اس کمپیوٹر کو آپریٹ کیا۔ اس کے چھوٹے سے اسکرین پر حروف نمایاں ہونے لگے۔ وہ حروف لفظوں میں بدل رہے تھے اور الفاظ جملوں میں بدلتے جا رہے تھے۔ مادام کمپیوٹر کہہ رہی تھی "مسٹر! ابھی تم نے آمنہ کو مناسب مشورہ دیا ہے۔ اس سے کہو' آرام کرے۔ میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے آمنہ کو دیکھا اور اس کمپیوٹر کی تحریر اس کی طرف کر دی۔ اس نے پڑھا پھر سر جھکا کر کہا "اچھی بات ہے' میں جا رہی ہوں لیکن مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔ میں آؤں گی تو مجھے ساری باتیں بتا دینا۔"

"ضرور بتاؤں گا۔ جاؤ اور آرام کرو۔"

وہ چلی گئی۔ میں نے ٹرانسمیٹر کے بٹن کو آن کرتے ہوئے پوچھا "تم تنہائی میں مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتی ہو؟"

پہلی تحریر اسکرین سے مٹ گئی' دوسری نظر آنے لگی۔ وہ پوچھ رہی تھی "کیسی طبیعت ہے؟ زخم کیسے ہیں؟ یوں تو تمہارے دماغ میں رہ کر زخموں کو اور تمہاری حالت کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں پھر بھی رسماً پوچھ لینا چاہیے۔"

میں نے ٹرانسمیٹر کے مائک کو آن کرتے ہوئے کہا "میں خیریت سے ہوں۔ تمہارے رسمی تکلفات کا شکریہ۔ آگے بولو' کیا کہنا چاہتی ہو؟"

اسکرین پر پھر تحریر نظر آنے لگی "مسٹر فرہاد! تمہارے متعلق جو زیادہ اندھیرے میں ہے' وہ آمنہ ہے۔ بے چاری پہلے تمہیں بابر سمجھتی تھی' اب معلوم ہو گیا' تم بابر نہیں ہو مگر کون ہو' یہ اس نے تم سے پوچھا ہی نہیں۔"

"تم اسے بتا سکتی تھیں پھر کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے تمہارے ساتھیوں کو بھی نہیں بتایا اور دشمن بھی تمہاری اصلیت سے بے خبر ہیں۔ وہ ابھی تک تمہیں بابر سمجھ رہے ہیں۔ اب ذرا بوجھو تو جانوں کہ میں نے اب تک

تمہارا راز فاش کیوں نہیں کیا ہے ؟"

"تم جانتی ہو میرا دماغ ابھی کمزور ہے۔ میں زیادہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوں۔ لہٰذا تم ہی سمجھا دو، تم یہ مہربانی کیوں کر رہی ہو۔ اب تک میرا راز فاش کیوں نہیں کیا ؟"

"تم سوچ سمجھ نہیں سکتے لیکن تمہارے دماغ میں مادام رسونتی موجود ہے اور مادام کے پیچھے تمہاری بے حد چاہنے والیاں یہاں آنے کے لیے پَر تول رہی ہیں۔ طرح طرح کی منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں۔ ذرا ان سے پوچھ لو، میں تم پر مہربانی کیوں کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے کمپیوٹر آف کر دو۔ جب اشارہ موصول ہوگا تو آن کر دینا۔"

میں نے اسے آف کر دیا۔ رسونتی نے کہا "میں ابھی اعلیٰ بی بی سے بات کر کے آتی ہوں۔"

مجھے تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ رسونتی اُدھر اعلیٰ بی بی اور سونیا وغیرہ کو ہماری گفتگو کے متعلق بتا رہی تھی پھر اس نے میرے پاس آکر کہا "ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق مادام کمپیوٹر خود غرض اور مفاد پرست ہے۔ صرف اپنا مفاد حاصل کرتی ہے۔ اس لیے مختلف دہشت گرد تنظیموں سے رابطہ قائم کرتی ہے، ہر ایک کے کام آتی ہے، جس کی کمزوری ہاتھ آجائے، اس سے خوب فائدے اٹھاتی ہے۔ مثلاً تمہاری ایک کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے۔ ابھی صرف وہی جانتی ہے کہ تم فرہاد ہو۔ وہ اس بات کو راز رکھنے کی تم سے قیمت وصول کرے گی۔"

کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہونے لگا۔ میں نے اسے آن کیا۔ اسکرین پر تحریر نظر آئی۔ وہ کہہ رہی تھی "بیشک تمہاری ساتھی ذہین ہیں۔ فوراً حالات کا اور مجھ جیسے کردار کا تجزیہ کر لیتی ہیں۔ میں تمہارے راز کو راز رکھوں تو بولو کیا قیمت دو گے ؟"

سونیا اور اعلیٰ بی بی نے رسونتی کو جو مشورہ دیا تھا اس کے مطابق میں نے جواب دیا "مادام کمپیوٹر! تمہیں سو فیصد یقین ہے کہ میں تمہارے چنگل میں ہوں اور خود کو راز رکھنے کی بھاری قیمت ادا کر سکوں گا۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک، ہر شہر کا بینک میرے لیے کھلا ہے۔ میں دنیا کے قیمتی ہیرے جواہرات تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر افسوس تمہیں میری ذات سے تِل بھر فائدہ نہیں پہنچے گا۔ پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔"

اسکرین پر تحریر نمودار ہوئی "واقعی تمہارا دماغ کمزور ہو گیا ہے۔ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہو۔ ورنہ اپنا بھلا بُرا کچھ تو سوچ لیتے پھر ایسا جواب دیتے۔"

"یہ فیصلہ میرا نہیں، میرے پیچھے کام کرنے والے ذہنوں کا ہے اور ان کی ذہانت کو تم تسلیم کر چکی ہو۔ وہ حالات کا اور تمہارے جیسے کردار کا صحیح تجزیہ کرتے ہیں۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ تمہارے ساتھی نہایت ہی ناقص العقل ہیں اور تم ان سے بھی گئے گزرے ہو۔ ان کی عقل پر چل رہے ہو۔"

"اُن کے ناقص العقل ہونے اور میرے گئے گزرے ہونے پر تمہیں کیا اعتراض ہے ؟"

"اعتراض مجھے نہیں، تمہیں ہوگا اور بہت جلد ہوگا جب دشمن تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیں گے تو تمہیں فرار کا راستہ نہیں ملے گا اور ملے گا تو اس قابل نہیں ہو گے کہ بستر سے اُٹھ بھی سکو۔ تمہاری خیال خوانی کرنے والی وہ رسونتی تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکے گی اور وہ جو تمہاری چاہنے والیاں اِدھر آنے کے لیے پَر تول رہی ہیں تو ان کے یہاں پہنچنے تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"

"تم دادی اماں کی طرح مجھے کیوں سمجھا رہی ہو۔ کچھ باتیں اپنے سمجھنے کے لیے بھی چھوڑ دو۔"

دوسری طرف خاموشی رہی، کمپیوٹر کا اسکرین بھی سادہ رہا، شاید اس کا دماغ بھی سادہ رہ گیا ہوگا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہماری طرف سے ایسا جواب ملے گا۔ میری بہت بڑی کمزوری اس کے ہاتھ آنے کے باوجود میں اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے سے انکار کر دوں گا اور اسے اپنی ذات سے فائدہ پہنچنے کا موقع نہیں دوں گا۔

میں نے کمپیوٹر کو آن رکھا تھا تاکہ وہ کسی وقت بھی جواب دے سکے پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک منٹ کے بعد اشارہ موصول ہوا۔ میں نے دیکھا، اسکرین پر اس کا جواب موصول ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "میں صرف پانچ منٹ کی مہلت دیتی ہوں، اس کے بعد اس اسپتال میں زلزلہ سا آئے گا۔ رسونتی اور اپنی دوسری ہمدردوں سے کہہ دو، وہ تمہارے لیے پانچ منٹ تک دعائیں مانگتی رہیں۔"

رسونتی میرے ذریعے اس کمپیوٹر کا جواب معلوم کرتی جا رہی تھی۔ اس نے چپکے سے کہا "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پتا نہیں، وہ کمبخت کیا کرنے والی ہے۔ میں ابھی سونیا اور اعلیٰ بی بی کو یہ بتا کر آتی ہوں۔ وہ دونوں پانچ منٹ سے پہلے ہی تمہاری حفاظت کے لیے تدبیریں سوچ کر بتائیں گی اور میں ان پر عمل کروں گی۔"

اِدھر وہ گئی اُدھر کمپیوٹر سے اشارہ موصول ہوا۔ میں نے اسکرین کو دیکھا۔ وہ تحریر کی زبان سے کہہ رہی تھی "فرہاد! یہ میری ایک معمولی سی چال ہے۔ میں نے پانچ منٹ کا وقت دے کر رسونتی کو تمہارے دماغ سے جانے پر مجبور کر دیا۔ اب تم

سے آواز دے سکتے ہو تو دو۔ صرف ایک منٹ کے اندر تم پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔"

ایک منٹ تو بہت ہوتا ہے، آدھے منٹ سے بھی کم وقفے میں اچانک میرے کمرے کا دروازہ ایک دھڑاکے سے کھلا۔ وہ من موہنی صورت والی نرس یکبارگی جنونی انداز میں داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے ایسے خوفناک انداز میں میری طرف آئی جیسے کوئی بَلا آتی ہے۔ وہ بڑی تیزی سے آئی تھی اور اتنی ہی تیزی سے اس نے چیخ مارتے ہوئے میرے پھیلے ہوئے ایک بازو پر حملہ کیا۔ یعنی وہ مادام کمپیوٹر جو اس کے دماغ پر چھائی ہوئی تھی، وہ جانتی تھی کہ میرے جسم کے کون کون سے حصے میں زخم آئے ہیں۔ وہ اسی جگہ سب مجھے ضربیں لگانے لگی۔ اس کا پہلا حملہ کامیاب رہا پھر میرے بازو میں درد کی ٹیس اٹھی۔ میں تلملا گیا۔

آدمی خواہ کتنا ہی کمزور ہو، وہ تکلیف کی شدت سے تڑپتا ہے۔ تڑپنے کا مطلب ہے، اس میں اتنی توانائی تو ہے کہ وہ تڑپ سکے، اِدھر سے اُدھر ہو سکے۔ جب مجھ میں اتنی توانائی تھی تو میں نے دوسرا حملہ ہونے سے پہلے ہی اپنے جسم کو اِدھر سے ذرا اُدھر کر لیا۔ اسے ناکامی ہوئی اس کا جنون اور بڑھ گیا۔

یہ وہی مسیحانہ انداز میں مسکرانے والی نرس تھی جو دوا سے نہیں، دُعا سے نہیں، صرف اپنی مسکراہٹ سے مریضوں میں جان ڈال دیتی تھی۔ اب وہ میری جان لینے آئی تھی مگر وہ بے چاری مجبور تھی۔ اپنے آپ میں نہیں تھی۔

اگر حملے سے بچنے والا کمزور ہو تو وہ اضطراری انداز میں کسی نہ کسی چیز کو مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرے پاس تھامنے کے لیے، سہارا لینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صرف بستر کی چادر تھی۔ میں نے دونوں طرف ہاتھ پھیلا کر اس چادر کو مٹھیوں میں بھینچ لیا تھا۔ اِدھر اس نے ناکام ہو کر اچانک ہی چھلانگ لگائی اور بستر کے سرے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ دوسری چھلانگ میں شاید میرے سینے پر کھڑی ہو جاتی لیکن نہیں، اس نے میرے منہ پر ٹھوکر مارنے کے لیے ایک پاؤں کو حرکت دی۔ گویا اس وقت وہ ایک پاؤں پر تھی۔ اس وقت میری حاضر دماغی کام آئی۔ میں نے اپنی مٹھی میں جکڑی ہوئی چادر کو فوراً ہی کھینچ لیا۔ وہ یکبارگی پلنگ کے سرے پر ڈگمگائی اور پیچھے کی طرف اُلٹ کر فرش پر گر پڑی۔

میں نے بے بسی سے آواز دی "رسونتی! جلدی آؤ، کہاں رہ گئی ہو ؟"

"وہاں کہاں تھی، وہاں مشورے لینے گئی تھی اور اب تک نہیں آئی تھی۔ اِدھر مادام کمپیوٹر چاہتی تو پہلی ہی فرصت میں نرس کے ذریعے مجھے گولی مار سکتی تھی لیکن وہ مجھے یکلخت ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے زخموں میں اضافہ کرنا چاہتی تھی تاکہ میں تڑپتا رہوں۔ موت کی بھیک مانگتا رہوں اور مجھے بھیک نہ ملے۔"

ہاں، وہ مجھے مار نہیں سکتی تھی۔ وہ منافع خور اور مفاد پرست تھی۔ مجھے دہشت زدہ کر کے مرنے کی حد تک جسمانی نقصان پہنچا کر ثابت کر رہی تھی کہ مجھے کسی وقت بھی ہلاک کر سکتی ہے۔ رسونتی چوبیس گھنٹے میری نگرانی نہیں کر سکتی تھی اور مجھے دماغی توانائی حاصل کرنے کے لیے جسمانی طور پر صحت مند ہونے کی ضرورت تھی۔

وہ بے چاری خوبصورت، نازک اندام نرس جو فرش پر گر پڑی تھی، یقیناً اسے چوٹیں آئی ہوں گی لیکن آلۂ کار بننے والوں کو احساس نہیں ہوتا۔ اس بار اس نے اٹھتے ہی غرّا کر میری طرف دیکھا پھر کن انکھیوں سے پاس والی میز کو دیکھا جس پر پھل کاٹنے والی چھُری رکھی ہوئی تھی۔

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اپنی تمام قوتوں کو جمع کیا۔ یکبارگی پوری قوت سے کروٹ بدلی اور اپنا ہاتھ بڑھا کر میز تک چھُری پر لے گیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ایک ساتھ چھُری پر پہنچے مگر ایک ساعت کا فرق پڑ گیا۔ اس کا ہاتھ مجھ سے پہلے پہنچا۔ اس نے چھُری کے دستے کو پکڑ لیا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر گیا پھر میں نے فوراً ہی اس کی کلائی پکڑ لی۔

اب یہ وقت آگیا تھا کہ میں ایک عورت سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ یہ گزرتا ہوا وقت بڑے عبرت ناک سبق سکھاتا ہے۔ ہمیں سمجھاتا ہے کہ جو کبھی شہ زور ہوتا ہے، وہ بے انتہا کمزور بھی بن سکتا ہے۔ اتنا کمزور کہ بستر پر کروٹ لیتے وقت جان سی نکلتی ہے۔ ایسے میں بھلا ایک عورت کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور ہو۔

ہم دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانا چاہتی تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے چھُری گرانا چاہتا تھا مگر اس کے دماغ میں جو مادام کمپیوٹر چھائی ہوئی تھی، اس نے چالاکی دکھائی۔ اس ہاتھ کی چھُری کو دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے کلائی کو اور مضبوطی سے جکڑ لیا تاکہ وہ حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپکے تو میں اسے دوسری طرف ہٹا سکوں لیکن وہ بھی گرفت سے نکل کر حملہ کرنا جانتی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ پر چھُری سے حملہ کیا۔ مجھے اپنے بچاؤ کے لیے کلائی چھوڑنا پڑی۔

اب وہ چھُری میرے جسم کے کسی بھی حصے پر پڑ سکتی تھی۔ میں اسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا پھر بھی زخمی ہوتا۔ لات چلاتا تو اس کے بعد لات چلانے کے قابل نہ رہتا، وہ مجھے بُری

طرح زخمی کرنے والی تھی۔

اس نے ایک بار پھر چھلانگ لگائی۔ چیختی چنگھاڑتی ہوئی اچھل کر بستر پر آئی۔ اب کے اس نے مجھے چادر کھینچنے کا موقع نہیں دیا۔ اپنا ایک پاؤں میرے ایک طرف رکھا۔ دوسرا پاؤں دوسری طرف۔ گویا کہ میں اس کے دو قدموں کے درمیان تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر چڑھ بیٹھی۔ ایک ہاتھ سے گریبان کو پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ میں چھری کا پھل چمک رہا تھا۔ اس کی چمک یکبارگی میرے سینے کی طرف آئی جیسے بجلی آسمان سے کڑکتی ہوئی آتی ہے۔

لیکن کڑکتی ہوئی بجلی زمین تک پہنچتے پہنچتے اپنا راستہ بھی بدل لیتی ہے۔ خلافِ توقع اس نرس کے حلق سے ایک چیخ نکلی پیچھے سے اس کے بالوں کو کسی نے جکڑ لیا تھا پھر اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ ایک سیکورٹی گارڈ تھا۔ میرے کمرے میں ہونے والے ہنگامے کی آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر موڑ دی۔ چھری ایک طرف فرش پر گر پڑی۔ اس نے نرس کو دوسری طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "یُو بلڈی سسٹر! تم دشمنوں کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تمھاری جیسی معصوم صورت والی ہمارے خاص آدمی کی دشمن بن جائے گی۔"

وہ نرس فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر حیران حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اِدھر اچانک ہی سیکورٹی گارڈ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

اس سے پہلے کہ میں قہقہے کا مطلب سمجھتا۔ وہ یکبارگی پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا گھونسا میرے منہ پر پڑ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ جسمانی طور پر کمزور ہونے کے بعد وہ گھونسا کتنی زور سے ہتھوڑے کی طرح لگا تھا۔ میں تِلملا کر رہ گیا۔ شدید تکلیف کی حالت میں تلملانے کا مطلب ہوتا ہے جواباً غصّے میں آجانا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی دونوں انگلیاں اس کی آنکھوں میں پیوست کر دینے کی کوشش کی۔ اس میں ناکامی تو ہوئی لیکن دونوں انگلیاں اس حد تک اس کی آنکھوں میں جا کر لگیں کہ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر انھیں سہلانے لگا پھر وہ جھنجلا کر بولا۔ "تم کمزور ہوتے ہوئے بھی زور دکھا رہے ہو لیکن کب تک؟ میں تمھیں ایسے زخم پہنچاؤں گی کہ . . ."

وہ اپنی بات اُدھوری چھوڑ کر اس چھری کی طرف گیا جو فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ مردانہ آواز سے بول رہا تھا مگر اس کے دماغ سے مادام کمپیوٹر بول رہی تھی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو رہی تھی۔ اس کی مرضی کے مطابق سیکورٹی گارڈ نے چھری کو اٹھا لیا پھر دوڑتا ہوا میرے پلنگ تک آیا۔ اس کا چھری والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا لیکن پھر آسمان سے کڑکتی ہوئی بجلی زمین تک پہنچتے پہنچتے اپنا راستہ بدل چکی تھی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس بار کوئی تیسرا مجھے بچانے نہیں آیا تھا۔ کسی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر مجھ سے دور نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ ٹیلی پیتھی کا عمل تھا۔ رسونتی پہنچ گئی تھی۔

چھری ایک بار پھر گر پڑی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اتنی دیر میں کچھ اور سیکورٹی گارڈز اور ان کا ایک افسر آ گیا تھا۔ سر پکڑ کر کراہنے والے نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "سر! یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ آپ میں سے کوئی اپنی آواز نہ سنائے۔ ایک لفظ منہ سے ادا نہ کرے۔ کسی نے مجھے اور اس نرس کو ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کیا تھا۔"

آفیسر بے یقینی سے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "نو سر! ایک لفظ زبان سے نہ نکالیں، کوئی سوال نہ کریں۔ میں جواب دیتا ہوں۔ آپ یقین کریں، پہلے اسے ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کر کے مسٹر بابر پر حملہ کرایا جا رہا تھا۔ جب میں نے اسے قابو میں کرنا چاہا تو خود بے قابو ہو گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا، میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مسٹر بابر پر حملہ کر رہا ہوں۔ سمجھ رہا تھا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن حملہ کرتا جا رہا تھا۔"

میں یوں ہانپ رہا تھا جیسے بہت دیر سے دوڑتا اور لڑتا رہا ہوں حالانکہ بستر پر ہی پڑا ہوا تھا۔ میرے جسم کا ایک ایک زخم چیخ رہا تھا، درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا، سر چکرا رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے کہا۔ "آفیسر! آپ کا یہ سیکورٹی گارڈ درست کہہ رہا ہے۔ آپ میں سے کوئی اپنی آواز نہ سنائے۔ ایک لفظ زبان سے ادا نہ کرے ورنہ وہ ٹیلی پیتھی جاننے والی بلا کی گرفت میں آجائے گا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں، میرے کمرے کے باہر جتنے سیکورٹی گارڈز آپس میں باتیں کرتے رہے ہیں، انھیں چھٹی دے دی جائے۔ ایسے لوگوں کو یہاں لایا جائے جو ہمیشہ گونگے بن کر رہ سکیں۔ نہ کمرے میں آ کر، نہ کمرے سے باہر کسی سے گفتگو کریں۔ کوئی ضرورت ہو تو اشاروں کی زبان استعمال کریں۔"

پھر میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں ناقابلِ برداشت تکلیف میں مبتلا ہوں۔ پلیز، ڈاکٹر کو بلائیے۔"

نرس آگے بڑھنا چاہتی تھی پھر رک گئی۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر روتے ہوئے بولی۔ "نہیں نہیں، میں اس قابل نہیں ہوں کہ مریض کے قریب بھی جا سکوں۔"

جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہ رسونتی کی مرضی کے مطابق کہنے لگا۔ "سسٹر! تمھارا قصور نہیں ہے۔ پھر بھی تم یہاں ڈیوٹی پر نہیں رہو گی۔ تم جا سکتی ہو۔ یہاں دوسری نرس کی ڈیوٹی لگائی جائے گی، وہ ہمیشہ گونگی بن کر رہے گی۔ ڈاکٹر گونگے نہیں رہ سکتے۔ انھیں اسپتال کے دوسرے مریضوں سے کچھ بولنا ہی پڑتا ہے۔"

نرس نے سوال کیا۔ "اگر اسے بھی ٹیلی پیتھی کے ذریعے ٹریپ کیا گیا تو؟"

"جب کوئی ڈاکٹر مسٹر بابر کے قریب آئے گا تو ہمارے سیکورٹی گارڈز اس کے آس پاس رہیں گے اور محتاط رہیں گے۔"

وہ وہاں سے چلے گئے۔ اب نئے افراد ڈیوٹی پر آنے والے تھے۔ کمپیوٹر سے اشارہ موصول ہونے لگا۔ میں نے اسے آن کر کے غصّے سے دیکھا۔ اسکرین پر وہ اپنی تحریر پیش کر رہی تھی۔ "خواہ مخواہ احتیاط برتی جا رہی ہے۔ میں تو تمھارے سامنے ایک نمونہ پیش کر رہی تھی تاکہ رسونتی اور تمھاری دوسری چاہنے والیاں دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ میں ان کی ذرا سی غفلت سے تمھیں نقصان پہنچا سکتی ہوں۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "تم میری دماغی توانائی حاصل کرنے تک یہ ہتھکنڈے استعمال کر سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے، کل تک دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔"

"کل بہت دور ہے۔ میں صرف آدھے گھنٹے کی مہلت دیتی ہوں۔ اس کے بعد بھی تم خوش فہمی میں مبتلا رہے تو آئندہ باہر سے کسی کے ذریعے حملہ نہیں کراؤں گی۔ تمھارے دماغ میں چوکنا رہوں گی۔ جب بھی رسونتی غیر حاضر رہے گی، تمھیں شدید جھٹکے پہنچاتی رہوں گی۔ تمھارا سارا وجود لرزتا رہے گا، تم چیختے رہو گے، رسونتی کو پکارتے رہو گے لیکن تمھارے دماغ میں میرے سوا کوئی نہ ہو گا۔ انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہی ہوں، دیکھتی ہوں، رسونتی کب تک جاگتی رہے گی۔ کب تک تمھاری حفاظت کرتی رہے گی۔"

اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ جواب دے سکتا۔ میری کراہیں ٹرانسمیٹر کے ذریعے مادام کمپیوٹر تک پہنچ رہی تھیں۔ اس نے تحریر کے ذریعے کہا۔ "میں جا رہی ہوں، آدھے گھنٹے بعد آؤں گی۔ میرے آنے کے بعد تم کراہنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

اسکرین سادہ ہو گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے آف کر دیا۔ اسی وقت ڈاکٹر ایک نئی نرس کے ساتھ آیا اور میرے زخموں کا معائنہ کرنے لگا۔ مجھے ایک دوا پینے کے لیے دی، ایک انجکشن لگایا تاکہ تکلیف میں کمی ہو سکے اور میں آرام سے سو جاؤں لیکن میرے جسم کی عمارت ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ جگہ جگہ زخموں سے خون رسنے لگا تھا، ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں ایک انجکشن کے ذریعے نہیں سو سکتا تھا۔ رسونتی نے مجھے ٹیلی پیتھی کے ذریعے سلانا شروع کیا۔ صرف پانچ منٹ کے بعد ہی میں خیال خوانی کے ذریعے سو گیا۔

آنکھ لگنے کے بعد میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اس دوران مادام کمپیوٹر میرے پاس آسکتی تھی، مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی لیکن میں سوتا رہا پھر میں نے خواب میں دیکھا۔ ایک ایسے آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا ہوں جس پر سفید چادر بچھی ہوئی ہے۔ میرے سامنے رسونتی کھڑی تھی۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی۔ "تم رسونتی کے سامنے موجود ہو۔ تم پر تنویمی عمل کیا جا رہا ہے۔ تم میرے معمول بن کر رہو گے۔"

میں نے جواب میں کہا۔ "میں تمھارا معمول بن کر رہوں گا۔"

پھر وہ مجھ پر عمل کرنے لگی۔ جن تنویمی عمل کے مراحل سے میں اپنے معمول یا معمولہ کو گزارتا رہتا تھا، آج خود ان مراحل سے گزر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، میں سن رہا تھا اور ایک تابعدار کی حیثیت سے جواب دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بالکل اس کی گرفت میں آ گیا، بے بس ہو گیا۔ وہ جو کہتی تھی، اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا اور اسی کی مرضی کے مطابق مجھے کہنا پڑتا تھا اور عمل کرنا پڑتا تھا۔ آخر اس نے حکم دیا۔ "میں تمھارے دماغ کو لاک کر دیتی ہوں۔ تمھارا دماغ اگلے پندرہ گھنٹوں تک مقفّل رہے گا۔ تم باہر سے ہونے والے کسی ناپسندیدہ عمل کو قبول نہیں کرو گے۔"

"میں باہر سے ہونے والے کسی ناپسندیدہ عمل کو قبول نہیں کروں گا۔"

"تمھیں چوٹیں پہنچائی جائیں گی مگر تمھارا دماغ بے حس رہے گا، تم تکلیف محسوس نہیں کرو گے۔"

"مجھے چوٹیں پہنچائی جائیں گی، میرا دماغ بے حس رہے گا اور میں تکلیف محسوس نہیں کروں گا۔"

"تمھارے دماغ میں ایک سوچ کی لہر بھی پیدا نہیں ہو گی خواہ وہ تمھاری اپنی سوچ کیوں نہ ہو۔"

میں نے اس کی بات دہرائی۔ اس نے کہا۔ "نہ سوچنے کا مطلب ہے، دماغ کا ٹھہر جانا۔ تم اگلے چوبیس گھنٹے تک ساکت رہو گے۔ صرف سانس لیتے رہو گے۔ تمھاری آنکھیں

کھلی رہیں گی۔ چونکہ تم باہر کے کسی عمل کو محسوس نہیں کر سکو گے لہٰذا دیکھتے ہوئے بھی کسی کو نہیں دیکھ سکو گے۔ سُنتے ہوئے بھی کسی کو نہیں سن سکو گے۔ میں تنویمی عمل کے ذریعے تمھاری زندگی کو چوبیس گھنٹے کے لیے ایک مقام پر روک رہی ہوں۔ تم صرف سانس لیتے رہو گے اور تمھارا دل دھڑکتا رہے گا۔"

میرا دل اور میرا دماغ اس کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ اس کے تنویمی عمل سے متاثر ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے آنکھیں کھولنے کے لیے کہا، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس نے آخری الفاظ کہے "تم چوبیس گھنٹے کے لیے میرے معمول ہو۔ اس کے بعد تنویمی عمل سے آزاد ہو جاؤ گے۔"

آنکھ کھولنے کے بعد وہ خواب کا سا منظر نہیں رہا تھا، رسونتی نگاہوں کے سامنے نہیں تھی۔ وہی اسپتال کا کمرہ تھا لیکن تنویمی عمل کے زیرِ اثر میں اس کمرے کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ دیواروں، پردوں اور گلدانوں میں سجے ہوئے پھولوں کے رنگ جھلک رہے تھے مگر ان رنگوں کی پہچان نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ گزر چکا ہوگا، اس دوران کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے اشارہ موصول ہوا ہوگا لیکن مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد مادام کمپیوٹر نے اپنے چیلنج کے مطابق میرے دماغ میں پہنچنے کی کوشش کی ہوگی لیکن دماغ کو مقفّل پایا ہوگا۔ دماغ کے مقفّل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے دروازے اور کھڑکیاں ہیں، انھیں بند کر دیا جاتا ہے اور تالا لگا دیا جاتا ہے۔ اصل میں بیرونی اثرات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کی بات ہے اگر دماغ کسی تنویمی عمل کے ذریعے بیرونی اثرات کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، وہ بے حس ہو چکا ہے۔ باہر کا کوئی اثر قبول نہیں کرے گا لہٰذا مقفّل ہے۔

یہ پابندی صرف مادام کمپیوٹر کے لیے نہیں تھی۔ اب تو رسونتی خود بھی اپنے تنویمی عمل کے بعد میرے دماغ میں نہیں آسکتی تھی۔ اسے چیلنج کیا گیا تھا کہ وہ کب تک میرے دماغ میں رہے گی، کب تک میری نگرانی کرے گی۔ آخر تھوڑی دیر کے لیے تو سونے، کھانے پینے یا دوسری ضروریات کے لیے میرے پاس سے غافل رہے گی۔ اب وہ بالکل ہی مجھ سے غافل ہو گئی تھی۔ نہ خود آنے والی تھی نہ کسی کو آنے کا موقع دے سکتی تھی۔ یقیناً سونیا اور اعلیٰ بی بی نے اسے یہ طریقۂ کار سمجھایا ہوگا اور میں اس کے نتیجے میں کسی حد تک محفوظ تھا۔

ہاں، اب باہر سے حملہ آور آسکتے تھے لیکن پندرہ گھنٹے کے بعد جب میں تنویمی عمل سے آزاد ہوا تھا تب مجھے پتا چلا کہ میرے کمرے کو بند کر دیا گیا تھا۔ صرف ضرورت کے وقت ڈاکٹر میرا معائنہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ میں کوما میں ہوں۔ نہ بول سکتا ہوں نہ سن سکتا ہوں، دیکھ سکتا ہوں، نہ سمجھ سکتا ہوں، صرف سانس لے رہا ہوں اور میرے دل کی دھڑکنیں جاری ہیں۔

مجھ پر تنویمی عمل کرنے کے بعد رسونتی نے سیکرٹ سروس کے چیف کو میرے حالات تفصیل سے بتا دیے تھے۔ اسی کے مطابق چیف نے اپنے کچھ خاص آدمیوں کا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ ڈاکٹروں کو سمجھا دیا گیا تھا کہ نہ بابر کو دیکھنے کی ضرورت ہے نہ دوائیں دینے کی ضرورت ہے۔ جب کسی ڈاکٹر کو بابر کے معائنے کے لیے بلایا جائے گا تو وہ کمرے میں جا سکیں گے۔ سیکرٹ سروس کا ایک خاص ایجنٹ میرے کمرے میں اکثر آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔

دوسری صبح آمنہ میرے پاس آنا چاہتی تھی۔ اسے بھی تمام حالات سے مطلع کرنے کے بعد میرے پاس آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ سمجھ دار تھی، جذباتی انداز میں آکر میری دیکھ بھال کرنے کی ضد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مادام کمپیوٹر کو موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اسے آلۂ کار بنا سکے۔

پتا نہیں، مادام کمپیوٹر کتنی بار میرے دماغ میں آنے کی کوشش کر چکی ہوگی اور بار بار ناکام رہی ہوگی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ تنویمی عمل کتنے عرصے کے لیے کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس کے جوابی اقدامات کے متعلق بعد میں معلوم ہونے والا تھا۔

اس عرصے میں اسپتال کے چاروں طرف سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ جو لوگ اپنے مریضوں کو دیکھنے آتے تھے انھیں تلاشی دینا پڑتی تھی۔ ان میں سے بھی صرف خاص رشتے دار ہی اپنے مریض کو دیکھنے کے لیے چند منٹ کے لیے جاتے تھے پھر انھیں اسپتال سے باہر بھیج دیا جاتا تھا۔ میرے کمرے کے اطراف دور دور تک کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ آس پاس کے کمرے بھی خالی کرا لیے گئے تھے۔

اگر مادام کمپیوٹر نے میری حقیقت ظاہر نہیں کی ہوگی تو دشمنوں کے درمیان کھچڑی پک رہی ہوگی۔ یہ بات ان کے لیے بڑی حیران کن ہو سکتی ہے کہ بابر جیسا مجرم جو ایک ٹی ٹی سینٹر سے وابستہ رہا ہے، اس کی اتنی حفاظت کیوں کی جا رہی ہے؟ کیا اس لیے کہ اس کے ذریعے دہشت گرد تنظیموں کے افراد بے نقاب ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ان کے خلاف حکومت کا اعتماد حاصل کرتا جا رہا ہے۔ دہشت گرد تنظیموں کے سربراہ مادام کمپیوٹر سے نالاں ہوں گے کہ اس نے اب تک مجھے اپنے قابو میں نہیں کیا ہے۔ انھیں معلوم تھا، کم کریزی سے مقابلہ کرنے اور اسے ہلاک کرنے کے بعد میں بھی جسمانی اور دماغی طور پر کمزور ہو گیا ہوں۔ مادام کمپیوٹر بہ آسانی

میرے دماغ میں پہنچ سکتی تھی پھر کیوں نہیں پہنچ رہی ہے۔ وہ چاہے تو میرا قصہ تمام کر سکتی ہے۔ میں کراچی سے یہاں تک ان کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ وہ اس دردِ سر کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتی تھی۔

اور اگر مادام کمپیوٹر نے تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کے سامنے میری اصلیت ظاہر کر دی ہوگی تو دشمن سخت پہروں سے گزر کر مجھ تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش کریں گے۔ خصوصاً ماسٹر کی اپنے چیلنج کے مطابق مجھے کمزور سے کمزور تر بنانے کے لیے یہاں ضرور پہنچے گا۔ شاید سونیا اور اعلیٰ بی بی یہی چاہتی تھیں کہ ماسٹر کی فرہاد کو چارہ سمجھ کر اسرار کے پردے سے نکل آئے۔

ابھی تنویمی عمل کے پندرہ گھنٹے پورے نہیں ہوئے تھے، میں بستر پر ساکت پڑا ہوا تھا۔ مقررہ وقت کے بعد جو کچھ پیش آنا ہے، وہ تو ضرور آئے گا۔ اس سے پہلے ریحانہ، حُور بانو اور کرم داد لاہور پہنچ گئے تھے۔ کرم داد کو خفیہ پولیس والوں نے ایک ٹرانسمیٹر دے دیا تھا تاکہ وہ کسی وقت بھی رابطہ قائم کر سکے۔

وہ بہت عرصے بعد لاہور آئے تھے۔ ریحانہ کو یاد تھا کہ اس کے بھائی کی کوٹھی کہاں ہے۔ ایک بھائی شاہنواز پیرس میں خودکشی کر چکا تھا۔ جیسا کہ اس کے علم میں آیا تھا، دوسرا بھائی رب نواز لاہور میں تھا۔ وہ کرم داد اور حور بانو کو لے کر اس کوٹھی میں پہنچی۔ پہلی نظر میں کوٹھی ویران ویران سی لگی۔ ان کی ٹیکسی پورچ میں آکر رک گئی۔ وہ کرایہ ادا کرنے کے بعد کوٹھی کے دروازے پر آئے۔ ایک ملازم نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ ریحانہ کو پہچان کر سلام کیا۔ اس نے سوال کیا "بھائی جان کہاں ہیں؟"

"آپ اندر تشریف لائیں۔ وہ موجود نہیں ہیں۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ریحانہ نے کہا "تم یہاں بیٹھو، میں اندر جا کر دیکھتی ہوں۔"

وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ ملازم نے کہا "بی بی جی! صاحب نے آپ کے لیے ایک پیغام چھوڑا ہے۔ وہ پیغام اس کمرے میں ہے۔"

ملازم نے ایک کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ وہاں پہنچی، کمرہ خالی خالی سا تھا۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں اور وہ تصویریں چونکا دینے والی تھیں۔ کرم داد ان تصویروں میں شاہنواز کی پٹائی کر رہا تھا۔ ایک دیوار پر سفید اسکرین لگا دیا گیا تھا۔ اسکرین سے کچھ فاصلے پر ایک پروجیکٹر رکھا ہوا تھا۔ ملازم نے کہا "صاحب نے کہا ہے کہ آپ اس پروجیکٹر کو آن کر کے اس میں لگی ہوئی فلم دیکھ لیں۔"

اس نے آگے بڑھ کر اسے آن کیا۔ اسکرین روشن ہوا پھر اسے اپنے بھائی جان رب نواز کی تصویر نظر آئی۔ وہ اسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا "ریحانہ! تم یہاں آرہی ہو، یہ بات مجھے معلوم ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا، ہمارا پرانا دشمن بھی تمھارے ساتھ آرہا ہے اور تمھارا جیون ساتھی بن کر آرہا ہے۔ تم نے اس کے ساتھ مل کر ہم سے اور اپنے باپ سے جو دشمنی کی، اس کی مثال نہیں ملتی۔ کوئی لڑکی اپنے باپ اور بھائی کی ایسی دشمن نہیں ہوتی جیسی تم ہو۔"

اس کا بھائی رب نواز جہاں کھڑا ہو کر اسے مخاطب کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار پر ان کے مقتول والد کی تصویر نظر آرہی تھی۔ بہت عرصے بعد باپ کی صورت دیکھ کر ریحانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

رب نواز کہہ رہا تھا "میں شاید تم سے کبھی بات نہ کرتا۔ تمھیں یہاں آنے کا موقع ہی نہ دیتا۔ اس سے پہلے کرم داد کو گولی مار دیتا جب سے تم اسے لے کر پیرس گئی ہو، ماسٹر کی سے ہمارے تعلقات پہلے جیسے نہیں رہے لیکن کل سے ماسٹر کی مجھ پر مہربان ہو گیا ہے۔ اس نے کرم داد کے خلاف ایسے ثبوت فراہم کیے ہیں جنھیں تم دیکھو گی تو آنکھیں کھُل جائیں گی۔ دوست اور دشمن کی پہچان ہو جائے گی۔

ریحانہ! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم دشمن کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئیں اور ہمیں بھی نقصان پہنچایا۔ میں یہ ثابت کرنے والا ہوں کہ وہ بدبخت ہمارا، ہمارے خاندان کا بدترین دشمن ہے۔ وہ ہم سب کو آہستہ آہستہ مٹا ڈالنے کے بعد آخر میں تمھیں بھی ختم کر ڈالے گا اور اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ وہ مجھے مارنے کے بعد تمھیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تم جواب دو، اگر وہ مجرم ثابت ہو جائے اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ وہ تمھارا بھی بدترین دشمن ہے اور تمھیں بھی نقصان پہنچا سکتا ہے تو کیا تم اپنے ہاتھوں سے اُسے ختم کر سکو گی۔ اگر نہیں تو پھر میرا انتظار کرنا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم ہمارے راستے میں نہ آنا۔

میں جانتا ہوں۔ جس وقت میں تم سے مخاطب ہوں گا اس وقت دشمن میرے ہی گھر میں بیٹھا ہوگا۔ اگر تم یہ موقع ہاتھ سے جانے دو گی تو ہم سب ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائیں گے، ہم مٹ جائیں گے، ہمارا خاندان مٹ جائے گا۔ اب اس اسکرین پر جو کچھ تم دیکھو گی ـــــ اس کے بعد میری اور تمھاری سلامتی کا سوال ہے، یا تو ہم سلامت رہ جائیں یا ہمارا دشمن۔ اب ریل نمبر دو اس پروجیکٹر میں لگاؤ اور اسے دیکھو۔"

اس نے پروجیکٹر کو آف کیا، پہلی ریل نکالی، ریل نمبر دو کو اس میں لگایا پھر اس کو آن کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی اسکرین

پر پیرس کا منظر دکھائی دیا۔ بڈ اینڈ اسپنسر کی بلڈنگ نظر آئی۔ اس کی سب سے اونچی منزل کا ایک کمرہ دکھائی دیا پھر کمرے کا اندرونی منظر نظر آتے ہی ریحانہ چونک گئی۔ کرم داد اس کمرے کے اندر شاہنواز کی پٹائی کر رہا تھا اور جو کچھ بولتا جا رہا تھا، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے اب سے پہلے صرف شاہنواز کو ہی نہیں بلکہ ان کے باپ کو بھی قتل کرنے کے لیے اسی کھیت میں بلایا تھا جہاں بہت عرصے پہلے اس کے باپ نے کرم داد کے باپ کو قتل کیا تھا۔

وہ شاہنواز کی پٹائی کرنے کے دوران ایسی باتیں کہہ رہا تھا جن سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ریحانہ کے خاندان کا کیسا بدترین دشمن ہے اور جس سے محبت کا دم بھرتا ہے اس سے یہ ساری باتیں چھپاتا آیا ہے حتیٰ کہ شاہنواز کے قتل کو خودکشی کا کیس ثابت کیا گیا تھا۔ اس میں کرم داد کا بھی ہاتھ تھا۔ اب اسکرین پر حقیقت کھل رہی تھی۔ کرم داد اس کے بھائی کو مارتا ہوا اسے کھڑکی کے پاس لے گیا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا کہ یا تو وہ خود کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے یا پھر اس کے ہاتھ سے مار کھاتا رہے۔ آخر کار وہ اسے مارتا ہوا ایسی پوزیشن میں لے آیا تھا کہ شاہنواز کی ٹانگیں پکڑ کر دوسری طرف الٹا دیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی آخری چیخ سنائی دی تھی۔ اس کے بعد ظاہر ہے وہ اس بلند ترین عمارت سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔

وہ منظر ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ بڑا سا ہال نظر آ رہا تھا جہاں ریحانہ، کرم داد کے ساتھ پہلی بار گئی تھی اور ماسٹر کی نے کرم داد کو نیٹ ورک سینٹر میں داخل کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ اس بڑے ہال کے وسط میں ایک دائرہ نما چبوترا تھا۔ اس چبوترے پر ایک ریوالونگ چیئر رکھی ہوئی تھی۔ اس چیئر نے گھوم کر کہا۔ "ہیلو ریحانہ! کیا یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ماسٹر کی تم سے مخاطب ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے دوغلے محبوب کی حرکتوں کا اتنا سا نمونہ کافی ہے۔ اگر تمھیں عقل آگئی ہے تو اس پروجیکٹر کے نیچے ایک پستول رکھا ہوا ہے۔ اسے اٹھاؤ اور کرم داد کو گولی مار دو۔"

ریحانہ نے پروجیکٹر کے نیچے میز کی سطح پر ایک پستول کو دیکھا پھر اسے اٹھا لیا۔ ریوالونگ چیئر ماسٹر کی کے انداز میں بول رہی تھی "ایک بات یاد رکھو۔ اگر تم اسے گولی نہیں مارو گی تو وہ تمہارے بھائی کو ضرور مارے گا۔ پھر کیوں نہ ہم تمہارے بھائی کو مار ڈالیں؟"

ریحانہ نے چونک کر توجہ سے اس کی بات سنی۔ وہ کہہ رہا تھا "اب سے پہلے تم نے جو ریل نمبر ایک میں اپنے بھائی کو دیکھا، اس فلم کو ہمارے آدمیوں نے کل رات اسی کوٹھی میں تیار کیا۔ اسے تیار کرنے کے بعد اسے اغوا کر لیا گیا، جانتی ہو کیوں؟

اس لیے کہ تم کرم داد کی دشمنی کے یہ سارے تماشے دیکھنے کے باوجود اس دشمن کو گلے لگا کر رکھنا چاہو گی اور محبت میں قسمیں وعدے لو گی کہ وہ تمہارے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ نقصان تو ہم پہنچائیں گے۔ اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو کرم داد کو گولی مار دو یا اپنے بھائی کی لاش کا انتظار کرو۔ دو میں سے کوئی ایک مرے گا۔

جس وقت تم اس کوٹھی میں پہنچو گی، اس کے ایک گھنٹے کے اندر تمھیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم اپنے فیصلے پر عمل کریں گے۔"

ریحانہ نے پروجیکٹر کو آف کیا، اس میں سے ریل نکال کر اسے ریوائنڈ کیا پھر دوبارہ اسے پروجیکٹر میں لگا دیا۔ اس دوران وہ پسینہ پسینہ ہو گئی تھی حالانکہ گرمی کا موسم نہیں تھا لیکن اس کے اندر لو چل رہی تھی۔ دل اور دماغ میں جہنم دہک رہا تھا۔

وہ اس کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ویران صحرا میں ہو، نہ کوئی اس کا اپنا ہو نہ پرایا ہو۔ وہ دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہو۔ جسے ہمیشہ کے لیے اپنایا تھا، جسے اپنی عزت آبرو کا رکھوالا سمجھتی تھی، وہی آستین کا سانپ نکلا تھا۔

وہ ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ کرم داد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا "تمہارے بھائی جان کہاں ہیں؟ یہاں اجنبیت سی محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ سپاٹ لہجے میں بولی "میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر پلٹ گئی۔ جدھر سے آئی تھی، ادھر جانے لگی۔ کرم داد نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "سنو تو! کہاں لے جانا چاہتی ہو، کیا دکھانا چاہتی ہو؟"

وہ کچھ نہیں بول رہی تھی، چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ پھر ڈرائنگ روم کے دروازے سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

حور بانو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "یہ کچھ عجیب سی لگ رہی ہے۔ کچھ دیر پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ اسے کیا ہو گیا ہے، ہمیں دیکھنا چاہیے۔"

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکلے۔ ریحانہ ان سے کچھ آگے ایک کمرے میں داخل ہو رہی تھی،

وہ بھی اس کے پیچھے کمرے میں آئے۔ پھر کرم داد اس خالی کمرے کی دیواریں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ بڑی بڑی تصویروں میں نظر آ رہا تھا۔ حور بانو نے بھی حیرانی سے دیکھا۔ پھر پوچھا "کرم داد! یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ یہ تصویریں یہاں کیوں لگائی گئی ہیں؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ ریحانہ نے کہا "حور بانو کی باتوں کا جواب دو۔"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا "پتا نہیں، یہ تصویریں کیسی بنائی گئی ہیں۔ میں نے تمہارے بھائی سے کبھی لڑائی نہیں کی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "ہاں، تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لیے اپنانے کے بعد میرے دونوں بھائیوں کو معاف کر دو گے، ان سے کبھی انتقام نہیں لو گے۔ ذرا اس پروجیکٹر کو آن کرو۔ تمہاری سچائی کا پول کھل جائے گا۔"

کرم داد نے اس پروجیکٹر کو دیکھا پھر کہا "معلوم ہوتا ہے، دشمنوں نے ہمارے درمیان فاصلے پیدا کرنے کے لیے، ہماری محبت کو نفرت میں بدلنے کے لیے کوئی چال چلی ہے اور تم اس فریب میں آگئی ہو۔"

"تم پروجیکٹر آن کرو۔ اگر کوئی غلط بات ہو اور میں کوئی غلطی کرنے لگوں تو مجھے روک دینا۔"

کرم داد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر پروجیکٹر کو آن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اسکرین روشن ہوا پھر وہی مناظر دکھائی دینے لگے۔ حور بانو بھی حیرانی سے دیکھ رہی تھی ابھی جن تصویروں کو اس نے دیوار پر دیکھا تھا، اب وہ اسکرین پر متحرک تھیں۔ کرم داد، ریحانہ کے بھائی شاہنواز کی پٹائی کر رہا تھا۔ آخر اس نے بلند عمارت سے اسے نیچے پھینک دیا یعنی اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اس کے بعد اسکرین پر ایک ریوالونگ چیئر دکھائی دی۔ وہ کسی شخص کی آواز میں بول رہی تھی۔ اس کے بولنے پر حور بانو کو پتا چلا، وہ ماسٹر کی بول رہا ہے۔ ریحانہ سے کہہ رہا ہے، اگر وہ اپنے بدترین دشمن کو جو زندگی کا ساتھی بنا ہوا ہے، ہلاک کرنا چاہتی ہے تو پروجیکٹر کے نیچے ایک پستول رکھا ہوا ہے۔

کرم داد نے چونک کر اس جگہ دیکھا۔ وہاں پستول نہیں تھا پھر اس نے سر گھما کر ریحانہ کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پستول لیے کھڑی ہوئی تھی اور پستول کا نشانہ ٹھیک اس کے دل کا تھا۔

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا "کیا تم مجھے گولی مارو گی؟ کیا میں نے تم سے کبھی دشمنی کی ہے؟"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "دشمنی اور کسے کہتے ہیں؟"

اس نے حور بانو سے کہا "تم نہیں جانتیں، یہ وہ شخص ہے جس کے لیے میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ میرا وہ شوہر ہے جو پہلی بار میری عزت کا دشمن بن کر آیا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کی ہو چکی ہوں اور اس کے بعد کسی دوسرے کا منہ نہیں دیکھ سکتی تو میں نے اس کی خاطر اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا۔"

کرم داد آگے بڑھنا چاہتا تھا، وہ ڈپٹ کر بولی "خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔ نہیں تو گولی چل جائے گی۔"

وہ اپنی جگہ رک گیا۔ ریحانہ نے کہا "حور بانو! میں وہ بدنصیب عورت ہوں جس کی آنکھوں کے سامنے اس شخص نے میری ماں کو قتل کر دیا پھر مجھے دھوکے میں رکھ کر میرے باپ کو یہاں سے بہت دور جانے کن کھیتوں میں بلایا اور وہاں انھیں بھی ہلاک کر ڈالا۔ اس کے بعد پیرس پہنچ کر میرے بھائی شاہنواز کو مار ڈالا جس کا تماشا تم اسکرین پر دیکھ چکی ہو۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "یہ ایک طرف میری ماں، میرے باپ اور میرے بھائی کو چن چن کر قتل کرتا رہا اور دوسری طرف میری محبت کا دم بھرتا رہا۔"

یہ کہتے کہتے وہ زار و قطار رونے لگی۔ کرم داد ایک قدم آگے بڑھا، اس کے ساتھ ہی گولی چلی۔ وہ گولی اس کے پاؤں کے پاس قالین کو ادھیڑتے ہوئے گزر گئی۔ حور بانو فوراً ہی ان کے درمیان آگئی۔ کرم داد کے سامنے ڈھال بن کر بولی "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"میں نے ابھی نشانہ نہیں لیا ہے، صرف دھمکی دی ہے۔ حور بانو تم عورت ہو، تم بتاؤ ایسے وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تم نے ابھی ماسٹر کی کو بولتے ہوئے سنا ہے۔ اس نے میرے بھائی جان کو اغوا کیا ہے اور یہ شرط لگا دی ہے کہ میں کرم داد کو نہیں ماروں گی تو وہ میرے بھائی کو مار ڈالے گا۔ اب میرے میکے میں صرف ایک بھائی رہ گیا ہے۔ تم جس کے لیے ڈھال بن گئی ہو، اس سے پوچھو۔ وہ اپنے دل سے، اپنے ایمان سے جواب دے۔ کیا یہ میرے اس آخری بھائی کو مارنے کے لیے نہیں آیا ہے؟"

کرم داد نے کہا "شاید تم میری بات کا یقین نہ کرو۔ میں یہ سوچ کر آیا ہوں کہ اگر تمہارے بھائی نے دشمنی نہیں کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو میں تمہاری محبت کی خاطر انتقامی جذبے کو بھول جاؤں گا۔"

"تم ہمیشہ جھوٹ بولتے آئے ہو۔ آج سچ کیسے بول سکتے ہو۔ پہلے بھی تم نے کہا تھا، میری محبت کو پا لینے کے بعد میرے والدین سے انتقام نہیں لو گے لیکن تم نے فریب دیا۔ یہاں بھی میری محبت کی قسمیں کھا رہے ہو تو میں کیسے یقین

کروں اور اگر یقین کر بھی لوں تو اس کا وقت گزر چکا ہے۔ تم میرے بھائی جان کو نہیں مار و گے، دشمن مار ڈالیں گے۔ ان کی تو ایک ہی شرط ہے۔ یا تو میں تمھیں گولی مار دوں یا پھر اپنے بھائی کی لاش کا انتظار کروں۔"

کرم داد نے حور بانو کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا "مجھے مار ڈالو۔ میری یہی سزا ہے۔ میں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز ریحانہ کو دھوکا دیا۔ تم مجھ پر اعتماد کرتی رہیں اور میں تمھارے خاندان والوں کو قتل کرتا رہا۔ میری یہی سزا ہے۔ میرے مرنے کے بعد تمھیں یقین آجائے گا کہ وہ کرم داد جو کسی کے آگے نہیں جھکتا، کسی سے شکست تسلیم نہیں کرتا، وہ تمھارے آگے سر جھکا کر مر گیا۔ لو، میں حاضر ہوں۔"

حور بانو پریشان ہو کر کبھی ریحانہ کے ہاتھ میں پستول کو دیکھ رہی تھی، کبھی کرم داد کو اور سوچ رہی تھی۔ کیا سچ مچ ریحانہ اسے مار ڈالے گی جسے وہ جان سے زیادہ چاہتی ہے؟

ریحانہ نے پوچھا "حور بانو! تم ایک عورت ہو، تم فیصلہ کرو، مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں تو یہی کہوں گی، پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر ماسٹر کی نے ایک گھنٹے کا وقت دیا ہے تو ہم کسی طرح تمھارے بھائی رب نواز کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اسے دشمنوں کے ہاتھوں مرنے نہیں دیں گے۔"

"میں یہی جواب کرم داد کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔"

کرم داد نے کہا "میں تمھاری محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں، ایک گھنٹے کے اندر تمھارے بھائی جان کو ڈھونڈ نکالوں گا، انھیں زندہ سلامت تمھارے پاس لے آؤں گا اور اگر نہ لا سکوں تو مجھے گولی مار دینا۔"

اس نے بے یقینی سے کہا "یہ محض بہلاوا ہے۔ تم ایک گھنٹے کے اندر دشمنوں تک کس طرح پہنچو گے۔ تمھیں کیسے معلوم ہوگا کہ بھائی جان کو ان لوگوں نے کہاں چھپایا ہے؟"

"اس بات کی فکر نہ کرو۔ یہ دشمنوں کی چال ہے کہ میں کسی طرح تمھیں خوش کرنے کے لیے تمھارے بھائی جان کی جان بچانے کے لیے انھیں تلاش کروں۔ وہ میرے لیے خود بخود اپنی طرف آنے کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔ میں ان کی چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔"

ریحانہ نے پستول سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تو پھر جاؤ۔ ایک گھنٹہ گزر جائے اور تمھیں یہ معلوم ہو کہ میرے بھائی جان کی لاش یہاں پہنچ چکی ہے تو اس کوٹھی کے اندر نہ آنا۔ آؤ گے تو بھائی جان کے ساتھ میری بھی لاش ملے گی۔"

"یہ احمقانہ فیصلہ ہے۔ تم اپنے آپ کو کیوں ہلاک کرو گی؟"

"صرف اس لیے کہ میری نادانی سے میرے ابو، میرے بڑے بھائی کو قتل ہونا پڑا اور اب میرے بھائی جان مارے جائیں گے۔ مجھے اپنی اندھی محبت کی کچھ تو سزا ملنی چاہیے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ آگے بڑھ کر دوسرے ہاتھ سے رسیور اٹھاتے ہوئے بولی "ہیلو، میں ریحانہ بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہم بہت دور سے اس کوٹھی کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ہمیں خفیہ پولیس کے کچھ آدمی نظر آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، تم سب سخت پہرے میں ہو۔ ہم تمھاری طرف آئیں گے یا تم کرم داد کے ساتھ اپنے بھائی کو تلاش کرنے کے لیے آؤ گی، دونوں ہی صورتوں میں خطرہ ہے۔ لہٰذا جو ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا، اسے بدلا جا رہا ہے۔ تم ابھی فون کے ذریعے اپنا فیصلہ سناؤ۔ کرم داد کو گولی مار رہی ہو یا ہم تمھارے بھائی کو گولی مار دیں؟"

ریحانہ نے ایک ہاتھ سے پستول کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا "تم جو کوئی بھی ہو، ایک انسان ہو، تمھاری زندگی میں بھی کوئی عورت آئی ہوگی۔ خواہ ماں کے روپ میں، بہن کے روپ میں یا بیوی کے روپ میں۔ اگر آئی ہو تو اس سے گھر جا کر پوچھ لینا، وہ اپنے شوہر کو گولی مار سکے گی یا اپنے بھائی کو؟ لیکن ایسا پوچھتے وقت اس عورت کے ہاتھ میں پستول نہ دینا۔ ورنہ جانتے ہو وہ کیا کرے گی؟"

یہ سوال کرتے ہی ریحانہ نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھا اور ٹریگر کو دبا دیا۔ اس سے پہلے کہ کرم داد اور حور بانو اس کی طرف لپکتے، فائر کی زبردست آواز ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ سے ریسیور چھوٹا، دوسرے ہاتھ سے پستول اور وہ زندگی سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی۔

چند لمحوں کے لیے موت کا سا گہرا سناٹا چھا گیا۔ کرم داد دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ اپنی پیاری شریکِ حیات کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جہاں تھا وہیں کٹی ہوئی شاخ کی طرح فرش پر گر پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ وہ مرد تھا، رو نہیں سکتا تھا لیکن حور بانو دوڑتی ہوئی گئی تھی اور ریحانہ سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

اچانک ہی بہت سے قدموں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ آوازیں کوٹھی کے مختلف حصوں سے آرہی تھیں۔

آخر وہ سب کمرے میں آکر رک گئے۔ وہ خفیہ پولیس کے افراد تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "مسٹر کرم داد! ہم نے یہاں دو بار فائرنگ کی آواز سنی۔ پہلی بار تو ہم نے طرح دی کہ شاید کوئی بات ہوئی تو تم اشارہ کرو گے لیکن دوسری فائرنگ پر آنا ہی پڑا۔"

پھر اس خفیہ پولیس کے آدمی نے ریحانہ کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا "افسوس کہ ہمیں آنے میں دیر ہو گئی۔"

کرم داد نے سر جھکا کر کہا "آفیسر! مجھ پر ایک مہربانی کرو۔ چند منٹ پہلے یہاں کسی نے میری بیوی کو فون کیا تھا۔ وہی لوگ اس کی موت کے ذمے دار ہیں۔ پلیز، یہ معلوم کر کے بتاؤ کہ فون کس نمبر سے اور کس مقام سے کیا گیا ہے؟"

"یہ بہت مشکل ہے۔ فون کرنے کے دوران اگر ڈیٹیکٹ کیا جاتا تو شاید پتا چل جاتا۔ اب دیر ہو چکی ہے۔ ہم معلوم نہیں کر سکتے۔"

کرم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے جانے لگا۔ حور بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئی، اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی "کہاں جا رہے ہو؟"

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں ان قاتلوں کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ میں ریحانہ کے بھائی کو مرنے نہیں دوں گا۔"

اس نے حور بانو کے ہاتھ کو پکڑ کر ایک طرف دھکا دیا پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس نے آفیسر سے کہا "پلیز، اسے روکو۔ وہ انتقام میں اندھا ہو رہا ہے۔"

آفیسر نے کہا "ہمیں افسوس ہے، ہمیں تو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی دشمن کی طرف بڑھتا ہے تو اسے روکنا نہیں چاہیے۔ اس طرح دشمن ہماری نگاہوں میں آئیں گے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ جہاں بھی جائے گا، اس کے آس پاس ہمارے آدمی ضرور موجود رہیں گے۔"

حور بانو نے پریشان ہو کر پوچھا "لیکن میں کہاں جاؤں! میں تو بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔"

"جب تک تمھارے ساتھی واپس نہیں آئیں گے، تم ہماری پناہ میں رہو گی۔"

جب تک میں غافل رہا، رسونتی اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہوئے میری جگہ سنبھالتی رہی۔ وہ ہر اس جگہ پہنچتی رہی اور میرے کام آنے والوں کے کام آتی رہی، جن کے متعلق وہ جانتی تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد میں اس سے ان تمام لوگوں کے متعلق سوالات کروں گا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ حور بانو کا جب تک کوئی ٹھکانا نہ ہو، اس کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ میں اس کی حفاظت کروں گا۔ لہٰذا وہ میری غفلت کے دوران حور بانو کی طرف زیادہ توجہ دیتی رہی۔

جب حور بانو، کرم داد وغیرہ کے ساتھ لاہور پہنچ گئی تھی تو رسونتی کو اطمینان ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے چھوڑ کر دوسری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ جب واپس آئی تو بہت کچھ ہو چکا تھا۔ ریحانہ نے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اگر وہ موقع پر موجود ہوتی تو ریحانہ کو کبھی اس کا موقع نہ دیتی۔ اس نے حور بانو کو خفیہ پولیس کے آدمیوں کے ساتھ جانے دیا لیکن دو گھنٹے بعد جسکانی لاہور پہنچا تو اس نے ہیرا پھیری کے ذریعے اسے حور بانو کے پاس پہنچا دیا۔

اِدھر بند کمرے کی عدالت میں سرداراں پر جو مقدمہ چل رہا تھا، پچھلے دن اس مقدمے کا رخ بدل گیا تھا اور میں نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ جلد ہی رعونت جہاں اور سرداراں کے خلاف دستاویزی ثبوت پیش کروں گا لیکن اپنے وعدے کے مطابق مجھے ان کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آج جبکہ بند کمرے میں پھر عدالت قائم ہوئی تھی تو میں تنویمی عمل کے زیرِ اثر تھا۔ رسونتی میری کمی پوری کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئی تھی۔ پتا چلا، ایڈووکیٹ حسن علی رضوی کو کسی نے دو فائلیں لا کر دی تھیں۔ ان میں سے ایک فائل رعونت جہاں اور دوسری سرداراں سے متعلق تھی۔ ان کے ذریعے مکمل ثبوت ملتا تھا کہ وہ دونوں خاص طور پر لاہور اسی لیے آئی ہیں کہ عالی جناب کو اپنے جال میں پھانس کر ان کے ذریعے حکومت کے مختلف شعبوں کے راز حاصل کریں۔ رعونت جہاں اپنے حسن کی جادوگری سے عالی جناب کو اس طرح قابو میں کرے گی کہ وہ صرف رعونت جہاں کی آنکھوں سے دیکھے گا، رعونت جہاں کے دماغ سے سوچے گا اور رعونت جہاں کے حکم کے مطابق متعلقہ شعبوں میں اہم تبدیلیاں لاتا رہے گا۔

جب ایڈووکیٹ حسن علی رضوی نے وہ فائلیں عدالت میں پیش کیں تو مقدمے کا فیصلہ خود بخود ہو گیا۔ صرف سرداراں کو ہی نہیں، رعونت جہاں کو بھی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے لے جانے کا حکم دیا گیا۔

لیکن عالی جناب کو یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ رعونت جہاں کو اب بھی معصوم سمجھ رہے تھے۔ اس کے دیوانے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا "یہ فیصلہ غلط ہے۔ میں اس کے خلاف اپیل کروں گا۔"

اُدھر سرداراں نے ایڈووکیٹ حسن علی کو گھور کر دیکھتے ہوئے کہا "ارے تم کیا چیز ہو اور تمھاری جیلیں کیا اہمیت رکھتی ہیں۔

میں اپنی رعونہ کو ان آہنی سلاخوں سے نکال کر لے جاؤں گی۔"

عالی جناب فیصلے کے خلاف اپنی بات منوا نہیں سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسے انتظامات کر دیے کہ رعونت جہاں اے کلاس جیل میں رہے اور اسے ہر طرح کا آرام ملتا رہے، ضرورت کی ہر چیز اس کے پاس پہنچتی رہے۔

انھوں نے عدالت برخاست ہونے کے بعد اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنانے کا موقع نہیں دیا۔ سپاہیوں کو حکم دیا "اسے ایئر کنڈیشنڈ کار میں لے کر جائیں۔ پھر چپکے سے رعونت جہاں کے پاس آکر کہا "تم فکر نہ کرو۔ میں تمھارے پاس اے کلاس جیل میں آؤں گا اور کل سے تمھیں اپنے پاس خفیہ طور پر بلالوں گا۔ کاغذات کے مطابق تمھیں جیل ہو رہی ہے لیکن تم میری ایک خفیہ رہائش گاہ میں رہا کرو گی۔"

رسونتی نے فی الحال عالی جناب کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور کرم داد کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ ریحانہ کی ہلاکت کے بعد جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے ماسٹر کی کے ڈی ٹی سینٹر میں رہ کر وہاں کے کوڈ ورڈز وغیرہ سے اچھی طرح واقفیت ہو گئی تھی، یہ بھی جان چکا تھا کہ ٹرانسمیٹر سے کس طرح رابطہ قائم کرنا چاہیے۔ ٹرانسمیٹر اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے ایک فریکوئنسی پر رابطہ قائم کیا۔ فوراً ہی ماسٹر کی کے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ کرم داد نے کوڈ ورڈز کا تبادلہ کرنے کے بعد بتایا "میں کرم داد ہوں اور تم لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ رب نواز کو کوئی نقصان نہ پہنچانا۔ مرد کے بچے ہو تو میرا انتظار کرو اور مجھے اپنا پتا بتاؤ۔"

دوسری طرف سے ہنستے ہوئے کہا گیا "تم ہمیں احمق سمجھ رہے ہو کہ ہم تمھیں اپنا پتا بتائیں اور تمھارے پیچھے خفیہ پولیس والوں کو آنے کا موقع دیں۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ اِدھر کرم داد جھنجلا کر دوبارہ رابطہ قائم کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں رسونتی نے دوسری طرف بات کرنے والوں کے دماغ میں پہنچ کر ان کا پتا معلوم کر لیا تھا۔ پھر اس نے وہی ٹیلی پیتھی کے ہتھکنڈے استعمال کیے جو میں کرتا آیا ہوں۔ مختصر یہ کہ اس نے ہیرا پھیری کے ذریعے کرم داد کو دشمنوں تک پہنچا دیا لیکن وہ رب نواز کو ختم کر چکے تھے۔ اس اڈے پر جتنے دشمن تھے، ان میں سے کچھ تو کرم داد کے ہاتھوں مارے گئے، کچھ رسونتی کی ٹیلی پیتھی کے ذریعے اس طرح ہلاک ہوئے کہ مرنے والوں کو اور خود کرم داد کو ٹیلی پیتھی کا شبہ بھی نہ ہو سکا۔

اس نے کرم داد کو بعد میں ریحانہ کی جدائی کا دکھ سہنے کے لیے چھوڑ دیا۔ فی الحال اس سے کوئی کام لیا نہیں جا سکتا تھا۔ اسے ریحانہ کی آخری رسومات میں شریک ہونا تھا۔ اس دوران سیکرٹ سروس کے چیف کی طرف سے یہ ہدایت موصول ہوئی تھی کہ کرم داد کو لاہور میں ہی رہنا ہے کیونکہ مائخل شوف کے علاوہ مختلف دہشت گرد تنظیموں کے جو افراد گرفتار ہوتے جا رہے تھے، ان میں سے کچھ نے حقیقت اُگل دی تھی۔ کچھ کے خلاف دستاویزی ثبوت حاصل ہوتے جا رہے تھے جن کے ذریعے یہ علم ہوا کہ ابھی کچھ اور خطرناک قسم کے تخریب کار ہمارے ملک میں پہنچنے والے ہیں۔ لہٰذا آئندہ کرم داد کی ڈیوٹی لاہور ایئر پورٹ پر مقرر کی گئی۔ وہ مختلف ٹی ڈی سینٹر سے تعلق رکھنے والوں کو شناخت کر سکتا تھا۔ اسی طرح جسکانی کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً اسلام آباد جائے اور وہاں پہنچنے والے مختلف ٹی ڈی سینٹر کے لوگوں کی شناخت کرتا رہے۔

کرم داد اور جسکانی کو خفیہ طور پر ایسی ڈیوٹی نہیں دی گئی تھی بلکہ چیف کا یہ حکم پولیس والوں کے ذریعے پہنچایا گیا تاکہ یہ بات عام ہو جائے۔ ٹی ڈی سینٹر والے جسکانی کو اسلام آباد پہنچنے نہ دیں اور کرم داد کو بھی ختم کرنے کی کوشش کریں۔ یعنی چال وہی تھی کہ تخریب کار اس بہانے ان سے ٹکرانے کے لیے سامنے آئیں اور بے نقاب ہوتے چلے جائیں۔

میری غفلت کے دوران رسونتی بڑی توجہ سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی، کچھ اپنی طرف سے بھی کارگزاری دکھا رہی تھی یعنی اب اس نے میرے قریب آنے والیوں کو مجھ سے دور رکھنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا۔ حور بانو کو جسکانی کے قریب پہنچا دیا تھا اور اس کے دماغ میں کچھ ایسے خیالات اور جذبات پیدا کر رہی تھی جو اسے جسکانی کی طرف مائل کرتے۔ دوسری طرف جسکانی کو بھی خیال خوانی کے ذریعے اس کی طرف مائل کر رہی تھی۔

پچھلی رات نو بجے رسونتی نے مجھ پر تنویمی عمل کیا تھا۔ اس کے مطابق مجھے آج دن کے بارہ بجے تک اس عمل کے زیرِ اثر رہنا تھا۔ ٹھیک صبح نو بجے میرے کمرے کا دروازہ کھلا وہاں دو عورتیں نظر آئیں۔ اس وقت میں انھیں پہچان نہیں سکتا تھا لیکن وہ خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ اسی لیے انھیں میرے کمرے میں آنے کی اجازت دی گئی تھی۔

وہ دونوں میرے بستر کے اطراف آئیں۔ دونوں نے میرا ایک ایک ہاتھ تھام لیا۔ ایک نے میری نبض دیکھی، دوسری نے بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی "ہائے فرہاد! تم کتنے شہ زور سمجھے جاتے ہو اور اس وقت کتنے کمزور ہو۔ اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں کر سکتے، باہر کے اثرات قبول نہیں کر سکتے۔ ہماری آواز تمھارے کانوں تک پہنچ رہی ہے مگر تم سن

نہیں سکتے، آنکھیں رکھتے ہو مگر دیکھ نہیں سکتے۔ اس وقت تم ایک چیونٹی سے بھی گئے گزرے ہو۔ کوئی بھی آکر تمھیں ایک چٹکی میں مسل سکتا ہے۔"

دوسری نے ہنستے ہوئے کہا "جب تم جانتی ہو کہ یہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے، سنتے ہوئے نہیں سن سکتے تو اپنی باتیں کسے سنا رہی ہو؟"

"دل کی بھڑاس نکال رہی ہوں۔ یہ حضرت جب ہوش و حواس میں ہوتے ہیں تو اپنے سامنے کسی کو بولنے نہیں دیتے بڑے تیس مار خاں بنتے ہیں۔"

"چلو اب رہنے بھی دو۔ یہ بتاؤ پہلے کس کی ڈیوٹی ہوگی، میری یا تمھاری؟"

دوسری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "رات بارہ بجے تک تمھاری ڈیوٹی ہوگی۔ اس کے بعد میں آجاؤں گی۔"

اتنے میں چار شخص اور نظر آئے۔ وہ ایک بڑا سا ٹیلی وژن اٹھائے ہوئے تھے۔ انھوں نے اسے میرے پاؤں کی طرف دیوار سے لگا کر رکھ دیا تاکہ میں لیٹے لیٹے بھی اسے دیکھ سکوں۔

وہ میری تفریح کے لیے نہیں لایا گیا تھا بلکہ میرے کمرے کے باہر اسپتال کے مختلف حصوں کو دیکھنے کے لیے اسے لا کر رکھا گیا تھا۔ وہ چاروں جو ٹیلی وژن لے کر آئے تھے، سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان پر ہر طرح سے اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ان عورتوں میں سے ایک نے ٹیلی وژن کے پاس پہنچ کر اسے چاروں طرف سے اچھی طرح چیک کیا۔ ٹیلی وژن کے پچھلے حصے کو بھی دیکھا۔ ایک شخص نے ریموٹ کنٹرولر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "مادام! اسے آن کر کے دیکھ لیں، اپنا اطمینان کر لیں۔"

وہ ریموٹ کنٹرولر لے کر میرے سرہانے کھڑی ہو گئی پھر وہاں سے آن کیا، اسکرین پر اسپتال کا ایک کوریڈور نظر آ رہا تھا۔ اس نے دوسرا بٹن دبایا، منظر بدل لیا۔ اب اسپتال کا دوسرا حصہ نظر آ رہا تھا۔ غرض یہ کہ میرے کمرے کی طرف دو کوریڈور آکر ملتے تھے۔ وہ دونوں باری باری اسکرین پر دیکھے جا سکتے تھے۔ کمرے کے پچھلے حصے کی طرف باغیچہ تھا۔ وہاں کا منظر بھی اسکرین پر دکھائی دیا۔ اس باغیچے میں ایک چھوٹی سی پولیس چوکی قائم کر دی گئی تھی۔ وہ برائے نام پولیس چوکی تھی۔ ورنہ سیکرٹ سروس کے مسلح جوان موجود رہتے تھے تاکہ پیچھے سے کوئی کھڑکی توڑ کر آنے کی جرأت نہ کر سکے۔

جیسے مادام کہا گیا تھا، اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "سب ٹھیک ہے، اب آپ جا سکتے ہیں۔"

وہ چاروں کمرے سے چلے گئے۔ دوسری عورت نے میرے سر کو سہلاتے ہوئے کہا "میں ابھی جا رہی ہوں۔ آدھی رات کو آؤں گی۔"

آدھی رات کو کوئی بلا ہی آتی ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ آدھی رات کو آنے والی تھی۔ بہرحال وہ چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی مادام نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہاں سے پلٹ کر مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھا پھر میری طرف یوں آئی جیسے کھنچی چلی آ رہی ہو۔ اس نے میرے ایک ہاتھ کو تھام لیا۔ پہلے تو اس ہاتھ کو اپنی دونوں آنکھوں سے لگایا پھر کہا "آج کتنے عرصے کے بعد تم سے ملاقات ہو رہی ہے اور عجیب ملاقات ہو رہی ہے۔ میں تم سے مل رہی ہوں، تم مجھ سے نہیں مل رہے ہو۔ جب تنویمی عمل کے اثر سے نکلو گے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔"

بیشک وہ بڑے ہی والہانہ انداز میں پیار بھری گفتگو کر رہی تھی جبکہ میں سننے کے قابل نہیں تھا۔ گویا کہ وہ بھینس کے سامنے بین بجا رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اپنی ذمّے داریوں کا بھی پورا خیال رکھے ہوئے تھی۔ اِدھر مجھ سے محبت کا اظہار کر رہی تھی اور اُدھر وقفے وقفے سے ریموٹ کنٹرولر کے ذریعے ٹی وی اسکرین کو دیکھتی جاتی تھی۔ اسپتال کے ہر حصّے کا جائزہ لیتی تھی پھر مطمئن ہونے کے بعد میری طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

تنویمی عمل کے زیرِ اثر رہنے کے دوران جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا، یہ تمام باتیں مجھے بعد میں بتائی گئی تھیں۔ رسونتی نے بھی مکمل رپورٹ سنائی تھی کہ وہ پندرہ گھنٹے کے دوران کس طرح میری ساری ذمّے داریاں پوری کرتی رہی ہے۔ اس نے میرے فرائض انجام دینے کے دوران ایک بات پر خاص توجہ دی تھی۔ وہ میں بتا چکا ہوں یعنی حور بانو اور جسکانی پر زیادہ توجہ دیتی رہی تھی۔ بار بار فرصت ملتے ہی کبھی حور بانو کے پاس پہنچتی اور کبھی جسکانی کے پاس اور دونوں کے دلوں اور دماغوں میں کچھ ایسی ہلکی پھلکی سی ہلچل مچاتی، کچھ ایسے میٹھے میٹھے سے تاثرات پیدا کرتی جس کے نتیجے میں پہلے تو وہ پریشان ہو کر سوچتے رہے کہ یہ ان میں کیسی تبدیلی آ رہی ہے۔ ان میں ایک دوسرے کو چاہنے کا شدید جذبہ کیوں پیدا ہوتا جا رہا ہے؟

چیف کے حکم کے مطابق جب جسکانی، حور بانو کے ساتھ اسلام آباد کی طرف روانہ ہوا تو دونوں کے لیے فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ ریزرو کرا دیا گیا تھا۔ سفر کے دوران جسکانی نے تنہائی میں موقع پاتے ہی پوچھا "کیا تم نے بابر کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

حور بانو نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر سر جھکا کر کہا۔ "مجھ میں ایک عجیب سی تبدیلی آ رہی ہے۔ میرے ارادے کبھی نہیں

بدلتے۔ جب ایک بات کا ارادہ کرلیتی ہوں تو اس پر قائم رہتی ہوں لیکن یہ دل کے معاملات کچھ سمجھ میں نہیں آتے۔"

"میں تمھاری بات سمجھ نہیں سکا۔ ذرا وضاحت سے بیان کرو۔"

"تم نے مجھ سے پوچھا' میں بابر کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں یا نہیں؟ اس کا جواب ہے' میں چاہتی تھی لیکن بابر نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایک سیلانی ہے کبھی ایک جگہ نہیں رہتا۔ وقت کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔ اگر میں اس کی تمنا کروں گی تو ہمیشہ پچھتاتی رہوں گی۔"

"بابر واقعی صاف گو' سچا اور کھرا آدمی ہے۔ جو بات دل میں ہوتی ہے' وہ زبان پر لے آتا ہے کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔"

"بعض سچی باتیں دل کو زہر لگتی ہیں' بعض حالات میں دل چاہتا ہے' کوئی دھوکا دے۔ جب اس نے اپنے متعلق سچی بات کہہ دی تو میرے دل کو ٹھیس پہنچی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا' رفتہ رفتہ وہ میری طرف مائل ہو جائے گا لیکن میں کئی بار اس کے ساتھ تنہا رہی۔ ہم بند کمرے میں رہے۔ میں اس کی موجودگی میں بے خطر سو گئی اور مجھے اس کی ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ میری سمجھ میں آگیا کہ وہ مجھے حاصل کرنا چاہتا تو میں اس سے دور نہیں تھی اور اس کے بس میں تھی مگر میں احمق ہوں' وہ اب تک دامن بچاتا آرہا ہے اور میں اپنے آپ کو اس کی سمجھتی رہی ہوں۔"

"تم نے خود کو سہاگن کیسے سمجھ لیا؟"

"بس یونہی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا بے خودی کا عالم تھا یا میں کسی اور سحر میں گرفتار تھی میں نے دیکھا کہ میں بابر کی دلھن بن گئی ہوں۔"

جمال احمد جسکانی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم اسے اب بھی چاہتی ہو۔"

"میں اسے ساری زندگی چاہتی رہوں گی مگر چاہنے کے انداز میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے اس سے محبت تھی' اب عقیدت ہے۔"

"یعنی تمھارے دل میں محبت سے کسی کو چاہنے کی گنجائش ہے۔"

وہ چپ رہی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔ جسکانی نے کہا' "تم اس دنیا میں تنہا ہو۔ اپنے والدین کے پاس نہیں جا سکتیں۔ ان کی زندگی بھی خطرے میں ہے اور تم بھی خطرے میں ہو' تمھیں ایک ایسے جیون ساتھی کی ضرورت ہے جو قدم قدم پر تمھاری حفاظت کرے اور تمھیں بڑی محبت سے اپنی دلھن بنا کر رکھے۔"

وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا: "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "ابھی میں نے اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ فیصلہ تو بابر کی موجودگی میں کیا تھا جس فیصلے پر وہاں عمل نہ ہو سکا' یہاں ہو سکتا ہے۔"

پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم برا نہ مانو تو میں کہنا چاہتا ہوں' پتا نہیں کیوں میرا دل تمھاری طرف کھنچا جا رہا ہے' میں تمھارے متعلق سوچنا نہیں چاہتا مگر یہ دل بے ایمان ہے' میری بات نہیں مانتا۔ تمھاری ضد کر رہا ہے۔"

یہ سن رہی تھی۔ وہ دل کی باتیں کہتا جا رہا تھا۔ یہی باتیں حور بالو کے دل میں بھی تھیں۔ جب کبھی اس کے دل میں بابر کا خیال آتا تو رسونتی اس کے خیالات بدل دیتی تھی۔ اس کا دھیان بٹا دیتی تھی پھر اسے جسکانی کی طرف مائل کر دیتی تھی۔

اسی طرح جمال احمد جسکانی اپنی موجودہ مصروفیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ سوچنا چاہتا اور محبت کی باتیں کم کرنا چاہتا تھا مگر رسونتی اس کے دل اور دماغ کو محبت کے جذبوں سے بھر رہی تھی۔ ایک بند کوٹھری میں دھواں بھر جائے تو وہ کہیں نہ کہیں سے نکلنے کا راستہ بنا لیتا ہے۔ اسی طرح جسکانی کے دماغ میں محبت کا دھواں بھرتا جاتا تھا اور وہ حور بالو کے سامنے ظاہر کرتا جاتا تھا۔ بے چارے وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ ان کے پیچھے کس طرح ٹیلی پیتھی اپنا کام دکھاتی جا رہی ہے۔

میں رفتہ رفتہ سحر سے آزاد ہونے لگا۔ تنویمی عمل کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر ڈی ڈی ٹی اور فنائل اور دواؤں کی ملی جلی بو میرے نتھنوں تک پہنچنے لگی۔ میں اس دنیا کی آوازیں سننے لگا۔

مجھے بڑی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تمام زخم جن کی ٹیسیں محسوس نہیں کر رہا تھا اور تنویمی عمل کے دوران بے حس ہو کر رہ گیا تھا' اب وہ زخم پھر تکلیف پہنچا رہے تھے۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہیں نکلنے لگیں۔ وہ میرے سرہانے کھڑکی کے پاس کھڑی اسپتال کے پچھلے حصے کو دیکھ رہی تھی۔ میری آوازیں سن کر فوراً پلٹ گئی۔ جب وہ سامنے آئی تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ اعلیٰ بی بی تھی۔

میرے مسکراتے ہی سمجھ گئی کہ میں تنویمی عمل کے اثر سے نکل آیا ہوں پھر تو اسے پر لگ گئے۔ وہ میرے پاس ایسے آئی جیسے پھول پر بہار آتی ہے۔ اس کے بس میں نہیں تھا ورنہ وہ اپنے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میرے سامنے بکھیر دیتی۔

میں نے بڑی نقاہت سے کہا: "میں بہت کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ چونک گئی۔ اسے اپنی جذباتی حماقتوں کا احساس ہوا۔ سب سے پہلے اس کا فرض تھا کہ ڈاکٹروں کو بلاتی۔ حالانکہ وہ بہت ہی ذہین' حاضر دماغ اور معاملہ فہم تھی۔ اس کے باوجود جذبات میں بہہ جانے کی حماقت ہو ہی جاتی ہے۔ اس نے فوراً ہی ریموٹ کنٹرولر کو ہینڈل کیا۔ سامنے اسکرین پر ایک ڈاکٹر کا چیمبر نظر آرہا تھا۔ وہاں دو ڈاکٹر' ایک نرس اور دو وردی میں ملبوس افراد نظر آرہے تھے۔ یقیناً وہ سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اعلیٰ بی بی نے آواز کے بٹن کو آن کرتے ہوئے کہا: "ہیلو' میں اعلیٰ بی بی مخاطب ہوں' مسٹر فرہاد ہوش میں آگئے ہیں۔ آپ تشریف لے آئیں۔"

اس نے ٹی وی کو آف کر دیا۔ میں نے پوچھا: "کیا وقت ہوا ہے؟"

"شام کے پانچ بجے ہیں۔"

"شام کے یا صبح کے؟"

وہ مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تم پندرہ گھنٹے تک سوتے رہے ہو۔"

میں نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلا کر بولی۔ "ذرا یاد کرو۔ کیا رسونتی تمھارے خواب میں' خیال میں آئی تھی۔ کیا اس نے تم پر تنویمی عمل کیا تھا؟"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ دماغ پر زور ڈال کر سوچنے لگا پھر یاد آیا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا تھا۔ رسونتی آئی تھی اور میری رضامندی حاصل کرنے کے بعد تنویمی عمل کر رہی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا' مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ معمول بن کر سوتے رہنے کے دوران جو کچھ بھی ہوا' وہ میری یادداشت میں محفوظ نہیں تھا۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ اعلیٰ بی بی نے ریموٹ کنٹرولر کے ذریعے ٹی وی کے اسکرین پر دیکھا۔ دروازے کے سامنے وہی دو ڈاکٹر اور دو مسلح افراد نظر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو کھول دیا۔ وہ دونوں ڈاکٹر میرے بستر کے اطراف آگئے۔ ان کے ساتھ ایک ایک مسلح گارڈ کھڑا ہو گیا۔ اعلیٰ بی بی اس نرس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ یہ احتیاط اس لیے تھی کہ مادام کمپیوٹر کسی کے دماغ میں پہنچ کر کوئی ایسی چال نہ چل سکے جس کی ہم توقع بھی نہ کرتے ہوں۔

ویسے وہ آنے والے تمام افراد گونگے بنے ہوئے تھے۔ میرا علاج کرنے والے ڈاکٹروں کو اور کمرے میں آنے والے ضروری افراد کو کم از کم ایک ہفتے کی ڈیوٹی پر لگا دیا گیا تھا۔ وہ ایک ہفتے تک گھر نہیں جا سکتے تھے۔ اسپتال میں ہی رہنا تھا اور باری باری ڈیوٹی انجام دینا تھی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر کی ابھی ڈیوٹی نہیں تھی لیکن وہ مجھے دیکھنا چاہتا تھا اور میرے کیس کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے بھی کوئی کسی مریض کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

ان تمام افراد کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ اپنے کمرے میں بند ہونے کے بعد بھی تنہائی میں ایک لفظ زبان سے ادا نہ کریں۔ ہر حال میں گونگے بنے رہیں پہلے جو ڈاکٹر میرے زخموں کی مرہم پٹی کر گیا تھا' اس نے رپورٹ دی تھی' ایک ہفتے کے اندر میرے زخم بھر جائیں گے اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ لہٰذا میرے کمرے میں آنے والے ڈاکٹروں اور دوسرے افراد کو ایک ہفتے تک کسی سے بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی ضروری بات ہو تو وہ تحریر کے ذریعے تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔

وہ دونوں ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک نبض ٹٹول رہا تھا۔ دوسرا زخموں کو دیکھ رہا تھا پھر وہ نرس کی مدد سے زخموں کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ وہ ایسی دوا لگا رہا تھا جس سے آرام پہنچ رہا تھا۔ نبض ٹٹولنے والے ڈاکٹر نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دوسرے ڈاکٹر کی طرف بڑھایا۔ اعلیٰ بی بی نے بھی اسے پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "مسٹر فرہاد! زخموں کی تکلیف سے پریشان ہیں۔ انھیں تکلیف سے نجات دلانے کے لیے میں یہ انجکشن منتخب کر رہا ہوں آپ کی کیا رائے ہے؟"

اس ڈاکٹر نے تجویز پیش کرنے والے ڈاکٹر سے اس انجکشن کی شیشی لے کر دیکھی' اسے پڑھا۔ پھر واپس کرنے کے بعد اس کاغذ کے نیچے لکھ دیا۔ "ہاں' یہ انجکشن دیا جا سکتا ہے۔"

انجکشن کی شیشی نرس کی طرف بڑھا دی گئی تاکہ وہ ایک سرنج تیار کرے۔ نرس اس میز کی طرف گئی جو ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس میز پر میری ڈریسنگ کے لیے دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔ باہر سے جو بھی دوا آتی تھی' اسے اچھی طرح چیک کیا جاتا تھا۔ دونوں ڈاکٹروں سے تصدیق کرائی جاتی تھی کہ وہ دوائیں نقصان دہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد وہ میرے کمرے میں لا کر اس میز پر رکھی جاتی تھیں۔ وہیں انجکشن دینے کے دوسرے سامان بھی رکھے ہوئے تھے۔ نرس وہاں پہنچ کر سرنج تیار کرنے لگی۔

اس نرس کو اپنے پیچھے اعلیٰ بی بی کی سرگوشی سنائی دی۔ "یہ تمھارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟"

وہ گھبرا کر پلٹ گئی۔ ہکلاتے ہوئے بولی۔ "نن... نہیں تو۔ میرے ہاتھ نہیں کانپ رہے ہیں۔"

اعلیٰ بی بی نے غراتے ہوئے پوچھا "تم نے اپنے منہ سے الفاظ کیوں ادا کیے جبکہ تمھیں سختی سے ممانعت کی گئی تھی"؟

"آ، آپ نے مجبور کر دیا "۔

"کوئی مجبور کرے تو کیا اپنے فرض کو بھول جاؤ گی جبکہ تمھارا فرض تھا گونگی رہنا "۔

"میں اپنی غلطی پر نادم ہوں "۔

"تم نادم ہو مگر یہ تمھیں کیا ہو رہا ہے ؟"

"مم، مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں "۔

"خاک ٹھیک ہو، تمھارے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ پہلے ہاتھ کانپ رہے تھے، اب زبان لڑکھڑا رہی ہے "۔

"مادام! آپ خواہ مخواہ مجھ پر نفسیاتی طریقے سے اثر انداز ہونا چاہتی ہیں "۔

اعلیٰ بی بی نے سرنج والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی "یہ مجھے دو"۔

وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "نہیں۔ میں ڈاکٹر کو دوں گی "۔

اس نے اپنی مٹھی کو سختی سے بند کر لیا تاکہ سرنج نکلنے نہ پائے۔ اعلیٰ بی بی نے اس کی مٹھی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مادام کمپیوٹر! تم ابھی بچّی ہو۔ تم نے میری ذہانت کو آزمایا ہے، اب میری زور آزمائی بھی دیکھو "۔

نرس نے اور سختی سے سرنج کو مٹھی میں بھینچ لیا تھا لیکن اعلیٰ بی بی نے تو نفسیاتی اثر ڈالا تھا۔ اس کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ زور آزمائی نہیں کرتی، مغالطے میں رکھتی ہے۔ اس سے پہلے کہ نرس کے دماغ میں چھپی رہنے والی مادام کمپیوٹر اعلیٰ بی بی کی چال کو سمجھتی، اعلیٰ بی بی چشم زدن میں اپنا ہاتھ اپنے سر کی طرف لائی پھر وہاں سے ہیئر پن نکال کر نرس کے ہاتھ میں چبھو دی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی پھر وہ مٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سرنج اعلیٰ بی بی کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وقت دونوں مسلّح افراد نے آگے بڑھ کر نرس کو حراست میں لے لیا۔ اعلیٰ بی بی نے پوچھا "اب یہی انجکشن میں تمھیں دوں تو کیسا رہے گا ؟"

وہ ایک دم سے رونے اور گڑگڑانے لگی "مادام! میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں خود نہیں سمجھ سکتی کہ میں بے اختیار ایسا کیوں کرنے جا رہی تھی "۔

[illegible] تیمور کے ساتھ رہ کر ٹیلی پیتھی کی ایک ایک ٹیکنیک کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ کیا تمھارے دماغ پر مادام کمپیوٹر پوری طرح چھائی ہوئی نہیں تھی ؟"

وہ اپنی ایک انگلی نرس کی پیشانی پر رکھتے ہوئے بولی "اور مادام کمپیوٹر! تم بھی اچھی طرح سن لو۔ ہم کس طرح بال کی کھال نکالنا جانتے ہیں۔ اگر تم نرس کے دماغ پر پوری طرح قابض ہوتیں تب بھی ہم اسے پکڑ لیتے کیونکہ تم تھوڑے سے عرصے میں نرس کی چال ڈھال، اس کے انداز اور اس کی پوری طرح اسٹڈی نہیں کر سکتی تھیں اور تم یہ جانتی تھیں کہ یہاں رکھے ہوئے ٹی وی اسکرین کے ذریعے میں ایک ایک فرد کی اسٹڈی کر رہی ہوں ...... تم نے اسے کسی نہ کسی طرح بلیک میل کیا ہے، اسے مجبور کیا ہے کہ یہ تمھارے حکم کی تعمیل کرتی رہے ورنہ اسے زبردست نقصان پہنچے گا "۔

نرس نے یک بیک دھاڑیں مار کر روتے ہوئے کہا۔ "مادام! آپ درست کہہ رہی ہیں، میں برباد ہو جاؤں گی، میری گود اجڑ جائے گی۔ میرے بچّے کو اغوا کیا گیا ہے۔ مجھے دھمکی دی گئی ہے اگر میں نے حکم کی تعمیل نہ کی تو اس معصوم کو مار ڈالا جائے گا۔ اب تو میں کہیں کی نہ رہی۔ نہ مادام کمپیوٹر کے حکم کی تعمیل کر سکتی ہوں، نہ اپنے بچّے کو کسی طرح بچا سکتی ہوں "۔

اعلیٰ بی بی نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا "مادام کمپیوٹر! میری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اب آگے سنو، چونکہ تم اس کے دماغ پر پوری طرح قابض رہ کر اس کی چال ڈھال اور مخصوص انداز کے ساتھ یہاں رہ نہیں سکتی تھیں، پکڑے جانے کا اندیشہ تھا اس لیے تم نے اسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ صرف بلیک میلنگ کا سہارا لے رہی تھیں، یہ بھول گئی تھیں کہ یہ نرس ایک عورت ہے۔ یہ فرض اور ممتا کے درمیان الجھی رہے گی تو کہیں نہ کہیں لغزش ضرور ہو گی۔

میرے سرہانے رکھے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر سے اشارہ موصول ہونے لگا۔ میں نے اسے اٹھا کر آپریٹ کیا۔ اسکرین پر لکھا ہوا نظر آیا "میں تمھاری اعلیٰ بی بی سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں "۔

میں نے کہا "اِدھر آجاؤ، جسے تم نرس کے دماغ میں مخاطب کر رہی ہو، وہ اس کمپیوٹر کے ذریعے کچھ کہنا چاہتی ہے "۔

"میں ابھی آتی ہوں "۔

اعلیٰ بی بی نے وہ سرنج ایک ڈاکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے فرہاد کے لیے جو انجکشن منتخب کیا تھا، وہ یقیناً درست ہو گا لیکن سرنج میں پہلے سے کچھ موجود تھا۔ آپ لیبارٹری میں لے جا کر اس کا تجزیہ کریں "۔

پھر اس نے مسلّح افراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "نرس کو یہاں سے لے جاؤ لیکن اسے سزا نہیں دی جائے گی۔ یہ بے قصور ہے۔ فی الحال اسے اسپتال کے احاطے سے نکال دو "۔

نرس گڑگڑاتے ہوئے کہنے لگی "میرا بچّہ، پلیز میرے بچّے کو کسی طرح بھی بچا لو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی "۔

وہ اسے کھینچ کر کمرے سے لے جا رہے تھے۔ اعلیٰ بی بی نے کہا "ٹھہر جاؤ "۔

اس نے میرے ہاتھ سے کمپیوٹر لے کر اسے آپریٹ

[...]با۔ پھر کہا "تم واقعی کوئی عورت ہو تو میں تمھیں ایک عورت [...]ونے کا واسطہ دیتی ہوں۔ سب سے دشمنی کرو، معصوم بچّوں سے [...]زرو۔ یہ بے چاری ممتا کی ماری ہے۔ تمھارے حکم کی تعمیل کر [...]ہی تھی۔ یہ اس کی اور تمھاری بدنصیبی ہے کہ میں نے چال کامیاب نہیں ہونے دی۔ اس میں اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں ہے [...]یں معلوم کرنا چاہتی ہوں، کیا تم اس سے اتنی ہمدردی کرو گی ؟"

کمپیوٹر سے جواب موصول ہوا "میں وعدہ کرتی ہوں، [...]ں کے بچّے کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اسے واپس کر [...]دیا جائے گا "۔

اعلیٰ بی بی نے نرس سے کہا "تم گھر جاؤ، تمھارا بچّہ [...]واپس مل جائے گا "۔

وہ سب وہاں سے چلے گئے۔ اعلیٰ بی بی نے دروازے [...]و بند کیا پھر کمپیوٹر کو آپریٹ کرتے ہوئے پوچھا "ہاں تو [...]مادام کمپیوٹر! تم مجھ سے کچھ باتیں... کرنا چاہتی ہو ؟"

اسکرین پر جواب موصول ہونے لگا "میں تمھارا ریکارڈ [...]پڑھ چکی ہوں۔ وہ ریکارڈ تمھاری بے مثال ذہانت اور حاضر دماغی [...]کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے مگر میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس [...]نرس کو اس طرح پکڑ لو گی۔ یہی میں معلوم کرنا چاہتی ہوں "۔

"اور میں بتانا چاہتی ہوں۔ بیشک تمھیں معلوم ہونا چاہیے [...]لیکن بلاؤں سے پالا پڑا ہے۔ کیا تم نے میرے ریکارڈ میں اس [...]سرٹیفکیٹ کی فوٹو کاپی نہیں دیکھی جو سند ہے کہ میں علمِ نفسیات [...]کی اتھارٹی ہوں۔ تمھاری ٹریپ کی ہوئی نرس بیشک پُرسکون [...]تھی۔ وہ اپنے بچّے کی خاطر خاموشی سے تمھارے حکم کی تعمیل کر کے [...]یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی لیکن اس کا چہرہ سپاٹ ہونے کے [...]باوجود ایک ذرا بجھا بجھا سا تھا۔ ہر انسان کی آنکھیں اس کے [...]اندرونی جذبات کی چغلی کھاتی ہیں۔ اس نے اپنے چہرے سے [...]بہت کچھ چھپا لیا تھا لیکن آنکھوں سے کرب ظاہر ہو رہا تھا یعنی [...]وہ اندر سے اپنے بچّے کے لیے رو رہی تھی۔ صرف آنکھ میں [...]آنسو نہیں آ رہے تھے۔ جب وہ انجکشن کی شیشی لے کر سرنج کی [...]طرف جانے لگی تو اس کی چال میں فرق آ گیا "۔

وہ ایک ذرا توقف سے بولی "اتنی باتوں سے یہ ظاہر [...]نہیں ہوتا کہ وہ کسی سازش میں مبتلا ہے۔ اس کی اپنی کوئی پریشانی [...]ہو سکتی تھی لیکن ایک بات مجھے کھٹکنے لگی۔ جو نرس اتنی اہم ڈیوٹی پر [...]ہو اگر وہ ذہنی طور پر پریشان ہے تو ہمارے لیے کسی نہ کسی پہلو [...]سے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ وہ پریشانی کی حالت میں سرنج کے [...]لیے مناسب سوئی کا انتخاب نہیں کر سکتی یا کوئی اور غلطی کر سکتی ہے۔ [...]میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اصل بات کیا ہے "۔

وہ پھر ایک لمحے کے لیے چپ ہوئی پھر کہنے لگی۔

"میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے چپکے سے اس کے پیچھے پہنچ کر سرگوشی میں ایسی بات کہی کہ وہ چونک گئی۔ جس کے دل میں چور ہوتا ہے، اچانک کوئی بات ہو تو وہ گھبرا جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ حالانکہ نہیں کانپ رہے تھے لیکن وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ زبان لڑکھڑانے لگی تھی "۔

اس نے ایک انگلی کو کمپیوٹر پر رکھتے ہوئے کہا "مادام کمپیوٹر! ٹیلی پیتھی آ جانے سے عقل نہیں آ جاتی۔ سونیا ٹیلی پیتھی جانتی ہے اگرچہ وہ ذہین ہے لیکن غیر معمولی طور پر ذہین نہیں ہے، بعض حالات میں وہ بے بس ہو جاتی ہے۔ اپنی ذہانت کو موقع کی مناسبت سے استعمال نہیں کر سکتی۔ ٹھیک اسی طرح تم نے بھی اپنی ذہانت سے کام نہیں لیا۔ جب میں نے نرس کی کلائی کو پکڑ لیا تھا اور اس سے سرنج لینا چاہتی تھی تو تمھارا کام تھا کہ وہ سرنج آسانی سے میرے حوالے کر دیتیں، اس کی مٹھی کھول دیتیں لیکن تم نے بھی دیکھا کہ کام بگڑ رہا ہے تو ضد پر آ گئی تھیں، تمھارا خیال تھا کہ راز فاش ہو جائے گا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمھاری کیا چال ہے لیکن سرنج دینے سے انکار کرنا ایک ایسا عمل تھا کہ میرا شبہ یقین میں بدل گیا "۔

"ہوں، میں سمجھ گئی "۔

"کیا سمجھیں ؟"

"یہی کہ پہلے تمھیں اس کمرے سے ہٹانا ہو گا "۔

"نہیں نہیں، مادام کمپیوٹر ایسی حماقت نہ کرنا۔ میں تو ہٹ ہی جاؤں گی لیکن میرے بعد جو بلا یہاں آنے والی ہے، وہ تمھارے بارہ بجا دے گی "۔

"میں جانتی ہوں، وہ مکّار عورت کون ہے۔ کیا تم میری ایک الجھن دور کرو گی ؟"

"اگر دور کر سکی تو ضرور کروں گی "۔

"میں نے سونیا کے دماغ میں پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن نہ پہنچ سکی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس نے [illegible]

"فرہاد کل سے تمھاری مٹھی میں ہے۔ اس کا دماغ کمزور ہے لیکن اب سے پندرہ گھنٹے پہلے تم نے اس کے دماغ میں پہنچنے کی کوشش کی ہوگی اور اب سے آدھے گھنٹے پہلے تک ناکام رہی ہو۔ کیا تمھاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا ؟"

کمپیوٹر سے جواب موصول ہوا "دو ہی باتیں سمجھ میں آئیں، یا تو فرہاد کو ایسی دوائیں دی گئی تھیں کہ اس کا دماغ سُن ہوگیا تھا، میری سوچ کی لہروں کو قبول نہیں کر رہا تھا یا پھر اس پر تنویمی عمل کیا گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے فرہاد کے دماغ میں پہنچ کر معلوم کرلیا، اس پر تنویمی عمل کیا گیا تھا۔ تم میری بات کا جواب دو۔ کیا سونیا کے ساتھ بھی یہی عمل کیا گیا ہے ؟"

"ہاں، یہی کیا گیا ہے لیکن کیسے کیا گیا ہے، اس کے لیے تم کسی ہپناٹزم کے ماہر سے رجوع کرو۔ میں زیادہ وضاحت نہیں کروں گی۔ ایک بات پوچھتی ہوں۔ جب فرہاد کے دماغ میں آسانی سے پہنچ سکتی ہو تو پھر نرس کو ٹریپ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی لیبارٹری سے رپورٹ آجائے گی۔ بہتر ہے تمھی رپورٹ پیش کر دو۔"

جواب موصول ہونے لگا "میں فرہاد کو ہمیشہ کے لیے اپنے بس میں رکھنا چاہتی ہوں۔ آخر میں اس کے دماغ کو کب تک جھٹکے پہنچاتی رہوں گی۔ رسونتی بار بار ڈھال بن جایا کرے گی۔ میں نے سوچا ایسی دوا انجیکٹ کی جائے کہ رفتہ رفتہ اس کا دماغ کمزور ہوتا چلا جائے۔"

"تم ہمارے مقابل کب تک ثابت قدم رہ سکوگی۔"

"ابھی تو ابتدا ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔"

"یہ مصرعہ یاد رکھنا۔ تمھارے بہت کام آئے گا۔"

"مجھ سے طنزیہ انداز میں گفتگو نہ کرو۔ غصہ آئے گا تو ابھی فرہاد کی کھوپڑی میں زلزلہ پیدا کر دوں گی۔"

"وہاں رسونتی موجود ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ وہ موجود ہوتی تو نرس کے دماغ میں پہنچ کر میری سازشوں کو پہلے ہی سمجھ لیتی۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں، وہ کہاں ہے ؟"

"ٹھیک تمھارے پیچھے ہے۔"

کمپیوٹر کا اسکرین بجھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے روشن ہوا۔ وہاں لکھا ہوا تھا "کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔"

اعلیٰ بی بی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اسے نفسیاتی حربہ کہتے ہیں۔ تم نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا ہوگا، اسی لیے اسکرین بجھ گیا تھا۔ نادان بچی، اتنی خوفزدہ کیوں ہو ؟"

"میں تمھاری باتوں کا جواب فرہاد کی کھوپڑی میں دھماکا کر کے دیتی مگر ذرا انتظار کرو۔ مجھے دوسری طرف سے کچھ اشارے مل رہے ہیں۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا "اوہو، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھیں نادان بچی کہہ دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمھیں اشارے بھی ملتے رہتے ہیں۔"

"یو شٹ اپ، میں ابھی آکر بتاتی ہوں۔"

اسکرین بجھ گیا۔ اعلیٰ بی بی نے ریموٹ کنٹرول کو ہاتھ میں لے کر ہینڈل کیا۔ اسکرین آن ہوگیا۔ ڈاکٹر کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک بٹن آن کرتے ہوئے پوچھا "کیا لیبارٹری سے رپورٹ آگئی ہے ؟"

ڈاکٹر نے چونک کر چھت کی طرف دیکھا۔ اعلیٰ بی بی کی آواز وہیں سے سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر نے کاغذ نکال کر دکھایا۔ اعلیٰ بی بی نے کہا "اسے سیدھی طرح پکڑے رہو، میں دیکھ رہی ہوں۔"

ڈاکٹر نے کاغذ کو اوپر اور نیچے کی طرف پھیلا کر پکڑ لیا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اس کاغذ کو اسکرین کے کلوز اپ میں لاکر پڑھنا شروع کیا۔ رپورٹ وہی تھی۔ ایسی دوا سرنج کے اندر پہلے سے موجود تھی جس کے اثر سے انسانی دماغ رفتہ رفتہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اعلیٰ بی بی نے کہا "میں پڑھ چکی ہوں۔ دیٹس آل۔"

اس نے ٹی وی اسکرین کو آف کر دیا پھر پریشان ہو کر کہا "پتا نہیں رسونتی کہاں رہ گئی ہے۔"

اسی وقت رسونتی نے مجھ سے کہا "میں آگئی ہوں۔ اعلیٰ بی بی سے کہو، مجھے اپنے دماغ میں آنے دے۔"

میں نے پیغام پہنچا دیا۔ وہ چُپ ہو کر ایک طرف تکنے لگی۔ گویا کہ اب اسے اپنے دماغ میں سن رہی تھی پھر اس نے کہا "تم اپنی رپورٹ بعد میں سنانا۔ میں نے تمھیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا، فرہاد کے دماغ سے زیادہ دیر غیر حاضر نہ رہنا۔ تم اب تک کہاں الجھی ہوئی تھیں۔"

یہ سوال کر کے وہ چپ ہوگئی۔ رسونتی کی باتیں سننے لگی۔ میں نے کہا "یہ کیا بات ہے۔ میں یہاں چپ چاپ تماشا دیکھ رہا ہوں اور تم باتیں کر رہی ہو۔ رسونتی سے کہو، وہ تمھاری زبان سے بولتی رہے۔ میں سنتا رہوں گا۔"

اس نے اعلیٰ بی بی کی زبان سے کہا "میں اب تک جہاں الجھی ہوئی تھی، اس کی روداد ابھی بیان کروں گی۔ اعلیٰ بی بی سے معلوم ہوا کہ یہاں مادام کمپیوٹر نے اپنا حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں، وہ ناکام ہوگئی، جو ہوگیا سو ہوگیا تم اپنی روداد بیان کرو۔"

وہ بیان کرنے لگی "اعلیٰ بی بی اور سونیا نے مشورہ دیا تھا کہ مجھے تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں اور ان کے خاص ماتحتوں کے دماغوں میں پہنچتے رہنا چاہیے۔ اس طرح ہم کسی نہ کسی طرح مادام کمپیوٹر کی کوئی کمزوری معلوم کریں گے۔"

اعلیٰ بی بی نے اپنے طور پر کہا "صرف یہی نہیں، ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ تمام سربراہ اور ان کے خاص ماتحت مادام کمپیوٹر سے کیا کام لے رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا "رسونتی ! تم نے اب تک کیا معلومات حاصل کیں ؟"

"میں اب تک ماسٹر کی کے ٹیرر ٹریننگ سینٹر میں تھی۔ تم وہاں خیال خوانی کے ذریعے کئی بار پہنچ چکے ہو۔ تمھیں وہ ہال یاد ہوگا جس کے وسط میں ایک دائرہ نما اسٹیج ہے اور اس اسٹیج پر ایک ریوالونگ چیئر رکھی ہے اور وہ چیئر خود کو ماسٹر کی کہتی ہے۔"

"تم اس ہال کا نقشہ کیوں پیش کر رہی ہو ؟"

"یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ماسٹر کی جسمانی طور پر کہیں بھی موجود نہیں رہتا ہے۔ تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں نے ایک اہم اجلاس طلب کیا تھا۔ ماسٹر کی نے جواب دیا تھا جو بھی اہم اجلاس ہوگا، وہ اسی کے ٹیرر ٹریننگ سینٹر کے اس بڑے ہال میں ہوگا جہاں وہ ریوالونگ چیئر رکھی ہوئی ہے یعنی وہ دوسری تنظیموں کے لیے بھی پُراسرار بنا ہوا ہے۔

بہرحال وہ اجلاس اس ریوالونگ چیئر کے سامنے منعقد ہوا۔ وہاں مادام کمپیوٹر بھی موجود تھی۔ کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس کی موجودگی کا پتا چل رہا تھا۔ اجلاس شروع ہوتے ہی الباما ٹیرر ٹریننگ سینٹر کے بریگیڈیر جوناتھن نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا 'ہم بہت اہم مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لی ہاروی ٹی ٹی سینٹر کے سائمن دی گریٹ نے یہاں آنا ضروری نہیں سمجھا۔'

اس کے جواب میں لی ہاروی ٹی ٹی سینٹر کے ایک خاص فرد نے اٹھ کر کہا 'میں سائمن دی گریٹ کا دستِ راست ہوں، میرے باس نے کہا ہے، وہ ماسٹر کی سے کسی طرح کمتر نہیں ہے اگر ماسٹر کی ہمارے ٹی ٹی سینٹر میں نہیں آسکتا تو سائمن دی گریٹ بھی اسے میزبانی کی زحمت نہیں دے گا۔ لہٰذا میں اپنے باس کی جگہ حاضر ہوں۔ یہاں میں جو کہوں گا اپنے باس کی زبان سے کہوں گا۔ جو سنوں گا وہاں جاکر سنا دوں گا۔'

بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کے ایک فرد نے اٹھ کر کہا 'میں بھی اپنے باس کی طرف سے حاضر ہوا ہوں۔ میرے باس نے کہا، یہ نہایت ہی نامناسب بات ہے۔ اگر ماسٹر کی اپنے گھر سے ہمارے گھر نہیں آسکتا تو پھر ہم اس کے گھر کیسے جاسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ اجلاس ایسی جگہ منعقد کرنا چاہیے تھا جہاں آنے میں کسی کو اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ لوگوں نے صرف ماسٹر کی کے اعتراض کو مدِنظر رکھا ہے۔'

ریوالونگ چیئر نے قہقہہ لگایا پھر ماسٹر کی کی آواز ابھرنے لگی 'تمھارے سربراہوں کی عدم موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ سب میرے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ وہ نہیں آئے، ان کے نمائندے آئے، خیر ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ اب ایجنڈے کے مطابق کارروائی شروع کی جائے۔'

اس کے مطابق الباما ٹی ٹی سینٹر کے بریگیڈیر جوناتھن نے اٹھ کر کہا 'اس وقت کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر آن ہے اور ہم مادام کمپیوٹر سے ان کی کوتاہیوں کی شکایات کر رہے ہیں۔'

وہ کمپیوٹر چھوٹا سا تھا لیکن اسے ایسے آلات کے ساتھ ایک بڑی اسکرین سے منسلک کیا گیا تھا کہ مادام کمپیوٹر کے جو الفاظ چھوٹے سے کمپیوٹر کے اسکرین پر ابھرتے تھے، وہ بڑی اسکرین پر نظر آنے لگتے تھے۔

اسکرین پر اس کا جواب موصول ہو رہا تھا۔ وہاں لکھا ہوا تھا 'میں اپنے خلاف شکایات سن رہی ہوں لیکن پہلے وارننگ دیتی ہوں کہ یہاں رسونتی کسی نہ کسی کے دماغ میں موجود ہے۔'

سب محتاط ہوگئے۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ریوالونگ چیئر نے پھر قہقہہ لگایا 'ہاں، تم سب ایک دوسرے کو دیکھو مگر اس چیئر کو نہ دیکھو۔ کیونکہ ٹیلی پیتھی جاننے والے مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ میں جو تم سب سے برتر ہوں اور میرے سامنے جو دوسرے ٹی ٹی سینٹر کے سربراہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ سب سے پہلے میں نے ہی فرہاد علی تیمور کو چیلنج کیا تھا۔ فرہاد اور رسونتی مجھ تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ ایک دن میں ان کی شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا لیکن میں انھیں جان سے نہیں ماروں گا یوں بے بس کر دوں گا کہ وہ میرے سامنے ساری عمر گھٹنے ٹیکتے رہیں گے۔'

اسکرین پر الفاظ ابھرنے لگے۔ مادام کمپیوٹر کہہ رہی تھی، 'ماسٹر کی ! تمھارا یہ چیلنج میرے لیے بھی ہے۔ زیادہ شیخی مت بگھارو۔ تم سے پہلے کتنے ہی یوگا کے ماہر آئے۔ وہ ٹیکنیکل مائنڈ والا بلیک شیڈو بھی چیلنج کرتا رہا لیکن نتیجہ کیا ہوا۔ یاد رکھو جس وقت تم قہقہے لگا رہے ہوتے ہو، اس وقت ٹیلی پیتھی جاننے والے سنگ

بنلتے ہوئے تمھاری طرف بڑھتے جاتے ہیں۔ ہم ایک نہ ایک دن تمھاری شہ رگ تک پہنچ جائیں گے میری ایک نصیحت یاد رکھو، کم بولا کرو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر بریگیڈیئر جوناتھن نے کہا۔ "مادام کمپیوٹر! تم بھی جو بولتی ہو، وہ نہیں کرتی ہو۔ کیا تم مصلحتاً بہت سی باتیں ہم سے نہیں چھپاتی ہو؟"

"میں مصلحتاً صرف وہی باتیں چھپاتی ہوں جن سے تمھارا نقصان نہیں ہوسکتا۔"

ریوالونگ چیئر نے کہا۔ "ہماری تازہ ترین اطلاع کے مطابق بابر بہت زیادہ پُراسرار بن گیا ہے اور تم اس کے متعلق ہم سے بہت کچھ چُھپا رہی ہو۔ کیا اس سے ہمیں نقصان نہیں پہنچے گا؟"

اسکرین کے ذریعے جواب دیا گیا۔ "جن لوگوں نے یہ اطلاع تمھارے پاس پہنچائی ہے، انھوں نے یہ تو ضرور بتایا ہوگا کہ بابر اتنا پُراسرار کیوں بن گیا ہے۔"

"ہمیں بتایا گیا ہے، وہ کریزی سے مقابلہ کرنے کے بعد ذہنی اور جسمانی طور پر کمزور ہوچکا ہے ـــــ تم آسانی سے اس کے دماغ میں پہنچ سکتی ہو لیکن تم نے اس کے دماغ میں پہنچ کر اب تک کوئی خاص بات نہیں بتائی جبکہ بابر کو حکومت کی بھرپور حمایت حاصل ہو رہی ہے خفیہ پولیس والے اور سیکرٹ سروس کے ایجنٹ اس کی نگرانی کر رہے ہیں جس اسپتال میں وہ زیرِ علاج ہے وہاں سخت پہرہ لگایا گیا ہے۔ ہمارے آدمی وہاں داخل ہونے میں ناکام رہے ہیں۔ آخر بابر میں ایسی کیا بات ہے کہ اس کی اتنی حفاظت کی جارہی ہے۔"

مادام کمپیوٹر نے جواب دیا۔ "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ بابر، کرم داد، جسکانی اور ریحانہ وغیرہ کو وہ خط اور فائلیں اسلام آباد تک لے جانے نہیں دوں گی۔"

"تو پھر کہاں ہے وہ خط، کہاں ہیں وہ فائلیں؟"

"بابر آخری وقت تک ہمیں دھوکا دیتا رہا۔ میں پہلے مجبور تھی۔ اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ نواب شاہ سے جو چالیں چلتا رہا، ان سے یہی ظاہر ہوا کہ اصل کاغذات اس نے اپنے پاس چھپا رکھے ہیں۔ میں نے کم کریزی کو اس سے ٹکرا دیا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔"

ریوالونگ چیئر کے ذریعے ماسٹر کی نے کہا۔ "تم نے میرے ایک بہت اہم مُہرے کو ختم کرا دیا۔ کریزی میرا بہت ہی قابلِ فخر فائٹر تھا۔ تم نے بابر کی پٹائی کرانا چاہی مگر وہ پٹنے والا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ تم نے مجھے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔"

اسکرین پر جواب نظر آیا۔ "نقصان برداشت کرنے اور کبھی کبھی ہارنے کا حوصلہ نہ ہو تو میدان چھوڑ دو۔ جب بابر سے مقابلہ نہیں ہوا تھا تب تم ہی کہا کرتے تھے، کم کریزی ناقابلِ شکست ہے۔ اسی لیے سمجھاتی ہوں، زیادہ شیخی مت بگھارو۔ کم بولو اور کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات تم نہیں کر رہی ہو۔ جب بابر کا دماغ کمزور ہوچکا ہے تو یہ کیوں نہیں بتاتیں کہ تم نے اس کے دماغ سے کیا معلومات حاصل کی ہیں؟"

"میں نے جس حد تک تم لوگوں سے معاہدہ کیا ہے اس حد تک بتا چکی ہوں، وہ خط اور کاغذات اس کے پاس نہیں ہیں۔"

"ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں، بابر کون ہے؟"

"اس سلسلے میں ابھی ہمارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ اس کا معاوضہ الگ سے لوں گی۔"

"جہنم میں گیا تمھارا معاوضہ۔ ہم نے معلوم کرلیا ہے، بابر کے پیچھے فرہاد علی تیمور کی شخصیت ہے۔ تم ہمارے لیے کام کرتی ہو اور ہم سے اس کی اصلیت چھپاتی ہو۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ تم کوئی خوبصورت عورت ہو اور فرہاد لیڈی کلر ہے۔ اگر تم خواب دیکھنے کی عادی ہو تو یقیناً اسے چاہنے والیوں کی فوج میں اپنا نام بھی لکھوانے والی ہو یا لکھوا چکی ہو۔"

"بکواس کرنے سے بہتر ہے، کام کی بات کرو۔ میں پوچھ سکتی ہوں کہ بابر کے پیچھے فرہاد علی تیمور کا شبہ کیوں ہو رہا ہے؟"

"تم شبہ کہہ رہی ہو اور ہم یقین سے کہہ رہے ہیں۔ اگر صرف حکومتِ پاکستان ہی بابر کی حمایت کرتی اور اس کے لیے سخت پہرہ لگاتی، اس کے لیے علاج معالجے کی تمام سہولتیں فراہم کرتی تو ہم شبہے میں مبتلا رہتے لیکن وہاں اعلیٰ بی بی اور سونیا کس لیے پہنچ گئی ہیں، بابر سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

اسکرین پر جلی حرفوں میں نظر آیا۔ "وہی جو فرہاد سے ہے۔"

"یعنی تم تسلیم کرتی ہو کہ تم نے فرہاد علی تیمور کی اصلیت کو ہم سے چھپا رکھا تھا۔"

"تسلیم کرتی ہوں۔ میں تم لوگوں کی زرخرید نہیں ہوں، اپنے معاملات ساری دنیا سے چھپا سکتی ہوں۔"

"لیکن یہ معاملہ ہم سے تعلق رکھتا ہے۔"

"تم سے تعلق رکھتا ہے تو تم فرہاد سے سمجھو۔ میں ایک سوداگر ہوں، اپنی ٹیلی پیتھی کا کمال سب کے سامنے فروخت کرتی ہوں۔ تم سب میرے چیدہ چیدہ گاہک ہو۔ ان میں فرہاد علی تیمور کا اضافہ ہوگیا ہے۔ وہ میری خدمات حاصل کرے گا تو میں اس سے بھی معاوضہ طلب کروں گی لیکن میرا طریقۂ کار یہ رہے گا کہ تم میں سے جو بھی میرا مؤکل رہے گا میں اسے فرہاد علی تیمور

کی طرف سے نقصان پہنچنے نہیں دوں گی۔ کوئی خطرہ درپیش ہوگا تو میں اطلاع دے دوں گی لیکن بچاؤ نہیں کروں گی۔ اپنا بچاؤ خود کرنا ہوگا۔ اسی طرح فرہاد کو جانی نقصان پہنچنے کا احتمال ہوگا تو میں اسے بھی بتا دوں گی لیکن اسے بچانے کے سلسلے میں پیش پیش نہیں رہوں گی۔"

سائمن دی گریٹ کے نمائندے نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی تم دونوں طرف سے مال کھا رہی ہو۔ ہم سب کو کٹھ پتلیاں سمجھ رہی ہو۔ اپنے طور پر نچانا چاہتی ہو۔ میرے باس سائمن دی گریٹ کو یہ منظور نہیں ہے۔"

بہرام علی ٹی ٹی سینٹر سے آنے والے نمائندے نے بھی کہا۔ "مادام کمپیوٹر! ہمارے ٹی ٹی سینٹر کی طرف سے تمھیں بھاری معاوضہ دینے کی پیشکش کی گئی تھی۔ تمھیں اس بات کی ضمانت دی گئی کہ ساری زندگی تمھارے پاس منہ مانگی رقم پہنچتی رہے گی۔ تمھیں صرف ہمارا ساتھ دینا چاہیے لیکن تم نے انکار کر دیا اور تمام دہشت گرد تنظیموں سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ ہر ایک سے اپنے اپنے طور پر مال وصول کرتی جارہی ہو۔ چلو یہ بھی ہم برداشت کرتے رہے ہیں لیکن فرہاد ہم تمام دہشت گرد تنظیموں کا مشترکہ دشمن ہے۔ تمھیں کم از کم اس سے کوئی سودا نہیں کرنا چاہیے۔"

کمپیوٹر نے جواب دیا۔ "میں کسی کی دوست نہیں ہوں، میں کسی کی دشمن نہیں ہوں۔ اگر مجھ سے سودا منظور ہے تو میں مختلف مراحل پر مختلف معاوضوں کے ساتھ تم لوگوں کے کام آتی رہوں گی۔ منظور نہیں ہے تو اچھی طرح سوچ لو۔ فرہاد اس وقت میری ٹیلی پیتھی کی مٹھی میں ہے۔ میں اس سے چشم زدن میں دوستی کرسکتی ہوں اور اس کے ساتھ مل سکتی ہوں۔ پھر ایک نہیں، دو نہیں، تین ٹیلی پیتھی کی قوتیں یکجا ہوجائیں گی اور تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں دھماکے کرتی رہیں گی۔"

پیش آنے والے اس خطرے کو سبھی سمجھ رہے تھے۔ پہلے فرہاد اور سونیا ہی کچھ کم نہ تھے، تیسری بھی دھمکیاں دے رہی تھی۔ تیسری نے کمپیوٹرائزڈ اسکرین کے ذریعے کہا۔ "سوچنے میں خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے سامنے شطرنج کی بساط بچھاؤ اور دیکھو کہ تین ٹیلی پیتھی کے مُہرے یکجا ہوگئے تو تم سب کی مات یقینی ہے۔ اگر جیتنا چاہتے ہو تو ایک مُہرے کو ادھر سے اٹھا کر اپنی طرف رکھو۔ ظاہر ہے وہ مُہرہ میں ہوں۔ میں نے کہہ دیا ہے، تمھاری دشمن نہیں ہوں، فرہاد کی بھی دشمن نہیں رہوں گی لیکن اس کی طرف سے کوئی خطرہ پیش آئے گا تو تمھیں فوراً اطلاع دے دیا کروں گی۔"

بریگیڈیئر جوناتھن نے بیزاری سے کہا۔ "پتا نہیں تم تیسری کہاں سے آ ٹپکی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم کسی کا ساتھ نہ دو۔"

"پھر میری کمائی کہاں سے ہوگی؟"

"اگر تم خاموش تماشائی بن کر رہنے کا وعدہ کرو تو ہم منہ مانگی رقم ادا کرتے رہیں گے، ساری زندگی ادا کرتے رہیں گے۔"

مادام کمپیوٹر نے کہا۔ "خاموش تماشائی بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرہاد کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہو تو میں تم لوگوں کو اطلاع نہ دوں۔"

ایک نے کہا۔ "نہیں نہیں، یہ اطلاع تو ضرور دینا چاہیے۔"

"پھر میں خاموش تماشائی کیسے رہوں گی؟"

ماسٹر کی نے کہا۔ "تم بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہم ایسے بھی پھنسے ہوئے ہیں اور ویسے بھی۔"

"تو پھر یہ اجلاس طلب کرنے کی زحمت کیوں گوارا کی ہے۔ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔"

"اگر ساتھ ہو تو ہمیں بتاؤ، فرہاد جہاں زیرِ علاج ہے وہاں اس کی حفاظت کے لیے اسپتال کے اندر کیسے انتظامات کیے گئے ہیں؟ باہر کی خبر ہمیں ہے۔"

کمپیوٹرائزڈ اسکرین پر لکھا ہوا نظر آیا۔ "اندر کی خبر کیا پوچھتے ہو، کیا اتنی اطلاع کافی نہیں ہے کہ فرہاد کے کمرے میں اعلیٰ بی بی اور سونیا باری باری ڈیوٹی دینے پہنچ گئی ہیں۔ کمرے میں ایک بڑا سائیڈ وی اسکرین ہے، اس میں اسپتال کا اندرونی حصہ نظر آتا ہے۔ اعلیٰ بی بی اس کمرے میں رہ کر پورے اسپتال کا معائنہ کرسکتی ہے۔ ایک ایک ڈاکٹر، ایک ایک نرس کی حرکت کو اپنی نظر میں رکھتی ہے۔ وہاں جو لوگ ڈیوٹی پر لگائے گئے ہیں، انھیں گونگا بنا دیا گیا ہے۔ ایک ہفتے تک وہ اپنے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کریں گے۔ اپنی آواز اپنے گھر والوں کو بھی نہیں سنائیں گے۔"

ماسٹر کی نے کہا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے۔ سونیا کے دماغ میں ٹیلی پیتھی کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے۔"

"میں نے کوشش کی تھی۔ اس کے دماغ کو لاک کر دیا گیا ہے۔ یہ سوچنا ہی نادانی ہے کہ سونیا مجھے اپنے دماغ میں آنے کی دعوت دینے کے لیے فرہاد کے کمرے میں پہنچ جائے گی۔"

بریگیڈیئر جوناتھن نے کہا۔ "ہمیں اعلیٰ بی بی اور سونیا کی آئندہ چالوں کے متعلق معلوم ہونا چاہیے اور مادام کمپیوٹر ان دونوں کے دماغوں میں نہیں پہنچ سکتی۔ گویا ہمیں اس سلسلے میں اس کمپیوٹر سے کوئی مدد حاصل نہیں ہوگی۔"

ماسٹر کی نے کہا۔ "مدد حاصل ہوسکتی ہے لیکن مادام کمپیوٹر نے خواہ مخواہ یہ شیخ لگا دی ہے کہ سونیا کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتی۔ کیا اس طرح یہ فرہاد کا بچاؤ نہیں کر رہی ہے؟"

اسکرین کے ذریعے جواب دیا گیا۔ "تم اپنے طور پر کچھ بھی سوچ سکتے ہو۔ میں ابھی فرہاد کی حفاظت نہیں کر رہی ہوں۔

میں نے جو کہا ہے سچ کہا ہے۔ یقین کرو یا نہ کرو۔"

سائمن دی گریٹ کے نمائندے نے کہا "اس طرح تو ہمارے درمیان اختلافات بڑھتے جائیں گے۔ مادام کمپیوٹر پر سے اعتماد اٹھتا جائے گا۔"

مادام نے کہا "اعتماد اٹھتا جائے گا لیکن تم سب اعتماد کرنے پر مجبور رہو گے۔ آج کے اجلاس میں یہ فیصلہ کر لو، مجھ سے دوستی کرنی ہے یا دشمنی۔ میں پندرہ منٹ کی مہلت دیتی ہوں۔ پندرہ منٹ تک اپنی طرف سے ایک لفظ نہیں کہوں گی، کوئی سوال کرے گا تو کسی کی بات کا جواب نہیں دوں گی لیکن یہاں موجود رہوں گی اور تم سب کی باتیں سنتی رہوں گی۔"

رسونتی اس اجلاس کی رپورٹ ہمیں سنا رہی تھی اور ہم سن رہے تھے۔ اعلیٰ بی بی نے چونک کر پوچھا "مادام کمپیوٹر نے یہ کب کہا تھا کہ وہ پندرہ منٹ تک کسی کی بات کا جواب نہیں دے گی لیکن اس اجلاس میں موجود رہے گی؟"

رسونتی نے جواب دیا "یہی کوئی آدھا گھنٹہ پہلے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھیں دھوکا دے کر یہاں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی، تم وہاں موجود ہو۔ اس کی یہ بات سننے کے بعد بھی اجلاس سے آنا نہیں چاہو گی اور پندرہ منٹ انتظار کرتی رہو گی کہ مادام کمپیوٹر ان کی باتوں کا کیا جواب دینے والی ہے۔ تمھیں وہاں الجھا کر وہ یہاں چلی آئی تاکہ فرہاد کے خلاف کسی نرس کو آلۂ کار بنا سکے۔"

رسونتی نے کہا "پھر تو اس نے بڑی مکاری دکھائی۔ میں پھر دھوکا کھا گئی۔"

"اس میں افسوس کرنے کی کیا بات ہے۔ موجودہ صورتحال کے مطابق دو باتیں اچھی طرح یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ تمھیں فرہاد کے دماغ سے زیادہ دیر غیر حاضر نہیں رہنا ہے اور اگر کہیں بھی مصروف رہو تو تھوڑی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچتی رہو۔ اگر ایک ہی جگہ مصروف رہو گی تو دشمن دوسری طرف سے حملہ کریں گے خصوصاً مادام کمپیوٹر کے پاس یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے۔ وہ تمھیں کسی دوسری جگہ الجھا کر فرہاد کے پاس آیا کرے گی۔ ہمیں اس طریقۂ کار کو ناکام بنانا ہوگا۔"

کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر سے اشارہ موصول ہونے لگا۔ میں نے اسے آن کیا۔ اعلیٰ بی بی میرے قریب آ کر اسکرین پر لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی "میں تمھارے درمیان موجود ہوں۔ ابھی رسونتی بھی موجود ہے۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اس لیے کمپیوٹر کے ذریعے بول رہی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے میں چیلنج کر کے گئی تھی کہ اعلیٰ بی بی مجھ پر طنز نہ کرے۔ غصہ آئے گا تو تمھاری کھوپڑی میں زلزلہ پیدا کر دوں گی لیکن رسونتی سے پوچھ لو، مجھے غصہ بہت کم آتا ہے۔ میں نے ہر جگہ میں تمھاری حمایت کی ہے، میں نے تمھاری اصلیت نرس پر نہیں کی۔ خود بخود انھیں معلوم ہو گیا ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ میں تمھاری دشمن نہیں ہوں، دوست بننا چاہتی ہوں۔"

میں نے کہا "تمھاری دوستی خوب ہے۔ تم نے دوستی کے لیے ہی اس نرس کو ٹریپ کیا تھا اور دوستی کے لیے ہی وہ انجکشن میرے جسم میں لگانا چاہتی تھیں۔"

جواب ملا "دوستی محبت سے بھی کی جاتی ہے اور جبر سے بھی۔ میں محبت سے کروں گی تو سودے بازی نہیں ہوگی، تم سے منافع حاصل نہیں ہوگا۔ جبراً دوستی کروں گی، تمھارے دماغ کو کمزور بنا کر تمھیں اپنے قابو میں رکھوں گی تو مجھے بھی فائدہ حاصل ہوگا اور تمھیں بھی میری ذات سے نقصان نہیں پہنچا کرے گا۔"

میں نے کہا "وہ تمام ٹی ٹی سینٹر والے تمھارے محتاج ہیں۔ اگر تم سے دوستی نہیں کریں گے تو تمھاری دشمنی سے ڈرتے رہیں گے اور دوستی کریں گے تو یہ بات ان کے دماغوں میں چبھتی رہے گی کہ تم مجھ سے بھی دوستی کر رہی ہو۔ بہرحال میں ان کی طرح نہ تو محتاج ہوں نہ مجبور ہوں۔ تمھیں میری ذات سے فائدہ نہیں پہنچے گا۔ تم نقصان پہنچا سکتی ہو تو پہنچا کر دیکھ لو۔"

مادام کمپیوٹر نے کہا "فرہاد! جو بات میں اس اجلاس میں تمام ٹی ٹی سینٹر کے سربراہوں اور ان کے خاص ماتحتوں کو سمجھا کر آئی ہوں، وہی میں تمھیں سمجھاتی ہوں۔ تم سب کے درمیان شطرنج کی بساط بچھی ہوئی ہے۔ تمھاری طرف دو ٹیلی پیتھی کے مہرے ہیں۔ اگر مجھ تیسری کا اضافہ ہو تو تمھاری قوت بڑھ جائے گی۔ مجھے اپنے خانوں سے نکال کر مخالف گروہ میں جانے پر مجبور کرو گے تو نقصان ضرور پہنچے گا۔ تمھارے دعوے کے مطابق میں زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکوں گی لیکن دانشمندی کا تقاضا ہے کہ معمولی سا نقصان بھی کیوں پہنچے؟ اس سے بچنے کی تدبیر کیوں نہ کی جائے اور تدبیر یہی ہے کہ میری دوستی قبول کر لو۔ میں تمھارے کام آیا کروں گی اور تم میرے کام آیا کرو گے۔"

"تم خواہ مخواہ گلے پڑ رہی ہو۔ بی بی معاف کرو۔ کوئی دوسرا گھر دیکھو۔"

"تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔ میں یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ جب تک تمھاری زندگی میں اور تمھارے معاملات میں اہمیت اختیار نہیں کروں گی، تم مجھے اپنی ضرورت نہیں سمجھو گے۔ میں جلد ہی اپنا کمال کر کے دکھاؤں گی۔ اس کے بعد تم چیخ چیخ کر مجھے آوازیں دو گے، مجھے اپنے پاس بلاؤ گے۔ تب ٹیلی پیتھی کے ایک پلڑے پر رسونتی ہوگی دوسرے پر میں، اور تم تسلیم کرو گے کہ میرا پلڑا بہت بھاری ہے۔"

میں نے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے بٹن پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "میں تمھاری خیال خوانی کو روک تو نہیں سکتا مگر تمھارا منہ بند کر سکتا ہوں۔"

میں نے بٹن کو دبا دیا۔ کمپیوٹر کو آف کر دیا۔ اسکرین بجھ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پھر سگنل موصول ہونے لگا۔ میں نے اسے آن نہیں کیا۔ تب اچانک ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں ایک دم سے تڑپ گیا۔ رسونتی نے فوراً خیال خوانی کے ذریعے مجھے سنبھالا، مجھے جو تکلیف محسوس ہو رہی تھی، وہ میرے دماغ میں رہ کر کوشش کرنے لگی کہ میں تکلیف کو محسوس نہ کر سکوں۔

چند لمحوں کے بعد مجھے دوسرا جھٹکا محسوس ہوا مگر وہ نہایت ہی خفیف سا تھا۔ مجھے زیادہ تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ رسونتی میرے دماغ کو بے حس بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور کہتی جا رہی تھی "کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ جب کمپیوٹر کو آف کر دیا گیا، تمھاری باتیں نہیں سنی گئیں تو تم نے فرہاد کو تکلیف پہنچانا شروع کر دی۔ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے ہتھکنڈے اس طرح آزما کر دیکھ لو۔"

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ کس ذریعے سے اپنا جواب ہم تک پہنچائے۔ کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو آف کر دیا گیا تھا۔ میرے دماغ پر رسونتی کا قبضہ تھا۔ اعلیٰ بی بی کے دماغ میں وہ پہنچ نہیں سکتی تھی۔ ہاں میرے دماغ میں آ کر میری ہی سوچ کی لہروں کو اپنا کر اپنی بات کہہ سکتی تھی لیکن ڈرتی تھی، بہت محتاط تھی۔ سوچتی ہوگی اگر ذرا بھی لغزش ہو جائے، میری سوچ کی لہروں کو اپنانے کے دوران اس کی سوچ کی ایک لہر بھی رسونتی کی گرفت میں آ جائے تو پھر اسے فرار کا راستہ نہیں ملے گا۔

اعلیٰ بی بی نے پوچھا "کیا وہ جا چکی ہے؟"

میں نے کہا "کوئی بھی خیال خوانی کرنے والا دماغ کے تاریک خانوں میں چھپا رہے، اپنی طرف سے کچھ نہ بولے تو اس کی موجودگی کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ موجود ہو۔"

رسونتی نے کہا "اس پر خاک ڈالو۔ اگر دماغ میں موجود ہے تو بے کار ہے۔ نہ بول سکتی ہے، نہ کھانس کھنکار سکتی ہے۔ ہمارے پاس آ کر ٹیلی پیتھی کی لاش بن کر رہ سکتی ہے۔ تم نے اتنی عورتوں کو پال رکھا ہے، ایک لاش کو بھی پالتے رہو۔"

اعلیٰ بی بی ہنسنے لگی۔ میں نے پوچھا "کیوں ہنس رہی ہو؟ اس ہنسی پر مادام کمپیوٹر اور زیادہ کڑھ رہی ہوگی۔"

رسونتی نے کہا "فرہاد! میں نے اعلیٰ بی بی اور سونیا کی ایک تجویز پر عمل کیا ہے۔ تم سے اجازت لینے کا موقع نہیں تھا کیونکہ تم پندرہ گھنٹے کے لیے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔"

وہ خیال خوانی کے ذریعے میری زبان کو استعمال کر رہی تھی تاکہ اعلیٰ بی بی سنتی رہے۔ میں نے پوچھا "کس تجویز پر عمل کیا ہے؟"

اعلیٰ بی بی نے کہا "میں بتاتی ہوں۔ میں نے، سونیا نے، رسونتی اور شبانہ نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ تمھاری زندگی میں جو بھی عورت آئے گی، ہم اسے زیادہ دیر ٹھہرنے نہیں دیں گے۔ اس آنے والی سے دشمنی بھی نہیں کریں گے بلکہ اس کی زندگی سنوارنے کے لیے کسی دوسری راہ پر لگا دیں گے۔ ہماری تجویز کے مطابق رسونتی نے پہلا تجربہ حور بانو اور جسکانی پر کیا ہے۔ تمھیں کوئی اعتراض ہے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا کر کہا "حور بانو کی زندگی سنور جائے اور اسے جسکانی جیسا شوہر اور محافظ مل جائے تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔"

اعلیٰ بی بی نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے کہا "رسونتی! اب تم سناؤ۔ کیا وہ ایک دوسرے کی طرف مائل ہو چکے ہیں؟"

"میں نے تو یہی کوشش کی تھی اور تقریباً کامیاب ہو چلی تھی۔ حور بانو آہستہ آہستہ اس کی طرف مائل بھی ہوتی جا رہی تھی اور پریشان ہو کر سوچتی بھی جا رہی تھی کہ اس کا دماغ اور دل کیسے بدل رہا ہے۔ وہ بابر کو بھول کر جسکانی کی طرف کیوں مائل ہو رہی ہے۔ وہ ایسا سوچتی بھی جا رہی تھی اور اعتراف کرتی جا رہی تھی کہ جسکانی اس کے دل و دماغ پر چھا رہا ہے۔ اسے بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "اور جسکانی کی کیا حالت ہے؟"

"وہ بھی اس کی طرف مائل ہو رہا ہے اور سوچتا جا رہا ہے کہ پہلے کبھی کسی عورت کی طرف اس نے دھیان بھی نہیں دیا۔ اب حور بانو کو رہ رہ کر کیوں دیکھتا ہے، وہ کیوں اچھی لگ رہی ہے۔ لاہور سے اسلام آباد تک ٹرین میں سفر کرنے کے دوران جسکانی نے کئی بار حور بانو کے خیال کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ اب تسلیم کر رہا ہے کہ عشق اسی کو کہتے ہیں۔ محبت یکبارگی دل اور دماغ پر دھاوا بول دیتی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "رسونتی! تم بہت اچھا رول ادا کر رہی ہو۔ اب یہ بتاؤ، وہ محبت کے کس مرحلے تک پہنچے ہیں؟"

"جب میں انھیں ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں

چھوڑ کر آئی تو وہ کچھ پریشان بھی تھے اور ایک دوسرے سے محبت کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ میں نے سوچا، ابھی یہیں تک کافی ہے۔ دوسری بار ان کے پاس آؤں گی تو ان کے دل اور دماغ میں محبت کی کھچڑی اور پکاؤں گی۔"

"کیا تم پھر ان کے پاس گئی تھیں؟"

"ہاں، گئی تھی لیکن وہاں بازی پلٹ چکی تھی۔"

اعلیٰ بی بی نے حیرانی سے پوچھا: "وہ کیسے؟"

"مادام کمپیوٹر میری کاٹ میں لگی ہوئی ہے۔ میں انھیں محبت کا میٹھا زہر پلا رہی تھی۔ وہ نفرت کا زہر پلانے لگی۔ حور بانو کے دماغ میں پہنچ کر یہ خیالات پیدا کیے کہ وہ صرف بابر کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ بابر ایک پُراسرار شخص ہے، اتنا پُراسرار کہ جنگل کے ویرانے اور ہیبت ناک ماحول میں اس کے تمام ساتھی سو جاتے ہیں اور وہ جاگتا رہتا ہے۔ چھ دشمن آ کر حملہ کرتے ہیں۔ پانچ اس طرح مر جاتے ہیں کہ بابر ایک گولی بھی نہیں چلاتا۔ چھٹا وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔

ہاں، وہ بہت پُراسرار ہے۔ اب میں اس کے پاس نہیں ہوں۔ پچھلی رات میں نے کروٹیں بدل بدل کر گزاری۔ مجھے نیند کیوں نہیں آئی جبکہ اس کی موجودگی میں فوراً آ جاتی تھی۔ کیا وہ کوئی ساحر ہے۔ مجھ پر سحر پھونکتا تھا۔

ہاں، اب میں یقین سے کہتی ہوں، جب تک اس کے ساتھ رہی، سحر زدہ رہی۔ اپنے آپ میں نہ رہی، نہ سوتے نہ جاگتے۔ سوتے میں بھی مجھے یوں لگا جیسے میں محبت کے سائے میں آرزو بھرے لمحات گزار رہی ہوں۔ اگرچہ وہ لمحات خواب خواب سے تھے مگر میں اسی ساحر پر جان دیتی رہوں گی۔ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ یہ جبکانی کیوں مجھے اپنی طرف مائل کر رہا ہے۔ میں کیوں اس کی طرف کھنچی جا رہی ہوں۔"

یقیناً مادام کمپیوٹر نے اس کے دماغ میں زہر بھر دیا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی، کہیں ... تو نہیں کہ بابر کوئی ساحر نہ ہو، کوئی غیر معمولی علم جاننے والا شخص ہو۔ شاید ٹیلی پیتھی جانتا ہو اور میرے دماغ میں رہ کر مجھے سحر زدہ کرتا رہا ہو اور وہ اب بھی یہی چاہتا ہے کہ میں اسے بھول کر جبکانی کی طرف مائل ہو جاؤں۔ یہ بات پہلے بھی وہ سمجھا چکا ہے کہ ہمیشہ میرا ساتھ نہیں دے گا۔ کہیں نہ کہیں چھوٹ جائے گا اور وہ چھوٹ گیا۔ اب وہ کہیں دور رہ کر میرے دماغ میں آتا ہے اور ٹیلی پیتھی کے ذریعے مجھے جبکانی کی طرف مائل کرتا رہتا ہے۔ نہیں نہیں، میں کسی کی طرف مائل نہیں ہو سکتی۔ بابر تم کہاں ہو؟ اگر ٹیلی پیتھی جانتے ہو، میرے دماغ میں موجود ہو تو میرا آخری فیصلہ سن لو۔ میں جان دے دوں گی مگر اپنا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ خدا کے لیے مجھ پر کوئی جادو نہ کرو۔ اگر مجھے اپنا نہیں سکتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

بابر! اگر یہ واقعی ٹیلی پیتھی کے ہتھکنڈے ہیں تو میں تم سے ایک بات یاد رکھنے کو کہتی ہوں کہ تم اپنے علم سے دو دماغوں کو ملا سکتے ہو، دو دلوں کو نہیں ملا سکتے اور جب دل ملتے ہیں تو ہمیشہ کے لیے مل جاتے ہیں۔ دماغ ملتے ہیں تو کبھی نہ کبھی دوری ہوتی ہے۔ تم کب تک سحر پھونکتے رہو گے۔ جب بھی میرا دماغ تمھارے سحر سے آزاد ہوگا، میں خودکشی کر لوں گی۔"

رسونتی یہ رپورٹ سنا کر چپ ہو گئی۔ ہم بھی چند لمحوں تک چپ رہے۔ پھر اعلیٰ بی بی نے کہا: "مادام کمپیوٹر اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ حالانکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بےچاری حور بانو کی زندگی برباد ہو جائے گی۔"

میں نے کہا: "مادام کمپیوٹر کو فائدہ کیوں نہیں پہنچے گا، ضرور پہنچے گا۔ وہ جانتی ہے، ہم جسے چاہتے ہیں، اس کا زندگی بھر ساتھ دیتے ہیں اور اس کی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر نہ سنوار سکے اور راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوں تو ہماری پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ ہمارا ضمیر ملامت کرے گا۔ ہم ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں گے اور یہی مادام کمپیوٹر کی کامیابی ہوگی۔"

ہم خاموش ہو کر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کا ایک سرخ بٹن جل بجھ رہا تھا اور ہلکی ہلکی سی آواز آ رہی تھی۔ اعلیٰ بی بی نے ریموٹ کنٹرول کو آن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے سے اسکرین پر سونیا نظر آئی۔ اس نے کہا: "ہیلو اعلیٰ بی بی!"

پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی: "ہیلو چاکلیٹ، اتنے میٹھے کیوں بن جاتے ہو کہ چیونٹیاں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ میں بہت پہلے ہی پیشگوئی کر چکی ہوں، تمھاری موت کسی عورت کی وجہ سے ہوگی۔ دیکھو لو، مادام کمپیوٹر نے تمھیں اسپتال پہنچا دیا ہے۔"

میں نے کہا: "تم بہت اچھی بکواس کر لیتی ہو۔ سامنے تو آؤ۔"

"تمھارے سامنے ہی ہوں۔ اس سے زیادہ سامنے نہیں آؤں گی۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا: "سونیا، تمھاری ڈیوٹی شروع ہونے والی ہے۔ وہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے میز پر سے ایک کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کو اٹھاتے ہوئے اور اسکرین پر ہمیں دکھاتے ہوئے کہا: "میں مادام کمپیوٹر سے دوستی کر رہی ہوں بلکہ ہماری دوستی ہو چکی ہے۔"

سونیا بھی اپنی جگہ سے اسکرین پر ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اعلیٰ بی بی نے اسے آنکھ ماری۔ پھر فوراً ہی غصے سے کہا: "کیا بکواس کر رہی ہو۔ اس مہم کے دوران میں تمھاری لیڈر ہوں۔ میں نے جو ڈیوٹی مقرر کی ہے، تمھیں اسے انجام دینا چاہیے۔"

سونیا نے کہا: "سوری، اعلیٰ بی بی! میں تمھاری عزت کرتی ہوں مگر تمھیں اپنے اوپر مسلط نہیں کر سکتی۔ میری ڈیوٹی کسی اور کو دے دو۔"

اعلیٰ بی بی نے میری طرف پلٹ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "رسونتی، ذرا میرے پاس آؤ۔"

وہ میرے دماغ سے اس کے دماغ میں پہنچ گئی۔ وہاں کیا باتیں ہوئیں، اس وقت مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ بعد میں جو کچھ معلوم ہوا، وہ میں بتائے دیتا ہوں۔ جب رسونتی، اعلیٰ بی بی کے دماغ میں پہنچی تو اس نے کہا: "سونیا کوئی چال چل رہی ہے۔ مجھے اشارہ مل گیا ہے۔ ہمیں سونیا سے جھگڑا کرنا چاہیے اور مادام کمپیوٹر سے دوستی کرنے پر اعتراض کرنا چاہیے۔ اب تم فرہاد کے دماغ میں جاؤ مگر فرہاد سے یہ باتیں نہ کہنا۔ ورنہ مادام کمپیوٹر اس کی سوچ پڑھ لے گی۔"

جب رسونتی میرے پاس آئی تو میں نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

اس نے کہا: "اعلیٰ بی بی کو سونیا کے اس طرزِ عمل پر اعتراض ہے۔ اسے مادام کمپیوٹر سے دوستی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ تمھاری بات مانتی ہے۔ اعلیٰ بی بی نے کہا ہے، تم سمجھاؤ گے تو وہ اس کی دوستی سے باز آ جائے گی۔"

میں اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کہا: "بھئی سونیا کو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ جب بھی وہ کوئی پینترا بدلتی ہے، کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے تو اس راستے کے اختتام پر دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پر اعتراض نہ ...۔"

رسونتی نے کہا: "سونیا لاکھ ذہین اور مکاری میں بےمثال سہی لیکن اعلیٰ بی بی اس سے کم نہیں ہے۔ ہمیں اعلیٰ بی بی کے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ ہم اسی کی لیڈرشپ میں ہیں۔"

میں نے اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "سونیا! یہ مناسب نہیں ہے۔ کسی کو لیڈر تسلیم کر لینے کے بعد اسی کی رہنمائی میں اور اسی کی منصوبہ بندی کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ اگر اعلیٰ بی بی کو تمھارے اس طرزِ عمل پر اعتراض ہے تو تم باز آ جاؤ۔ ہم نے مادام کمپیوٹر کو گھاس نہیں ڈالی ہے۔ ایک ذرا لفٹ نہیں دینا چاہتے۔ تم لفٹ دو گی تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔"

"ہم سب اپنی مشکلات سے نمٹنا جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ اچھا کیا ہے، برا کیا ہے۔"

"اگر جانتی ہو تو ہمیں بھی اچھا برا سمجھاؤ۔"

"تم اور رسونتی اپنی اپنی ٹیلی پیتھی پر نازاں ہو یا پھر مادام کمپیوٹر کی صلاحیتوں سے جلتے ہو۔ وہ بھی تمھارے برابر خیال خوانی کرنے والی ہستی ہے۔ میں پوچھتی ہوں، اگر ایک اور خیال خوانی کرنے والی کا اضافہ ہماری ٹیم میں ہو جائے گا تو کیا نقصان ہے؟"

اعلیٰ بی بی نے کہا: "تم یہ بھول رہی ہو کہ وہ کسی ایک کی دوست نہیں ہے اور کسی ایک کی دشمن نہیں ہے۔ اگر وہ صرف ہماری دوست بن کر رہے تو اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے لیکن وہ تو صرف دوغلی چالیں چلتی ہے۔ جس سے منافع حاصل ہوتا ہے، اسی کے کام آنا شروع کر دیتی ہے۔ سونیا، ہوش کی باتیں کرو۔ آخر اس مادام کمپیوٹر نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے کہ اس کی حمایت کر رہی ہو۔"

"محبت اور دوستی جب حد سے بڑھنے لگتی ہے تو وہ

جادو کی طرح اثر کرتی ہے۔ مادام کمپیوٹر کی محبت بھی مجھ پر اثر کر رہی ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک معاہدہ ہونے والا ہے اور وہ ایسا معاہدہ ہے جس کے متعلق میں تم میں سے کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ میں رسونتی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اس نے میرا دماغ لاک کر دیا ہے۔ اب وہ بھی میرے پاس پہنچ کر ہمارے منصوبے اور معاہدے کے متعلق معلومات حاصل نہیں کر سکے گی۔"

میں نے کہا "تم ہماری مخالفت کر رہی ہو لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ تمھاری ذات سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھیں یا ہمارے دوسرے تمام ساتھیوں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"تم یہاں آکر ڈیوٹی نہیں سنبھالو گی تو کیا مجھے نقصان نہیں پہنچے گا؟"

"میری جگہ کوئی بھی وہاں ڈیوٹی دے سکتا ہے یا دے سکتی ہے۔"

"تمھاری جگہ کوئی نہیں سنبھال سکتا۔"

"مجھے تعریف کر کے پھسلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے کہہ دیا ہے، تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور زیادہ وضاحت سے سننا چاہتے ہو تو سن لو۔ آج سے پورے ایک ہفتے تک تمھارے کمرے میں مادام کمپیوٹر نہیں آئے گی، کوئی دشمن تمھاری طرف آنا چاہے گا تو اسے مجھ سے اور مادام کمپیوٹر سے ٹکرانا ہوگا۔ اعلیٰ بی بی اور رسونتی احتیاطاً تمھارے پاس رہ سکتی ہیں۔ تم اطمینان سے اپنا علاج کراؤ اور جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔ دیٹس آل مائی چاکلیٹ۔"

سونیا اپنے اس کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو اٹھا کر وہاں سے چلی گئی۔ یعنی اسکرین اس کے وجود سے خالی ہو گیا۔ اعلیٰ بی بی نے اسے آف کرتے ہوئے حیرانی سے کہا "دوست اور دشمن میری حاضر دماغی، ذہانت، معاملہ فہمی اور منصوبہ بندی کی تعریفیں کرتے ہیں لیکن میں سونیا کو سمجھ نہیں پائی کمبخت شیطانی دماغ رکھتی ہے۔ پتا نہیں اس نے کیا چکر چلایا ہے۔ کس طرح اس نے مادام کمپیوٹر کو اپنی مٹھی میں لیا ہے کہ ایک ہفتے تک وہ اس کمرے میں بھی نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا "اور آئے گی تو ہم اس کی موجودگی کو سمجھ نہیں پائیں گے۔"

رسونتی نے کہا "اسی لیے وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ مجھ کو اور اعلیٰ بی بی کو تمھارے پاس موجود رہنا چاہیے۔"

ویسے سونیا نے درست کہا تھا۔ اس رات کے بعد سے مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کسی رکاوٹ اور پریشانی کے بغیر میرا علاج ہونے لگا۔ آمنہ کئی بار مجھ سے ملنے آئی لیکن اتنا سخت پہرہ تھا کہ ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب مجھے پتا چلا تو میں نے اعلیٰ بی بی سے کہا "اسے تھوڑی دیر کے لیے بھیج دو۔ میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے اجازت مل گئی۔ جب وہ کمرے میں آئی تو اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ شیرنی کی طرح دشمنوں پر ٹوٹ پڑتی تھی لیکن اس وقت مرجھائی ہوئی تھی۔ میں نے محبت اور ہمدردی سے کہا "آمنہ، میرے پاس آؤ۔ کیا بات ہے اتنی اُداس کیوں ہو؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے بستر کے پاس آئی۔ مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اپنے بابر کو ڈھونڈ رہی ہو۔

میں نے کہا "میں تمھیں ساری حقیقت بتا چکا تھا۔ تم نے کہا تھا، میں بابر نہ سہی، اس کی زندہ تصویر تو ہوں۔ جب اپنے اس دنیا سے اٹھ جاتے ہیں تو دل کی تسلی کے لیے ان کی تصویروں کو دیواروں پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ میں آج بھی بابر کی تصویر کی طرح تمھارے سامنے ہوں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "اگر تم کوئی اور ہوتے، فرہاد علی تیمور نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

"میرے فرہاد ہونے پر کیا اعتراض ہے؟"

"تم بہت مہنگے ہو، بہت ریزرو رہتے ہو، میں اچھی طرح جانتی ہوں، اگر کوئی تم سے ملنا چاہتا ہے تو اسے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈھونڈنا پڑتا ہے اور میں تو اپنے بابر کو چاہتی ہوں۔ اگر تم کوئی اور ہوتے تو میں تمھیں ہر قیمت پر حاصل کر لیتی اور اپنے ساتھ رکھتی۔ خدا گواہ ہے کہ ساتھ ضرور رکھتی مگر تمھیں بابر کا مقام کبھی نہ دیتی۔"

"میں تمھارے جذبوں کو اور بابر سے تمھاری وفا کو اچھی طرح سمجھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو بابر کی جگہ لے سکے۔ حتیٰ کہ یہ فرہاد علی تیمور بھی یہ جگہ پُر نہیں کر سکتا۔"

وہ آگے بڑھی، میرے چہرے پر جھک گئی۔ اسے خوب غور سے دیکھنے لگی۔ میرے چہرے کا ایک ایک نقش بابر کے نقوش کا حامل تھا۔ میں نے کہا "آمنہ! میں تمھاری صلاحیتوں کو ضائع ہونے نہیں دوں گا۔ تم کہیں بھٹکنے کے لیے نہیں جاؤ گی۔ ہمارے ساتھ رہو گی۔ اعلیٰ بی بی تمھیں بابا فرید واسطی صاحب کے ادارے میں پہنچائے گی۔ وہاں سے امتحانات پاس کرنے کے بعد تم ہماری

ٹیم میں شامل ہو جاؤ گی۔ بولو، ہمارا ساتھ تو نہیں چھوڑو گی نا؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی ؎

"اے شمع تیری عمرِ طبعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اور میں رونا نہیں جانتی۔ ہنستے ہنستے پہاڑ جیسی زندگی گزاروں گی۔ اس سے زیادہ مناسب اور کیا ہو سکتا ہے کہ مجھے بابا فرید واسطی صاحب کے ادارے میں جگہ مل جائے اور پھر میں تم لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔"

اعلیٰ بی بی نے پیچھے سے آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ آمنہ نے پلٹ کر اسے دیکھا تو اعلیٰ بی بی نے اسے گلے لگا لیا۔ میرے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ایک طرف حور بانو اور جسکانی کا معاملہ جو مادام کمپیوٹر کی مداخلت سے بگڑتا جا رہا تھا، اب وہ پھر بننے والا تھا کیونکہ سونیا اسے ہینڈل کر رہی تھی۔ مادام کمپیوٹر کو ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع وہ کبھی نہ دیتی۔ دوسری طرف میں نے بابا فرید واسطی صاحب کے ادارے میں آمنہ کا ٹھکانا بنا دیا تھا۔

ذہنی سکون حاصل ہو اور کسی طرح کی فکر لاحق نہ ہو تو ایک بیمار تیزی سے صحت یاب ہوتا چلا جاتا ہے جبکہ میرا علاج خاص توجہ سے ہو رہا تھا۔۔۔ بڑے ماہر ڈاکٹر میرے لیے دن رات حاضر رہتے تھے۔ مجھے مہنگی اور زود اثر دوائیں استعمال کرائی جا رہی تھیں۔ اعلیٰ بی بی نے تیمار داری کی انتہا کر دی تھی۔ وہ چوبیس گھنٹے میں صرف چھ گھنٹے سوتی تھی۔ اس کے بعد میری ہی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی۔

میرے لیے موسم کے تازہ پھل، خالص دودھ، بہترین غذائیں فراہم کی جاتی تھیں۔ میں کم کھانے کا عادی ہوں۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ کھلاتی تھی۔ میں دوسرے ہی دن اٹھ کر بیٹھ گیا تیسرے دن اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک عام مریض اور ایک دلیر سپاہی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک سپاہی کے تمام زخم بھر جائیں۔ ذرا توجہ سے اس کی مرہم پٹی ہو جائے تو وہ بستر سے اٹھ جاتا ہے کچھ اور توجہ دی جائے اور خاطر خواہ دوائیں استعمال کرائی جائیں تو وہ ہاتھ میں بندوق بھی پکڑ لیتا ہے۔ میری عمر ایک سپاہی کی طرح لڑتے ہوئے گزر رہی ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ ہمیں اسپتال کے بستر پر نیند نہیں آتی۔ ہم گھر کے بستر پر صرف تھکن اتارتے ہیں ورنہ ہمیشہ میدانِ عمل میں مصروف رہنا چاہتے ہیں۔ یہی ہماری فطرت ہے۔

پانچویں دن میں نے پچھلی کھڑکی کی طرف منہ کر کے اسپتال کے پائیں باغ کو دیکھا۔ وہاں مسلح محافظوں کا ایک کیمپ لگا ہوا تھا۔ تازہ تازہ ہوا آ رہی تھی۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر ہلکی سی ورزش کی۔ گہری گہری سانسیں لیں۔ اسی وقت رسونتی میرے دماغ میں آئی تو میں نے سانس روک لی۔ اس کی سوچ کی لہریں واپس چلی گئیں۔ میں نے خوش ہو کر خیال خوانی کی پرواز کی تو فوراً رسونتی کے دماغ میں پہنچا۔ پہلے اس نے سانس روکی پھر پوچھا "کون؟"

میں نے جواباً پوچھا "کیا مجھے خوش آمدید نہیں کہو گی؟"

وہ ایک دم سے چونک گئی "کون ہو تم؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔ مادام کمپیوٹر تمھارے دماغ میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ میں ہوں تمھارے بیٹے کا باپ۔"

پارس اس کے سامنے کھیل رہا تھا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ پارس کو اٹھا کر سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا "دیکھو دیکھو تمھارے پاپا آئے ہیں۔"

پارس نے کہا "پاپا، پاپا۔۔۔"

رسونتی نے کہا "ہاں، بولو بیٹا۔ پاپا آئے۔"

اس نے دہرایا "پاپا آئے۔" میں یوں تو اس کے معصوم سے دماغ میں کئی بار جھانکتا رہا تھا۔ اس کے دماغ کی کائنات کے متعلق میں پہلے بہت کچھ بتا چکا ہوں۔ آج پہلی بار باقاعدہ اس کی آواز، اس کے لب و لہجے کو گرفت میں لے کر اس کے پاس پہنچا پھر اس کے دماغ میں کہا "ہاں، بیٹا میں ہوں، تمھارا پاپا۔"

رسونتی نے کہا "اور میں ہوں، تمھاری ماما۔"

پارس اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر خلا میں تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا کہ دماغ میں ماں اور باپ کی آواز کیسے آ رہی ہے۔ اس نے اپنی ماما کی طرف دیکھا۔ رسونتی نے کہا "فرہاد! میں اس کے دماغ میں جانے سے پرہیز کرتی ہوں، تمھارے آنے کی خوشی میں پہلی بار دماغ میں پہنچ کر تمھارے ساتھ بول رہی تھی۔ یہ ابھی مناسب نہیں ہے۔ بچہ ہے، ہماری خیال خوانی کو سمجھ نہیں پائے گا۔ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جائے گا۔"

"تم درست کہتی ہو۔ آؤ، اب ہم اعلیٰ بی بی کو خوشخبری سنائیں۔"

"مجھے نہ بلاؤ۔ وہ اپنے طور پر خوشی کا اظہار کرے گی۔ میرا موجود رہنا مناسب نہیں ہے۔"

رسونتی نے دانشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ ادھر اعلیٰ بی بی کو معلوم ہوا تو وہ مارے خوشی کے والہانہ محبت کا ثبوت دینے لگی۔ وہ پانچواں دن بھی گزرنے لگا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ ان پانچ دنوں میں دشمن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے تھے۔ انھوں نے اپنی سی کوششیں کی تھیں، ذہانت سے کام لینے اور مکارانہ چالیں چلنے والے سخت پہروں سے بھی کسی نہ کسی طرح گزر جاتے ہیں لیکن

اعلیٰ بی بی اور سونیا جیسی ذہین اور مکار عورتیں وہاں موجود تھیں۔ دشمنوں کی ایک چال بھی کامیاب نہیں ہو رہی تھی اور کامیاب کیسے ہوتی جبکہ اس مکار سونیا نے مادام کمپیوٹر کو اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا۔

میں اپنی یہی حیرانی دور کرنا چاہتا تھا لیکن سونیا سے اسی وقت رابطہ قائم ہوتا جب وہ ٹی وی اسکرین کے ذریعے ہم سے مخاطب ہوتی۔ ورنہ ہم اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اعلیٰ بی بی نے کہا "اگر تم چاہو تو سونیا کو کمرے میں بلا کر اس پر تنویمی عمل کر سکتے ہو۔ جس دماغ کو لاک کیا گیا ہے' اسے کھولا بھی جا سکتا ہے۔"

"ابھی مناسب نہیں ہے۔ اگر ہم نے اس پر تنویمی عمل کیا اور اس کے دماغ کے دروازوں کو اپنے لیے کھولنا چاہا۔ تو وہ دروازے مادام کمپیوٹر کے لیے بھی کھل جائیں گے۔"

اعلیٰ بی بی نے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اپنی دماغی صحت یابی کی خوشخبری اسے بھی سنا دو۔ بے چاری نے سونیا سے وعدہ کیا ہے کہ ایک ہفتے تک اس کمرے میں نہیں آئے گی۔ ہم ہی اسے بلا لیتے ہیں۔"

میں نے اسے لے کر آپریٹ کیا۔ دوسری طرف مادام کمپیوٹر جہاں بھی تھی' اسے اشارہ موصول ہو رہا ہوگا۔ میں نے اسکرین کو آن کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس پر تحریر نظر آئی۔

"ویٹ اے منٹ۔"

ہم انتظار کرنے لگے۔ صرف آدھے منٹ میں ہی اسکرین پر مادام کمپیوٹر کے الفاظ ابھرنے لگے۔ وہ حیرانی کا اظہار کر رہی تھی' اس نے لکھا تھا "تعجب ہے' جب میں ایک ہفتے تک نہ آنے کا وعدہ کر چکی ہوں تو اس سے پہلے تم مجھے کیوں مخاطب کر رہے ہو؟"

"میں تمھیں اپنے دماغ میں آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔"

"میں نے سونیا سے وعدہ کیا ہے' تمھارے دماغ میں نہیں جاؤں گی۔"

"جب میں کہہ رہا ہوں تو پھر وعدے کی پابندی لازمی نہیں ہوتی۔"

"تم اجازت دے رہے ہو تو آ رہی ہوں۔"

میں نے خلا میں تکتے ہوئے انتظار کیا۔ میرے دماغ نے چند لمحوں کے بعد ہی اجنبی سوچ کی لہروں کو محسوس کیا۔ میں نے سانس روک لی۔ وہ لہریں واپس چلی گئیں۔ میں مسکرا کر اعلیٰ بی بی کو دیکھنے لگا۔ اس نے اشارے سے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ آئی تھی۔ میرے دماغ سے ٹکرا کر چلی گئی۔ اب ذرا اسکرین کو دیکھو۔ اسی وقت اسکرین پر مادام کمپیوٹر نے کہا۔

"اچھا سمجھ گئی۔ تم یہ چیلنج کرنے بلا رہے تھے کہ میں تمھارے دماغ میں نہیں آ سکوں گی۔ تمھاری دماغی توانائی بحال ہو چکی ہے۔"

"ہاں' تمھاری خوش فہمی دور کرنا چاہتا تھا اور ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا۔"

"پوچھو' مناسب سمجھوں گی تو جواب دوں گی۔"

"ایسی کیا بات ہے کہ تم نے سونیا سے دوستی کر لی اور اس دوستی کے نتیجے میں اپنے وعدے کے مطابق اِدھر کا رخ نہیں کیا؟ کیا اس سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمھاری کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آ گئی ہے۔"

"تعجب ہے۔ سونیا تمھاری رگِ جاں سے قریب ہے۔ تم نے اس سے نہیں پوچھا۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو۔"

"اس سے رابطہ قائم نہیں ہو رہا ہے' اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

"یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ وہ تمھیں لفٹ نہیں دے رہی ہے اور تم سے دور کہیں اپنے روز و شب گزار رہی ہے۔ تم اس کا انتظار کر رہے ہو اور ابھی وہ تمھارے پاس آنا ضروری نہیں سمجھتی ہے۔ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمھارے بس میں نہیں ہے' تم اس کے بس میں ہو۔"

"تم یہ مسئلہ نہ اٹھاؤ کہ چھری خربوزے پر گرتی ہے یا خربوزہ چھری پر۔ اگر تمھاری کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے تو مجھے بتاؤ' نہیں بتاؤ گی تو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔"

"کمزوری خود بخود ظاہر ہو جائے تو یہ مجبوری ہوتی ہے ورنہ کوئی اپنی مجبوری کسی کو نہیں بتاتا' تم مجھ سے ایسی توقع نہ رکھو۔"

میں نے کمپیوٹر کو آف کیا۔ میری خیال خوانی کو پَر مل گئے تھے' میں پرواز کر سکتا تھا۔ اب دہشت گرد تنظیموں کے مختلف سربراہوں کے پاس پہنچ کر معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ میرے خلاف کس قسم کے اقدامات کر رہے ہیں۔ اسی وقت میرے کمرے میں رکھے ہوئے ٹی وی سے اشارہ موصول ہونے لگا۔ اعلیٰ بی بی نے فوراً ہی ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اسے آپریٹ کیا پھر اسکرین روشن ہو گیا۔ سونیا نظر آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "مجھے فوراً سونتی کی ضرورت ہے۔ وہ میرے دماغ میں نہیں آ سکتی۔ اس سے کہو' آمنہ کے دماغ میں پہنچے۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا "تمھارے لیے خوشخبری ہے فرہاد نے دماغی توانائی بحال کر لی ہے۔"

اس نے خوش ہو کر سر گھماتے ہوئے یوں دیکھا جیسے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔ پھر اس نے کہا "فرہاد! ام بھی آؤ مگر سونتی بھی ضروری ہے۔"

پھر اس نے اعلیٰ بی بی سے کہا "تم ابھی فرانس کے سفارت خانے سے رابطہ قائم کرو۔ ان سے دوستی کا حوالہ دے کر کہو' ہمیں فوراً ایک چارٹرڈ طیارے کی ضرورت ہے۔ اگر انتظام نہ ہو سکے تو ائیر فرانس کا جو بھی طیارہ پرواز کرنے والا ہو' اس میں آمنہ کے لیے ایک سیٹ ریزرو کرائی جائے۔ چارٹرڈ طیارے کا انتظام یہاں نہ ہو سکے تو انقرہ میں اس کا بندوبست کیا جائے۔ آمنہ انقرہ تک سفر کرے گی۔ وہاں سے چارٹرڈ طیارے کے ذریعے وادیٔ قاف جائے گی۔"

"میں ابھی تمام انتظامات کیے دیتی ہوں۔ مجھے چند لفظوں میں یہ بتا دو کہ بات کیا ہے؟"

"ایک بین الاقوامی نوعیت کا اہم راز میری مٹھی میں ہے۔ آمنہ اسے لے کر وادیٔ قاف جائے گی۔ یہ راز وہیں محفوظ رہ سکتا ہے۔ دشمن وہاں تک پہنچنے کی جرأت نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو منہ کی کھائیں گے۔"

"میں نے کہا "سونیا! میں کسی بھی راز کے سلسلے میں اپنے وطن کو ترجیح دوں گا۔ یہ راز ہماری سیکرٹ سروس میں محفوظ رہنا چاہیے۔"

"مجھے بچی سمجھ کر سبق نہ پڑھاؤ۔ پاکستان سے مجھے بھی محبت ہے' تمھارے رشتے سے میں بھی پاکستانی ہوں۔ میں نے اس راز کی دو کاپیاں بنائی ہیں۔ ایک یہاں محفوظ رہے گی' دوسری آمنہ لے جا رہی ہے۔"

میں آمنہ کے دماغ میں پہنچ گیا۔ سونتی بھی وہاں پہنچ گئی۔ میں نے کہا "اب ہمیں بتاؤ' آخر وہ راز کیا ہے؟"

"میں ابھی بتاتی ہوں۔" اس نے ایک پیچ کس لے کر کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ڈھانچے کو کھولنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں اس کا پچھلا حصہ کھل گیا۔ اندر کل پرزے نظر آ رہے تھے۔ سونیا نے کہا "یہ کمپیوٹر جو میرے پاس ہے' ایسا ہی تمھارے پاس ہے اور ایسا ہی کمپیوٹر دہشت گرد تنظیموں کے تمام سربراہوں کے پاس ہے پھر کیا وجہ ہے کہ مادام کمپیوٹر جب مجھ سے رابطہ قائم کرتی ہے تو اس کمپیوٹر سے صرف میں ہی گفتگو سنتی ہوں۔ تم میں سے کوئی یہ گفتگو نہیں سن سکتا؟"

میں نے کہا "ہاں' یہ ایک اہم ٹیکنیکل سوال ہے۔"

"یہ سوال جب میرے دماغ میں پیدا ہوا تو میں نے سیکرٹ سروس کے چیف سے تعاون کی درخواست کی۔ میں نے کہا۔ "مجھے ایک ایسے ماہر کی ضرورت ہے جو ریڈیو' ٹی وی' ٹرانسمیٹر اور کمپیوٹر وغیرہ میں فنی مہارت رکھتا ہو اور بے مثال کاریگر ہو۔" چیف نے صرف دو گھنٹے کے اندر ایک ایسے ماہر کو تمام اوزار کے ساتھ میرے پاس پہنچا دیا۔"

اس نے بڑی سی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں تم مختلف سامان دیکھ رہے ہو۔ جو اہم سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا' میں نے وہی ٹیکنیکل سوال اس ماہر سے کیا۔ اس نے بتایا "ہر فرد سے بات کرنے کے مختلف چینل ہیں۔ مثلاً وہ مادام کمپیوٹر مجھ سے چینل نمبر سات پر بات کرتی ہے۔ تم سے چینل نمبر پانچ پر۔ اسی طرح لی ہارڈی ٹی ٹی سینٹر کے سائمن دی گریٹ سے کسی اور چینل پر بات کرتی ہے۔ ماسٹر کی سے کسی اور چینل پر۔ مادام کمپیوٹر نے جتنے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر تیار کیے ہیں' ان میں ہر فرد کے لیے ایک مخصوص چینل رکھنے کے بعد باقی تمام چینل کا سسٹم ختم کر دیا ہے۔

اس ماہر نے بتایا "مادام کمپیوٹر کے پاس جو کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر ہے۔ وہ ایک بہت بڑا سیٹ ضرور ہوگا اور اس سیٹ میں تمام چینل موجود ہوں گے۔ وہ جس چینل پر چاہتی ہوگی' بات ..... کر لیتی ہوگی۔ اگر میرے اس کمپیوٹر پر ایک سے لے کر بارہ تک چینل کا سسٹم کر دیا جائے تو میں یہاں بیٹھے بیٹھے اسی کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے سائمن دی گریٹ اور مادام کمپیوٹر سے ہونے والی گفتگو سن سکتی ہوں۔ پھر چینل بدل کر ماسٹر کی سے ہونے والی گفتگو بھی سن سکوں گی۔"

جب مجھے اس تکنیک کا پتا چلا تو میں نے اس ماہر سے کہا "اپنی فنی مہارت کا ثبوت دو اور اس کمپیوٹر میں ایک سے لے کر بارہ چینل تک کا سسٹم بحال کر دو۔"

اس نے کام شروع کر دیا۔ اس کے لیے تمام ضروری سامان فراہم کیا جانے لگا۔ صرف آٹھ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد اس نے یہ کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر میرے لیے تیار کیا ہے۔ اس میں ایک سے لے کر بارہ تک چینل موجود ہیں۔ میں یہاں بیٹھے بیٹھے کسی بھی چینل کو تبدیل کر کے مادام کمپیوٹر سے ہونے والی تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کی گفتگو سن لیتی ہوں اور میں نے سن لیا ہے۔ صرف سنا نہیں ہے بلکہ ان کی تمام باتیں ریکارڈ بھی کر لی ہیں۔"

آمنہ حیرانی سے دیدے پھیلائے سونیا کو تک رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں' میں اور سونتی اسے شدید حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر میں نے کہا "سونیا! تم کیا چیز ہو' معلوم ہوتا ہے' جب تم پیدا ہوئی تھیں تو شیطان نے اپنا دماغ تمھاری کھوپڑی میں امانت کے طور پر رکھ دیا تھا اور پھر واپس لینا بھول گیا۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا "یہ تم میری تعریفیں کر رہے ہو؟"

"میں دشمنوں کی زبان سے تعریف کر رہا ہوں۔ وہ تمھیں اسی طرح شیطان کی خالہ، چڑیل، بدروح، جادوگرنی، بلائے ناگہانی اور عذابِ جان اور نہ جانے کیا کچھ کہیں گے۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

آمنہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھی۔ محبت سے مسکراتی رہی پھر قریب آکر بولی۔ "میں زبان سے نہیں، دل سے کہوں گا۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں باتیں کریں گی۔"

آمنہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔ رسونتی نے کہا۔ "سونیا! میں نے بھی تمھیں گلے سے لگائے رکھا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم دونوں اسی طرح محبت کا اظہار کرتے رہو گے تو وقت ضائع ہوگا۔ ابھی بڑے کام پڑے ہیں۔ میں چاہتی ہوں" تم آمنہ پر تنویمی عمل کرو اور اس کے دماغ کو لاک کر دو تاکہ مادام کمپیوٹر کسی وقت اسے ٹریپ نہ کر سکے۔"

سونیا جس مکان میں رہ کر کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کے سلسلے میں تجربات کرتی رہی تھی، میں اس کے دوسرے کمرے میں آمنہ کو لے گیا اور تنویمی عمل کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔ دوسری طرف رسونتی نے اعلیٰ بی بی سے رابطہ قائم کر کے پوچھا۔ "آمنہ کی روانگی کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے؟"

"تمام انتظامات ہو چکے ہیں۔ اب سے تین گھنٹے بعد ایئر فرانس کا طیارہ یہاں سے روانہ ہونے والا ہے۔ آمنہ کے لیے ایک سیٹ ریزرو کرا دی گئی ہے۔ جب وہ القرہ پہنچے گی تو اس کے لیے ایک چارٹرڈ طیارہ موجود رہے گا۔"

رسونتی نے سونیا کو یہ باتیں بتائیں۔ سونیا نے کہا۔ "ایک ایسی ایمبولینس نما گاڑی کا انتظام کیا جائے جس میں آمنہ کو لے جایا جا سکے کیونکہ تنویمی عمل کے بعد کم از کم اسے ایک گھنٹہ سُلانا لازمی ہوگا۔ وہ ساہیوال سے لاہور تک سوتے ہوئے سفر کرے گی۔"

رسونتی نے یہی بات اعلیٰ بی بی کو بتائی۔ اس نے کہا۔ "میں ایسی گاڑی کا انتظام بھی کیے دیتی ہوں مگر رسونتی" میں تجسس میں مبتلا ہوں۔ مجھے جلدی سے بتاؤ کہ سونیا ایسا کیا کرتی رہی ہے کہ بین الاقوامی اہمیت کا کوئی راز اس کے ہاتھ آگیا ہے۔"

"میں ابھی آکر بتاتی ہوں۔"

اس نے سونیا سے کہا۔ "اعلیٰ بی بی تجسس میں مبتلا ہے۔ میں اسے تمھارے کارناموں کے متعلق بتانے جا رہی ہوں۔"

"ابھی ٹھہر جاؤ۔ پہلے ضروری کام ہونا چاہیے۔ فرہاد یہاں دماغی طور پر آمنہ کے پاس موجود ہیں لیکن جسمانی طور پر اسپتال کے اسی کمرے میں ہیں۔ اعلیٰ بی بی سے کہہ دو کہ فرہاد کو وہاں سے نکالا جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسرا مریض وہاں پہنچایا جائے۔ اسپتال کے چاروں طرف اتنا سخت پہرہ ہے کہ باہر والوں کو اس تبدیلی کا پتا نہیں چلے گا۔ اعلیٰ بی بی جو ایمبولینس نما گاڑی بھیجنے والی ہے فرہاد اسی گاڑی میں چھپ کر چلے آئیں گے۔ اب تم جا سکتی ہو۔"

رسونتی اعلیٰ بی بی کے پاس آگئی۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔ "میں تنویمی عمل کرنے کے لیے آمنہ کے پاس جا رہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک مجھے مخاطب نہ کرنا۔"

میں آمنہ کے پاس پہنچ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ تنویمی عمل کا جو طریقۂ کار میں اب تک اختیار کرتا آیا ہوں، میں نے اسی طریقے کے مطابق آمنہ کو اپنی معمولہ بنایا اور اس کے دماغ کو اس حد تک لاک کر دیا کہ کوئی بھی اجنبی سوچ کی لہر اس کے دماغ میں پہنچے تو وہ اسے محسوس کر لے اور سانس روک لیا کرے۔

چونکہ آمنہ اپنی مرضی سے میری معمولہ بنی تھی، اس لیے میرا کام جلد ہی ہو گیا۔ میں نے اسے ایک گھنٹے کے لیے سلا دیا۔ اس کے بعد دماغی طور پر حاضر ہو کر اعلیٰ بی بی سے کہا۔ "میں اس کمرے سے نکلنے کو تیار ہوں، دوسرے مریض کو بلایا جائے۔"

یہ کام بھی نہایت رازداری سے ہو گیا۔ میرے کمرے میں ایک شخص آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں وہاں سے اٹھ کر اسپتال کے ان حصّوں سے گزرتا گیا جہاں سخت پہرہ تھا اور مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں اس ایمبولینس میں آکر بیٹھ گیا۔ اس کے پچھلے دروازے کو بند کر دیا گیا۔ وہ گاڑی مجھے سونیا کے پاس لے گئی۔ وہاں سے آمنہ کا سفر شروع ہوا۔ اسے ایک اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس کے پچھلے حصّے میں پہنچایا گیا۔ اس حصّے میں چار مسلّح محافظ بیٹھ گئے۔ آگے بھی دو مسلّح جوان بیٹھے ہوئے تھے پھر وہ لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نے رسونتی کو مخاطب کیا اور کہا۔ "تم آمنہ کے دماغ میں مسلسل موجود رہو گی۔ لاہور پہنچنے تک وہ تنویمی نیند سے بیدار ہو جائے گی۔ جب وہ طیارے میں سوار ہو جائے تو اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تمام مسافروں کو اچھی طرح چیک کر لینا۔ طیارہ یہاں سے پرواز کرنے لگے تو اس کے دماغ سے آ سکتی ہو۔ میں اس کی نگرانی کروں گا۔"

"تم میری فکر نہ کرو۔ میں لاہور سے کراچی، کراچی سے استنبول اور وادیٔ قاف تک اس کی نگرانی کرتی رہوں گی۔ کبھی ضرورت پیش آئے گی تو تمھیں بلاؤں گی ورنہ اپنی جگہ مصروف رہو۔ پانچ دن کے بعد اسپتال سے نکلے ہو، ذرا سی غفلت نقصان دہ

ثابت ہوگی۔ کہیں دشمن تمھیں دیکھ نہ لیں۔"

"میں اپنا پورا خیال رکھوں گا۔ تم آمنہ کے پاس جاؤ۔"

میں نے دروازے کو بند کیا۔ پھر پلٹ کر سونیا کو محبت سے دیکھا۔ وہ بڑی محبت سے میرے پاس آگئی۔ وہ میری جانِ حیات تھی۔ سب سے نرالی، سب سے الگ۔ جب سے میری جدّوجہد کی داستان شروع ہوئی ہے تب سے آج تک کوئی لڑکی سونیا کی ذہانت، چالبازی، حاضر دماغی اور دشمنوں پر دہشت بن کر چھا جانے والی مثال پیش نہ کر سکی۔ حالانکہ ثباتہ اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتی تھی، رسونتی کی الگ خصوصیات تھیں، اعلیٰ بی بی کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن دشمن اگر کسی سے ڈرتے تھے اور کتراتے تھے تو وہ صرف سونیا تھی۔

ایک گھنٹے بعد اس نے ایک اٹیچی میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں تمھارے لیے لباس ہے اور میک اپ کا سامان بھی، اپنے چہرے میں تبدیلیاں کر لو۔"

میں نے پہلے غسل کیا پھر آئینے کے سامنے بیٹھ کر میک اپ کرنے لگا۔ چونکہ ہلکی سی تبدیلی کرنا تھی، کوئی مستقل میک اپ نہیں تھا۔ اس لیے عارضی میک اپ میں دیر نہیں لگی۔ میں نے لباس پہننے کے بعد باہر آکر پوچھا۔ "اب بتاؤ، کیا ارادے ہیں؟"

"میں تمھیں وہ تمام آوازیں سناؤں گی جو ریکارڈ کر چکی ہوں۔"

وہ بڑے سے ریکارڈر کے پاس گئی پھر کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کو اٹھاتے ہوئے بولی۔ "جب تم اسپتال پہنچے، اس کے دوسرے دن یہ ایک سے بارہ چینل تک تیار ہو چکا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک نمبر چینل پر مادام کمپیوٹر سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے ایک نمبر کو نہیں چھیڑا۔ دو نمبر کو آزمایا۔ جانتے ہو، کس سے رابطہ قائم ہوا؟"

میں نے پوچھا۔ "کس سے؟"

"اسی ماسٹر کی سے۔ جس نے تمھیں چیلنج کیا تھا کہ اب گُرو ماسٹر اور ماسک مین وغیرہ تمھارے راستے میں نہیں آئیں گے۔ وہ تمھارے سامنے یوگا کی دیوار بن جائے گا اور تمھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔"

"اچھا، تو تم نے اس سے مادام کمپیوٹر بن کر گفتگو کی۔"

"ہاں، تم جیکی وائز کے ذریعے ماسٹر کی تک پہنچنے کا راستہ بنا چکے تھے۔ میں نے اس کمپیوٹرکم ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس کے پاس پہنچنے کا راستہ نکال لیا۔ وہ کمبخت مجھے مادام کمپیوٹر سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹروں کی رپورٹ کے مطابق فرہاد ایک ماہ تک دماغی کمزوری میں مبتلا رہے گا۔ ایک ہفتے بعد اسے اسپتال سے منتقل کیا جائے گا لیکن اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے سلسلے میں اتنی رازداری سے کام لیا جا رہا ہے کہ تم، تمھارے خاص ماتحت اور تمھارے آلۂ کار فرہاد کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ صرف میں اس کے دماغ میں رہ کر معلوم کرتی رہوں گی۔ صرف میں تمھیں بتا سکتی ہوں کہ فرہاد کو کس طریقے سے اور کن راستوں سے کہاں لے جایا جائے گا۔"

"اگر تم فرہاد کو اغوا کرنے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون کرو اور یہ بات کسی دوسری دہشت گرد تنظیم کے سربراہوں کو نہ بتاؤ تو میں تمھیں منہ مانگی قیمت ادا کروں گا۔ تمھاری ہر شرط پوری کروں گا۔"

سونیا نے مجھ سے کہا۔ "یہ باتیں جو میں تمھیں بتا رہی ہوں، انھیں میں ریکارڈ کر چکی ہوں۔ انھیں سنتے جاؤ تو تمھیں ساری رپورٹ مل جائے گی۔"

اس نے ریکارڈر کو آن کر دیا۔ اب اس میں سے وہی باتیں سنائی دے رہی تھیں جو سونیا مجھے اب تک بتا چکی تھی۔ اس کے بعد جو میں نے سنا تو ماسٹر کی کہہ رہا تھا۔ "مادام کمپیوٹر! کیا وہ اتنے احمق ہیں، انھیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ تم فرہاد کے کمزور دماغ میں رہ کر ان کی پلاننگ کو سمجھ لو گی؟"

سونیا نے جواب دیا۔ "انھوں نے اپنے طور پر بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ رسونتی نے تنویمی عمل کے ذریعے فرہاد کے دماغ کو لاک کر دیا ہے اور اس کو اپنا معمول بنا کر ہدایت کی ہے کہ اس کے دماغ میں صرف رسونتی کی سوچ کی لہریں آئیں گی، کوئی دوسری سوچ کی لہر آئے تو اس کا دماغ قبول نہیں کرے گا۔ ایسا کرتے وقت رسونتی ایک بات بھول گئی کہ میں اس کا لب و لہجہ اختیار کر کے اس کی سوچ کی لہر بن کر فرہاد کے دماغ میں پہنچ سکتی ہوں۔"

"تعجب ہے، یہ تو بہت معمولی سی بات ہے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی جبکہ وہاں اعلیٰ بی بی اور سونیا جیسی ذہین اور مکّار عورتیں وہاں موجود ہیں۔"

"بعض حالات میں انسان اس قدر خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنے سامنے دشمن کو کمزور بھی سمجھتا ہے اور کم عقل بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے چالاک اور ذہین مجرم صرف خوش فہمی میں مبتلا رہ کر کوئی ایسی غلطی کر جاتے ہیں، کوئی ایسی لغزش ہو جاتی ہے کہ وہ قانون کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ خوش فہمی میں رہ کر اس طریقۂ کار کو بھول گئی ہیں اور مجھے اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔"

ماسٹر کی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "ہاں' بعض حالات میں بڑے سے بڑے چالاک اور ذہین ترین مجرم اپنے غرور میں اور خوش فہمی میں بھول جاتے ہیں کہ ان سے کوئی چھوٹی سی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر تم فرہاد کو میرے پاس پہنچادو اور کسی دوسری تنظیم کو اس کی ہوا نہ لگنے دو تو میں منہ مانگی رقم ادا کروں گا۔ میں جانتا ہوں' تم دوہری چالیں چلتی ہو۔ ہر طرح سے اور ہر طرف سے منافع حاصل کرتی ہو۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں' فرہاد کو میرے پاس پہنچانے میں مدد کرو گی تو تمھیں اتنا فائدہ پہنچاؤں گا جتنا تمام تنظیمیں مل کر بھی نہیں پہنچا سکتیں۔ میں ساری عمر تمھارے مطالبات پورے کرتا رہوں گا۔"

"تم ایسا کر سکتے ہو۔ میں مادام کمپیوٹر کی حیثیت سے تم لوگوں کے سامنے ابھی حال ہی میں آئی ہوں۔ اس سے پہلے میں چپ چاپ تماشائی تھی اور بڑی خاموشی سے بڑے بڑے ممالک کے اندرونی راز معلوم کرتی رہی ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمھارے اور الباما ٹی ٹی سینٹر کے بریگیڈیئر جوناتھن کے درمیان گہرا گٹھ جوڑ ہے۔ تم دونوں سپر ماسٹر کے لیے کام کر رہے ہو۔ کیا یہ غلط ہے؟"

"تم موضوع سے ہٹ کر گفتگو کر رہی ہو۔"

"میرا جو مطالبہ پیش ہونے والا ہے' اس کا تعلق اسی سے ہے اور اسی شرط پر میں تمھیں فرہاد کے متعلق مکمل معلومات فراہم کروں گی۔"

"کیا تم سپر ماسٹر کا ذکر چھیڑ کر یہ معلوم کرنا چاہتی ہو کہ ہم کون ہیں اور ہمارے پیچھے سپر ماسٹر کا ہاتھ کس طرح کام کر رہا ہے اور یہ باتیں تم کہیں ریکارڈ کر رہی ہو؟"

"ماسٹر کی! نادان بچوں کی طرح باتیں نہ کرو۔ اب تک میں نے تم لوگوں سے جتنے معاہدے کیے ہیں اور اس کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے تمھارے ساتھ جو گفتگو کی ہے اور پاکستان میں تخریبی کارروائیوں کے سلسلے میں جو باتیں مجھ سے کہی گئی ہیں، وہ ساری باتیں یہاں ریکارڈ کر سکتی تھی لیکن نہیں کیں۔ تم لوگوں کی جانب سے پاکستان میں جو تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ چل رہا ہے' اگر میں یہ ریکارڈ کر کے بین الاقوامی سطح پر لے آؤں تو کیا مجھے دوہرا فائدہ حاصل نہیں ہوگا؟ لیکن میں جانتی ہوں، اس کے بعد تم لوگوں کا اعتماد مجھ سے اٹھ جائے گا۔ میں ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتی اور پھر مجھے ریکارڈ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں جب چاہوں' تمھارے خاص ماتحتوں کے دماغ میں پہنچ کر بہت کچھ معلوم کر سکتی ہوں۔ اگر مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو بات ختم کر دو۔ میں سائمن دی گریٹ سے سودا کر لوں گی۔"

"نہیں نہیں' رک جاؤ۔ تم وہاں نہیں جاؤ گی۔ صرف ہمارے درمیان سودا طے ہوگا۔ ہر حال میں طے ہوگا اور ہر شرط پر ہوگا۔ بولو' کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ سپر ماسٹر پس پردہ کیوں چلا گیا؟"

"وہ فرہاد' رسونتی اور سونیا کو اپنے قابو میں نہ کر سکا۔ ایک کے بعد ایک کئی سپر ماسٹر آئے اور سب ناکام رہے۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کام صرف میں کر سکتا ہوں کیونکہ میں یوگا کا ماہر ہوں' استادوں کا استاد ہوں' میرے پچیس شاگرد ایسے ہیں جو دس منٹ سے لے کر آدھے گھنٹے تک سانس روک سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کم کریزی بھی تھا جو فرہاد کے ہاتھوں مارا گیا۔ بہر حال ابھی چوبیس باقی ہیں۔ یہ ایسے شہ زور اور ناقابلِ شکست ہیں کہ فرہاد ان سے ٹکراتے ٹکراتے چکنا چور ہو جائے گا۔"

"جب تم اسے چکنا چور کر سکتے ہو تو پھر میرا تعاون کیوں چاہتے ہو؟"

"میں اپنے یوگا کے ماہروں سے جو خدمات لینے والا ہوں اس میں ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔ تمھارے ذریعے یہی کام چشمِ زدن میں ہو سکتا ہے۔"

"جس دن فرہاد اسپتال سے منتقل کیا جائے گا' میں اس سے پہلے ہی تمھیں اطلاع دوں گی۔ اسے اغوا کرنے کے تمام راستے ہموار کر دوں گی۔ اس کے بعد میں پاکستان سے نکل کر اس ملک میں تمھارے لیے کام کرنا چاہتی ہوں' جہاں تمھاری سرگرمیاں بڑی تیز ہیں۔"

"یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ تم وہاں بھی ہمارے کام آؤ گی۔"

مادام نے کہا "مگر مجھے اس کا پس منظر معلوم ہونا چاہیے۔ تمھارے لوگ وہاں کی حکومت کو اندر سے کمزور بنا رہے ہیں جبکہ تم یہ اچھی طرح جانتے ہو، ماسک مین کی حکومت وہاں بہ آسانی اقتدار حاصل کر سکتی ہے۔"

ماسٹر کی نے کہا "ہماری یہی چال ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ماسک مین کے ملک سے فوجیں آئیں اور اس ملک پر چھا جائیں۔ اس کے تمام پڑوسی ممالک خوفزدہ رہیں گے۔ انھیں ہمیشہ یہی اندیشہ رہے گا کہ ماسک مین کے فوجی اس ملک کے راستے ان کی سرحدوں کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ وہ ممالک ایسے وقت ہماری طرف دیکھیں گے' ہماری امداد چاہیں گے' ہمارے محتاج رہیں گے اور ہمارے اشاروں پر چلیں گے۔"

ماسٹر کی چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "مادام کمپیوٹر! تم ہمارے بہت سے رازدارانہ اور خفیہ معاملات میں

ساتھ دے رہی ہو۔ اس لیے ہم تمھیں وضاحت سے بتا رہے ہیں تاکہ دوسرے ملک میں بھی تم ہمارے کام آتی رہو مگر یاد رکھو، اگر تم نے کسی معاملے میں دھوکا دینے کی کوشش کی تو میرا نام ماسٹر کی ہے۔ میں نے کبھی فرہاد علی تیمور اور رسونتی کی ٹیلی پیتھی کو اہمیت نہیں دی، تم تو ابھی دو دن کی بچی ہو۔"

"تم نہ تو مجھے دھمکی دو' نہ مجھے نصیحت کرو۔ میں نادان نہیں ہوں۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماروں گی۔ تم سب میرے مؤکل ہو۔ تم لوگوں سے مجھے لاکھوں اور کروڑوں کا منافع حاصل ہوتا ہے۔ میں صرف اس ہاتھ سے دینے اور اس ہاتھ سے لینے کا کھرا سودا کرنا جانتی ہوں' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

سونیا نے بڑے سے ریکارڈر کو آف کرتے ہوئے مجھ سے کہا "فرہاد! ابھی ماسٹر کی سے میری اتنی ہی گفتگو ہوئی تھی کہ کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر سے اشارہ موصول ہونے لگا۔ میں نے ماسٹر کی سے کہا' مجھے دوسری طرف سے اشارے مل رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر بعد رابطہ قائم کروں گی۔"

میں نے اس سے رابطہ ختم کیا اور مادام کمپیوٹر کو مخاطب کیا۔ وہ بڑے غصے میں تھی۔ کمپیوٹر کے اسکرین پر تحریر کی زبان سے کہہ رہی تھی "سونیا! تم شیطان کی بچی ہو' نہایت ذلیل اور ناقابلِ اعتماد ہو۔ میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم میرے ہی کاندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہی ہو۔ میرے ہی کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے میرے ہی مؤکلوں کو گمراہ کر رہی ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "اگر میں ایسا کر رہی ہوں تو مداخلت کیوں نہیں کر رہی ہو۔ ماسٹر کی سے یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس وقت کمپیوٹر کے ذریعے تم نہیں سونیا بول رہی ہے۔"

"میں تمھاری مکاری خوب سمجھتی ہوں۔ میں ماسٹر کی سے کہوں گی تو آئندہ وہ میرے کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر پر اعتماد نہیں کرے گا۔ میں جب بھی گفتگو کروں گی، وہ یہی سمجھے گا کہ سونیا دھوکا دے رہی ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "تم بڑی سمجھدار بچی ہو۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ میری ذہانت کی داد دو کہ میں نے تمھارے اس کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو ایک سے بارہ چینل تک تیار کرا لیا ہے۔ اب میں تمھارے تمام مؤکلوں سے رابطہ قائم کروں گی اور تم جھنجلاتی رہو گی۔ چپ چاپ تماشا دیکھتی رہو گی۔"

مادام کمپیوٹر جواباً کچھ نہ بول سکی۔ یقیناً جھنجلا رہی ہو گی۔ تلملا کر کوئی راستہ اختیار کرنے کے متعلق سوچ رہی ہو گی۔ میں نے کہا "مادام کمپیوٹر! تمھارے پاس یہی ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعے تم خاموش رہ کر اپنے مؤکلوں سے رابطہ قائم کر سکتی ہو۔ تمھیں کسی طرح کا اندیشہ نہیں ہے' فرہاد اور رسونتی تمھارے دماغ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اب تمھارے اس اہم ذریعے کو میں نے اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ تم براہِ راست کسی بھی مؤکل کے دماغ میں نہیں پہنچو گی۔ تمھارے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ کسی آلۂ کار کو اپنے لیے استعمال کرو اور اس کے ذریعے اپنے مؤکلوں سے رابطہ قائم کرو لیکن افسوس وہ آلۂ کار بھی چھپا نہیں رہ سکے گا۔ کم از کم فرہاد اور رسونتی سے تو کہیں بچ کر نہیں جا سکے گا۔ مختصر یہ کہ تمھارے پاس یہی ایک کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کا ذریعہ رہ گیا ہے۔ صبر کرو اور مجھے استعمال کرنے دو یا پھر چلو میرے ساتھ' اعلان کر دو کہ سونیا تمھاری جگہ بول رہی ہے۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو' میں ایسا نہیں کر سکوں گی کیونکہ مجھے اس کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو اپنا ذریعہ بنائے رکھنا ہے۔"

"تو پھر خاموشی سے تماشا دیکھتی رہو۔ میں تمھارے راستے میں نہیں آؤں گی' تم میرے راستے میں نہ آؤ' اس طرح ہماری دوستی قائم رہے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں' تمھارے تمام مؤکلوں کو تمھارے ہی لیے آمدنی کا ذریعہ بنائے رکھوں گی۔ مجھے ان سے کچھ نہیں لینا ہے۔ چند معلومات حاصل کرنا ہیں۔ اس کے بعد میں کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو استعمال نہیں کروں گی۔ ابھی جب تک استعمال کر رہی ہوں، تب تک تم اپنے موجودہ بدترین حالات پر غور کرتی رہو۔"

میں نے سونیا کو بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھا۔ جب گہری محبت اور عقیدت ہو تو انسان آنکھ سے نہیں دل سے دیکھتا ہے۔ سونیا نے بے شک و شبہ جو ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا تھا' اس کے لیے خراجِ تحسین پیش نہ کرنا زیادتی ہوتی۔ لہٰذا میں اسے خراجِ تحسین پیش کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "بظاہر سپر ماسٹر اور ماسک مین پسِ پردہ چلے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ تمھارے معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ہے۔ نہ وہ تمھارے راستے میں آئیں گے' نہ تمھیں ان کے راستے میں آنا چاہیے۔ اس سمجھوتے کے بعد وہ ماسٹر کی اور الباما ٹی ٹی سینٹر کے بریگیڈیئر جوناتھن کو استعمال کر رہے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ماسک مین پس پردہ چلا گیا ہے اور وہ لی ہاروی ٹی ٹی سینٹر کے سائمن دی گریٹ اور بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کے ایک گمنام سربراہ کو اپنے لیے استعمال کر رہا ہے۔ میں ان لوگوں سے یہی باتیں اگلوا رہی ہوں اور ریکارڈ کر رہی ہوں۔ اس طرح ہمیں بین الاقوامی سازشوں کا ثبوت بھی مل رہا ہے کہ وہ ہمارے پڑوسی ممالک میں کیا کارروائی کر رہے

ہیں اور آئندہ ان کے کیا نتائج سامنے آنے والے ہیں ۔"

وہ بڑے سے ریکارڈر کے پاس آئی اور کہا "چونکہ بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کے سربراہ کا نام ہمیں معلوم نہیں ہے۔ وہ اب تک راز میں ہے، اس لیے میں سائمن دی گریٹ کے پاس پہنچ گئی اور اس سے بھی اسی انداز میں گفتگو کی، جس انداز میں ماسٹر کی سے کر چکی تھی۔ لو سنو ۔"

اس نے ریکارڈر کو آن کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ریکارڈر سے سونیا اور سائمن دی گریٹ کی آواز ابھرنے لگی۔ سونیا اسی طرح مادام کمپیوٹر بن کر اسے کہہ رہی تھی کہ فرہاد ایک ہفتے بعد اسپتال سے ایک ایسی جگہ منتقل کیا جائے گا جس کے متعلق صرف وہی بتا سکتی ہے۔

سائمن دی گریٹ نے پوچھا "کیا تم مجھے بتا سکتی ہو؟ اگر تم کسی دہشت گرد تنظیم کے سربراہ کو فرہاد کے متعلق اطلاع نہ دو، صرف مجھے موقع دو کہ میں اسے اغوا کر لوں تو تمھیں منہ مانگی رقم دوں گا۔ تمھاری ہر شرط پوری کروں گا۔"

"میں ابھی نہیں بتا سکتی کیونکہ اسے پانچ دن کے بعد منتقل کیا جائے گا۔ ابھی وہ پلاننگ کر رہے ہیں۔ بہت محتاط رہ کر اسے وہاں سے منتقل کرنا چاہتے ہیں ۔"

"کیا وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ تم فرہاد کے کمزور دماغ میں رہ کر ان کی پلاننگ کو سمجھ سکتی ہو؟"

سونیا نے اسے بھی وہی بات سمجھائی جو ماسٹر کی کو سمجھا چکی تھی کہ کس طرح رسونتی نے تنویمی عمل کے ذریعے فرہاد کے دماغ کو لاک کیا ہے لیکن وہ رسونتی کے لب و لہجے کو اختیار کر کے اس کے دماغ میں چپکے سے پہنچ سکتی ہے اور اہم معلومات حاصل کر سکتی ہے۔

سائمن دی گریٹ نے کہا "مجھے یقین ہے، تم ایسا کر سکتی ہو اور صرف میرے لیے کر سکتی ہو لیکن بُرا نہ ماننا تم بہت لالچی ہو۔ ہر طرح سے اور ہر طرف سے منافع حاصل کرنا چاہتی ہو۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، اگر فرہاد کے سلسلے میں صرف میرے کام آؤ گی تو میں تمھاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں ۔"

سونیا نے کہا "سائمن دی گریٹ! میں ابھی حال ہی میں مادام کمپیوٹر کی حیثیت سے سامنے آئی ہوں۔ اس سے پہلے میں خاموش تھی اور چپ چاپ تمام سازشی ملکوں کے اندرونی راز معلوم کرتی رہی تھی۔ تم سب کے متعلق بھی بہت کچھ معلومات حاصل کیں۔ میں جانتی ہوں، سپر ماسٹر پس پردہ چلا گیا ہے اور ماسٹر کی اس کی جگہ کام کر رہا ہے۔ اسی طرح تمھاری لابی میں ماسک مین پس پردہ چلا گیا ہے اور تم بہرام علی ٹی ٹی سینٹر سے مل کر وہی کر رہے ہو جو اب تک ماسک مین کرتا رہا تھا۔ کیا یہ غلط ہے؟"

"تم موضوع سے ہٹ کر باتیں کر رہی ہو ۔"

"میں فرہاد کو تمھارے حوالے کرنے کے سلسلے میں جو شرط پیش کرنے والی ہوں، اس کا اس موضوع سے گہرا تعلق ہے ۔"

"اگر تعلق ہے تو میں تمھاری ہر بات کا جواب دوں گا لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم یہ باتیں ریکارڈ کر رہی ہو؟"

سونیا نے اسے بھی وہی بات سمجھائی کہ اگر ریکارڈ کرنا ہوتا تو وہ پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے سلسلے میں اب تک جو گفتگو ان سے کرتی آئی ہے اسے انھیں ریکارڈ کر لیتی اور انھیں بلیک میل کرتی لیکن وہ ایسا نہیں کر رہی ہے۔

بہر حال سائمن دی گریٹ کو یقین ہو گیا۔ اس نے کہا "ہاں مجھے یقین ہے، تم ایسا نہیں کرو گی اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم تو کسی وقت بھی ہمارے دماغوں میں پہنچ سکتی ہو۔ بہر حال میں تسلیم کرتا ہوں، ماسک مین پسِ پردہ جا چکا ہے۔ وہ تنظیم جو ریڈ پاور کے نام سے چل رہی تھی، اس کا نام ختم کر دیا گیا ہے۔ بہرام علی ٹی ٹی سینٹر سے کامیاب ہو کر نکلنے والے دہشت گرد بالکل اسی انداز میں کام کر رہے ہیں جس انداز میں ریڈ پاور تنظیم کے افراد کام کرتے تھے۔ ان کی رہنمائی میں کرتا ہوں اور . . ."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ سونیا نے پوچھا "رک کیوں گئے۔ کیا یہ نہیں بتانا چاہتے کہ بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کا سربراہ کون ہے؟"

"یہ پوچھ کر کیا کرو گی۔ تم اپنے کام سے کام رکھو ۔"

"میں آم کھاتی ہوں، پیڑ نہیں گنتی۔ مجھے اپنے منافع سے مطلب ہوتا ہے مگر میں اندھیرے میں رہنا نہیں چاہتی۔ اگر بتا سکتے ہو تو بتا دو ورنہ فرہاد کو تمھارے حوالے کرنے کے سلسلے میں کوئی خاص بات مجھے چھپانے کی ضرورت پیش آئی تو میں تمھیں بھی کچھ نہیں بتاؤں گی ۔"

اس نے جلدی سے کہا "ایسا ہرگز نہ کرنا۔ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں، بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کا سربراہ بھی ماسک مین ہے۔ وہ اپنے خاص ماتحتوں کو آلۂ کار بنا کر بھیجتا ہے۔ خود سامنے نہیں آتا اور نہ ہی آئندہ کبھی اپنا نام کسی سلسلے میں استعمال کرے گا لیکن میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ تم یہ باتیں کیوں چھیڑ رہی ہو اور اس سے تمھاری شرط کا کیا تعلق ہے ۔"

سونیا نے کہا "ماسک مین کے ملک سے ایک ایشیائی ملک کے گہرے تعلقات ہیں۔ اس کے باوجود ماسک مین کے

تخریب کار اور دوسرے سیاسی سازشیں کرنے والے اس ملک میں بھی اندرونی سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر کوئی مصلحت ہے تو کیا میں اس سلسلے میں تمھارے کام نہیں آسکتی؟"

"بے شک تم ہمارے کام آسکتی ہو اور بہت زیادہ کام آسکتی ہو لیکن ہمیں ڈر لگتا ہے، ہمارا راز کہیں دوسری جگہ نہ پہنچا دو۔"

"مجھے تم لوگوں نے آزما لیا ہے۔ میں ایک کی بات دوسرے تک کبھی نہیں پہنچاتی ۔"

"ہم مانتے ہیں ۔"

"اگر مانتے ہو تو بتا دو، آخر ماسک مین کا ملک اپنے بہترین حلیف ملک کے خلاف بھی کیوں اندرونی طور پر سازشیں کرتا ہے؟"

"بات اصل میں یہ ہے کہ پاکستان ایک درمیانی دیوار ہے۔ اپنے پڑوسی ملک کے لیے ایک مضبوط دیوار ہے۔ پاکستان جب تک قائم رہے گا کوئی سپر پاور اس راستے سے دوسرے ملک نہیں پہنچ سکے گی۔ گویا کہ پاکستان پڑوسی ملک کے لیے ایک بفر زون ہے ۔"

سونیا نے کہا "اگر یہ بفر زون ہے تو وہ پڑوسی ملک پاکستان پر بار بار حملے کی دھمکیاں کیوں دیتا ہے۔ پاکستان کے خلاف زیادہ سے زیادہ ہتھیار کیوں حاصل کیے جا رہے ہیں؟"

"پڑوسی ملک کی پالیسی یہ ہے کہ پاکستان پر حملہ ضرور کرو لیکن اسے مٹنے نہ دو صرف کمزور بنا دو۔ اس پر اپنی برتری ثابت کر دو۔ دوسری طرف ماسک مین کے ملک کے حکمران کی پالیسی یہ ہے کہ پڑوسی ملک کو زیادہ سے زیادہ ہتھیار دو۔ جب کوئی چیز بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اسے ہضم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ زیادہ کھانے والا قے کرنے لگتا ہے۔ پڑوسی ملک کے پاس زیادہ ہتھیار ہوں گے تو وہ پھولتا رہے گا اور کہیں نہ کہیں حملہ کرنے کے لیے مچلتا رہے گا۔ ایک دن وہ ایک دم سے بدہضمی کا شکار ہو کر پاکستان پر چڑھ دوڑے گا اور ماسک مین کی حکومت یہی چاہتی ہے ۔"

میں نے ریکارڈر کو آف کرتے ہوئے پوچھا "کیا جو ٹیپ ریل آمنہ کے ساتھ گیا ہے، اس میں یہی سب کچھ ہے؟"

"ہاں، اصل ٹیپ میں نے چیف کے حوالے کر دی ہے۔ اس کی ایک نقل آمنہ لے گئی ہے، دوسری نقل یہ ہے جو تم سن رہے ہو۔ اس ریل میں تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کے ایسے بیانات ہیں جن کے ذریعے ان کی بین الاقوامی سازشوں کا پول کھلتا ہے۔ اس کے بعد سائمن دی گریٹ نے یہ حقیقت بھی اُگل دی ہے کہ آئندہ شاہِ ایران کا تختہ کس طرح الٹنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں ۔"

میں نے کہا "میں ہمیشہ سیاست سے کتراتا رہا ہوں لیکن اس ٹیپ ریل کے ذریعے ہمارے دشمنوں کی کمزوریاں ہاتھ آگئی ہیں، میری دلچسپی صرف اس حد تک ہے کہ میرے وطن کو یہ لوگ سیاسی سازشوں میں ملوّث کر رہے ہیں۔ اگر وہ شاہِ ایران کا تختہ الٹنے کی سازشیں کر رہے ہیں تو ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن یہ وہاں کے عوام کے مفاد میں ہے۔ وہاں شہنشاہیت کا خاتمہ ہونا ہی چاہیے ۔"

سونیا نے جس طرح اہم راز اگلوائے تھے اور انھیں ریکارڈ کیا تھا اس سلسلے میں ایک وضاحت کر دوں۔ وہ یہ کہ مادام کمپیوٹر جب رابطہ قائم کرتی ہے تو ہماری آواز اس کے پاس پہنچتی ہے لیکن اس کی آواز ہمارے پاس نہیں آتی۔ وہ تحریر کی صورت میں جواب دیتی ہے۔ سونیا نے جتنی ریکارڈنگ کی تھی، اس میں ماسٹر کی، سائمن دی گریٹ اور بریگیڈیئر جوناتھن وغیرہ کی آوازیں ریکارڈ ہوئی تھیں لیکن جتنی باتیں سونیا نے اپنی طرف سے کہی تھیں، وہ کمپیوٹر کی اسکرین پر تحریر کی صورت میں ان کے سامنے پہنچی تھیں یعنی اس ٹیپ میں جتنے دہشت گرد تنظیم کے سربراہوں کی آوازیں ریکارڈ ہوئی تھیں۔ وہ صرف بولتے رہے تھے اور جب کمپیوٹر کی اسکرین پر تحریری جواب پڑھتے تھے تو اس وقت تک ٹیپ خاموشی سے چلتا رہتا تھا۔ جب وہ پھر بولنے لگتے تھے تو پتا چلتا تھا کہ مادام کمپیوٹر کی کن باتوں کے جواب میں بولتے جا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے جو ٹیپ ریکارڈ کیا گیا تھا، وہ ہر اعتبار سے مکمل تھا۔

سونیا نے کہا "بہت دیر ہو چکی ہے، ذرا آمنہ کی خبر لو۔"

میں نے خیال خوانی کی پرواز کی اور آمنہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ طیارے میں سوار ہو گئی تھی۔ میں نے ہولے سے رسونتی کو مخاطب کیا "کیا تم موجود ہو؟"

رسونتی نے کہا "بے فکر رہو۔ میں آمنہ کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہوں گی ۔"

"کیا تم نے کوئی ایسی بات محسوس کی جیسے آمنہ اپنے مزاج کے خلاف یا اپنے حالات کے خلاف سوچ رہی ہو؟"

"نہیں، میں نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی ہے۔ اگر مجھے شبہ ہوا کہ مادام کمپیوٹر آمنہ کی سوچ میں اسے بہکا رہی ہے یا کوئی چال چلنا چاہتی ہے تو میں فوراً تمھیں اطلاع دوں گی ۔"

"ہاں، محتاط رہنے کی بہت ضرورت ہے۔ میں پھر آؤں گا ۔"

میں نے سونیا کے پاس آکر اسے آمنہ اور رسونتی کے متعلق بتایا۔ اسی وقت کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کے ذریعے اشارہ موصول

ہونے لگا۔ چینل نمبر ایک کا اشارہ تھا۔ یعنی مادام کمپیوٹر سونیا سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ سونیا نے فوراً ہی بڑے سے ریکارڈر کو آن کر دیا۔ پھر کہا "فرہاد! ذرا دیکھتے رہو' میں اسے کیسا چکر دیتی ہوں"
اس نے کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کو آپریٹ کیا۔ پھر کہا "ہیلو' میں سونیا بول رہی ہوں"

جواب میں اسکرین خاموش رہا۔ پھر چند لمحوں کے بعد تحریر ابھرنے لگی۔ مادام کمپیوٹر پوچھ رہی تھی "کیا تم نے تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کی گفتگو ریکارڈ کی ہے؟"

"میں نے اسی لیے ریکارڈر آن رکھا ہے تاکہ تم بھی سن لو"

"میں نے تو سن لیا' تم بھی سن لو۔ آئندہ میں کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کو استعمال نہیں کروں گی۔ نہ ہی کسی مؤکل سے رابطہ قائم کروں گی۔ میں کچھ دنوں کے لیے خاموشی اختیار کر رہی ہوں۔ جیسا کہ پہلے خاموش رہ کر تماشا دیکھتی رہی تھی اور معلومات حاصل کرتی رہی تھی لیکن آئندہ خاموشی کے دوران تم خاص طور پر میری ٹارگٹ رہو گی۔ آج سے تمہارا ہر قدم موت کی طرف اٹھے گا تم سوچ بھی نہیں سکو گی کہ کون سا لمحہ تمہاری زندگی کا آخری لمحہ ہو سکتا ہے"

"مجھے تو سوچنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ہے میری بہنا' تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو"

"زیادہ چہکنے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تمہارا راستہ کاٹ دیا ہے۔ آئندہ تم کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کے ذریعے کسی بھی سربراہ سے بات کرنا چاہو گی تو وہ گھاس نہیں ڈالے گا۔ میں سب کو اطلاع دینے جا رہی ہوں کہ ان کے ساتھ بہت ہی بڑا فراڈ ہوا ہے"

"فوراً اطلاع دو لیکن اب فوراً جیسا لفظ نامناسب ہے۔ تمہیں دیر ہو چکی ہے۔ مجھے جو کرنا تھا وہ کر چکی ہوں"

"اور اب مجھے جو کرنا ہے' وہ کرنے جا رہی ہوں۔ جب ٹی ڈی سینٹر والوں کو پتا چلے گا کہ تم نے فراڈ کیا ہے تو وہ تمہیں فرار کا راستہ نہیں دیں گے۔ اتنا تو سب جانتے ہیں کہ ابھی تم ساہیوال میں ہو۔ تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گی"

"صرف میری بات نہ کرو۔ میں تو یہ ٹیپ بھی لے کر اپنے ساتھ نکلوں گی جو دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کے خلاف ایک بہت اہم ثبوت ہے۔ جاؤ اور اب ٹی ڈی سینٹر والوں کے ساتھ سر کھپاؤ"

اس نے میٹر کو آف کر دیا۔ اسکرین بجھ گیا۔ پھر اس نے کہا "وہ ضرور تمام سربراہوں کے پاس پہنچ کر انھیں میرے خلاف بھڑکائے گی۔ میں ذرا ہلکا سا میک اپ کر کے اپنا چہرہ تبدیل کرنے جا رہی ہوں۔ تم اسے آپریٹ کرو۔ ایک ایک چینل کو آزماؤ کسی نہ کسی چینل پر اس سے بات کرنے والے کی آواز سنائی دے گی"

میں نے کہا "یوں تو میں خیال خوانی کے ذریعے ہر ایک کے دماغ میں پہنچ سکتا ہوں۔ صرف ماسٹر کی کے پاس نہیں جا سکتا۔ ایک طرف یہ' دوسری طرف مادام کمپیوٹر دونوں ہی میری خیال خوانی کے ٹارگٹ سے باہر ہیں"

میں نے اس کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کے مختلف چینل کو آزمانا شروع کیا۔ ایک چینل پر ماسٹر کی کی آواز سنائی دی۔ وہ مادام کمپیوٹر سے کہہ رہا تھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم میرے پاس اس کمپیوٹر کے ذریعے نہیں آئی تھیں؟ تم نے مجھ سے آدھے گھنٹے تک گفتگو کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ فرہاد جب اسپتال سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا' تم مجھے اطلاع دو گی اور ان کی پلاننگ کے متعلق تفصیلات بتاؤ گی"

وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ رہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مادام کمپیوٹر کا جواب پڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے حیرانی سے کہا "میں یقین نہیں کر سکتا۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو کیا تمہاری جگہ سونیا باتیں کر رہی تھی۔ اوہ گاڈ' یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ خاموش ہو کر اس کا جواب سننے لگا۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی ہو گی۔ جو کچھ بھی کہہ رہی ہو گی' وہ اسکرین پر الفاظ کی صورت میں ابھر رہا ہو گا۔ میں نے اپنے کمپیوٹر کو دیکھا۔ اس کا اسکرین تاریک تھا۔

بہرحال یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مادام کمپیوٹر نے جواباً اسے کیا کہا ہے۔ اس کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی تھی۔ میرے کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کا اسپیکر خاموش تھا۔ میں نے خیال خوانی کی پرواز کی اور سائمن دی گریٹ کے پاس پہنچ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ ماسٹر کی کے بعد وہ سائمن دی گریٹ کے پاس پہنچی تھی۔ کیونکہ دہشت گرد تنظیموں میں ان دو سربراہوں کی زیادہ اہمیت تھی۔ اس وقت سائمن دی گریٹ بھی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا "میں کیسے یقین کروں کہ اب تک سونیا نے مجھ سے بات کی ہے' مجھ سے فراڈ کیا ہے۔ تم اس وقت تک کیا کر رہی تھیں۔ کیا تم ہمیں اس فراڈ کی اطلاع فوراً نہیں دے سکتی تھیں؟"

"اگر میں موجود ہوتی اور مجھے معلوم ہوتا تو کیا میں اب تک خاموش رہتی۔ میں دوسری جگہ مصروف تھی۔ جیسے ہی مجھے اس فراڈ کا علم ہوا' میں اطلاع دینے آئی ہوں۔ آئندہ اس کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کو استعمال نہ کرنا۔ تم نے سونیا سے بین الاقوامی سازشوں کے متعلق باتیں کی ہیں اور ان سازشوں میں خود کو فخریہ انداز میں ملوث کیا ہے۔ اس چڑیل نے وہ تمام باتیں ریکارڈ کر لی ہیں اور وہ ریکارڈ کیا ہوا ٹیپ ابھی اس کے پاس موجود ہے۔ ابھی وہ ایک چھوٹے سے ٹاؤن ساہیوال میں ہے۔ اسے گھیرنا چاہتے ہو' اپنے خلاف ثبوت مٹانا چاہتے ہو تو وہ ٹیپ حاصل کر لو۔ ورنہ سائمن دی گریٹ کی گریٹنس ہمیشہ کے لیے خاک میں مل جائے گی"

مادام کمپیوٹر تحریر کی زبان سے جو کچھ کہہ رہی تھی' اسے میں سائمن دی گریٹ کے دماغ میں رہ کر معلوم کر رہا تھا۔ اس نے کہا "مادام کمپیوٹر! جو ہوا بہت برا ہوا۔ مجھے فوراً بتاؤ' سونیا تنہا ہے یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہے' فرہاد کی پوزیشن بھی واضح کرو"

میں نے اس کے دماغ سے پھر مادام کمپیوٹر کا جواب سنا۔ وہ کہہ رہی تھی "سونیا کے متعلق میں کہہ نہیں سکتی کہ وہ تنہا ہے یا کچھ لوگوں کے ساتھ ہے۔ کیونکہ اس کا دماغ لاک ہے۔ میرا رابطہ صرف کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کے ذریعے ہوتا ہے"

"فرہاد کے متعلق بتاؤ۔ اس کا دماغ کمزور ہے۔ تم معلوم کر سکتی ہو"

"سونیا نے میری جگہ آ کر تم لوگوں کو مس گائیڈ کیا ہے۔ اس نے غلط کہا کہ وہ اسپتال میں بیمار ہے اور ایک ہفتے بعد وہاں سے منتقل کیا جائے گا۔ حقیقتاً وہ دماغی توانائی حاصل کر چکا ہے اور اب میں اس کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتی"

"اوہ گاڈ' ہر طرف سے مایوسی ہو رہی ہے۔ پلیز مادام کمپیوٹر' دس منٹ کے بعد پھر مجھ سے رابطہ قائم کرو۔ میں سونیا کو گھیرنے کے انتظامات کر رہا ہوں"

اس نے کمپیوٹر کم ٹرانسیسٹر کو آف کر دیا پھر دوسرے ٹرانسیسٹر وغیرہ کو آپریٹ کرنے لگا۔ چونکہ وہ ایک بہت بڑے ملک کے لیے کام کر رہا تھا' ماسک مین اس کی پشت پر تھا اس لیے مواصلاتی سیارے کے ذریعے مطلوبہ تخریب کاروں سے رابطہ قائم کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے اپنے لوگوں کو بتایا کہ وہ لاہور' ملتان اور فیصل آباد میں جہاں کہیں بھی ہیں' ساہیوال سے قریب تر ہوں گے لہٰذا وہ سونیا کو وہاں سے نکلنے کا موقع نہ دیں۔ وہ یقیناً میک اپ میں ہو گی۔ لہٰذا اس کے قد' اس کی جسامت' اس کی چال اور انداز پر توجہ دی جائے۔ ایسی کوئی بھی عورت نظر آئے تو اسے اغوا کر لو۔ پوری طرح اطمینان کرو کہ وہ میک اپ میں ہے یا نہیں؟ اس کی تلاشی ضرور لو۔ وہ سونیا ہو گی تو اس کے پاس سے ایک ٹیپ برآمد ہو گا۔ اسے اپنے قبضے میں لے لینا۔ بلکہ اسے فوراً ہی ضائع کر دینا۔ اپنے ہاتھوں سے اس ٹیپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اسے جلا ڈالنا۔

میں الیاس ٹی ڈی سینٹر کے بریگیڈیئر جوناتھن کے پاس پہنچ گیا۔ اس دوران مادام کمپیوٹر وہاں پہنچی ہوئی تھی اور اسے بھی سمجھا رہی تھی کہ وہ سب کس طرح بین الاقوامی سازشوں میں ملوث ہونے کے مجرم قرار پائیں گے کیونکہ سونیا نے ان کی تمام گفتگو ریکارڈ کر لی ہے۔

اِدھر سے بریگیڈیئر جوناتھن نے بھی اپنے وسیع ذرائع اختیار کرنے شروع کر دیے۔ وہ بھی سونیا کو گھیرنے کے لیے اپنے تخریب کاروں' قاتلوں اور بدمعاشوں کو ساہیوال کی طرف بڑھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ انھیں ہدایات دے رہا تھا کہ کس طرح سونیا کو پہچاننا چاہیے اور کس طرح اس سے ٹیپ حاصل کرنا چاہیے۔

میں نے دوسرے کمرے میں آ کر سونیا کو دیکھا۔ وہ میک اپ کر چکی تھی۔ اس نے شوخ رنگ کی شلوار کرتا پہن رکھا تھا۔ بالکل پنجاب کی دیہاتی دوشیزہ لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں موٹا سا کاجل لگایا ہوا تھا۔ لبوں پر گہری سرخی تھی۔ چہرے پر ایسا میک اپ کیا تھا جیسے میک اپ کرنے کا شوق تو ہو مگر سلیقہ نہ ہو۔ میں نے کہا "تم تو سچ مچ پنڈ دی کڑی لگ رہی ہو۔ یہ میک اپ اور یہ انداز کیسے سیکھ لیا۔ تم پنجاب کے متعلق زیادہ معلومات نہیں رکھتی ہو"

"میں نہیں رکھتی ہوں لیکن میرے ساتھ جو گبرو جوان بن کر رہنے والا ہے' وہ تو جانتا ہے۔ اسی نے یہ میک اپ کیا ہے"

"کیا مطلب' کیا میرے علاوہ بھی کوئی ہے"

"تمہارے علاوہ دنیا میں بہت ہیں۔ میں جسے چاہوں' اپنا ہمسفر بنا سکتی ہوں' تم خوش فہمی میں رہنا چھوڑ دو"

"یہ تیور کیوں بدل رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ ہمسفر بدل رہا ہے"

اسی وقت کمرے میں ایک چھ فٹ کا جوان داخل ہوا۔ اس کے سر پر دیہاتی انداز میں پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ لانبا سا ریشمی رنگین کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ دھوتی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں بڑی سی لاٹھی پکڑے ہوئے تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لاٹھی کو فرش پر زوردار آواز میں ٹیکتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے مجھ سے کہا "پائی جی' السلام علیکم' ساڈا میک اپ اور گیٹ اپ دیکھو اور چھیتی پاس کرو"

میں نے اس کے دماغ میں چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے میری سوچ کی لہریں واپس آ گئیں۔ اس نے مسکرا کر کہا "سر! معذرت چاہتا ہوں۔ اتنا بتا دوں کہ پاکستان میں بھی یوگا کے ماہر ہیں۔ خاص طور پر سیکرٹ سروس میں۔ مادام سونیا نے اسی لیے میرا انتخاب کیا ہے کہ مادام کمپیوٹر میرے دماغ تک نہ پہنچ سکے"

میں نے سونیا سے کہا "مجھے تمہارا یہ طریقۂ کار پسند نہیں آیا۔ فرض کرو، دشمن تمھیں کہیں راستے میں روکتے ہیں۔ تم دونوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں۔ یقیناً وہ دھوکا کھائیں گے لیکن ان میں سے کسی کے دماغ میں مادام کمپیوٹر موجود رہے گی تو وہ ان کے ذریعے تم میں سے کسی ایک کے دماغ میں پہنچنے کی کوشش کرے گی اور اس کی سوچ کی لہریں اسی طرح واپس ہو جائیں گے۔ تب کیا اسے شبہ نہیں ہوگا کہ تم سونیا ہو اور جس مرد کے دماغ سے اس کی سوچ کی لہریں واپس آئی ہیں، وہ فرہاد ہو سکتا ہے اور جب فرہاد ہو سکتا ہے تو پھر میں تمھارے ساتھ کیوں نہیں چل سکتا۔ آخر تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟"

وہ میرے پاس آکر بولی "تمھارے کچھ زخم بھر چکے ہیں اور کچھ علاج اور توجہ چاہتے ہیں۔ تم بظاہر صحت مند ہو لیکن ان حالات میں دشمنوں سے ٹکرانا مناسب نہیں ہے۔ میں تمھاری ہی حفاظت کے لیے تم سے الگ ہو رہی ہوں۔"

"یہ ہو نہیں سکتا کہ تم خطرات میں گھر جاؤ اور میں تم سے دور ہو جاؤں۔"

وہ میرے پاس سے پلٹ کر آئینے کے پاس گئی۔ پھر اپنے میک اپ اور گیٹ اپ کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "جب میں وادیٔ قاف سے روانہ ہوئی تو یہاں آتے آتے جو پلاننگ کی، اس پر عمل کر رہی ہوں۔ میرا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دشمنوں کی ساری توجہ تمھاری طرف ہے۔ وہ تمھیں ٹارگٹ بنائے ہوئے ہیں۔ میں ایسی چال چلوں گی کہ ان کی توجہ تمھاری طرف سے ہٹ جائے گی اور سب مجھے ٹارگٹ بنا لیں گے۔ اب دیکھو کہ میں نے کس طرح انھیں اپنی طرف لگا لیا ہے۔"

سونیا اب تک جو چالیں چلتی رہی ہے، انھیں میں دیکھتا اور سمجھتا آ رہا ہوں لیکن مقصد اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ واقعی ماسٹر کی میرا جانی دشمن تھا۔ وہ مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دینا چاہتا تھا اور اپنی قید میں مجھے لمبی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہی ماسٹر کی میری طرف سے دھیان ہٹا کر سونیا کی طرف متوجہ ہو چکا ہو گا۔

دہشت گرد تنظیموں کے دوسرے سربراہ سائمن دی گریٹ، بریگیڈیر جوناتھن اور بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کا وہ سربراہ جو اب تک گمنام اور پُراسرار تھا، اب ہمیں اس کی حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ وہ ماسک مین ہی تھا۔ یہ سب کے سب میری طرف سے توجہ ہٹا کر سونیا کے پیچھے پڑ چکے تھے۔

اور تو اور مادام کمپیوٹر جو مجھے بے نقاب کر چکی تھی اور مجھ سے مفادات حاصل کرنا چاہتی تھی، وہ بھی سونیا کو چیلنج کر رہی تھی۔ میں حیران حیران نظروں سے سونیا کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ہزار بار دیکھ چکا تھا۔ ہزار دن، ہزار راتیں اس کے قرب میں گزار چکا تھا۔ لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور وہ ہر بار ایک نئی حیثیت سے سامنے آتی ہے اور ناقابلِ فہم بن جاتی ہے۔

میں نے کہا "فی الحال تم مجھ سے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہو۔ واقعی تمام دشمن تمھارے ہی پیچھے دوڑیں گے لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی "پسند ہو یا نہ ہو، میں اپنے طور پر کام کر رہی ہوں۔ میرا فرض ہے تمھاری حفاظت کرنا اور میں کر رہی ہوں، جو ہو چکا ہے تم اسے بدل نہیں سکتے۔"

"یہ بات تم فرہاد سے کہہ رہی ہو۔ میں بازی پلٹنا بھی جانتا ہوں۔ تم یہاں سے اپنے نئے ہمسفر کے ساتھ جاؤ مگر میں بہت جلد تمام لوگوں کو اپنے پیچھے دوڑانا شروع کر دوں گا۔"

سونیا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر کہا "فرہاد! میری محبت اور میرے فرض کو سمجھو۔ میں تمھیں دشمنوں سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ ہمیں اندازہ کرنا چاہیے کہ دشمن یہ ٹیپ مجھ سے چھیننے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے آزمائیں گے۔ وہ ناقابلِ شکست فائٹروں کو ہمارے پیچھے لگائیں گے۔ وہ چالباز اور بہروپیے لوگوں کو بھی آلۂ کار بنا کر بھیجیں گے۔ تم ہر ایک سے نمٹ سکتے ہو لیکن مقابلے کا وقت آئے تو ابھی تم اس قابل نہیں ہو۔"

"میں ہوں یا نہیں، یہ میں جانتا ہوں۔"

"ضد نہ کرو۔ اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی۔ دشمنوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تو پھر....."

وہ بات ادھوری چھوڑ کر میرے قریب آئی۔ اپنی دونوں ہتھیلیوں سے میرے چہرے کو تھام لیا۔ پھر بڑی محبت سے بولی "پلیز، میری بات مان لو، ضد نہ کرو، صرف ایک ہفتے تک آرام کرو۔ اعلیٰ بی بی تمھاری نگرانی کرے گی، تمھارے ساتھ رہے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں، ایک ہفتے بعد تم سے آکر ملوں گی۔"

"مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ تم کہاں ہو۔ کن حالات سے گزر رہی ہو، تمھارا دماغ لاک کر دیا گیا ہے۔ تم سوچ کی لہروں کو قبول نہیں کرو گی۔"

"میرے ساتھ میرے یہ ہمسفر مسٹر رضا علی ہیں۔ یہ تمھیں اپنے دماغ میں آنے کا موقع دیتے رہیں گے۔ تم ان کے ذریعے ہمارے حالات معلوم کرتے رہو گے۔"

"خدانخواستہ رضا علی کو کچھ ہو جائے یا تم دونوں کا ساتھ

چھوٹ جائے اور رضا علی ایک طرف بھٹک جائے تم دوسری طرف نکل جاؤ تب میں تم سے کس طرح رابطہ قائم رکھوں گا؟"

سونیا نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک لاکٹ کو نکالا۔ وہ ایک چین سے منسلک تھا۔ وہ گلے میں پہنے ہوئے تھی۔ پھر اس نے کہا "ایسا ہی ایک لاکٹ اعلیٰ بی بی کے گلے میں ہے۔ وہ سیاہ موتیوں کی مالا پہنے رہتی ہے۔ اسی مالا میں ایک لاکٹ ہے۔ یہ ٹرانسمیٹر ہے۔ اس کے ذریعے اعلیٰ بی بی مجھ سے رابطہ قائم کر سکتی ہے۔ تم اس کے ذریعے میرے حالات معلوم کر سکتے ہو۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اچھی بات ہے، تم جاؤ، میں کسی نہ کسی طرح تم سے رابطہ قائم کرتا رہوں گا۔"

وہ بڑے سے ریکارڈر کے پاس آئی۔ اس میں سے ٹیپ کو نکالا پھر اپنے کپڑوں کی ایک گٹھری میں اسے چھپا دیا۔ اس گٹھری کو رضا علی کے حوالے کرتے ہوئے کہا "تم باہر چلو، میں آ رہی ہوں۔"

وہ باہر گیا۔ یہ محبت سے رخصت ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ "میں نے تمھیں کھو کر پایا ہے، پھر کھو رہا ہوں، پھر پا لوں گا۔ اب جاؤ۔"

وہ مجھے دیکھتے ہوئے، اُلٹے قدموں چلتے ہوئے دروازے سے باہر گئی۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرا ضمیر یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو عورت مجھے اتنی شدت سے، اتنی دیوانگی سے چاہتی ہے اور میری حفاظت کے لیے طوفانوں کا رخ میری طرف سے اپنی طرف موڑ لیتی ہے، میں اسے تنہا دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ دوں۔ میں نے بظاہر اس کی بات مان لی تھی مگر سوچ رکھا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟

سب سے پہلے میں نے اعلیٰ بی بی سے رابطہ قائم کیا، اس سے کہا "میں اسپتال سے جس مکان میں بھیجا گیا ہوں، تم وہاں پہنچ جاؤ، جن لوگوں نے مجھے یہاں پہنچایا ہے، وہ تمھیں بھی پہنچا دیں گے۔"

"لیکن دشمنوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا ہے کہ تم اسپتال میں ہو اور میں تمھاری نگرانی کر رہی ہوں۔ اگر میں یہاں سے نکلوں گی تو تمام دشمن سمجھ لیں گے کہ اسپتال میں تم نہیں ہو۔"

"دشمنوں کو سمجھنے دو، میرے پاس چلی آؤ۔"

"میں آ رہی ہوں۔ اس دوران مجھے بتاتے رہو، کیا ہو رہا ہے اور ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"میں بتا رہا ہوں مگر جو لوگ تمھیں یہاں لائیں گے ان سے کہو، ایک برقعے کا انتظام کریں۔"

"وہ کیوں؟"

"میں تمھیں بتاؤں گا۔ پہلے سونیا کے متعلق سنو۔ اس نے کیسی چالیں چلی ہیں اور وہ کمبخت سارے دشمنوں کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے ہے۔ اس نے ہماری طرف سے ان کا دھیان ہٹا دیا ہے۔"

میں نے تفصیل سے بتایا کہ سونیا ان پانچ دنوں میں کیا کرتی رہی ہے اور کتنی کامیاب چالیں چلتی رہی ہے۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ دشمن فی الحال مجھے بھول جائیں اور اپنی بقا کے لیے اور اپنی نیک نامی کو قائم رکھنے کے لیے وہ ٹیپ حاصل کرنے کی خاطر اس کے پیچھے دوڑتے رہیں۔ اس کا مقصد ہے، میں آرام کرتا رہوں، علاج کراتا رہوں، صحت مند ہوتا رہوں اور وہ خطرات میں گھری رہے، مجھے زندگی ملتی رہے اور وہ موت کا سامنا کرتی رہے لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہم دونوں دشمنوں کو اپنے پیچھے لگائیں گے۔ اگر تم نے بھی مجھے آرام کرنے، علاج کرتے رہنے اور کہیں چھپ کر رہنے کا مشورہ دیا تو میں تمھارا ساتھ بھی چھوڑ دوں گا۔"

"میں ایسا کوئی مشورہ نہیں دوں گی کہ تم میرا ساتھ چھوڑ سکو۔ میں آ رہی ہوں۔"

اس وقت تک وہ ایک گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اور میری طرف آ رہی تھی۔ میں نے خیال خوانی کی پرواز کی اور سائمن دی گریٹ کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ صرف وہی نہیں بلکہ دہشت گرد تنظیموں کے تمام سربراہ پریشان تھے۔ یہ بھید کھلنے والا تھا کہ سائمن دی گریٹ، ماسٹر کی، بریگیڈیر جوناتھن اور بہرام علی ٹی ٹی سینٹر والے سپر ماسٹر اور ماسک مین کے لیے کام کر رہے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر مختلف ممالک کے خلاف مختلف طریقوں سے سازشیں کرتے جا رہے ہیں۔

اس وقت سائمن دی گریٹ کے سامنے پاکستان کا نقشہ بچھا ہوا تھا اور وہ پنجاب کے علاقے میں ساہیوال پر ایک گول دائرہ لگا رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ میں کہا "ساہیوال ایک چھوٹا سا ٹاؤن ہے۔ یہاں میک اپ کی سہولتیں شاید میسر نہ ہوں۔ مجھے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ سونیا میک اپ نہ کر سکے تو کس طرح چھپ سکتی ہے۔"

وہ میری سوچ کے مطابق سوچنے لگا پھر اسے خیال آیا "ہاں، مسلمانوں میں پردے کا رواج ہے۔ ان کی عورتیں برقع پہنتی ہیں۔ یقیناً وہ برقعے میں چھپ کر جائے گی۔"

میں یہی چاہتا تھا کہ سائمن دی گریٹ برقعے کے متعلق

سوچے۔ میں نے اس کی توجہ پھر نقشے کی طرف دلائی۔ پھر اسے سوچنے پر مجبور کیا۔ "ساہیوال سے کتنے راستے مختلف سمت جاتے ہیں۔ ایک لاہور کی طرف دوسرا ملتان کی طرف۔ اس نقشے میں تمام راستوں کی تفصیل نہیں ہے۔ پاکستان میں ہمارے جو لوگ موجود ہیں، ان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے لیکن سونیا کی مکاری کے پیش نظر یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ لاہور کی طرف نہیں جائے گی۔ یا تو اسلام آباد پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گی یا واپس ملتان کا رخ کرے گی۔ وہ چڑیل ہمیشہ الٹے راستے اختیار کرتی ہے۔ ہمیں ہر طرف جال بچھانا چاہیے۔"

میں اسے جو کچھ سوچنے کی طرف مائل کر رہا تھا اور جو کچھ وہ سوچ رہا تھا، میں وہی کرنے والا تھا یعنی اعلیٰ بی بی کو برقع پہنا کر کسی دوسرے راستے سے اسلام آباد پہنچانا چاہتا تھا۔

میں نے اسی قسم کے خیالات بریگیڈیئر جوناتھن کے دماغ میں پیدا کیے۔ بہرام علی ٹی ٹی سینٹر کے سربراہ ماسک مین تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسی طرح ماسٹر کی تک میری رسائی نہیں تھی لیکن اس کے دستِ راست جیکی وائز تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے جیکی وائز کے دماغ میں بالکل اسی طرح کے خیالات پیدا کیے تاکہ وہ اپنے باس ماسٹر کی سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کر سکے۔

ہم سمجھ رہے تھے کہ بین الاقوامی سازشوں کا پول کھولنے اور ان سازشوں کے پیچھے رہنے والوں کو بے نقاب کرنے کے بعد وہ تمام دشمن ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے لیکن بات اس سے بھی آگے بڑھ گئی جب اعلیٰ بی بی میرے پاس پہنچی تو اس کے ساتھ آنے والے سیکرٹ سروس کے ایک شخص نے کہا۔ "جناب! ٹرانسمیٹر پر آپ کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔"

میں نے اس سے ٹرانسمیٹر لے کر کہا۔ "میں فرہاد علی تیمور بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے چیف نے کہا۔ "فرہاد! ہم زبردست سیاسی پیچیدگیوں میں الجھنے والے ہیں۔ خصوصاً سپر ماسٹر اور ماسک مین کے ممالک نے کھلی دھمکی دی ہے اور کہا ہے اگر اس ٹیپ کو فوراً ان کے حوالے نہ کیا گیا تو ہمیشہ کے لیے ان سے تعلقات بگڑ جائیں گے۔ ان کی دشمنی ہمیں بڑی مہنگی پڑے گی۔ دوسری طرف یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر ہم نے وہ ٹیپ انھیں اسی طرح واپس کر دیا اور اس کی تشہیر نہ کی تو ہمیں بڑی سے بڑی امداد فراہم کی جائے گی۔ ماسک مین کے ملک نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمارے ہاں فولاد کا کارخانہ قائم کرے گا۔ سپر ماسٹر کے ملک نے وعدہ کیا ہے کہ ورلڈ بینک سے ہمیں بھاری قرضہ دلائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کیا کہتے ہیں؟"

"ہم ایک ترقی پذیر ملک کے باشندے ہیں اور بڑی پابندیوں میں رہ کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ سونیا نے یہاں آتے ہی جو کارنامہ انجام دیا ہے، اس کے پیش نظر میں سمجھ گیا تھا کہ سپر پاورز کی طرف سے ہم پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ اسی لیے میں نے سونیا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ٹیپ کی ایک کاپی وادیٔ قاف بھیج دے۔ اگر ہم پر دباؤ ڈالا گیا اور ہم جھکنے پر مجبور ہوئے تو وقتی طور پر سمجھوتہ کر لیں گے۔ وہ ٹیپ واپس کر دیں گے۔ انھوں نے اپنے وعدے پورے کیے، ہمارے ساتھ دوستانہ رویّہ رکھا تو اچھی بات ہے۔ اگر کسی بھی سیاسی مرحلے پر ہم سے دھوکا کیا تو ان کے خلاف ایک ثبوت وادیٔ قاف میں موجود رہے گا۔ ہم بعد میں ان سے نمٹ لیں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم لوگوں پر زبردست آفت آنے والی ہے۔ یہ بڑی طاقتیں تمھیں پاکستان میں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گی۔ ان کا بھید کھل رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے، تم سونیا اور اعلیٰ بی بی کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے پاکستان سے باہر چلے جاؤ۔ ایسا مشورہ دیتے ہوئے میرا دل دُکھ رہا ہے لیکن مجھے یہ سوچ کر اطمینان ہوتا ہے کہ تم جسمانی طور پر یہاں سے جاؤ گے مگر دماغی طور پر ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔"

میں نے اعلیٰ بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلا کر اشارے میں کہنے لگی۔ "ہاں، ہم یہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

میں نے ٹرانسمیٹر پر کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر آپ یہی مناسب سمجھ رہے ہیں تو ہمیں جانا ہی ہوگا۔"

"میں تمھاری روانگی کے انتظامات ابھی کرتا ہوں۔"

اعلیٰ بی بی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کہا۔ "دوسرے چینل پر گفتگو کرو۔"

میں نے ٹرانسمیٹر پر یہی بات کہی اور اسے آف کر دیا۔ پھر خیال خوانی کے ذریعے اعلیٰ بی بی سے پوچھا۔ "تم نے چینل بدلنے کے لیے کیوں کہا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہم فوراً ہی یہ ملک نہیں چھوڑیں گے لیکن یہی خبر عام ہوگی کہ پاکستانی حکومت نے ہمیں آج ہی یہاں سے نکال دیا ہے۔"

میں نے خیال خوانی کی پرواز کی اور چیف کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں سعید احمد صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔ "چیف! آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر لیکن میں خوش نہیں ہوں۔"

"فرہاد! تم ہمیں کس قدر عزیز ہو، اس کا اندازہ تم ہمارے دل اور دماغ میں پہنچ کر کر سکتے ہو۔ فی الحال اس بات کو یوں لو کہ اپنے ہی گھر سے بعض حالات میں نکلنا پڑتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں۔ دنیا گول ہے، جانے والا لوٹ کر ضرور آتا ہے۔"

میں نے سعید احمد صاحب سے کہا۔ "آپ کو تو یاد ہوگا، یہ پہلی بار ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ میں دوسری بار اپنے ملک سے نکالا جا رہا ہوں۔"

میری گفتگو کے دوران اُدھر اعلیٰ بی بی نے اپنے لاکٹ ٹرانسمیٹر کے ذریعے سونیا سے رابطہ قائم کیا۔ سونیا نے کہا۔ "میں بہت مصروف ہوں۔ ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے چاروں طرف سے گھری جا رہی ہوں۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا۔ "فوراً بتاؤ تم کہاں ہو؟"

"ہم ہائی وے پر ساہیوال سے پچاس میل کے فاصلے پر ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آ رہی ہوں۔"

میں سعید احمد صاحب اور چیف سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خیال خوانی کرتے رہنا۔ فوراً یہاں سے چلو، سونیا خطرے میں ہے۔"

ہم سیکرٹ سروس کے دو افراد کے ساتھ باہر آئے۔ وہاں گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اعلیٰ بی بی نے کہا۔ "فوراً ہائی وے پر نکلو۔ پچاس میل تک جتنی تیز رفتاری سے چل سکتے ہو، اسے ڈرائیو کرتے رہو۔"

ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں اگلی سیٹ پر آ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے سونیا کے ہمسفر رضا علی کے دماغ پر دستک دی۔ اس نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں فرہاد علی تیمور۔"

"میں کیسے یقین کروں۔ تم مادام کمپیوٹر بھی ہو سکتی ہو۔"

"محتاط رہنا اچھی بات ہے لیکن مادام کمپیوٹر نے تمھاری آواز ابھی تک کہیں نہیں سنی ہے۔ لہٰذا وہ تمھارے پاس نہیں آ سکتی۔"

"اچھی بات ہے فرہاد صاحب، فرمائیے۔"

"مجھے اپنے دماغ میں رہنے دو۔ میں تمھارے ذریعے وہاں کے حالات معلوم کرتا رہوں گا۔"

وہ اور سونیا بس میں سفر کر رہے تھے۔ دیہاتیوں کے حلیے میں تھے۔ کار وغیرہ میں سفر کرتے تو دشمن فوراً ہی تاڑ لیتے، یوں بھی بس میں مسافروں کے ساتھ سفر کرتے رہنے میں زیادہ تحفظ حاصل ہوتا رہتا اور وہ مشکل سے پہچانے جاتے۔

لیکن دشمن بھی مشکلات سے گزرنا جانتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "آخر دشمنوں کو شبہ کس طرح ہوا؟"

رضا علی نے کہا۔ "وہ ہماری توقع سے بہت زیادہ تیز نکلے۔ ساہیوال کے ہر اس مقام تک پہنچے ہوئے تھے جہاں سے ہم نکل کر جا سکتے تھے۔ ہمیں لاری اڈّے میں بہت سی کاریں اور ویگنیں نظر آئیں۔ عام دنوں میں ایسی فاضل گاڑیاں نظر نہیں آتی ہیں۔ ان میں جو لوگ تھے، وہ یہاں کے ماحول سے اور یہاں کے لوگوں سے مختلف تھے۔ وہ سب لاریوں کے پاس جا کر مسافروں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے اور مادام سونیا کو بھی دیکھ کر ایک شخص ہمارے پاس آیا۔ پھر اس نے سو کا ایک نوٹ نکال کر پوچھا۔ "بھائی، آپ کے پاس کھلّا ہوگا؟"

میں نے خالص پنجابی زبان میں جواب دیا۔ "میرے پاس سو کا کھلّا نہیں ہے۔"

اس نے مادام سونیا پر ایک نظر ڈالی۔ پھر چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں ہی ایک عورت آئی۔ اس نے مادام سونیا سے پنجابی زبان میں پوچھا۔ "یہ لاری کس وقت یہاں سے جائے گی؟"

میں نے جواب دیا۔ "ابھی پندرہ منٹ کے بعد روانہ ہوگی۔"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا پھر کہا۔ "جب ایک عورت دوسری عورت سے بات کرتی ہو تو مردوں کو بیچ میں نہیں بولنا چاہیے۔ کیوں بہن، میں ٹھیک کہتی ہوں، نا؟"

سونیا نے گونگی بن کر اشارے میں کہا کہ وہ بول نہیں سکتی۔"

رضا علی کی باتیں سن کر میں نے کہا۔ "ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اس نے پنجابی عورتوں کا سا لباس پہنا ہے، ویسا ہی حلیہ بنا لیا ہے لیکن یہ پنجابی زبان نہیں جانتی ہے۔ مجھے اس وقت یاد ہوتا تو اسے ٹوک دیتا۔"

"مادام سونیا کو اور مجھ کو یہ باتیں معلوم تھیں اور ہم نے سوچ رکھا تھا کہ راستے میں یہ گونگی بنی رہیں گی۔"

"یہی تو ہوتا ہے۔ ہم سب خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنے اپنے طور پر بہت سی چالیں چلتے ہیں لیکن کسی ایک پہلو کو یہ سوچ کر نظرانداز کر دیتے ہیں کہ کوئی اس پر توجہ نہیں دے گا۔"

رضا علی نے کہا۔ "وہ عورت چلی گئی۔ اس کے دو منٹ کے بعد ہی دو عورتیں ایک شخص کے ساتھ آئیں۔ انھوں نے کہا۔ "بہن! ہمارے ساتھ گاڑی میں چلو۔ ہم فوراً ہی لاہور پہنچا دیں گے۔"

"میں نے انکار کیا۔ سونیا نے بھی اشارے سے کہا۔

وہ میرے ساتھ جائے گی اور لاری میں جائے گی۔"
ان باتوں کے دوران ان کی نظریں اس گٹھری پر تھیں جسے سونیا نے بغل میں داب رکھا تھا۔ وہ لاری اڈے کے ہجوم میں ہم سے چھیڑ چھاڑ نہیں کر سکتے تھے اسی لیے چلے گئے۔ ہم اس لاری میں بیٹھ کر سفر کرتے رہے کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بس ایک جگہ رکی۔ وہاں کچھ مسافر اتر گئے اور کچھ سوار ہوئے ایک مسافر ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنے ایک ساتھی مسافر سے کہنے لگا "یار! اگر تمھیں یہ معلوم ہو جائے کہ تمھارے بس سے اترنے پر تمام بس کے مسافروں کی جان بچ سکتی ہے تو تم کیا کرو گے؟"
اس کے ساتھی نے جواب دیا "میں تمام مسافروں کی جان بچانے کے لیے بس سے اتر جاؤں گا۔ خواہ مجھے کتنے ہی خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔"
پھر پہلے مسافر نے پوچھا "اگر اس بات کی ضمانت دی جائے کہ تمھیں کسی قسم کا خطرہ درپیش نہیں ہو گا، تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ صرف معاملات طے ہوں گے تو ایسی صورت میں کیا کرو گے؟"
"یہ تو اور اچھی بات ہے۔ مسافروں کی جان بھی بچ جائے گی اور میں بس سے اترنے کے بعد تنہا ہونے کے باوجود محفوظ رہوں گا۔"
"تو پھر اچھی طرح سن لو میرے دوست۔ ہم ساہیوال سے بیس میل تک چلے آئے ہیں۔ آگے تیس میل تک میں تمھیں موقع دے رہا ہوں۔ دانشمندی کا ثبوت دو اور اتر جاؤ تمھیں لاہور تک پہنچانے کے لیے گاڑیوں کی کمی نہیں ہو گی۔"
اس کے بعد وہ مسافر خاموش ہو گئے تھے۔ آگے ایک اسٹاپ پر وہ دونوں اتر گئے۔ بس پھر آگے بڑھ گئی۔ میں نے مادام سونیا سے پوچھا "کیا ارادہ ہے؟"
مادام نے جواب دیا "جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اب تو دشمنوں سے سامنا کرنا ہی پڑے گا۔"
میں نے کہا "مادام ایک تدبیر ہے۔ آپ نے اپنی گٹھڑی میں ایک برقع بھی رکھا ہوا ہے۔ یہ کام آ سکتا ہے۔ آپ چادر اتار کر برقع پہن لیں۔ آگے اسٹاپ پر جب مسافر اترنے لگیں تو عورتوں کے ساتھ آپ بھی اتر جائیں۔"
رضا علی! تم یہ بھول رہے ہو کہ وہ دو مسافر جو ابھی باتیں کر رہے تھے اور بالواسطہ ہمیں دھمکی دے کر چلے گئے ہیں تو ان کے بعد بھی یہاں کچھ لوگ ہوں گے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم پر شبہ ہو اور وہ تنہا ہمیں اس بس میں سفر کرنے کے لیے چھوڑ دیں۔ میں برقع پہنوں گی تو ان کی نظروں میں آ جاؤں گی۔"
میں رضا علی کے دماغ میں رہ کر یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ ہماری گاڑی آندھی طوفان کی رفتار سے بھاگ جا رہی تھی۔ ان کی بس ایک جگہ رُکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے دماغ سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہائی وے تو نہیں ہے۔"
جی ہاں' انھوں نے ہمیں پورے پچاس میل تک جانے کا بھی موقع نہیں دیا۔ اس سے پہلے ہی اچانک بس کے دونوں دروازوں پر دو شخص اسٹین گنیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ تیسرا ونڈ اسکرین کے پاس ڈیش بورڈ پر بیٹھ گیا۔ اسٹین گن کا رخ ڈرائیور کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ اگر اپنی اور مسافروں کی خیریت چاہتے ہو تو آگے جا کر راستہ بدل دینا۔ آگے دائیں طرف ایک کچّا راستہ آنے والا ہے۔"
میں نے رضا علی سے کہا "اس راستے کی نشاندہی کرو۔"
آپ ہائی وے پر آئیں گے تو ساہیوال سے تقریباً پینتالیس میل دور دائیں طرف سرخ اینٹوں کا بھٹا نظر آئے گا۔ اینٹوں کے بھٹے کے پاس سے ایک کچّا راستہ گزرتا ہے۔ آپ دائیں طرف خیال رکھیں۔"
میں نے یہی بات اپنی گاڑی ڈرائیو کرنے والے شخص کو بتا دی پھر رضا علی سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی بس کچے راستے پر تقریباً چار پانچ میل اندر جانے کے بعد رک گئی تھی۔ جب پہلی بار انھوں نے اسٹین گن کے ذریعے بس کو اغوا کرنا چاہا تو کتنی عورتوں کی چیخیں نکل گئی تھیں' بچے رونے لگے تھے' انھوں نے ڈانٹ کر کہا تھا "اگر کوئی شور نہیں مچائے گا تو اسے نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ہمیں صرف دو مسافروں کی ضرورت ہے ہم ہائی وے پر انھیں گرفتار نہیں کر سکتے لہٰذا کچّے راستے پر لے جا رہے ہیں۔"
بس ڈرائیور نے کہا "وہ دو مسافر کون ہیں' ہمیں دکھاؤ۔ ہم انھیں بس سے اتار دیں گے۔"
"صرف اتار دینے سے کام نہیں بنے گا۔ وہ اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئیں گے۔ ان مسافروں میں جو ایک عورت ہے، وہ ہمیشہ گیلے صابن کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتی ہے۔ ہم ہائی وے پر اسے پھسلنے کا موقع نہیں دینا چاہتے۔"
بہر حال وہ بس ایک جگہ رک گئی تھی۔ اب ایک اسٹین گن کا رخ سونیا کی طرف تھا اور اسٹین گن والا کہہ رہا تھا "چپ چاپ وہ ٹیپ ہمارے حوالے کر دو اور اس کے بعد ہمارے ساتھ چلو۔"
رضا علی سونیا کے ساتھ اٹھنے لگا۔ اسٹین گن والے نے سونیا کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا "نہیں' ابھی اپنی جگہ بیٹھی رہو۔ پہلے ہمارا مطالبہ پورا کرو۔ وہ ٹیپ ہمارے حوالے کرو۔

اس کے بعد ہم تمھیں بڑی عزّت سے لے جائیں گے۔"
میں نے رضا علی کے ذریعے بس کے باہر دیکھا۔ اب کچّے راستے پر دوسری سمت سے بھی دو گاڑیاں آ رہی تھیں۔ وہ گاڑیاں کچھ فاصلے پر رک گئی تھیں اور ان میں سے نکلتے ہوئے لوگ تیزی سے دوڑتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی اسٹین گنیں تھیں۔ پھر ایک جھاڑی کے پیچھے سے آواز آئی "سونیا کا راستہ روکنے والو! تمھارا شکریہ۔ ہم بھی طلبگاروں میں سے ہیں۔ ہمارا پہلا مطالبہ ٹیپ، دوسرا مطالبہ سونیا۔ یہ مطالبات پورے کیے بغیر تم نہ تو ٹیپ لے جا سکتے ہو نہ سونیا کو . . ."
میں نے بولنے والے کے دماغ میں چھلانگ لگائی' پتا چلا۔ ان کا تعلق لی ہاروی ٹی ٹی سینٹر سے ہے یعنی وہ سائمن دی گریٹ کے آدمی ہیں۔ جن افراد نے اسٹین گن کے ذریعے بس کو اغوا کیا تھا' ان کا تعلق ماسٹر کی سے تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے سیکرٹ سروس کے ایجنٹ سے کہا۔ "فوراً ٹرانسمیٹر کے ذریعے متعلقہ افسران سے رابطہ قائم کرو۔ ہمیں ابھی ایک ہیلی کاپٹر کی ضرورت ہے۔ ہم سونیا کو ان کے نرغے سے نکالنے کے لیے اسے استعمال کریں گے۔ اس کے لیے مضبوط رسّے کی بھی ضرورت ہے۔"
پھر میں نے ڈرائیور سے پوچھا "اب ہم اس مقام سے کتنی دور ہیں۔"
"ہم تقریباً اٹھائیس میل کے فاصلے پر ہیں۔"
"اور دس میل جانے کے بعد گاڑی روک دینا۔"
دوسرا سیکرٹ ایجنٹ ٹرانسمیٹر کے ذریعے ہیلی کاپٹر کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا "ان سے کہہ دو، پندرہ بیس منٹ کے بعد اس جگہ کی نشاندہی کی جائے گی جہاں ہیلی کاپٹر کو اتارنا چاہیے۔"
میں پھر بس میں پہنچ گیا۔ اب وہاں پہنچنے کے لیے ضروری نہیں تھا کہ رضا علی کے دماغ میں پہنچتا۔ اب تو اسٹین گن والا بھی ٹیلی پیتھی کی مٹھی میں تھا اور وہ جھاڑیوں میں چھپنے والے سائمن دی گریٹ کے لوگ بھی میری دسترس سے دور نہیں تھے لیکن سوچ سمجھ کر ٹیلی پیتھی کو استعمال کرنا تھا۔ اگر میں ایک طرف دشمنوں کو ٹریپ کرتا تو دوسری طرف سے سونیا پر فائرنگ ہو سکتی تھی یا کسی اور طرح اسے نقصان پہنچ سکتا تھا۔
میں نے رسونتی کو مخاطب کیا "فوراً چلی آؤ اور میرے دماغ میں رہ کر دشمنوں کے دماغوں تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"
وہ آمنہ کی نگرانی پر مامور تھی۔ میرے کہنے پر چلی آئی۔ اس وقت تک بس میں رہنے والا ماسٹر کی سنڈیکیٹ کا ایک فرد کہہ رہا تھا "تم لوگ یہ نہ سوچو کہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر مجبور کر دو گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ یا ہمارے سامنے ہتھیار ڈال دو۔ ہم جان پر کھیل کر ٹیپ اور سونیا کو لے جائیں گے۔"
سونیا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "میری ہمسفر بہنو اور بھائیو! میرے پاس ایک ایسا راز ہے جو ان دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا تو ہمارے ملک کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور اگر یہ ہمارے ملک میں رہا تو دشمنوں کی سازشوں کا پول کھلتا رہے گا۔ یہ مجھ سے زبردستی وہی راز چھین کر لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں نے سنا ہے کہ یہ مجھ سے ٹیپ کا مطالبہ کر رہا ہے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے تو نہ سہی مگر حوصلے سے کام لیں۔"
اس کے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے اسٹین گن کو اچھالتے ہوئے ڈپٹ کر کہا "خاموش رہو۔"
وہ اسٹین گن کے دستے کو سونیا کے منہ پر مارنا چاہتا تھا مگر اس کے ہاتھ اٹھے رہ گئے۔ میں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ فوراً ہی سونیا کے پاس سے پلٹ کر دروازے کی طرف اپنے ساتھی کے سامنے پہنچا۔ پھر اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا "یہ ہتھیار نیچے پھینک دو۔"
اس کے ساتھی نے پوچھا "کیا تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"
واقعی دماغ خراب ہو چکا تھا۔ اس نے تڑا تڑ گولیاں چلائیں۔ مسافر عورتوں کی چیخیں نکلنے لگیں' بچے رونے لگے۔ دوسرا اسٹین گن والا ساتھی ان کی طرف دوڑتا آ رہا تھا۔ رسونتی نے اسے قابو میں کر لیا۔ وہ بس کی سیٹوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ جب سونیا کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "مادام سونیا! یہ لیجیے۔ اسٹین گن آپ ہی کے ہاتھوں میں اچھی لگتی ہے۔"
ایک تو ہلاک ہو چکا تھا۔ جس نے ہلاک کیا تھا' وہ بھی سونیا کے پاس آیا۔ اس نے رضا علی کی طرف اسٹین گن بڑھاتے ہوئے کہا "میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ یہ آپ ہی لوگوں کو مبارک ہو۔"
جس وقت اسٹین گن سے فائرنگ ہوئی تھی، اس کے جواب میں درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے سے بھی بس کی طرف فائرنگ ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ماسٹر کی کے آدمی دھمکی دینے کے لیے فائرنگ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بھی جواباً دھمکی آمیز فائرنگ کی۔ اسی لیے بس کو نقصان نہیں پہنچا۔

بس کے اندر وہ دونوں دشمن نہتے ہوگئے تھے۔ایک میرے قبضے میں تھا دوسرا سونتی کے۔ہم ان دونوں کو باہر لے آئے۔پھر کھلی فضا میں پہنچ کر ایک کے ذریعے کہا:"ہم کسی دھمکی میں آنے والے نہیں ہیں۔ہماری جوانمردی دیکھو، ہم اسٹین گن چھوڑ آئے ہیں۔مرد ہو تو اپنے ہتھیار پھینک دو اور ہم سے مقابلہ کرو۔"

ایک درخت کے پیچھے سے کہا گیا:"ہمیں اتنا نادان نہ سمجھو۔تم دونوں کے علاوہ بس میں اور بھی مسلح ساتھی ہیں۔"

ادھر سونیا نے ایک اسٹین گن اٹھا کر مسافروں سے کہا "ایسا کون میرا بھائی ہے جو اسٹین گن چلانا اور جان کی بازی لگانا جانتا ہو۔"

بس کے اندر کئی گبرو جوان کھڑے ہوگئے۔صرف جوان ہی نہیں، بوڑھے بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے تھے۔چار عورتوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا:"جو مرد لڑ نہیں سکتے، وہ ہمارے بچوں کو سنبھالیں۔ہم مقابلہ کر کے دکھائیں گی۔"

سونیا نے کہا:"بس میرا حوصلہ بڑھ گیا۔اب میں دشمنوں کو بھاگنے پر مجبور کر دوں گی۔"

"ادھر بس سے نکلنے کے بعد جو دشمن کھلی فضا میں پہنچ گئے تھے، انھوں نے پھر للکارا۔ایک جھاڑیوں کی طرف دوڑتا گیا۔دوسرے گھنے درختوں کی طرف۔ان کے مخالفین نے سوچا، یہ کوئی چال چلی جا رہی ہے۔لہٰذا انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔جس کے نتیجے میں وہ دونوں زمین پر ڈھیر ہوگئے۔فائرنگ کی آواز چند لمحوں تک گونجتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔اس خاموشی میں بہت سی گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔وہ بس سے کچھ فاصلے پر رک گئی تھیں۔ان میں سے کئی مسلح افراد نکلتے ہوئے دور دور درختوں اور جھاڑیوں کے پاس جانے لگے۔سائمن دی گریٹ کے ایک آدمی نے چیخ کر کوڈ ورڈز کا تبادلہ کرنا چاہا لیکن جواب نہیں ملا جس کا مطلب یہ تھا کہ آنے والے مخالفین میں سے تھے اور ان کا تعلق ماسٹر کی اور بریگیڈیئر جوناتھن کے سینٹر سے تھا۔

آنے والوں میں سے ایک نے کہا:"ہم دیکھ چکے ہیں، ہمارے دو آدمی مارے جا چکے ہیں۔اب اس کے بدلے اپنے دس آدمیوں کی لاشیں اٹھا کر لے جانے کے لیے تیار رہو۔"

سونیا نے بس کے اندر سے چیختے ہوئے کہا:"میں مانتی ہوں کہ ابھی دو طرفہ دشمنوں میں گھری ہوئی ہوں لیکن تم سب اپنی عقل پر زور دو اور سوچو، کس کا محاذ مضبوط ہے؟ میں سب سے مضبوط ہوں حالانکہ تمھارے درمیان گھری ہوئی ہوں۔ تم میں سے کوئی مجھے یا اس بس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔اگر پہنچانا چاہے تو یہ سوچ لے کہ میرے ساتھ وہ ٹیپ ضائع ہو جائے گی پھر اس بات کا ثبوت نہیں ملے گا کہ جو ٹیپ ضائع ہو چکی ہے وہ اصلی تھی یا نقلی یا سرے سے ٹیپ تھی ہی نہیں۔"

وہ بس کی ایک کھڑکی کے قریب ذرا سا سر اٹھا کر کہہ رہی تھی۔ 'لہٰذا میری طرف گولی چلانے یا بس کو تباہ کرنے سے پہلے تصدیق کر لینا دانشمندی ہوگی۔"

دوسری طرف سے ایک شخص نے چیخ کر کہا:"ہمارا ایک آدمی نہتا آئے گا۔اس کے پاس صرف ٹیپ ریکارڈر ہوگا۔تم اسے ٹیپ دو گی۔وہ تمھارے سامنے اسے آن کر کے سنے گا۔جب تصدیق ہو جائے گی تو وہ اسے لے آئے گا۔اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو ہم تمھیں یہاں سے نکلنے کا موقع نہ دیں گے۔ضد کرو گی تو پچھتاؤ گی، جان سے بھی جاؤ گی۔"

اس کا جواب سونیا کو نہیں دینا پڑا۔ان کے مخالفین میں سے ایک نے بلند آواز سے کہا:"کیوں احمقوں کی طرح دھمکی دے رہے ہو۔سونیا کوئی نادان بچی نہیں ہے کہ جان کے خوف سے تمھارے پاس چلی آئے گی۔ویسے وہ ہمارے پاس آئے گی ہم وارننگ دیتے ہیں، تمھارا کوئی آدمی ٹیپ ریکارڈر لے کر بس کی طرف نہیں جائے گا۔اُدھر بڑھے گا تو پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

ماسٹر کی کے ایک آدمی نے کہا:"اگر ہم آپس میں اسی طرح الجھتے رہے تو نہ سونیا ہاتھ آئے گی نہ وہ ٹیپ۔لہٰذا ہمیں عقل سے کام لینا چاہیے۔پہلے وہ چیز اپنے قبضے میں لی جائے جو ہمارے لیے سب سے اہم ہے۔"

کہنے والے نے جھاڑی کے پیچھے سے اٹھ کر دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا:"میں عارضی طور پر دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔پہلے ہم وہ چیز حاصل کریں گے پھر آپس میں نمٹ لیں گے لیکن سونیا سے نمٹنے کے لیے ہمارے درمیان اتحاد ضروری ہے۔میں دوستی کی پیشکش کرتا ہوں۔"

بھلا میں کب گوارا کرتا کہ ان میں دوستی ہو۔میں نے سائمن دی گریٹ کے ایک آدمی کے ذریعے نشانہ لیا۔جو شخص جھاڑی کے پیچھے سے اٹھ کر دوستی کی پیشکش کر رہا تھا، وہ ایک ہی گولی میں ٹھاہ ہوگیا۔

اس ردِ عمل سے ثابت ہوگیا کہ ان کے درمیان دوستی نہیں ہوسکتی۔انھوں نے جواباً فائرنگ کی۔پھر تو آپس ہی میں فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔اب پوزیشن یہ تھی کہ درمیان میں بس تھی۔بس کے اندر مسافر سیٹوں کے درمیان دبکے ہوئے تھے۔اس

کے ایک طرف بہت دور سائمن دی گریٹ کے آدمیوں نے محاذ بنایا ہوا تھا۔بس کے پچھلے حصّے کی طرف کافی فاصلے پر کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ان کے پیچھے اور جھاڑیوں اور درختوں کے پیچھے ماسٹر کی کے آدمیوں نے محاذ بنا رکھا تھا۔دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں لیکن اس طرح کہ کوئی گولی سونیا کی طرف نہ جائے، اسے زندہ رکھنا لازمی تھا۔

دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ پہلے ٹیپ لے کر تصدیق کی جائے کہ اس میں ان کے سربراہوں کی گفتگو اور سازشوں کا تذکرہ ہے یا نہیں۔اگر نہ ہو تو سونیا کو ضرور اغوا کیا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے فرہاد اور اس کی ٹیم کے لوگوں کو بلیک میل کر سکیں اور اس کے ذریعے وہ ٹیپ حاصل کر سکیں۔

میں گاڑی میں گم صم بیٹھا خیال خوانی میں مصروف تھا۔ادھر ٹرانسمیٹر کے ذریعے یقین دلایا گیا تھا کہ ہیلی کاپٹر جلد ہی پہنچنے والا ہے۔جس مقام پر سونیا کو نرغے میں لیا گیا تھا، وہاں سے تقریباً اٹھارہ میل دور ہم گاڑی روکے ہیلی کاپٹر کا انتظار کر رہے تھے۔اس کے پائلٹ کو بتا دیا گیا تھا کہ اسے کس مقام پر ہیلی کاپٹر کو اتارنا ہے۔

میں پھر بس کے اندر پہنچ گیا۔دونوں طرف سے فائرنگ جاری تھی۔اب ماسٹر کی سنڈیکیٹ کے آدمیوں نے اپنا محاذ ان گاڑیوں کے پیچھے بنا لیا تھا جن میں وہ بیٹھ کر آئے تھے اور اب وہ اسے آہستہ آہستہ دھکا دیتے ہوئے بس کے قریب جا رہے تھے۔جوابی فائرنگ بھی کرتے جا رہے تھے تاکہ سائمن دی گریٹ کے لوگ اپنی جگہ رُکے رہیں، پیش قدمی نہ کر سکیں۔

ویسے اب دشمنوں کی تعداد کم رہ گئی تھی۔سائمن دی گریٹ کے کافی آدمی مارے گئے تھے۔ان میں سے صرف چھ رہ گئے تھے۔دوسری طرف ماسٹر کی سنڈیکیٹ کے پانچ آدمی تھے۔ان میں سے ایک ٹرانسمیٹر آن کرنے کے بعد کسی سے پوچھ رہا تھا:"آخر دیر کیوں ہو رہی ہے۔جان لوفر کو فوراً بھیجو۔وہی سچویشن کو قابو میں لا سکتا ہے اور سونیا کو یہاں سے لے جا سکتا ہے۔"

جان لوفر کون تھا؟

میں جس کے دماغ میں تھا، اس کی سوچ بتانے لگی، جان لوفر دراصل کم بکر یزی کا قائم مقام تھا۔ماسٹر کی کے پچیس شاگردوں میں سے تھا۔کریزی ختم ہو چکا تھا۔اب دوسرا آ رہا تھا۔وہ یوگا کا ماہر کتنی دیر تک سانس روکتا تھا، یہ صرف ماسٹر کی جانتا تھا۔ویسے وہ کم کریزی سے کہیں زیادہ تیز طرار اور ذہین تھا۔بڑے بڑے خطرناک فائٹروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔اس وقت وہ لباس کے اندر بلٹ پروف پہن کر آ رہا تھا۔وہ بلٹ پروف سر پر ٹوپی کی صورت میں گردن سے ہوتا ہوا اس کے گلے تک آتا تھا۔وہاں سے پھر پورے جسم کو ڈھانپتا ہوا پاؤں میں جرابوں کی طرح جوتوں میں چھپ جاتا تھا یعنی صرف چہرے کا اگلا حصّہ کھلا رہتا تھا اور کلائی سے لے کر دونوں ہتھیلیاں بلٹ پروف کے بغیر رہتی تھیں تاکہ وہ اپنے ہاتھوں کو اور انگلیوں کو حرکت دے سکے چونکہ سپر ماسٹر سونیا کی ایک چال کے باعث بے نقاب ہونے والا تھا۔اس لیے ماسٹر کی نے اپنے یوگا کے ماہروں میں سے سب سے بہترین فائٹر اور یوگا کے ماہر کو ٹیپ کے حصول کے لیے بھیجا تھا۔ویسے ماسک مین نے بھی سائمن دی گریٹ کے ذریعے بڑے ہی چیدہ چیدہ فائٹروں، مکّار اور ذہین قسم کے لوگوں کو سونیا کے پیچھے لگا دیا تھا۔میں نے رضا علی کے پاس پہنچ کر اسے جان لوفر کے بارے میں بتایا تاکہ وہ سونیا کو اس کے متعلق باخبر رکھے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ان کے درمیان تقریباً آدھے گھنٹے تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا۔اب دونوں طرف سے لوگ محتاط تھے کیونکہ کارتوس ختم ہو رہے تھے۔اسی وقت کچے راستے پر ایک بڑی سی ویگن آتی ہوئی نظر آئی۔ماسٹر کی سنڈیکیٹ کے ایک شخص نے کہا:"آ گیا، جان لوفر آ گیا۔"

وہ ویگن ان کے قریب آ کر رک گئی تھی۔ایک شخص دوڑتا ہوا گیا پھر ویگن کے پچھلے حصّے کا دروازہ کھولنے لگا۔دروازہ کھولتے ہی ایک قدآور شخص نظر آیا۔ڈیل ڈول کے لحاظ سے پہاڑ لگتا تھا۔جب وہ گاڑی سے نیچے اترا اور سیدھا تن کر کھڑا ہوا تو ایک اونچی چٹان نظر آیا۔اس کا قد ساڑھے چھ فٹ تھا۔جس شخص نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا، اس پر اچانک ہی فائرنگ ہوئی۔وہ چیختا ہوا وہیں زمین پر گر گیا اور تڑپنے لگا۔فائرنگ کرنے والے بھلا جان لوفر کو کیوں چھوڑتے۔انھوں نے اسے بھی نشانہ بنایا۔اسٹین گن سے تڑ تڑا تڑ کی آوازیں گونج رہی تھیں اور گولیاں چل رہی تھیں — جان لوفر گہری سنجیدگی اور ناگواری سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔گولیاں اس کے سینے اور اس کے جسم پر لگ رہی تھیں مگر بے اثر ہو رہی تھیں پھر وہ بس کے پاس آ کر ایک کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔اس نے کھڑکی کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔"بے بی سونیا! آ جاؤ، اچھی بچیاں ضد نہیں کرتیں۔"

سونیا نے کہا:"اچھے بچے بلٹ پروف پہن کر بزرگوں

کی طرح باتیں نہیں کرتے ۔"

اس نے گٹھری میں ہاتھ ڈال کر ایک سیاہ رنگ کی ٹوپی نکالی پھر اسے سر پر پہننے لگی۔ وہ ٹوپی اس کی گردن تک آتی تھی اور آدھے چہرے کو ڈھانپ لیتی تھی۔

جان لوفر نے کہا "اچھا تو تم بھی بلٹ پروف میں ہو۔"

"ہم ہتھیار سے کھیلنے کے عادی نہیں ہیں مگر ہتھیار سے بچنے کا سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے ۔"

اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر آگیا تھا۔ ہماری گاڑی کے چاروں طرف گردش کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ اترنے لگا۔ میں اپنی گاڑی سے نکل کر سیکرٹ سروس کے ایجنٹ کے ساتھ دوڑتا ہوا اُدھر جانے لگا۔ اعلیٰ بی بی ہمارے پیچھے آرہی تھی دوڑتے رہنے کے دوران میں نے رضا علی سے کہا "سونیا سے کہو وہ جان لوفر کو جھانسا دیتے ہوئے کسی کھلی جگہ چلی جائے ۔"

اس نے سونیا کے کان میں چپکے سے کہہ دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی اسٹین گن سنبھالتے ہوئے اس نے کھڑکی کی طرف فائرنگ کی۔ جان لوفر کے چہرے کا سامنے والا حصہ کھلا ہوا تھا۔ بلٹ پروف کے بغیر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، چہرے پر آسانی سے گولی ماری جاسکتی ہے لیکن اسٹین گن سنبھالتے ہی جان لوفر نے چہرے کو بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ فائرنگ ہوئی مگر بے اثر ہوئی پھر جیسے ہی فائرنگ بند ہوئی، جان لوفر نے بجلی کی تیزی سے اس اسٹین گن کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا۔ رضا علی اس کی طرف کھنچتا ہوا گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ جان لوفر نے کراٹے کا ایک ہاتھ اس کے سر پر رسید کیا تھا۔ یوں تو رضا علی بہترین فائٹر تھا لیکن جان لوفر کی قوت کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا بس اتنا ہی اندازہ ہوسکا کہ رضا علی جیسا سخت جان چکرا کر دو سیٹوں کے درمیان گر پڑا تھا۔

سونیا باہر جانے لگی۔ ایک جوان نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا "بہن جی! آپ نہ جائیں۔ میں جاؤں گا۔"

سونیا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم دیکھ چکے ہو، اس پر گولیاں اثر نہیں کریں، اس کی طاقت کا اندازہ ہو چکا ہے اب بس کا ایک مسافر بھی باہر نہیں جائے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں، تم میں سے کسی پر آنچ نہیں آئے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلی آئی۔ جان لوفر بس کے دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آنے لگا۔ وہ دوڑتے ہوئے اس طرف جانے لگی جہاں کھلا میدان تھا۔ جان لوفر نے اس طرف دوڑتے ہوئے کہا "آخر کہاں تک بھاگو گی۔ تم نے میری تیز رفتاری نہیں دیکھی۔ میں پلک جھپکتے ہی تمھیں دبوچ لوں گا۔"

سونیا نے دوڑتے رہنے کے دوران گٹھری میں ہاتھ ڈال کر ٹیپ کو نکال لیا تھا۔ اسے ایک ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے ہلاتی جارہی تھی، جیسے چارہ ڈالتی جارہی ہو۔ ٹیپ کو دیکھتے ہی جان لوفر نے تیزی سے دوڑ لگائی۔ واقعی وہ ہرفن مولا تھا۔ اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا جس کی توقع ہم نہیں کرسکتے تھے۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا، سونیا نے اس ریل کو پوری قوت سے کھلے میدان کی طرف پھینک دیا۔ پھر کہا "مجھے پکڑنا چاہتے ہو یا اس ریل کو؟"

اس نے عزا کر سونیا کو دیکھا۔ وہ بالکل قریب تھی، اسے کسی وقت بھی دبوچ سکتا تھا لیکن سب سے زیادہ اہمیت ٹیپ کی تھی۔ وہ اُدھر دوڑتا چلا گیا۔

اِدھر ہم ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئے تھے۔ وہاں پچھلی سیٹوں پر مسلح جوان بیٹھے ہوئے تھے ساعلیٰ بی بی ان کے درمیان بیٹھ گئی، میں پائلٹ کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے سامنے رسّیوں کا ایک بڑا سا بنڈل رکھا ہوا تھا۔ اس کے ایک سرے پر پہلے سے پھندا بنا کر رکھا گیا تھا۔ اعلیٰ بی بی نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "سونیا کا کیا حال ہے۔ اُدھر بھی دھیان رکھو۔"

"فکر نہ کرو۔ تم تو جانتی ہو، جان لوفر کتنا ہی شہ زور ہو، ناقابلِ شکست ہو، سونیا ایسے وقت لڑنے سے کتراتی ہے صرف مکارانہ ذہانت سے کام لیتی ہے ۔"

ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوگیا۔ سونیا واقعی مکاری دکھا رہی تھی۔ جان لوفر اس ٹیپ کی طرف دوڑتا گیا تھا جو دور جاکر کھلے میدان میں گر گئی تھی۔ اِدھر وہ دوڑتی ہوئی دوسری طرف جارہی تھی۔ وہ ٹیپ کے پاس پہنچ کر اسے زمین پر سے اٹھانا چاہتا تھا جیسے ہی اس نے جھک کر ہاتھ بڑھایا، کئی گولیاں تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ کے پاس آئیں۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گیا۔ سائمن دی گریٹ کے آدمیوں نے چیخ کر کہا۔ "ہم سمجھ گئے ہیں، تم بلٹ پروف میں ہو لیکن تمہارے وہ ہاتھ جو ٹیپ کو اٹھانے جائیں گے، گولیوں سے چھلنی ہوجائیں گے۔"

جان لوفر نے انھیں عزا کر دیکھا پھر ان کی طرف غصے سے دوڑنے لگا۔ انھوں نے فائرنگ کی، وہ اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپاتا ہوا، اپنے ہاتھوں کو بچاتا ہوا دوڑتا جارہا تھا۔ جواباً ماسٹر کی سنڈیکیٹ کے آدمیوں نے بھی فائرنگ کرنے والوں پر فائرنگ کی۔ جس کے نتیجے میں سائمن دی گریٹ کے چار آدمی مارے گئے۔ دو بچ گئے۔ وہ دونوں فائرنگ کرنا چاہتے تھے لیکن اسٹین گن خالی ہوچکی تھی۔ انھوں نے اسے نال کی طرف سے پکڑ لیا اور پھر جان لوفر کی طرف حملہ کرنے کے لیے لپکے۔ دونوں نے بیک وقت اسٹین گن کے کندے سے ضرب لگانے کی کوشش کی

لیکن وہ دونوں حملے اس نے اپنے ہاتھوں سے روک لیے انھیں پکڑ کر اپنی طرف کھینچا پھر دونوں کی ٹھوڑیوں کے نیچے ہاتھ لے جاکر ان کے جبڑوں کو جکڑ لیا۔

ایک ہاتھ میں ایک شخص کا جبڑا تھا، دوسرے ہاتھ میں دوسرے شخص کا۔ وہ دونوں تلملا کر اسے مار رہے تھے کبھی گھونسے، کبھی کراٹے۔ اس نے دونوں کو جبڑوں کی طرف سے جکڑ کر زمین سے بلند کرلیا۔ اس کی شہ زوری کا یہ ایک نمونہ تھا دو ہٹے کٹے دشمنوں کو اس نے دونوں ہاتھوں سے بلند کرلیا تھا۔ وہ دونوں لاتیں چلا رہے تھے۔ اسے کسی طرح نقصان پہنچا کر اس کی گرفت سے نکلنا چاہتے تھے لیکن ذرا سی دیر میں ہی ان کے جبڑے جیسے چٹخنے لگے۔ ان کے منہ سے لہو رسنے لگا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ اب جدّوجہد نہیں کرسکتے تھے۔ تھوڑی بہت جان ضرور ہوگی پھر وہ بھی نہ رہی۔ جان لوفر ان دونوں کو جکڑے ہوئے گول گول گھوم رہا تھا۔ انھیں اِدھر سے اُدھر چرخی کی طرح گھما رہا تھا پھر اس نے پوری قوت سے دور پھینک دیا۔ ان میں سے ایک درخت کے تنے سے جاکر ٹکرایا۔ اس کی آخری کراہ منہ سے نکلی، اس کے بعد وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ دوسرا کہیں جھاڑیوں میں جاکر گم ہوگیا تھا۔ پھر جان لوفر نے پلٹ کر سونیا کو فاتحانہ انداز میں دیکھا۔ وہ شانِ بے نیازی سے چلتا ہوا اس ٹیپ کے پاس آیا جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر چونک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہیلی کاپٹر کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ ہم اسی کھلے میدان کے اوپر ہیلی کاپٹر میں چکر لگا رہے تھے جب ان دشمنوں نے ہمیں دیکھا کہ ہم رسّی کا پھندا پھینک رہے ہیں تو انھوں نے اپنی اپنی اسٹین گن اٹھا کر ہماری طرف فائرنگ شروع کی۔ وہ فائرنگ صرف چند سیکنڈ کی تھی، اس کے بعد ہتھیار خالی ہوگئے۔ میں رسّی کا پھندا سونیا پر ڈال کر اسے وہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ اگر سونیا سے کہتا تو وہ کبھی راضی نہ ہوتی پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کے جو چار دشمن تھے، وہ سب نہتے تھے۔ تین سے سونیا بہ آسانی نمٹ سکتی تھی۔ چوتھا جان لوفر تھا جو کم کریزی کی طرح سخت جان تھا۔ نہ پھانسی کے پھندے سے مرسکتا تھا، نہ اسے فری اسٹائل کے مقابلے میں مارا جاسکتا تھا۔ وہ غیر معمولی انسان تھا۔ اسے غیر معمولی طریقے سے ہی مارا جاسکتا تھا۔

رسّی کا پھندا نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ پھندا جو سونیا کی طرف جانے والا تھا، اسے میں نے جان لوفر کی طرف پھینکا۔ وہ اس پھندے سے نکلنا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے سر پر سے ہوتا ہوا جسم کے نصف حصے تک آیا تھا۔ وہ اسے ہاتھوں سے پکڑ کر ایک طرف پھینکنا چاہتا تھا مگر میں نے رسّی کو کھینچا۔ پھندے کا حلقہ تنگ ہوگیا لیکن تنگ ہوتے ہوتے وہ اس کے قدموں کی طرف چلا آیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں نے کھینچا تو وہ اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اسے اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس پھندے کو نکالتا۔ اس وقت تک وہ اٹھ چکا تھا۔ فضا میں اُلٹا لٹکتا ہوا بلند ہوتا چلا جارہا تھا۔

اس کے تینوں ساتھی دوڑتے ہوئے اسے پھندے سے نکالنے کے لیے تیزی سے بڑھے تھے لیکن وہ ان کی پہنچ سے بلند ہوگیا تھا لہٰذا انھوں نے ٹیپ کی طرف دوڑ لگائی۔ ان میں جو سب سے پہلے ٹیپ کے پاس پہنچا اور جس نے جھک کر اسے اٹھانا چاہا۔ اس کے منہ پر ایک زبردست ٹھوکر پڑی۔ وہ چیختے ہوئے دوسری طرف الٹ گیا۔ سونیا دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس ٹیپ کے پاس کھڑی ہوئی تھی اور کہہ رہی تھی "یہ زمین پر پڑا ہوا ہے۔ تم میں سے کوئی جوانمرد ہے تو اسے اٹھالے ۔"

میں جان لوفر کو پھندے میں الجھانے کے بعد اسے اوپر اٹھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ میں نہیں جان سکتا تھا کہ سونیا کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ جو کچھ میں بیان کررہا ہوں، یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا۔

جب میں نے اسے پھندے میں الجھانے کے بعد اوپر اٹھانا شروع کیا تب پتا چلا، کمبخت کتنا وزنی ہے۔ کم از کم تین ساڑھے تین من کا تو ضرور ہوگا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ہیلی کاپٹر کو اس طرح لے چلو کہ نیچے لٹکنے والا درختوں سے ٹکراتا جائے۔

پائلٹ نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ اسے اسی طرح لٹکائے ہوئے ہم اِدھر سے اُدھر پرواز کرنے لگے۔ وہ واقعی سخت جان تھا۔ دو چار درختوں سے ٹکرانے، ان سے الجھتے اور گزرتے رہنے کے دوران یقیناً چوٹیں آئی ہوں گی لیکن وہ برداشت کرنا جانتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اوپر کی طرف اٹھ کر اپنی ٹانگوں کو پکڑ لیا تھا اور اب رسّی کو پکڑ کر آہستہ آہستہ یوں اوپر اٹھ رہا تھا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر پھندا ڈالنے کے بعد اس کی بلندی تک پہنچنے جا رہا ہو۔

میں نے پیچھے بیٹھے ہوئے فوجی جوان سے کہا "ہتھکڑی نکالو۔ میں اس کے ہاتھ میں ڈالوں گا۔"

اعلیٰ بی بی نے پریشان ہوکر پوچھا "تم کیا کرنے جارہے ہو۔ اسے ہتھکڑی پہنانے کے لیے تمھیں باہر نیچے لٹکنا ہوگا۔"

"اگر ہم نے اسے اندر آنے کا موقع دیا اور اس کے ہاتھ

کھلے رہے تو یہ سب کے لیے تباہی کا باعث بنے گا۔"

"رسّی کاٹ ڈالو۔اسے بلندی سے گر کر مرنے دو۔"

ایک [illegible] نے کہا" مادام! یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مجرم ضرور ہے لیکن ہم اسے مارنے کا حق نہیں رکھتے۔اسے عدالت پہنچایا جائے گا۔"

افسر نے میری طرف ہتھکڑی بڑھاتے ہوئے کہا" رسّی کا آخری سرا ہیلی کاپٹر سے بندھا ہوا ہے۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔ اسے کسی طرح ہتھکڑی پہنانے کی کوشش کریں۔ میں آپ کی ٹانگیں پکڑے رہوں گا۔"

میں نے اس سے ہتھکڑی لی۔ اس وقت تک جان لوفر رسیّوں کو تھام کر ایک ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے اوپر چلا آرہا تھا۔ جب میں ہیلی کاپٹر سے باہر جھانکتے ہوئے نیچے کی طرف جھکنے لگا تو ہمارے درمیان صرف چھ فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے ہیلی کاپٹر کے دروازے والے ہینڈل کو تھام رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ جان لوفر نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ پھر غراتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔ گردش کرتا ہوا پنکھا اس قدر شور مچا رہا تھا کہ اس کی بڑبڑاہٹ سنائی نہیں دی۔ اس نے اور اوپر اٹھنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر رسّی کو تھامنا چاہا۔ میں نے اس کی کلائی میں ہتھکڑی پہنانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے فوراً ہی ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں نے کہا" تمھیں اوپر آنے کے لیے ہتھکڑی پہننا پڑے گی۔ ورنہ اسی طرح لٹکتے رہو گے۔"

وہ کمبخت شاید سرکس میں بازی گر بھی رہ چکا تھا۔ کیونکہ رسّی کو ہاتھوں سے تھامنے کے بعد ٹانگوں کو پھندے سے آزاد کر چکا تھا۔ اب اس کے لیے بھی دشواری یہ تھی کہ مجھے دونوں ہاتھوں سے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ایک ہاتھ سے رسّی کو پکڑنا ضروری تھا اور دوسرے ہاتھ سے ہتھکڑی کو اپنے سے دور رکھنے کا مسئلہ بھی تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب وہ ہاتھ بڑھا کر رسّی کو اور ذرا اوپر تھامنا چاہتا تو میرا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا اور وہ پھر ہاتھ کھینچ لیتا۔

ہیلی کاپٹر پرواز کرتا جا رہا تھا اور ہمارے درمیان یہ کھیل جاری تھا۔ کبھی میں ہاتھ بڑھاتا تھا کبھی وہ ہاتھ پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ جب میں پیچھے ہاتھ ہٹا لیتا تو وہ رسّی کو تھام کر اوپر آنا چاہتا۔ میں نے ایک بار اسے اوپر آنے کا موقع دیا۔ وہ دھوکا کھا گیا۔ اس نے سوچا، ایک ہاتھ سے رسّی تھامتے ہی فوراً اچک کر دوسرے ہاتھ سے رسّی کو تھام لے گا لیکن میں نے اس دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔

وہ ہتھکڑی خود کار تھی یعنی کلائی میں پہناتے ہی مقفل ہو جاتی تھی۔ بعد میں اسے مخصوص چابی سے کھولا جاتا تھا۔ وہ ایک کلائی میں تو مقفل ہو گئی اب دوسری کلائی باقی تھی لیکن وہ بھی بلا کا چالاک تھا۔ ہتھکڑی والے ہاتھ سے اس نے رسّی کو تھام کر دوسرے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو تھام لیا تاکہ میں دوسری کلائی میں نہ پہنا سکوں۔

اب وہ دو طرح کی کوششیں کر رہا تھا۔ ایک تو یہ کہ میں اس کی دوسری کلائی تک نہ پہنچ سکوں۔ دوسرے وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جیسے دھمکی دے رہا تھا کہ کھینچتے ہی نیچے کی طرف پھینک دے گا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ جواباً میں اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا لیکن اس کے وزن کے متعلق پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ ایک فوجی جوان نے پیچھے سے میری ٹانگ پکڑ.... رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے دروازے کے ہینڈل کو پکڑ رکھا تھا۔ اس لیے اب تک بچا ہوا تھا ورنہ کب کا بلندی سے پستی کی طرف جا چکا ہوتا۔

اس نے میری کلائی کو بڑی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ میری کلائی جیسے فولادی شکنجے میں آگئی تھی۔ میں اِدھر سے اُدھر ہاتھ ہلا نہیں سکتا تھا پھر بھی کوشش جاری تھی۔ آخر میں نے پیچھے سر گھما کر فوجی جوان سے کہا" میری ٹانگ چھوڑ دو۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا" یہ کیا کہہ رہے ہو، تم گر پڑو گے۔"

میں نے کہا" جو میں کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔ میری ٹانگ چھوڑ دو۔"

افسر نے پائلٹ سے کہا۔ پرواز نیچی رکھو اور فرہاد صاحب کی ٹانگ چھوڑ دو۔"

اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ میں نے ہینڈل کو اسی طرح دوسرے ہاتھ سے تھام کر رکھا پھر ہیلی کاپٹر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ گویا کہ صرف ایک ہاتھ کے زور پر میں ہینڈل کو تھامے لٹک رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ دشمن کی گرفت میں تھا اور اب بار بار لات اس کے منہ پر مار رہا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری کلائی پر اس کی گرفت ذرا کمزور پڑ گئی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو پوری قوت سے ایک طرف موڑ کر اس کی کلائی میں ہتھکڑی پہنا دی۔

اِدھر میں نے دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنائی اُدھر اس نے میری کلائی چھوڑ دی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا خطرہ مول لے گا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک ہاتھ سے رسّی تھامے پھسلتا ہوا نیچے جانے لگا۔ پہلے تو یہی سمجھ میں آیا کہ وہ پستی کی طرف گرتا جا رہا ہے لیکن ہیلی کاپٹر زیادہ بلندی پر نہیں تھا اس کی پرواز تقریباً پچاس فٹ کی بلندی پر تھی۔ درختوں سے

ٹکرانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ پہلے میں نے ایک ہاتھ سے ہینڈل کو تھاما ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے جان لوفر سے زور آزمائی کرتا رہا تھا۔ اس کے نیچے جاتے ہی میں نے رسّی کو تھام لیا تھا۔ پھر ایک فوجی نے مجھے آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ میں ہیلی کاپٹر کے اندر آگیا۔ اس کے بعد میں نے سر نکال کر دیکھا تو رسّی خالی لٹک رہی تھی۔ وہ نہیں تھا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ارے وہ کہاں چلا گیا؟"

پائلٹ نے کہا" میں اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک گھنے درخت کے اوپر پرواز کرنے کے دوران اس نے رسّی چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد نظر نہیں آرہا ہے۔ ہم [illegible] درخت کے چاروں طرف پرواز کر رہے ہیں۔"

ہم نیچے کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی گھنے درخت تھے۔ ہیلی کاپٹر ان کے اوپر پرواز کرتا ہوا ایک گول چکر کاٹ رہا تھا۔ اب ان میں سے کون سا درخت ہے، یہ ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ پائلٹ سے پوچھنے پر اس نے کہا" تمام درخت ایک جیسے گھنے ہیں۔ انھی میں سے کسی درخت میں چھپا ہوگا۔"

جب ہیلی کاپٹر نے دو چکر پورے کر لیے تو میں نے فوجی جوانوں سے کہا" آپ میں سے دو نوجوان رسّی کے ذریعے نیچے اتر جائیں اور اسے تلاش کریں۔ ہمیں سونیا کی طرف واپس جانا چاہیے۔"

افسر نے کہا" آپ مادام سونیا کی فکر نہ کریں۔ بیشک وہاں تین دشمن رہ گئے تھے لیکن بس کے مسافر بھی ان کے ساتھ ہیں۔ سب نے مل کر ان تینوں کو قابو میں کر لیا ہوگا۔"

میں نے رضا علی کے دماغ پر دستک دی۔ پھر اس کے ذریعے معلومات حاصل کیں۔ افسر کا اندازہ درست نکلا۔ اوّل تو سونیا نے ان تینوں کی اچھی طرح پٹائی کی تھی۔ اس کے بعد بس کے مسافروں نے ان پر دھاوا بول دیا تھا۔

آفیسر آنکھوں سے دُوربین لگائے نیچے درختوں کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے ان درختوں کے اطراف کئی چکر لگائے تھے، لیکن جان لوفر نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے کہا" ہمیں ذرا آگے جا کر دیکھنا چاہیے۔ وہ یقیناً دریا کی طرف گیا ہوگا۔" ہیلی کاپٹر کو دریا کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں بھی وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یقیناً گھنے درختوں کے سائے تلے چھپ چھپ کر کسی دوسری طرف نکلنے کی کوشش میں ہوگا۔ افسر نے کہا" ہیلی کاپٹر کو دریا کے کنارے اتار دو۔ ہم پرواز کرنے کے دوران گھنے درختوں کے سائے میں اسے دیکھ نہیں سکیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ہیلی کاپٹر دریا کے کنارے اتر چکا تھا۔ پنکھے کی گردش ختم ہو گئی تھی۔ آفیسر نے کہا" اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے۔ وہ آبادی کی طرف جائے گا تو لوگ اسے مجرم سمجھ کر دوڑا کر گھیرنے کی کوشش کریں گے۔"

ہم گھنے درختوں کی طرف جانے لگے۔ میں نے کہا" اس کا آبادی کی طرف جانا خطرناک ہے۔ بستی والے بیچارے اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ درندہ ہے۔ گینڈے کی طرح طاقتور ہے۔ کسی نہ کسی کی زندگی کو خطرے میں ڈال کر انھیں مجبور کرے گا کہ اس کی ہتھکڑی کو کسی طرح کاٹا جائے۔"

میں نے افسر سے دُوربین لے کر اپنی آنکھوں سے لگائی۔ چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگا۔ حدِّ نظر تک درخت پھیلے ہوئے تھے۔ دُور کا منظر ان کی وجہ سے چھپ جاتا تھا۔ میں نے دریا کی طرف گھوم کر دیکھا پھر چونک گیا۔ بہت دُور دریا پر ریلوے کا پُل نظر آرہا تھا۔ جان لوفر اسی طرف بھاگتا جا رہا تھا۔ میں نے دُوربین کے لینس کو اس کے کلوز میں کیا تاکہ اسے صاف طور پر دیکھ سکوں پھر میں نے افسر سے کہا" وہ ریلوے لائن کی طرف جا رہا ہے۔"

افسر نے مجھ سے دُوربین لے کر اس طرف دیکھا۔ پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا" فوراً ادھر چلو۔ اسے فرار ہونے کا موقع نہ دو۔"

وہ ریلوے لائن پر پہنچ گیا تھا اور اب پُل پر دوڑتا جا رہا تھا۔ ہم سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ دُوربین نہ ہوتی تو شاید وہ ہمیں نظر بھی نہ آتا۔ آفیسر نے حیرانی سے کہا" آخر یہ پُل کے اوپر کیوں دوڑتا جا رہا ہے جبکہ دریا کے اس پار سگنل ڈاؤن ہے۔ ٹرین آنے ہی والی ہے۔"

اگرچہ ہم دوڑتے ہوئے اس کی طرف جا رہے تھے لیکن اس سے بہت دُور تھے۔ اس وقت تک وہ پُل کے درمیانی حصے میں پہنچ گیا تھا یعنی دریا کے بیچ پُل پر کھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ ریلوے لائن پر لیٹ گیا۔ میں نے آفیسر سے دُوربین لے کر اس کے لینس کو کلوز کرتے ہوئے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ ریلوے لائن پر ایسی جگہ لیٹا ہوا تھا جہاں دو پٹریاں ملتی تھیں اور ان دو پٹریوں کو نٹ بولٹ کے ذریعے مضبوطی سے جوڑ کر رکھا جاتا تھا۔ وہ وہاں لیٹنے کے بعد اپنے دانتوں سے نٹ بولٹ کو کھول رہا تھا۔ میری آنکھیں دُوربین سے لگی ہوئی تھیں اور حیرانی سے پھیل گئی تھیں۔ یہ ایک ناقابلِ یقین بات تھی کہ ایک انسان اپنے دانت کی مضبوطی کو آزما رہا تھا اور ریلوے لائن کے بولٹ کھول رہا تھا۔

میں نے دُوربین کو آفیسر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا" ذرا اسے کلوز میں دیکھیے۔ وہ نٹ بولٹ کھول رہا ہے جو ممکن نہیں ہے۔"

آفیسر نے دیکھا۔ پھر کہا" یہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ فرض کرو وہ انھیں کھولنے میں کامیاب ہو جائے تو پٹری کا جوڑ کھل جائے گا۔ آنے والی ٹرین کو حادثہ پیش آسکتا ہے۔"

میں نے کہا" وہ ٹرین کو حادثے سے دوچار کر کے کیا فائدہ

حاصل کرے گا؟ اس کا مقصد کچھ اور ہے۔"

میں پھر دُوربین لے کر دیکھنے لگا۔ میں اور آفیسر ایک جگہ ٹھہر گئے تھے۔ باقی مسلح جوان ریل کی پٹڑی کی طرف دوڑتے جا رہے تھے۔ آفیسر نے چیخ کر کہا "پُل پر نہ جانا۔ ٹرین آنے ہی والی ہے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اگر مسلح جوان پل پر جاتے تو اس وقت تک ٹرین آجاتی۔ پھر انھیں واپسی کا موقع نہ ملتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ٹرین کی زد میں آجاتے اور جان لوفر تو زد میں آنے ہی والا تھا۔

میں نے دُوربین سے دیکھا۔ اس نے ایک پٹری کے دونوں نٹ بولٹ کھول لیے تھے۔ اب وہ دونوں ٹانگیں ایک پٹری میں پھنسا کر ریلوے لائن کے نیچے جھول گیا تھا۔ یعنی دریا کی طرف لٹک رہا تھا اور جس پٹری کے نٹ بولٹ کھولے تھے، اس پٹری کو اوپر کی طرف اٹھا رہا تھا۔ اس کے لیے غیر معمولی قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جب وہ پٹری ذرا اوپر اُٹھ کر علیحدہ ہو گئی تو اس نے دوسری پٹری پر اپنی ہتھکڑی کا درمیانی حصہ رکھ دیا۔ جو پٹری ذرا اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھی وہ پھر نیچے آگئی۔

اب ٹرین کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ میں حیرانی سے دُوربین لگائے دیکھ رہا تھا۔ وہ دوبارہ اس پٹری کے نٹ بولٹ کو اپنے دانتوں سے پکڑ کر لگا رہا تھا تاکہ ٹرین کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔

وہ عجیب سچویشن تھی۔ ہم دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ مسلح جوان جو ریلوے لائن کے قریب پہنچ گئے تھے، وہ پُل پر نہیں جا سکتے تھے۔ اتنی دیر میں جان لوفر نے نٹ بولٹ دوبارہ لگا دیے تھے اور اپنی ٹانگیں جس پٹری سے پھنسائے ہوئے تھا، اس پٹری کو چھوڑ دیا تھا۔ گویا اب ہتھکڑیوں کے بل دریا کی طرف لٹک رہا تھا۔

آفیسر نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا "اوہ گاڈ! اِٹ اِز اے ڈیئرنگ اسٹرگل، آئی ہیو ایور سین (او خدایا! میں نے ایسی جان پر کھیل جانے والی جدوجہد کا انداز پہلے کبھی نہیں دیکھا)"

ٹرین آگئی تھی۔ تیز رفتاری سے پُل پر پہنچ گئی تھی اور اب پُل پر سے گزرتے ہوئے جان لوفر کے سر کے اوپر سے گزرتی جا رہی تھی۔ ابھی صرف ٹرین کے انجن کے بعد ایک بوگی ہی گزری ہو گی کہ ہتھکڑی کا درمیانی حصہ کٹ گیا اور جان لوفر وہاں سے بہتی کی طرف جاتا ہوا دریا کی گہرائی میں پہنچ گیا۔ میں نے دُوربین سے اتنا ہی دیکھا کہ پانی کے چھینٹے دُور تک پھیلے۔ اس کے بعد پھر لہریں اپنے معمول کے مطابق بہنے لگیں۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ گہرائی میں جانے کے بعد دوبارہ اُبھر نہیں سکا۔ کیا وہ ڈوب گیا تھا؟

آفیسر اور دوسرے جوان ایسا سوچ سکتے تھے لیکن میں جانتا تھا، وہ یوگا کا ماہر پانی میں سانس روکے ہوئے کسی طرف جا رہا ہوگا۔ ہم جہاں کھڑے ہوئے تھے، دریا کا رُخ اسی طرف تھا یعنی ہم جنوباً کھڑے ہوئے تھے اور دریا شمال کی طرف سے بہتا ہوا آرہا تھا، وہ بھی اسی طرف بہتا ہوا آرہا ہوگا لیکن یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ وہ کوئی بے حس و حرکت تو نہیں تھا کہ دریا کے بہاؤ کے مطابق چلا آتا۔ وہ اس کے مخالف سمت بھی تیرتا ہوا اندر ہی اندر کہیں سے کہیں نکل سکتا تھا۔ ٹرین گزر چکی تھی۔ آفیسر چیخ کر اپنے ماتحتوں سے کہہ رہا تھا "پل کراس کر کے دوسرے کنارے جاؤ۔ تم میں سے ایک شمال کی سمت جائے گا، دوسرا جنوب کی طرف۔"

میں نے کہا "وہ یوگا کا ماہر ہے۔ میری معلومات کے مطابق ماسٹر جی کے شاگرد تقریباً آدھے گھنٹے تک سانس روک سکتے ہیں۔"

"اوہ نو! اتنی دیر تک سانس بھلا کیسے روکی جا سکتی ہے۔ آدمی تو مر ہی جائے گا۔"

"ایسا ہماری دنیا میں ہوتا ہے۔ پتا نہیں، وہ آدھے گھنٹے میں کتنی دُور نکل جائے گا۔ ہم کنارے کنارے کہاں تک جا سکیں گے۔

اعلیٰ بی بی نے کہا "ہمیں ہیلی کاپٹر میں پرواز کرتے ہوئے اسے دیکھنا چاہیے۔"

ہم سب دوڑتے ہوئے پھر ہیلی کاپٹر میں پہنچ گئے۔ دس منٹ کے بعد ہم پرواز کر رہے تھے۔ آفیسر بے یقینی سے کہہ رہا تھا "دس منٹ گزر چکے ہیں۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ وہ اب تک پانی کے اندر ہوگا۔"

ہم پرواز کرتے ہوئے نیچے دریا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں کناروں پر ہماری نظر تھی۔ آفیسر کبھی خود دُوربین سے دیکھتا تھا، کبھی وہ دُوربین میری طرف بڑھا دیتا تھا۔ ہم کئی میل تک شمالاً بھی گئے اور جنوباً بھی۔ دریا پر برابر نظر رکھتے رہے لیکن وہ کم بخت نظر ہی نہیں آرہا تھا۔

اعلیٰ بی بی نے کہا "دریا کے مختلف حصوں میں اب تک دو لانچیں اور تین کشتیاں نظر آئی ہیں۔ وہ جدھر بھی جا رہی ہوں، پرواز کو ذرا نیچے کر کے ان سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔"

ایسا ہی کیا گیا۔ میگا فون کے ذریعے لانچ والوں کو مخاطب کر کے کہا گیا "ایک خطرناک قیدی فرار ہو گیا ہے۔ وہ فرار کے لیے دریائی راستہ اختیار کر رہا ہے۔ یقیناً وہ کسی کشتی یا لانچ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ پہنچ چکا ہے تو ہمیں سگنل کے ذریعے اطلاع دی جائے۔"

لانچ کے عرشے پر کھڑے ہوئے ایک نیوی مین نے سگنل دینا شروع کیا۔ اس کا جواب تھا "ہماری لانچ میں ایسا کوئی مفرور نہیں ہے۔"

اس سے تقریباً چار میل کی دُوری پر ایک اور لانچ چلی جا رہی

تھی۔ وہاں سے بھی یہی جواب موصول ہوا۔ باقی کشتیوں کو ہم نے دُوربین کے ذریعے دیکھا۔ کشتیوں میں چھپنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ پرواز کے دوران اس میں بیٹھے ہوئے مسافر نظر آجاتے ہیں۔ وہ نظر نہیں آیا۔

ایک گھنٹے تک پرواز کرنے کے بعد پائلٹ نے کہا "اب ہمیں واپس جانا چاہیے ورنہ ایندھن ختم ہو جائے گا۔"

ہم لاہور پہنچ گئے۔ ہمیں فوجی چھاؤنی کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں رکھا گیا۔ اس گیسٹ ہاؤس کے چاروں طرف سخت پہرہ لگا دیا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد سونیا بھی آگئی۔ اعلیٰ بی بی نے اسے بتایا "حالات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔ بڑے ممالک کی طرف سے بالواسطہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ ٹیپ متعلقہ لوگوں کو واپس کر دیا جائے اور ہمیں اس ملک سے نکال دیا جائے۔ وہ ہمیں نکالنے کی بات واضح طور پر نہیں کہہ رہے ہیں لیکن ان کا مقصد یہی ہے۔"

ان باتوں کے دوران دو آفیسر گیسٹ ہاؤس میں آئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ہماری خیریت پوچھی، پھر یہ بھی معلوم کیا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ایک آفیسر نے کہا "مادام سونیا! آپ سے درخواست ہے کہ وہ ٹیپ جو آپ کے پاس ہے اسے ہمارے حوالے کر دیں۔"

سونیا نے پوچھا "کیا یہ ضروری ہے جبکہ میں ایک ٹیپ آپ کے اُوپر کے دفتر میں پہنچا چکی ہوں؟"

"ابھی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ ٹیپ اوریجنل نہیں ہے۔ اصل کی نقل ہے۔"

سونیا اور اعلیٰ بی بی ان افسران سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے معذرت چاہتے ہوئے دوسرے کمرے میں پہنچ کر سعید احمد صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ پھر پوچھا "کیا واقعی جو ٹیپ آپ کے پاس پہنچا ہے، وہ اصل نہیں ہے؟"

"مجھے افسوس ہے۔ سونیا بھابی نے ہم سے بھی دھوکا کیا ہے۔"

میں نے پوچھا "آخر آپ اصل کیوں چاہتے ہیں۔ کس نے یہ کہا ہے کہ وہ اصل نہیں ہے؟"

"فرہاد! ٹیپ پر ہونے والی ری ریکارڈنگ کو پہچاننے والے ماہرین موجود ہیں۔ سپر ماسٹر اور ماسک مین کے جو ماہرین یہاں ہیں، انھوں نے اس ٹیپ پر اعتراض کیا ہے۔ وہ اصل کا مطالبہ کر رہے ہیں۔"

"پھر تو اصل کبھی ان کے ہاتھ نہیں لگے گا۔"

"ہم بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ دوستی اور برسوں کے رشتے داری پسِ پشت ڈال کر مجھے سخت اقدامات پر مجبور ہونا پڑے گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میں فرض کے سامنے سب کچھ قربان کر دیتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ آپ کو فرض کی ادائیگی سے نہیں روکوں گا لیکن آپ ذرا وضاحت فرما دیں کہ ہمارے خلاف سخت اقدامات کیا ہو سکتے ہیں؟ ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟"

"میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ مصلحت اندیشی کا تقاضا ہے۔ ہمیں سپر ماسٹر اور ماسک مین کے مطالبات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ انھیں تسلیم کر لینے سے ہماری پوزیشن کمزور نہیں پڑے گی۔ وہ چاہے کیسے بھی سیاسی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہوں، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ملک کو نقصان نہ پہنچے۔ فرہاد، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم ان کا یہ مطالبہ پورا کر کے ان دونوں ممالک سے بڑے فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات ایک موٹی سی عقل میں بھی آسکتی ہے کہ ہم ایسی چیز دے کر جس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اس کے بدلے دس فائدے حاصل کرتے ہیں تو ہمیں ایسا کرنا چاہیے۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں لیکن آپ یقین کریں، بعض حالات میں سونیا میرے بس سے بھی باہر ہوتی ہے۔ میں بھی اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے آپ کے پاس اصل ٹیپ پہنچایا ہے یقیناً وہ اصل آمنہ کے ذریعے وادیٔ قاف پہنچا دیا گیا ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تم وادیٔ قاف سے واپس منگوا سکتے ہو۔"

میں چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر کہا "میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ مشکلات میں پڑ جائیں۔ بس سمجھ لیجیے، وہ اصل واپس آگیا ہے۔ اس وقت سونیا کے پاس موجود ہے۔"

"کیا واقعی اصل ٹیپ سونیا بھابی کے پاس موجود ہے؟"

"ہاں، دو آفیسر وہ ٹیپ لینے آئے ہیں۔ میں ابھی سونیا سے کہتا ہوں، وہ اُن کے حوالے کر دے گی۔"

"تم میری بہت بڑی مشکل آسان کر دو گے۔ پلیز، ہم سے تعاون کرو۔ وہ ٹیپ ان کے حوالے کر دو مگر پھر فراڈ نہ ہو۔ اگر وہ بھی نقلی ثابت ہوا تو؟"

"آپ اطمینان رکھیں، وہ نقلی نہیں ہے۔"

میں اس کمرے سے نکل کر سونیا اور اعلیٰ بی بی کے پاس آیا۔ وہ دونوں افسران سے بحث کر رہی تھیں۔ میں نے کہا "سونیا! میری بات مان لو۔ وہ ٹیپ ان کے حوالے کر دو۔ ہمیں ہر حال میں ان سے تعاون کرنا چاہیے ورنہ میری وجہ سے سعید احمد صاحب مشکلات میں پڑ جائیں گے۔"

سونیا مجھ سے بھی بحث کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پلیز! میری بات مان لو۔"

ایسا کہنے کے دوران میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی۔ اس نے بے چون و چرا گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر ٹیپ کو نکالا۔ پھر آفیسر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے آپ کی بات مان لی لیکن آپ نہیں جانتے، جیسے ہی یہ اصل ٹیپ دشمنوں کو ملے گا، وہ ہمارے پیچھے کتوں کی طرح لگ جائیں گے۔ کہیں بھی دیکھیں گے تو بے دریغ گولی مار دیں گے۔ ہم اپنی جان سے جائیں گے۔ آپ اس خوش فہمی میں رہیں گے کہ ہماری حفاظت کی جارہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آفیسر! جینا اور مرنا نصیب کی بات ہے، آپ ہمارے چاروں طرف سے پہرہ اٹھا دیں اور ہمیں جانے کی اجازت دیں۔"

ایک افسر نے کہا۔ "پہلے یہ ٹیپ آزمایا جائے گا کہ اصلی ہے یا نقلی۔ اس کے بعد آپ لوگوں کی یہاں سے روانگی کا انتظام کیا جائے گا۔ آپ جس ملک میں جانا چاہیں گے، وہاں آپ کو پہنچا دیا جائے گا۔"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ جس طیارے میں ہم پہنچائے جائیں گے وہ اسی ملک میں پہنچے گا؟"

اس آفیسر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہاں سے روانہ ہوتے ہی ہم پر کیا گزرے گی۔ بہرحال آپ اپنی من مانی کر لیں۔"

وہ دونوں آفیسر جانے لگے۔ سونیا نے انہیں مخاطب کیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "ایک بات یاد رکھیے۔ ہم اس ملک سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں کے قانون کا احترام کرتے ہیں ورنہ یہ جو پہرے بٹھائے گئے ہیں، ہمارے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ ہم یہ ملک فوراً چھوڑ دیں گے لیکن اپنے طور پر چھوڑیں گے۔ ہم اپنے طور پر سوچیں گے کہ کس طرح جانا چاہیے اور کن راستوں سے نکلنا چاہیے۔ اگر آپ نے ہمارے ساتھ اتنا تعاون نہیں کیا . . . ."

میں نے سونیا کو آگے کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ ان افسروں نے مجھے اعلیٰ بی بی اور سونیا کو گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر واپس چلے گئے۔

میں نے سونیا اور اعلیٰ بی بی سے سرگوشی میں کہا۔ "وہ اصل ٹیپ چاہتے ہیں اور میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی جو ٹیپ لے گئے ہیں، وہی اصل ہے۔ لہٰذا مجھے تھوڑی دیر تک مخاطب نہ کرنا۔"

میں ان افسران کے دماغ میں پہنچ گیا۔ ان میں سے ایک آفیسر سپر ماسٹر کے سفارت خانے میں ٹیلیفون کے ذریعے کہہ رہا تھا۔ "ہم نے مادام سونیا سے وہ ٹیپ حاصل کر لیا ہے۔ لے کر آ رہے ہیں۔ آپ ماسک مین کے کسی نمائندے کو بھی بلا لیجیے تاکہ ایک ساتھ اسے سن کر تصدیق کر سکیں۔"

میں نے دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سنی۔ پھر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ ماسک مین کے سفارت خانے میں فون کر کے ان کے ایک ماہر کو بلا رہا تھا۔ میں اس ماہر کے دماغ میں بھی پہنچ گیا۔ پھر میں نے ٹیلی پیتھی کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ماسک مین کی طرف سے آنے والے ماہر کے ساتھ ایسی گڑبڑ کی کہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکا۔ ادھر ہمارے افسران وہ ٹیپ لے کر سپر ماسٹر کے ایک ماہر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے دوسرے ماہر کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اُن کے اندر یہ کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ کسی طرح اصل ٹیپ تک پہنچ جائیں۔ لہٰذا اس نے ریکارڈر پر اسے لگایا اور آن کر کے سننے لگا۔

میں اس کے دماغ میں موجود تھا۔ جو کچھ وہ سن رہا تھا، اسے سننے کا موقع دے رہا تھا مگر بہت کم سمجھنے کا موقع دے رہا تھا۔ وہ ہزار مہارت رکھتا ہو لیکن ٹیلی پیتھی کی مہارت کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہی ٹیپ اصل ہے۔ اس میں جو نقل ہونے کی خامیاں تھیں یا کچھ ٹیکنیکل باتیں رہ گئی تھیں، وہ اس کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ دوسرے لفظوں میں، میں نے اسے سمجھنے کا موقع نہیں دیا۔

اس نے مطمئن ہونے کے بعد ٹیلی فون کے ذریعے اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے سپر ماسٹر کے خاص ماہر سے رابطہ قائم کیا اور تصدیق کی۔ "میں نے وہ اصل ٹیپ سن لیا ہے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ یہ ہر طرح سے اوریجنل ہے۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "ماسک مین کا ماہر کیا کہتا ہے؟"

وہ کہنا چاہتا تھا کہ ابھی ان کا ماہر یہاں پہنچا نہیں ہے۔ اسی وقت اس کی نظر دروازے پر گئی۔ پھر اس نے کہا۔ "وہ ابھی یہاں پہنچا ہے اور اب وہ سن کر تصدیق کرنے والا ہے۔"

"اچھی بات ہے، میں اس کی رپورٹ بھی سننا چاہوں گا۔"

"یس سر! ابھی آپ سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔"

ماسک مین کا وہ ماہر ریکارڈر کے پاس آیا اور ٹیپ کو ریوائنڈ کرنے لگا۔ میں نے سپر ماسٹر کے ماہر کے دماغ میں یہ بات پیدا کی۔ "میں تو سن چکا ہوں۔ مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہاں رہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے مخالف ماہر کی رائے کو اہمیت دینے والا ہوں اور اس کے نکتۂ نظر سے اس ٹیپ کے اصل یا نقل ہونے کا فیصلہ کرنے والا ہوں۔"

یہ بات اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچاتی تھی۔ لہٰذا وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ادھر میں نے ماسک مین کے ماہر کے ساتھ بھی وہی طریقۂ کار اختیار کیا۔ اس نے پورا ٹیپ سننے کے بعد تصدیق کر دی۔ "ہاں یہی اصل ٹیپ ہے۔ میں اسے اسلام آباد لے جاؤں گا۔ وہاں ہمارے اور سپر ماسٹر کے ماہرین مزید تصدیق کریں گے۔"

سپر ماسٹر کے ماہر نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "ہم یہ ٹیپ اسلام آباد لے جائیں گے۔ یہ ہماری ذمے داری ہے۔"

ماسک مین کے نمائندے نے کہا۔ "ذمے داری ہماری بھی ہے اس میں ہمارے معاملات بھی شامل ہیں۔"

"بات نہ بڑھائی جائے تو بہتر ہے۔"

بات کیسے نہ بڑھتی جبکہ میں ان کے درمیان معاملے کو طول دینا چاہتا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ شام ہوتے ہی سردی بڑھ جاتی تھی۔ لوگ کھڑکی اور دروازے بند رکھتے تھے لیکن ماسک مین کے ماہر نے فوراً ہی پلٹ کر کھڑکی کو کھولا اور اس ٹیپ کو یہ کہتے ہوئے باہر پھینک دیا۔ "اسے سنبھالو، کسی کے ہاتھ نہ لگنے دینا۔"

وہ دو افسران جو ہم سے ٹیپ لے گئے تھے، انہوں نے گرج کر کہا۔ "یہ غلط بات ہے۔"

ماسک مین کے ماہر نے کہا۔ "یہ بھی غلط ہے، جس ٹیپ میں ہمارے معاملات شامل ہیں، اسے سپر ماسٹر کے آدمی نہیں لے جا سکتے۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ دونوں افسران دوڑتے ہوئے کمرے سے باہر گئے تھے تاکہ باہر والے سے اسے چھین سکیں۔ یوں بھی باہر سپر ماسٹر کے آدمی موجود تھے۔ انہوں نے اس ٹیپ لے جانے والے کو گھیر لیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہاں سے نکل نہیں سکے گا تو اس نے اسی ماہر کو آواز دی اور کہا۔ "اسے سنبھالو، میں ابھی لے لوں گا۔"

اس نے پھر کھڑکی کے راستے اسے اندر پھینکا لیکن اس بار وہ ٹیپ سپر ماسٹر کے ماہر کے ہاتھ لگ گیا۔ میں خاموشی سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی پیتھی کا حربہ استعمال کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود ہی اس ٹیپ کی ایسی تیسی کرنے والے تھے۔ اگر نہ کرتے تو پھر میں اپنی غیر معمولی صلاحیت کو استعمال کرتا۔

جب وہ ٹیپ سپر ماسٹر کے ماہر کے ہاتھ لگا تو وہ اسے نہ لے جاسکا۔ دوسرے ماہر نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر ماری تھی۔ وہ ٹیپ اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر پہنچا۔ پھر پہیے کی طرح لڑھکتا ہوا ایک طرف جانے لگا۔ دونوں نے بیک وقت اس کی طرف چھلانگ لگائی۔ دونوں ہی پہنچے مگر سپر ماسٹر کا آدمی ذرا پہلے پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ وہ ٹیپ آیا لیکن ماسک مین کا آدمی اس کے اوپر آگرا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا تھا پھر دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ادھر سپر ماسٹر کا آدمی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے جھٹکے دے رہا تھا۔ ایک بار اتنی زور کا جھٹکا پڑا کہ ریل ہاتھ سے نکل گیا۔ فضا میں اُڑتا ہوا آتش دان کے پاس پہنچا۔ وہ آتش دان نمائشی طور پر تھا۔ اس میں آگ نہیں جلتی تھی لیکن اس کے اوپر ہیٹر آن تھا۔ وہ ٹیپ ریل ہیٹر سے ٹکرایا، اس کے اوپر سے ہوتا ہوا گزرا۔ بس اتنا ہی وقت کافی تھا۔ ٹیپ نے آگ پکڑ لی۔

باہر سے دوڑتے ہوئے آنے والوں نے ان دونوں کو دیکھا جو فرش پر گتھم گتھا تھے۔ ایک آفیسر نے پوچھا۔ "وہ ٹیپ کہاں ہے؟"

دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ کر فوراً ہی اٹھ گئے۔ اس وقت تک ٹیپ نے آگ پکڑ لی تھی۔ بہرحال اُسے بجھایا جا سکتا تھا۔ ایک نے اسے بجھانے کے لیے اس کی طرف دوڑ لگائی۔ یہی وہ وقت تھا کہ میں خاموش تماشائی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے دوسرے کے ذریعے اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا اور ایسی جگہ گرا جہاں باہر سے آنے والے اس ٹیپ کو آگ کی لپیٹ میں دیکھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ گرنے والے سے ٹکرائے اور اوندھے منہ زمین بوس ہو گئے۔ آگے والے گرے تو پیچھے والے سنبھل نہ سکے۔ کچھ لڑکھڑائے کچھ سنبھلنے کی کوشش کرتے رہے۔ اتنی دیر کافی تھی۔ ایک تو ٹیپ نے آگ پکڑ لی تھی، دوسرے ٹیپ پلاسٹک کا تھا۔ وہ بھی پگھلتا چلا جا رہا تھا۔

میں دماغی طور پر اپنی جگہ حاضر ہو گیا۔ سونیا اور اعلیٰ بی بی مجھے تک رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو مختصر طور پر بتا دیا کہ اس ٹیپ کو میں نے ان کے ہی ہاتھوں سے کس طرح ضائع کرا دیا ہے۔ وہ خوش ہو گئیں۔

میں نے سعید احمد صاحب کو مخاطب کیا۔ پھر کہا۔ "آپ کے پاس ایک ٹیپ ہے۔ دوسرا ٹیپ دو افسران سونیا سے لے گئے تھے۔ ان کا جو حشر ہوا، وہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔"

میں نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح سپر ماسٹر اور ماسک مین کے ماہرین نے آپس میں جھگڑا کیا اور وہ ٹیپ تباہ ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ "فرہاد! اس میں تمہارا ہاتھ ہے؟"

"آپ یہ سوال نہ کریں۔ دیکھیں کہ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ ٹیپ ان کے حوالے کر دیا۔ آپ کے دونوں افسران نے بھی اپنے فرائض ادا کیے۔ سپر ماسٹر اور ماسک مین کے ماہرین نے اسے اُن کے سامنے سُنا اور تصدیق کی کہ وہ اصلی ٹیپ ہے۔ اب تو آپ کی تمام ذمے داریاں ختم ہو چکی ہیں۔"

"اگر انھوں نے تصدیق کی ہے اور اس کے بعد ٹیپ ضائع ہوا ہے تو ہماری ذمے داریاں ختم ہو جاتی ہیں۔"

"آپ وعدہ کریں کہ اس ٹیپ کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے جسے آمنہ لے گئی ہے۔"

"تم نے بڑی مشکلات سے مجھے نکالا ہے۔ میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔"

"شکریہ کیا آپ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ہمیں ہمارے حال پر نہیں چھوڑ سکتے؟"

"کیا مطلب؟"

"ہم اپنے طور پر یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ وعدہ کرتے ہیں کہ جلد سے جلد یہ ملک چھوڑ دیں گے۔"

"ہم تمہیں کہیں بھی پہنچانے کے لیے تیار ہیں اور بحفاظت پہنچائیں گے۔ پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"آپ ہم سے زیادہ ہمارے دشمنوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہم موقع دیکھ کر یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"فرہاد! تم میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں تم سے ایسی ایسی شخصیتیں ناراض ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا مثال کے طور پر عالی جناب کا نام پیش کر سکتا ہوں۔ اس نے ایک تحریری بیان دیا ہے جس میں لکھا ہے۔

"فرہاد علی تیمور جب تک ہمارے ملک میں موجود رہے گا، تخریب کاری جاری رہے گی اور ایسے ہنگامے ہوں گے جن کا متحمل ہمارا ملک نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اسے پہلی فرصت میں یہاں سے نکالا جائے۔ اگر میں کبھی کسی وجہ سے یہ تحریری بیان بدلنا چاہوں تو یہ اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ فرہاد میرے دماغ میں پہنچ گیا ہے اور مجھے اپنا بیان بدلنے پر مجبور کر رہا ہے۔"

وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوئے، پھر کہا۔" اس سے اندازہ کر سکتے ہو کہ ایسی وہ تمام بڑی شخصیتیں جو کسی نہ کسی وجہ سے اسمگلنگ، چور بازاری اور تخریب کاری میں ملوث ہیں۔ جنھیں تمہارے دشمن ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے، وہ سب تمہارے خلاف بیان دے رہے ہیں اور دباؤ ڈال رہے ہیں کہ پہلی فرصت میں تمہیں، سونیا کو اور اعلیٰ بی بی کو یہاں سے نکال دیا جائے۔"

"میں جانتا ہوں آپ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں، آپ کی طرح میرے ملک کے جتنے فرض شناس افسران ہیں، وہ بھی مجھے چاہتے ہیں۔ میرے ہم وطن کبھی پسند نہیں کریں گے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں لیکن میں جاؤں گا۔ صرف اس لیے کہ جو بڑے بڑے ناقابلِ شکست دشمن ہیں، وہ میری دشمنی میں میرے ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ مجھے ان سے نمٹنا ہو گا تو میں سرحد سے باہر جا کر نمٹ لوں گا۔"

"تم لوگوں کے تعلقات فرانسیسی حکومت سے بہت اچھے ہیں۔ ہم نے انکے سفارت خانے سے رجوع کیا تھا۔ انھوں نے تم لوگوں کے لیے ایک طیارہ چارٹرڈ کیا ہے۔ وہ طیارہ یہاں سے تمہیں وادیٔ قاف لے جائے گا۔ آج آدھی رات کے بعد تم تینوں کو بہت ہی رازداری سے ائیرپورٹ پہنچایا جائے گا۔"

"جب دشمن کہہ چکے ہیں کہ ہمیں پہلی فرصت میں یہاں سے نکال دینا چاہیے تو وہ توقع کر رہے ہوں گے کہ ہم آج رات کو یا کل صبح تک یہاں سے جانے والے ہیں۔ کیا وہ ہمارا تعاقب نہیں کریں گے؟"

"ہم تمہارے دشمنوں پر اپنی مجبوریاں ظاہر کر رہے ہیں۔ تمہاری حُب الوطنی کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں سمجھا رہے ہیں کہ یک بیک ہم انھیں ملک سے جانے کے لیے نہیں کہہ سکتے۔ ہم کچھ روز اُن کی میزبانی کریں گے۔ پھر ایک ہفتے بعد انہیں یہاں سے وادیٔ قاف پہنچا دیں گے۔ میں سمجھتا ہوں، یہ بہترین موقع ہے۔ تم تینوں کو آج رات ہی نکل جانا چاہیے۔"

میں نے سعید صاحب کے دماغ کو چیک کیا۔ وہ مطمئن تھے۔ انھوں نے ایسے انتظامات کیے تھے کہ جب ہمارا طیارہ یہاں سے پرواز کرتا تو اس ائیرپورٹ سے کسی طیارے کو فوری طور پر پرواز کی اجازت نہ ملتی۔ اس طرح یہ یقین ہو جاتا کہ اندرونِ ملک سے کوئی دشمن ہمارے تعاقب میں نہیں جا سکے گا۔

اب رہا یہ خدشہ کہ بیرونی سرحدوں کے پار دشمن ہماری تاک میں ہوں گے تو انہیں صحیح وقت کا اندازہ نہیں تھا۔ اگر وہ ہمارے طیارے کو پرواز کرتے دیکھ بھی لیتے تو اسے ائیر فرانس کا طیارہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے۔

میں نے سونیا اور اعلیٰ بی بی کو سعید احمد سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتایا۔ پھر کہا۔" ہمیں ہر حال میں خطرہ مول لینا ہے خواہ ہم فضائی سفر اختیار کریں یا خشکی کے راستے یہاں سے نکلنا چاہیں۔ لہٰذا کیوں نہ آج کی رات ہی یہاں سے نکل جائیں۔"

اعلیٰ بی بی نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر فرانسیسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا، پھر کہا۔" مسٹر فرہاد علی تیمور آپ سے دماغی رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ ریسیور رکھ دیجیے۔"

اعلیٰ بی بی نے بھی ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔" تم معلوم کرو، اس طیارے کا پائلٹ کون ہے اور اس کے ذریعے پورے طیارے

کو اچھی طرح چیک کرو۔"

میں نے یہی کیا۔ سفارت خانے کے اس اہم شخص کے ذریعے پائلٹ کے پاس پہنچا۔ اس سے دوستی کی۔ پھر اُسے سمجھایا کہ میں اس کے ذریعے پورے طیارے کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا۔" جناب! میرے ساتھ ایک کو پائلٹ بھی ہو گا۔ آپ اس کے دماغ میں بھی پہنچ کر مطمئن ہو جائیں۔"

میں نے ان دونوں کے دماغوں کو اچھی طرح ٹٹول لیا۔ اس دوران وہ ائیرپورٹ پہنچ گئے تھے اور اب طیارے کو اچھی طرح چیک کر رہے تھے۔ اِدھر گیسٹ ہاؤس میں رات کے دس بجے ہمارے لیے پُرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ ہمارے ساتھ دو افسر بھی تھے۔ انھوں نے کہا۔" بے انتہا مصروفیات کے باعث کھانے میں دیر ہو گئی۔ ہم معذرت چاہتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔" کوئی بات نہیں۔ کھانا تو مل رہا ہے اور اچھا مل رہا ہے۔"

ہم ہنستے بولتے کھانے میں مصروف رہے۔ اس دوران میں بار بار پائلٹ اور کو پائلٹ کے دماغوں میں جا کر معلوم کرتا رہا تھا۔ انھوں نے پورے طیارے کو چیک کر لیا تھا۔ اب مجھ سے سننا چاہتے تھے کہ میں مطمئن ہوں یا نہیں۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ ایک افسر میرے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کافی کی چُسکی لیتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "ہم رات کے ٹھیک ایک بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ آپ تیار رہیں۔"

یہی بات میں نے پائلٹ وغیرہ سے کہہ دی۔ انھوں نے کہا۔" جناب ہم بالکل تیار ہو کر آئے ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں یہاں آ سکتے ہیں۔ ہم یہیں موجود رہیں گے۔"

ہم کافی پینے کے بعد اپنے کمرے میں آئے۔ اعلیٰ بی بی نے کہا۔" ہم تینوں کا ایک ساتھ سفر کرنا مناسب نہ ہو گا۔ کیوں نہ ہم الگ الگ طیارے سے سفر کریں۔ پہلے فرہاد یہاں سے نکل جائیں۔ اس کے بعد سونیا، اس کے بعد میں۔"

سونیا نے کہا۔" مجھے تمہاری اس تجویز سے اتفاق ہے لیکن فرہاد پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے ہیں۔ میں انہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔"

"پھر تم دونوں آج رات نکل جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گی۔"

"لیکن ہم تینوں کو یہاں سے نکلنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔"

اعلیٰ بی بی نے ریسیور اٹھایا، فرانسیسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا، پھر کہا۔" میں آپ کے ملک کی شہری ہوں۔ آج کسی وجہ سے نہیں جانا چاہتی۔ کیا مجھے روکا جا سکتا ہے؟"

"ہم اپنے ذرائع استعمال کریں گے۔ آپ جب تک چاہیں گی، یہاں رہ سکیں گی۔"

اس نے ریسیور رکھا۔ اسی وقت باہر کہیں سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ ہم چونک کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ گیسٹ ہاؤس کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے دونوں افسران کے دماغ میں باری باری جھانک کر دیکھا۔ پتا چلا ایک مسلح سپاہی مُردہ پایا گیا ہے۔ اس نے کسی کو دیکھا ہو گا۔ دیکھتے ہی پہلے وارننگ دی ہو گی۔ پھر فائر کیا ہو گا۔ فائرنگ کا اثر نہ ہوا کیونکہ کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ کون ہو سکتا تھا۔ سپاہی مسلح تھا۔ اس کے باوجود ایک سپاہی قابو میں آ گیا تھا۔ اُسے دوسری بار فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ہم تینوں کے ذہن میں ایک ہی نام اُبھرا۔" جان لوفر۔"

رات کی خاموشی میں افسران چیخ چیخ کر حکم دے رہے تھے۔

"اُسے تلاش کرو۔ کون ہے وہ۔ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔"

جو افسر ہیلی کاپٹر میں ہمارے ساتھ تھا اور جس نے جان لوفر کا تعاقب کیا تھا، میں نے اس سے دماغی رابطہ قائم کیا اور کہا۔ "یہ جان لوفر ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک سپاہی کو ہلاک کر کے بھاگ جائے گا۔ وہ گیسٹ ہاؤس کے اندر گھُسنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔"

افسر نے جواب دیا۔" ہم اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں، چاروں طرف مسلح جوان موجود ہیں۔ جیسے ہی وہ نظر آئے گا، بے دریغ فائرنگ شروع کر دیں گے۔"

"آپ بھول رہے ہیں۔ وہ سر سے پاؤں تک بلٹ پروف میں ہے۔ فائرنگ کا اثر نہیں ہو گا۔"

سونیا گیسٹ ہاؤس کے بیرونی دروازے پر آ کر ایک افسر سے کہہ رہی تھی۔" ہمیں باہر جانے کی اجازت دیجیے۔"

"مادام! باہر خطرہ ہے۔ پہلے ہم اُسے گرفت میں لینا چاہتے ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔" آپ ہمیں کنویں کا مینڈک بنا کر نہ رکھیں۔ ہم کھُلے میدان میں اس سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"مسٹر فرہاد! آپ بُرا نہ مانیں۔ جیسا کہ میں اس کے متعلق سُن چکا ہوں۔ آپ جیسے چار فرہاد بھی مل کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

سونیا نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ میں نے کہا۔" آفیسر درست کہتے ہیں۔ ہمیں گھر کے اندر بیٹھنا چاہیے۔"

ہم اندر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے خیال خوانی کی پرواز کی اور

جان لوفر کے دماغ پر دستک دی۔ پہلے تو اس نے سانس روکی۔ پھر سانس لیتے ہوئے بولا "تم جو کوئی بھی ہو، اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ میرے دماغ کو جھٹکے پہنچا سکو گے۔"

"میں فرہاد ہوں۔ زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتا، اتنا معلوم کرنا چاہتا ہوں، آخر تم چاہتے کیا ہو؟ جبکہ وہ اصلی ٹیپ ہم نے تمہارے بڑھل کے حوالے کردیا ہے۔"

"مجھے صرف ٹیپ لینے کے لیے نہیں، تمہارے اور سونیا کے لیے بھی بھیجا گیا ہے۔"

"اگر ہمیں یہاں سے اغوا کرنا چاہتے ہو تو یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ ذرا عقل سے کام لو۔ گیسٹ ہاؤس تک پہنچتے پہنچتے اتنے مسلح افراد تم پر حاوی ہو جائیں گے کہ جان بچا کر نہیں نکل سکو گے۔ میں نہیں چاہتا، تم گرفت میں آؤ۔ یا تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آخر اس مہربانی کی وجہ؟"

"وجہ محبت نہیں ہے۔ ہم نے سانپ کو دودھ پلانا نہیں سیکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تمہارے دل میں مجھے اغوا کرنے کی حسرت نہ رہے۔ لہٰذا کہیں تنہائی میں ملاقات کرو۔ یہاں تو بے موت مارے جاؤ گے اور میں تمہیں اپنے لیے بچا رکھنے کی خاطر کچھ نہیں کرسکوں گا۔"

"کیوں نہیں کرسکتے۔ گیسٹ ہاؤس سے نکل آؤ۔"

"میں اپنے وطن کے محافظوں کا احترام کرتا ہوں۔ اُن کے حکم کی تعمیل کرنا میرا اولین فرض ہے۔ میں اُن کی محبت کو بھی سمجھتا ہوں کہ حفاظت کی خاطر انہوں نے گیسٹ ہاؤس تک ہمیں محدود کررکھا ہے، لہٰذا میں باہر نہیں نکل سکتا تھا وعدہ کرتا ہوں۔ ضرور تمہارا سامنا کروں گا لیکن صبر کرو۔"

گفتگو کے دوران میں اس کے ذریعے سمجھ رہا تھا کہ وہ گیسٹ ہاؤس کے پچھلے حصے میں تھا اور ایک درخت کی آڑ میں پچھلے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ دیوانہ وار تیزی سے دوڑتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی طرف آنے لگا۔ اسی وقت کئی طرف سے فائرنگ ہوئی۔ تڑ تڑ اتڑ کی آواز کے ساتھ گولیاں چل رہی تھیں۔ یقیناً اسے لگ رہی ہوں گی لیکن وہ دوڑتا ہوا سیدھا پچھلے دروازے تک آیا۔ ایک زور کی ٹکر ماری اور دروازے کو توڑ کر اندر چلا آیا۔

میں نے سونیا اور اعلیٰ بی بی سے کہا "تم دونوں اسی کمرے میں رہو۔ وہ ادھر آیا تو سونیا اس سے نمٹ لے گی۔"

میں دوڑتا ہوا درمیانی کمرے میں پہنچا جہاں کا دروازہ توڑ کر وہ آیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پیچھے لپکا۔ میں اسے اپنے پیچھے دوڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اتنی دیر میں باہر سے مسلح افراد دوڑتے چلے آرہے تھے لیکن ہم کمرے میں پہنچ چکے تھے، اس نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ پھر میری طرف پلٹ کر کہا "تم غلط سمجھ رہے تھے کہ میں تمہیں اغوا کرنا چاہتا ہوں۔ ماسٹر کی نے حکم دیا ہے، تمہیں اپاہج بنا کر چھوڑ دوں۔ اس کے بعد تمہیں کوئی بھی اغوا کرکے لے جاسکتا ہے۔ اور میرے ماسٹر تک پہنچا سکتا ہے۔"

باہر سے دروازہ پیٹنے کی آواز آرہی تھی۔ ایک افسر کہہ رہا تھا۔ "فرہاد! دروازہ کھولو، اس سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

جان لوفر نے میری طرف بڑھتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا "اگر دروازہ کھول سکتے ہو تو جاکر کھول دو۔"

وہ قد میں مجھ سے چار انچ اونچا تھا۔ جسامت میں ڈیڑھ گنا تھا۔ اپنے لانبے سے ہاتھ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "آؤ ہاتھ آجاؤ۔"

میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا، جیسے پنجہ لڑانا چاہتا ہوں۔ اس نے جھپٹ کر مجھ سے پنجہ ملانا چاہا۔ میں نے فوراً ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ ذرا جھونک میں آگے بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر ایک طرف زور سے کھینچا۔ وہ سامنے والی دیوار کی طرف گیا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ وہ دیوار تک پہنچنے سے پہلے ہی اوندھے منہ دھڑام سے گر پڑا۔ اس کے گرنے سے جیسی آواز پیدا ہوئی۔ اس سے اس کے وزن کا پتا چلتا تھا۔

مجھے یہی سہولت حاصل تھی۔ وہ بے تحاشا وزن رکھتے ہوئے فوراً نہیں اٹھ سکتا تھا۔ نہ ہی تیزی سے مڑ سکتا تھا لیکن جب مڑ جاتا تو برق رفتاری سے حملہ آور ہوتا تھا۔ ویسے میں دھوکا کھا گیا۔ میں تو اس کے اٹھنے کا انتظار کررہا تھا۔ لیکن اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کے دوران ہی پیچھے سے ایک لات ماری۔ میں ذرا پیچھے گیا۔ جب تک آگے آتا، وہ اٹھ کر مقابلے پر ڈٹ گیا تھا۔

میں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس بار وہ دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اب اس کے تیور بدل گئے تھے۔ پہلے وہ کھیل سمجھ رہا تھا مگر اب سنجیدہ ہوگیا تھا۔ اس بار میں پنجہ لڑانے کا فریب نہ دے سکا۔ اس سے پہلے ہی اس نے یکبارگی دوسری طرف گھوم کر دونوں ہاتھ فرش پر ٹیکے اور دولتی مجھے ماری۔ دونوں لاتیں میرے سینے پر پڑیں۔ میں پیچھے لڑکھڑاتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکرا گیا۔ جس طرح گیند دیوار سے ٹکرا کر واپس آتی ہے۔ میں اسی رفتار سے واپس آیا۔ فضا میں قلابازی کھائی اور اس کی کمر پر کھڑا ہوگیا۔ پھر وہاں سے قلابازی کھائی اور فرش پر آگیا۔ ابھی میرے پاؤں پوری طرح جمنے نہ پائے تھے کہ اس نے میری ٹانگ پر ٹانگ

ماری۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔ پھر تو میری شامت آگئی۔ اس نے میرے اٹھنے سے پہلے ہی مجھے دبوچ لیا۔ میں اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فولادی شکنجے میں بے بس ہوتا چلا جارہا ہوں۔

پھر وہ مجھے اسی طرح دبوچے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے بعد یکبارگی مجھے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا اور چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا کہ مجھے کہاں دے مارے گا۔ اس کی نظر آتش دان پر رکھے ہوئے ہیٹر کی طرف گئی۔ ہیٹر آن نہیں تھا۔ اس نے مجھے ایک دیوار کی طرف دے مارا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ میری کیا حالت ہوئی۔ بس ایسے ہی لگ رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے اور اب مجھے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ جو چوٹیں آئیں وہ تو الگ تھیں۔ اس کے بعد میرے فوراً اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں کراہتے ہوئے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی "میں نے ہیٹر کو آن کردیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ ٹیپ ہیٹر میں جل کر ضائع ہوگئی ہے۔ اب میں تجربہ کروں گا کہ تمہیں کس حد تک ضائع کیا جاسکتا ہے۔"

وہ اسے آن کرنے کے بعد میری طرف آنے لگا۔ اتنی دیر میں مجھے اُٹھنے کا موقع مل گیا تھا جیسے ہی وہ میرے قریب آیا میں نے ایک کرسی اٹھا کر اس پر حملہ کیا۔ اس نے حملے کو روک لیا پھر ہم دونوں کے درمیان کرسی رہ گئی۔ ہم اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگے۔ وہ مجھے دھکیلنا چاہتا تھا، میں اُسے لیکن میں یہ اعتراف کرتے ہوئے سبکی محسوس نہیں کرتا کہ وہ بھاری پڑ رہا تھا۔ ایسے وقت طاقت سے کم اور ذہانت سے زیادہ لڑا جاتا ہے۔ میں اچانک ہی زور لگاتے لگاتے بیٹھ گیا۔ کرسی یکبارگی میرے پیچھے فرش پر گری اور وہ کرسی پر سے ہوتا ہوا دوسری طرف اُلٹ گیا۔

اس دوران کتنی ہی بار دروازے پر دستک ہوچکی تھی، اسے پیٹا جارہا تھا اور بار بار کہا جارہا تھا "دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیا جائے گا۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے بھی دیر نہیں لگائی۔ فوراً اُٹھ کر میرے پیچھے لپکا۔ میں اسے دوڑاتا ہوا اسی آتشدان کے پاس گیا۔ فوراً ہی ہیٹر کے ہینڈل کو پکڑ کر تیزی سے پلٹ گیا۔ وہ میرے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے یکبارگی ہیٹر کو اس کے منہ پر دے مارا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی اُفتاد آپڑے گی۔ وہ جلن ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہاڑنے لگا۔ اگرچہ ہیٹر کو کھینچ کر اس کے منہ پر مارنے کے سبب پلگ نکل گیا تھا لیکن جس حد تک وہ گرم ہوچکا تھا اس نے چہرے کو اچھی طرح جھلس دیا تھا۔ باہر دروازہ پیٹنے والے یا اُسے توڑنے والے ذرا خاموش ہوگئے تھے۔ اس کے دہاڑنے کی آواز سن رہے تھے۔

آتش دان کے ایک طرف پیڈسٹل فین رکھا ہوا تھا۔ لاہور کا موسم بھی عجیب سا ہوجاتا ہے۔ دن کو گرمی پڑتی ہے، رات کو سردی، شاید اسی لیے وہ پیڈسٹل فین وہاں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس پنکھے کی اگلی جالی کے تینوں ہُک ہٹائے۔ اس جالی کو ایک طرف پھینکا۔ پھر اس کے پلگ کو سوئچ بورڈ میں لگا دیا۔ پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میں نے اسے نیچے سے پکڑ کر اٹھایا۔ اتنی دیر میں جان لوفر غصے سے دہاڑتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں نے وہ پنکھا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے حلق سے پھر دہاڑنے کی آوازیں نکلیں۔ وہ اپنے ہاتھ دونوں طرف جھٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے گردش کرتے ہوئے پنکھے کو اس کے چہرے کے سامنے لے جاکر لگا دیا۔ حملہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بعد اس کی جو حالت ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ وہ اپنی تیزی طراری بھول گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اتنی دیر میں گردش کرتے ہوئے پنکھے نے اس کے چہرے کو لہولہان کردیا تھا۔

ڈوبنے والے کو تیرنا یاد نہ رہے، تب بھی وہ ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ اس نے بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارے۔ اس کے نتیجے میں پنکھا ایک طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پلگ بھی سوئچ بورڈ سے نکل گیا۔ اس کا چہرہ مرقعِ عبرت بن گیا تھا۔ گردش کرتے ہوئے پنکھے نے اس کی ناک اُڑا دی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کی کٹی ہوئی ناک دیکھی۔ چہرہ پہلے تو ہیٹر کے ذریعے جھلس گیا تھا۔ اس کی جھلسی ہوئی جلد کو پنکھے نے جگہ جگہ سے تراش کر رکھ دیا تھا۔ آنکھیں لہو میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار آنکھیں میچ کر کھولنا چاہتا تھا۔ پھر بند کرلیتا تھا۔

میں نے پنکھے کو ایک طرف رکھ دیا۔ وہ دونوں ہاتھ ٹیک کر فرش پر سے اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اس کے دماغ میں پہنچ کر پوچھا "ہیلو جان لوفر! کیا حال ہے؟ مجھے اپنے دماغ سے نہیں نکالو گے؟"

ناک ہی نہیں تھی تو وہ سانس کہاں سے روکتا اور اگر روک بھی سکتا تو اذیت ناک تکالیف نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ کریوگا کے فن کا مظاہرہ کرتا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا، ڈگمگا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ بڑھا کر راستہ ٹٹولتے ہوئے میری طرف آنا چاہتا

تھا۔ میں نے اس کے دماغ کو ایک جھٹکا پہنچایا۔ وہ ایک دم سے دہاڑتا ہوا، غراتا ہوا، پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے اس کے دماغ میں کہا "میری کچھ باتیں اچھی طرح یاد رکھو اور یہ باتیں ماسٹر کی۔ سے ضرور کہنا۔ اوّل تو یہ کہ میں نے تمہیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے زیر نہیں کیا۔

دوسری بات یہ کہ لڑتے جانور بھی ہیں اور انسان بھی جانور لڑتے وقت عقل استعمال نہیں کرتے، انسان کرتا ہے۔ میں نے اپنی ذہانت سے کام لیا اور تمہیں اس حال کو پہنچا دیا۔

تیسری بات یہ کہ ماسٹر کی اب تیسرے شاگرد کو بھیجے گا۔ ہوسکتا ہے وہ کم کریزی اور تم سے زیادہ خطرناک ہو۔ لیکن ذہانت کسی کی جاگیر نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے وہ ہم سے زیادہ ذہین بن جائے۔ لیکن ماسٹر کی سے کہنا۔ جسے اللہ رکھتا ہے اسے کوئی نہیں چکھتا۔"

میں وہاں سے پلٹ کر دروازے کے پاس آیا کیوں کہ بڑی دیر سے جان لوفر کے دہاڑنے، غرانے، کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب ہی تجسس میں مبتلا تھے۔ دروازے کو پیٹنا بھول گئے تھے۔ کان لگا کر سن رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سب دھڑ دھڑاتے ہوئے اندر چلے آئے۔ کمرے کا سامان الٹ پلٹ ہوگیا تھا لیکن جان لوفر کا چہرہ جس بے ترتیبی سے الٹ پلٹ ہوا تھا اسے دیکھتے ہی سب دم بخود رہ گئے تھے۔

اعلیٰ بی بی نے ایک طرف سے اور دوسری طرف سے سونیا نے میرے بازوؤں کو تھام لیا تھا۔ وہ دونوں خوش ہو کر دشمن کو دیکھ رہی تھیں۔ میں نے آفیسر سے کہا "یہ لوگ صرف ایک فرہاد کو نہیں سنبھال سکتے۔ آپ چار فرہاد کی باتیں کر رہے تھے۔"

میں سونیا اور اعلیٰ بی بی کے ساتھ وہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگیا۔ انھوں نے جان لوفر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اسے دھکے دیتے ہوئے گیسٹ ہاؤس سے لے جا رہے تھے۔ وہ افسر ہمارے پاس آیا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر کہا "بریوو (شاباش)، دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یونہی تمہارے نام کا ڈنکا نہیں بجتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں، تمام غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے مجرموں کے لیے صرف ایک فرہاد کافی ہے۔"

اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ محبت سے میری ہتھیلی کی پشت کو تھپکی دی پھر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ رات کے ایک بج کر تیس منٹ پر ایک گاڑی ہمارے گیسٹ ہاؤس کے سامنے آکر رکی۔ ہمیں اس میں بیٹھ کر ائیرپورٹ جانا تھا۔ اعلیٰ بی بی کے وہاں رکنے کا انتظام ہوگیا تھا۔ میں اور سونیا اس گاڑی کے پچھلے حصے میں بٹھائے گئے۔ اسے بند کر دیا گیا۔ پھر وہ گاڑی بڑی رازداری سے روانہ ہوئی۔ میں نے اعلیٰ بی بی سے وعدہ کیا تھا، جب تک طیارہ پرواز نہیں کرے گا، میں رابطہ قائم کرتا رہوں گا۔ کوئی شک و شبہے کی بات ہوگی تو اسے فوراً اطلاع دوں گا۔

ویسے بھی فوجی افسران نے وہاں سے ائیرپورٹ تک خفیہ سراغ رسانوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ تمام ذمے دار افسران اپنی اپنی جگہ فون پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرانسمیٹر سے بھی رابطہ قائم تھا جب تک ہم وہاں سے روانہ نہ ہوتے اس وقت تک وہ سکون سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

وہ گاڑی ہمیں لے کر سیدھی ائیرپورٹ کے رن وے تک پہنچی۔ میں نے گاڑی سے اتر کر پائلٹ اور کو پائلٹ سے گفتگو کی۔ ان کے دماغوں میں جھانکنے سے پتا چلا کہ جب میں نے ان سے گفتگو کی تھی اور ان کے دماغ میں رہ کر طیارے کو چیک کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ائیرپورٹ کے ہی ریٹائرنگ روم میں جا کر سو گئے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا "تم لوگوں نے نیند پوری کرلی۔"

"ہم گیارہ بجے سوئے تھے۔ اور ایک بج کر پندرہ منٹ پر بیدار ہوگئے۔ اتنی ہی نیند کافی ہے۔"

نیند کے دوران وہ طیارہ فوجی جوانوں کی نگرانی میں تھا۔ ہم مطمئن ہو کر اس میں سوار ہوگئے۔ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ لاہور پہنچ کر بھی اپنی لاڈلی بہن شاہینہ سے ملاقات نہ کر سکا۔ سعید احمد صاحب نے ان کی کوٹھی کے آس پاس سخت پہرہ لگا رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن اس کوٹھی پر حملہ کرسکتے ہیں اور میری بہن کو یا کسی اور کو یرغمال بنا کر مجھے کمزور بنا سکتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، ہم محبت بھرے رشتوں کے قریب پہنچ کر بھی ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتے۔

اس طیارے نے پرواز کی۔ میں نے سعید صاحب کے دماغ میں پہنچ کر کہا "الوداع! میرے ملک کی زمین تنگ نہیں ہے۔ میرے وطن کا سینہ بہت کشادہ ہے۔ میں پھر آؤں گا۔"

طیارہ اپنی مخصوص بلندی پر پہنچ کر محو پرواز تھا۔ سونیا پائلٹ کے پاس تھی۔ شاید وہ اپنی تسلی کر رہی تھی۔ کو پائلٹ نے میرے پاس آکر مسکراتے ہوئے کہا "جناب! اس طیارے میں ائیر ہوسٹس نہیں ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ آپ کافی پینا پسند کریں گے؟"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا "ہم میں سے کوئی میزبان نہیں ہے، کوئی مہمان نہیں ہے۔ ہم سب ہمسفر ہیں۔ آؤ دونوں مل کر کافی تیار کریں۔"

ہم اسٹیورڈ روم میں آگئے۔ وہاں ہم نے کافی تیار کی۔ اتنے میں سونیا آگئی۔ ہم مزے مزے سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے اور ہنستے بولتے رہے۔ اس دوران میں نے رسونتی کو مخاطب کیا۔ اس نے بتایا "آمنہ بخیریت اس کے پاس پہنچ گئی۔" میں نے کہا "اب تم ہمارے پاس موجود رہو گی۔ میں اس کو پائلٹ سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اس کے لب و لہجے کو یاد رکھو۔ اس کے ذریعے تم پائلٹ کے دماغ میں بھی پہنچ جاؤ گی۔"

ہم کافی پینے کے بعد اپنی سیٹوں پر آکر بیٹھ گئے۔ رسونتی بہت خوش تھی کیونکہ یہ طیارہ ہمیں اسی کے پاس پہنچانے والا تھا۔ میں نے سونیا کو بتا دیا کہ رسونتی ہمارے درمیان موجود ہے۔ رسونتی نے کہا "فرہاد! تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ تمہیں سو جانا چاہیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں، جب تک سوتے رہو گے، میں جاگتی رہوں گی۔ ایک ذرا بھی خدشہ محسوس ہوا تو تمہیں جگا دوں گی۔"

میں واقعی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ آج تمام دن بڑی مصروفیت رہی تھی۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد جتنی جدوجہد میں مصروف رہا تھا، وہ مجھے تھکا دینے کے لیے کافی تھی۔ اچھا ہوا کہ میں نے خیال خوانی کم کردی تھی اور جسمانی طور پر سرگرم عمل رہنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ میں تھکن کو بھی برداشت کرلیا کروں گا۔ فی الحال تو سونیا میرے پاس موجود تھی۔ رسونتی خیال خوانی کے ذریعے پہرہ دے رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ احتیاطاً اپنے دماغ کو ہدایت دی تھی کہ غیر معمولی بات ہو تو میری آنکھ کھل جائے۔

ایک گھنٹے بعد ہی رسونتی نے آکر جگایا "فرہاد جلدی اٹھو گڑبڑ ہے۔"

میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول کر پوچھا "کیا بات ہے؟"

"میں دونوں پائلٹ کے دماغ میں نہیں پہنچ سکتی۔ بار بار کوشش کی مگر واپس آگئی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم خود دیکھ لو۔"

میں نے کوشش کی۔ خیال خوانی کی پرواز کرتے ہوئے پہلے پائلٹ کے دماغ میں پہنچنا چاہا۔ پتا چلا، اس کے دماغ کو لاک کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد میں نے کو پائلٹ کے دماغ کو آزمایا۔ وہاں بھی یہی بات تھی۔ وہاں سے فوراً اٹھ کر دوڑتا ہوا اس دروازے کے پاس گیا جس کے دوسری طرف پائلٹ کیبن تھا۔ وہ دروازہ دوسری طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے دروازے کو پیٹنا شروع کیا۔ سونیا نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

میں نے اسے بتایا "دونوں کے دماغ لاک کر دیے گئے ہیں۔ یہ کیسے ہوا، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

رسونتی نے کہا "یقیناً ان پر تنویمی عمل کیا گیا ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے ائیرپورٹ پہنچنے کے بعد ان کے دماغوں کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا تھا۔ پرواز کے دوران بھی یہ نارمل رہے۔ ہمارے ساتھ ہنستے بولتے رہے۔ اگر یہ ڈیوٹی کے دوران سو جاتے تو یہ سمجھا جاتا کہ کوئی اُن پر تنویمی عمل کر رہا ہے لیکن یہ تو اپنی ڈیوٹی پر ہیں اور مسلسل جاگتے رہے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو، اچانک دماغ کے لاک ہوجانے کا مطلب یہی ہے کہ اُن پر تنویمی عمل پرواز کے دوران کیا گیا ہے یا پھر پرواز سے بہت پہلے۔"

رسونتی کی یہ بات سُنتے ہی میں چونک گیا۔ مجھے یاد آیا دونوں پائلٹ رات کے گیارہ بجے سو گئے تھے اور ایک بج کر پندرہ منٹ پر بیدار ہوئے تھے۔

ایک چبھتا ہوا سوال ذہن میں اُبھرا۔ کیا مادام کمپیوٹر نے انہیں تنویمی نیند سُلا دیا تھا؟

سونیا دروازے کو پیٹتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "دروازہ کھول دو ورنہ ہم اسے توڑ ڈالیں گے۔"

دروازہ کمزور نہیں تھا۔ دھکّے مارتے رہنے سے ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ضربیں لگا لگا کر اُسے کمزور بنایا جاسکتا۔ رسونتی نے کہا۔" وہ دونوں پائلٹ ہمارے دُشمن نہیں تھے۔ اب بھی نہیں ہیں۔ ذرا سوچو، ان پر کس طرح تنویمی عمل کیا گیا ہے۔ انھوں نے طیّارے کو اُڑایا ہے۔ پرواز کے دوران بہت دیر تک ہنستے بولتے رہے ہیں۔ ایک پائلٹ نے تمہارے ساتھ کافی پی ہے۔ وہ اس وقت بھی مادام کمپیوٹر کا معمول نہیں تھا پھر اچانک کیسے بن گیا؟"

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا "تنویمی عمل کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً مُجرمانہ ذہن رکھنے والے کسی کو معمول بنا کر اُسے ہدایت دیتے ہیں کہ وہ ایک گھنٹے تک سوتا رہے گا جب بیدار ہوگا، تو تنویمی عمل بھول جائے گا۔ اس کے ٹھیک دو گھنٹے کے بعد اسے یاد آئے گا کہ تنویمی عمل کے دوران اسے کیا ہدایات دی گئی ہیں اور اُسے کس طرح ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر انہیں دو گھنٹے بعد کسی کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہو تو وہ ٹھیک اسی وقت ان کے معمول بن کر ان کے حکم کی تعمیل کرنے لگتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ مادام کمپیوٹر نے گیارہ بجے انہیں تنویمی نیند سلایا پھر انہیں ہدایت کی کہ پرواز کرنے کے ایک گھنٹے بعد تنویمی عمل کی ہدایات یاد آئیں گی اور اس کے مطابق اُن کا دماغ لاک ہوجائے گا۔"

"اگر دماغ لاک ہوگیا ہے تو وہ طیارے کو کہاں لے جائیں گے۔ کیا انہیں یاد ہوگا کہ وادیٔ قاف کی طرف جانا ہے؟"

"نہیں، وادیٔ قاف کی طرف لے جانا ہوتا تو دماغ کو لاک نہ کیا جاتا۔ مادام کمپیوٹر نے تنویمی عمل کے دوران اُنہیں دوسرا روٹ سمجھایا ہوگا۔ وہ معمول بن کر اُسی روٹ پر جا رہے ہیں۔"

یہ بات میں ذرا اُونچی آواز میں رسونتی سے کہہ رہا تھا تاکہ سونیا بھی سنتی رہے۔ وہ میری باتیں سُننے کے دوران دروازے کو گھورتی ہوئی نظروں دیکھ رہی تھی اور بڑی تیزی سے سوچتی بھی جا رہی تھی۔ میری بات سُن کر وہ پلٹ گئی۔ اس نے کہا۔ "اوہ گاڈ! اگر ان کے دماغ میں کوئی دوسرا روٹ نقش کر دیا گیا ہے تو وہ طیارے کو وہیں پہنچائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہاں پہنچائیں گے؟"

میں اور سونیا ایک دوسرے کو تکتے ہوئے سوچنے لگے۔ پھر سونیا یکبارگی دوڑتے ہوئے اسٹیورڈ روم میں گئی۔ وہاں سے ایک چاقو اٹھا کر لے آئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا کرنا چاہتی ہو؟"

وہ دروازے کے پاس پہنچ کر بولی۔ "اس ہینڈل کے چاروں طرف وار کرتی رہوں گی۔ اتنا حصّہ کمزور ہو جائے تو شاید ہم دروازہ کو جبراً کھولنے میں کامیاب ہوسکیں۔"

اس نے چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دروازے پر مارنا شروع کیا مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کامیاب ہوسکے گی۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ مادام کمپیوٹر نے کس سے سودا کیا ہے؟ وہ ہمیں کہاں پہنچانا چاہتی ہے؟ کیا بہرام علی کی ٹی سینٹر لے جائے گی یا ہمیں ماسٹر کی کے قدموں میں لے جا کر گرائے گی؟

میں نے دونوں مُٹھیاں بھینچ لیں پھر مادام کمپیوٹر کو مخاطب کیا۔ "اگر تم اس طیارے میں موجود ہو تو ہم سے بات کرو۔"

اسے مخاطب کرنا سراسر حماقت تھی۔ وہ بھلا طیارے میں کیسے موجود ہوسکتی تھی۔ میرے دماغ میں آتی تو مجھے معلوم ہوجاتا مگر وہ کبھی نہ آتی۔ میں اسے آنے کا موقع دیتا تب بھی پہلو بچاتی۔ وہ بڑی محتاط تھی۔ شاید سوچتی تھی، کہیں کوئی غلطی ہوگئی تو پکڑی جائے گی۔

اسی لیے وہ میرے دماغ میں نہیں آسکتی تھی۔ سونیا کے دماغ کو ہم نے لاک کر دیا تھا۔ دوسری طرف پائلٹ کیبن میں دونوں پائلٹ کے دماغ ناقابلِ تسخیر تھے۔ نہ ہم پہنچ سکتے تھے نہ وہ پہنچ سکتی تھی۔ گویا کہ یہ طیارہ مادام کمپیوٹر کے بغیر بھی مادام کمپیوٹر کی مرضی کے مطابق اس کے روٹ پر جا رہا تھا۔

مگر کہاں جا رہا تھا؟

سونیا کے ہاتھ میں چاقو کا پھل چمکتا جا رہا تھا اور اس کی نوک بار بار ہینڈل کے آس پاس پیوست ہوتی جا رہی تھی۔

شاید دشمنوں کی عید ہونے والی تھی۔ فرہاد اور سونیا دو اہم مُہرے ایک ساتھ ان کے جال میں پھنسنے چلے آ رہے تھے۔

طیّارہ اپنی مخصوص رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ باہر کی فضا اس کی پرواز کے لیے خوشگوار تھی لیکن اندر طوفان آیا ہوا تھا۔ سونیا چاقو کے دستے کو مضبوطی سے تھامے دروازے کے ہینڈل کے اطراف پے در پے ضربیں لگا رہی تھی۔ میں طوفانی رفتار سے سوچ رہا تھا، آخر کس طرح اپنا بچاؤ کیا جاسکتا ہے؟

بچاؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہم زمین پر تھے نہ آسمان پر۔ ہم فضائی قیدی تھے۔ جہاں پہنچا دیے گئے تھے وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

ہمارے یقینی اندازے کے مطابق طیّارے کا پائلٹ تنویمی عمل کے زیرِ اثر تھا۔ اب مادام کمپیوٹر نے اسے طیّارے کو کہیں پہنچانے کی بات سمجھائی تھی یا نہیں؟ یہ بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ ہوسکتا تھا تنویمی عمل کے دوران اس نے پائلٹ کو ایک مخصوص روٹ سمجھا دیا ہو یا کچھ بھی نہ سمجھایا ہو۔ ایسی صورت میں طیّارہ اس وقت تک پرواز کرتا رہتا جب تک کہ ایندھن ساتھ دیتا۔ اس کے بعد وہ بے جان پرندے کی طرح گر پڑتا، کسی پہاڑ سے ٹکرا جاتا۔ یا کسی سمندر میں غرق ہوجاتا۔

رسونتی نے پریشان ہوکر کہا۔ "فرہاد! میں کیا کروں؟ کس طرح تمہیں اور سونیا کو بچاؤں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ میں نے اعلیٰ بی بی اور سعید احمد صاحب کو اطلاع دے دی ہے، وہ دونوں اپنے اپنے طور پر ممکنہ ذرائع استعمال کر رہے ہیں، تمہارے طیّارے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اعلیٰ بی بی فرانسیسی ایمبیسی میں موجود ہے۔ میں نے خود فرانسیسی حکام سے رابطہ قائم کیا ہے۔ چند منٹوں میں وہاں سے سراغ رساں طیارے پرواز کرنے والے ہیں۔ دنیا کے تمام ائیرپورٹ اور ائیرلائنز تک یہ خبر پہنچائی جا رہی ہے کہ ائیر فرانس کا ایک چارٹرڈ طیّارہ گمراہ ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے، اب تک تمام ائیرپورٹ کے کمپیوٹر آن ہوں گے اور اس طیارے کو ڈی ٹیکٹ کیا جا رہا ہوگا۔"

سونیا کے ہاتھ رک گئے۔ وہ دروازے کے پاس سے پلٹ کر یک بیک قہقہہ لگانے لگی۔ میں نے تعجب سے دیکھا وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "فرہاد! ذرا اس چاقو کو دیکھو، اس کی نوک کس طرح مڑ گئی ہے۔ جیسے ناراض ہوا ور کہہ رہی ہو، جاؤ ہم کام نہیں آتے۔"

وہ پھر ہنسنے لگی۔ رسونتی کو تشویش ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا سونیا موجودہ حالات سے متاثر ہوگئی ہے۔ کیا اس کا دماغ چل گیا ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ سونیا ہے، دوسروں کے دماغ کو چلتا کر دے گی۔"

وہ ہنستے ہوئے میرے قریب آئی۔ چاقو کو ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "جتنی کوشش کرنا چاہیے، وہ کر چکی ہوں۔ اب میری برسوں کی آرزو پوری ہونے والی ہے۔"

"کیسی آرزو؟"

"میں یہی دعا مانگتی رہی کہ تمہارے ساتھ مسلسل زندگی گزارنے کا موقع ملے یا نہ ملے لیکن موت آئے تو تمہارے ساتھ آئے۔ شاید دعا قبول ہو رہی ہے۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے۔

رسونتی نے کہا۔ "میں اعلیٰ بی بی کے پاس جا رہی ہوں۔"

وہ سمجھدار تھی، چلی گئی۔ ہم بھی سمجھدار تھے، سمجھ گئے کہ بدترین حالات میں پریشان ہونے سے پریشانیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ فکر کو جتنا موقع دو، وہ اتنا ہی کھاتی چلی جاتی ہے۔ انسان اعصابی تناؤ میں اور ذہنی کھنچاؤ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ایسے میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔ جب ہم اچھے وقت پر سوچتے ہیں کہ انسان کو ہر حال میں خوش رہنا چاہیے تو پھر بُرے وقت میں خوش کیوں نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا وہ لمحات ہم نے محبت میں گزارے اور اپنے نصیب کا فیصلہ نصیب لکھنے والے پر چھوڑ دیا۔

اس دوران میں نے سائمن دی گریٹ، برگیڈیر جوناتھن کے دماغوں میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ ماسٹر کی کے دماغ میں براہِ راست نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے دستِ راست جیکی وائز کے ذریعے معلوم کیا، ان میں سے کسی کو بھی ہمارے طیّارے کے اغوا ہونے کا علم نہیں تھا۔

اس طرح یہ معلوم ہوگیا کہ مادام کمپیوٹر نے ابھی ہمارے دشمنوں سے ہمارا سودا نہیں کیا ہے، ویسے اس کا طریقۂ کار بتا رہا تھا کہ وہ ضرور کسی سے سودا کرے گی۔

جب ہمارے طیّارے کے گمراہ ہونے یا اغوا کیے جانے کی اطلاع دنیا کے ائیرپورٹ، فلائنگ کلب اور فلائنگ ایجنسیز تک پہنچیں تو ہمارے دشمنوں تک بھی پہنچ گئیں۔ جیکی وائز کے ذریعے پتا چلا، ماسٹر کی بار بار مادام کمپیوٹر سے رابطہ قائم کر رہا ہے۔ تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ جس کمپیوٹرائزڈ ٹرانسمیٹر سے سونیا بھی رابطہ قائم کرکے دھوکا دینے لگی ہے، اسے اب استعمال نہ کیا جائے۔ مادام کمپیوٹر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گی تو اس سے رابطہ رکھا جائے گا لیکن اس مادام نے ہمارے طیّارے کو اغوا کرکے ایسا ڈرامائی انداز اختیار کیا تھا جس کے بعد دہشت گرد تنظیم کا کوئی سربراہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ سب کے اندر جیسے پارا بھر گیا تھا۔ ہر سربراہ مادام کمپیوٹر کو

مخاطب کر رہا تھا، کمپیوٹر کم ٹرانسمیٹر کو استعمال کر رہا تھا۔ اور اس کے اسکرین سے یہی جواب مل رہا تھا "صبر کرو، دو گھنٹے بعد رابطہ قائم کر دوں گی۔ ویٹس آل"

یہ مختصر سا جواب ایٹم بم سے کچھ کم نہیں تھا، سب جھنجلا رہے تھے۔ فرہاد اور سونیا بیک وقت مادام کمپیوٹر کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ ایسا سنہرا موقع بار بار نہیں آتا، وہ چاہتے تھے کہ مادام سے کسی بھی طرح سودا ہو جائے یا کوئی سمجھوتا ہو جائے، فرہاد اور سونیا نکلنے نہ پائیں۔ مادام کمپیوٹر ابھی اس میدان میں بچی ہے، فرہاد اور سونیا اُسے جُل دے کر نکل جائیں گے۔

میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ بچی ہے، وہ بہترین اور بروقت ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔ رسونتی نے میرے اور سونیا کے دماغ کو لاک کر دیا تھا، اس کے راستے روک دیے تھے۔ اس نے ہم سے جو سبق حاصل کیا تھا، وہی سبق دوہراتے ہوئے ثابت کر رہی تھی کہ وہ وقت اور حالات کے مطابق ذہانت سے کام لینا جانتی ہے۔

ہم نے ڈھائی بجے رات کو لاہور سے پرواز شروع کی تھی، اب ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ پرواز جاری تھی اور نہ جانے کتنی دیر تک جاری رہتی۔ میں پھر ماسٹر کی کے دستِ راست جیکی وائنز اور رسائمن دی گریٹ کے دماغوں میں پہنچ کر معلوم کرنے لگا کہ وہ جو ایک لمحہ بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے، اب کیا کر رہے ہیں؟

وہ اپنے وسیع ذرائع استعمال کر رہے تھے۔ سپر ماسٹر کے زیرِ اثر جتنے ممالک تھے، ان تمام ممالک کے ائیر پورٹ وغیرہ پر اہم افسران مستعد ہو گئے تھے، انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی ان کے کمپیوٹر اسکرین کے ذریعے ہمارا طیارہ گزرتا ہوا دکھائی دے گا، وہ اس کے روٹ کو صحیح طور پر معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسی طرح ماسک مین کے زیرِ اثر رہنے والے ممالک میں بھی تمام متعلقہ افسران مستعد ہو چکے تھے، وہ آسمان پر نظریں جما کر ہمیں ڈھونڈ نہیں سکتے تھے۔ اپنے اپنے کمپیوٹر اسکرین پر اس طرح نظریں جمائے ہوئے تھے جیسے عید کا چاند دیکھنے والے ہوں۔

ان تمام دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں کے پاس بار بار پہنچنے کے بعد ان کے متفقہ جو رخیال کا پتا چلا، وہ جو رخیال یہ تھا کہ مادام کمپیوٹر نے بہت بڑی حماقت کی ہے، طیارے کو اغوا کر کے جہاں پہنچا رہی ہے، وہ یقیناً اس کا خاص اڈہ ہوگا۔ اس طرح وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دوستوں اور دشمنوں کے لیے اپنے خاص اڈے کی نشاندہی کرنے والی ہے۔

صبح ہونے لگی، میں نے اور سونیا نے کھڑکی سے دیکھا، صرف بادل ہی بادل نظر آ رہے تھے۔ نیچے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جہاز بہت ہی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ دن کی روشنی تیز ہونے لگی، اس طرح ہم نے اندازہ لگایا کہ ہم پاکستان سے مشرق کی طرف پرواز کر رہے ہیں، اگر مغرب کی طرف پرواز کرتے تو دنیا کے مغربی حصوں میں ابھی رات تھی۔ ہم جتنا آگے بڑھتے، اتنا ہی رات کے حصے سے گزرتے جاتے — ہم مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں اچھی طرح دن نکل آیا تھا۔ بابا فرید واسطی صاحب کا ادارہ فرانس میں تھا۔ فرانسیسی حکومت کو کبھی اس ادارے سے شکایت نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ اس حکومت کا تعاون حاصل رہا، وادیٔ قلف میں نئی مملکت قائم ہونے کی بات چلی تو اعلیٰ بی بی نے فرانسیسی حکومت پر ہی اعتماد کیا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی بھی اہم مسئلہ ہوتا تو ہم اسی حکومت سے تعاون حاصل کرتے تھے، اسکی اہم اور بنیادی وجہ یہ بھی کہ فرانسیسی حکمران کسی بھی سپر پاور کے دباؤ میں نہیں آتے تھے۔

ہم کھڑکی کے پار دیکھتے جا رہے تھے۔ ہمیں نیچے سمندر نظر آ رہا تھا۔ میں نے فرانس کے ایک اعلیٰ افسر سے رابطہ قائم کیا۔ پھر کہا۔ "میں آپ کو طیارے کا روٹ بتا رہا ہوں، آپ اسے راز میں رکھیں، کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔"

"مسٹر فرہاد صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔ ہم نے اب تک آپ کا اعتماد بحال رکھا ہے، آئندہ بھی رکھیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمارا طیارہ مشرق کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ نیچے صرف سمندر نظر آ رہا تھا۔ ویسے پرواز کو تین گھنٹے بیس منٹ ہو چکے ہیں، میں طیارے کی رفتار معلوم نہیں کر سکتا — ایک اندازے کے مطابق یہ برما سے آگے نکل چکا ہے۔"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "جناب! وہ طیارہ کسی بھی ملک کی فضا سے نہیں گزر رہا ہے، اس نے سمندر کا راستہ پکڑا ہے اور سمندر پر ہی پرواز کرتا ہوا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی کمپیوٹر اسکرین پر نظر نہیں آیا ہے۔ میں آپ کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ طیارہ خلیج بنگال سے آگے نکل چکا ہے۔ برما کے جنوبی سمندر کو عبور کر رہا ہوگا۔ اب میں اسے ڈھونڈ نکالنے کے انتظامات کر رہا ہوں۔"

اس افسر نے متعلقہ افسران سے رابطہ قائم کیا۔ انھیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ فرانسیسی حکومت کے چارٹرڈ طیارے سنگاپور، بنکاک اور ہانگ کانگ وغیرہ میں موجود تھے۔ وہاں ان سے رابطہ قائم کر کے [illegible] تا تھا کہ کس طرح سمندر پر پرواز کرتے ہوئے ایک ائیر فرانس کے طیارے کو ڈھونڈ نکالنا ہے۔

سونیا دوسری طرف کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "فرہاد! ادھر آؤ۔ ایک جزیرہ نظر آ رہا ہے!"

میں تیزی سے ادھر گیا۔ واقعی دور پستی میں ایک جزیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ طیارے کی پرواز نیچی ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ جزیرے کے قریب پہنچتا جا رہا تھا، پرواز اور نیچی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ جزیرے کے اطراف چکر کاٹنے لگا۔

ہماری نگاہوں کے سامنے بہت دور پستی میں بڑے خوبصورت مناظر تھے۔ جزیرہ ہرا بھرا تھا۔ ہر طرف شادابی نظر آ رہی تھی۔ اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں، جھرنے بھی تھے۔ ایک جگہ دریا بہتا ہوا نظر آیا۔ کہیں بہت خوبصورت پکے مکانات تھے۔ اور کہیں جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

وہ طیارہ جیسے جیسے چکر کاٹ رہا تھا، ویسے ہی مناظر بدلتے جا رہے تھے۔ پھر ایک محل نما بڑی سی عمارت نظر آئی۔ اس کے اطراف بہت دور دور تک مکانات بنے ہوئے تھے۔ اونچے نیچے پختہ راستے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر وہ منظر بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب ہمارا طیارہ ایک کھلے میدان پر پرواز کر رہا تھا۔ اس میدان میں ایک پختہ راستہ دور تک چلا گیا تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا، یہی رن وے ہو سکتا ہے، ہم دونوں دائیں بائیں کھڑکیوں کی طرف جا کر سیٹ پر بیٹھ گئے اور سیفٹی بیلٹ کو باندھ لیا۔ ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ طیارہ اسی رن وے پر اتر رہا تھا۔

ہم طیارے کے دائیں بائیں کھڑکی طرف اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے تاکہ دونوں طرف کے مناظر دیکھ سکیں اور اندازہ لگا سکیں، وہ کون سی جگہ ہے۔ کون ہماری طرف آتا ہے اور طیارہ جہاں اتارا جاتا ہے، وہ جگہ باقاعدہ ائیر پورٹ ہے بھی یا نہیں؟

اس طیارے نے اجنبی زمین کو چھو لیا تھا۔ اب رن وے پر دوڑتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے دوڑتا ہوا اپنی رفتار کم کر رہا تھا اور رکتا جا رہا تھا، ویسے ہی کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف سونیا نے شدید حیرانی سے چیخ کر کہا۔ "فرہاد! جلدی آؤ، یہ کیا ہو رہا ہے، یہاں تو لوگ جھنڈیاں لیے کھڑے ہوئے ہیں، پھولوں کے ہار بھی نظر آ رہے تھے۔"

میں نے سیفٹی بیلٹ کو کھولا پھر سونیا کے پاس آ کر کھڑکی سے دیکھا۔ واقعی لوگ ہاتھوں میں جھنڈیاں لیے یوں ہلا رہے تھے جیسے ہمیں خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ گویا انھیں ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے تھی۔

یا حیرت! یہ کیا ماجرا تھا۔ ہم کسی ملک کے سربراہ یا وزیر تو نہیں تھے۔ نہ ہی کسی خیر سگالی دورے پر آئے تھے۔ یہ اتنا ہجوم ہمارے استقبال کے لیے آیا تھا، اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا!

جہاں وہ طیارہ رک گیا تھا، وہاں اب دروازے کی طرف سیڑھیاں لا کر لگائی جا رہی تھیں لیکن دروازہ کھولا نہیں گیا۔ کتنی ہی عورتیں پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لے کر آئی تھیں۔ اب وہ سیڑھی کے پاس ننھے پھولوں کو بچھاتی جا رہی تھیں گویا پھولوں بھرا راستہ بناتی جا رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "سونیا! پھولوں میں کانٹے چھپے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے مگر چبھتے ضرور ہیں۔"

"یہی میں سوچ رہی ہوں، مادام کمپیوٹر ہم پر اتنی مہربان تو نہیں ہو سکتی۔ اس نے یقیناً بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کے بعد ہمیں یہاں پہنچایا ہے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، مادام نے ہمارے ان اجنبی میزبانوں کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہم بندوق کی گولی سے نہیں، پھولوں کی مار سے مر سکتے ہیں۔"

"کچھ ایسی ہی بات ہو سکتی تھی۔ اب تک ہمیں ایک بھی مسلح شخص نظر نہیں آیا۔ ہمارا ذہن تسلیم نہیں کر سکتا، دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں لوگ صرف پھولوں کی زبان بولتے ہوں اور گولیوں کی زبان سے موت کی گالیاں نہ دیتے ہوں۔"

میں نے جھوٹ نہیں کہا۔ چند منٹ کے بعد ہی تصدیق ہو گئی۔ اچانک ہی تڑتڑاتڑ کی آواز کے ساتھ دور تک گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ جو بے چاریاں ہمارے لیے پھول بچھا رہی تھیں، وہ کچھ تو زمین پر گر پڑیں، کچھ جھکتے ہوئے، رینگتے ہوئے دور نکل جانے کی کوشش کرنے لگیں۔ پھر ہم نے دیکھا، دور جہاں خوبصورت پھولوں کے اونچے اونچے پودے تھے، ان کے پیچھے سے اسٹین گنیں اور مشین گنیں ابھرنے لگیں اور جواباً آگ برسانے لگیں۔ ہم نے اندازہ کر لیا، ہمارے طیارے کے ایک طرف سے مخالفانہ فائرنگ ہو رہی تھی۔ اور جہاں ہم دیکھ رہے تھے، وہاں سے جواب میں گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔

دو شخص اپنی جان پر کھیلتے ہوئے، دوڑتے ہوئے ہمارے طیارے کی سیڑھیوں کے پاس آئے۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے تو ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ فائرنگ جاری تھی، اچانک ہی ایک زوردار دھماکا ہوا، طیارے کے قریب ہی کوئی بم یا ہینڈ گرنیڈ پھٹ پڑا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والوں میں سے ایک نے اجنبی زبان میں ہم سے کچھ کہا۔ زبان تو سمجھ میں نہیں آئی مگر مطلب سمجھ میں آ گیا۔ وہ ہمیں طیارے

سے نکل کر فوراً ہی دور بھاگنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی بھاگنے لگے۔ ہم بھلا کیسے پیچھے رہ سکتے تھے، ہم نے بھی ان کے پیچھے ایک ایک دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے دور نکل جانے کی کوشش کی۔

اس دوران میں نے ایک ذرا پلٹ کر طیارے کے اگلے حصے کی طرف دیکھا، وہاں بھی سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں، اگلا دروازہ کھول کر دونوں پائلٹ کو نکل بھاگنے کا موقع دیا جا رہا تھا۔ وہ ہمارے معصوم اور نہتے میزبان جو بھی تھے، اپنے سینے میں انسانی ہمدردی اور محبت سے دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے۔ اپنی جان پر کھیل کر ہم سب کو طیارے سے نکال کر لے جا رہے تھے۔

انجانے دشمن، طیارے سے بہت دور درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے فائرنگ کر رہے تھے۔ اس کے جواب میں ہمارے میزبانوں کے حمایتی بھی فائرنگ کرتے جا رہے تھے۔ اور ہم ان کے درمیان تھے۔ فائرنگ ذرا رُکتی تو ہم دوڑ لگاتے پھر شروع ہوتی تو ہم زمین پر لیٹ جاتے۔ کبھی رینگنے لگتے، کبھی جھک کر بھاگنے لگتے۔ ایسے وقت میں نے اور سونیا نے دیکھا، ہمارے چاروں طرف مرد اور عورتوں نے حصار باندھ لیا تھا اور ہمیں آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے جا رہے تھے۔ اشارے سے کہہ رہے تھے "پروا نہ کرو، ہم ڈھال بنے ہوئے ہیں، بھاگتے رہو۔"

میں ایسے انجانے دوستوں کی دوستی اور محبت کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ جب ہم ذرا دور نکل گئے تو اچانک تڑ تڑا تڑ کی آواز کے ساتھ گولیاں چلیں اور مجھے ڈھال بنانے والی ایک لڑکی اور ایک مرد اُن کا نشانہ بن گئے۔ وہ بے جان ہو کر مجھ پر آگرے، میں نے دونوں کو سنبھالا اور زمین پر لیٹ گیا۔

میں چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ میرے ایک بازو پر اس اجنبی دوست کا سر تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے سرد پڑ چکا تھا۔ دوسرے بازو پر لڑکی سر رکھے ہوئے تھی۔ میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں پوچھ رہا تھا۔ "اے زمین و آسمان کے مالک! ان سے میرا کیا رشتہ ہے؟"

اچانک لڑکی کے جسم میں حرکت ہوئی، وہ آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگی پھر اس نے مجھے دیکھا، سر سے پاؤں تک نظر ڈالی۔ مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر آخری مسکراہٹ آئی پھر اس نے کانپتا ہوا ہاتھ مجھ پر رکھ کر کہا۔ "تا مُسلم۔"

پھر اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا "مُسلم"۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر میرے سینے پر ڈھلک گیا۔

میں چند سیکنڈ تک سانس لینا بھول گیا تھا۔ میں جیسے اپنی معصوم مجاہدہ کے ساتھ مر چکا تھا۔ یہ دنیا میرے لیے مر چکی تھی۔ اچھا ہی ہوتا اگر یہ خونخوار درندوں سے بھری ہوئی دنیا مر جاتی۔ پھر میں چونک گیا۔ میرے ایک بازو سے اس شخص کی لاش کو کچھ لوگ اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ پھر کچھ عورتوں نے اس لڑکی کو اٹھانا چاہا، میں نے روک دیا، اسے آہستگی سے سنبھال کر اٹھ گیا۔ پھر میں نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ میں مانتا ہوں، حالات نے ہمیں بہت سنگدل بنا دیا ہے، میری آنکھ میں آنسو نہیں تھے لیکن دل جذبوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس معصوم کی لاش کو اٹھا کر ادھر کا رُخ کیا جدھر سے مخالفین فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر میں نے دانت کچکچانے کے بعد غصے سے دہاڑتے ہوئے کہا۔ "سفاک درندو! ابھی ایسی کوئی گولی نہیں بنی جو میرے جسم میں پیوست ہو سکے۔ ابھی تو میں نے اس زمین پر قدم رکھا ہے، وقت بتائے گا کہ میں تمھاری گولیوں سے مرنے والا نہیں ہوں۔"

پھر میں اس معصوم کو اٹھائے اُدھر گھوم گیا جدھر ہمارے میزبان دوست، دشمنوں پر جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف بھی چیختے ہوئے کہا: "یہ کیسا استقبالیہ ہے، یہ مجھے خوش آمدید کہنے کا کیسا مجاہدانہ انداز ہے، ابھی میں نے دشمنوں کو چیلنج کیا ہے کہ ان کی گولیاں مجھے نہیں مار سکیں گی۔ مگر خدا کی قسم تم سے ایسی محبت کی تو میں مر جاؤں گا۔"

مجھ پر جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ میں نے دوسری طرف گھوم کر خلا میں گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "مادام کیبوٹڑا تم نے مجھے کیسی جگہ پہنچا دیا ہے۔ تم دشمنی کر رہی ہو یا دوستی؟ مگر نہیں، تم سے دوستی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ شاید تم شہد میں ملا کر زہر اور دوستی میں ملا کر دشمنی پیش کر رہی ہو۔ بہتر ہے کھل کر سامنے آجاؤ ورنہ جس دن میں نے تمھیں گرفت میں لیا، اس دن تم مجھ سے زیادہ تلملاؤ گی، مجھ سے زیادہ جنون میں مبتلا ہو کر دماغی توانائی کھو بیٹھو گی۔"

میں یک بیک چپ ہو گیا۔ میرے شانے پر ایک ہاتھ آیا تھا۔ میں اس ہاتھ کو ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ میرے لیے سکون کا باعث تھا اور وہ سونیا کا ہاتھ تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ "بس کرو فرہاد، ڈونٹ بی سو ایکسائٹیڈ۔"

کچھ عورتوں نے آکر اس لڑکی کی لاش کو مجھ سے لے لیا۔ میں نے خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ جوش، جذبہ اور جنون انسان کو اپنی ہی ذات سے غافل کر دیتا ہے۔ اتنی دیر سے جیسے میں غافل رہا تھا۔ اب ہوش آیا تو دیکھا، فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ دشمن یا تو مارے گئے تھے یا پسپا ہو گئے تھے۔

میں سونیا کے ساتھ چلتا ہوا ایک چھوٹے سے پختہ مکان کی طرف جانے لگا۔ اس کی چھت پہلے پھولوں اور پتوں سے ڈھکی ہوئی نظر آئی تھی۔ بعد میں پتا چلا، وہاں مشین گن رکھی ہوئی ہے جسے پھولوں اور پتوں میں چھپایا گیا تھا۔ اسی مشین گن نے دشمنوں کو کافی تعداد میں ہلاک کیا تھا اور انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس مکان کی کھڑکیاں اور دروازے نہیں تھے۔ دیواریں کئی جگہ سے تڑخ گئی تھیں۔ ایک جگہ شگاف پڑ گیا تھا۔ یقیناً گولہ بارود کے دھماکوں سے ایسا ہوا ہوگا۔ ہم سے پہلے بھی اس مکان کے آس پاس کی جگہ میدانِ جنگ بن چکی ہوگی۔

اس مکان کے پیچھے کئی پرانی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک واکس ویگن کی طرف اشارہ کیا گیا۔ ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ ہم اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے والی سیٹ پر وہ دونوں پائلٹ آکر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے انگریزی میں پوچھا۔ "کیا تم یہ زبان سمجھتے ہو؟"

وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے جاپانی زبان میں پوچھا، سونیا نے ترکی اور فرانسیسی زبانوں کو آزمایا مگر وہ سوالیہ نشان بنا رہا۔ جو لوگ دشمنوں پر فائرنگ کرتے رہے تھے، اب وہ ہمیں نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھ رہا تھا، وہ باقاعدہ وردی میں ہوں گے لیکن اکثر لوگوں نے لنگی اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ کچھ پتلون، شرٹ اور جیکٹ میں نظر آ رہے تھے۔ اس مکان کی چھت سے مشین گن اتار لی گئی تھی۔ سب اپنے اپنے ہتھیار لے کر مختلف گاڑیوں میں سوار ہو گئے تھے۔ پھر وہ قافلہ وہاں سے چل پڑا۔

میں نے روانہ ہوتے وقت طیارے کی طرف دیکھا۔ طیارے کی سیڑھی سے لے کر کچھ دور تک بہت سے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ ہمارے استقبال کے لیے جانے کتنی ٹوکریاں بھر کر پھول لائے گئے تھے لیکن ان پھولوں پر اب مجاہدین کے لہو کے چھینٹے بھی پڑ گئے تھے۔

یہ کون لوگ تھے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف تھے۔ یہ کیسی زمین ہے، اس جزیرے کا تعلق کس ملک سے ہے؟ یہ سمجھنا ذرا مشکل تھا۔

یہاں کے مردوں اور عورتوں کے چہرے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ برمی ہو سکتے ہیں۔ ملایائی اور سنگاپوری بھی ہو سکتے ہیں یا ان کا تعلق ویتنام یا فلپائن سے ہے۔ ان کا رنگ سانولا تھا، چہرے پر زندگی کی سختی اور اپنے مزاج کی شگفتگی تھی، آنکھیں گہری اور چھوٹی تھیں، ناک اونچی بھی نہیں تھی، چپٹی بھی نہیں تھی۔ ہاں مگر پھیلی ہوئی تھی۔

مردوں کی بہ نسبت عورتوں کا رنگ ذرا صاف تھا۔ انھوں نے ٹخنوں تک پیٹی کوٹ پہنا ہوا تھا، اوپر صدری نما قمیصیں تھیں۔ لڑکیوں کا لباس ذرا شوخ تھا۔ انھوں نے کڑھائی کیے ہوئے بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہن رکھے تھے۔ دوپٹہ نما کپڑا ان کے سر پر سے ہوتا ہوا، دونوں کانوں پر سے گزرتا ہوا پیچھے جا کر ایک گرہ میں بندھا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا، یہ مسلمان عورتیں ہیں اور اپنا جسم اسی طرح ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ سر پر کپڑا ابھی ضرور رکھتی ہیں ورنہ اس جزیرے میں کچھ دوسری عورتیں بھی نظر آئیں۔ جن میں کچھ مردوں کی طرح لنگی پہنے ہوئے تھیں، کسی نے اپنے جسم کے اوپری حصے کو کسی نہ کسی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ وہاں کی غربت، تنگ دستی ان کے لباس سے ظاہر تھی۔ مسلمان عورتیں بھی غریب تھیں لیکن وہ کھانے سے پہلے تن کو ڈھانپنا ضروری سمجھتی تھیں۔

ہمارا قافلہ ایک پختہ سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ دونوں طرف ہرے بھرے درخت تھے۔ دور تک خوبصورت مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جو پہلے دور نظر آرہی تھیں، اب ہم ان کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ میں نے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پائلٹ سے پوچھا۔ "تم ہمیں کس جگہ لے آئے ہو؟"

وہ خود حیران حیران نظروں سے آس پاس دیکھتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتا، یہ کون سی جگہ ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے طیارے کو یہیں لانے اور یہیں اتارنے کے لیے کہا گیا تھا۔"

"کس نے کہا تھا؟"

وہ اپنے سر کو کھجانے لگا، سوچنے لگا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں، اپنے دماغ پر زور نہ ڈالو۔"

اب ہماری گاڑیوں کو دھچکے سے لگ رہے تھے۔ پختہ سڑک چھوڑ دی تھی، کچے راستے پر جا رہے تھے۔ پہاڑی کے دامن میں وہ کچا راستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور کبھی نظر آنے لگتا تھا۔ جب ہماری گاڑیاں نشیبی راستے سے گزرتے ہوئے اس کچے راستے کی بلندی پر پہنچیں تو پہاڑیوں کے درمیان ایک خوبصورت سی وادی نظر آئی۔ لکڑیوں سے بنے ہوئے مکانات دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑوں کی چٹانوں کے سائے میں بھی کچھ لوگ آباد

تھے۔ بچے وادی میں دوڑ رہے تھے، ہنس بول رہے تھے۔ ہمارے قافلے کو دیکھتے ہی بہت سی عورتیں اور مرد ہماری طرف دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ گاڑیاں رک گئی تھیں۔ ہم باہر آئے تو وہ ہمیں دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگے۔ عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر اپنی اپنی زبان میں کچھ یوں کہہ رہی تھیں جیسے خوشی سے نعرے لگا رہی ہوں۔

معلوم ہوتا تھا ہم ان کے لیے باعث رحمت ہیں۔ ان کی جانے کتنی مشکلیں آسان ہونے والی ہیں حالانکہ ہم ان کے مسائل کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ ہم مسلح جوانوں کے درمیان چلتے ہوئے ایک غار کے سامنے پہنچ گئے۔ غار کے دہانے کو تراش کر بہت بڑے گیٹ کی طرح بنایا گیا تھا۔ اس میں لکڑی کا مضبوط دروازہ بھی لگایا گیا تھا۔ وقتِ ضرورت وہ دروازہ بند کیا جاتا تھا۔ اس وقت وہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک ادھیڑ عمر کا قدآور شخص دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا تھا ـــ اس نے ہمیں دیکھتے ہی فوراً آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پھر گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "خوش آمدید برادر! خوش آمدید سسٹر! مجھے احساس ہے یہاں پہنچتے ہی آپ بڑی الجھنوں میں گرفتار ہو گئے۔ میں انگریزی زبان بول رہا ہوں، آپ میرے دماغ میں پہنچ کر بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"

میں اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے انکار میں ایک انگلی ہلاتے ہوئے کہا "مگر نہیں برادر، ابھی خیال خوانی نہ کریں۔ پہلے میرے غریب خانے میں تشریف لائیں۔ وہاں آرام سے بیٹھیں۔ کچھ کھائیں پئیں پھر اطمینان سے ہمارے متعلق معلومات حاصل کریں۔"

ہم اس کے ساتھ غار میں داخل ہوئے۔ میں نے اتنی دیر میں معلوم کر لیا کہ فلپائن کے ایک بہت ہی دور افتادہ جزیرے میں ہیں۔ فلپائن کے جنوب مغرب میں جو سمندر ہے، وہ سولو سمندر کہلاتا ہے۔ اس کے جنوب میں جو سب سے آخری جزیرہ ہے اس کا نام کادی کادی ہے۔ ہم اسی جزیرے کادی کادی میں تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی ہمیں ایک بڑا سا ہال نظر آیا۔ اسے پہاڑ کے اندرونی حصے کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد اندر ہی اندر کئی کمرے تراشے گئے تھے۔ کچھ کمروں میں اناج کا ذخیرہ تھا اور کچھ میں مختلف قسم کے اسلحے جمع کیے جاتے تھے۔ جس ہال میں ہم پہنچے وہاں کچھ بستر اور کرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ ہتھیار ہی ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ میں نے سونیا کو بتایا "ہم کس ملک کے جزیرے میں ہیں، جس میزبان کے سامنے ہم بیٹھے ہوئے تھے اس کا نام سلیمان مورروز تھا۔ سونیا نے اسے باتوں میں لگا لیا اور میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے لگا۔

میری داستان جس موڑ پر پہنچی ہے اسے آئندہ سمجھنے کے لیے فلپائن کی تھوڑی سی تاریخ کو سمجھنا ضروری ہے۔ میں صرف چند لفظوں میں بیان کروں گا۔ ۱۵۲۱ء میں ایک پرتگالی ملاح نے فلپائن کو دریافت کیا تھا۔

۱۵۶۸ء میں شاہ سلیمان نے فلپائن کو فتح کیا اور وہاں بڑے طمطراق سے حکومت کرتا رہا۔ آج بھی فلپائن کے بڑے شہر مینڈانو اور بحرِ سولو کے جزیرے کادی کادی اور ہولو میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

دوسری جنگِ عظیم تک اس ملک میں کئی سیاسی انقلابات آئے، حکومتیں بدلتی رہتی رہیں پھر یہاں امریکی برسرِ اقتدار آ گئے۔

میں اور سونیا ۱۹۷۳ء کے ساتویں مہینے میں یہاں پہنچے تھے۔ ان دنوں ویتنام سے امریکی فوج کے قدم اکھڑ چکے تھے۔ فلپائن میں بھی امریکی اقتدار کمزور پڑ چکا تھا۔ ایک طرف کمیونسٹ بغاوت کر رہے تھے، دوسری طرف مسلمان اپنے برسوں کے تاریخی حوالے سے اپنے حقوق طلب کر رہے تھے۔ بعد میں ۱۹۷۴ء کو ایک صلح نامے پر دستخط ہوئے جس کی رو سے مسلمانوں کو فلپائن کی حکومت میں شریک کیا گیا۔ لیکن یہ برائے نام شرکت تھی۔ ۱۹۷۷ء میں پھر جنگ شروع ہو گئی۔ اب ۱۹۸۰ء میں مسلمانوں نے ایک علیحدہ حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہوا ہے۔

اگرچہ یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے تاہم مسلمانوں کی دہشت طاری ہے، آج بھی بیرونی ممالک سے آنے والے سیاحوں کو جزیرہ ہولو اور کادی کادی میں جانے سے روکا جاتا ہے۔ شہر مینڈانو کے بہت سے علاقوں میں بھی سیاحوں پر پابندی ہے کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں انھیں باغی قرار دیا جاتا ہے۔

میں نے اپنے میزبان سلیمان مورروز کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "فلپائن کے سب سے پہلے بادشاہ کا نام بھی سلیمان تھا۔"

وہ سر ہلا کر مسکراتے ہوئے بولا "ہاں، میرے ماں باپ نے اسی پہلے بادشاہ کے نام پر میرا نام رکھا ہے۔ وہ کہتے تھے، میں فلپائن میں اپنی حکومت دوبارہ قائم کروں گا اور میں اسی جدوجہد میں مصروف ہوں۔"

"کیا یہاں کے مسلمان اسی طرح پہاڑوں، غاروں اور جنگلوں میں رہتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں، فلپائن کے خاص شہروں منیلا، مینڈانو سے لے کر یہاں کے جزیروں تک مسلمان شہروں میں آباد ہیں اور پُرامن شہری زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بھی مسلمان ہیں، ہم بھی مسلمان ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ بھی ہماری طرح لڑتے ہیں مگر اپنی ذہانت اور علم سے۔ اور ہم ہتھیاروں سے لڑ رہے ہیں۔"

سونیا نے پوچھا "یہاں صرف آپ انگریزی جانتے ہیں؟"

"اس وادی میں میری طرح دو اور انگریزی جاننے والے ہیں۔ باقی تمام لوگ ناخواندہ ہیں، محنت مزدوری کرنے والے ہیں۔ ویسے یہاں کے جزیروں سے لے کر فلپائن کے ہر علاقے میں آپ کو زیادہ سے زیادہ انگریزی جاننے والے ملیں گے۔ شاید آپ نہیں جانتے، فلپائن دنیا کا وہ تیسرا ملک ہے جہاں سب سے زیادہ انگریزی بولی جاتی ہے۔"

میں نے اچانک سوال کیا "کیا مادام کمپیوٹر سے آپ کا کوئی معاہدہ ہوا ہے؟"

"کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ جو تحریری نہ ہو وہ معاہدہ نہیں کہلاتا بلکہ وعدہ کہلاتا ہے۔ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ اس کے کام آئیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تھا ہمارے کام آئے گی۔"

"گویا وہ کام آ رہی ہے۔"

"آپ کی آمد اس بات کا ثبوت ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا تھا، اس کی کیا ضمانت ہے کہ فرہاد صاحب ہمارے دوست بن جائیں گے اور دوست بن گئے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اپنی بے انتہا مصروفیات چھوڑ کر اتنی دور ہمارے پاس آئیں گے۔ ہم اس کے اور آپ کے احسان مند ہیں اور شکر گزار ہیں۔ وہ زبان کی دھنی نکلی اور آپ تمام مصروفیات چھوڑ کر ہمارے پاس چلے آئے۔"

"چلیے، وہ تو آپ کے کام آ رہی ہے آپ کس طرح اس کے کام آ رہے ہیں؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "آپ مجھ سے پوچھنے کا تکلف کر رہے ہیں جب کہ دماغ میں پہنچ کر تمام باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "میں اس لیے سوالات کر رہا ہوں تاکہ آپ جواب دیں۔ اور سونیا بھی سنتی رہے۔"

"پھر تو ہمیں اطمینان سے باتیں کرنا چاہئیں۔ آپ تھکے ہوئے آئے ہیں۔ کم از کم غسل کر لیجیے۔ کچھ کھانے پینے کا سلسلہ بھی چلتا رہے اور باتیں بھی ہوتی رہیں۔"

ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ہمیں احساس نہیں ہو رہا تھا کہ کسی پہاڑ کے غار میں داخل ہوئے تھے۔ ہم کشادہ کمروں میں تھے، ایک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچ رہے تھے۔ غار کو ایسی فنکاری کے ساتھ تراشا گیا تھا کہ کسی قدیم پتھریلے محل کا گمان ہوتا تھا۔ ہمارے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ باتھ روم میں غسل کرنے کا سامان موجود تھا۔ میرے اور سونیا کے لیے مقامی لباس کے علاوہ جینز، شرٹس، پتلون، جیکٹس، بیٹی کوٹ، بلاؤز وغیرہ بھی مہیا کیے گئے تھے۔ مادام کمپیوٹر نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کسی نہ کسی دن وہ مجھے وہاں پہنچا دے گی۔ ہو سکتا ہے، میرے ساتھ کچھ ساتھی بھی ہوں، اس لیے انھوں نے پہلے سے یہ انتظامات کر رکھے تھے۔

میں نے غسل کرنے کے دوران اعلیٰ بی بی سے رابطہ قائم کیا۔ رسونتی وقتاً فوقتاً ہمارے دماغ میں آتی جاتی رہی تھی۔ اسے ہمارے موجودہ حالات کا علم تھا اور وہ مطمئن تھی۔ میں نے اس کے ذریعے فرانس کے دوست افسران کو پیغام پہنچا دیا تھا کہ وہ جزیرہ کادی کادی کا معاملہ راز میں رکھیں، حالاں کہ یہ راز زیادہ دیر راز میں رہنے والا نہیں تھا۔ جن مخالفین نے ہم پر فائرنگ کی تھی، ان کے ذریعے ہماری آمد کی تشہیر ہونے والی تھی۔ اس طرح یہ بات دہشت گرد تنظیموں کے سربراہوں تک بھی پہنچنے والی تھی۔

اعلیٰ بی بی نے کہا "جب طیارہ اغوا کیا جا رہا تھا تب ہم طرح طرح کی باتیں سوچ رہے تھے لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مادام کمپیوٹر تم دونوں کو ایسی جگہ پہنچائے گی جہاں بالکل ہی نئے مسائل جنم لیں گے۔"

"کیا تم اندازہ کر سکتی ہو کہ یہاں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور ہم کن حالات سے گزرنے والے ہیں؟"

"ابتدائی طور پر صرف اتنا ہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ فلپائن کے مسلمان دو طرح سے اپنی جنگیں لڑ رہے ہیں۔ ایک تو علم اور ذہانت سے، دوسرے ہتھیاروں سے۔ وہ لوگ تمھاری ذہانت سے بھی کام لینا چاہیں گے اور جنگی صلاحیتوں سے بھی لیکن فرہاد! میرا مشورہ ہے تم ایسے کسی معاملے میں نہ پڑو جس کا تعلق سیاست سے ہو۔ کسی بھی ملکی معاملات میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم بہت عرصے تک مصیبتوں میں گھرے رہتے ہیں۔ سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا۔"

"درست کہتی ہو۔ میں یہی کروں گا۔ ان کی سیاست میں حصہ نہیں لوں گا لیکن ان کا تحفظ کروں گا۔ انھیں کوئی خطرہ درپیش ہوگا تو پہلے سے اطلاع دے دوں گا۔ بلکہ پیش آنے والے خطرات سے انھیں حتی الامکان بچائے رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا "یہ تو ایک مسئلہ ہوا لیکن دوسرا اہم مسئلہ مادام کمپیوٹر کا ہے، پتا نہیں وہ تمھارے میزبان سلیمان مورروز اور وہاں کے رہنما مسلمانوں سے کسی طرح اپنا کام نکالنا چاہتی ہے اور وہ کام کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ دراصل پیچیدہ گیاں

یہیں سے شروع ہوں گی۔"

"میں ابھی معلوم کر کے تمھیں بتاؤں گا۔"

ہمارے میزبان سلیمان موروز کا دماغ کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا۔ میں نے اسے پڑھ لیا۔ باتھ روم سے نکل کر آیا تو سونیا بھی غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر مقامی لباس پہن چکی تھی۔ اور آئینے کے سامنے کھڑی الجھی ہوئی زلفیں سلجھا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "جب ہم طیارے میں جزیرے کے چاروں طرف پرواز کر رہے تھے تو ہم نے ایک محل نما بڑی سی عمارت دیکھی تھی۔ تمھیں یاد ہے؟"

"ہاں، وہ کوئی قدیم زمانے کا محل ہوگا۔"

"مادام کمپیوٹر نے یہاں کے مسلمانوں سے اپنی خدمات کے صلے میں اسی محل کا مطالبہ کیا ہے۔"

وہ بال سلجھاتے سلجھاتے رک گئی۔ آئینے کے اندر سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ہے نا تجسس کی بات؟"

"میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ یہ کم بخت کوئی زبردست ہیرا پھیری کر رہی ہے۔ اس پرانے محل کا مطالبہ یونہی تو نہیں کر رہی ہوگی۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔"

"جب کسی قدیم تاریخی محل کا ذکر کسی خاص معاملے میں آتا ہے تو دماغ فوراً کسی خفیہ خزانے کے متعلق سوچتا ہے، تم کیا سوچ رہی ہو؟"

"میرا دماغ بھی یہی سوچ رہا ہے۔"

میں نے خیال خوانی کی چھلانگ لگائی۔ اعلیٰ بی بی کو مختصر طور پر مادام کمپیوٹر کے مطالبے کے متعلق بتایا۔ پھر اس سے بھی وہی سوال کیا۔ اس نے جواب دیا۔ "یقیناً اس محل میں کوئی ایسا تہ خانہ ہے جس کا علم مادام کمپیوٹر کو ہے اور اس تہ خانے میں جو کچھ ہے، وہ بھی صرف مادام جانتی ہے۔ تاریخی حوالے سے کوئی جانتا بھی ہوگا تو وہ اب اس دنیا میں نہیں رہے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس محل کا مطالبہ کرنے میں کوئی اور راز بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن ہم مادام کمپیوٹر کو ایک لالچی ہستی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنے کے لیے اسے اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہے۔"

"اس کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ وہ چھ ماہ کے بعد فلپائن کی حکومت سے جزیرہ کاوی کاوی کو خرید لے گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی، اس طرح اس جزیرے کے مسلمانوں کو فائدہ کیا پہنچے گا۔ ادھر وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ پورا جزیرہ ہی خریدنا چاہتی ہے۔"

"مسلمانوں کی جدوجہد فلپائن میں حکومت قائم کرنے کے لیے ہے، ان جزیروں میں نہیں۔"

اعلیٰ بی بی نے کہا۔ "پھر تو وہ بہت زبردست چال چل رہی ہے یعنی ایک طرف اس نے وعدہ پورا کیا، تمھیں ان کے پاس پہنچا دیا۔ دوسری طرف وہ تاثر دے رہی ہے کہ مسلمان اپنی جدوجہد میں کامیاب نہ ہوئے تو وہ فلپائن کی حکومت سے سودا کرے گی اور اس جزیرے کو خرید لے گی۔ ایسی صورت میں وہاں کے مسلمان مادام کمپیوٹر کے ماتحت ہوں گے۔ اور اس کی اطاعت پر مجبور ہوں گے یا پھر وہ جزیرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"

"میں سلیمان موروز کے دماغ کو پڑھ چکا ہوں، اس کے دماغ میں صرف ایک پہلو ہے اور وہ یہ کہ فلپائن میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی تو کاوی کاوی جزیرے کی کیا اہمیت ہوگی، وہ تو ایک چٹکی کے برابر ہے۔ اسے مادام کمپیوٹر کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اور اس کی اچھی قیمت بھی مل جائے گی۔"

"تم اپنے میزبان سلیمان کو مجبور کرو کہ وہ دوسرے منفی پہلو پر بھی سوچے۔"

"آزادی کی جدوجہد کرنے والے، اپنے حقوق کی خاطر لڑنے والے ناکامی کے متعلق نہیں سوچتے۔ وہ یہی خواب دیکھتے ہیں کہ انھیں کامیابی ہوگی اور سلیمان جیسے فلپائن کے مسلمان رہنما، سبھی پُر امید ہیں کہ ان کی حکومت قائم ہوگی یا پھر حکومت میں برابر کی شرکت کے مواقع حاصل ہوں گے۔"

"وہاں کے مسلمانوں کو کامیابی ہو یا نا ہو، مادام کمپیوٹر اپنا فائدہ ضرور حاصل کرے گی۔"

یہ کہتے ہی اعلیٰ بی بی ہنسنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "مادام کمپیوٹر تمھارے کمزور دماغ میں پہنچنے کے بعد تم سے فائدے حاصل کرنا چاہتی تھی اور تم سے باقاعدہ سودے بازی کر رہی تھی، تم نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے چیلنج کیا تھا کہ وہ تمھاری ذات سے فائدے حاصل کرتی رہے گی، دیکھ لو، اس نے کس طرح اپنا چیلنج پورا کیا ہے۔ تمھیں وہاں لے جا کر پھنسا دیا۔ تم ان کی مدد کرنے سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایک تو وہ مسلمان ہیں، دوسرے تاریخی حوالے سے اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تمھارا ضمیر تمھیں وہاں مصروف رکھے گا اور مادام کمپیوٹر تمھاری آڑ میں فائدے حاصل کرتی رہے گی۔"

اس دلچسپ داستان کے باقی واقعات
چودھویں حصے میں ملاحظہ کیجیے
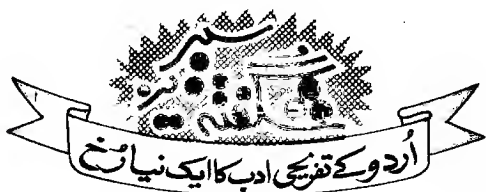
اُردو کے تفریحی ادب کا ایک نیا رُخ
طنز و مزاح سے بھرپور ہلکے پھلکے رومانی ناول
آپ کے جانے پہچانے مشہور ادیب اثر نعمانی کے قلم سے
قہقہے ہی قہقہے
حکیمی ٹیکسی
قیمت روپے
آپ کے سر پر
قیمت روپے
گھر کی مرغی
قیمت روپے
شرارت
قیمت روپے
بی وی کی تلاش
قیمت روپے
بے وقوف
قیمت روپے
اُلّو کی دم
قیمت روپے
اور سہی...
قیمت روپے
مسٹر مداری
قیمت روپے
یہ کتابیں اس وقت کے لیے ہیں
جب آپ بور ہو رہے ہوں
بور ہونا چھوڑیں، مسکرانا سیکھیں
تمام کتابیں آج ہی منگا لیں
ڈاک خرچ فی کتاب روپے کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف۔ پورے سیٹ کی قیمت صرف روپے مع ڈاک خرچ
کتابیات پبلی کیشنز